بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

ح

ح ا ش (ح ش و)

اَلْحَاشِیَۃُ ۔ کنارہ (کپڑے وغیرہ کا) ۔ حَشْوَۃُ النَّاسِ ۔ رذیل لوگ* (یعنی وہ لوگ جنہیں کنارے پر دور دور رکھا جائے) ۔ یہیں سے اسکے معنے دوری کے آتے ہیں ۔ حَاشَ لِلّٰہِ ۔ خدا اس سے بہت دور ہے وہ منزہ ہے ۔ یا میں اللہ کی پناہ مانگتا ہوں ۔ (کیونکہ اَلْحَاشِیَۃُ ان لوگوں کو بھی کہتے ہیں جو کسی کی حفاظت میں رہتے ہوں)*

قرآن کریم میں ہے وَ قُلْنَ حَاشَ لِلّٰہِ (۱۲/۳۱) ۔ ''انہوں نے کہا کہ خدا تمام عیوب سے پاک ہے ۔ وہ نقائص سے مبرا ہے'' ۔ یہ تنزیہ اور استثناء کیلئے آتا ہے** ۔ یعنی عیوب اور نقائص سے منزہ ہونے کے معنوں میں[۱]

ح ب ب

اَلْحَبُّ ۔ اَلْمَحَبَّۃُ ۔ صاحب محیط نے لکھا ہے کہ اس مادہ کے پانچ معانی ہیں ۔ (۱) سفیدی اور صفائی ۔ یہاں سے حَبَبُ الْاَسْنَانِ لیا گیا ہے یعنی دانتوں کی چمک (۲) بلند ہونا اور ظاہر و نمودار ہونا ۔ یہاں سے حَبَابُ الْمَاءِ لیا گیا ہے ۔ یعنی پانی کا بلبلہ (۳) کسی چیز کا اپنی جگہ ٹھہرے اور جمے رہنا ۔ یہاں سے حَبَّ الْبَعِیْرُ وَ اَحَبَّ لیا گیا ہے ۔ یعنی اونٹ اسطرح جم کر بیٹھ گیا کہ پھر نہ اٹھا ۔ (۴) کسی چیز کا خالص ہونا یا اس کا لب لباب اور حقیقی جوہر ۔ جیسے حَبَّۃُ الْقَلْبِ ۔ سویدائے دل کو کہتے ہیں اور (۵) کسی کی حفاظت کرنا ۔

---

* تاج ۔ ** راغب ۔ [۱] حاش کے مادہ کے بارے میں علماء لغت کا اختلاف ہے ۔ بعض نے ح ش و بتایا ہے اور بعض ح ش ی ۔ تاج نے حاش للہ کے معنی معاذ اللہ لکھے ہیں یعنی اللہ کی حفاظت اور پناہ

اسے تھامے رکھنا ۔ اسی سے حُبُّ الْمَاءِ مٹکا یا ٹھلیا یا مشک کو کہتے ہیں جسمیں پانی محفوظ رکھا جائے ۔ یا گھڑونچی جس پر مٹکے رکھے جاتے ہیں***۔ حَبَّ الرَّجُلُ کے معنی ہیں آدمی ٹھہر گیا ۔ أَحَبَّ الزَّرْعُ ۔ کھیتی میں دانے پڑ گئے ۔ یعنی اسکی نشو و نما کے نتائج ابھر کر سامنے آ گئے * ۔

راغب نے لکھا ہے کہ محبت کے معنی اس چیز کو چاہنا ہیں جسے اچھا اور مفید پایا جائے ، اس کے تین پہلو ہیں ، ایک تو لذت کیلئے ۔ جیسے مرد عورت سے محبت کرتا ہے ، دوسری مفید اور نفع بخش (مادی) چیزوں کوچاھنا ، تیسرا پہلو یہ ہے کہ فضل و شرف (معنوی امور) سے محبت رکھنا ، جیسے اہل علم ، علم و فضل کی بناء پر ایک دوسرے سے محبت کرتے ہیں ۔ کبھی محبت کے معنی ارادہ کے بھی کئے جاتے ہیں ۔ لیکن محبت میں ارادہ سے زیادہ زور و قوت ہے** ۔ اِسْتَحَبَّهُ - اسے چاہا، پسند کیا ۔ اِسْتَحَبَّهُ عَلَيْهِ ۔ اسے اس پر ترجیح دی (۱۴/۱۰۷) ۔

ابن فارس نے کہا ہے کہ اَلْحَبُّ اور اَلْمَحَبَّةُ کے معنی کسی کو لازم پکڑنا ہیں ۔ اس مادہ کے بنیادی معنی لزوم اور ثبات کے ہیں ۔ یعنی کسی شے کو لازم پکڑنا اور اس کے ساتھ مستحکم طور پر رہنا ۔

قرآن کریم میں حُبٌّ کا لفظ کُرْہٌ کے مقابلہ میں آیا ہے ۔ وہاں اسکے معنی پسندیدگی کے ہیں (مثلاً ۲/۲۱٦ ؛ ۴۹/۷) ۔ یہ معانی کسی تشریح و توضیح کے محتاج نہیں ۔ لیکن جہاں قرآن میں اللہ کی محبت کا ذکر آیا ہے وہ مقامات تشریح طلب ہیں ۔ مثلاً سورۃ بقرۃ میں ہے وَ مِنَ النَّاسِ مَنْ يَتَّخِذُ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اَنْدَادًا يُحِبُّوْنَهُمْ كَحُبِّ اللّٰهِ وَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا اَشَدُّ حُبًّا لِلّٰهِ (۲/۱٦۵) ۔ ”اور ایسے لوگ بھی ہیں جو خدا کے علاوہ اور قوتوں کو اسکا ہمسر قرار دیتے ہیں اور ان قوتوں سے اسطرح محبت کرتے ہیں جسطرح اللہ سے محبت کی جاتی ہے ۔ حالانکہ جو لوگ ایمان والے ہیں وہ اللہ کی محبت بہت بڑھکر کرتے ہیں“ ۔ (یہ وہ ترجمہ ہے جو عام طور پر کیا جاتا ہے) اسی طرح سورۃ آل عمران میں ہے قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِيْ يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ وَ يَغْفِرْ لَكُمْ ذُنُوْبَكُمْ وَ اللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۔ قُلْ اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَ الرَّسُوْلَ فَاِنْ تَوَلَّوْا فَاِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْكٰفِرِيْنَ (۳/۳۱-۳۲) ”ان سے کہدو کہ اگر تم اللہ سے محبت کرتے ہو تو میرا اتباع کرو ۔ اللہ تم سے محبت کریگا ۔ اور تمہارے قصوروں

---

* محیط ۔ ** راغب ۔ *** اگرچہ محیط نے یہ تشریح کی ہے کہ ان معنوں میں یہ فارسی سے معرب ہے ۔

کو معاف کر دیگا ۔ اور اللہ حفاظت کرنے والا رحم کرنے والا ہے ۔ ان سے کہدو کہ اللہ اور رسول کی اطاعت کرو ۔ پھر اگر یہ لوگ اس سے پھر جائیں تو اللہ کافروں سے محبت نہیں کرتا '' ۔ (یہ وہ ترجمہ ہے جو عام طور پر کیا جاتا ہے) ۔

ان آیات سے اللہ سے محبت ، اور اللہ کی محبت ، کی سند لی جاتی ہے اور پھر اس پر تصوف کی پوری عمارت استوار کر لی جاتی ہے جس کا اصل الاصول خدا کی محبت ہے ۔ اور محبت بھی ایسی شدت کی محبت کہ اس ذات میں اپنے آپ کو جذب کردینا اسکا منتھی قرار دیا جاتا ہے ۔ یہ سارا تصور لفظِ محبت کو اُن معنوں میں لے لینے سے پیدا ہوتا ہے جن معنوں میں ہم اسے انسانوں سے محبت کرنے کیلئے استعمال کرتے ہیں ۔

خدا سے اس قسم کے تعلق کا تصور غیر قرآنی ہے ۔ جہانتک خدا کی ذات کا تعلق ہے ہمارے حیطہ ادراک میں آ ہی نہیں سکتی ۔ اسلئے اس سے اس قسم کی محبت کا سوال پیدا نہیں ہوتا جس قسم کی محبت انسانی محبوب سے کی جاتی ہے (خواہ وہ کسی کی اولاد ہی کیوں نہ ہو) ۔ کسی آن دیکھی چیز سے اس قسم کی محبت کا پیدا ہونا نفسیاتی طور پر ناممکن ہے ۔ یہی وہ دشواری تھی جسکے پیش نظر لوگوں کو خدا کو بشکل انسان (اوتاروں کے روپ میں) ڈھالنا پڑا یا اسکی مورتیاں بنانی پڑیں ۔

لفظ محبت کے اُن معانی پر غور کیجئے جنہیں شروع میں درج کیا گیا ہے ۔ ساری بات صاف ہو جائیگی ۔ حُبّ کے معنے ہیں کسی چیز پر ثابت قدمی اور خلوص کے ساتھ جمے رہنا ۔ لہذا خدا کے ساتھ انسان کی محبت کے معنے ہیں ، احکامِ خداوندی کی خلوص اور استقامت کے ساتھ اطاعت کرنا ۔ ان پر نہایت ثابت قدمی سے جمے رہنا ۔ ان سے ذرا اِدھر اُدھر نہ ھٹنا ۔ ان معانی کی تائید خود وہ آیات کر رہی ہیں جنہیں اوپر درج کیا گیا ہے ۔ سورۃ بقرہ کی آیت ($\frac{۲}{۱٦۵}$) میں دیکھئے ۔ جو لوگ خدا کے علاوہ اوروں کو بھی صاحب اقتدار و اختیار مانتے ہیں (اَنْدَادًا مِنْ دُوْنِ اللّٰہِ) وہ اُن کے قوانین اور فیصلوں کی اطاعت کرتے ہیں ۔ ان کے مقابلہ میں مومنین کا شیوہ یہ ہے کہ وہ صرف قوانین خداوندی کی اطاعت کرتے ہیں اور نہایت شدت سے اطاعت کرتے ہیں ۔ لہذا اس آیت میں اللہ کی محبت کے معنے ہیں قوانین خداوندی کی اطاعت ۔ سورۃ آل عمران کی آیات ($\frac{۳}{۳۰-۳۱}$) میں اس مفہوم کی وضاحت ہو جاتی ہے ۔ ان میں اِنْ کُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰہَ کی تفسیر اَطِیْعُوْا اللّٰہَ نے کردی ہے ۔ اور

اسکے مقابل میں تَوَلَّوْا (روگردانی کرنے) کے لفظ نے اسکی مزید وضاحت کر دی ہے۔ لہذا ان آیات میں بھی خدا سے محبت سے مراد اس کے احکام کی اطاعت ہے جو اُس نظام کے مرکز کی وساطت سے کی جاتی ہے جو اُسکے قوانین کو نافذ کرنے کیلئے متشکل ہوتا ہے۔ اس کی تائید سورۃ المائدۃ کی آیات (۵/۵۴-۵۶) سے بھی ہوتی ہے۔ ان آیات میں مومنین سے کہا گیا ہے کہ تم میں سے جو کوئی اس دین سے پھر جائے تو اسے سمجھ لینا چاہئیے کہ خدا کا دین اس کی مدد کا محتاج نہیں۔ وہ یہ نہ خیال کرے کہ اس نے اس دین کو چھوڑ دیا تو اس دین کو سنبھالنے والا کوئی نہیں رہیگا۔ اللہ ان کی جگہ ایسے لوگوں کو لے آئیگا يُحِبُّهُمْ وَيُحِبُّوْنَهٗ جن سے خدا محبت رکھیگا اور وہ خدا سے محبت رکھینگے۔ یعنی وہ لوگ اپنوں کے سامنے نہایت نرم اور مخالفین کے مقابلہ میں غالب آنے والے ہونگے۔ وہ اللہ کی راہ میں مسلسل جدوجہد کرینگے اور کسی ملامت کرنے والے کی ملامت سے نہیں ڈرینگے۔ اس سے اگلی آیت میں ہے اِنَّمَا وَلِيُّكُمُ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا... (۵/۵۵)۔ "تمہارے دوست اللہ اور اس کا رسول اور مومنین ہیں"۔ اس سے واضح ہے کہ "محبت" سے مراد "ولی ہونا" ہیں۔ اس سے آگے مومنین سے کہا گیا ہے کہ تم کفار کو اپنا ولی مت بناؤ (۵/۵۷)۔ اس سے بھی "خدا سے محبت" کرنے کا مفہوم واضح ہو جاتا ہے۔ یعنی اس کی اطاعت کرنا۔

اب رہا خدا کا بندے سے محبت کرنا، تو اس کے لئے اس لفظ کے دوسرے معانی کو سامنے لائیے یعنی حفاظت کرنا۔ تھامے رکھنا۔ مضمر صلاحیتوں کا نمودار کرنا۔ اعمال کا نتیجہ خیز ہونا۔ لہذا خدا کی طرف سے محبت کے معنے ہیں اُن تمام ثمرات و نتائج کا حاصل ہو جانا جو قوانین خداوندی کی اطاعت کا فطری ماحصل ہیں۔

یہ ہے قرآنی مفہوم، انسان کے خدا سے محبت اور خدا کے انسان سے محبت کرنے کا۔ یہی مفہوم اللہ کا انسان کے ولی (دوست) ہونے یا انسان کا اللہ کا ولی ہونے سے ہے۔ (دیکھئے عنوان و-ل-ی)

حَبٌّ۔ دانہ۔ اناج۔ غلہ (۵۵/۱۲)۔ حَبَّةٌ (واحد) دانہ (۲/۲۶۱)۔

ح ب ر

اَلْحِبْرُ۔ روشنائی (جس سے لکھا جاتا ہے)۔ اَلْمِحْبَرَةُ۔ دوات۔ اَلْحِبْرِیُّ۔ روشنائی فروش۔ اَلْحِبْرُ* ۔ اہل کتاب کا عالم۔ بالخصوص یہود کا عالم۔ جمع اَحْبَارٌ (۵/۴۴)۔ اَلْحِبْرُ۔ حسن اور حسن کی رونق۔

* مطلقاً عالم کے لئے بھی بولا جاتا ہے۔ اس مادہ کے بنیادی معنوں کے لحاظ سے یہ ایسے عالم کو کہا جائیگا جو مہارت و کمال سے متصف ہو۔

اَلْحَبْرُ - سرور - خوشی - مسرت - حَبْرَۃٌ - کامل نعمت و آسائش ، فراوانی عیش - اَلْحَبْرَۃُ - جنت میں سماع - موسیقی - عمدہ نغمہ - چنانچہ قرآن میں جو ہے فَهُمْ فِیْ رَوْضَۃٍ یُحْبَرُوْنَ (۳۰/۱۵) - یا اُدْخُلُوْا الْجَنَّۃَ اَنْتُمْ وَ اَزْوَاجُکُمْ تُحْبَرُوْنَ (۴۳/۷۰) تو زجاج نے اسکی تفسیر موسیقی کے ساتھ ھی کی ہے - اس نے کہا ہے کہ لغت میں اَلْحَبْرَۃُ عمدہ گانے کو کہتے ھیں* - درحقیقت اس میں حسن و جمال اور زیبائی و رعنائی نیز خوشی اور مسرت کے تمام مظاھر آجاتے ھیں خواہ وہ جنتِ نگاہ ھوں یا فردوسِ گوش - آرٹ کے شاھکار ھوں یا حیات افروز موسیقی - ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی ایسے نشانات کے ھیں جن سے اس چیز کا حسن اور رونق نمایاں ھوں -

حَبَّرَ الْخَطَّ وَ الشِّعْرَ - اسنے خط اور شعر کو عمدہ بنایا اور مزین کردیا - تَحَبَّرَ الرَّجُلُ - آدمی حسین اور مزین بن گیا** - ثَوْبٌ حَبِیْرٌ - عمدہ اور نیا کپڑا - اَلْیَحْبُوْرُ - نرم و نازک بدن والا آدمی* - راغب نے کہا ہے کہ اَلْحِبْرُ نہایت عمدہ اور حسین اثر (نشان) کو کہتے ھیں - اَلْحَبْرُ عالم کو اسلئے کہتے ھیں کہ اس کے علم کا اثر لوگوں کے دلوں میں باقی رھتا ہے اور اس کے عمدہ آثارِ قدم کی پیروی کی جاتی ہے***-

قرآن ، کائنات کی ھر حسین شے کی تحسین (Appreciation) کے جذبہ کو ابھارتا ہے اور اس سے لطف اندوز ھونے کی تاکید کرتا ہے ، اس شرط کے ساتھ کہ انسان حدود اللہ سے تجاوز نہ کرے - ایک جنتی معاشرہ اس قسم کے حسن کا مظہر ھوتا ہے جس میں آرٹ - نغمہ وغیرہ اپنے اپنے مقام پر وجہِ شادابئی قلب ونظر بنتے ھیں - اور چونکہ اسمیں حدود اللہ کا ھر وقت خیال رکھا جاتا ہے اسلئے اس سے مضر اثرات مرتب نہیں ھونے پاتے - حسن و زیبائی کا وہ کونسا گوشہ ہے جس کا ذکر ، قرآن نے ، جنتی زندگی کے ضمن میں نہیں کیا ؟ لیکن زندگی ، جنتی بنتی اسوقت ہے جب وہ قوانینِ خداوندی کے تابع رہے -

ح ب س

اَلْحَبْسُ - روک لینا - قید کر دینا - اِحْتَبَسَہٗ - اسے روک دیا - فَاحْتَبَسَ - پس وہ رک گیا - اَلْمَحْبَسُ جانوروں کے چارہ رکھنے کی جگہ* - چھلا جو انگلیوں میں پہنا جاتا ہے** - حَبَسَہٗ عَنْہُ کے معنے اسے کسی چیز سے روکنے کے ھوتے ھیں - اور حَبَسَہٗ عَلَیْہِ کے معنے وقف کر دینے کے**-

* تاج - ** محیط - *** راغب -

قرآن کریم میں ہے - تَحْبِسُوْنَهُمَا (۵/۱۰۶) ”تم ان دونوں (گواہوں) کو روک لو“ -

ح ب ط

اَلْحَبَطُ - زخم کا نشان جو زخم اچھا ہو جانے کے بعد رہ جائے - اَلْحُبَاطُ - مویشیوں کی ایک بیماری ہے جس میں ان کا پیٹ ابھر جاتا ہے اور وہ مر جاتے ہیں - زمخشری اور ابن الاثیر نے کہا ہے کہ حَبِطَتِ الدَّابَّةُ حَبَطاً کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ جانور کسی نہایت اچھی چراگاہ میں پہنچکر بہت زیادہ کھا جائے جسے وہ ہضم نہ کرسکے - اس سے اسکا پیٹ پھول جائے اور وہ مر جائے* - ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی باطل ہو جانا اور درد و الم کے ہیں -

قرآن کریم نے حَبْطِ اَعْمَال (اعمال کے رائیگاں جانے) کی اصطلاح نہایت پر معنے طریق سے استعمال کی ہے - (۲/۲۱۷)- جانور جو کچھ کھاتا ہے وہ اگر اچھی طرح ہضم ہو کر اسکا جزو بدن بن جائے تو اس سے اسکی صحت قائم رہتی ہے اور وہ فربہ و توانا ہو جاتا ہے - لیکن اگر اسکا چارہ ہضم نہ ہو تو اسکا پیٹ پھول جاتا ہے - اس سے ایسا نظر آتا ہے کہ وہ بہت فربہ ہے لیکن یہ در حقیقت فربہی نہیں ہوتی بلکہ اسکی ہلاکت کی علامت ہوتی ہے - اسی طرح انسان بہت کام ایسے کرتا ہے جو اسے بڑے خوش آئند دکھائی دیتے ہیں اور وہ ان سے بڑے خوشگوار نتائج کی توقع وابستہ رکھتا ہے لیکن وہ در حقیقت اسکی ہلاکت کا موجب ہوتے ہیں - اسے قرآن حَبْطِ اَعْمَال سے تعبیر کرتا ہے - یعنے جن اچھے نتائج کی توقع ان سے وابستہ کی گئی ہو اُن نتائج کا مرتب نہ ہونا - حقیقت یہ ہے کہ وہی اعمال خوشگوار نتائج مرتب کرسکتے ہیں جو قوانینِ خداوندی کے مطابق صحیح نظام کے اندر رہتے ہوئے سرزد ہوں - اگر ایسا نہ ہو تو انسان کی ساری محنت اکارت چلی جاتی ہے اور نتیجہ تباہی و بربادی کے سوا کچھ نہیں ہوتا - اُولٰٓئِكَ حَبِطَتْ اَعْمَالُهُمْ فِى الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ (۲/۲۱۷) - انہی کے لئے آیا ہے - یعنی وہ جن کے اعمال دنیا اور آخرت دونوں میں رائگاں جاتے ہیں - ان کے اعمال کے صرف نشانات رہ جاتے ہیں - نتائج کچھ نہیں نکلتے - اور وقت اور توانائی، سب ضائع ہو جاتے ہیں - لہذا اچھے اعمال وہ نہیں جنہیں ہم اپنے تصوّر یا عقیدہ کے مطابق اچھے سمجھ لیں - اچھے اور برے اعمال کا معیار، اللہ کی کتاب

* تاج و محیط -

ہے ۔ جو اعمال اس کی رو سے اچھے نہیں وہ کبھی اچھا نتیجہ نہیں پیدا کر سکتے خواہ ہم انہیں کتنا ہی اچھا کیوں نہ سمجھیں اور کتنی ہی اچھی نیت سے انہیں کیوں نہ کریں ۔ کائنات کی میزان میں فیصلے انسانوں کے اپنے عقیدوں اور تصوروں کے مطابق نہیں ہوتے ۔ خدا کے اٹل معیاروں کے مطابق ہوتے ہیں ۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن نے نہ صرف اچھے اعمال کی نشاندہی کر دی ہے بلکہ اس کے ساتھ یہ بھی بتا دیا ہے کہ ان کا نتیجہ کیا نکلیگا تاکہ ہم قدم قدم پر اس کا محاسبہ کرتے جائیں کہ ہم صحیح راستے پر جا رہے ہیں یا نہیں ۔ اگر ہمارے اعمال کے وہ نتائج نہیں برآمد ہوتے جو قرآن کریم نے بتا رکھے ہیں تو ہمیں یہ سمجھ لینا چاہئے کہ وہ اعمال قرآن کریم کے مطابق سرزد نہیں ہو رہے ۔ اگر ہم ایسا نہ کریں اور اپنی خوش فہمی کے ماتحت ان اعمال کو ویسے ہی کرتے جائیں تو یہ سب رائگاں جائینگے ۔ فَحَبِطَتْ اَعْمَالُهُمْ فَلَا نُقِيْمُ لَهُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ وَزْنًا ۔ (۱۸/۱۰۵) "سو ان کے اعمال بے نتیجہ رہ گئے ۔ لہذا ہم ان کے لئے ظہور نتائج کے وقت میزان تک کھڑی نہیں کرینگے" ۔ ان کے تولنے کی ضرورت ہی نہیں ہوگی ۔ غور کیجئے کہ ہمارے کسقدر اعمال ہیں جو یوں بے نتیجہ چلے جا رہے ہیں اور ہم کبھی رک کر نہیں سوچتے کہ ایسا کیوں ہو رہا ہے، حالانکہ خدا کی کتاب (اعمال کے نتائج کی زندہ کسوٹی) ہمارے پاس ہے

جیسا کہ پہلے کہا گیا ہے ، ابن فارس نے کہا ہے کہ اس مادہ کے بنیادی معنی نہ صرف باطل ہونے کے ہیں بلکہ اس کے ساتھ الم و تکلیف کے بھی ہیں ۔ یعنی اعمال کا محض رائیگاں جانا ہی نہیں بلکہ ان کا الم و تکلیف کا موجب بن جانا بھی ۔ خود یہی احساس کیا کم الم و تکلیف کا موجب ہے کہ جن کاموں کے متعلق سمجھا جاتا تھا کہ ان کے نتائج ایسے خوشگوار مرتب ہونگے ، وہ آخرالامر بے نتیجہ ثابت ہوں ؟

ح ب ک

اَلْحَبْکُ ۔ کس کر باندھنا اور مضبوط کرنا ۔ اَلْحُبْکَةُ ۔ ازار باندھنے کی جگہ ۔ تَحَبَّکَ تَحَبُّکًا ۔ اسنے کمر پر ازار باندھ لیا ۔ اَلْحُبْکَةُ ۔ وہ رسی جو کمر پر باندھی جائے ۔ اَلْحُبُکُ مِنَ السَّمَاءِ ۔ ستاروں کے راستے ۔ حُبُکُ الرَّمْلِ ۔ ریت کی لہریں ۔ فراء نے کہا ہے کہ حَبْکٌ کسی چیز کے بل کھا کر مڑ جانے یا ٹوٹ جانے کو کہتے ہیں ۔ چنانچہ اَلْحُبُکُ

منَ الشَّعْرِ ان گھونگھریالے بالوں کو کہتے ھیں جو بل کھا کر ٹوٹے پڑے ہوں ۔ اور اَلْحَبْکُ کے معنے کاٹ ڈالنے اور گردن اڑا دینے کے ھیں* ۔

قرآن کریم میں وَالسَّمَاءِ ذَاتِ الْحُبُکِ (۵۱/۷) آیا ھے ۔ یعنی راستوں والا آسمان ۔ وہ بلند فضا جس میں مختلف اجرام فلکی اپنے اپنے راستوں میں چلتے اور مڑتے رھتے ھیں ۔ اور اگر اسکے معنے مضبوطی کے لئے جائیں تو اس سے مفہوم ہوگا ایسی بلند فضا جسمیں تمام اجرام اپنے اپنے دوائر میں نہایت مضبوطی سے بندھے ہوئے ھیں اور وہ ادھر ادھر نہیں ہو سکتے ۔ چنانچہ اَلْحَبَاکُ لکڑیوں کے اس گٹھے کو کہتے ھیں جسے مضبوطی سے اسطرح باندھا جائے کہ کوئی لکڑی اپنی جگہ سے ھلے نہیں** ۔ اور اگر اسکے معنے ٹوٹنے کے لئے جائیں تو مفہوم ہوگا ان اجرام فلکی والی فضا جسمیں مختلف اجرام اپنے اولین ھیولے سے ٹوٹ کر چکر کاٹ رہے ھیں ۔

ابن فارس نے کہا ھے کہ اس کے بنیادی معنوں میں کسی چیز کا تسلسل، درازی اور مضبوطی شامل ھیں ۔ اس اعتبار سے وَالسَّمَاءِ ذَاتِ الْحُبُکِ کے معنی ہونگے ایسی بلندی (فضا) جس میں اجرام فلکی کے لئے لمبے لمبے راستے ہوں ۔

ح ب ل

اَلْحَبْلُ ۔ باندھنے کی چیز ۔ رسی ۔ اسکی جمع حِبَالٌ* ھے ۔ حَبَلَہٗ ۔ اسے رسی سے باندھ دیا* ۔ سورۃ طٰہٰ میں حِبَالُھُمْ آیا ھے (۲۰/۶۶) جسکے معنے ''رسیاں'' ھیں ۔ نیز اَلْحَبْلُ کے معنے عہد، ذمہ اور امان کے ھیں ۔ سورۃ آل عمران میں ھے وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰہِ جَمِیْعًا (۳/۱۰۲) ۔ ''تم سب کے سب حبل اللہ کو تھامے رکھو'' ۔ اس کے ساتھ متمسک رھو ۔ اس میں، صاحب تاج العروس کے نزدیک، حَبْلٌ کے معنے عہد کے ھیں ۔ صاحب کتاب الاشتقاق نے بھی اسکی تائید کی ھے ۔ ابن فارس نے کہا ھے کہ اس کے بنیادی معنی کسی شے کی درازی پر دلالت کرتے ھیں ۔ راغب نے کہا ھے کہ ھر وہ چیز جس سے کسی دوسری چیز تک پہنچا جائے حَبْلٌ کہلاتی ھے ۔ اس لئے اس آیت میں حَبْلُ اللّٰہِ کے معنے ھیں وہ چیز جو تمہیں خدا تک پہنچادے، یعنے قرآن کریم ۔ ابوعبیدہ نے کہا ھے کہ اَلْاِعْتِصَامُ بِحَبْلِ اللّٰہِ کے معنے اتباع قرآن کریم ھے ۔ ابن مسعود نے حَبْلُ اللّٰہِ کے معنے قرآن کریم

* تاج ۔ راغب ۔ محیط ۔ ** تاج ۔

ہی لئے ہیں ۔ ابن عرفہ نے کہا ہے کہ دوسری جگہ قرآن کریم میں ہے اِلَّا بِحَبْلٍ مِّنَ اللّٰہِ وَ حَبْلٍ مِّنَ النَّاسِ ($\frac{3}{111}$) جسکے معنے ہیں خدا کی ذمہ داری یا لوگوں کی دی ہوئی ذمہ داری ۔ اسلئے ($\frac{3}{102}$) میں بھی حَبْلُ اللّٰہِ کے معنے خدا کی ذمہ داری کے ہیں* ۔

لیکن اسکے معنے رسّی لیں یا ذریعہ ۔ ذمہ لیں یا عہد ۔ بات ایک ہی ہے ۔ خدا سے ہمارا تعلق قرآن کریم کی رو سے ہے ۔ یہی وہ رسی ہے جو اسکی طرف سے ہم تک آئی ہے اور جس سے ہم ایک دوسرے کے ساتھ بندھے رہ سکتے ہیں (کیونکہ آیت کا اگلا حصہ ہے وَلَا تَفَرَّقُوْا اور اس سے آگے مومنین کو ایک امت بنکر رہنے کی تاکید کی گئی ہے دیکھئے $\frac{3}{103}$; $\frac{3}{109}$) لہذا حَبْلُ اللّٰہِ کے معنے ہیں وہ نظامِ اجتماعی جو قرآن کریم کی بنیادوں پر قائم ہو اور جسکا مقصد ، وحدتِ ملت اور اطاعتِ قوانین الٰہیہ ہو ۔

قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ کے متعلق ہے وَ نَحْنُ اَقْرَبُ اِلَیْہِ مِنْ حَبْلِ الْوَرِیْدِ ($\frac{50}{16}$) "ہم ، انسان سے حَبْلُ الْوَرِیْدِ سے بھی زیادہ قریب ہیں" ۔ فراء نے لکھا ہے کہ حَبْلٌ اور وَرِیْدٌ کے ایک ہی معنے ہیں ۔ یعنے رگِ جان ۔ شدتِ قرب کی بناپر دونوں الفاظ آئے ہیں* ۔ اس قربِ خداوندی کی تشریح آیت کے پہلے حصہ میں یہ کہکر کر دی گئی ہے ۔ وَ نَعْلَمُ مَا تُوَسْوِسُ بِہٖ نَفْسُہٗ ($\frac{50}{16}$) "ہم اسکے وساوسِ نفس تک سے بھی واقف ہیں" ۔ یعنے اسمیں علم الٰہی کی طرف اشارہ ہے جس پر قانونِ مکافات عمل کا مدار ہے ۔ انسان کا کوئی عمل ، حتّٰکہ اس کے دل میں گذرنے والا خیال تک بھی خدا کے قانونِ مکافات کے احاطہ سے باہر نہیں رہ سکتا ۔ مَا یَلْفِظُ مِنْ قَوْلٍ اِلَّا لَدَیْہِ رَقِیْبٌ عَتِیْدٌ ($\frac{50}{18}$) نے اسکی مزید وضاحت کردی ہے ۔ یعنی انسان کی ہر بات پر ایک نگہبان (چوکیدار ۔ محاسب) موجود ہوتا ہے ۔ یہ ہے خدا کے رگِ جان سے بھی قریب تر ہونے کا مفہوم ۔ یعنی خدا کا قانونِ مکافات جو انسان کے دل میں گذرنے والے خیالات کو بھی محیط ہے ۔

ح ت م

حَتَمَہٗ و حَتَمَ بِکَذَا ۔ یَحْتِمُ ۔ حَتْمًا ۔ اس نے کسی بات کا فیصلہ کر دیا ۔ اسے طے کر دیا ۔ حَتَمَ عَلَیْہِ الْاَمْرَ ۔ اس پر کوئی بات واجب اور لازم کردی ۔ اَلْحَاتِمُ ۔ فیصلہ کرنے والا ۔ فیصلہ کو کسی پر واجب اور لازم کرنے والا*** ۔

* تاج ۔ ** محیط ۔ *** تاج و محیط

قرآن کریم میں ہے کَانَ عَلٰی رَبِّکَ حَتْمًا مَّقْضِیًّا (۱۹/۷۱) "یہ تیرے رب پر لازم ہے۔ اس کا فیصلہ ہو چکا ہے"۔

ابن فارس نے کہا ہے کہ یہ کوئی بنیادی لفظ نہیں بلکہ اس میں تاء کاف سے بدلی ہوئی ہے۔ یعنی حَتَمَ اصل میں حَکَمَ تھا جس کے معنی فیصلہ کرنے کے ہیں۔

حَتّٰی - (حرف)

حَتّٰی - حسب ذیل معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔

(۱) "یہاں تک کہ"۔ قَالُوْا لَنْ نَّبْرَحَ عَلَیْهِ عٰکِفِیْنَ حَتّٰی یَرْجِعَ اِلَیْنَا مُوْسٰی (۲۰/۹۱)۔ "انہوں نے کہا کہ ہم اس کے ساتھ چمٹے رہینگے تا آنکہ موسیٰ ہماری طرف واپس نہ آجائے"۔ یعنی اسوقت تک ہم ایسا کئے جائینگے جب تک.......

(۲) بعض اوقات اس کے معنی "تاکہ" بھی ہوتے ہیں۔ جیسے بعض کے نزدیک اس آیت میں آیا ہے۔ وَلَا یَزَالُوْنَ یُقَاتِلُوْنَکُمْ حَتّٰی یَرُدُّوْکُمْ عَنْ دِیْنِکُمْ اِنِ اسْتَطَاعُوْا (۲/۲۱۷)۔ "اور یہ لوگ تم سے ہمیشہ جنگ کرتے رہینگے تاکہ اگر انہیں اسکی طاقت ہو تو تمہیں تمہارے دین سے پھرا دیں"۔ یعنی ان کے جنگ کرنے کا مقصد یہ ہے۔

(۳) بعض اوقات اِلَّا کے معنوں میں بھی آتا ہے۔ تاج العروس اور محیط المحیط میں ابن مالک کے حوالہ سے اسکی مثال میں یہ شعر نقل کیا گیا ہے۔

لَیْسَ الْعَطَاءُ مِنَ الْفُضُوْلِ سَمَاحَةً
حَتّٰی تَجُوْدَ وَ مَا لَدَیْکَ قَلِیْلٌ

ضرورت سے زیادہ مال میں سے کچھ دیدینا سخاوت نہیں ہے۔ مگر یہ کہ تمہارے پاس جو کچھ مال ہو وہ تھوڑا ہو اور تم پھر بھی سخاوت کرو۔

بعض اوقات یہ وَ (اور) کے معنوں میں بھی آتا ہے۔ مثلاً اس آیت میں۔ فَاِذَا لَقِیْتُمُ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا فَضَرْبَ الرِّقَابِ حَتّٰی اِذَا اَثْخَنْتُمُوْهُمْ .... (۴۷/۴)۔ "سو جب تم کفار کے مقابل آؤ تو ان کی گردنیں مارو۔ اور جب تم ان پر غالب آجاؤ تو......" (اس میں شبہ نہیں۔ کہ یہاں حَتّٰی کے معنی تاآنکہ بھی ہو سکتے ہیں لیکن "اور" سے بھی معنی واضح ہوجاتے ہیں)۔

(۵) بعض اوقات یہ محض ابتدائے کلام (بات شروع کرنے) کے لئے آتا ہے - جیسے حَتّٰی اِذَا اَتَوْا عَلٰی وَادِ النَّمْلِ .... (۲۷/۱۸) - ''پھر حال - غرض ، جب وہ وادیٔ نمل میں آئے تو .... '' یعنی حَتّٰی سے ایک بالکل نئی بات شروع ہوئی ہے - سابقہ بات سے اسکا تعلق نہیں -

ح ث ث

حَثَّهٗ یَحُثُّهٗ حَثًّا - جلدی کرانا - جلدی کا تقاضا کرنا (لگاتار) حَثَّهٗ عَلَيْهِ - اسے کسی کام پر ابھارا ، اکسایا ، برانگیختہ کیا - اَلْحَثِيْثُ - تیز رفتار - اپنے کام میں چست* - قرآن کریم میں لیل و نہار کے متعلق ہے یَطْلُبُهٗ حَثِيْثًا (۷/۵۴) - یعنے وہ (دن) اس (رات) کے پیچھے نہایت تیزی سے مسلسل چلا آ رہا ہے - حریری نے خلیل کے حوالہ سے لکھا ہے کہ حَثٌّ اور حَضٌّ مرادف الفاظ ہیں - فرق یہ ہے کہ حَثٌّ چلنے میں جلدی کرانے اور برانگیختہ کرنے کو کہتے ہیں اور حَضٌّ دوسرے کاموں پر ابھارنے اور جلدی کرانے کو* -

ح ج ب

حَجَبَ - یَحْجُبُ - ڈھانپنا - چھپانا - اَلْحِجَابُ - وہ چیز جو بطور پردہ کے استعمال کی جائے** - وَ بَيْنَهُمَا حِجَابٌ (۷/۴۶) - ''ان دونوں کے درمیان پردہ ہوگا'' - لیکن راغب نے لکھا ہے کہ اسکے معنے ایسی روک کے ہیں جو ایک چیز کے دوسری چیز تک پہنچنے میں حائل ہو*** - یعنے اہل جہنم کا عذاب ، جنت والوں تک نہیں پہنچ سکے گا اور اہل جنت کی لذات سے اہل جہنم محروم ہونگے - ''محروم'' کے معنوں میں سورۃ تطفیف میں ہے اِنَّهُمْ عَنْ رَّبِّهِمْ يَوْمَئِذٍ لَّمَحْجُوْبُوْنَ (۸۳/۱۵) - ''وہ اس دور میں خدا کے عطایا سے محروم ہونگے '' ، اپنے اعمال کی وجہ سے - نواب صدیق حسن خاں نے لکھا ہے کہ جن الفاظ میں حاء اور جیم اکٹھے آئیں ان کا مفہوم منع کرنا اور روکنا ہوتا ہے - ابن فارس نے بھی اس کے بنیادی معنی روکنے کے لکھے ہیں -

اَلْحَاجِبُ مِنَ الشَّمْسِ وَ الْقَمَرِ - چاند اور سورج کا کنارہ جو پہلے پہل نمودار ہو** -

---

* تاج و محیط - ** تاج - *** راغب -

ح ج ج

اَلْحَجُّ ۔ ارادہ کرنا ۔ قصد کرنا ۔ حَجَجْتُ فُلَانًا ۔ میں نے اسکا قصد کیا ۔ بعض علمائے لغت نے کہا ھے کہ اس کے معنے کسی باعظمت شے کا قصد کرنا یا بکثرت قصد کرنا ھیں* ۔ اسی لئے مکہ معظمہ کا سفر کرنے کے قصد کو حَجٌّ کہا جانے لگا ۔ اَلْحِجَّةُ ایک سال کو بھی کہتے ھیں* ۔ اسکی جمع حِجَجٌ ھے ۔ سورۃ قصص میں ھے ثَمٰنِيَ حِجَجٍ (۲۸/۲۷) یعنی آٹھ سال ۔

اَلْحَجُّ کے معنے روکنا بھی ھیں ۔ حَجَّهٗ عَنِ الشَّيْءِ ۔ اس کو اس چیز سے روک دیا ۔ منع کر دیا ۔ اسی سے اس کے معنے جھگڑا کرنے کے آتے ھیں ۔ اَلْمُحَاجَّةُ ۔ آپس میں ایک دوسرے سے جھگڑا کرنا* ۔ اسکی اصل یہ ھے کہ جھگڑا کرنے والوں میں سے ھر فریق دوسرے کو اس کے ارادے سے باز رکھنے کی کوشش کرتا ھے ۔ فَاِنْ حَآجُّوْكَ (۳/۱۹) "اگر یہ تجھے تیرے ارادے سے روکیں"۔ نیز (۶/۸۱) ۔ حُجَّةٌ ۔ دلیل ۔ محیط میں ھے کہ دلیل کو بَيِّنَةٌ اسلئے کہتے ھیں کہ اس سے بات واضح اور صاف ھو جاتی ھے اور حُجَّةٌ اسلئے کہتے ھیں کہ اس سے فریق مقابل پر فتح حاصل ھو جاتی ھے** ۔

سورۃ انعام میں قرآنی دلائل و احکام کو اَلْحُجَّةُ الْبَالِغَةُ (۶/۱۵۰) کہا گیا ھے ۔ حج کعبہ کیلئے لفظ حَجّ (۲/۱۹۶) میں آیا ھے ۔ اسی طرح (۳/۹۶) میں حِجُّ الْبَيْتِ کہا گیا ھے ۔ اَلْحَاجُّ (۹/۱۹) حج کرنے والا ۔

حج ، عالم اسلامی کا وہ عالمگیر اجتماع ھے جو اس اُمت کے مرکز محسوس (کعبہ) میں اس غرض کیلئے منعقد ھوتا ھے کہ ملت کے تمام اجتماعی امور کا حل قرآنی دلائل و حجت کی رو سے تلاش کیا جائے اور اسطرح یہ اُمت اپنے فائدے کی باتوں کو اپنی آنکھوں کے سامنے دیکھ لے ۔ لِيَشْهَدُوْا مَنَافِعَ لَهُمْ (۲۲/۲۸) "تاکہ یہ اپنے فائدے کی باتوں کو اپنے سامنے محسوس شکل میں دیکھ لیں"۔ نظام کے قیام کے لئے مرکزی اجتماعات نہایت ضروری ھوتے ھیں ۔ غور کیجئے ۔ قرآن نے اُس زمانے میں مشاورتی نظام (۴۲/۳۸) اور اس کے لئے اجتماعات کا تصور دیا جب ساری دنیا پر بادشاھی نظام مسلط تھا اور دنیا اسے خدا کی رحمت سمجھتی اور بادشاہ کو "ایشور کا اوتار" اور

* تاج ۔ ** محیط ۔

خدائی اختیارات (Divine Rights) کا حامل خیال کرتی تھی ۔ صلٰوۃ کے مقامی اجتماعات سے لیکر حج کے عالمگیر اجتماع تک ہر اجتماع کی غرض یہ ہے کہ اُمت کے نمائندے باہمی مشاورت سے قرآنی نظام کے استحکام اور نوعِ انسان کی بہبود کے سامان و ذرائع پر غور کریں ۔ (مزید تفصیل "قبلہ" کے عنوان میں ملیگی)

ح ج ر

حَجْرٌ ۔ پتھر (جمع اَحْجَارٌ وحِجَارَۃٌ) اَلْحِجْرُ (حاء کی تینوں حرکات زبر زیر پیش کے ساتھ) منع کرنا ۔ روکنا ۔ حفاظت کرنا ۔ حِجْراً مَحْجُوْراً (۲۵/۲۲) کے معنے روک کے ھیں ۔ حَجْرَۃٌ ۔ اونٹوں کا باڑہ ۔ کمرہ ۔ جمع حُجُرَات (۴۹/۴) اَلْحِجْرُ ۔ عقل جو انسان کو روکتی ہے (۸۹/۵)۔ نواب صدیق حسن خان نے لکھا ھے کہ جن الفاظ میں حاء اور جیم اکٹھے آئیں ان کے معنوں میں روکنے اور منع کرنے کا مفہوم پایا جائے گا* ۔

حِجْرٌ ۔ قوم ثمود کی بستیوں کو کہتے تھے کیونکہ وہ پہاڑوں میں پتھر تراش کر بنائی گئی تھیں ۔ حَنْجَرَۃٌ ۔ حلق ۔ اسکی جمع حَنَاجِرُ ھے ۔ (۳۳/۱۰ ؛ ۴۰/۱۸) ۔ حَجَرٌ ۔ سونے اور چاندی کو بھی کہتے ھیں ۔ اور ایسے آدمی کو بھی جو بہت ھوشیار اور چالاک ھو* ۔

قرآن کریم میں النار کے متعلق ہے کہ وَقُوْدُھَا النَّاسُ وَالْحِجَارَۃُ (۲/۲۴) ۔ "جسکا ایندھن انسان اور پتھر ھیں"۔ راغب نے کہا ھے کہ اس سے مراد ایسے لوگ ھیں جو حق کے قبول کرنے میں ایسے سنگدل ھوں جیسے پتھر ۔ انہی کے متعلق ذرا آگے چل کر کہا گیا ھے کہ ثُمَّ قَسَتْ قُلُوْبُکُمْ مِنْ بَعْدِ ذَالِکَ فَھِیَ کَالْحِجَارَۃِ اَوْ اَشَدُّ قَسْوَۃً (۲/۷۴) ۔ "پھر اسکے بعد تمہارے دل سخت ھوگئے، سو وہ پتھر کی طرح ھیں بلکہ سختی میں ان سے بھی بڑھکر"۔ یعنے جن میں سمجھنے سوچنے اور اثر پذیری کی صلاحیت باقی نہیں رھی ۔ یا جن کی صلاحیتوں کی نشو و نما رک چکی ھے ۔ یا ، اَلنَّاسُ کے معنے ھونگے عام لوگ (جو بڑے بڑے لوگوں کے پیچھے چلتے ھیں) اور حِجَارَۃٌ کے معنے ھونگے وہ چالاک اور ھوشیار لوگ جو لیڈر بنکر عوام کو اپنے پیچھے لگا لیتے ھیں ۔ اس لحاظ سے آیت کے معنی یہ ھونگے کہ غلط راستے پر چلنے والے عوام اور خواص (لیڈر اور ان کے متبعین) سب جہنم میں ھونگے ۔ اس کی تائید قرآن کریم کے دوسرے مقامات سے ھو جاتی ھے (مثلاً ۱۴/۲۱ ؛ ۳۳/۶۷) اور اگر اسکے معنے سونے چاندی کے لئے جائیں تو اسکے معنے ھونگے سرمایہ

*تاج و محیط ۔

پرستی جو ایک جہنمی معاشرہ پیدا کردیتی ہے ، کیونکہ سورۃ توبہ میں ہے کہ جو لوگ سونا اور چاندی (دولت) جمع کرتے رہتے ہیں اور اسے نوع انسانی کی ربوبیت کیلئے کھلا نہیں رکھتے تو اس دولت کو جہنم کی آگ میں تپایا جائیگا اور اس سے انکی پیشانیوں پر اور پشت پر داغ دیا جائیگا (۹/۳۴-۳۵) ۔ لہذا جہنم کا ایندھن سرمایہ پرست اور انکی وہ دولت ہے جسے وہ نوع انسانی کی منفعت کے لئے عام نہیں کرتے بلکہ انفرادی مفاد کی خاطر جمع رکھتے ہیں ۔ لیکن اگر (۲/۲۵) میں اَلنَّارُ کے معنے جنگ کے لئے جائیں (دیکھئے عنوان ن ۔ و ۔ ر) تو اَلْحِجَارَۃُ کے معنے ہونگے وہ پتھراؤ جو اُس زمانہ میں مخالفین پر کیا جاتا تھا (جیسا کہ سورۃ فیل میں ۱۰۵/۴ آیا ہے) ۔ اس صورت میں آیت کے معنے یہ ہونگے کہ تم لوگ جب علم و بصیرت کی رو سے بات کا فیصلہ نہیں کرنا چاہتے تو اسکا نتیجہ جنگ ہوگی جو انسانوں کے ہاتھوں سے اور ان پتھروں کے ذریعوں سے بھڑکائی جائیگی جو فریق مخالف کی تباہی کیلئے برسائے جاتے ہیں ۔ یہ جنگ ، نظامِ خداوندی کی حامل جماعت اور مخالفین کے درمیان بھی ہوسکتی ہے اور مخالفین کی باہمی جنگ بھی (جس کیلئے دیکھئے ۶/۶۵ ؛ ۶/۱۳۰ ؛ ۲۹/۸۲-۸۳) ۔ نظام خداوندی کی حامل جماعت کو جنگ اسلئے کرنی پڑتی ہے کہ دنیا سے خود جنگ کا خاتمہ ہو جائے (۴۷/۴) ۔

سورۃ انعام میں ہے حِجْرٌ لَا یَطْعَمُھَا (۶/۱۳۹) ۔ یعنے ممنوع ۔ جسکے کھانے کی عام اجازت نہو ۔

حُجُوْرٌ کے معنے ہیں حفاظت ۔ (۴/۲۳) ۔ حِجْرٌ کے معنی گود بھی ہیں ۔*

ح ج ز

حَجَزَہٗ ۔ یَحْجُزُہٗ ۔ حِجَازَۃً ۔ منع کرنا ۔ روک دینا ۔ اصل میں حَجَزَ الْبَعِیْرَ کے معنے ہوتے ہیں اونٹ کو بٹھا کر اس کی ٹانگوں کے نچلے جوڑوں کو رسی سے باندھ کر اس رسی سے اسکی کمر باندھ دینا تا کہ وہ ہل نہ سکے اور اسطرح اسکی پشت کے زخم کا علاج کیا جا سکے ۔ اَلْحِجَازُ اس رسی کو کہتے ہیں جس سے اونٹ کو اسطرح باندھا جائے ۔ کمر بند کو بھی کہتے ہیں ۔ حِجَازٌ کو اسلئے حِجَازٌ کہتے ہیں کہ یہ علاقہ نجد اور تہامہ کے درمیان روک ہے** ۔

---

* تاج و لین ۔ ** تاج و محیط و راغب

اَلْحَجْزُ - دو چیزوں کے درمیان روک اور حد فاصل بنانے کو کہتے ھیں* - ابن فارس نے اس کے بنیادی معنی دو چیزوں کے درمیان حائل ھونا لکھے ھیں -

قرآن کریم میں حَاجِزاً (۲۷/۶۱) کا لفظ روک کیلئے آیا ھے - دوسری جگہ حَاجِزِیْنَ (۶۹/۴۷) آیا ھے جسکے معنے روکنے والے یا منع کرنے والے، ھیں -

نواب صدیق حسن خان نے لکھا ھے کہ جن الفاظ میں حاء اور جیم اکٹھے آئیں ان میں روکنے اور منع کرنے کا مفہوم پایا جائیگا -

ح د ب

اَلْحَدَبُ - سینہ اور پیٹ کا اندر گھس جانا اور کمر کا کوب نکل آنا - حَدِبَ یَحْدَبُ حَدَباً کبڑا ھوجانا - اَلْحَدَبُ - بلند (مرتفع) زمین** - زمین کا سخت اور بلند حصہ*** - ابن فارس نے کہا ھے کہ اس کے بنیادی معنی کسی چیز کے بلند ھونے کے ھیں -

قرآن کریم میں یا جوج و ماجوج کے متعلق ھے وَ ھُمْ مِنْ کُلِّ حَدَبٍ یَنْسِلُوْنَ (۲۱/۹۶) - '' وہ سطح مرتفع (بلند زمین) سے نہایت تیزی سے اچھل کر نکل پڑینگے '' - اسکی تشریح کیلئے عنوان (ا - ج - ج) میں لفظ یَاجُوْجُ دیکھئے -

ح د ث

اَلْحَدِیْثُ - قدیم کی ضد ھے - نئی بات - ابن فارس نے لکھا ھے کہ اس کے بنیادی معنی عدم سے وجود میں آنے کے ھیں - حَوَادِثُ - نئے نئے واقعات جو سامنے آتے رھیں - اَلْاَحْدَاثُ - شروع سال میں ھونے والی بارشیں - حَدِیْثُ السِّنِّ - کم عمر نوجوان - اَحْدَثَہٗ - اس نے کسی کام کو (جو پہلے نہیں تھا) پہلی بار کیا -

اِحْدَاثٌ - وجود میں لانا - اَلْمُحَدَّثُ - صادق اور سچا آدمی - اَلْمُحَدِّثُ - حدیث بیان کرنے والا****- مُحْدَثٌ - جو قائم بذاتہ نہو***- نئی رونما ھونے والی بات - جو بات پہلی بار وجود میں آئے - جس کی پہلے نظیر نہ ھو - نیز جس بات کو آئے ھوئے زیادہ عرصہ نہ گذرا ھو - قرآن میں مُحْدَثٌ کا لفظ انہی معنوں میں آیا ھے (۲۱/۲ ; ۲۶/۵) -

* تاج و محیط و راغب - ** تاج و راغب - *** محیط - ****تاج -

سورۂ کہف میں ہے اُحْدِثَ لَکَ (۱۸/۷۰) - "میں خود ہی پہل کرکے تجھ سے بات کروں"۔ سورۂ طٰہٰ میں قرآن کریم کے متعلق ہے یُحْدِثُ لَہُمْ ذِکْرًا (۲۰/۱۱۳) - اسکے یہ معنے بھی ہیں کہ یہ قرآن کریم لوگوں کو رفعت و بلندی عطا کردیگا۔ (دیکھئے عنوان ذ-ک-ر) اور یہ بھی کہ یہ ان کے سامنے نصیحت کی باتیں یا اقوام عالم کے تاریخی نوشتے لائیگا جس سے ان کی سمجھنے کی قوتیں بیدار ہوجائینگی۔ دونوں صورتوں میں اِحْدَاثٌ کے معنے وجود میں لانے کے ہیں - سورۃ الضّحٰی میں ہے وَ اَمَّا بِنِعْمَۃِ رَبِّکَ فَحَدِّثْ (۹۳/۱۱) - یہاں تَحْدِیْثٌ کے معنے ہیں عام چرچا کرنا - "تو اپنے رب کی نعمتوں کا عام چرچا کرتا رہ"۔ اَحَادِیْثُ ** (واحد حَدِیْثٌ) قصّے۔ داستانیں - باتیں - (۱۲/۶) - افسانے (۲۳/۴۴) - جیسا کہ اوپر کہا جا چکا ہے، ابن فارس نے کہا ہے حَدَثَ کے معنی ہیں کسی ایسی چیز کا وجود میں آنا جو پہلے موجود نہ تھی۔ اسی سے اَلْحَدِیْثُ ہے کیونکہ وہ ایسی بات ہوتی ہے جس سے ایک کے بعد دوسری بات پیدا ہوتی چلی جاتی ہے بات میں سے بات نکلتی جاتی ہے - افسانہ در افسانہ -

شرعی اصطلاح میں اَلْحَدِیْثُ اس قول یا عمل کو کہتے ہیں جسے رسول اللہؐ کی طرف منسوب کیا گیا ہو - (واضح رہے کہ حدیث کی تفصیلی تعریف طویل ہے - ہم نے اسے یہاں مختصر الفاظ میں بیان کیا ہے)۔ قرآن میں یہ لفظ اس معنی میں نہیں آیا -

ح د د

اَلْحَدُّ - اس مادہ میں اصلی معنے روکنے اور منع کرنے کے ہیں* - حَدَّ الرَّجُلَ عَنِ الْاَمْرِ - آدمی کو اس معاملہ سے روکا - منع کیا - حَدَدْتُ فُلَانًا عَنِ الشَّرِّ - میں نے فلاں کو شر سے روکا - اَلْحَدَدُ روک - رکاوٹ - ھٰذَا اَمْرٌ حَدَدٌ - یہ امر ممنوع ہے - اَلْحَدُّ - ایک چیز کو دوسری چیز سے ممیز کرنا - نیز وہ شے جو دو چیزوں کے درمیان فصل بن جائے تا کہ ایک چیز دوسری چیز سے مل نہ جائے - یا ایک چیز دوسری چیز تک پہنچ نہ جائے اَلْحَدِیْدُ - لوہا - کیونکہ یہ اپنی سختی کی وجہ سے روک بن جاتا ہے (خصوصاً دشمن سے) - نیز تیز یا آرپار ہو جانے والی چیز کو بھی کہتے ہیں - حَدَّ - دھار تیز کرنا - اَلْمُحَادَّۃُ - آپسمیں دشمنی کرنا، اور ایک دوسرے کی مخالفت

* محیط - **فراء کے نزدیک احادیث در اصل اُحدوثہ کی جمع ہے جو قیاس کے مطابق ہے لیکن بعد میں یہ حدیث کی جمع بن گئی -

کرنا ۔* در اصل اس کے معنی ھیں ایک دوسرے کو روکنے اور باز رکھنے کی کوشش کرنا ۔ سورۃ احزاب میں تیز زبانی (یا طعن و تشنیع) کیلئے بِالْسِنَۃٍ حِدَادٍ آیا ھے (۳۳/۱۹) اس میں حِدَاد، حَدِیْدٌ کی جمع ھے یعنی تیز زبانوں سے ۔ سورۃ قٓ میں ھے فَبَصَرُکَ الْیَوْمَ حَدِیْدٌ (۵۰/۲۲) ۔ جسکے معنی ایسی نگاہ کے ھیں جو حقیقت پر پڑے ھوئے پردوں سے آرپار گزر کر سب کچھ دیکھ لے ۔ جسکے سامنے چھپی ھوئی چیزیں آجائیں ۔ اس میں ظہورِ نتائج کے وقت کی کیفیت کا ذکر ھے جب نگاھیں اتنی تیز ھو جائینگی کہ وہ اعمال کے اندر چھپے ھوئے نتائج و عواقب کو بے نقاب دیکھ لینگی ۔ سورۃ الحدید میں کتاب (ضابطہ قوانین) کی عملی تنفیذ کیلئے حَدِیْدٌ (فولاد) کے نازل کرنے کا ذکر ھے جسکے معنی قوت (یا شمشیر) کے ھیں ۔ (۵۷/۲۵) ۔ سورۃ مجادلہ میں ھے اِنَّ الَّذِیْنَ یُحَادُّوْنَ اللّٰہَ وَرَسُوْلَہٗ (۵۸/۵) ۔ اسکے معنی مزاحمت کرنے کے ھیں ۔ یعنی جو لوگ قانونِ مملکت کی راہ میں رکاوٹیں ڈالتے رھتے ھیں ۔ قرآن کریم میں قوانین خداوندی کیلئے متعدد مقامات پر آیا ھے تِلْکَ حُدُوْدُ اللّٰہِ فَلَا تَقْرَبُوْھَا (۲/۱۸۷) ۔ ''یہ اللہ کی حدود ھیں جن کے قریب مت جاؤ'' ۔ قوانین الٰہیہ کو حُدُوْدُ اللّٰہِ سے تعبیر کرنے میں ایک بہت بڑی حقیقت کی طرف اشارہ ھے ۔ قرآن کریم نے (عام طور پر) صرف اصولی احکام دئے ھیں اور یہ چیز انسانوں پر چھوڑ دی ھے کہ وہ اپنے اپنے زمانے کے تقاضوں کے مطابق ان اصولوں کی روشنی میں جزئی قوانین ایک نظام کے تابع خود مرتب کریں ۔ قرآن کے اصول تو غیر متبدل رھینگے لیکن ان کے اندر رھتے ھوئے جو جزئی قوانین بنائے جائینگے وہ حالات کی تبدیلی کیساتھ بدلتے رھینگے ۔ اسطرح انسان کو غیر متبدل حدود کے اندر سعی و عمل کی پوری آزادی رھتی ھے، جسطرح کھیل کے میدان میں چند لکیروں اور ضابطوں کے اندر ٹیم کو پوری آزادی ھوتی ھے کہ وہ اپنے اختیار و ارادہ کے مطابق کھیلے ۔ لہذا قرآن ایک ایسا نظامِ زندگی پیش کرتا ھے جس میں انسان، مستقل اقدار اور تبدیل ھونے والے تقاضے، دونوں کا ساتھ دیتا ھوا آگے بڑھتا جاتا ھے ۔ وہ نہ تو انسان کی آزادی کو قاطبۃً سلب کرتا ھے کہ اس کی ھر نقل و حرکت پر غیر متبدل پابندی عائد کر دے ، اور نہ ھی اسے ایسا بے زمام چھوڑتا ھے کہ وہ مستقل اقدار کی پابندی سے بھی بے نیاز ھو جائے ۔ یہ ھے مقصد حُدُوْدُ اللّٰہِ کا ۔ لیکن ھم نے اس حقیقت کو پس پشت ڈال کر اپنے لئے ایسے جامد احکام وضع کر رکھے ھیں جس سے اسلام ایک زندہ حرکت بننے کے

* تاج ۔

بجائے منجمد اور متحجر نظریات و رسمیات کا مجموعہ بنکر رہ گیا ہے جو زمانہ کے بڑھتے ہوئے تقاضوں کا ساتھ ہی نہیں دے سکتا۔

چند حدود (Limitations) کے اندر کھلی آزادی۔ یہ ہے قرآن کا عطا کردہ دین۔ "حدود اللہ" قوانین کی وہ آخری حدیں یا سرے ہیں جن سے تجاوز نہیں کرنا چاہئے۔

ح د ق

اَلْحَدَقَۃُ۔ آنکھ کی سیاہی جو پتلی کو گھیرے ہوئے ہوتی ہے۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی ایسی چیز کے ہیں جو کسی چیز کا احاطہ کرے، اُسے اپنے گھیرے میں لے لے۔ حَدَقُوْابِہٖ، یَحْدِقُوْنَ۔ انہوں نے اسے اپنے گھیرے میں لے لیا۔ ہر وہ چیز جو کسی دوسری چیز کو اپنی گولائی کے ساتھ گھیرے میں لے لے، اسکے لئے اَحْدَقَ بِہٖ کہتے ہیں۔آنکھ کی سیاہی کی نسبت سے حَدِیْقَۃٌ وادی کے اس گڑھے کو کہتے ہیں جو پانی کو اپنے اندر جمع کرلے۔ یا ہر نشیبی زمین کو جس میں پانی رک جائے۔ اسی طرح حَدِیْقَۃٌ اس باغ کو کہتے ہیں جسکے چاروں طرف دیوار ہو۔ جسکے گرد دیوار نہ ہو اسے حَدِیْقَۃٌ نہیں کہتے۔ نیز اس میں گھاس کا ہونا بھی ضروری ہے۔ اگر گھاس نہ ہو تو اسے رَوْضَۃٌ کہینگے *۔ اسکی جمع حَدَائِقُ ہے۔

قرآن کریم میں حَدَائِقَ ذَاتَ بَھْجَۃٍ (۲۷/۶۰) آیا ہے۔ یعنی خوشنما باغات۔ یہاں اس سے مراد عام باغات ہیں۔

ح ذ ر

حِذْرٌ۔ حَذَرٌ۔ خوف زدہ کرنے والی چیز سے بچنا۔ محتاط رہنا۔ اجتناب کرنا۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی بچاؤ اور چوکنا رہنے کے ہیں۔ چنانچہ رَجُلٌ حَذِرٌ، اس شخص کو کہتے ہیں جو سخت احتیاط کی وجہ سے جاگتا رہے۔اِبْنُ اَحْذَارٍ، اس شخص کو کہتے ہیں جو بہت ہی محتاط ہو۔حَذَارِ حَذَارِ کے معنے ہیں۔ بچو، بچو **۔اَلْحَاذِرُ اس شخص کو کہتے ہیں جو ہتھیار لگا کر جنگ کیلئے بالکل مستعد ہو*۔اس کی جمع حَاذِرُوْنَ ہے۔ وَ اِنَّا لَجَمِیْعٌ حٰذِرُوْنَ (۲۶/۵۶) کے معنے اسلحہ بند لشکروں کے ہیں۔ سورۃ بنی اسرائیل میں اِنَّ عَذَابَ رَبِّکَ کَانَ مَحْذُوْرًا (۱۷/۵۷) کے معنے ہیں خدا کا عذاب (یعنی انسان کی غلط روش کا تباہ کن نتیجہ) فی الواقعہ ایک ایسی چیز ہے جس سے محتاط رہنے کی بڑی ضرورت ہے۔ سورۃ

* تاج و راغب و محیط ** تاج و محیط

بقرہ میں فَاحْذَرُوْہُ (۲/۲۳۵) کے معنے ھیں قانون خداوندی کی نگہداشت اور پاسداری رکھو۔ سورۃ زمر میں بندہ مومن کے متعلق ھے یَحْذَرُ الْاٰخِرَۃَ (۳۹/۹) وہ آخرت (مستقبل) کی زندگی کی نگہداشت رکھتا ھے۔ سورہ مائدہ میں فَخُذُوْہُ کے مقابلہ میں فَاحْذَرُوْا آیا ھے (۵/۴۱) جس کے معنے کسی شے سے محترز رھنے کے ھونگے۔ سورۃ بقرہ میں حَذَرَ الْمَوْتِ (۲/۱۹ ؛ ۲/۲۴۳) کے معنے ھیں موت سے بچنے کی خاطر۔ سورۃ نساء میں خُذُوْا حِذْرَکُمْ (۴/۷۱) میں تمام حفاظتی تدابیر آ جاتی ھیں، بیدارمغزی کے ساتھ۔

حَذَّرَہٗ تَحْذِیْرًا اسے چوکنا کیا، خبردار کیا۔ محتاط رھنے کے لئے کہا۔ حَذَّرَہٗ مِنْ اَمْرٍ یا حَذَّرَہُ الْاَمْرَ۔ اس نے اُسے اُس بات سے محتاط رھنے کے لئے کہا (یا تاکید کی)۔ قرآن کریم میں ھے یُحَذِّرُکُمُ اللّٰہُ نَفْسَہٗ (۳/۲۸) "خدا تمہیں اپنے (قانونِ مکافات کے عواقب سے) محتاط رھنے کی تاکید کرتا ھے۔ یہ وھی بات ھے جو اوپر یوں کہی گئی ھے کہ اِنَّ عَذَابَ رَبِّکَ کَانَ مَحْذُوْرًا (۱۷/۵۷) "یقیناً تیرے رب کا عذاب (غلط اعمال کے نتائج) ایسی چیز ھے جس سے محتاط رھنے کی ضرورت ھے"۔

ح ر ب

اَلْحَرْبُ۔ صاحب محیط کے نزدیک اس مادہ میں اصل معنے ویرانی۔ تباھی و بربادی۔ تلف۔ سلب و نہب کے ھیں*۔ نواب صدیق حسن خاں نے لکھا ھے کہ جن الفاظ میں حاء اور راء اکٹھے آئیں ان میں مشقت اور سختی کا مفہوم ھوتا ھے۔ جیسے اَلْحَرْبُ۔ ابن فارس نے لکھا ھے کہ اس کے بنیادی معنی چھیننے کے ھیں۔ یہ لفظ سِلْمٌ (امن وصلح) کی ضد ھے۔ یعنے لڑائی**۔ حَارَبَہٗ۔ اس سے لڑائی کی، نیز یہ لفظ سرکشی اختیار کرنے کے معنوں میں بھی آتا ھے**۔ چنانچہ لِمَنْ حَارَبَ اللّٰہَ وَرَسُوْلَہٗ (۹/۱۰۷)۔ یا۔ اَلَّذِیْنَ یُحَارِبُوْنَ اللّٰہَ وَرَسُوْلَہٗ (۵/۳۳) میں اسکے معنے سرکشی اختیار کرنے ھی کے ھیں**۔ حَرْبٌ۔ جنگ (۲/۲۷۹)۔ اَلْمِحْرَابُ۔ بالا خانہ۔ بلند جگہ۔ صدر مکان۔ نیز محلات (بحوالہ کتاب الاشتقاق) کیونکہ ایسی اونچی جگہیں دراصل حرب ھی کے لئے بنائی جاتی تھیں۔ جیسے قلعوں کی برجیاں وغیرہ۔ مَحَارِیْبُ بَنِیْ اِسْرَائِیْلَ۔ بنی اسرائیل کی مساجد جن میں وہ امور حرب کے متعلق مشورے*** کیا کرتے تھے**۔ لیکن ایسا معلوم ھوتا ھے

*محیط۔ **تاج۔ ***قرآن میں مسلمانوں کے متعلق بھی اقامت صلوٰۃ کے ساتھ وامرھم شوریٰ بینھم آیا ھے (۴۲/۳۸) یعنی وہ اپنے معاملات باھمی مشورے سے طے کرتے ھیں۔ اس سے مساجد اور مشاورت کا تعلق ظاھر ھے۔

کہ مِحْرَاب ہیکل میں اس مقام کو کہتے تھے جہاں قربانیاں دی جاتی تھیں۔ یعنی قربانگاہ۔ حضرت زکریاؑ کے متعلق ہے ھُوَ قَائِمٌ یُّصَلِّیْ فِی الْمِحْرَابِ (۳/۳۸)۔ ''وہ قربانگاہ میں کھڑا مصروف صلوٰۃ تھا''۔

سورۃ سباء میں ہے کہ حضرت سلیمانؑ کیلئے مَحَارِیْبُ تیار ہوتے تھے (۳۴/۱۳) اسکے معنے مضبوط قلعے یا محلات بھی ہو سکتے ہیں اور ہیکل (مساجد) بھی۔

ح ر ث

اَلْحَرْثُ کے بنیادی معنے ہیں کچھ کمانا۔ کسب و ہنر کرنا۔ اسکے بعد یہ لفظ زمین ہر کام کرنے کیلئے عام ہوگیا۔ چنانچہ حَرْثٌ کے معنے ہیں کھیتی باڑی کرنا۔ چونکہ کام کرنے اور کمانے کیلئے تگ و تاز اور فکر و تجسس کی ضرورت ہوتی ہے اسلئے حَرَثَ الشَّیْئَ کے معنے ہیں اس نے اس بات میں تفقہ حاصل کرلیا۔ اَلْحَرْثُ کے معنے ہیں آگ کو حرکت دینا تاکہ وہ زیادہ روشن ہو جائے۔ اَلْمِحْرَاثُ اس لکڑی کو کہتے ہیں جس سے آگ کریدی جائے*۔ قرآن کریم نے عورتوں کو حَرْثٌ (کھیتی) سے تشبیہ دی ہے۔ (۲/۲۲۳) اس لئے کہ وہ افزائشِ نسلِ انسانی کا بنیادی ذریعہ ہیں۔ اس سے یہ بھی واضح ہو جاتا ہے کہ قرآن کریم کی رو سے میاں بیوی کے جنسی اختلاط سے مقصود کیا ہے۔ یعنی افزائشِ نسل۔ (مزید تفصیل ح - ص - ن اور س - ف - ح کے عنوانات میں ملیگی)

سورۃ واقعہ میں تَحْرُثُوْنَ (۵۶/۶۳) کے معنے ہیں تخم ریزی (یعنی زمین میں بیج ڈالنا)۔ اور اسکے بعد تَزْرَعُوْنَ (۵۶/۶۴) کے معنے ہیں کھیتی کا زمین سے اُگانا۔ حَرْثٌ تو انسان کے اپنے اختیار میں ہے لیکن زَرْعٌ خدا کے قانون کے مطابق ہوتا ہے۔ انسان زمین میں بیج ڈال سکتا ہے۔ اُس بیج کو زمین سے اگانا اس کے بس کی بات نہیں۔ یہ خدا کے قانون کے مطابق ہوتا ہے۔ اس لئے جو کچھ زمین سے پیدا ہوتا ہے وہ فرد متعلقہ کی محنت اور خدا کے وہبی عطیہ دونوں کا نتیجہ ہوتا ہے۔ اس میں سے فردِ متعلقہ صرف اپنی محنت کا حقدار ہو سکتا ہے۔ وہ موہبتِ خداوندی کا مالک نہیں بن سکتا۔ تفصیل کے لئے میری کتاب نظام ربوبیت دیکھئے۔ ابن فارس نے لکھا ہے کہ حَرَثَ نَاقَتَہٗ کے معنے ہیں اس نے اپنی اونٹنی کو لاغر کردیا۔ غالباً تگ و تاز اور محنت کی بنا پر یہ معنی لئے گئے ہیں۔

---

* تاج و محیط۔

ح ر ج

اَلْحَرَجُ - دراصل چیزوں کو اسطرح جمع کرنے کو کہتے ہیں جس سے تنگی نظر آنے لگے۔ یعنی جگہ کم ہو اور چیزیں زیادہ ہوں تو وہ جگہ تنگ نظر آنے لگ جاتی ہے ۔ چنانچہ اس مقام کو بھی کہتے ہیں جہاں بہت ہی گھنے درخت ہوں*۔ راغب نے کہا ہے کہ اس سے یہ لفظ اضطراب، بے اطمینانی اور شک کے معنوں میں استعمال ہونے لگا* ۔ جو کام دل کی کشاد سے نہ کیا جائے اسکے لئے یہ لفظ بولا جاتا ہے ۔ چنانچہ حَرَجَ الرَّجُلُ اَنْيَابَهُ کے معنے ہیں اسنے اپنے دانت پیسے* ۔ لَا حَرَجَ عَلَيْكَ ۔ تم پر کوئی مضائقہ نہیں ۔ کوئی اعتراض نہیں** ۔ اسی سے یہ لفظ گناہ کے معنوں میں بھی استعمال ہوتا ہے*** ۔

اصل یہ ہے کہ جن الفاظ میں حاء اور راء اکٹھے آئیں ان میں مشقت اور سختی کا مفہوم مضمر ہوتا ہے ۔ حَرَجٌ میں بھی یہی کیفیت پائی جاتی ہے**** ۔

سورة نساء میں ہے کہ مومنین کا شیوہ یہ ہے کہ وہ نظامِ خداوندی کی اطاعت اسطرح کریں کہ لَا يَجِدُوْا فِیْٓ اَنْفُسِهِمْ حَرَجًا (۴/۶۵) ۔ ''وہ اس اطاعت سے اپنے دل میں ذرا سی بھی کبیدگی محسوس نہ کریں '' ۔ سورة نور میں یہ لفظ قابل اعتراض بات کے معنوں میں آیا ہے (۲۴/۶۱)۔ سورة حج میں ہے وَ مَا جَعَلَ عَلَيْكُمْ فِی الدِّيْنِ مِنْ حَرَجٍ (۲۲/۷۸) ۔ '' اس نے دین کے معاملہ میں تم پر کوئی تنگی نہیں رکھی '' ۔ اسکے یہ معنی بھی ہیں کہ دین زبردستی قبول نہیں کرایا جاسکتا ۔ اسے بہ طیب خاطر اختیار کیا جائیگا ۔ لَآ اِكْرَاهَ فِی الدِّيْنِ (۲/۲۵۶) ۔ اور یہ معنے بھی کہ دین میں جن قوانین کی اطاعت کرائی جاتی ہے تو یہ اسلئے نہیں کہ تم سے کوئی بیگار لی جاتی ہے ۔ بلکہ یہ اسلئے ہے کہ خود تمہاری ذات میں وسعت اور استحکام پیدا ہو ۔ لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا (۲/۲۸۶) ۔ '' اللہ کسی نفس کو کسی کام کے لئے مکلف نہیں ٹھہراتا بجز اس کے کہ اس سے مقصد خود اس ذات (نفس) میں وسعت پیدا کرنا ہوتا ہے '' ۔ یاد رکھئے ۔ '' دین میں تنگی نہیں '' سے مراد یہ نہیں کہ آپ دین (نظام) کے اندر بھی رہیں اور اسکے بعد جن باتوں میں آسانی محسوس کریں انہیں مانیں اور جن میں کچھ گرانی نظر آئے انہیں یہ کہکر چھوڑ دیں کہ دین میں تنگی نہیں ۔ جبتک آپ اس نظام کے اندر ہیں

---

* تاج ۔ ** محیط ۔ *** راغب ۔ **** العلم الخفاق ۔

اسکے تمام قوانین و ضوابط کو بہ طیب خاطر ماننا ہوگا ۔ جسوقت آپ اسمیں تنگی محسوس کریں اس نظام کے دائرے سے باہر نکل جائیں ۔ نظام کے اندر رہتے ہوئے نظام کے ہر حکم اور ضابطہ کی پابندی لازمی ہو گی ۔ یہ جبر نہیں بلکہ ایسی پابندی ہے جسے انسان خوش دلانہ اور رضاکارانہ اپنے اوپر خود عائد کرتا ہے ۔ یعنی اس کا بہ طیب خاطر دین قبول کر لینا اس امر کا اقرار ہے کہ وہ دین کی عائد کردہ پابندیوں کو اپنے اوپر لازم قرار دیگا ۔ دین میں تنگی نہ ہونے سے یہ مراد ہے ۔

ح ر د

حَرَدَهٗ ۔ یَحْرِدُهٗ ۔ حَرْدًا اس نے اسکا قصد کیا ۔ اس نے اسے روکا اور منع کیا ۔ اَلْحُرُوْدُ کے معنے الگ تھلگ رہنے کے ہیں ۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنے (۱) ارادہ کرنا (۲) غصہ ہونا اور (۳) ایک طرف کو ہو جانا ، ہیں ۔ رَجُلٌ حَارِدٌ ۔ الگ رہنے والا آدمی ۔ غضبناک آدمی کو بھی کہتے ہیں * ۔ قرآن میں باغ والوں کی مثال کے ضمن میں کہا ہے وَغَدَوْا عَلٰی حَرْدٍ قٰدِرِیْنَ ($\frac{۶۸}{۲۵}$) ۔ اسکے یہ معنی بھی ہو سکتے ہیں کہ وہ اپنے مقصد کی تکمیل پر قادر تھے ۔ اور یہ بھی کہ وہ اسکی قوت رکھتے تھے کہ غریبوں اور مسکینوں کو اپنے باغ میں آنے سے روک دیں ۔ سیاق عبارت کی رو سے دوسرے معنے زیادہ مناسب نظر آتے ہیں ۔

نواب صدیق حسن خان نے کہا ہے کہ جن الفاظ میں حاء اور راء اکٹھے آئیں ان میں مشقت اور سختی کا پہلو ہوتا ہے ۔ مثلاً اَلْحَرَدُ ۔ غضب اور غصہ ۔

ح ر ر

اَلْحَرُّ ۔ اَلْحَرُوْرُ ۔ الحرارۃ ۔ گرمی ۔ الحَرُوْرُ ۔ (دھوپ کی) تپش (قرآن میں یہ لفظ ظِلٌّ کے مقابلہ میں آیا ہے $\frac{۳۵}{۲۱}$) ۔ اَلْحَرِیْرُ ** ۔ ریشمی کپڑا ($\frac{۲۲}{۲۳}$) ۔ راغب نے لکھا ہے کہ ہر باریک کپڑے کو حَرِیْرٌ کہتے ہیں ۔ اس مادہ کے معنی ہیں کسی چیز کا اس انداز سے خالص ہونا کہ اس میں کسی قسم کی آمیزش نہ ہو ** ۔

اَلْحُرُّ ۔ عَبْدٌ کی ضد ہے ۔ مرد آزاد بمقابلہ غلام ۔ ہر چیز کا بہترین حصہ ۔ عمدہ گھوڑا ۔ عام زمین اور ریتلی زمین میں سے بہترین زمین ۔

---

* تاج و راغب ۔ ** تاج ۔

حُرٌّ كُلِّ اَرْضٍ - ہر زمین کا بہترین حصہ۔ مَا هٰذَا مِنْكَ بِحُرٍّ۔ یہ بات تمہاری طرف سے اچھی نہیں ہے*

حَرَّ - يَحَرُّ - آزاد ہونا - اَلتَّحْرِيْرُ - (باندی اور غلام کو) آزاد کرنا - تَحْرِيْرُ الْكِتَابِ میں اگرچہ تحریر کے معنے اس اعتبار سے آزاد کرنا ہو سکتے ہیں کہ انسان اپنے خیالات کو ذہن کی قید سے آزاد کرکے صفحہ قرطاس پر لے آتا ہے لیکن صاحب تاج کے خیال میں اس سے مراد کتاب کے حروف کو خوبصورت بنانا اور اسکے اغلاط کو درست کرنا ہیں۔ یعنی بہتر بنانا۔*

تَحْرِيْرُ الْوَلَدِ - کسی بچہ کو معبد یا خانقاہ کی خدمت کے لئے وقف کر دینا - سورہ آل عمران میں ہے کہ حضرت مریم کی والدہ نے کہا تھا اِنِّي نَذَرْتُ لَكَ مَا فِي بَطْنِي مُحَرَّرًا (۳/۳۴) - "جو کچھ میرے پیٹ میں ہے اسے میں نے معبد کی خدمت کے لئے وقف کرنے کی منت مانی ہے"۔ اس میں مُحَرَّرٌ کے یہی معنے ہیں - اس میں یہ شرط ہوتی ہے کہ وہ بچہ اپنی ساری عمر اس خدمت کو چھوڑ نہیں سکتا تھا - یعنی وہ عمر بھر کے لئے کنیسہ کی خدمت کے لئے وقف ہو جاتا تھا*۔ چنانچہ اب بھی عیسائیوں کی (Nuns) کو عمر بھر غیر شادی شدہ رہ کر اپنے آپ کو کلیسا کی خدمت کے لئے وقف رکھنا پڑتا ہے۔ اس حقیقت کو سامنے رکھنے سے وہ تمام مقامات واضح ہو جاتے ہیں جن میں یہودیوں نے حضرت مریم کو مورد طعن و تشنیع بنایا تھا۔ حضرت مریم کو کنیسہ کی خدمت کے لئے بطور (Nun) وقف کر دیا گیا تھا۔ معلوم ہوتا ہے کہ جس وقت حضرت مریم کی والدہ نے انہیں ہیکل کی نذر کیا تھا اس وقت ابھی ہیکل کے دستور میں یہ چیز داخل نہیں تھی کہ ہیکل کی خدمت گار لڑکی کو عمر بھر تجرد کی زندگی بسر کرنی ہوگی۔ یہودیوں نے بعد میں یہ قاعدہ وضع کر لیا (جو پھر عیسائیوں میں بھی جاری رہا۔ اور اب تک جاری ہے) حضرت مریم نے خدا کے حکم کے مطابق (انسانوں کے اس خود ساختہ مستبد) قاعدے کو ٹھکراتے ہوئے شادی کر لی اور خانقاہ کو چھوڑ کر تاہل کی زندگی بسر کرنا شروع کر دی۔ یہودیوں کے خود ساختہ ضابطہ خانقاہیت کی رو سے ان کا یہ عمل بہت بڑا جرم تھا اور "دین" سے سرکشی کے مرادف۔ اس لئے یہودیوں کے احبار و رہبان ان کے پیچھے پڑ گئے۔ یہ تھا حضرت مریم کا جرم۔ (تفصیل ان امور کی میری کتاب "شعلۂ مستور" میں ملے گی)۔

* تاج

ح ر س

حَرَسَہٗ ۔ یَحْرِسُہٗ وَیَحْرُسُہٗ ۔ اس نے اس کی حفاظت کی ۔ اَلْحَرَسِیُّ ۔ سرکاری چوکیدار اور محافظ ۔ حَرَسَ الرَّجُلُ ۔ اس آدمی نے چوری کی ۔ اَلْحَرِیْسَۃُ ۔ مسروقہ شے * ۔

قرآن کریم میں ہے حَرَسًا شَدِیْدًا (۷۲/۸) یعنی سخت پہرے دار ۔ حَرَسٌ اور حُرَّاسٌ ۔ حَارِسٌ کی جمع ہے جس کے معنے کسی جگہ کے محافظ کے ہیں ۔ حِرْزٌ ،، سامان کی حفاظت کو کہتے ہیں اور حَرْسٌ جگہ کی حفاظت کو ۔ **

اس میں سختی اور مشقت کا پہلو مضمر ہوگا کیونکہ اس لفظ میں حاء اور راء اکٹھے آئے ہیں ۔ اور یہ ان کا خاصہ ہے *** ۔

ح ر ص

اَلْحَرْصُ کے معنے ہیں کسی چیز میں چھید کر دینا ۔ کسی چیز کو پھاڑ دینا یا چھیل دینا ۔ جسطرح دھوبی کپڑے کو پتھر پر مار مار کر اس میں سوراخ کر دیتا ہے یا پھاڑ دیتا ہے ۔ چنانچہ ثَوْبٌ حَرِیْصٌ اس طرح پھاڑے ہوئے کپڑے کو کہتے ہیں ۔ اَلْحَارِصَۃُ ۔ اس بادل کو کہتے ہیں جو اپنی بارش سے زمین میں سوراخ کر دے ۔ یا اس کی بالائی سطح کو کھرچ دے ۔ اَلْحَرْصَۃُ ۔ تھنوں کا اسطرح پھٹ جانا کہ دودھ کی دھاریں منتشر ہو کر برتن میں گریں **** ۔

ان بنیادی معانی کے پیش نظر حِرْصٌ ایسی شدید آرزو کو کہتے ہیں (خواہ وہ اچھی چیز کی ہو اور خواہ بری چیز کی) جو دل کے آر پار ہو جائے ۔ دل میں نہ ٹھہرے اور اس کا بار بار اظہار کیا جائے ۔ یعنے نہایت شدید خواہش ۔* ابن فارس نے یہ دونوں اس کے بنیادی معنی لکھے ہیں ۔

قرآن کریم میں ہے وَلَتَجِدَنَّھُمْ اَحْرَصَ النَّاسِ عَلٰی حَیٰوۃٍ (۲/۹۶) ،، تو دیکھیگا کہ ان لوگوں کے دلوں میں زندہ رہنے کی خواہش بہت زیادہ ہے ،، ۔ دوسری جگہ نبی اکرمؐ کے متعلق ہے ۔ حَرِیْصٌ عَلَیْکُمْ (۹/۱۲۸) ۔ ازہری نے کہا ہے کہ حَرِیْصٌ عَلَیْکَ کے معنے اہل عرب کے نزدیک حَرِیْصٌ عَلٰی نَفْعِکَ ہوتے ہیں* ۔ یعنے اس کے دل میں

*تاج ۔ ** راغب ۔ *** العلم الخفاق ۔ **** تاج و محیط ۔

تمہاری منفعت کی آرزو نہایت شدید ہے ۔ یعنی عَزِیْزٌ عَلَیْہِ مَا عَنِتُّمْ (۹/۱۲۸) "جو تمہیں دکھ پہنچتا ہے وہ اس پر شاق گزرتا ہے" منفیانہ پہلو ہے ، اور حَرِیْصٌ عَلَیْکُمْ "وہ تمہاری منفعت کی شدید آرزو رکھتا ہے" اس کا مثبت پہلو۔

ح ر ض

اَلْحَرَضُ ۔ بگاڑ ۔ خواہ جسم میں ہو خواہ عقل میں* ۔ تھکا ہوا کمزور آدمی جو بالکل تباہی کے قریب ہو نیز جسے غم وعشق نے گھلا ڈالا ہو (۱۲/۸۵)**۔ناقابل اعتناء چیز جسمیں کوئی خوبی باقی نہ رہ گئی ہو***۔اَلْحَرِضُ ۔ جو شخص بیماری کی وجہ سے بہت کمزور اور نڈھال ہو چکا ہو۔ اور ازکار رفتہ*۔

راغب نے لکھا ہے کہ تَحْرِیْضٌ کے معنے اِزَالَۃُ الْحَرَضِ کے ہیں ۔ یعنے کسی کی کمزوری ، لاغری یا خرابی کو دور کر دینا ۔ جیسے مَرَّضْتُہٗ کے معنے مرض دور کرنے کے ہوتے ہیں***۔ لہذا حَرَّضَ کے معنی ہیں کسی شخص کو ایسے کام کے لئے برانگیختہ کرنا جو اس کے لئے حیات بخش ہو اور اگر وہ ایسے نہ کرے تو اسکی ہلاکت کا خوف ہو۔ قرآن میں نبی اکرمؐ سے کہا گیا ہے وَحَرِّضِ الْمُؤْمِنِیْنَ عَلَی الْقِتَالِ (۸/۶۵) ۔ اسکے عام معنی ہیں "تو انہیں جنگ کیلئے برانگیختہ کر" ۔ لیکن اسکے اصلی معنے ہونگے تو ان مومنین (یعنی اپنے رفقاء) کی تمام کمزوریوں اور کمیوں کو دور کردے تاکہ وہ جہادِ زندگی میں مردانہ وار شریک ہونے کے قابل ہو جائیں ۔ اسی کا نام تزکیہ ہے ۔ وَیُزَکِّیْہِمْ (۶۲/۲) یعنے نشو و نما دینا ۔ بالیدگی اور نمو پیدا کرنا ۔ کمزوری اور کمی کو رفع کرنا اس پروگرام کا پہلا مرحلہ ہوتا ہے ۔

ح ر ف

حَرْفٌ ۔ کسی چیز کا سرا ، کنارہ یا حد ۔ حَرْفُ الْجَبَلِ ۔ پہاڑ کا اوپر کا حصہ جو ایک طرف کو نکلا ہوا ہو ۔ فُلَانٌ عَلٰی حَرْفٍ مِنْ اَمْرِہٖ ۔ وہ شخص اپنے معاملہ میں ایک کنارہ پر کھڑا انتظار کر رہا ہے کہ جس طرف جانے میں اسے فائدہ نظر آئے اسی طرف چلا جائے* ۔ چنانچہ قرآن کریم میں ہے وَمِنَ النَّاسِ مَنْ یَّعْبُدُ اللّٰہَ عَلٰی حَرْفٍ (۲۲/۱۱)۔ اسکے یہ معنی ہیں کہ وہ احکام خداوندی کی اطاعت کے معاملہ میں ایک

* تاج ۔ **محیط ۔ ***راغب ۔

کنارہ پر کھڑے رہتے ہیں کہ اگر ان کی اطاعت میں فائدہ ہو تو یوں کر لیا جائے اور اگر انہیں چھوڑنے میں فائدہ نظر آئے تو چھوڑ دیا جائے۔ حَرَّفَ الشَّیْءَ عَنْ وَجْهِهٖ کے معنے ہیں کسی چیز کو اس کے صحیح رخ سے پھیر دیا ۔ بدل دیا ۔ اَلتَّحْرِیْفُ ۔ تغیر و تبدل کر دینا ۔ خواہ یہ لفظی ہو خواہ معنوی ۔ قلم پر ٹیڑھا قط لگانا۔ اِنْحَرَفَ ۔ ایک کنارہ کی طرف جھک جانا، ٹیڑھا ہو جانا* ۔ یُحَرِّفُوْنَهٗ مِنْ بَعْدِ مَا عَقَلُوْهُ (۲/۷۵) ۔ "کلام اللہ کو سمجھ لینے کے بعد اس میں تغیر و تبدل کر دیتے ہیں"۔

حَرَفَ لِعِیَالِهٖ ۔ اس نے اپنے اہل و عیال کیلئے کمائی کی* ۔ اَلْحِرْفَةُ ۔ صنعت اور پیشہ جس سے انسان اپنی معاش پیدا کرے۔ حَرِیْفُكَ تمہارا ہم پیشہ** ۔ (ہم پیشہ لوگوں میں باہمی چشمک کی وجہ سے یہ لفظ ہمارے ہاں مدمقابل یا دشمن کے معنوں میں استعمال ہوتا ہے)۔ اَلْمُحَارَفُ ۔ وہ شخص جو حصول معاش کیلئے بڑی محنت کرے لیکن اسکے باوجود اسکی آمدنی اسکے اہل و عیال کے گذارہ کیلئے کافی نہ ہو** ۔ اَلْمُحَرَّفُ ۔ وہ شخص جس کا مال جاتا رہا ہو** ۔ لہذا تحریف کے معنی اس طرح کی توجیہ و تاویل کرنا ہونگے جن سے اس کی وہ روح جاتی رہے جو در اصل اس کا رأس المال ہے ۔ خواہ یہ تحریف ، الفاظ کے رد و بدل سے ہو یا مفہوم کی تبدیلی سے۔ اہل کتاب نے اپنی آسمانی کتابوں میں جو تحریف کی ہے اس کے متعلق سورة نساء میں ہے یُحَرِّفُوْنَ الْكَلِمَ عَنْ مَّوَاضِعِهٖ (۴/۴۶) "وہ کلمات کو ان کے مقامات سے ہٹا دیتے ہیں" ۔ نیز (۵/۱۳) ۔ اس سے تحریف لفظی بھی مراد ہوسکتی ہے اور تحریف معنوی بھی ۔ اور سورة بقرہ میں ہے یَكْتُبُوْنَ الْكِتٰبَ بِاَیْدِیْهِمْ ثُمَّ یَقُوْلُوْنَ هٰذَا مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ . . . . . . (۲/۷۹) "یہ لوگ الکتاب کو اپنے ہاتھوں سے لکھتے ہیں اور پھر کہتے ہیں کہ یہ اللہ کی طرف سے ہے" اس سے تحریف لفظی مراد ہے ۔ یہود و نصاریٰ دونوں نے اپنی آسمانی کتابوں میں جس بری طرح سے تحریف کی ہے اس کی تفصیل میری کتاب "معراج انسانیت" کے پہلے باب "ظهرالفساد" میں ملیگی ۔ ان کی کوئی کتاب اپنی اصلی شکل میں کہیں موجود نہیں ۔

ح ر ق

حَرَقَ الْحَدِیْدَ بِالْمِبْرَدِ ۔ لوہے کو ریتی سے گھسا ۔ یہ اس کے بنیادی معنی ہیں (ابن فارس)۔ چونکہ اس سے حرارت پیدا ہوتی ہے اس لئے اس کے

* تاج ۔ ** تاج و محیط ۔

معنے آگ میں ڈال کر جلا دینے کے ہیں۔ اَلْحَرَقُ۔ آگ کا شعلہ یا آگ۔ اَلْحَرِقَةُ۔ آگ۔ اَلْحَرِیقُ مِنَ السَّحَابِ۔ سخت بجلیوں والا بادل۔* اَلْحَرِیْقُ۔ آگ***۔ نیز جلنا۔****

سورۃ آل عمران میں ہے ذُوْقُوْا عَذَابَ الْحَرِیْقِ (۳/۱۸۰)۔ "سب کچھ جلا کر تباہ کر دینے والا عذاب چکھو"۔ سورۃ انبیاء میں حضرت ابراہیمؑ کے متعلق ہے قَالُوْا حَرِّقُوْهُ (۲۱/۶۸)۔ "انہوں نے کہا کہ اسے جلا ڈالو"۔ اِحْتَرَقَ۔ جل جانا (۲/۲۶۶)۔

چونکہ اس لفظ میں حاء اور راء اکٹھے آئے ہیں اس لئے اس کے مفہوم میں مشقت اور سختی کا پہلو ہوگا۔ یہی اس کا خاصہ ہے۔**

ح ر ک

حَرُکَ۔ یَحْرُکُ۔ حَرْکًا وَحَرَکَةً۔ ہلا، حرکت کی (سکون کی ضد ہے)۔ حَرَّکْتُهُ فَتَحَرَّکَ۔ میں نے اسے حرکت دی۔ پس وہ متحرک ہو گیا۔ یہ صرف مادی چیزوں کے ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل ہونے کے لئے آتا ہے۔ بعض اوقات تَحَرَّکَ کَذَا اس موقعہ پر بھی بولتے ہیں جب کسی چیز میں کچھ تغیر ہو جائے۔ یعنی اس کے اجزاء میں کمی بیشی ہو جائے۔*

قرآن کریم میں نبی اکرمؐ سے کہا گیا ہے لَا تُحَرِّکْ بِهٖ لِسَانَکَ لِتَعْجَلَ بِهٖ (۷۵/۱۶)۔ "اس کے لفظی معنی ہیں تو اس کے ساتھ اپنی زبان کو حرکت مت دے، تاکہ اسے جلدی لے لے"، اس کا مفہوم عام طور پر یہی سمجھا جاتا ہے کہ یہ حکم قرآن کریم کے متعلق ہے اس لئے کہ دوسرے مقام پر ہے، "وَلَا تَعْجَلْ بِالْقُرْاٰنِ مِنْ قَبْلِ اَنْ یُّقْضٰٓی اِلَیْکَ وَحْیُهٗ (۲۰/۱۱۴) یعنی جب تک (کسی ایک معاملہ کے متعلق) وحی کی پوری تعلیم سامنے نہ آ جائے اس کے عملی پروگرام میں عجلت مت کرو۔ عملی قدم اس وقت اٹھاؤ جب سارا پروگرام واضح طور پر سامنے آ جائے۔ لیکن (۷۵/۱۶) سے پہلے قرآن کا ذکر نہیں۔ انسان اور اس کے اعمال کا ذکر ہے۔ اس صورت میں، اس آیت سے نیا مضمون شروع ہوتا ہے۔ اگر ربط مضمون پیش نظر ہو تو یہ سمجھنا ہوگا کہ یہاں خطاب خود انسان سے ہے اور بات بھی اس کے اعمالنامہ سے متعلق ہے۔ (اس کی تشریح "مفہوم القرآن" میں کی جائیگی کیونکہ وہی اس کا صحیح مقام ہے۔)

* تاج۔ ** العلم الخفاق۔ *** راغب۔ **** محیط۔

ح ر م

حَرُمَتْ الشَّيْئُ حَرِیْماً وَ حِرْمَاناً ۔ اس سے کسی شے کو روک لینا ۔ اس شے کو اس تک پہنچنے نہ دینا۔ لہذا اس کے بنیادی معنے شدت کے ساتھ روک دینے یا ممانعت کر دینے کے ھیں ۔ (ابن فارس) اَلْحَرَامُ ۔ تمام وہ چیزیں جن کی ممانعت کردی گئی ھو۔ جنکے کرنے سے روک دیا گیا ھو۔ یہ اَلْحَلَالُ کی ضد ہے جسکے معنے ھیں رسیاں کھول کر رکاوٹ اور بندش کا دور کردینا ۔ اَحْرَمَ الْحَاجُّ ۔ حاجی اس حالت میں پہنچ گیا جہاں اس پر کئی ایک ایسی چیزیں ممنوع ھو گئیں جنھیں وہ پہلے کر سکتا تھا ۔ اسی کو حالت اِحْرَام کہتے ھیں ۔ اَلْحَرِیْمُ ۔ ھر حرام کی ھوئی ممنوع چیز ۔ ھر جگہ جس کی حمایت و حفاظت لازمی ھو۔ نیز ایام جاھلیت میں ان کپڑوں کو کہتے تھے جنھیں وہ لوگ طواف کعبہ کے وقت اتار دیا کرتے تھے اور ننگے حج کیا کرتے تھے ۔ یعنے ان کپڑوں کا پہننا ممنوع تھا ۔ اسی طرح اَشْھُرُ الْحُرُمِ ۔ وہ (چار) مہینے (رجب ۔ ذوالقعدہ ۔ ذوالحجۃ اور محرم) تھے جن میں جنگ کی ممانعت تھی* ۔

روکنے کے اعتبار سے حَرِیْمُ الدَّارِ ، مکان کے اس اندرونی حصہ کو کہتے ھیں جو حدبندی کرکے مکان میں داخل کر لیا گیا ھو* ۔

اَلْمَحْرُوْمُ ۔ وہ ہے جسکی ضروریات رک جائیں ۔ جسکے پاس کچھ نہ رہے* ۔ اصل میں اس میں مشقت کا پہلو مضمر ہے ۔ اس لئے کہ حَرَمٌ میں حاء اور راء اکٹھے آئے ھیں ۔ اور ان کا خاصہ ہے کہ جس لفظ میں یہ اکٹھے آئیں اس میں مشقت اور سختی پائی جائے** ۔ اسی لئے اس کے بنیادی معنی شدت کے ساتھ روکنے کے ھیں ۔ اَلْحُرْمَۃُ کے معنے ھیں وہ کام جس کا کرنا جائز نہ ھو۔ وہ پابندی جسکے توڑنے کی ممانعت ھو۔ نیز وہ ذمہ داری جس کی حفاظت لازمی ھو۔ وہ کام جسکا کرنا ضروری ھو* ۔ قرآن میں جہاں ہے تَعَالَوْا اَتْلُ مَا حَرَّمَ رَبُّکُمْ عَلَیْکُمْ اَلَّا تُشْرِکُوْا بِہٖ . . . . ($\frac{6}{152}$) ۔ تو وھاں اسکے معنے یہی ھیں کہ یہ وہ باتیں ھیں جو اللہ نے تم پر واجب قرار دی ھیں ۔ جنکی خلاف ورزی سے تمہیں روکا گیا ہے ۔

سورۃ انبیاء میں ہے وَ حَرَامٌ عَلٰی قَرْیَۃٍ اَھْلَکْنٰھَا اَنَّھُمْ لَا یَرْجِعُوْنَ ۔ ($\frac{21}{95}$) ۔ جو قوم ھمارے قانون مکافات کے مطابق تباہ و برباد

*تاج و محیط ۔ ** الملم الخفاق ۔

ہو جاتی ہے اس پر واجب ہو جاتا ہے کہ وہ پھر زندہ نہ ہو سکے*۔ یعنے اسکی بازآفرینی اسکے لئے ناممکن ہو جاتی ہے۔ یہ قوموں کی وہ آخری تباہی ہے جو مہلت کے وقفہ کے بعد عمل میں آجاتی ہے اور جس سے وہ قومیں پھر ابھر نہیں سکتیں۔ لیکن اگر اس آیت کو اس کے بعد کی آیت سے ملایا جائے جو حَتّٰی سے شروع ہوتی ہے تو اسکا مطلب یہ ہوگا کہ انکی بازآفرینی اسوقت ممکن ہوتی ہے جب وہ صورت پیدا ہو جائے جو اس آیت میں بیان کی گئی ہے۔ یا اس آیت کے معنے یہ ہونگے کہ جب ہم نے بستیوں کو ہلاک کیا تھا تو ان پر یہ سزا اس لئے واجب ہوئی تھی (حَرَامٌ عَلٰی) کہ وہ کسی طرح بھی خدا کے قانون کی طرف رجوع نہیں کرتے تھے۔ یعنی کوئی قوم مستحق ہلاکت اسوقت ہوتی ہے جب اس میں "رجعت الی اللہ" کی صلاحیت نہیں رہتی۔ (اس صورت میں اگلی آیت میں حتّٰی زائد ہوگا)

حُرُمٌ۔ حالت احرام میں (۵/۱)۔ اَلْحُرُمٰتُ۔ جن چیزوں سے منع کیا گیا ہے (۲/۱۹۴)۔

مَحْرُوْمٌ۔ جو کسی چیز سے روک دیا گیا ہو۔ حتکہ اپنی محنت کے ماحصل سے بھی۔ (۵۶/۶۷)۔ جسکی ضروریات زندگی پوری نہ ہوتی ہوں (۵۱/۱۹)
مُحَرَّمٌ۔ جو حرام یا ممنوع قرار دیا گیا ہو (۲/۸۵)۔ جیسے واجب التحریم یا واجب الاحترام بنایا گیا ہو (۱۴/۳۷)۔

حرام وحلال۔ چونکہ حرام اور حلال کے سوال کو مذہب (اور دین) میں بڑی اہمیت حاصل ہے۔ ایسی اہمیت کہ بعض اوقات یہی شے ایک مذہب اور دوسرے مذہب میں امتیازی نشان بن جاتی ہے۔ اس لئے اس کے متعلق تفصیلی گفتگو ضروری ہے۔

اللہ تعالیٰ نے انسان کو آزاد پیدا کیا ہے۔ اس کے ارشاد کے مطابق ہر ابنِ آدم۔ ہر انسان۔ محض انسان ہونے کی جہت سے واجب التکریم ہے۔ (وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِىْ اٰدَمَ۔ ہم نے بنی آدم کو تکریم عطا کی ہے (۱۷/۷۰)) اس لئے اس نے واضح الفاظ میں کہہ دیا کہ کسی انسان کو حق حاصل نہیں کہ وہ کسی دوسرے انسان کو اپنا محکوم بنائے۔ اس پر اپنی مرضی چلائے۔

* ابن قتیبہ نے بھی لکھا ہے کہ لا یرجعون میں لا زائد ہے۔ یا حرام کے معنی واجب کے ہیں۔ (القرطبی ج/۱ص ۱۳۳ ; ج/۲ص ۲۶) دوسرے معنی صحیح ہیں۔ لا زائد نہیں مانا جا سکتا۔

اسے اپنے احکام کے تابع رکھے ۔ مَا كَانَ لِبَشَرٍ اَنْ يُّؤْتِيَهُ اللّٰهُ الْكِتٰبَ وَالْحُكْمَ وَالنُّبُوَّةَ ثُمَّ يَقُوْلَ لِلنَّاسِ كُوْنُوْا عِبَادًا لِّيْ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ . . . . (۳/۷۸) "کسی انسان کو اس کا حق حاصل نہیں ، خواہ اللہ نے اسے ضابطہ قوانین ۔ یا حکومت یا نبوت ہی کیوں نہ دی ہو ۔ کہ وہ دوسرے انسانوں سے کہے کہ تم اللہ سے ورے میری محکومیت اختیار کرو"۔ لہذا قرآن کریم کی رُو سے کسی انسان کو اس کا اختیار نہیں کہ وہ دوسرے انسانوں کی آزادی پر کسی قسم کی پابندی لگائے ۔

لیکن زندگی میں بعض پابندیوں کی بھی ضرورت ہوتی ہے ۔ ان پابندیوں کی مختلف قسمیں ہیں ۔ مثلاً

(الف) ڈاکٹر مریض سے کہہ دیتا ہے کہ تم اتنے دنوں تک گوشت نہیں کھانا ۔ ظاہر ہے ڈاکٹر کے اس فیصلہ کی پابندی ، کسی کے حکم کی اطاعت نہیں ۔ یہ اس کا ایک فنی مشورہ اور مشفقانہ ہدایت ہے جسے ماننا یا نہ ماننا ہمارے اپنے بس کی بات ہے ۔ اسے ماننے سے ہمارا بھلا ہوگا ۔ نہ ماننے سے نقصان ہوگا ۔ ہم اسے بطیب خاطر مانتے ہیں ۔ اس سے ہماری آزادی سلب نہیں ہوتی ۔

(ب) ہمارے ملک کی مجلس قانون ساز جو ہمارے نمائندوں پر مشتمل ہے ، ایک قانون بناتی ہے اور حکومت اسے نافذ کرتی ہے (مثلاً یہ قانون کہ سڑک پر بائیں ہاتھ چلو) اس قانون کی پابندی بھی در حقیقت کسی دوسرے کے حکم کی پابندی نہیں ۔ ہمارے اپنے ہی فیصلہ کی پابندی ہے ۔ لہذا اس سے بھی ہماری آزادی سلب نہیں ہوتی ۔

لیکن اس کے برعکس ، ایک شخص کہتا ہے کہ اسلام کی رُو سے فلاں چیز کا استعمال حرام ہے ۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ یہ شخص نہ صرف اپنے زمانے کے کروڑھا مسلمانوں پر پابندی لگاتا ہے بلکہ قیامت تک آنے والی اُمّت مسلمہ کو اس حکم کی زنجیر میں اس طرح جکڑتا ہے کہ جو شخص اس کی خلاف ورزی کرتا ہے وہ دنیا اور آخرت دونوں میں مجرم قرار پاتا ہے ۔ ظاہر ہے کہ اس قسم کی شدید پابندی کے لئے کوئی واضح اور متعین سند (Authority) ہونی چاہئے ۔ سوال یہ ہے کہ قرآن کریم کی رُو سے یہ اتھارٹی کیا ہے ؟

قرآن کریم نے اس قسم کی پابندی کے لئے "حرام" کا لفظ استعمال کیا ہے جو "حلال" کی ضد ہے ۔ حلال کے معنی ہیں ، رسیاں کھول کر آزاد کر

دینا۔ اس لئے حرام کے بنیادی معنی ہوئے کسی کو کسی بات سے روک دینا۔ منع کر دینا۔ اس پر پابندی لگا دینا۔ قرآن کریم نے حرام اور حلال کے بارے میں واضح احکام دیئے ہیں۔

اس نے سب سے پہلے اصول یہ بیان کیا ہے کہ خوشگوار سامانِ رزق کی ہر شے حلال ہے بجز ان کے جنہیں اللہ نے حرام قرار دیا ہو۔ سورۂ بقرہ میں ہے۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا كُلُوا مِنْ طَيِّبَاتِ مَا رَزَقْنَاكُمْ وَاشْكُرُوا لِلَّهِ إِنْ كُنْتُمْ إِيَّاهُ تَعْبُدُونَ۔ إِنَّمَا حَرَّمَ عَلَيْكُمُ الْمَيْتَةَ وَالدَّمَ وَلَحْمَ الْخِنْزِيرِ وَمَا أُهِلَّ بِهِ لِغَيْرِ اللَّهِ...... (۲/۱۷۲-۱۷۳)

اے ایمان والو! جو کچھ اللہ نے بطور رزق دیا ہے اس میں سے طیبات (خوشگوار چیزوں) کو کھاؤ۔ اور اللہ کا شکر کرو۔ اگر تم صرف اسی کی محکومی اختیار کرتے ہو۔ اس نے تم پر صرف مردار اور خون* اور سور کا گوشت اور جسے اللہ کے سوا کسی دوسرے کے لئے پکارا جائے، حرام کیا ہے۔

یہاں صرف کھانے کی چیزوں کا ذکر ہے۔ سورۃ اعراف میں ان کے ساتھ اشیائے مستعملہ کا بھی اضافہ کیا گیا ہے۔ فرمایا۔

قُلْ مَنْ حَرَّمَ زِينَةَ اللَّهِ الَّتِي أَخْرَجَ لِعِبَادِهِ وَالطَّيِّبَاتِ مِنَ الرِّزْقِ...... (۷/۳۲)

(ان سے) کہو کہ وہ کون ہے جس نے زینت کی چیزوں کو جنہیں اللہ نے اپنے بندوں کے لئے پیدا کیا ہے۔ اور خوشگوار سامانِ زیست کو حرام قرار دیا ہے؟

اس سے آگے ہے:۔

قُلْ إِنَّمَا حَرَّمَ رَبِّيَ الْفَوَاحِشَ مَا ظَهَرَ مِنْهَا وَمَا بَطَنَ..... (۷/۳۳)

ان سے کہو کہ میرے رب نے صرف بے حیائی کی باتوں کو حرام قرار دیا ہے۔ خواہ وہ ظاہر ہوں یا پوشیدہ۔

---

* سورہ انعام میں دماً مسفوحاً کہہ کر اس کی تصریح کردی کہ صرف بہتا ہوا خون حرام ہے۔ (۶/۱۴۶)

ان آیات سے ظاہر ہے کہ ۔

(i) کسی شے کو حرام قرار دینے کا اختیار صرف خدا کو حاصل ہے ۔

(ii) خدا کے علاوہ اس کا حق کسی اور کو حاصل نہیں ۔

(iii) اس نے زینت کی کسی چیز کو حرام قرار نہیں دیا ۔

(iv) اشیائے رزق میں سے جنہیں حرام قرار دیا ہے ان کی خود ہی تصریح کر دی ہے ۔

ہم نے دیکھ لیا کہ انسانوں پر کسی شے کو حرام قرار دینے کا حق صرف خدا کو حاصل ہے ۔ لیکن خدا ہر شخص سے براہ راست کلام نہیں کرتا اس لئے اس نے حرام و حلال کے متعلق اپنے فیصلے وحی کی رو سے دئیے جو رسول اللہ پر نازل ہوئی تھی ۔ سورۃ انعام میں ہے ۔

قُلْ لَآ اَجِدُ فِیْ مَآ اُوْحِیَ اِلَیَّ مُحَرَّمًا عَلٰی طَاعِمٍ یَّطْعَمُهٗٓ اِلَّآ .... (۶/۱۴۶)

(اے رسول ان سے) کہدو کہ جو کچھ میری طرف وحی کیا گیا ہے میں اسمیں کسی چیز کو جو کھانے والا کھائے حرام نہیں پاتا ۔ سوائے (مردار، بہتے خون، لحم خنزیر اور اسکے جو اللہ کے سوا کسی دوسرے کے نام سے پکارا گیا ہو)

اس سے ظاہر ہے کہ خدا نے حرام و حلال کا فیصلہ اس وحی کی رو سے کر دیا ہے جو نبی اکرم کی طرف نازل ہوئی تھی ۔ یہ وہ وحی ہے جس کی تلاوت کی جاتی ہے ۔ سورۃ حج میں ہے ۔

وَ اُحِلَّتْ لَکُمُ الْاَنْعَامُ اِلَّا مَا یُتْلٰی عَلَیْکُمْ .... (۲۲/۳۰)

اور تمہارے لئے چوپائے حلال ہیں بجز ان کے جن کے متعلق تمہیں اس وحی کی رو سے بتادیا گیا ہے جو تمہیں پڑھ کر (سنائی) جاتی ہے ۔

یہ ''مَا یُتْلٰی'' وہ وحی تھی جو 'الکتاب' میں تھی ۔ سورۃ عنکبوت میں ہے اُتْلُ مَآ اُوْحِیَ اِلَیْکَ مِنَ الْکِتٰبِ (۲۹/۴۵) ''اسے پڑھ جو تیری طرف کتاب میں سے وحی کیا گیا ہے'' ۔ یہی وہ چیز ہے جس کے متعلق سورۃ آلِ عمران کی اس آیت میں جس کا پہلا حصہ سابقہ صفحات میں درج کیا گیا ہے

کہہ دیا کہ خدا کی محکومی اختیار کی جاتی ہے۔ بِمَا كُنْتُمْ تُعَلِّمُوْنَ الْكِتَابَ وَ بِمَا كُنْتُمْ تَدْرُسُوْنَ (۳/۷۸)۔ اس کتاب کے ذریعے جس کی تم تعلیم و تدریس کرتے ہو"۔ سورۃ نمل میں واضح الفاظ میں بتا دیا کہ اس سے مراد قرآن ہے۔ اِنَّمَا اُمِرْتُ ..... اَنْ اَتْلُوَ الْقُرْآنَ ... (۲۷/۹۲) "مجھے حکم دیا گیا ہے کہ میں قرآن کی تلاوت* کروں"۔

ان تصریحات سے واضح ہے کہ قرآن کی رو سے

(i) کسی شے کو حرام قرار دینے کا حق صرف خدا کو حاصل ہے اور
(ii) اسے جو کچھ حرام قرار دینا تھا اسے قرآن میں بتا دیا ہے۔

یہ تو رہا اس موضوع کا مثبت پہلو۔ یعنی کسی شے کو حرام قرار دینے کی اتھارٹی کون ہے؟ اب یہ دیکھئے کہ قرآن کریم نے اس حقیقت کو کس طرح واضح کیا ہے کہ یہ اتھارٹی خدا کے سوا اور کسی کو حاصل نہیں۔

ہم سورۃ اعراف کی وہ آیت پہلے درج کر چکے ہیں جس میں پوری تحدّی سے کہا گیا ہے کہ قُلْ مَنْ حَرَّمَ زِيْنَةَ اللّٰهِ الَّتِيْٓ اَخْرَجَ لِعِبَادِهٖ وَالطَّيِّبٰتِ مِنَ الرِّزْقِ (۷/۳۲) "ان سے کہو کہ وہ کون ہے جو زینت کی اشیاء کو جنہیں اللہ نے اپنے بندوں کے لئے پیدا کیا ہے۔ اور خوشگوار سامانِ رزق کو حرام قرار دیتا ہے؟" اس سے ظاہر ہے کہ خدا کے علاوہ اور کسی کو اس کا اختیار نہیں دیا گیا کہ وہ کسی شے کو حرام قرار دیدے۔ اس بارے میں، اور تو اور، خود نبی اکرمؐ سے کہا گیا کہ

يٰٓاَيُّهَا النَّبِيُّ لِمَ تُحَرِّمُ مَآ اَحَلَّ اللّٰهُ لَكَ ..
.... (۶۶/۱)

اے نبی جس چیز کو اللہ نے تیرے لئے حلال قرار دیا ہے،
تو اسے حرام کیوں قرار دیتا ہے؟

اس وقت ہم اس بحث میں نہیں پڑنا چاہتے کہ وہ کیا چیز (یا بات) تھی جسے نبی اکرمؐ نے اپنے اوپر ممنوع قرار دے لیا تھا (اس لئے کہ یہ گوشہ ہمارے زیرِ نظر موضوع سے خارج ہے)۔ ہم صرف یہ بتانا چاہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے یہ حق نبی اکرمؐ کو بھی نہیں دیا کہ، دوسرے انسانوں پر کسی چیز کو حرام قرار دینا تو ایک طرف، خود اپنی ذات پر بھی کسی ایسی شے کو ممنوع قرار دے لیں جسے اللہ نے حلال قرار دیا تھا۔

*تلاوت کے معنی پیروی کرنے کے بھی ہیں۔

اس مقام پر ضمناً ایک نقطہ کی وضاحت ضروری معلوم ہوتی ہے۔ قرآن میں حلال اشیاء کے ساتھ طَيِّبًا کا اضافہ کیا گیا ہے۔ مثلاً سورۃ بقرہ میں ہے يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ كُلُوْا مِمَّا فِى الْاَرْضِ حَلٰلًا طَيِّبًا۔۔۔۔۔ (۲/۱۶۸) "اے نوع انسانی! زمین کی پیداوار جو تم پر حلال کی گئی ہے۔ اسے طیّب انداز سے کھاؤ" طیب کے معنی ہیں خوشگوار۔ پاکیزہ۔ مفید۔ نفیس۔ یعنی یہ نہیں کہ ہر حلال شے کا کھانا تم پر فرض قرار دیا گیا ہے۔ ان میں سے تم اپنے ذوق اور پسند کے مطابق جسے اچھا سمجھو کھاؤ۔ جو ناپسند ہوں انہیں مت کھاؤ۔ اس میں انفرادی ذوق، میلان طبع، طبی ضرورت اور دیگر تضمنات کی رعایت رکھ دی گئی ہے۔

لیکن نبی اکرم؏ کے بارے میں اس رعایت میں بھی خاص احتیاط ملحوظ رکھی گئی ہے۔ یہ اس لئے کہ (مثلاً) زید کسی ایسی چیز کو چھوڑ دیتا ہے جو اسے ناپسند ہے، اس کے فیصلے کا اثر اس کی اپنی ذات تک محدود رہتا ہے۔ لیکن اگر نبی کسی ناپسندیدہ چیز کو چھوڑ دیتا ہے اور اس طرح چھوڑ دیتا ہے گویا اس نے اسے اپنے اوپر ہمیشہ ہمیشہ کے لئے حرام قرار دے لیا ہے، تو اس کے نتائج بہت دور رس ہوسکتے ہیں۔ ہوسکتا ہے کہ حقیقت سے ناواقف، یا عقیدتمندی میں افراط کی طرف چلے جانے والے، یہ سمجھ کر کہ اُس چیز میں کوئی دینی قباحت ہوگی، اسے اپنے اوپر مستقلاً حرام قرار دے لیں اور اس طرح، بالواسطہ (Indirectly) ہی سہی، خدا کی حلال کردہ شے، لوگوں پر حرام قرار پا جائے۔ پہلی قوموں میں ایسا ہوچکا تھا۔ اس لئے نبی اکرم؏ کی توجہ اس طرف خاص طور پر مبذول کرائی گئی۔ قرآن میں ہے کہ حضرت یعقوب؏ نے کسی شے کو اپنے لئے ممنوع قرار دے لیا۔ ان کا یہ فیصلہ محض انفرادی تھا۔ لیکن بنی اسرائیل نے اسے خدائی حکم سمجھ کر اس شے کو اپنے اوپر ہمیشہ کے لئے حرام قرار دے لیا۔ حتیٰ کہ جب انہوں نے دیکھا کہ قرآن میں جن چیزوں کو حرام قرار دیا گیا ہے ان میں اس شے کا ذکر نہیں تو انہوں نے اس پر اعتراض کیا کہ جس چیز کو پہلے (ان کے غلط خیال کے مطابق) "خدا نے حرام قرار دیا تھا"، اسے اب قرآن میں کیوں حلال قرار دیا گیا ہے۔ اس کے جواب میں قرآن نے کہا کہ۔ كُلُّ الطَّعَامِ كَانَ حِلًّا لِّبَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ اِلَّا مَا حَرَّمَ اِسْرَآءِيْلُ عَلٰى نَفْسِهٖ مِنْ قَبْلِ اَنْ تُنَزَّلَ التَّوْرٰىةُ (۳/۹۲) "یہ تمام کھانے (جواب مسلمانوں کے لئے حلال قرار دئے گئے ہیں) بنی اسرائیل کے لئے بھی حلال تھے سوائے اس کے جسے، تورات نازل ہونے سے پہلے، اسرائیل (یعقوب؏) نے

اپنے آپ پر ممنوع قرار دے لیا تھا''۔ وہ چیز خدا کی طرف سے حرام قرار نہیں دی گئی تھی۔ حضرت یعقوبؑ نے اسے، (کسی وجہ سے) از خود اپنے آپ پر ممنوع قرار دے لیا تھا۔ یہودی یہ سمجھ بیٹھے کہ خدا کے نبی نے جو اسے اپنے آپ پر ممنوع قرار دے لیا تھا تو وہ خدا کی طرف سے حرام کی گئی ہوگی۔ اس واقعہ کے پیش نظر، اللہ تعالیٰ نے نبی اکرمؐ سے خاص طور پر کہہ دیا کہ آپ نے اس چیز کو محض ذاتی بے رغبتی یا کسی اور وجہ سے چھوڑ دیا اور اسے ایک معمولی بات سمجھا (عام حالات میں یہ بات ہے بھی معمولی سی) لیکن ہوسکتا ہے کہ (یہودیوں کی طرح) آپ کی امت کے افراط پسند لوگ اسے حرام کی فہرست میں داخل کرلیں۔ اسلئے آپ کے لئے ان معاملات میں خاص طور پر محتاط رہنے کی ضرورت ہے۔

اس سے یہی واضح ہے کہ اگر نبی، اپنے ذاتی میلان یا مصلحت کی بنا پر کسی حلال شے سے مجتنب رہے تو اس کے اتباع میں اس شے کو حرام سمجھ لینا، صحیح نہیں۔ حرام وہی ہے، جسے اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب میں حرام قرار دیا ہو۔

یہ بحث نا تمام رہ جائے گی اگر ہم اس کے ساتھ سورۃ اعراف کی اس آیت کو بھی سامنے نہ لائیں جس کا صحیح مفہوم سامنے نہ ہونے کی وجہ سے انسان ایک بنیادی غلطی میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ اُس سورت میں نبی اکرمؐ کی خصوصیات کبریٰ کے ضمن میں فرمایا کہ وَ یُحِلُّ لَہُمُ الطَّیِّبٰتِ وَ یُحَرِّمُ عَلَیۡہِمُ الۡخَبٰٓئِثَ (۷/۱۵۷) ''وہ ان کے لئے طیبات کو حلال قرار دے گا اور خبائث کو حرام ٹھیرائے گا''۔ اس آیت سے یہ استنباط کیا جاتا ہے کہ حلال و حرام قرار دینے کا اختیار نبی اکرمؐ کو بھی حاصل تھا۔

سب سے پہلے تو یہ دیکھئے کہ جب

(i) اللہ تعالیٰ قرآن کے متعدد مقامات میں یہ کہتا ہے کہ حلّت و حرمت کا حق صرف خدا کو ہے اور

(ii) خود نبی اکرمؐ سے بہ نص صریح کہتا ہے کہ لِمَ تُحَرِّمُ مَآ اَحَلَّ اللّٰہُ لَکَ (۶۶/۱) ''جس چیز کو اللہ نے تیرے لئے حلال قرار دیا ہے تو اسے حرام کیوں قرار دیتا ہے''۔

تو اس کے بعد یہ سمجھنا بنیادی طور پر غلط ہے کہ حلّت و حرمت کا اختیار نبی اکرمؐ کو بھی تھا۔ اصل یہ ہے کہ جو امور وحی کی رو سے بیان ہوئے ہیں قرآن کا اسلوب یہ ہے کہ وہ انہیں کبھی اللہ کی طرف منسوب کردیتا ہے اور

کبھی رسول کی طرف (کیونکہ لوگوں تک وہ احکام رسول ہی کی وساطت سے پہنچتے تھے) اور مراد دونوں جگہ خدا کی وحی (یعنی قرآن کریم) ہوتا ہے، سورۃ بقرہ میں اس حقیقت کو واضح کر دیا گیا ہے جہاں ایک جگہ کہا ہے کہ وَ لَمَّا جَآءَ هُمْ كِتٰبٌ مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ مُصَدِّقٌ لِّمَا مَعَهُمْ ..... (۲/۸۹) "جب ان کی طرف اللہ کے ہاں سے ایک کتاب آئی جو ان باتوں کو سچ کر دکھانے والی تھی جو ان کے پاس تھیں"۔ اور دوسری جگہ ہے وَ لَمَّا جَآءَ هُمْ رَسُوْلٌ مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ مُصَدِّقٌ لِّمَا مَعَهُمْ (۲/۱۰۱) دیکھئے۔ الفاظ دونوں آیتوں میں وہی ہیں۔ فرق صرف یہ ہے کہ ایک جگہ کتاب ہے اور دوسری جگہ رسول۔ اس سے ظاہر ہے کہ جہاں تک احکام و ہدایات کا تعلق ہے، خدا، وحی، کتاب، رسول۔ ایک ہی حقیقت کے مختلف گوشے ہیں۔

اس بنیادی اصول کے بعد، اب آیتِ زیر نظر کو دیکھئے یہاں رسول کے متعلق کہا گیا ہے کہ وَ يُحِلُّ لَهُمُ الطَّيِّبٰتِ وَ يُحَرِّمُ عَلَيْهِمُ الْخَبٰٓئِثَ (۷/۱۵۷) یعنی رسول ان کے لئے طیّبات کو حلال کرتا ہے اور خبائث کو حرام قرار دیتا ہے۔ لیکن سورۃ مائدہ میں ہے۔ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تُحَرِّمُوْا مَآ اَحَلَّ اللّٰهُ لَكُمْ (۵/۸۷) "اے ایمان والو جن طیبات کو اللہ نے تمہارے لئے حلال قرار دیا ہے انہیں حرام مت کرو۔" یہاں واضح طور پر کہا گیا ہے کہ طیبات کو اللہ نے حلال قرار دیا ہے۔ (اسی) سورۃ اعراف میں ہے قُلْ اِنَّمَا حَرَّمَ رَبِّيَ الْفَوَاحِشَ ... (۷/۳۳) "اے رسول! ان سے کہہ دے کہ حقیقت یہ ہے کہ میرے رب نے تو صرف فواحش حرام کئے ہیں"۔ یہاں خود رسول اللہؐ کی زبان مبارک سے کہلوایا گیا ہے کہ کسی شے کو حرام قرار دینا خدا کا کام ہے۔ اسی طرح سورۃ بقرہ میں ہے وَ اَحَلَّ اللّٰهُ الْبَيْعَ وَ حَرَّمَ الرِّبٰوا (۲/۲۷۵) اللہ نے بیع کو حلال قرار دیا ہے اور ربٰو کو حرام"۔

لہذا، قرآن نے جہاں حلت و حرمت کو رسول اللہؐ کی طرف منسوب کیا ہے اس سے بھی مراد خدا کی وحی ہے جو قرآن میں محفوظ ہے۔

اس سلسلہ میں سورۃ توبہ کی اس آیت کا صحیح مفہوم سمجھ لینا بھی ضروری ہے جس میں کہا گیا ہے۔

قَاتِلُوا الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَ لَا بِالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَ لَا يُحَرِّمُوْنَ مَا حَرَّمَ اللّٰهُ وَ رَسُوْلُهٗ ... (۹/۲۹)

(اهل کتاب میں سے) جو لوگ اللہ اور آخرت پر ایمان نہیں
رکھتے۔ اور اللہ اور اس کے رسول نے جسے حرام ٹھہرایا ہے اسے حرام
نہیں سمجھتے۔ ان سے جنگ کرو۔

اس آیت سے بھی یہ مستنبط کیا جاتا ہے کہ حرام قرار دینے کا اختیار اللہ اور اس کے رسول دونوں کو ہے۔ اس آیت میں ،، یُحَرِّمُوْنَ مَا حَرَّمَ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ ،، سے مراد حرام قرار دینا نہیں۔ جیسا کہ پہلے بیان ہو چکا ہے حرام کا لفظ کسی بات کو واجب اور لازم قرار دینے کے معنوں میں بھی استعمال ہوتا ہے۔

اس آیت کے معنی یہ ہیں کہ جن باتوں کو اللہ اور اس کا رسول واجب قرار دیتے ہیں (ان کے کرنے کا حکم دیتے ہیں) یہ انہیں اپنے اوپر واجب نہیں قرار دیتے۔ یہ لوگ اسلامی نظام کے اندر رہتے ہوئے اس کے قوانین سے انحراف کرتے ہیں۔ ان سے جنگ کی جائے گی تا آنکہ یہ اپنی اس روش کو چھوڑ کر، اسلامی حکومت کی رعایا کی حیثیت سے رہنے پر رضا مند ہو جائیں۔

ان تصریحات سے واضح ہے کہ قرآن کریم کی رو سے

(۱) حرام و حلال کا اختیار صرف خدا کو ہے۔

(۲) جن چیزوں کو یا امور کو خدا نے حرام قرار دینا تھا ان کی تصریح قرآن میں کر دی گئی ہے۔

(۳) خدا کے علاوہ یہ اختیار کسی اور کو نہیں۔

قرآن کریم نے اس بات کو سنگین جرم قرار دیا ہے کہ جن چیزوں کو خدا نے حلال قرار دیا ہے (یعنی حرام نہیں ٹھیرایا) انہیں حرام قرار دیدیا جائے۔ اس نے تاکیداً کہہ دیا کہ

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تُحَرِّمُوْا طَيِّبٰتِ مَآ
اَحَلَّ اللّٰهُ لَكُمْ وَلَا تَعْتَدُوْا اِنَّ اللّٰهَ لَا
يُحِبُّ الْمُعْتَدِيْنَ (۵/۸۷)

اے ایمان والو! وہ پاکیزہ چیزیں جنہیں اللہ نے تمہارے لئے
حلال قرار دیا ہے انہیں حرام مت ٹھہراؤ۔ اور (اس طرح)
حد سے نہ بڑھو۔ اللہ حد سے بڑھنے والوں کو پسند نہیں
کرتا۔

یعنی حلال کو حرام قرار دینا، انسان کا اپنے اختیارات کی حد سے آگے بڑھ جانا ہے۔ اس لئے کہ جیسا کہ شروع میں کہا جا چکا ہے کسی انسان کو اس کا حق حاصل نہیں کہ وہ دوسرے انسانوں کی آزادی کو سلب کرے۔ دوسری جگہ اس سے بھی زیادہ تاکید کے ساتھ کہا کہ

وَلَا تَقُوْلُوْا لِمَا تَصِفُ اَلْسِنَتُكُمُ الْكَذِبَ هٰذَا حَلٰلٌ وَّهٰذَا حَرَامٌ لِّتَفْتَرُوْا عَلَى اللّٰهِ الْكَذِبَ ...... (۱۶/۱۱۶)

اور جو تمہاری زبانیں یونہی جھوٹ بیان کر دیتی ہیں کہ یہ حلال ہے اور یہ حرام تاکہ اللہ پر محض بہتان باندھو۔ ایسی بات مت کیا کرو۔

یہاں قرآن کریم نے بتایا کہ جو مذہبی پیشوا حرام و حلال کی فہرستیں تیار کر کے بیٹھ جاتے ہیں دل سے وہ بھی جانتے ہیں کہ یہ اختیار خدا کے سوا کسی کو حاصل نہیں۔ (یا وہ سمجھتے ہیں کہ اگر ہم نے یہ کہہ دیا کہ ہم نے ایسے حرام قرار دیا ہے تو لوگ اسے مانیں گے نہیں) اس لئے وہ یہ نہیں کہتے کہ ان چیزوں کو ہم نے حرام یا حلال ٹھہرایا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ یہ سب "شریعتِ خداوندی" کے مطابق ہے۔ اس طرح یہ لوگ خدا کی طرف ایسی باتیں منسوب کرتے ہیں جو اس نے کبھی نہیں کہیں۔ یہ افتراء ہے۔ کذب ہے۔ بہتانِ عظیم ہے۔ ان کے متعلق کہا گیا ہے کہ

قُلْ اَرَءَيْتُمْ مَّا اَنْزَلَ اللّٰهُ لَكُمْ مِّنْ رِّزْقٍ فَجَعَلْتُمْ مِّنْهُ حَرَامًا وَّحَلٰلًا قُلْ آٰللّٰهُ اَذِنَ لَكُمْ اَمْ عَلَى اللّٰهِ تَفْتَرُوْنَ (۱۰/۵۹)

ان سے کہو کیا تم اس پر غور کرتے ہو کہ اللہ نے جو کچھ تمہارے لئے بطور رزق نازل کیا ہے، تم اس میں سے کسی کو حرام قرار دیتے ہو کسی کو حلال۔ ان سے پوچھو کہ کیا اللہ نے تمہیں اس کی اجازت دے رکھی ہے (کہ جسے چاہو حرام قرار دے دو اور جسے چاہو حلال کر دو) یا تم اللہ پر افترا باندھتے ہو۔

قرآن کریم کا کہنا یہ ہے کہ اللہ نے کسی انسان کو اس کی اجازت نہیں دی کہ وہ کسی چیز کو حلال یا حرام قرار دے۔ جو شخص ایسا کرتا ہے وہ خدا پر افتراء باندھتا ہے۔

قرآن یہ بھی بتاتا ہے، کہ بعض (حلال) چیزیں یہودیوں پر بطور سزا حرام قرار دیدی گئی تھیں۔ سورۃ انعام میں ہے۔

وَعَلَى الَّذِيْنَ هَادُوْا حَرَّمْنَا كُلَّ ذِي ظُفُرٍ . . .
ذٰلِكَ جَزَيْنٰهُمْ بِبَغْيِهِمْ . . . . . ($\frac{6}{147}$)

اور ہم نے یہودیوں پر سب ناخن والے جانور (پرندے) حرام قرار دیدئے تھے۔ اور گائے اور بکریوں کی چربی بھی حرام کر دی تھی بجز اس کے جو ان کی پیٹھ کے ساتھ یا انتڑیوں کے ساتھ یا ھڈی کے ساتھ لگی ہوئی ھو۔ یہ ہم نے انہیں ان کی بغاوت کی سزا دی تھی۔

سورہٴ نسآء میں ہے

فَبِظُلْمٍ مِنَ الَّذِيْنَ هَادُوْا حَرَّمْنَا عَلَيْهِمْ طَيِّبٰتٍ أُحِلَّتْ لَهُمْ . . . . ($\frac{4}{160}$)

یہودیوں کی زیادتی کی وجہ سے ہم نے ان پر وہ خوشگوار چیزیں جو ان کے لئے حلال تھیں، حرام قرار دیدیں۔

(اس کے بعد ان کی ان زیادتیوں کی تفصیل دی گئی ہے جن کی سزا کے طور پر ان پر حلال چیزیں حرام قرار دی گئی تھیں۔ سورہٴ نحل میں کہا گیا ہے کہ یہ حکم خدا کی طرف سے ظلم نہیں تھا۔ انہوں نے خود اپنے آپ پر ظلم کیا تھا جو اس سزا کے مستوجب قرار پا گئے ($\frac{16}{118}$)۔ اس سے ظاھر ہے کہ جن چیزوں کو خدا نے حرام قرار نہیں دیا انہیں حرام قرار دیدینا، لوگوں کو سزا دینا ہے۔ یہودیوں کو اس سزا سے نجات دلانے کے لئے حضرت عیسیٰؑ تشریف لائے۔ چنانچہ آپؑ نے ان سے کہا کہ میری بعثت کا مقصد یہ ہے

وَلِأُحِلَّ لَكُمْ بَعْضَ الَّذِي حُرِّمَ عَلَيْكُمْ . . . .
. . . ($\frac{3}{49}$)

تاکہ جو چیزیں تم پر حرام قرار دیدی گئی ھیں ان میں سے بعض کو حلال قرار دوں۔

یہودیوں نے حضرت عیسیٰؑ کی مخالفت کی اور اسطرح اپنی سزا کی زنجیروں کو خود اپنے ھاتھوں سے مضبوط کرلیا۔ آپ کے بعد نبی اکرمؐ تشریف لائے اور اللہ تعالیٰ نے آپ کی بعثت کا مقصد بھی یہ بتایا کہ

وَ يُحِلُّ لَهُمُ الطَّيِّبٰتِ وَ يُحَرِّمُ عَلَيْهِمُ الْخَبٰٓئِثَ . . . . . (۷/۱۵۶)

وہ ان کے لئے پاکیزہ چیزیں حلال کریگا اور خبیث چیزوں کو حرام قرار دے گا۔

لیکن انہوں نے قرآن کی بھی مخالفت کی اور اسطرح اپنی خود ساختہ زنجیروں میں جکڑے رہنا پسند کیا جن میں وہ اب تک ماخوذ ہیں۔

اہل کتاب نے اپنے علماء اور مشائخ (احبار و رہبان) کے فتاویٰ کے مطابق حرام و حلال کی فہرستیں مرتب کر رکھی تھیں جن کے لئے خدا کی کوئی سند ان کے پاس نہیں تھی۔ باقی رہے مشرکین عرب، سو ان کے ہاں حرام و حلال کے متعلق کچھ باتیں وراثتاً چلی آتی تھیں، جو محض توہم پرستی پر مبنی تھیں۔ قرآن نے ان کی بھی مخالفت کی۔ مویشیوں میں سے فلاں حرام ہے۔ کھیتی میں سے یہ منع ہے۔ سواری کے جانوروں میں سے فلاں فلاں پر چڑھنا ناجائز ہے (۶/۱۳۹)۔ فلاں چیز مردوں کے لئے حلال ہے اور عورتوں کے لئے حرام (۶/۱۴۰)۔ اونٹنی اس قسم کا بچہ دے تو وہ حرام ہے، گائے کے فلاں فلاں بچے حرام ہیں (۶/۱۴۴)۔ ان سے کہا گیا کہ یہ سب فہرستیں تمہاری یا تمہارے آباؤ اجداد کی مرتب کردہ ہیں (۶/۱۳۹)۔ تم اللہ کی طرف ان کی نسبت یونہی کرتے ہو۔ (۶/۱۳۹)۔ اس کے بعد انہیں چیلنج دیا گیا اگر تم اپنے اس دعوے میں سچے ہو کہ یہ خدا کی طرف سے حرام کردہ ہیں تو اس دعوے کے ثبوت میں گواہ لاؤ (۶/۱۵۱)۔

ان تصریحات سے بھی واضح ہے کہ قرآن کریم کی رو سے حرام و حلال کے لئے سند صرف حکم خداوندی ہے۔ اس کے علاوہ کچھ اور سند اور کوئی اتھارٹی نہیں۔

کھانے پینے کے علاوہ، قرآن نے رشتے ناطے کے متعلق بھی بالتصریح بتا دیا ہے کہ کونسا حلال ہے اور کونسا حرام۔ سورہ نساء کی آیات ۲۲-۲۴ میں ان کی فہرست دی ہوئی ہے۔

یہ ہے قرآن کریم کی رو سے حلت و حرمت کی پوزیشن جس سے واضح ہے کہ کسی چیز کے متعلق یہ کہنے کے لئے کہ وہ حرام ہے قرآن کریم کی سند پیش کی جانی ضروری ہے۔

آخر میں اتنا اور کہہ دینا بھی ضروری ہے کہ ہو سکتا ہے کہ اسلامی نظام، کسی ہنگامی مصلحت یا ضرورت کے ماتحت، کسی شے کا استعمال

عارضی طور پر ممنوع قرار دے دے ۔ مثلاً برسات (یا ہیضہ) کے زمانہ میں ہیلتھ اوفیسر حکم دیدیتا ہے کہ شہر میں امرود یا کھیرے کا استعمال ممنوع ہے ۔ یا جنگ کے زمانے میں حکومت فیصلہ کر دیتی ہے کہ سول آبادی کے لئے فلاں چیز کا استعمال ممنوع ہے کیونکہ فوجی ضرورت شدید ہے ۔ وقس علی ذالک ۔ ہو سکتا ہے کہ سب سے پہلے اسلامی نظام نے (نبی اکرم ؐ اور خلافت راشدہ کے زمانے میں) بعض چیزوں کے استعمال کو اسی طرح ممنوع قرار دیا ہو ۔ لیکن ظاہر ہے کہ اس طرح کسی شے کے استعمال کو ممنوع قرار دینے ، اور کسی شے کو ابدی طور پر حرام قرار دینے میں بنیادی فرق ہے ۔ کسی شے کو ابدی طور پر حرام قرار دینے کا اختیار خدا کے سوا کسی کو نہیں ۔ (نیز دیکھئے عنوان ح-ل-ل اور ن-ع-م)

ح ر ی

اَلتَّحَرِّیْ ۔ قصد کرنا ۔ کسی چیز کی طلب میں کوشش کرنا ۔ کسی کام کو کرنے کا خصوصیت کے ساتھ ارادہ کرنا ۔ تَحَرَّاہُ ۔ اس نے اس کا ارادہ کیا ۔ بعض نے کہا ہے کہ بہتر اور حق چیز کی طلب میں کوشش کرنے کو کہتے ہیں* ۔ قرآن کریم میں ہے فَاُولٰٓئِکَ تَحَرَّوْا رَشَدًا (۷۲/۱۴) ۔ ”یہ لوگ ہیں جنہوں نے رشد وسعادت کے حصول کے لئے عزیمت مندانہ قصد کر لیا“ ۔

ابن فارس نے اس کے بنیادی معنی (۱) قرب و ارادہ (۲) حرارت اور (۳) لوٹ جانا یا کم ہوجانا لکھے ہیں ۔ حِرَاء مکہ میں ایک پہاڑ تھا جس کے غار میں (کہا جاتا ہے کہ) حضور ؐ قبل از نبوت (رشد و ہدایت کی طلب صادق میں) جایا کرتے تھے* یہ صرف تاریخ کا بیان ہے ۔ قرآن کریم میں اس کی صراحت نہیں ۔ قرآن کریم یہی بتاتا ہے کہ قبل از نبوت حضور ؐ تلاشِ حقیقت میں سرگرداں رہتے تھے ۔ دیکھئے عنوان ض-ل-ل)

ح ز ب

نیز اس کے معنی ورد ہیں۔ یعنی تلاوتِ قرآن کریم وغیرہ کا ایک مقررہ حصہ

اَلْحِزْبُ ۔ پانی پر اترنے کی باری ۔ لوگوں کی جماعت ، فریق ، گروہ (اسکی جمع اَحْزَابٌ ہے)اس کے لئے شرط یہ ہے کہ ان کے دل اور اعمال ایک دوسرے سے ملتے ہوں ۔ خواہ ویسے وہ ایک دوسرے سے کبھی ملے ہوں یا نہ ملے ہوں** ۔ راغب

* تاج و راغب ۔ ** تاج ۔

نے کہا ہے کہ اسکی ایک شرط یہ بھی ہے کہ ان میں سختی اور شدت پائی جائے*۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن نے حِزْبُ اللّٰہِ (۵۸/۲۲) اور حِزْبُ الشَّیْطَانِ (۵۸/۱۹) دو گروہوں کا ذکر کیا ہے ۔ حِزْبُ اللّٰہِ سے مراد وہ لوگ ہیں جو قانونِ خداوندی پر نہایت سختی سے کاربند ہوں خواہ وہ دنیا کے کسی حصہ میں ہوں ، اور حِزْبُ الشَّیْطَانِ وہ ہیں جو غیر خدائی قوانین کے مطابق زندگی بسر کرتے ہوں ، خواہ وہ کسی قوم اور کسی ملک سے متعلق ہوں ۔ قرآن کریم، قوموں کی تشکیل، نظریۂ زیست یا نصب العین حیات کی بنیادوں پر کرتا ہے نہ کہ وطن ، نسل یا زبان وغیرہ کے اشتراک پر ۔ سورۃ مومن میں اَحْزَاب (۴۰/۵) ان پارٹیوں کو کہا گیا ہے جنہوں نے خدا کے رسولوں کی مخالفت کی تھی ۔ سورۃ احزاب میں اَلْاَحْزَابُ (۳۳/۲۲) ان پارٹیوں کو کہا گیا ہے جنہوں نے مل کر رسول اللہؐ کے خلاف جنگ کی تھی ۔

قرآن کریم نے فرقہ بندی کو شرک قرار دیتے ہوئے کہا ہے کہ اس میں پھر حالت یہ ہو جاتی ہے کہ کُلُّ حِزْبٍ بِمَا لَدَیْھِمْ فَرِحُوْنَ (۳۰/۳۲)۔ ہر فرقہ مطمئن ہو جاتا ہے کہ وہ حق پر ہے (اور باقی سب فرقے باطل پر ہیں) ۔ قرآن کریم نے ’’کُلُّ حِزْبٍ‘‘ (تمام فرقے) کہکر اس حقیقت کو واضح کر دیا کہ جب دین میں فرقے پیدا ہو جائیں تو پھر یہ سمجھنا غلط ہوتا ہے کہ ان میں سے ایک فرقہ حق پر ہے اور باقی باطل پر ۔ فرقوں کا تو وجود ہی قرآن کریم کی رو سے شرک ہے ۔ (۳۰/۳۲)۔ جب تک الدین کا نظام (یعنی اسلامی مملکت کا نظام) قائم رہے ، فرقے پیدا نہیں ہو سکتے ۔ جب وہ نظام باقی نہیں رہتا تو دین ’ انفرادی چیز بن جاتا ہے جس میں فرقے پیدا ہونے لازمی ہیں ۔ جب فرقے پیدا ہو جائیں تو انہیں مٹانے کی ایک ہی شکل ہے ۔ یعنی اسلامی نظام مملکت کا قیام ۔ اس کے سوا اس ’’شرک‘‘ سے نکلنے کی کوئی صورت نہیں ہوتی ۔

ح ز ن

حَزَنٌ ۔ یہ ایک جامع لفظ ہے جو ہر اس غم و فکر اور پریشانی کے لئے بولا جاتا ہے جو انسان کو کسی وجہ سے لاحق ہو ۔ اس میں معاشی پریشانی خاص طور پر شامل ہے چنانچہ حَزَانَۃُ الرَّجُلِ ۔ انسان کے وہ متعلقین (اھل و عیال) ہیں جن کی تکلیف سے اسے پریشانی ہوتی ہو اور وہ ان کے سامانِ زیست کی

* راغب ۔

اہتمام کرے* ۔ تاج العروس میں ہے کہ سورۃ فاطر کی آیت اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ اَذْهَبَ عَنَّا الْحَزَنَ (۳۵/۳۴) ۔ میں حَزَنٌ کے معنے ہیں صبح اور شام کے کھانے کی فکر ۔ راغب نے کہا ہے کہ قرآن کریم میں جہاں لَا تَحْزَنْ یا لَا تَحْزَنُوْا کہا گیا ہے اس سے مراد یہ نہیں کہ تم فکر مت کرو، اسلئے کہ فکر پر انسان کو اختیار نہیں ہوتا ۔ اس سے مقصود یہ ہے کہ تم ان اسباب کو مت پیدا ہونے دو جن سے حُزْنٌ پیدا ہوتا ہے* ۔ یہ چیز معاشی فارغ البالی اور مرفہ الحالی سے پیدا ہوگی کیونکہ حُزْنٌ کے معنے فکر معاش سے پیدا ہونے والی پریشانی کے ہیں ۔ نیز اَلْحَزْنُ ۔ سخت پتھریلی زمین کو کہتے اس کی ضد ''سَهْلٌ'' ہے* ۔ (غالباً اسلئے کہ اس میں اناج وغیرہ پیدا نہیں ہو سکتا) ۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس مادہ میں سختی ۔ شدت اور کھردرے پن کا پہلو ہوتا ہے ۔

خَافَ کے عنوان میں آپ دیکھینگے کہ خَوْفٌ اس پریشانی کو کہتے ہیں جو کسی متوقع خطرہ سے پیدا ہو (یعنے اس کا تعلق مستقبل میں واقع ہونے والے حادثہ سے ہوتا ہے) ۔ جب ان معانی کے مقابل میں حُزْنٌ کا استعمال ہو تو اس سے مراد وہ غم ہوتا ہے جو اس حادثہ کی وجہ سے ہو جو گزر چکا ہے ۔ کسی نقصان سے پہلے جو کیفیت ہوتی ہے وہ خَوْفٌ ہے ۔ اس نقصان (یا حادثہ کے واقع ہو جانے) کے بعد خوف ختم ہو جاتا ہے اور غم یا حزن شروع ہو جاتا ہے ۔ قرآن کریم میں ہے وَلَا تَهِنُوْا وَلَا تَحْزَنُوْا وَ اَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ (۳/۱۳۸)۔ یہاں وَهْنٌ اور حُزْنٌ ۔ عظمت اور بلندی ۔ عروج و اقبال اور غلبہ و تمکن (علو) کے مقابلہ میں آیا ہے ۔

قصہ آدم میں ہے کہ جب آدم سے جنت کی زندگی چھن گئی تو اسکی بازیابی کیلئے اس سے کہا گیا کہ اگر تم وحی کے تابع زندگی بسر کروگے تو اسکا نتیجہ یہ ہوگا کہ لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ (۲/۳۸)۔ اس سے خوف اور حزن نہیں رہیگا ۔ جب یہ جنتی معاشرہ اس دنیا میں قائم ہوگا تو اسمیں (منجملہ دیگر اسباب اطمینان و آسائش) سامان معاش کی طرف سے کوئی پریشانی نہیں ہوگی ۔ یہ حُزْنٌ کے بنیادی معنے ہیں ۔ نیز جس جنت سے آدم نکلا تھا اس کی خصوصیت بھی یہ بتائی گئی ہے کہ اُس میں بھوک ۔ پیاس ۔ لباس اور مکان کیلئے کسی کو جگر پاش مشقت نہیں اٹھانی پڑتی

* تاج ۔

تھی اور نہ ھی کوئی اس سے محروم رہتا تھا ۔ (۲۰ / ۱۸-۱۹، ۱) ۔ اس سے بھی حُزْنٌ کا مفہوم واضح ھو جاتا ھے ۔ (ان امور کی تفصیل کیلئے ا ۔ د ۔ م ، ش ۔ ج ۔ ر ، ج ۔ ن ۔ ن ، کے عنوانات دیکھئیے) ۔ بہرحال یہ ظاھر ھے کہ جو قوم خوف ۔ بھوک ۔ حزن وغیرہ کی پریشانیوں میں مبتلا ھو اُسے سمجھ لینا چاھئیے کہ وہ خدا کی طرف سے ملی ھوئی راہ نمائی کا اتباع نہیں کر رھی ۔ قوانین خداوندی کے مطابق زندگی بسر کرنے کا لازمی اور حتمی نتیجہ یہ ھے کہ انسان کی یہاں کی زندگی بھی مرفہ الحالی اور سرفرازی کی ھو اور آخرت کی زندگی بھی کامیابی اور کامرانی کی زندگی۔

سورۃ یوسف میں حُزْنٌ کے معنے اس غم کے آئے ھیں جو کسی گزرے ھوئے واقعہ سے پیدا ھو (۱۲ / ۸۴) ۔ اور لَا تَحْزَنْ عَلَيْهِمْ (۱۵ / ۸۸) ۔ کے معنے ھیں ان پر غم نہ کھا ۔ تَحَزَّنَ عَلَيْهِ کے معنے ھیں وہ اس پر درد مند ھوا *۔

ح س ب

حَسَبَ يَحْسُبُ حَسْبَانًا و حِسَابًا ۔ گننا ۔ شمار کرنا ۔ حَسِبَ يَحْسَبُ مَحْسَبَةً و حِسْبَانًا ۔ خیال کرنا ۔ گمان کرنا ۔ حَسْبٌ ۔ وہ جو کافی ھو ۔ جو کفایت کرے ۔ جسکے بعد کچھ اور ضرورت نہ رھے ۔ حَاسِبٌ ۔ حساب کرنے والا ۔ حُسْبَانٌ ۔ (حِسَابٌ کی جمع) ۔ گنتی ۔ شمار ۔ حَسْبُكَ دِرْهَمٌ ۔ تمہیں ایک درھم کافی ھے ۔ حَسْبُنَا اللهُ (۹ / ۵۹)۔ ھمارے لئے اللہ (کا قانون) کافی ھے ۔ اسکے ھوتے ھوئے ھمیں کسی اور چیز کی ضرورت نہیں رھتی ۔ وہ ھماری تمام ضروریات کو پورا کر دینے کیلئے کافی ھے ۔ هٰذَا بِحَسَبِ ذَا ۔ یہ اسکے مطابق یا اسکے بقدر ھے **۔

حَسِيْبٌ ۔ حساب کرنے والا ۔ نگرانی کرنے والا ۔ كَفٰى بِنَفْسِكَ الْيَوْمَ عَلَيْكَ حَسِيْبًا (۱۷ / ۱۴) ۔ خدا کے قانونِ مکافات کی رو سے مرتب شدہ نتائج کے ظہور کے وقت کسی خارجی شاھد اور محتسب کی ضرورت نہیں ھوتی ۔ انسان کی اپنی ذات خود اپنے خلاف زندہ شاھد ھوتی ھے ۔ بَلِ الْاِنْسَانُ عَلٰى نَفْسِهٖ بَصِيْرَةٌ (۷۵ / ۱۴) اعمال کے جو اثرات اس پر مرتب ھوتے ھیں وہ اپنے منہ سے خود بول اٹھتے ھیں کہ اس نے کس قسم کے کام کئے تھے ۔ ظہور نتائج کے وقت کو يَوْمُ الْحِسَابِ یا يَوْمَ يَقُوْمُ الْحِسَابُ (۱۴ / ۴۱) کہا ھے ۔ یعنی ھر عمل کا نتیجہ تو اس کے ساتھ ھی مرتب ھونا

* محیط ۔ ** تاج و محیط ۔

شروع ہوجاتا ہے ۔ لیکن اسکی نمود ایک خاص وقت پر جا کر ہوتی ہے ۔ جیسے درخت میں پھل تو اسوقت سے بننا شروع ہو جاتا ہے جب اس میں پہلا شگوفہ (بلکہ کونپل) پھوٹتی ہے لیکن وہ پھل کی شکل میں کچھ عرصہ بعد سامنے آتا ہے ۔ اسے ظہور نتائج کا وقت کہتے ہیں ۔

سورۃ انعام میں ہے وَ الشَّمْسَ وَ الْقَمَرَ حُسْبَانًا (۶/۹۶)۔ اسی کی تشریح دوسری جگہ ان الفاظ سے کر دی ۔ لِتَعْلَمُوْا عَدَدَ السِّنِیْنَ وَ الْحِسَابَ (۱۰/۵ ; ۱۷/۱۲) چاند اور سورج کو اسلئے بنایا تا کہ انؐ سے ماہ وسال وغیرہ کا حساب رکھا جا سکے۔ اس سے ظاہر ہے کہ کیلنڈر، سورج کے حساب سے بھی رکھا جا سکتا ہے ۔ قمری اور شمسی میں سے جو زیادہ آسان اور ملی مفاد کے مطابق ہو اسے اختیار کیا جا سکتا ہے ۔

سورۃ کہف میں ہے وَ یُرْسِلَ عَلَیْھَا حُسْبَانًا مِنَ السَّمَاءِ (۱۸/۴۰) ۔ وہ کھیتی پر آسمان سے حُسْبَان بھیجدے ۔ یہاں حُسْبَان کے معنے عام طور پر بلا کے لئے جاتے ہیں ۔ یعنے کوئی آفت سماوی جس سے کھیتی تباہ و برباد ہو جائے ۔ مثلاً بارش کا طوفان ۔ آندھی ۔ جھکڑ ۔ یا ژالہ باری ۔ یا ٹڈی دل وغیرہ* ۔ لیکن (لغت حمیر میں) اسکے معنے سخت سردی کے آتے ہیں** ۔ ابن فارس نے اس کے معنی ٹڈی اور اولے دونوں لکھے ہیں ۔

اِحْتَسَبَ ۔ کے معنی گمان کرنا یا خیال کرنا ہیں*** ۔ سورۃ طلاق میں ہے ۔ وَ یَرْزُقْهُ مِنْ حَیْثُ لَا یَحْتَسِبُ (۶۵/۳) ۔ خدا کا قانون اسے ایسے مقامات سے رزق پہنچاتا ہے جو اسکے وہم و گمان میں بھی نہ ہوں ۔

سورۃ بقرۃ میں ہے وَ اللّٰهُ یَرْزُقُ مَنْ یَّشَاءُ بِغَیْرِ حِسَابٍ (۲/۲۱۲) ۔ "جو ایسا چاہتا ہے اسے اللہ بغیر حساب رزق دیتا ہے" ۔ راغب نے اسکے مختلف معانی لکھے ہیں ۔ ان میں ایک یہ بھی ہیں کہ وہ اُسے دیتا ہے لیکن اُس سے لیتا نہیں ۔ یا لوگوں کے عام اندازے اور شمار کے مطابق نہیں بلکہ اس سے کہیں زیادہ دیتا ہے **** ۔ جب معاشرہ خدا کے قانون کے مطابق متشکل ہوجائے تو اس میں رزق کی فراوانیاں عام اندازوں سے کہیں زیادہ ہوتی ہیں ۔

ح س د

حَسَدٌ ۔ کے اصلی معنے چھیلنے کے ہیں ۔ الحَسَدُ ۔ وہ ذہنیت جسکی رو سے تمنا کی جاتی ہے کہ دوسرے کے پاس جو کچھ ہے وہ اس سے چھن کر

* تاج ۔ ** غریب القرآن ۔ مرزا ابوالفضل ۔ *** محیط ۔ **** راغب ۔

مجھے مل جائے ، اور اگر مجھے نہ بھی ملے تو کم از کم اس سے ضرور چھن جائے ۔ غِبْطَۃٌ یہ ہے کہ ایسی چیز اس کے ساتھ ساتھ مجھے بھی مل جائے (اسے رشک کہتے ہیں)* ۔ راغب نے اس پر اتنا اضافہ کیا ہے کہ اس میں اس مقصد کے لئے کوشش کرنا بھی شامل ہوتا ہے ۔

سورۃ بقرۃ میں ہے کہ یہ مخالفین حَسَد کی وجہ سے اسکی انتقامی آرزو کرتے ہیں کہ تم ایمان کو چھوڑ کر پھر سے کفر اختیار کر لو ۔ یعنے ایمان کے خوشگوار نتائج تم سے ضرور چھن جائیں خواہ اس سے ان کا اپنا کچھ بھلا ہو یا نہو ($\frac{۲}{۱۰۹}$) ۔

قرآن کریم نے حَسَد کو بڑی تخریبی ذہنیت قرار دیا ہے اور اس سے، اور ایسی ذہنیت رکھنے والوں کی تخریبی کوششوں سے بچنے کی تاکید کی ہے ($\frac{۱۱۳}{۵}$) یہ بچاؤ، قانونِ خداوندی کے ساتھ گہرے تمسک (تَعَوُّذ) سے حاصل ہو سکتا ہے ۔

ح س ر

حَسَرَ ۔ یَحْسِرُ کے بنیادی معنے ہیں کسی چیز کو کھول دینا ۔ چھیل دینا ۔ کھال اتار دینا ۔ اَلتَّحْسِیْرُ کے معنے ہیں پرندے کے بال و پر گرجانا* ۔ یہاں سے اسکے معنے عاجز و درماندہ ہو جانے کے آتے ہیں ۔ حَسَرَ الْبَعِیْرَ ۔ اونٹ کو اتنا چلایا کہ وہ تھک کر عاجز و درماندہ ہو گیا ۔ اسی بنا پر اَلْحَسْرَۃُ اس کیفیت کو کہتے ہیں جس میں انسان کی حالت تھکے ماندے اونٹ کی سی ہو جائے ۔ اس میں عجز و ندامت دونوں پائے جاتے ہیں ۔ نیز غم و تاسف بھی* ۔ راغب نے لکھا ہے کہ اَلْحَسْرَۃُ کے معنے ہیں کسی چیز کے فوت ہو جانے پر غم اور شرمندگی کی حالت ۔ گویا اس شخص سے اب وہ جہالت دور ہو گئی ہے جسکی وجہ سے اس نے یہ کام کیا تھا ، اب انکشاف حقیقت ہو گیا ہے** ۔ اسی لئے صاحب محیط نے کہا ہے کہ اس مادہ کے اصلی معنے کَشْفٌ کے ہیں*** ۔ (یعنے کھول دینا) ۔ حَسَرَ الْبَحْرُ عَنِ السَّاحِلِ کے معنے ہیں دریا ساحل سے پیچھے ہٹ گیا اور پانی کے نیچے جو زمین تھی وہ کھل کر سامنے آگئی* ۔ اس میں عجز اور کشف کے دونوں پہلو ہیں ۔ سورۃ بقرۃ میں ہے یُرِیْهِمُ اللّٰهُ اَعْمَالَهُمْ حَسَرَاتٍ عَلَيْهِمْ ($\frac{۲}{۱۶۷}$) ۔ اللہ ان کے اعمال کو بے نقاب کر کے انہیں دکھا دیگا اور اس انکشاف حقیقت سے ان پر بری طرح عجز و درماندگی چھا جائیگی ۔ حَسَرَتِ الدَّابَّۃُ کے معنی ہیں

* تاج ۔ ** راغب ۔ *** محیط ۔

مینے گھر میں جھاڑو دی اور اَلْمِحْسَرَۃُ ۔ جھاڑو کو کہتے ہیں**۔ اس اعتبار سے مندرجہ بالا آیت کا مفہوم یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ان کے اعمال یکسر بے نتیجہ ہو کر رہ گئے ۔ ان کے کئے کرائے پر جھاڑو پھر گئی۔

سورۃ انبیاء میں لَا یَسْتَحْسِرُوْنَ (۲۱/۱۹) آیا ہے جسکے معنے تھک جانے کے ہیں ۔ سورۃ بنی اسرائیل میں مَلُوْمًا مَّحْسُوْرًا (۱۷/۲۹) آیا ہے ۔ یعنے درماندہ ۔ ایسی حالت جس میں تمہارے پاس کچھ باقی نہ رہے ، سب کچھ صاف ہو جائے اور تم کو اپنے کئے پر پشیمانی ہو ۔ اور (۶۷/۴) میں حَسِیْرٌ آیا ہے ۔ یعنے تھکی ماندی ۔

اَلتَّحَاسِیْرُ ۔ بلاؤں اور مصیبتوں کو کہتے ہیں ۔ حَسْرَۃٌ کے معنے سخت افسوس و ندامت اور ہاتھ سے نکل جانے والی چیز پر غم کرنے کے ہیں**۔ یَا حَسْرَتٰی (۳۹/۵۶) ۔ وائے افسوس۔

ح س س

اَلْحِسُّ ۔ حرکت ۔ خفی آواز (اس چیز کی جسے تم دیکھ نہ رہے ہو)۔ اَلْحَوَاسُّ اسی سے ہے ۔ اَحَسَّ ۔ محسوس کرنا ۔ آگاہ ہونا*۔ راغب نے کہا ہے کہ جب کوئی چیز اسطرح نمایاں اور آشکارا ہو جائے کہ وہ با آسانی محسوس کی جا سکے تو اس وقت اَحَسَّ بولا جاتا ہے ۔ فَلَمَّآ اَحَسَّ (۳/۵۱) ۔ جب اس نے محسوس کیا ۔ تَحَسَّسَ ۔ کسی کا پتہ لگانا (۱۲/۸۷)۔

حَسِیْسٌ ۔ ہلکی سی آواز ۔ آہٹ ۔ لَا یَسْمَعُوْنَ حَسِیْسَہَا (۲۱/۱۰۲) ۔

اَلْحَسِیْسُ ۔ سردی جو گھاس کو جلا دے ۔ حَوَاسُّ الْاَرْضِ ۔ سردی ۔ اولہ ۔ ہوا ۔ ٹڈی اور مویشی جو کھیتی پر تباہی لے آئیں ۔ اس سے اس کے معنے تباہی اور بربادی کے آتے ہیں ۔ چنانچہ اَلْحَاسُوْسُ قحط سالی کو کہتے ہیں*۔ سورۃ آل عمران میں ہے اِذْ تَحُسُّوْنَہُمْ (۳/۱۵۱) ۔ "جب تم انہیں ہلاک اور برباد کر رہے تھے" ۔ ابن فارس نے اَلْحَسُّ کے معنے قتل کرنے کے بھی لکھے ہیں ۔

ح س م

حَسَمَہٗ ۔ یَحْسِمُہٗ ۔ اس نے اسے قطع کر دیا ۔ حَسَمَ الْعِرْقَ ۔ اس نے رگ کو کاٹ دیا ۔ اور اس پر لوہے سے داغ لگا دیا تا کہ اسکا خون نہ

* تاج ۔ ** محیط ۔

ہیں* ۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے معنی کسی چیز کو اسکی جڑ سے کاٹ دینے کے ہیں ۔ اَلْحُسَامُ ۔ تیز کاٹنے والی تلوار ۔ اَلْحُسُوْمُ ۔ بدبختی ۔ ازہری نے کہا ہے کہ ہر اس چیز کو جو دوسری چیز کے بعد فوراً آ جاتی ہو حَاسِمٌ کہتے ہیں ، جسکی جمع حُسُوْمٌ ہے ۔ لہذا اسکے معنے ہیں پے در پے اور مسلسل آنے والی چیزیں* ۔ راغب نے کہا ہے کہ اَلْحَسْمُ کے معنے کسی چیز کے اثر کو مٹا دینے کے ہیں ۔ یعنی کسی چیز کو اس طرح تباہ کرنا کہ اس کا نشان تک مٹ جائے** ۔

قرآن کریم میں ہے کہ قوم عاد پر جو آندھی کا عذاب آیا تھا سَخَّرَهَا عَلَيْهِمْ سَبْعَ لَيَالٍ وَ ثَمٰنِيَةَ اَيَّامٍ حُسُوْمًا (۶۹/۷) ۔ ''اس نے اس (آندھی) کو ان پر سات راتیں اور آٹھ دن چلائے رکھا'' (حُسُوْمًا کا ترجمہ نہیں کیا گیا) ۔ اس میں حُسُوْمًا کے معنے مسلسل کے بھی ہو سکتے ہیں ۔ لیکن عذاب کی شدت کے اعتبار سے یہ معنے زیادہ مناسب نظر آتے ہیں کہ وہ ایسی آندھی تھی جس نے اس قوم کے نام و نشان تک کو مٹا دیا ۔ یا ان کی جڑوں تک کو کاٹ کر رکھ دیا ۔

ح س ن

اَلْحُسْنُ ۔ صاحب محیط نے (کلیات کے حوالہ سے) لکھا ہے کہ حسن سے مراد ہوتا ہے اعضاء کا صحیح صحیح تناسب اور توازن ۔ اور عرف عام میں حسین ان چیزوں کو کہا جاتا ہے جو نگاہ کو بھلی معلوم ہوں*** ۔ لہذا حُسْنٌ کے بنیادی معنے ہیں تناسب و توازن کا قائم رہنا اور یہ سُوْءٌ کی ضد ہے ۔ نیز اس کے مقابلہ میں فَسَادٌ کا لفظ آیا ہے (۴۵/۲۲) جس کے معنی بگڑے ہوئے توازن کے ہیں ۔ لہذا اَلْاِحْسَانُ کے معنے ہوئے کسی کے بگڑے ہوئے توازن کو ٹھیک کر دینا ۔ یعنے اگر کسی وجہ سے افراد معاشرہ میں سے کسی کی کسی قوت و صلاحیت میں کمی واقع ہو گئی ہے تو اس کمی کے پورا کردینے کا نام اِحْسَانٌ ہے ۔ (دیکھئے عنوان ع ۔ د ۔ ل جسمیں عَدْلٌ و اِحْسَانٌ کے متعلق تفصیلی گفتگو کی گئی ہے) ۔ راغب نے کہا ہے کہ احسان دو طرح ہوتا ہے ۔ ایک تو کسی دوسرے پر انعام کرنا (یعنے اسکی کمی کو پورا کرکے اسکا توازن درست کر دینا) ۔ اور دوسرے خود اپنے کاموں (سیرت و کردار) میں توازن پیدا کرنا ۔ اس میں حسن پیدا کرنا** ۔

*تاج ۔ **راغب ۔ ***محیط ۔

نیز راغب نے کہا ہے کہ عَدْل* تو یہ ہے کہ جو کچھ تمہارے ذمہ ہو وہ دیدو اور جتنا تمہارا حق ہے وہ لے لو۔ اور اِحْسَان* یہ ہے کہ اس سے زیادہ دو جتنا تمہارے ذمہ ہے اور اس سے کم لو جتنا تمہارا حق ہے*۔ یعنی اِحْسَان* میں نگاہ واجب (Due) پر نہیں ہوتی بلکہ مقصد، توازن برقرار رکھنے سے ہوتا ہے۔ سورۃ قصص میں حضرت موسیٰؑ کے متعلق ہے کہ جب وہ جوانی کو پہنچے وَاسْتَوَىٰ اور اسمیں ہر طرح کا اعتدال پیدا ہو گیا۔ تو ہم نے انہیں علم و حکم (قوت فیصلہ) عطا کیا۔ اسکے بعد ہے کَذَٰلِكَ نَجْزِي الْمُحْسِنِيْنَ (۲۸/۱۴)۔ ہم اسطرح محسنین کو ان کے اعمال کا ثمرہ دیا کرتے ہیں۔ یہاں ظاہر ہے کہ مُحْسِنِيْنَ سے مراد اعتدال کے ساتھ زندگی بسر کرنے والے ہیں۔

هُوَ يَحْسِنُ الشَّيْئَ اِحْسَاناً کے معنے ہیں وہ اس چیز کو اچھی طرح سے جانتا ہے*۔ سورۃ یوسف میں ہے کہ جب قید خانہ میں ان دو نوجوانوں نے حضرت یوسفؑ سے اپنا اپنا خواب بیان کیا اور آپ سے کہا کہ ان خوابوں کی تاویل بتائیے تو اسکے بعد ہے اِنَّا نَرٰكَ مِنَ الْمُحْسِنِيْنَ (۱۲/۳۶)۔ یہاں مُحْسِنِيْنَ کے معنی ہیں وہ لوگ جو کسی بات کا اچھی طرح علم رکھتے ہوں*۔

قرآن کریم میں حَسَنَات* (بمقابلہ سَيِّئَات*) زندگی کی خوشگواریوں کیلئے آیا ہے (مثلاً ۳/۱۱۹؛ ۷/۱۳۱) سورۃ توبہ میں حَسَنَةٌ* کے مقابلہ میں مُصِيْبَةٌ* آیا ہے (۹/۵۰)۔ لہذا حَسَنَةٌ* ہر وہ چیز ہے جس سے انسان کو آرام ملے۔ راحت و آسائش کا سامان۔ اور چونکہ سامان راحت و آسائش کی تکمیل مملکت و حکومت میں جا کر ہوتی ہے اسلئے بنی اسرائیل کی داستان کے سلسلہ میں کہا کہ ہم نے انہیں ارض فلسطین کے مشارق و مغارب کا وارث بنا دیا اور اسطرح تَمَّتْ كَلِمَتُ رَبِّكَ الْحُسْنٰى (۷/۱۳۷)۔ "تیرے نشو و نما دینے والے کے توازن بدوش قانون کی تکمیل (حسن کارانہ انداز سے) ہوگئی"۔ (حُسْنٰى مونث ہے اَحْسَنُ کا)۔ خدا کے اَسْمَاءِ کو الْاَسْمَاءُ الْحُسْنٰى (۵۹/۲۴) کہا گیا ہے۔ اسلئے کہ خدا کی ذات وہ ہے جسمیں مختلف صفات اپنے پورے پورے تناسب و توازن کو لئے، انتہائی حسن کارانہ انداز سے یک جا جمع ہیں۔ جملہ صفات اور ان میں کامل تناسب۔ یہ ہے خدا کا تصور قرآن کریم کی رو سے۔ اور چونکہ انسانی زندگی کا مقصود یہ بتایا

* تاج۔

گیا ہے کہ وہ اپنے آپ کو خدا کے رنگ میں رنگ لے۔ (٢/١٣٨)۔ اسمائے خدا کا "مقرب" وہ ہے جسکی ذات (Personality) کی مختلف صلاحیتیں نشوونما حاصل کرتی جائیں، بایں نمط کہ ان میں پورا پورا توازن قائم رہے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن کریم نے جہاں کہا ہے کہ لِلّٰهِ الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰى فَادْعُوْهُ بِهَا۔ (اسمائے خداوندی۔ صفاتِ الٰہیہ۔ پورا پورا توازن لئے ہوتی ہیں اسلئے خدا کو انہی کے مطابق پکارو۔ یعنی خدا کے متعلق وہی تصور درست ہے جو ان صفات کے مطابق قائم ہو۔ تو اسکے ساتھ ہی یہ کہہ دیا کہ وَذَرُوا الَّذِيْنَ يُلْحِدُوْنَ فِيْ اَسْمَآئِهٖ۔ (٧/١٨٠) جو لوگ ان صفات میں سے کسی ایک میں بھی (توازن کی راہ چھوڑ کر) کسی ایک طرف نکل جاتے ہیں، تم ان سے الگ ہو جاؤ۔ لہذا خدا کی صفات کا اپنے اندر منعکس کرنا (یعنی انسانی ذات کے مضمر جوہروں کی نمود اور بالیدگی) ہی مقصود نہیں بلکہ ان میں حسن و توازن قائم رکھنا بھی ضروری ہے۔ جس زندگی میں حسن نہیں سمجھ لیجئے کہ وہ قرآنی قالب میں ڈھلی ہوئی نہیں ہے۔ زندگی کا مقصود یہ ہے کہ تم اپنے اندر کسقدر حسن پیدا کرتے ہو اور کائنات میں کسقدر حسن کا اضافہ کرتے ہو۔ خارجی دنیا میں اس اِحْسَان* (حسن پیدا کرنے) کی ابتدا اپنے رفقائے سفر (دوسرے افرادِ معاشرہ) کے ساتھ حسنِ معاملہ سے ہوتی ہے۔ اسکے لئے کہا ہے کہ وَقُوْلُوْا لِلنَّاسِ حُسْنًا (٢/٨٣)۔ لوگوں سے ایسی باتیں کرو جن سے حسن پیدا ہو۔ اور اسکا عملی طریقہ یہ ہے کہ اَنْفِقُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ۔ اپنی محنت کے ماحصل کو ربوبیت عامہ کیلئے کھلا رکھو اور اسطرح اَحْسِنُوْا (٢/١٩٥) معاشرہ میں حسن پیدا کرتے رہو۔ اسی کا دوسرا نام اِحْسَان* ہے (٢/٨٣)۔

قرآن کریم نے کہا ہے کہ تم سے جو حسن پیدا کرنے (اِحْسَان*) کی تاکید کی گئی ہے تو اس کے متعلق یہ سمجھ لینا ضروری ہے کہ یہ چیز کسی معاوضہ کی خاطر نہیں کی جائیگی۔ اس لئے کہ هَلْ جَزَآءُ الْاِحْسَانِ اِلَّا الْاِحْسَانُ* (٥٥/٦٠)۔ حسن پیدا کرنے (احسان) کا بدلہ (یعنی نتیجہ) یہ ہے

* (ہمارے ہاں عام طور پر یہ سمجھا جاتا ہے کہ احسان کا بدلہ احسان ہونا چاہئے یعنے کسی آدمی پر کوئی وقت آ پڑا۔ وہ دوسرے کے پاس مدد کے لئے گیا۔ اس نے اسکی مدد کی۔ یہ اسکا احسان ہوا۔ اب یہ دوسرا شخص اس انتظار میں رہے کہ کب اُس پہلے شخص پر کوئی مصیبت پڑے اور یہ اس کے احسان کا بدلہ اتارے۔ اور جب تک اُس کا بدلہ نہ اتارے اُس کا بے دام غلام بنا رہے۔ اگر اس نے اسکی کسی بات سے بھی اختلاف کیا تو اس نے جھٹ کہہ دیا کہ یہ کسقدر احسان فراموش ہے؟ یہ ہے احسان سے مراد ہمارے معاشرے میں۔ اور وہ ہے احسان کا مفہوم قرآن کی رو سے ببیں تفاوت رہ از کجاست تا بہ کجا]۔

کہ اس سے حسن پیدا ہو جاتا ہے۔ اور یہی مقصود بالذات ہے۔ یعنی احسان کا بدلہ یہ ہے کہ تم احسان کرتے جاؤ اور اس کے معاوضہ کا دل میں خیال تک بھی نہ لاؤ۔ اس لئے کہ مومنین کا شعار یہ ہے کہ وہ جب کسی کے ساتھ احسان کرتے ہیں تو ان سے برملا کہہ دیتے ہیں کہ لَا نُرِيْدُ مِنْكُمْ جَزَآءً وَّلَا شُكُوْرًا (۷۶/۹)۔ "ہم تم سے نہ کوئی معاوضہ چاہتے ہیں نہ شکریہ کے متمنی ہیں۔ لہذا قرآنی تعلیم کا مقصود یہ ہے کہ انسان حسن پیدا کرے۔ خود اپنی ذات میں۔ دوسرے انسانوں میں اور خارجی کائنات میں۔ (Make it more Beautiful) ۔ یہ چیز اپنا بدلہ آپ ہوگی اسی بنا پر قرآن کریم نے کہا ہے کہ جہاں دیکھو کہ توازن بگڑ گیا ہے، اُسے درست کر دو۔ اسکے درست کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ وہاں حسن پیدا کر دو (توازن قائم کر دو) اس سے بگاڑ خود بخود دور ہو جائیگا۔ اِدْفَعْ بِالَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ السَّيِّئَةَ (۲۳/۹۶)۔ پہلے خود اپنا جائزہ لو۔ اگر تمہاری ذات متوازن (Balanced Personality) نہیں تو اس میں احسان (توازن پیدا کرنے) کی کوشش کرو۔ اسکے بعد جب کسی دوسرے شخص کو دیکھو کہ وہ اپنا توازن کھو رہا ہے تو اس سے احسان کرو۔ یعنے اسکا توازن قائم کرنے کی کوشش کرو۔ جب معاشرہ کا توازن بگڑ جائے تو معاشرے میں حسن پیدا کرنے کی کوشش کرو۔ اس طرح خارجی کائنات میں علم و تحقیق کی رو سے حسین اضافے کرتے جاؤ۔ تمہاری یہ کوششیں اپنا بدلہ آپ ہونگی۔ حسن پیدا کرنے کی کوشش کا نتیجہ یہ ہوگا کہ حسن پیدا ہو جائیگا۔ یعنی بگڑا ہوا توازن قائم ہو جائیگا۔ زندگی کا یہی مقصود ہے۔ یعنی تخلیقِ حسن۔ اور خدا کی ذات وہ ہے جس میں حسن اپنی انتہا تک پہنچا ہوا ہے۔ (الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰى)۔ اس لئے انسانی ذات کی صحیح صحیح نشو و نما اور تکمیل کے لئے خارجی معیار (Objective Standard) خدا کی ذات ہے جس کا تعارف قرآن کریم نے کرایا ہے۔

ح ش ر

اَلْحَشْرُ۔ (لوگوں کو) جمع کرکے ہانک کر کسی طرف لیجانا۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی ہانکنا، اٹھانا۔ اٹھ کھڑا ہونا اور چل پڑنا ہیں، اہل لغت اَلْحَشْرُ کے معنے اکٹھا کرنا اور ہانکنا کرتے ہیں۔ اَلْمَحْشَرُ (ش کو زیر اور زبر کے ساتھ) جمع ہونے کی جگہ*۔ محیط

* تاج۔

میں ہے کہ عوام اس لفظ کو ہجوم اور ایک دوسرے کے لئے تنگی پیدا کرنے کے معنوں میں استعمال کرتے ہیں**۔ یعنے ایسا ہجوم (اجتماع) جو دوسروں کیلئے مشکل اور تنگی پیدا کرنے کیلئے کیا جائے۔ قرآن کریم میں یہ لفظ جنگ کے اجتماع کے مفہوم میں بھی استعمال ہوا ہے۔ مثلاً وَ حُشِرَ لِسُلَیْمٰنَ جُنُوْدُہٗ (۲۷/۱۷) "سلیمان کے حکم کے مطابق اسکے لشکر جمع کرکے لیجائے گئے"۔ اور یہودیوں کے متعلق سورۃ حشر میں ہے ھُوَ الَّذِیْٓ اَخْرَجَ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا مِنْ اَھْلِ الْکِتٰبِ مِنْ دِیَارِھِمْ لِاَوَّلِ الْحَشْرِ۔ (۵۹/۲) "اللہ وہ ہے جس نے اہل کتاب میں سے ان لوگوں کو جنہوں نے سرکشی اختیار کی، پہلے حشر، کے لئے ان کے گھروں سے نکالا"۔ اس سے بھی مراد جنگ کا اجتماع ہے۔ یا جلاوطنی جو اسکا نتیجہ تھی۔ سورۃ آل عمران میں ہے کہ ان مخالفین سے کہدو کہ سَتُغْلَبُوْنَ وَ تُحْشَرُوْنَ اِلٰی جَھَنَّمَ (۳/۱۱) "تم بہت جلد مغلوب ہوگے اور تباہی کے میدان میں جمع کرکے جہنم کیطرف لے جائے جاؤگے۔ اس سے اگلی آیت میں اس جنگ کی تفصیل درج ہے۔ سورۃ شعراء میں فرعون کے متعلق ہے کہ اس نے مختلف شہروں میں حٰشِرِیْنَ بھیجے (۲۶/۳۶)۔ یعنی ہرکارے جو لوگوں کو جمع کرکے لائیں۔

اَلْحَشْرُ کے معنے دھار تیز کرنے نیز جمع کر کے ایک جگہ سے دوسری جگہ لے جانے کے بھی آتے ہیں۔ جیسے قحط سالی لوگوں کو دیہات سے نکال کر شہروں کی طرف لے آتی ہے*۔ اَلْحَشَرَۃُ کے معنے ہیں شکار یا کھایا جانے والا شکار نیز کیڑا مکوڑا اس سے جمع حَشَرَاتٌ کیڑوں مکوڑوں اور چھوٹے چھوٹے جانوروں کے لئے بولا جاتا ہے*۔ لغت یمن میں اسکے معنے بھوسی کے بھی ہیں*۔

اَلْحَشْرُ۔ موت کو کہتے ہیں۔ نیز کان کا لطیف اور باریک حصہ*۔ سورۃ طٰہٰ میں ہے وَنَحْشُرُہٗ یَوْمَ الْقِیٰمَۃِ اَعْمٰی (۲۰/۱۲۴) "اور ہم اسے قیامت کے دن اندھا اٹھائینگے"۔ اسکے معنے اعمال کا بدلہ دینے کے ہیں جو نہایت لطیف انداز سے واقع ہوتا ہے۔ یعنے اعمال کے اثرات وقتائج نہایت لطیف انداز سے مرتب ہوتے رہتے ہیں۔

مَحْشُوْرَۃً۔ اکٹھا کئے ہوئے۔ (۳۸/۱۹)۔ ذٰلِکَ حَشْرٌ عَلَیْنَا یَسِیْرٌ (۵۰/۴۴)۔ "یہ اکٹھا کرنا ہمارے لئے آسان ہے"۔ وَاِذَا حُشِرَ النَّاسُ (۴۶/۶) "جب لوگ اکٹھے کئے جائینگے"۔ ان مقامات میں جمع کرنے کے ساتھ، آگے لے جانے کا مفہوم بھی پیش نظر رکھنا چاہئے۔

* تاج۔ ** محیط۔

ہمارے ہاں حَشْرٌ سے مراد صرف مرنے کے بعد (قیامت کے دن) حساب کتاب کے لئے جمع ہونا لیا جاتا ہے۔ (جیسا کہ آخرت۔ قیامت۔ ساعت۔ بعث وغیرہ کے تحت لکھا گیا ہے)۔ یہ قرآن کریم کی جامع اصطلاحات ہیں جن سے مفہوم صرف مرنے کے بعد جی اُٹھنا نہیں بلکہ اس دنیا میں قوموں کی نشاۃِ ثانیہ بھی ہے۔ چنانچہ حَشْرٌ کے متعلق شاہ ولی اللہؒ (حجۃ اللہ البالغہ۔ کتاب الفتن میں) کہتے ہیں کہ ''زبانِ شریعت میں حشر کے دو معنی ہیں۔ ایک لوگوں کا ملک شام میں جمع ہونا، قیامت سے پیشتر یہ واقعہ اُس وقت ہوگا جب زمین پر لوگوں کی قلت ہو جائیگی تو بعض لوگ مختلف تقریبوں کی وجہ سے اور بعض لوگ آگ (غالباً جنگ سے مراد ہے) کی وجہ سے وہاں جمع ہونگے۔ دوسرے حشر کے معنی ہیں موت کے بعد زندہ ہونا''۔

قرآن کریم میں جہاں جہاں یہ الفاظ آئیں متن کے اعتبار سے دیکھ لینا چاہئے کہ وہاں مراد مرنے کے بعد کی زندگی ہے یا اس دنیا میں انقلاب آفرینی۔

ح ص ب

اَلْحَصَبَۃُ۔ کنکری۔ پتھر۔ اَلْحَصَبُ۔ ایندھن۔ جو کہ آگ میں ڈالا جائے تاکہ وہ جلے اور اس سے آگ میں اضافہ ہو اور وہ تیز بھڑکے۔ لکڑی کو بھی حَصَبٌ اس وقت کہہ سکتے ہیں جب اس سے آگ کو بھڑکایا اور روشن کیا جائے۔ اَلْحَاصِبُ۔ وہ تیز ہوا (آندھی کا جھکڑ) جو مٹی۔ غبار اور کنکریاں اڑائے*۔ قرآن کریم میں ہے يُرْسِلَ عَلَيْكُمْ حَاصِبًا (۱۷/۶۸)۔ تم پر کنکر برسانے والی آندھی بھیج دے۔ سورۃ انبیاء میں ہے اِنَّكُمْ وَمَا تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ حَصَبُ جَهَنَّمَ (۲۱/۹۹) ''تم اور تمہارے وہ معبود جن کی تم اللہ کے سوا عبادت کرتے ہو، جہنم کا ایندھن ہیں''۔ یہاں حَصَبٌ کے معنے ایندھن کے ہیں۔ قوم لوط پر آتش فشاں پہاڑ سے جو شعلہ آمیز آندھی چلی تھی اسے بھی حَاصِبًا کہا گیا ہے (۵۴/۳۴)۔ اس میں پتھروں کی کنکریاں اور آگ کی حرارت دونوں کا امتزاج ہے۔

ح ص د

حَصَدَ۔ کھیتی یا پودوں کو درانتی سے کاٹنا**۔ فَمَا حَصَدْتُّمْ فَذَرُوْهُ فِیْ سُنْۢبُلِهٖۤ (۱۲/۴۷)۔ ''جو کھیتی تم کاٹو اسے اسکے خوشوں ہی

* تاج و محیط۔ ** تاج

میں رہنے دو"۔ حَصَادٌ۔ کھیتی کاٹنا (۶/۱۴۲) یا کھیتی کاٹنے کا وقت۔ اَلْحَصِیْدُ۔ کاٹی ہوئی کھیتی (۱۱/۲۴) قرآن کریم نے ہلاک شدہ قوموں کے متعلق کہا ہے کہ جَعَلْنٰهُمْ حَصِیْدًا خٰمِدِیْنَ (۲۱/۱۵) "انہیں ہم نے کٹے ہوئے کھیت کی طرح بے حس و حرکت اور خاموش کر دیا۔ انہیں نشوونما کی صلاحیت کو ختم کر دیا"۔ بربادی اور زندگی کی حرارت سے محرومی کا کیسا عبرت انگیز نقشہ ہے!

ح ص ر

اَلْحَصْرُ۔ روک دینا۔ قید کرنا۔ تنگی پیدا کر دینا*۔ راغب نے لکھا ہے حَصْرٌ اور اِحْصَارٌ اُس وقت بولتے ہیں جب رکاوٹ کی وجہ کوئی ظاہری سبب ہو (جیسے دشمن نے روک دیا ہو) یا باطنی سبب ہو (جیسے بیماری رکاوٹ پیدا کردے) لیکن جب رکاوٹ صرف باطنی سبب سے ہو تو اس موقع پر حَصْرٌ ہی کہتے ہیں**۔ سورۃ نساء میں ہے اَوْجَآءُوْکُمْ حَصِرَتْ صُدُوْرُهُمْ (۴/۹۰)۔ "یا وہ تمہارے پاس آئیں اس حالت میں کہ ان کے سینے بھنچے ہوئے اور دل تنگ ہوں"۔ حَصِیْرٌ (۱۷/۸) قید خانہ کو بھی کہتے ہیں اور تنگدل شخص کو بھی۔ نیز وہ بخیل آدمی جو بخل کی وجہ سے شراب نہ پیے*۔

اَلْحَصُوْرُ (۳/۳۸) رکنے والا۔ بالخصوص وہ شخص جو عورتوں کے پاس جانے سے رکا رہے*۔ نیز حَصُوْرٌ اس شخص کو بھی کہہ سکتے ہیں جو اپنے نفس پر قابو رکھتا ہو اور اپنی نفسانی خواہشات کو لگام دے سکتا ہو۔ مُحَاصَرَۃٌ۔ دشمن کو چاروں طرف سے گھیر کر روک لینا۔ حَصَرَ الْقَوْمُ بِفُلَانٍ۔ قوم نے فلاں کو گھیر لیا*۔

سورۃ بقرہ میں اُحْصِرُوْا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ کی تفسیر لَا یَسْتَطِیْعُوْنَ ضَرْبًا فِی الْاَرْضِ (۲/۲۷۳)۔ نے کردی۔ یعنی جو اسطرح روک لئے جائیں کہ نقل و حرکت کی استطاعت نہ رکھیں۔ ان کی نقل و حرکت پر پابندی لگا دی جائے۔

سورۃ بنی اسرائیل میں جَهَنَّمَ کو حَصِیْرًا کہا گیا ہے۔ (۱۷/۸)۔ یعنی وہ مقام جہاں کسی کی نشو و نما (Development) رک جائے۔ جہاں کسی کو آگے بڑھنے سے روک دیا جائے۔ (جہنم کے صحیح مفہوم کیلئے دیکھئے عنوان جَهَنَّمَ اور ج۔ح۔م)

---

* تاج۔ ** راغب۔

ح ص ص (ح ص ح ص)

اَلْحَصُّ ۔ بالوں کو مونڈ دینا ۔ (تاکہ سر صاف ہو جائے) ۔ اَلْحَصَّاءُ مِنَ الرِّیَاحِ ۔ صاف ہوا جس میں گرد و غبار نہ ہو۔ حَصْحَصَ الشَّیْءُ تَحْصِیْصاً وَحَصْحَصَ*** ۔ چیز ظاہر ہو گئی ۔ واضح ہو گئی (جو چیز پہلے چھپی ہوئی ہو اور پھر واضح ہو جائے اس کے متعلق کہتے ہیں*۔

سورہ یوسف میں ہے اَلْئٰنَ حَصْحَصَ الْحَقُّ (۱۲/۵۱) ۔ " اب حقیقت واضح ہو گئی " ۔ اب اصل بات بے نقاب ہو کر سامنے آ گئی ۔ لیکن صاحب محیط نے بیضاوی کے حوالہ سے لکھا ہے کہ یہ حَصْحَصَ الْبَعِیْرُ سے ہے جس کے معنے ہوتے ہیں اونٹ نے بیٹھنے کے لئے اپنے سینہ اور گھٹنوں کو اچھی طرح زمین پر جمایا ۔ اس لئے حَصْحَصَ الْحَقُّ کے معنے ہونگے حق ثابت اور برقرار ہو گیا**۔ حِصَّۃٌ ۔ (حصہ) جو چیز اصل میں سے کاٹ کر الگ کر لی جائے ۔ مجموعہ کا ایک ٹکڑا* ۔ ابن فارس نے اس کے بنیادی معنوں میں (۱) حصہ اور (۲) واضح اور متمکن ہو جانا لکھا ہے ۔ نیز کسی چیز کا ختم یا کم ہو جانا ۔

ح ص ل

اَلْحَاصِلُ مِنْ کُلِّ شَیْئٍ ۔ کسی چیز میں سے جو کچھ باقی رہ جائے ۔ اَلتَّحْصِیْلُ ۔ جو کچھ حاصل ہو جائے اسے الگ الگ کر دینا ۔ دراصل تَحْصِیْلٌ کے معنے چھلکے سے مغز نکالنا ہوتا ہے ۔ مثلاً بھوسے سے گیہوں کے دانوں کو یا مٹی پتھر کو، الگ کرنا ۔ تَحَصَّلَ الشَّیْئُ ۔ چیز جمع اور ثابت ہو گئی ۔ اس سے اَلْحَوْصَلَۃُ ۔ پرندے کے پوٹے کو کہتے ہیں* ۔

قرآن کریم میں ہے وَحُصِّلَ مَا فِی الصُّدُوْرِ (۱۰۰/۱۰) جو کچھ سینوں میں (یا کہیں اور پوشیدہ) ہے اسے یوں الگ کر کے باہر نکال لیا جائے گا جیسے چھلکے سے مغز الگ کر لیتے ہیں ۔ ابن فارس نے لکھا ہے کہ تَحْصِیْلٌ کے معنی سونے یا چاندی کو کان کی مٹی سے نکالنے کے ہیں ۔

---

*تاج و راغب ۔ ** محیط ۔ *** حصحص رباعی ہے لیکن ہم نے اسے الگ لکھنے کی بجائے یہیں (ثلاثی میں) لکھدینا مناسب سمجھا ہے ۔

ح ص ن

اَلْاِحْصَانُ کسی چیز کی حفاظت کرنا ۔ اسے محفوظ رکھنا ۔ یہ اس لفظ کے بنیادی معنے ہیں ۔ حَصُنَ الْمَکَانُ یَحْصُنُ ۔ جگہ کا محفوظ ہونا اس طرح کہ اس تک پہنچنے کی راہ نہ ہو ، ایسی محفوظ جگہ حَصِیْنٌ کہلائیگی ۔ حَصَّنَہٗ وَ اَحْصَنَہٗ اس نے اسے محفوظ کرد یا ۔ اَلْحِصْنُ ہر محفوظ مقام جسکے اندر تک رسائی نہ ہوسکے ۔ جمع حُصُوْنٌ ۔ ($\frac{59}{2}$) مُحَصَّنَۃٍ ۔ محفوظ کی ہوئی ($\frac{59}{14}$) ۔ اَلْمِحْصَنُ ۔ قفل ۔ حفاظت کرنے کے معنوں میں سورۃ انبیاء میں ہے لِتُحْصِنَکُمْ ($\frac{21}{80}$) " تاکہ وہ تمہیں محفوظ رکھے " ۔

سورۃ یوسف میں بحفاظت ذخیرہ کی ہوئی گندم کیلئے ہے مِمَّا تُحْصِنُوْنَ ($\frac{12}{48}$) ۔ حفاظت کے اعتبار سے ، حَصَانٌ اس عورت کو کہتے ہیں جو پاکدامن ہو اور اپنی عفت کو محفوظ رکھتی ہو * ۔ (موتی کو بھی کہتے ہیں کہ وہ سیپ میں محفوظ ہوتا ہے) ۔ عورت کی پاکدامنی دو طریق پر ہوتی ہے ۔ ایک تو یہ کہ وہ غیر شادی شدہ ہو اور اپنی عفت کو محفوظ رکھے اور دوسرے یہ کہ وہ شادی کرکے (صرف ایک کی ہوجائے) اور اسطرح اسکی عصمت (غیروں کے ہاتھوں سے) محفوظ ہو جائے ۔ اس اعتبار سے پاکدامن عورت کو مُحْصِنٌ بھی کہتے ہیں اور مُحْصَنٌ بھی ۔ (یعنے بصیغہ فاعل اور بصیغہ مفعول دونوں طرح) ۔ راغب نے کہا ہے کہ مُحْصِنٌ (حفاظت کرنے والی) اسوقت کہتے ہیں جب وہ (غیر شادی شدہ حالت میں) اپنی عفت کی حفاظت آپ کرے ۔ اور مُحْصَنٌ ۔ (جس کی حفاظت کی جائے) جب اسکی عصمت کی حفاظت شادی کے ذریعہ سے ہو جائے ۔ چنانچہ اَلْمُحْصَنٰتُ ۔ شادی شدہ عورتوں کو کہتے ہیں ۔ اَحْصَنَ ۔ کے معنے ہیں شادی کرنا ۔ لیکن تاج العروس میں (جوھری اور ثعلب کے حوالہ سے) لکھا ہے کہ پاکدامن عورت کے لئے مُحْصِنَۃٌ اور مُحْصَنَۃٌ ۔ دونوں الفاظ آتے ہیں ، لیکن شادی شدہ کیلئے صرف مُحْصَنَۃٌ آتا ہے ۔۔ چنانچہ قرآن کریم میں پاکدامن عورتوں کیلئے اَلْمُحْصَنٰتُ آیا ہے ($\frac{4}{24}$) ۔ جسمیں شادی شدہ اور غیر شادی شدہ دونوں شامل ہیں ۔ لہذا جہاں مُحْصَنَۃٌ آئیگا ، وہاں سیاق و سباق کی رو سے دیکھنا ہوگا کہ اس سے مطلب غیر شادی شدہ پاکدامن عورت ہے یا شادی شدہ عورت ۔

---

* تاج و راغب و محیط

قرآن کریم میں یہ لفظ پاکدامن کے معنوں میں (۵/۵ ; ۲۴/۴ ; ۲۳/۲۴) میں آیا ہے ۔ سورۃ نساء (۲۵/۴) میں یہ لفظ فَتَیٰت کے مقابلہ میں آیا ہے جہاں اسکے معنے آزاد عورتوں کے ہیں (بمقابلہ لونڈیوں کے) ۔ اسی سورۃ کی چوبیسویں آیت (۲۴/۴) میں جہاں یہ لفظ آیا ہے، وہاں اسکے معنے ”پاکدامن“ بھی ہو سکتے ہیں اور ”شوہردار“ بھی ۔ پہلے معنوں کے اعتبار سے اس کا مفہوم یہ ہوگا کہ تم پر تمام پاکدامن عورتیں حرام ہیں بجز ان کے جو تمہارے نکاح میں ہوں ۔ اور دوسرے معانی کے اعتبار سے اس کا مفہوم یہ ہوگا کہ تم پر شوہر دار عورتیں حرام ہیں، بجز ان لونڈیوں کے جو اس سے پہلے تمہاری ملک میں آ چکی ہوں (دیکھئے عنوان م ۔ ل ۔ ک) ۔ یا بجز شوہردار عورتوں کے جن کا استثناء (۱۰/۶۰) میں کیا گیا ہے ۔ ہمارے نزدیک یہاں شوہردار کا مفہوم زیادہ قرین قیاس ہے ۔

قرآن کریم نے مرد اور عورت کے جنسی تعلقات کیلئے دو لفظ استعمال کئے ہیں ۔ مُحْصِنِیْنَ غَیْرَ مُسٰفِحِیْنَ (۲۴/۴) ۔ (سَفْح* کے تفصیلی معنے عنوان س ۔ ف ۔ ح کے تحت دیکھئے ۔ یہاں اتنا سمجھ لیجئے کہ اسکے معنے ہیں اپنے مادہ کو یوں ہی بہا دینا یا گرا دینا) یعنے اگر یہ اختلاط محض مادہ کو نکالنے کیلئے ہے (جسے شہوت رانی کہتے ہیں ۔ یعنے جنسی اشتعال کی تسکین ۔ زنا کا مقصد یہی ہوتا ہے) تو یہ ناجائز ہے ۔ اور اگر اس سے مقصد یہ ہے کہ اسطرح مادہ (استقرار حمل کی رو سے) محفوظ ہو جائے اور یونہی بھکو ضائع نہ چلا جائے ۔ تو یہ اختلاط جائز ہے ۔ اسے نکاح کہتے ہیں ۔ چنانچہ عربوں میں نِکَاح* کے مقابلہ میں لفظ سِفَاح* آتا تھا ۔ نیز ان کے ہاں تیروں سے جوا کھیلا کرتے تھے ۔ ہر تیر کسی خاص حصہ کیلئے ہوتا تھا ۔ لیکن ان میں ایک تیر خالی رکھا جاتا تھا جو محض خانہ پری کیلئے ہوتا تھا ۔ اسکا نہ کوئی حصہ ہوتا تھا نہ نتیجہ ۔ اس تیر کو اَلسَّفِیْحُ کہتے تھے* ۔ اس سے بھی واضح ہو جاتا ہے کہ مُحْصِنِیْنَ غَیْرَ مُسٰفِحِیْنَ کے معنے کیا ہیں ۔ اَلْمَسْفُوْحُ مِنَ الزَّرْعِ ۔ اس کھیتی کو کہتے تھے جسکے پتے شدت سردی سے زرد پڑ جائیں ۔ دانے مرجھا کر پتلے ہوجائیں ۔ بالیں سیاہ پڑ جائیں ۔ اور انکے پرت گر پڑیں** ۔ اسطرح ساری کھیتی ضائع ہو جائے ۔ اس سے بھی واضح ہو جاتا ہے کہ قرآن کریم کی رو سے جنسی اختلاط کا منشا کیا ہے ۔ اسی لئے اس نے عورتوں کو حَرْثٌ* (کھیتی) کہا ہے ۔ (۲۲۳/۲) ۔ یعنے مرد اور عورت کا جنسی اختلاط بطریق

* تاج ۔ **محیط ۔

مُحْصِنِیْنَ ہونا چاہئے ۔ یعنی ذمہ داریوں کی حفاظت کی غرض سے جو نکاح کے ذریعہ ایک دوسرے پر عائد ہوتی ہیں اور جسکا منشا تحفظ اور بقائے نسل انسانی ہے ، نہ کہ محض جنسی تسکین کی خاطر۔ ” خالی تیر چلانے ،، کیلئے۔ ” وقتی نکاح ،، بھی سَفْح ہی ہوتا ہے نہ کہ اِحْصَان۔ (نیز دیکھئے عنوان خ ۔ د ۔ ن)

(مردوں اور عورتوں کے جنسی اختلاط کے حدود و ضوابط کا قوموں کے تمدن اور کلچر سے کسقدر گہرا تعلق ہے ، اس کے لئے میری کتاب ” طاہرہ کے نام خطوط ،، ملاحظہ کیجئے)۔

ح ص ی

اَلْحَصٰی ۔ چھوٹی چھوٹی کنکریاں ۔ سنگریزے ۔ چونکہ عرب ابتداءً چیزوں کی گنتی چھوٹی چھوٹی کنکریوں سے کرتے تھے (جیسا کہ ہم انگلیوں سے گنتے ہیں) اس لئے اِحْصَاء کے معنے گنتی کرنے (۱۴/۳۴) ۔ یا گنتی کر کے کسی چیز کو حاصل کر لینے اور احاطہ میں لے لینے کے ہوگئے*۔

قرآن کریم میں ہے وَاَحْصٰی كُلَّ شَیْءٍ عَدَدًا (۷۲/۲۸) ۔ ” اس نے ہر چیز کو گن کر احاطہ میں لے رکھا ہے ،، ۔ یعنی اس میں گنتی اور اس کے بعد حفاظت سے حاصل کر لینے کے دونوں گوشے آجاتے ہیں ۔ جیسے سورۃ مزمل میں ہے عَلِمَ اَنْ لَّنْ تُحْصُوْهُ (۷۳/۲۰) ۔ ” وہ جانتا ہے کہ تم پابندی کے ساتھ ایسا کرنے کی طاقت نہیں رکھ سکو گے ،، ۔ سورۃ کہف میں ہے اَیُّ الْحِزْبَیْنِ اَحْصٰی لِمَا لَبِثُوْا اَمَدًا (۱۸/۱۲) ” ان دونوں گروہوں میں سے کس نے اس عرصہ کا احاطہ کیا ہے ،، اور اس مدت کو شمار کر لیا ہے یا اسے اپنے ضبط اور کنٹرول میں رکھا ہے ۔ عموماً اس آیت میں اَحْصٰی افعل التفضیل سمجھا جاتا ہے لیکن ہمارے خیال میں بہتر یہ ہے کہ اسے فعل ماضی سمجھا جائے ۔ کشاف نے بھی یہی لکھا ہے ۔ ابن فارس نے اس کے بنیادی معنے روکنے کے لکھے ہیں ، نیز شمار کرنا اور بدقت کسی کام کی طاقت رکھنا ۔ اس سے بھی مطلب احاطہ کرنا اور ضبط کرنا ہیں ۔

ح ض ر

حَضَرَ ۔ یَحْضُرُ ۔ حُضُوْرًا ۔ حاضر ہونا ۔ موجود ہونا ۔ (غَابَ کی ضد ہے)۔ نیز حَاضِرٌ ۔ موجود ۔ اَحْضَرَ الشَّیْءَ ۔ چیز کو حاضر کر دیا**۔

---

*تاج و راغب ۔ ** تاج

حَضَرَہٗ وَاحْضَرَہٗ وَاحْتَضَرَہٗ ۔ اُسے حاضر و موجود کیا ، نیز اس کے پاس آیا اور پہنچا* ابن فارس نے اس مادہ کے معانی پہنچنا ، پہنچانا ، موجود ہونا بتائے ہیں ۔ اس اعتبار سے الاِحْتِضَارُ دم مرگ کو کہتے ہیں جب موت حاضر ہو جاتی ہے ۔ آیت (۲۳/۹۸) میں یَحْضُرُوْنِ کے معنے بتاتے ہوئے اس نے کہا ہے کہ بعض نے اس کے معنے ایذا پہنچانا اور برا کرنا بھی بتائے ہیں ۔ اَلْحَضَارَۃُ ۔ شہر میں اقامت کرنا ۔ برخلاف بَدَاوَۃٌ کے، جس کے معنی دیہات میں سکونت اختیار کرنا ہیں ۔ اَلْحَاضِرَۃُ ۔ شہر ' بستیاں ' سرسبز آباد علاقے** ۔

قرآن کریم میں ہے اِذْ حَضَرَ یَعْقُوْبَ الْمَوْتُ (۲/۱۳۳) ''جب یعقوب؏ کے سامنے موت آگئی'' ۔ یعنی ان کے مرنے کا وقت آ گیا ۔

حَاضِرَۃَ الْبَحْرِ (۷/۱۶۳) دریا کے کنارے واقع ہونے والی ۔ تِجَارَۃً حَاضِرَۃً (۲/۲۸۲) نقد تجارت ۔ نقد سودا ۔ مُحْضَرُوْنَ (۳۰/۱۶) حاضر کئے ہوئے، مبتلائے عذاب ۔ مُحْتَضَرٌ (۵۴/۲۸) حاضر کیا ہوا ۔ یعنی جس کی باری ہوگی اس کے لئے گھاٹ موجود ہوگا ۔ کسی دوسرے نے اس پر قبضہ نہیں کیا ہوگا ۔

ح ض ض

اَلْحَضُّ ۔ کسی کام پر برانگیختہ کرنا ، ابھارنا ۔ خلیل کے نزدیک اَلْحَضُّ ہانکنے کے علاوہ دوسرے کاموں پر برانگیختہ کرنے کے لئے آتا ہے ۔ (بحوالہ ابن فارس) حَضَّہٗ ' یَحُضُّہٗ' عَلٰی اَمْرٍ ۔ کسی کو کسی کام پر ابھارنا ۔ برانگیختہ کرنا ۔ حَضِیْضٌ ۔ نشیبی زمین کو کہتے ہیں*** ۔ (کیونکہ اس طرف انسان تیزی سے چلا جاتا ہے) ۔ اصل میں حَضٌّ کے معنے ہی جانور کو نشیب کی طرف ہانکنے کے ہوتے ہیں****۔ پھر اسکے معنے ابھارنے اور برانگیختہ کرنے کے آنے لگے ۔

قرآن کریم میں ہے وَلَا یَحُضُّ عَلٰی طَعَامِ الْمِسْکِیْنِ (۶۹/۳۴) ''وہ مسکین کو کھانا کھلانے کی ترغیب نہیں دیتا'' ۔ سورۃ فجر میں وَلَا تَحٰضُّوْنَ (۸۹/۱۸) آیا ہے ۔ ''وہ ایک دوسرے کو ترغیب نہیں دیتے'' ۔ ایسا کرنے والے دین کی تکذیب کرتے ہیں ۔ (۱۰۷/۱-۳) ۔ آپ نے غور کیا کہ قرآن کریم کی رو سے دین اور معاشیات کا کتنا گہرا تعلق ہے !

* محیط ۔ ** تاج ۔ *** تاج و راغب ۔ **** راغب ۔

ح ط ب

اَلْحَطَبُ ۔ وہ لکڑیاں جو آگ جلانے کے لئے درختوں سے کاٹی جاتی ہیں ۔ ایندھن (جب ان لکڑیوں میں آگ لگائی جائے تو پھر اس ایندھن کو وَقُوْدٌ کہا جائیگا)*** ۔ حَطَبَ یَحْطِبُ ۔ لکڑیاں جمع کرنا ۔ مَکَانٌ حَطِیْبٌ ۔ وہ جگہ جہاں بہت لکڑیاں ہوں ۔ ھُوَ حَاطِبُ لَیْلٍ ۔ وہ بری بھلی، کار آمد و بیکار، ہر قسم کی باتیں بیان کرتا ہے ۔ جیسے رات کے اندھیرے میں لکڑیاں چننے والا کبھی سانپ کو بھی لکڑی سمجھ کر اٹھا لیتا ہے* ۔ فُلَانٌ یَحْطِبُ عَلٰی فُلَانٍ ۔ فلاں آدمی فلاں کے خلاف لوگوں کو بھڑکاتا ہے ۔ حَطِبَ فُلَانٌ بِصَاحِبِہٖ ۔ فلاں نے اپنے ساتھی کے خلاف چغلی کھائی** ۔

قرآن کریم میں حَطَبًا (۷۲/۱۵) ایندھن کے لئے آیا ہے ۔ اور ابو لہب کی بیوی کو حَمَّالَۃَ الْحَطَبِ (۱۱۱/۴) کہا گیا ہے ۔ اس کے معنے چغلخور کے بھی ہوسکتے ہیں اور دشمنی کی آگ بھڑکانے کے بھی ۔ اس کا مفہوم ''لگائی بجھائی کرنے والی'' زیادہ موزوں نظر آتا ہے ۔ یا اسباب مخالفت میں اضافہ کرنے والی ۔

ح ط ط

اَلْحَطُّ ۔ اس مادہ کے اصلی معنے اوپر سے اتارنا اور نیچے رکھنا ہیں**** ۔ اَلْحَطُّ وَ اَلْاِحْتِطَاطُ کے معنے ہیں سواری وغیرہ سے سامان اتار دینا ۔ حَطَّ فِیْ مَکَانٍ ۔ وہ کسی جگہ اتر گیا ۔ اَلْمَحَطُّ ۔ منزل، قیام گاہ ۔ حَطَّ الرَّجُلُ یَحُطُّ ۔ وہ آدمی اوپر سے نیچے کی طرف اترا ۔ اَلْحُطَائِطُ ۔ چھوٹے قد کا آدمی* ۔

سورۃ بقرہ میں جہاں بنی اسرائیل سے کہا گیا ہے کہ تم اب اس شہر میں فاتحانہ حیثیت سے داخل ہو جاؤ، وہاں ہے وَ قُوْلُوْا حِطَّۃٌ (۲/۵۸) ۔ اسکے معنے یہ ہیں کہ تم اس شہر میں جا بسو، اور پھر یہ دعا کرو کہ اب ہماری دشت نوردی اور خانہ بدوشی کی زندگی ختم ہو جائے ۔ ہمارا رختِ سفر ہماری سواریوں سے اتر جائے اور ہم اس قیامگاہ میں آرام سے زندگی بسر کریں ۔

* تاج ۔ ** محیط و راغب ۔ *** لطائف اللغۃ ۔ **** محیط ۔

راغب نے کہا ہے کہ حِطَّةٌ* کے معنے ہیں حُطَّ عَنَّا ذُنُوْبَنَا۔ یعنی ہمارے گناہ ہم سے اُتار دے۔ دور کردے*۔ اسکا یہی مطلب بھی ہے کہ اب ہماری خطا معاف ہو اور صحرانوردی اور دشت پیمائی کی زندگی کا خاتمہ ہو جائے۔

ح ط م

اَلْحَطْمُ۔ توڑ دینا۔ خواہ کسی طریق سے بھی ہو۔ خشک چیز جیسے ہڈی وغیرہ کو توڑ دینا۔ اِنْحَطَمَ وہ چیز ٹوٹ گئی۔ اَلْحِطْمَةُ۔ اَلْحُطَامَةُ جو کچھ کسی چیز میں سے ٹوٹ جائے۔ اَلْحَطِيْمُ۔ وہ حصہ جو خانہ کعبہ کی عمارت سے الگ چھوڑا ہوا ہے۔ اَلْحَطْمَةُ۔ سخت قحط کا سال۔ اَلْحُطَمَةُ۔ کثیر تعداد میں اونٹ یا بکریاں جو زمین کے بالائی حصہ یا پودوں کو پامال کردیں۔ سخت آگ جو ہر اس چیز کو جو اس میں ڈالی جائے بھسم کرکے رکھدے۔ ایسا چرواہا جو اپنے جانوروں پر سخت ظلم کرے۔

سورۃ نمل میں ہے لَا يَحْطِمَنَّكُمْ (۲۷/۱۸) ''وہ کہیں تمہیں کچل نہ ڈالیں''۔

سورۃ زمر میں ہے ثُمَّ يَجْعَلُهُ حُطَامًا (۳۹/۲۱) پھر وہ اسے چورا چورا کر دیتا ہے۔ کچلی ہوئی چیز کیطرح کر دیتا ہے۔ سورۃ اَلْهُمَزَةُ میں جہنم کیلئے اَلْحُطَمَةُ آیا ہے (۱۰۴/۴)۔ یعنی جس میں انسانیت کچلی جائے۔

ح ظ ر

حَظَرَهُ الشَّيْئَ يَحْظُرُهُ۔ اس سے کسی چیز کو روک دینا، بند کر دینا، منع کر دینا۔ جب کوئی شے تمہارے اور کسی دوسرے کے درمیان روک بن کر حائل ہوجائے تو کہتے ہیں حَظَرَهُ عَلَيْكَ۔ اَلْحَظِيْرَةُ۔ باڑ جو کھیت کے گرد لگادی جائے۔ احاطہ۔ کھجور کی شاخوں اور پتھوں سے ایک دائرہ سا بنا لیتے ہیں جس میں کجھوریں توڑ توڑ کر اکٹھی کرتے جاتے ہیں۔ نیز اونٹوں وغیرہ کا باڑہ۔ اَلْحِظَارُ۔ دیوار کو بھی کہتے ہیں۔

اَلْحَظِيْرُ۔ بخیل کو بھی کہتے ہیں کیونکہ وہ مال کو اپنے لئے روک رکھتا ہے اور نوع انسانی کیلئے کھلا نہیں رکھتا۔ اَلْمَحْظُوْرُ۔ روکا ہوا۔ محروم۔ جیسے کسی چیز کے لینے سے روک دیا ہو*۔

---

*راغب۔ *تاج و محیط و راغب۔

قرآن کریم میں ہے کہ جہانتک خدا کے قانون طبعی کے ذریعہ دنیا کے مال و متاع سامنے کا تعلق ہے یہ ہر شخص کو اسکی کوشش کے مطابق مل سکتا ہے۔ اس میں کافر و مومن، کسی کی تمیز نہیں۔ مَا كَانَ عَطَاءُ رَبِّكَ مَحْظُوْرًا (۱۷/۲۰) " خدا نے اپنی عطا کردہ نعمتوں پر کوئی احاطہ بندی نہیں کر رکھی "۔ اسے تمام نوع انسانی کی ربوبیت عامہ کیلئے کھلا رکھا ہے۔ لہذا انہیں اسی طرح کھلا رہنا چاہئے۔ جو نظام، خدا کے دیئے ہوئے رزق کے سرچشموں کو افراد کی ملکیتوں میں دیکر انہیں محظور کر دیتا ہے وہ خدا کے نظامِ ربّ العالمینی کی خلاف ورزی کرتا ہے۔ اس لئے وہ کبھی کامیاب نہیں ہوسکتا۔ اسی کو يَمْنَعُوْنَ الْمَاعُوْنَ (۱۰۷/۷) کہا گیا ہے۔ یعنی جس رزق کو پانی کی طرح بہتا رہنا چاہئے تھا اسے بند لگا کر روک رکھنا۔

سورۃ قمر میں قوم ثمود کی تباہی کے ضمن میں ہے فَكَانُوْا كَهَشِيْمِ الْمُحْتَظِرِ (۵۴/۳۱)۔ وہ ایسے ہوگئے جیسے پرانی باڑ کا فرسودہ چورہ ہوتا ہے۔ (ابن فارس) یا اس بھوسہ کی طرح ہوگئے جس کو رکھنے کیلئے باڑ بنانے والا باڑ بناتا ہے۔

ح ظ ظ

اَلْحَظُّ۔ نصیب۔ مقررہ حصہ۔ بخت۔ اَحَظَّ فُلَانٌ۔ فلاں شخص خوش بخت اور مالدار ہو گیا۔ اَلْحَظِيْظُ۔ خوش نصیب و آسودہ حال*۔

قرآن کریم میں بہت بڑے نصیب والے (خوش بخت) کو ذُوْ حَظٍّ عَظِيْمٍ کہا گیا ہے (۴۱/۳۵)۔ یہ وہ ہے جو برائی کو حسن کارانہ انداز سے دور کرتا اور جادۂ حق پر استقامت سے چلے جاتا ہے (۴۱/۳۰-۳۵)۔

ح ف د

حَفَدَ۔ يَحْفِدُ۔ کام میں پھرتی اور جلدی کرنا۔ خدمت کرنا۔ اَلْحَفَدُ و اَلْحَفَدَةُ۔ خدام و اعوان (حَافِدٌ کی جمع ہے) جو شخص کوئی کام کرے اور اس میں اطاعت اور تیزی دکھائے تو اسے حَافِدٌ کہتے ہیں*۔ قرآن کریم میں ہے وَ جَعَلَ لَكُمْ مِنْ اَزْوَاجِكُمْ بَنِيْنَ وَ حَفَدَةً (۱۶/۷۲) " اس نے تمہارے لئے تمہاری بیویوں سے اولاد (بیٹے) پیدا کی۔ اور خدمتگار بھی "۔ بعض نے کہا ہے کہ حَفَادُ الرَّجُلِ۔ آدمی کی اولاد اور

* تاج۔

اولاد در اولاد کو کہتے ہیں ۔ بعض نے کہا ہے کہ یہ نسبتی رشتہ داروں کو کہتے ہیں ۔ بعض نے پوتے مراد لئے ہیں *** ۔ لیکن اکثریت اسی طرف گئی ہے کہ اس سے مراد خدمتگار ہی ہیں ۔ اور آیت کے معنی یہ ہیں کہ تمہاری بیویوں سے تمہاری اولاد پیدا کی ۔ نیز تمہارے لئے خدمتگار بنائے ۔ پوتے وغیرہ بھی اسلئے مراد لئے جاتے ہیں کہ ان کی خدمت زیادہ صداقت آمیز ہوتی ہے ** ۔ واضح رہے کہ '' خدمتگار '' سے مراد کام کاج میں معاون اور مددگار ہیں ۔ ہمارے موجودہ تصور کے مطابق '' نوکر '' نہیں جنہیں انسانیت کا درجہ ہی نہیں دیا جاتا ۔

ح ف ر

حَفَرَ الشَّیْءَ یَحْفِرُہٗ ۔ کسی چیز کو کھودنا ۔ جو جگہ کھودی جائے اسے حُفْرَۃٌ کہتے ہیں اور جس چیز سے کھودا جائے اسے مِحْفَارٌ * ۔ اَلْحُفْرَۃُ ۔ گڑھا * (۳/۱۰۲) اَلْحَافِرُ ۔ جانور کے سم کو کہتے ہیں ، کیونکہ وہ چلنے میں مٹی کھودتا چلا جاتا ہے ۔ اسی سے حَافِرَۃٌ اس راستہ کو کہتے ہیں جس پر کوئی نشان بناتا گیا ہو ۔ چنانچہ کہتے ہیں رَجَعْتُ عَلٰی حَافِرَتِیْ ۔ میں اپنے اس راستہ پر لوٹ آیا جس پر میں گیا تھا ۔ یعنے اپنی پہلی حالت پر واپس آجانا * ۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی کھودنے کے علاوہ ، اوّلِ امر کے بھی ہیں ۔

سورۃ نَازِعٰت میں ہے کہ جب ان لوگوں سے کہا جاتا ہے کہ آنے والے انقلاب میں ان سے وہ سب قوت و دولت چھن جائیگی جو انہوں نے اسطرح سلب و نہب سے حاصل کر رکھی ہے اور اسطرح وہ اُسی حالت پر لوٹ جائینگے جس پر وہ اس دولت و قوت کے حصول سے پہلے تھے ، تو یہ اسکا مذاق اڑاتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ، ذرا ان کی سننا ! یہ کہہ رہے ہیں کہ ہماری پھر وہی پہلی سی حالت ہو جائیگی ۔ یَقُوْلُوْنَ ءَاِنَّا لَمَرْدُوْدُوْنَ فِی الْحَافِرَۃِ (۷۹/۱۰) ۔ صاحب تاج نے لکھا ہے کہ حَافِرَۃٌ اسطرح لوٹنے کو کہتے ہیں کہ آخری حصہ بالکل پہلے حصہ پر پلٹ جائے **** ۔ (As you were) ہو جانا ۔ یا مرنے کے بعد جب ہڈیاں تک کھوکھلی ہو جائیں ، پھر زندگی کی حالت کیطرف لوٹ آنا ۔ یعنی دوبارہ زندہ ہوجانا ۔

* تاج و راغب ۔ ** راغب ۔ *** لطائف اللغۃ ۔ **** تاج

ح ف ظ

حَفِظَہٗ ۔ حِفْظًا ۔ نگہبانی کرنا ۔ حفاظت کرنا ۔ بچانا * ۔ اَلْحِفْظُ کے بھی یہی معنے ہیں (۱۲/۶۴) ۔ نواب صدیق حسن خان نے لکھا ہے کہ جن الفاظ میں حآء اور فآء اکٹھے آئیں اُن میں جمع کرنے کا مفہوم مضمر ہوتا ہے ۔ محفوظ کرنے کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ اُس شے کو منتشر نہ ہونے دیا جائے ۔ جمع رکھا جائے ۔ حَافِظٌ ۔ حَفِیْظٌ ۔ وہ شخص جو کسی چیز کی نگہبانی کیلئے مقرر کیا گیا ہو ۔ محافظ ۔ نگہبان * ۔ اِنْ کُلُّ نَفْسٍ لَّمَّا عَلَیْهَا حَافِظٌ (۸۶/۴) ۔ '' ہر شخص پر نگہبان مقرر ہے '' ۔ اور اِنَّ رَبِّیْ عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ حَفِیْظٌ (۱۱/۵۷) ۔ '' میرا رب ہر شے کا نگہبان ہے '' ۔ سورۃ قٓ میں مومن کو بھی حَفِیْظٌ (۵۰/۳۲) کہا گیا ہے ۔ اس کے معنے ہونگے قانون خداوندی کی نگہداشت کرنے والا ۔ حَافِظٌ کی جمع حَفَظَۃٌ ہے ۔

قرآن کریم میں یہ لفظ اُن کائناتی قوتوں (ملائکہ) کیلئے بھی آیا ہے جو قانونِ خداوندی کے مطابق ہر شے پر کنٹرول رکھتی ہیں ۔ (۶/۶۱) ۔ اِسْتَحْفَظَ حفاظت کی خواہش کرنا ۔ سورۃ مائدہ میں ہے بِمَا اسْتُحْفِظُوْا مِنْ کِتَابِ اللّٰہِ (۵/۴۴) یعنے جو کتاب اللہ انکی حفاظت میں دی گئی تھی ۔ جس کی حفاظت کا ان سے مطالبہ کیا گیا تھا ۔ مَحْفُوْظٌ ۔ حفاظت میں رکھا ہوا ۔ سورۃ انبیاء میں ہے وَ جَعَلْنَا السَّمَآءَ سَقْفًا مَّحْفُوْظًا (۲۱/۳۲) ۔ ''ہم نے آسمان کو محفوظ چھت بنایا'' ۔ فتح القدیر میں ہے کہ اسکے معنے مَرْفُوْعًا اونچا ہیں ** ۔ لیکن ہمیں لغت سے اسکی تائید نہیں ملی شاید یہ معنی اس اعتبار سے لئے گئے ہوں کہ حفاظت کی غرض سے کسی شے کو اتنی بلندی پر رکھ دیا جائے جو لوگوں کی دسترس سے باہر ہو ۔ لیکن یہ معنی قیاسی ہونگے ۔ (آیت کے مفہوم کے لئے دیکھئے عنوان س ۔ م ۔ و) ۔

نصر نے کہا ہے کہ اَلْحَافِظُ سیدھے اور واضح راستے کو بھی کہتے ہیں * ۔

ح ف ف

اَلْحِفَافُ ۔ گنجے کے سر کے ارد گرد کے بال ۔ اس سے اسکے معنے ہوتے ہیں ہر وہ چیز جو کسی چیز کے گردا گرد واقع ہو اور اسے اپنے گھیرے میں لئے ہو ۔ حَفَّهٗ بِالشَّیْءِ ۔ اس نے اسے کسی چیز کے ذریعہ گھیر لیا ۔

---

* تاج ۔ ** بحوالہ غریب القرآن میرزا ابوالفضل ۔

حَفَّفَ حَوْلَہٗ ۔ اس نے اسکے گرد گھیرا ڈال دیا * ۔ اصل میں ، جس لفظ میں حآء اور فآء اکٹھے ہوں اس میں جمع کرنے کا مفہوم مضمر ہوتا ہے ** ۔

سورۃ کہف میں دو باغوں کے متعلق ہے ۔ حَفَفْنٰهُمَا بِنَخْلٍ (۱۸/۳۲) " ہم نے انکے گردا گرد کھجوریں لگائیں "۔ سورۃ زمر میں ہے وَ تَرَى الْمَلٰٓئِكَةَ حَآفِّيْنَ مِنْ حَوْلِ الْعَرْشِ (۳۹/۷۵) ۔ " تو ملائکہ کو دیکھیگا کہ وہ عرش کے اردگرد گھیرا ڈالے ہیں "۔ عرش ، کائنات کے کنٹرول کا مرکز ہے ۔ اور ملائکہ ، عالم امر و خلق کی وہ قوتیں جو مشیت کے پروگرام کو بروئے کار لاتی ہیں ۔ یہ سب قوتیں خدا کے کائناتی کنٹرول کے مطابق سرگرم عمل رہتی ہیں ۔

ح ف ی (ح ف و)

اَلْحَفَا ۔ آدمی یا اونٹ کے پاؤں اور جانوروں کے سُم یا کھر کا زیادہ چلنے سے چھل جانا ۔ ننگے پاؤں ، بغیر جوتے یا موزے کے چلنا ۔ اِحْتَفٰى ۔ وہ ننگے پاؤں چلا **** ۔ چونکہ انسان ننگے پاؤں اس کام کے لئے اٹھ کر چل دیتا ہے جسکے متعلق اسے بڑی کاوش اور اضطراب ہو ، اس لئے اس لفظ کا استعمال شدت اور مبالغہ کے لئے ہوتا ہے ۔ حَفِيَ بِہٖ : اسکے ساتھ مہربانی و لطف سے پیش آیا ، اس کا انتہائی اکرام و احترام کیا ، اسے دیکھ کر نہایت مسرت و شادمانی کا اظہار کیا *** ۔ حَفِيَ عَنْہُ يَحْفٰى ۔ کسی کا حال بار بار ، اکثر با صرار پوچھتے رہنا ۔ اَحْفَى السُّؤَالَ ۔ اس نے بار بار سوال دھرایا ۔ با صرار مانگا ۔ اَلْحَفِيُّ ۔ اس عالم کو کہتے ہیں جو نہایت کاوش کے ساتھ علم حاصل کرے ۔ جو بات کی تہہ تک پہنچ جائے ۔ اِسْتَحْفَى الرَّجُلُ ۔ آدمی نے بڑی کوشش اور کاوش سے بات معلوم کی **** ۔ اَلْحَافِيْ ۔ قاضی کو کہتے ہیں جو مقدمہ کی تہ تک پہنچ کر فیصلہ دیتا ہے *** ۔ اَلْحَفِيُّ ۔ بات کو اچھی طرح جاننے والا **** ۔ وسیع معلومات اور ہمہ گیر علم رکھنے والا ۔ سورۃ اعراف میں ہے يَسْئَلُوْنَكَ كَاَنَّكَ حَفِيٌّ عَنْهَا (۷/۱۸۷) یہ تجھ سے (اَلسَّاعَةُ) کے متعلق اسطرح پوچھتے ہیں گویا تو سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر اسی مسئلہ کی تحقیق کے پیچھے لگا ہوا ہے ۔ سورۃ مریم میں خدا کے متعلق ہے اِنَّهٗ كَانَ بِيْ حَفِيًّا (۱۹/۴۷) ۔ وہ مجھ پر بہت مہربان ہے " میری حاجت روا کرنے والا ہے ۔ کیونکہ حَفِيَ بِہٖ کے معنے ہیں کسی کے

* تاج و محیط ۔ ** العلم الخفاق ۔ *** محیط ۔ **** تاج ۔

اکرام میں مبالغہ سے کام لینا ۔ اصمعی نے حَفِیٌ بِہٖ کے معنے کسی کی ضرورت پر اس کے کام آنا اور اسکو عزت سے ٹھیرانا کئے ہیں* ۔ سورۃ محمد میں ہے اِنْ یَّسْئَلْکُمُوْھَا فَیُحْفِکُمْ (۳۷/۴۷) اگر وہ تم سے (مال و دولت) مانگے اور اس مانگنے میں اصرار کرے تمہارا پیچھا لے اور چمٹ جائے ۔ ننگے پاؤں تمہارے پیچھے پیچھے پھرے ۔

ابن فارس نے کہا ہے کہ اس مادہ کے بنیادی معنی (۱) روکنا ۔ (۲) سوال کرنے میں حد کر دینا ۔ اور (۳) ننگے پاؤں ہونا ہیں ۔ اس مادہ میں کسی چیز کو جڑ سے اکھیڑ دینے کے معنے بھی پائے جاتے ہیں ۔ اسی سے اِحْفَاءُ الشَّوَارِبِ ہے (یعنی مونچھوں کو جڑ سے کاٹ لینا ۔) ۔ صاحب محیط نے اس کی تائید میں ابوفراس بن حمدان عدوی کا یہ شعر نقل کیا ہے ۔

آغَایَۃُ الدِّیْنِ اَنْ تُحْفُوْا شَوَارِبَکُمْ

یَا اُمَّۃً ضَحِکَتْ مِنْ جَھْلِھَا الْاُمَمُ

کیا تمہارے نزدیک دین کی غایت یہی رہ گئی ہے کہ مونچھوں کو جڑ سے مونڈا جائے؟ اے وہ قوم کہ تیری جہالت پر دنیا کی قومیں ہنس رہی ہیں ۔

ح ق ب

اَلْحَقَبُ ۔ وہ بند جو اونٹ کے پیٹ کے نیچے سے کھینچکر کجاوہ یا کاٹھی کے ساتھ کس کر باندھا جائے ۔ (اسے ہمارے ہاں ''تنگ'' کہتے ہیں) اس کے بنیادی معنی روکنے اور قید کرنے کے ہوتے ہیں (ابن فارس) ۔ اَلْحَقِیْبَۃُ ۔ تھیلا ، بالخصوص وہ تھیلا جو پالان کے پچھلے حصہ میں لٹکا رہتا ہے ۔ اَلْمُحْتَقِبُ ۔ وہ شخص جو اپنے پیچھے کسی دوسرے آدمی کو سواری پر بٹھائے ۔ اِحْتَقَبَ فُلَانٌ ۔ فلاں آدمی نے اپنے کجاوہ یا کاٹھی کے پچھلے حصہ میں کچھ باندھ کر لٹکا لیا ۔ اِحْتَقَبَ فُلَانٌ اْلاِثْمَ ۔ فلاں آدمی نے گناہوں کا پشتارہ اپنے پیچھے باندھ لیا ۔ اَلْحِقْبَۃُ مِنَ الدَّھْرِ ۔ زمانہ کی ایک مدت جسکی مقدار مقرر نہیں ۔ اَلْحُقْبُ وَالْحُقُبُ زمانہ ۔ اسّی (۸۰) سال کا زمانہ ۔ سال ۔ سالہاسال ، (جمع اَحْقَابٌ)* ۔ یہ لفظ غیر متعین مدت کے لئے بولا جاتا ہے** سورۃ کہف میں ہے اَوْ اَمْضِیَ حُقُبًا

* تاج ۔ ** راغب ، لطائف اللغۃ میں اس کے معنے اَلدَّھر لکھے ہیں ۔ یعنی زمانہ ۔

(۲۳/۲۳)۔ ”سالہا سال تک چلتا رہوں“۔ اہلِ جہنم کے متعلق ہے لٰبِثِیْنَ فِیْھَا اَحْقَابًا (۲۳/۷۸)۔ ”وہ اس میں زمانہ دراز تک رہینگے“۔ مَادَامَتِ السَّمٰوٰتُ وَ الْاَرْضُ (۱۰۷/۱۱) تک۔ یعنی جب تک زمین و آسمان قائم ہیں۔

ح ق ف

اَلْحِقْفُ۔ لمبا بلند یا بڑا گول ریتیلا ٹیلہ۔ جمع اَحْقَافٌ ہے۔ نیز بل کھائی ہوئی ریتیلی زمین کو بھی کہتے ہیں۔ اَحْقَافٌ (۲۱/۴۶)۔ یمن میں، عمان اور حضرموت کے درمیان ٹیلے اور پہاڑ ہیں جہاں قوم عاد رہتی تھی*۔

ح ق ق

حَقٌّ کے معنے ہیں کسی چیز کا اسطرح موجود، واقع اور ثابت ہو جانا کہ اسکے واقع ہونے یا ثابت ہونے سے انکار نہ کیا جاسکے*۔ یعنی کسی چیز کا ٹھوس شکل (Concrete Form) میں سامنے آ جانا۔ یا ثابت (Establish) ہو جانا۔ جن الفاظ میں حاء اور قاف اکٹھے آئیں ان میں اثبات (ثابت ہونے) کا مفہوم مضمر ہوتا ہے**۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنوں میں صحت (صحیح ہونا) اور استحکام و ثبات دونوں شامل ہیں۔ چنانچہ کہتے ہیں عِنْدَ حَقٍّ لِقَاحِھَا۔ یعنی اونٹنی کا حمل ثابت ہونے پر۔ رَجُلٌ حَاقُّ الرَّجُلِ کے معنے ہیں اس شخص کی مردانگی ایک ناقابلِ انکار حقیقت ہے۔ رَمٰی فَاَحَقَّ الرَّمِیَّۃَ کے معنے ہیں اسنے تیر چلایا اور اس کے ساتھ ہی جانور مر گیا۔ لہذا یہ بات پایہ ثبوت تک پہنچ گئی کہ اسکا تیرنشانے پر لگا تھا۔ یعنے یہ بات محض قیاسی اور نظری نہیں کہ تیر نشانہ پر لگا ہے یا نہیں۔ مرے ہوئے شکار نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ تیر نشانہ پر لگا تھا۔ اِحْتَقَّتْ بِہِ الطَّعْنَۃُ کے معنے ہیں نیزے کے وار نے اسے قتل کردیا۔ جس سے ثابت ہو گیا کہ وار کاری تھا۔ طَعْنَۃٌ مُحْتَقَّۃٌ۔ یا مُحْتَقَّۃٌ نیزے کی اس مار کو کہتے ہیں جو سیدھی آر پار ہو جائے اور اسطرح اسکے ٹھکانے پر لگنے میں کوئی شبہ نہ رہے*۔ لہذا حَقٌّ کے معنے ہیں کسی چیز کا ٹھوس واقعہ یا حقیقت بنکر سامنے آ جانا۔ چنانچہ سورۃ احقاف میں ہے کہ مجرمین کو عذاب کے سامنے کھڑا کرکے ان سے پوچھا جائیگا کہ اَلَیْسَ ھٰذَا بِالْحَقِّ (۳۴/۴۶)۔ ”کہو اسکافات عمل ایک ٹھوس حقیقت ہے یا

* تاج و راغب۔ ** العلم الخفاق۔

نہیں؟'' اسی طرح جب حضرت یوسف ؑ کو مصر میں تمکن حاصل ہوگیا تو انہوں نے اپنے باپ سے کہا کہ ھَـذَا تَاْوِیلُ رُءْیَایَ مِنْ قَبْلُ۔ ''یہ ہے مآل اس خواب کا جو میں نے بہت پہلے (بچپن میں) دیکھا تھا''۔ قَدْ جَعَلَهَا رَبِّی حَقًّا (۱۲/۱۰۰)۔ ''میرے نشو و نما دینے والے نے اسے ایک ٹھوس واقعہ کی صورت میں سامنے لاکر دکھا دیا ہے'' ۔ اسی طرح سورۃ حجر میں ہے کہ جب حضرت ابراہیم ؑ کے مہمانوں نے انہیں انکی کبرسنی کے زمانہ میں بیٹے کی خوشخبری دی اور حضرت ابراہیم ؑ کو اس پر تعجب سا ہوا تو انہوں نے کہا بَشَّرْنٰکَ بِالْحَقِّ (۱۵/۵۵) ''ہم جو تجھے خوشخبری دے رہے ہیں وہ ایک ٹھوس واقعہ بنکر سامنے آ جائیگی'' ۔

لہذا حَقٌّ کے اولین معنے ہیں کسی چیز کا ٹھوس واقعہ یا حقیقت بنکر سامنے آجانا ۔

(۲) چونکہ کوئی شے ٹھوس واقعہ میں اسی صورت میں تبدیل ہوسکتی ہے جب اسکی نشو و نما تعمیری (Constructive) ہو ۔ اس لئے حَقٌّ ، اعمال کے محکم اور تعمیری نتائج کو کہتے ہیں ۔ چنانچہ تَحْقِیْقٌ کے معنے ہیں کپڑے کو نہایت مضبوط کر کے بُننا* ثَوْبٌ مُحَقَّقٌ اُس کپڑے کو کہتے ہیں جو پختہ بُنا ہوا ہو (محیط) ۔ اَلْحِقُّ ۔ ان اونٹوں کو کہتے ہیں جو تین سال پورے کر کے چوتھے سال میں لگ گئے ہوں اور اس قابل ہوں کہ ان سے باربرداری کا کام لیا جا سکے ۔ نیز وہ اس قابل ہوں کہ وہ اونٹنیوں کو حاملہ کر کے ٹھوس نتائج مرتب کر سکیں**۔ اِحْتَقَّ الْفَرَسُ کے معنے ہیں گھوڑا لاغر ہوگیا، دبلا ہوگیا اور اِحْتَقَّ الْمَالُ کے معنی ہیں مویشی موٹے ہو گئے **۔ اِنْحَقَّتِ الْعُقْدَۃُ ۔ کے معنے ہیں گرہ نہایت مضبوطی سے لگ گئی** ۔ لہذا حَقٌّ کے معنے ہوئے ٹھوس تعمیری واقعہ جو اپنی جگہ پر ثابت اور محکم ہو ۔ امٹ ہو ۔ اسلئے قرآن کریم میں یُحِقُّ ۔ بمقابلہ یَمْحُ (یمحو) آیا ہے ۔ وَ یَمْحُ اللّٰہُ الْبَاطِلَ وَ یُحِقُّ الْحَقَّ بِکَلِمٰتِہٖ (۴۲/۲۴) ۔ خدا کا قانونِ کائنات ، تخریبی قوتوں کے نتائج کو مٹا دیتا ہے اور تعمیری قوتوں کے نتائج کو برقرار رکھتا ہے ، جو ٹھوس شکل میں موجود رہتے ہیں ۔

(۳) کوئی چیز اسی صورت مین باقی رہ سکتی ہے کہ وہ قانونِ حفظ و بقا کے عین مطابق ہو ۔ جو زمانہ کے تقاضوں کا ساتھ دے سکے ۔ جو اپنی جگہ

*لین ۔ ** تاج ۔

پر بھی فیٹ ہو اور بدلنے والے حالات سے بھی موافق رہے ۔ چنانچہ حَقّ کے تیسرے معنے ہیں علم و عقل ، عدل و انصاف اور واقعات ومصالح کے عین مطابق ہونا ۔ راغب نے اسے ایک مثال سے سمجھایا ہے ۔ آجکل تو دروازوں میں قبضے لگے ہوتے ہیں لیکن پرانے زمانہ میں دروازوں کے اوپر اور نیچے گلّی کی طرح لکڑی بڑھی ہوئی ہوتی تھی اور وہ لکڑی ساکٹ (Socket) میں اسطرح فیٹ آجاتی تھی کہ وہ اپنی جگہ پر قائم بھی رہتی تھی اور دروازے کے ساتھ گھومتی بھی تھی ۔ راغب کے نزدیک حَقّ کی یہی کیفیت ہوتی ہے ** ۔ چنانچہ حَقّ اس موجد کو کہتے ہیں جو حکمت کے تقاضوں کے مطابق اشیاء کو ایجاد کرے ۔ اس لئے خدا کو اَلْحَقّ کہا گیا ہے *** ۔ نیز ہر اس موجود چیز کو حَقّ کہتے ہیں جو حکمت کے تقاضوں کے مطابق ہو ** ۔ اَلْاَحَقّ مِنَ الْفَرَسِ ۔ اس گھوڑے کو کہتے ہیں جو اپنا پچھلا پاؤں ٹھیک اس جگہ رکھے جہاں اسکا اگلا پاؤں پڑا تھا * ۔

ان معانی کی روشنی میں حَقّ اور بَاطِل کی قرآنی اصطلاحات کا صحیح صحیح مفہوم سمجھ میں آ جائیگا ۔

حَقَّ الْاَمْرُ یَحِقُّ اور یَحُقُّ کے معنے ہیں وہ اس واجب ہو گیا ۔ یعنی کسی بات کا واجب ہونا ۔ حَقِیْقَةٌ ۔ اس چیز کو کہتے ہیں جسکی حفاظت تم پر واجب ہو جائے ۔ حَقًّا عَلَى الْمُتَّقِیْنَ (۲/۱۸۰) کے یہی معنے ہیں ۔ یعنے متقین کے ذمہ اتنا ہی نہیں کہ وہ اس قانون (وصیت) پر خود ہی عمل پیرا ہوں بلکہ ان پر یہ بھی واجب ہے کہ وہ اسکی حفاظت کریں ۔ نیز کسی ملک کے جھنڈے کو بھی حَقِیْقَةٌ کہتے ہیں کیونکہ اس سے اس ملک کے وجود کا اثبات ہوتا ہے ۔ اور اسکی حفاظت ہر ایک پر واجب ہوتی ہے * ۔

حَقَّ الطَّرِیْقَ ۔ کے معنے ہیں وہ سوار ہوکر راستہ کے درمیان چلا ۔ اور اسطرح نمایاں ہوکر سامنے آگیا * ۔

سورۃ یونس میں حَقّ کا لفظ ظَنّ کے مقابلہ میں آیا ہے (۱۰/۳۶) جہاں کہا گیا ہے کہ ظَنّ ، حق کے مقابلہ میں کچھ کام نہیں دیتا ۔ اس لئے اتباع ، حق کی کرنی چاہئے نہ کہ ظن کی ۔ دین یکسر حق ہے ۔ اس میں ظن کے لئے کوئی گنجائش نہیں ۔ خدا خود حق ہے (۱۰/۳۰) ۔ اس کا رسول حق ہے (۳/۸۵) ۔ اسکی طرف سے بھیجا ہوا قرآن کریم حق ہے (۶/۳۴) ۔ اس کے وعدے (قوانین) حق

* تاج ۔ ** راغب ۔ *** راغب و تاج ۔

ھیں (۱۰/۵۵) ۔ اس کا دین حق ہے (۹/۳۳) ۔ اور یہ کائنات بالحق پیدا کی گئی ہے (۳۹/۵) ۔ چونکہ حَقٌّ ۔ ظن و شکوک سے بلند ھوتا ہے ۔ اور وہ ایک ٹھوس تعمیری واقعہ کی شکل میں سامنے موجود ھوتا ہے ، اس لئے ظہور نتائج کو بھی اَلْحَاقَّةُ کہا گیا ہے ۔ (۶۹/۱) ۔

تصریحات بالا سے واضح ہے کہ حَقٌّ کوئی ذھنی ، نظری ، تصوراتی ، یا محض عقیدہ کی چیز نہیں ۔ یہ عقائد اور نظریات حیات کے تعمیری نتائج کا نام ہے جو ٹھوس شکل میں سامنے آ جائیں اور جو زمانہ کے بڑھتے ہوئے تقاضوں کا ساتھ دیتے چلے جائیں اور اپنی صداقتوں کیلئے خارجی دلائل کے محتاج نہ ھوں بلکہ سورج کی طرح اپنی دلیل آپ ھوں ۔ اس دنیا سے متعلق کوئی عقیدہ حق ثابت نہیں کہلا سکتا جب تک اسکے تعمیری نتائج ایک ٹھوس حقیقت بنکر سامنے نہ آجائیں ۔

قرآن کریم میں سَمَاءٌ کے متعلق ہے کہ وہ پھٹ جائیگا اور زمین کے متعلق ہے کہ وہ خالی ھو جائیگی (ان امور کی تشریح " مفہوم القرآن ،، میں ملیگی) اسکے بعد فرمایا کہ وَ اَذِنَتْ لِرَبِّهَا وَ حُقَّتْ (۸۴/۲-۵) ۔ "وہ اپنے نشو و نما دینے والے کے قانون پر عمل کریگی اور اسے بنایا ھی اسکے مطابق گیا ہے ،، ۔ اسی طرح اعمال کے نتائج واجب ھوجانے کیلئے حَقَّ عَلَيْهِمُ الضَّلَالَةُ (۷/۳۰) ۔ اور فَحَقَّ عَلَيْهَا الْقَوْلُ (۱۷/۱۶) ۔ فَحَقَّ وَعِيْدِ (۵۰/۱۴) ۔ اور فَحَقَّ عِقَابِ (۳۸/۱۴) آیا ہے ۔ یا حَقًّا عَلَيْنَا نُنْجِ الْمُؤْمِنِيْنَ (۱۰/۱۰۳) ۔"مومنین کو مخالفین کی تدابیر سے محفوظ رکھنا ھم پر واجب ھوتا ہے ،، ۔

حَقِيْقٌ (۷/۱۰۵) ۔ مناسب ۔ ضروری ۔ واجب ۔ لازم ۔

اِسْتَحَقَّا اِثْمًا (۵/۱۰۷) ۔ انہوں نے ارتکاب جرم کیا ہے ۔ (دیکھئے ! یہاں بھی واقعہ کے سرزد ھونے ، یعنی اس کے اس واقعہ بن جانے کے لئے یہ لفظ آیا ہے ۔ یہ حَقٌّ کے بنیادی معنی ھیں) ۔

(حَقٌّ کے ساتھ بَاطِلٌ کا عنوان بھی دیکھئے تا کہ دونوں کے تقابل سے مفہوم اور نکھر جائے) ۔

ح ک م

اَلْحَكَمَةُ ۔ گھوڑے کی لگام کو کہتے ھیں** ۔ بلکہ منہ میں لگام دیکر جس چمڑے سے اسے باندھ دیا جائے کہ وہ اسکے دونوں جبڑوں کو کس لے اور

* تاج ۔ **راغب ۔

ادھر ادھر نہ ہونے دے ۔ اسے حَکَمَۃٌ کہتے تھے ۔ اَحْکَمَ الْفَرَسَ کے معنے ہیں گھوڑے کو اسطرح کی لگام دینا * ۔ چونکہ اس لگام کا کام یہ ہے کہ گھوڑے کو سرکشی اور بے راہرو ہونے سے روک دے اسلئے حَکَمْتُ الْفَرَسَ کے معنی ہیں میں نے گھوڑے کو روکا اور (لگام کے ذریعہ) قابو میں لیا۔ اَحْکَمَہٗ عَنِ الْاَمْرِ کے معنے ہیں ، اسے اس بات سے روک دیا ۔ منع کردیا ۔* ابن فارس نے کہا ہے کہ یہ اس کے بنیادی معنی ہیں ۔ روکنے اور منع کرنے کا مطلب یہ ہے کہ ہر شخص کو بتا دیا جائے کہ اس کی آخری حد کونسی ہے جس سے آگے وہ نہیں بڑھ سکتا ۔ اسی کو اختلافی امور میں فیصلہ کرنا کہتے ہیں ۔ یعنی ہر ایک کے حقوق و واجبات کی حدیں متعین کر دینا اور کسی کو ان سے آگے نہ بڑھنے دینا ۔ اسی کو حُکْمٌ کہتے ہیں ۔ یعنی فیصلہ * ۔ حَاکِمٌ کے معنے ہیں فیصلہ کرنے والا ۔ اس قسم کا حکم دینے والا جسکا ذکر اوپر کیا گیا ہے ۔ حَکَمَ بَیْنَہُمْ کَذَالِکَ کے معنے ہیں اس نے ان کے درمیان اس طرح کا فیصلہ کیا * ۔ اَلْحُکُوْمَۃُ اسی سے اسم ہے * ۔ اَلْحَکَمُ ۔ صاحبِ اختیار ثالث یا پنچ ۔ ایسا فیصلہ کرنے والا جسے موافقت یا مخالفت میں فیصلے کا پورا پورا اختیار ہو ۔ قانون نافذ کرنے والا ۔ ($\frac{۳}{۳۵}$ و $\frac{۶}{۱۱۵}$)۔

اَلْحِکْمَۃُ کے معنے ہیں فیصلہ میں عدل و انصاف کو ملحوظ رکھنا * ۔ یعنے ہر ایک کے حقوق کی حدیں مقرر کرکے کسی کو ان سے تجاوز نہ کرنے دینا ۔ اسی لئے حَکِیْمٌ اُس شخص کو بھی کہتے ہیں جو ہر چیز کو صحیح تناسب و توازن کے ساتھ ، ہر تقاضے کو ملحوظ رکھتے ہوئے ، نہایت حسن و اتقان کے ساتھ بنائے ، یا معاملات کو اسطرح سر انجام دے ** ۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ حِکْمَۃٌ کو حکمت اسلئے کہتے ہیں کہ وہ جہالت اور نادانی کی باتوں سے روکتی ہے ۔ اقبال کی اصطلاح میں حِکْمَۃٌ ، "رائے با قوت" کو کہینگے ۔ یعنی فیصلہ دینے کی صلاحیت اور پھر اس فیصلہ کو نافذ کرنے کی قدرت ۔ اسی کو آجکل کی زبان میں حکومت کہتے ہیں ۔

چونکہ حَکَمَ کے معنے کسی چیز کو (ایک مقام پر) روک دینے کے ہیں ۔ اور جو چیز ایک مقام پر جم کر کھڑی ہو جائے وہ مستحکم ہو جاتی ہے ۔ اسلئے اَحْکَمَہٗ کے معنے ہیں اسکو مستحکم کردیا ** ۔ اسے ایسا بنا دیا کہ وہ اپنے مقام سے نہ ہلے ۔

قرآن کریم کو حَکِیْمٌ کہا گیا ہے ($\frac{۳۶}{۲}$) کیونکہ وہ ہر شے کا صحیح مقام متعین کر کے کسی کو ان حدود سے آگے نہیں بڑھنے دیتا ۔ وہ

* تاج (نیز کتاب الاشتقاق) ۔ ** تاج و محیط ۔ *** راغب ۔

تمام اختلافی امور میں صحیح فیصلے کرتا ہے۔ خدا کو بھی حَکِیْمٌ کہا گیا ہے (۲/۳۲)۔ کیونکہ وہ کائنات کو ٹھیک ٹھیک راستہ پر چلاتا ہے۔ ہر شے کو صحیح صحیح اندازے اور تناسب کے مطابق پیدا کرتا ہے اور اپنے قانون کی لگام سے ہر شے کو مسخر کئے ہوئے ہے یَحْکُمُ بَیْنَھُمْ فِیْمَا کَانُوْا فِیْہِ یَخْتَلِفُوْنَ (۲/۱۱۳) وہ انسانوں کے اختلافی امور میں فیصلے کرتا ہے۔

قرآن نے کہا ہے کہ اسکی آیات مُحْکَمٰتٌ اور مُتَشَابِھَاتٌ ہیں۔ یہ بڑا اہم نکتہ ہے جسکا اچھی طرح سے سمجھ لینا ضروری ہے۔ سورۃ آل عمران میں ہے۔ ھُوَ الَّذِیْٓ اَنْزَلَ عَلَیْکَ الْکِتٰبَ مِنْہُ اٰیٰتٌ مُّحْکَمٰتٌ ھُنَّ اُمُّ الْکِتٰبِ وَ اُخَرُ مُتَشٰبِھٰتٌ۔ فَاَمَّا الَّذِیْنَ فِیْ قُلُوْبِھِمْ زَیْغٌ فَیَتَّبِعُوْنَ مَاتَشَابَہَ مِنْہُ ابْتِغَآءَ الْفِتْنَۃِ وَ ابْتِغَآءَ تَاْوِیْلِہٖ وَمَا یَعْلَمُ تَاْوِیْلَہٗٓ اِلَّا اللّٰہُ وَ الرّٰسِخُوْنَ فِی الْعِلْمِ یَقُوْلُوْنَ اٰمَنَّا بِہٖ کُلٌّ مِّنْ عِنْدِ رَبِّنَا وَمَا یَذَّکَّرُ اِلَّآ اُولُوا الْاَلْبَابِ (۳/۶)۔

عام الفاظ میں اس آیت کا ترجمہ یہ ہے۔

اللہ وہ ہے جس نے تجھ پر یہ کتاب اتاری ہے۔ اس میں ایک قسم تو ایسی آیتوں کی ہے جو "محکم" ہیں اور وہی کتاب کی اصل و بنیاد ہیں۔ دوسری قسم "متشابہات" کی ہے۔ سو جن لوگوں کے دلوں میں کجی ہے وہ ان آیتوں کے پیچھے پڑتے ہیں جو "متشابہ" ہیں تاکہ فتنہ پیدا کریں اور انکی تاویل نکالیں۔ حالانکہ اسکی تاویل اللہ جانتا ہے اور وہ لوگ (جانتے ہیں) جو علم میں پختہ ہوتے ہیں۔ یہ کہتے ہوئے کہ ہم ان سب پر ایمان رکھتے ہیں۔ یہ سب ہمارے پروردگار کی طرف سے ہے۔ (حقیقت یہ ہے کہ) حقائق کو وہی لوگ سمجھ سکتے ہیں جو عقل و بصیرت والے ہیں۔

ہم نے اس ترجمہ میں "محکم"۔ "متشابہ"۔ "تاویل"۔ وغیرہ الفاظ کو اسی طرح لکھ دیا ہے۔ اس لئے کہ انہی کے مفہوم کی وضاحت سے اس نکتے کی وضاحت ہوگی۔

جیسا کہ ہم اوپر دیکھ چکے ہیں، مُحْکَمٌ کے معنے ہیں اپنی جگہ پر قائم۔ اٹل۔ صاف صاف فیصلہ کرنے والا۔ مستحکم۔ لیکن یہاں اس کے مقابل میں مُتَشَابِھَاتٌ کا لفظ آیا ہے اس لئے مُحْکَمٌ کے معنے ہونگے وہ جو مُتَشَابِہ نہ ہو۔ اور مُتَشَابِہٌ کے معنے ہونگے وہ جو محکم نہ ہو۔ یعنے مُحْکَمٌ اور مُتَشَابِہٌ۔ مختلف قسم کی آیات ہیں۔ یا آیات کی دو قسمیں ہیں۔

مُتَشَابِہ ؕ کے تفصیلی معنے ش - ب - ہ کے عنوان میں دیکھئے - مختصر الفاظ میں اسکے معنے ہوتے ہیں ، ملتی جلتی ہوئی چیزیں جن میں باہمی مشابہت اور موافقت ہو - تشبیہ کو اسی لئے تشبیہ کہتے ہیں کہ اس سے ایک چیز کو اس سے ملتی جلتی چیز کے ساتھ مثال دیکر سمجھایا جاتا ہے -

ان معانی کے اعتبار سے مُحْکَم ؕ کے اولین معنے ہونگے ایسی آیات جن کے الفاظ سے وہی مفہوم ہو جو ان الفاظ کے معنے ہیں - مثلاً نکاح کے ضمن میں ارشاد ہے حُرِّمَتْ عَلَیْکُمْ اُمَّھٰتُکُمْ (۴/۲۳) - تمہاری مائیں تم پر حرام ہیں - اس میں اُمٌّ کے معنے ماں کے ہیں - یعنے وہ عورت جسکے بطن سے کوئی پیدا ہو - لیکن مُحْکَم وَ مُتَشَابِہَات کی جس آیت کو اوپر نقل کیا گیا ہے - یعنے (۳/۷) - اس میں ھُنَّ اُمُّ الْکِتَابِ میں اُمٌّ کے معنے اس قسم کی ماں نہیں - اس میں اُمٌّ کا لفظ استعارۃً استعمال کیا گیا ہے اور اس سے مفہوم ہے ''اصل و بنیاد'' - یہ اس لفظ کی تاویل ہے - تَاْوِیْل ؕ کے معنے ہیں آخری نتیجہ - جو کچھ مآل کار ہو - کسی شے کی آخری حقیقت (Ultimate Reality) - قرآن میں انسانی راہنمائی کیلئے قوانین و ضوابط دئے گئے ہیں - ظاہر ہے کہ ان احکام و قوانین کے الفاظ ایسے ہونے چاہئیں جن کا مطلب ان الفاظ سے محکم طور پر متعین ہو جاتا ہو - جیسا کہ حُرِّمَتْ عَلَیْکُمْ اُمَّھٰتُکُمْ کی مثال میں بتایا گیا ہے - اس قسم کی آیات مُحْکَمٰت ؕ ہیں - لیکن اس کے ساتھ ہی قرآن میں ایسے حقائق کا بھی ذکر ہے جن کا تعلق اُس عالم سے ہے جو ہماری سرحدِ ادراک سے باہر ہے - مثلاً اللہ کی ذات اور اسکی صفات - مرنے کے بعد کی زندگی اور اُس میں اعمال کے نتائج - وہاں کی جنت اور جہنم - یا انسانی زندگی کا منتہیٰ اور مآل - ظاہر ہے کہ اس قسم کے مجرد حقائق (Abstract Truths) کو جب بھی بیان کیا جائیگا تو تشبیہ و استعارہ اور تمثیلات کے رنگ میں بیان کیا جائیگا - یعنی اُن کا بیان (Symbolically) ممکن ہوگا - مثلاً اللہ کے متعلق کہا گیا ہے - ثُمَّ اسْتَوٰی عَلَی الْعَرْشِ (۷/۵۴) - وہ عرش پر مستوی ہو گیا - اور کَانَ عَرْشُہٗ عَلَی الْمَآءِ (۱۱/۷) اسکا عرش پانی پر ہے - ظاہر ہے کہ ان آیات میں عَرْش ؕ سے مراد لکڑی (یا کسی اور چیز کا) بنا ہوا تخت مراد نہیں - نہ ہی مَآء ؕ سے مراد پانی ہے - یہ بیان تمثیلی یا تشبیہی ہے - یعنے ان حقائق کو تشبیہ اور مثال کے ذریعے بیان کیا گیا ہے - لہذا یہ آیات مُتَشَابِہَات ؕ ہیں - ایسی آیات جن میں حقائق کو تشبیہ کے رنگ میں بیان کیا گیا ہے -

یہ بھی واضح ہے کہ جو حقائق ہمارے عالمِ محسوسات سے باہر کے ہیں' اُن کی حقیقت ، کنہ ، ماہیت ، یعنی ان کی تَنّاؔ وِ یئلْ ؔ (What they Actually are) کا سمجھنا ہمارے بس کی بات نہیں ۔ البتہ جس قسم کی مثالوں سے انہیں سمجھایا گیا ہے ان پر غورو فکر کرنے سے ہم انکے متعلق کچھ ایسا اندازہ اپنے ذہن میں لگا سکتے ہیں جو اس حقیقت کا مفہوم سمجھا دے ۔ مثلاً لفظ عَرْشٌ سے ہم سمجھ سکتے ہیں کہ اسکا مفہوم قوت و اقتدار (Authority or Control) ہے ۔ یا کَانَ عَرْشُہٗ عَلَی الْمَاءِ میں مَاءٌ سے مراد زندگی کا سرچشمہ ہے کیونکہ قرآن کریم میں دوسری جگہ ہے وَ جَعَلْنَا مِنَ الْمَاءِ کُلَّ شَیْئٍ حَیٍّ (۲۱/۳۰) ۔ ہم نے ہر زندہ شے کو پانی سے بنایا ۔ لیکن خدا اپنے کنٹرول کو کسطرح عمل میں لاتا (Exercise کرتا) ہے یا اس نے خود حیات (Life) کو کسطرح پیدا کیا ۔ ان باتوں کی کنہ و حقیقت کو ہم نہیں پاسکتے ۔ ان حقائق کی اصل و حقیقت کے متعلق ہمیں علم کا بہت تھوڑا حصہ دیا گیا ہے ۔ وَمَا اُوْتِیْتُمْ مِنَ الْعِلْمِ اِلَّا قَلِیْلًا (۱۷/۸۵) ۔ ان کی اصل و حقیقت کا واقعی علم صرف خدا کو ہو سکتا ہے ۔ البتہ جہانتک ان کا تعلق ہماری ذات اور انسان کی تمدنی زندگی سے ہے، ہم عقل و فکر کے ذریعہ اس راہنمائی تک پہنچ سکتے ہیں جو ان سے مقصود ہے ۔ وَمَا یَذَّکَّرُ اِلَّا اُولُوا الْاَلْبَابِ (۳/۷)۔

اس قسم کی آیات کے متعلق دو قسم کی ذہنیتوں کا ذکر کیا گیا ہے ۔ ایک تو وہ لوگ ہیں جن کے پیش نظر فتنہ پیدا کرنا ہوتا ہے ۔ یعنی لوگوں کو زندگی کے بنیادی حقائق اور عملی نتائج سے دور ہٹا کر محض نظری تصورات میں الجھا کر ان کی قوتوں کو تخریبی راستوں میں ضائع کرتے چلے جانا ۔ یہ لوگ ان ماوراء العقل حقائق کی کنہ و حقیقت اور کیفیت و ماہیت دریافت کرنے کیلئے نظری موشگافیاں اور تصوراتی نکتہ آفرینیاں کرتے رہتے ہیں ۔ اور ایسے بلند ترین سطح کا علم قرار دیتے ہیں ۔ یہ زمین کے ہنگاموں کو پست معاملات قرار دیکر ہمیشہ آسمان کی باتوں میں الجھے رہتے ہیں ۔ قرآن کریم ایسے فتنہ قرار دیتا ہے جو انسان کو عملی زندگی سے بیگانہ بنا دیتا ہے ۔ اس کے برعکس، دوسری ذہنیت کے لوگ وہ ہیں جنہیں قرآن کریم '' رَاسِخُوْنَ فِی الْعِلْمِ ،، اور '' اُولِی الْاَلْبَابِ ،، کہکر پکارتا ہے ۔ یعنے وہ جو عقل وفکر سے کام لیکر علم میں پختہ ہوتے چلے جاتے ہیں ۔ ان کے متعلق کہا ہے کہ وہ اپنی فکر کی عمارت کو ایمان کی بنیاد پر استوار کرتے ہیں ۔ یعنے وہ کہتے ہیں کہ یہ تمام حقائق اس خدا کی طرف سے بیان ہوئے ہیں جو ہر شے کا علم

رکھتا ہے اسلئے ان کے حقائق (Truths) ہونے میں کسی قسم کا شبہ نہیں لیکن ہم انکی کنہ و حقیقت کو پا نہیں سکتے ۔ البتہ ان سے جو انسانی راہنمائی مقصود ہے (ذکر) ہم عقل و فکر سے اس تک ضرور پہنچ سکتے ہیں ۔ ان حقائق کے متعلق ہمارے علم کی یہی حد ہے ۔ یعنے ان حقائق کا علم خدا بھی رکھتا ہے اور یہ ”رَاسِخُوْنَ فِی الْعِلْمِ ،، بھی ۔ لیکن خدا انکی کنہ و حقیت تک کا علم رکھتا ہے اور یہ لوگ صرف اس حد تک ان کا علم رکھتے ہیں جس حد تک ان سے مقصود انسانی راہنمائی (ذکر) ہوتا ہے ۔ قرآن کریم نے متعدد مقامات پر بتایا ہے کہ علم سے انسان صحیح نتیجہ تک اسی صورت میں پہنچ سکتا ہے جب وہ اپنے علم سے وحی کی روشنی میں کام لے (مثلاً دیکھئے (۳۶/۲۹ یا ۳۵/۲۸) ۔ یہ بھی سمجھ لینا چاہئے کہ ”ایمان والوں ،، میں دو قسم کے لوگ ہونگے ۔ ایک وہ عوام جو وحی پر ویسے ہی ایمان رکھتے ہیں ۔ اور دوسرے صاحبان علم و بصیرت جو عقل و فکر کی رو سے وحی کے حقائق پر غور و خوض کرتے ہیں ۔ سورۃ مدثر میں اس دوسرے گروہ کو اَلَّذِیْنَ اُوْتُوْا الْکِتٰبَ ،، کہکر پکارا گیا ہے اور ان کے برعکس عام لوگوں کو ”اَلْمُؤْمِنُوْنَ ،، (۷۴/۳۱) ۔

جن دو ذہنیتوں کا اوپر ذکر کیا گیا ہے ان کے متعلق سورۃ مدثر میں زیادہ وضاحت سے بیان کیا گیا ہے ۔ وہاں سَقَرٌ (جہنم) کے متعلق کہا ہے کہ عَلَیْھَا تِسْعَۃَ عَشَرَ (۷۴/۳۰) اس پر انیس (ملائکہ) مقرر ہیں ۔ ظاہر ہے کہ یہ ایک تمثیلی بیان ہے ۔ اس کے بعد فرمایا وَمَا جَعَلْنَا عِدَّتَھُمْ اِلَّا فِتْنَۃً لِّلَّذِیْنَ کَفَرُوْا (۷۴/۳۱) ۔ انکی یہ گنتی (یعنی اُنیس کی تعداد) ان لوگوں کےلئے وجہ ”فتنہ ،، ہے جو قرآن کے حقائق کا انکار کرتے ہیں ۔ لیکن ان کے برعکس لِیَسْتَیْقِنَ الَّذِیْنَ اُوْتُوا الْکِتٰبَ وَ یَزْدَادَ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا اِیْمَانًا ۔ جن لوگوں کو اَلْکِتٰبُ (کا علم) دیا گیا ہے ان کے دل میں اس سے یقین پیدا ہو جاتا ہے اور (عام مومنین) کے ایمان میں اضافہ ہوتا ہے ۔ وَلَا یَرْتَابَ الَّذِیْنَ اُوْتُوْا الْکِتَابَ وَ الْمُؤْمِنُوْنَ ۔ بہر حال مومنین کی جماعت کے خواص ہوں یا عوام ان میں سے کسی کےلئے بھی اس قسم کا تمثیلی بیان وجہ اضطراب وشکوک نہیں ہوتا ۔ لیکن وَلِیَقُوْلَ الَّذِیْنَ فِیْ قُلُوْبِھِمْ مَّرَضٌ وَّالْکٰفِرُوْنَ مَاذَا اَرَادَ اللّٰہُ بِھٰذَا مَثَلًا (۷۴/۳۱) جن لوگوں کے دل میں مرض ہوتا ہے ، نیز وہ لوگ جو قرآن پر سرے سے ایمان نہیں رکھتے ۔ یہ کہتے ہیں کہ اس مثال سے خدا کا حقیقی منشا کیا ہے ۔ اس کے بعد ہے کہ (قرآن میں یہ حقائق تمثیلی انداز میں بیان ہوئے ہیں) ۔ ان بیانات سے

جو چاھتا ھے صحیح راھنمائی حاصل کر لیتا ھے اور جو چاھتا ھے ان سے گمراہ ھوجاتا ھے ۔ اسکے بعد ھے وَمَا یَعْلَمُ جُنُوْدَ رَبِّکَ اِلَّا ھُوَ (۷۴/۳۱) ۔ یہ خدا کے لشکر ھیں جنکی کنہ و حقیقت کا علم صرف اسی کو ھے ۔ وَ مَا ھِیَ اِلَّا ذِکْرٰی لِلْبَشَرِ (۷۴/۳۱) ۔ لیکن ان کے تمثیلی بیان سے انسانوں کی راھنمائی مقصود ھے ۔ لھذا جو "رَاسِخُوْنَ فِی الْعِلْمِ" ھیں وہ ان کی کنہ و حقیقت کے پیچھے نہیں پڑتے بلکہ غور و فکر سے اس راھنمائی (ذکر) تک پہنچ جاتے ھیں جو ان سے مقصود ھے ۔

یہ ھے آیات مُحْکَمٰت و مُتَشَابِھٰت کا پہلا مفہوم ۔

مُتَشَابِھٰت میں ایسے حقائق بھی شامل ھیں جنھیں اس قسم کے ملتے جلتے الفاظ میں بیان کیا گیا ھے جن کا مفہوم ھر شخص اپنی اپنی علمی اور عقلی سطح کے مطابق یا ھر زمانہ کا انسان اپنے زمانہ کی علمی سطح کے مطابق سمجھ سکتا ھے ۔ یہ ظاھر ھے کہ قرآن کریم ھر سطح کے انسانوں کیلئے راھنمائی کا ضابطہ ھے اور ھر زمانہ کے انسانوں کیلئے بھی ۔ ھم دیکھتے ھیں کہ ایک ھی زمانہ میں مختلف انسان مختلف علمی اور عقلی سطح رکھتے ھیں ۔ اگر قرآن کریم کسی ایک سطح کے انسانوں کو سامنے رکھکر ھی اپنے حقائق بیان کرتا تو نہ وہ عالمگیر ھو سکتا تھا نہ ابدی ۔ وہ صرف کسی ایک زمانہ کے انسانوں کیلئے یا ایک سطح کے انسانوں کیلئے ھی مفید ھو سکتا تھا ۔ باقی انسانوں کیلئے بیکار ھوتا ۔ اس قسم کی کتاب کیلئے ضروری تھا کہ وہ ان حقائق کو ایسے ملتے جلتے الفاظ میں بیان کرے جن میں کافی وسعت اور لچک ھوتا کہ ھر سطح کا انسان اس سے فائدہ اٹھا سکے ۔ حقیقت یہ ھے کہ الفاظ کا اس قسم کا انتخاب بھی قرآن کریم کا وہ خاصہ ھے جو اعجاز کا مرتبہ رکھتا ھے ۔ ان الفاظ میں یہ خصوصیت رکھی گئی ھے کہ یہ حقیقت کو اس کے صحیح مقام پر بھی رکھتے ھیں اور اسکے ساتھ ھی اپنے اندر ایسی لچک رکھتے ھیں کہ اس سے ھر انسان اپنی اپنی سطحِ علم و عقل کے مطابق مستفید ھو سکتا ھے ۔ مثلاً قرآن کریم میں اجرامِ فلکی کے متعلق ھے کہ کُلٌّ فِیْ فَلَکٍ یَّسْبَحُوْنَ (۳۶/۴۰) ۔ ھر ایک اپنے اپنے دائرے میں تیزی سے تیر رھا ھے ۔ اور سورج کے متعلق ھے وَالشَّمْسُ تَجْرِیْ لِمُسْتَقَرٍّ لَّھَا (۳۶/۳۸) ۔ سورج اپنے مستقر کی طرف چلا جا رھا ھے ۔ اب ظاھر ھے کہ جب تک فلکیات کے متعلق (قدیم) بطلیموسی تصور رائج تھا ، اجرامِ فلکی کی گردش سے متعلق صحیح تصور ذھن انسانی میں آ نہیں سکتا تھا ۔ جب بعد میں کوپر نیکس کا

نظام سامنے آیا تو معلوم ہوا کہ اجرام سماوی کسطرح اپنے اپنے دائرے میں سرگرم گردش ہیں ۔ اسی طرح جبتک ھرشل کا نظریہ سامنے نہیں آیا تھا یہ کسی کے ذہن میں بھی نہیں آسکتا تھا کہ سورج اپنے پورے نظام کے ساتھ کسی مستقر کی طرف بھی بڑھ رہا ہے ۔ جبتک انسانی علم اتنی بلندی تک نہیں پہنچا تھا قرآن کریم کی یہ آیات مُتَشَابِهَات کی فہرست میں شامل تھیں ۔ جب یہ انکشافات ہوئے تو یہ آیات مُحْكَمَات کے زمرے میں شامل ہوگئیں ۔ اب بھی یہ آیات ایک خاص علمی سطح کے انسانوں کیلئے مُحْكَمَات کا درجہ رکھتی ہیں ۔ ان سے نیچے کی سطح والوں کیلئے یہ مُتَشَابِهَات ہی میں داخل ہیں ۔ جب تک یہ آیات مُتَشَابِهَات کے زمرے میں تھیں انکی حقیقت (تَاوِیْل) کا علم خدا کو تھا ۔ جب یہ مُحْكَمَات کے ذیل میں آگئیں تو انکی حقیقت " رَاسِخُوْنَ فِی الْعِلْمِ " پر بھی منکشف ہوگئی ۔ اسی بنا پر قرآن کریم کے متعلق کہا گیا ہے کہ اسے اس خدا نے نازل کیا ہے جو کائنات کی پستیوں اور بلندیوں کے اسرار سے واقف ہے (۲۵/۶) ۔ اور اس سے کچھ آیات بعد ہے کہ اگر ان امور کے متعلق کچھ معلوم کرنا چاہو تو فَسْئَلْ بِهٖ خَبِیْرًا (۲۵/۵۹) ۔ اس سے پوچھو جو ان اسرار سے واقف ہے ۔ جبتک انسانی علم ان حقائق کی بلندیوں تک نہیں پہنچتا ان کا واقف صرف خدا ہوتا ہے جسنے وحی کے ذریعہ ان حقائق کو بیان کردیا ہے ۔ جب انسانی علم ان کی بلندیوں تک پہنچ جائیگا تو ان حقائق کے ماہرین بھی (خدا کی دی ہوئی بصیرت کے مطابق) ان کے خبیر ہو جائینگے ۔

لہذا مُحْكَمَات و مُتَشَابِهَات کا ایک مفہوم یہ بھی ہے ۔

یہ ہیں قرآنی آیات کے مُحْكَمَات وَ مُتَشَابِهَات ہونے کے مختلف مفہوم ۔ لیکن مُحْكَمَات ہوں یا مُتَشَابِهَات تمام آیات اپنی اپنی جگہ پر یکسر مستحکم ہیں ۔ قرآن کا ایک ایک لفظ ہمالیہ پہاڑ کی طرح اپنی جگہ پر محکم ہے ۔ اسی لئے سورۃ ھود میں ہے کِتٰبٌ اُحْكِمَتْ اٰیٰتُهٗ (۱۱/۱) ۔ یہ وہ کتاب ہے جسکی تمام آیات کو محکم بنایا گیا ہے ۔ یہ کتاب مستقل اقدار (Permanent Values) کی حامل ہے ۔ اسکے حقائق غیر متبدل اور اسکے اصول تغیّر نا آشنا ہیں ۔ جن حقائق کو تمثیلی رنگ میں بیان کیا گیا ہے انکی بھی حقیقت غیر متبدل (مُحْكَم) ہے ۔ لہذا اس نقطہ نگاہ سے قرآن کریم کی تمام آیات مُحْكَمَات ہیں ۔

اسکے برعکس سورۃ زمر میں پوری کتاب کو مُتَشَابِهًا کہا گیا ہے ۔ اَللّٰهُ نَزَّلَ اَحْسَنَ الْحَدِیْثِ كِتٰبًا مُّتَشَابِهًا مَّثَانِیَ (۳۹/۲۳) ۔

لیکن یہاں مُتَشَابِهًا کا لفظ مُحْكَمًا کے مقابلہ میں استعمال نہیں ہوا بلکہ مَثَانِيَ کے مقابلہ میں استعمال ہوا ہے۔ مَثَانِيَ کے مفہوم کیلئے ث۔ن۔ی کا عنوان دیکھئے۔ یہاں مختصر طور پر یہ سمجھئے کہ مَثَانِيَ ان دو چیزوں کو کہتے ہیں جو ایک دوسرے کے آمنے سامنے کھڑی کر دی جائیں۔ یعنے ایک دوسرے کی ضد ہوں۔ قرآن کریم کا انداز بیان یہ ہے کہ وہ ایک چیز کی وضاحت اسکی ضد کو سامنے لا کر کرتا ہے۔ مثلاً نور (روشنی) کے مقابلہ میں ظلمت (تاریکی) کا ذکر کرتا ہے۔ یہ دونوں (نورو ظلمت) باہمدگر مَثَانِيَ ہیں۔ اس طریق بیان سے بات بالکل واضح ہوجاتی ہے (چنانچہ بعض فلاسفرز کا تو خیال ہے کہ اشیاء پہچانی ہی اپنے اضداد سے جاتی ہیں)۔ لیکن اس سے ذہن میں یہ خیال پیدا ہوسکتا تھا کہ قرآن کریم میں متضاد باتوں کا بیان ہے۔ اس کے متعلق اللہ نے کہدیا کہ نہیں۔ قرآن کریم میں کہیں تضاد نہیں ($\frac{4}{83}$)۔ اس کی تمام آیات باہمدگر ملتی جلتی (مُتَشَابِهًا) ہیں۔ مَثَانِيَ (متضاد اشیاء کو آمنے سامنے لانے) سے مقصود صرف یہ ہے کہ حقیقت نکھر کر سامنے آ جائے۔ لہذا قرآن کریم کی آیات مَثَانِيَ ہونے کے باوجود مُتَشَابِهٌ ہیں۔ اسطرح قرآن کریم کِتَابًا مُتَشَابِهًا مَثَانِيَ ہے۔ یا یوں کہئے کہ متشابہ وہ اسلوب بیان ہے جس میں حقائق کو ملتے جلتے انداز میں بیان کیا گیا ہے (مثلاً نُوْرٌ و هُدًى) اور مثانی وہ اسلوب ہے جس میں ایک چیز کے سامنے اسکی ضد لا کر بات واضح کی گئی ہے۔

(سَبْعًا مِنَ الْمَثَانِي ($\frac{15}{87}$) کے لئے دیکھئے عنوان ث۔ن۔ی)

قرآن کریم میں کِتَابٌ کے ساتھ حِكْمَةٌ کا لفظ بھی آیا ہے۔ وَ يُعَلِّمُكُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ ($\frac{2}{151}$)۔ ایک چیز ہوتی ہے قانون (Law) اور ایک ہوتی ہے اس قانون کی مصلحت یا غایت و علت (The why of it) قانون کو کہتے ہیں کِتَابٌ (دیکھئے عنوان ک۔ت۔ب) اور اسکی مصلحت یا علت اور غایت کو کہتے ہیں حکمت۔ اس لئے کہ یہ حِكْمَةٌ ہی ہے جو یہ بتاتی ہے کہ قانون کی غایت کیا ہے۔ اس کا متعین راستہ کونسا ہے۔ وہ کس روش پر انسانوں کو چلانا چاہتا ہے۔ اگر قرآن کریم کا مقصود یہ ہوتا کہ اس کے قانون کو مستبدانہ انداز سے (ڈنڈے کے زور پر) اندھا دھند منوایا جائے تو پھر خالی قانون (کتاب) کی ضرورت تھی۔ لیکن چونکہ اسکا مقصود یہ ہے کہ اس قانون کی اطاعت علیٰ وجہ البصیرت اور بطیب خاطر (دل کی پوری رضامندی کے ساتھ) ہو اسلئے ضروری تھا کہ ان قوانین کی حکمت

(مقصد - غایت - مصلحت) بھی ساتھ ھی واضح کر دی جائے - لھذا کتاب کے ساتھ حکمت بھی دی گئی - یہ دونوں خدا کی طرف سے بذریعہ وحی ملتے ھیں اور قرآن کریم کے اندر محفوظ ھیں - چنانچہ سورۃ نساء میں ھے وَ اَنْزَلَ اللّٰهُ عَلَيْكَ الْكِتَابَ وَ الْحِكْمَةَ (۴/۱۱۳) - خدا نے تیری طرف کتاب اور حکمت کو نازل کیا - کہیں قرآن کریم کو صرف اَلْحِكْمَةُ کہا گیا ھے (۵۴/۱۷) - کہیں اسے اَلْكِتَابُ اور اَلْحِكْمَةُ کہکر ضمیر دونوں کے لئے واحد کی استعمال کی گئی (۲/۲۳۱) تاکہ اس سے یہ حقیقت واضح ھو جائے کہ اس سے مراد ایک ھی چیز (قرآن کریم) ھے - سورۃ احزاب میں اس حقیقت کو واضح کر دیا کہ اَلْحِكْمَةُ کی بھی تلاوت ھوتی ھے (۳۳/۳۴) - اس لئے حکمت وحی غیر متلو نہیں - ان حقائق سے واضح ھے کہ حِکْمَت قرآن کریم کے اندر ھے - قرآن کریم سے باھر نہیں -

حِکْمَت کو وحی کے ذریعہ نازل کرنے میں ایک بہت بڑا مقصد تھا - قرآن کریم نے احکام و قوانین اسلئے دیے ھیں تاکہ ان کا نتیجہ مرتب ھو - یعنی اسکے قوانین مقصود بالذات نہیں بلکہ ایک نتیجہ پیدا کرنے (ایک مقصد حاصل کرنے) کا ذریعہ ھیں - اگر اللہ کی طرف سے صرف قوانین مل جاتے اور یہ نہ بتایا جاتا کہ ان قوانین پر عمل کرنے سے نتیجہ کیا نکلیگا تو ھو سکتا تھا کہ ھم ان قوانین پر اپنے طور پر عمل کر کے مطمئن ھو کر بیٹھ جاتے کہ خدا کا منشا پورا ھو گیا ھے - خدا نے یہ نہیں کیا - اسنے قوانین دیے اور ساتھ ھی یہ بھی بتا دیا کہ ان قوانین پر عمل کرنے کا نتیجہ کیا ھوگا - لھذا ھمیں ھر وقت یہ دیکھنا ھوگا کہ ان قوانین سے وہ نتیجہ برآمد ھو رھا ھے یا نہیں جو خدا نے متعین کیا ھے - اگر ھو رھا ھے تو پھر ان قوانین پر عمل بھی ٹھیک ھو رھا ھے - لیکن اگر ان سے وہ نتیجہ نہیں نکلتا تو پھر ھمیں رک کر اپنا جائزہ لینا ھوگا کہ ھم سے کہاں غلطی ھو رھی ھے جسکی وجہ سے ان قوانین سے ان کا متعین کردہ نتیجہ برآمد نہیں ھو رھا - مثلاً قرآن کریم میں صَلٰوۃ کے متعلق ھے کہ اَقِمِ الصَّلٰوۃَ اِنَّ الصَّلٰوۃَ تَنْهٰى عَنِ الْفَحْشَاءِ وَ الْمُنْكَرِ (۲۹/۴۵) - اسمیں اَقِمِ الصَّلٰوۃَ (صَلٰوۃ قائم کرو) حکم (کِتَاب) ھے - اور دوسرا حصہ (کہ صلٰوۃ سے فحشاء اور منکر کی روک تھام ھو جائیگی) اس کی حِکْمَت ھے - اگر صَلٰوۃ سے یہ نتیجہ مرتب نہیں ھوتا تو ھمیں سوچنا ھوگا کہ ھم سے کہاں غلطی ھو رھی ھے - کیونکہ جب خود خدا نے کہا ھے کہ اقامت صلٰوۃ سے ایسا ھوگا (تو اگر اقامت صلٰوۃ قرآن کریم کے منشاء کے مطابق ھو رھا ھے) تو اس

سے وہ نتیجہ لازمی طور پر نکلنا چاہئے ۔ اس لئے کہ یہ نتیجہ بھی خود خدا ہی کا بتایا ہوا ہے جو کبھی غلط نہیں ہوسکتا ۔ دین (قرآنی نظام) میں ہر حکم اپنا متعین نتیجہ مرتب کرتا چلا جاتا ہے ۔ یہ مقصد تھا کِتَابٌ کے ساتھ حکمت کے مُنَزَّل مِنَ اللّٰهِ ہونے کا (نیز دیکھئے عنوان ک ۔ ت ۔ ب)

حُکْمًا سے مراد وہ قوتِ فیصلہ (یا فہم) بھی ہے جو عام انسانوں کو حاصل ہوتی ہے، یعنی وحی کے بغیر۔ سورۃ قصص میں حضرت موسیٰؑ کے متعلق ہے کہ وَلَمَّا بَلَغَ اَشُدَّهٗ وَ اسْتَوٰىٓ اٰتَيْنٰهُ حُكْمًا وَّ عِلْمًا (۲۸/۱۴) جب وہ اپنی جوانی کو پہنچا اور اس کے قویٰ میں اعتدال آگیا تو ہم نے اسے حکم (فہم ۔ قوت فیصلہ) اور علم عطا کیا ۔ سیاق و سباق سے ظاہر ہے کہ یہ بات حضرت موسیٰؑ کو نبوت ملنے سے پہلے کی ہے ۔ اس لئے اس سے مراد وہ حِکْمَةٌ نہیں جو وحی کے ذریعے ملتی ہے۔ یہ وہ حکمت ہے جس کے مطابق فیصلہ کیا جاتا ہے کہ خدا کے کسی حکم یا قانون کو، کب کسطرح اور کہاں ، زمان و مکان کے تقاضوں کے مطابق، منطبق کیا جائے اور اس کے اصولی حکم کو جزئیات پر چسپاں کرنے کے لئے کیا انداز تعبیر اختیار کیا جائے ۔ یا مختلف احکام میں سے کس کو مقدم اور کس کو موخر کیا جائے ، یہ ساری حکمتیں عقل ، فہم ، فراست سے تعلق رکھتی ہیں اور اس اَلْحِکْمَةٌ سے الگ ہیں جو قرآن کریم کے اندر ہیں اور جن کا ذکر اوپر آچکا ہے ۔ نبی اکرمؐ کے متعلق قرآن کریم میں ہے يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ وَ يُزَكِّيْهِمْ وَ يُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَ الْحِكْمَةَ (۶۲/۲) ۔ اس میں تلاوتِ آیات ۔ تزکیہ ۔ تعلیمِ کتاب اور تعلیمِ حکمت، چاروں الگ الگ چیزیں ہیں ۔ اس سے مراد یہ ہے کہ رسول ایک تو ان قوانین اوران کی حکمت کی تعلیم دیتا ہے جو قرآن کریم کے اندر ہیں ۔ اور (اس نظام کی عملی تشکیل کے سلسلہ میں) بہت سی حکمتیں اس کے علاوہ بتاتا ہے اور اسطرح احکام خداوندی کے مناسب انطباق یا تقدیم و تاخیر وغیرہ کے فیصلے کرتا ہے ۔ اس تعلیم حکمت سے اُمت کو یہ سکھانا مطلوب ہوتا ہے کہ وہ بھی مختلف ادوار و حالات میں اسی طرح کی حکمتیں (سمجھ کی باتیں) کام میں لائے ۔ قرآن کریم کی بیان کردہ حکمت تو (اس کے قوانین کیطرح) غیر متبدل ہوگی لیکن یہ حکمت (عقل و فراست پر مبنی فیصلے) تغیرِ حالات سے بدلتی رہیگی ۔

حکومت ۔ قرآن کریم کا اصل الاصول یہ ہے کہ کسی انسان کو اس کا حق حاصل نہیں کہ وہ دوسرے انسانوں پر حکومت کرے ، خواہ اسے ضابطہ

قوانین ، قوتِ فیصلہ اور نبوت تک بھی کیوں نہ دے دی گئی ہو (۳/۷۹) ۔ حکومت (لوگوں میں فیصلہ کرنے اور اپنے فیصلے منوانے) کا حق صرف خدا کو حاصل ہے (۱۲/۴۰) ۔ خدا کی یہ حکومت ، اس کی کتاب (قرآن کریم) کے ذریعے قائم ہوتی ہے (۶/۱۱۵)۔ لیکن قرآن کریم کے فیصلوں کو عملاً نافذ کرنے کے لئے ایک زندہ اتھارٹی کی ضرورت لاینفک ہے ۔ ایسے اسلامی نظام یا اسلامی مملکت کہینگے جسے سب سے پہلے رسول اللہؐ نے قائم کیا تھا ۔ اس نظام کے مرکز کی اطاعت ، خود خدا کی اطاعت تھی کیونکہ وہ مرکز خدا کے احکام کی اطاعت کراتا تھا اپنے فیصلوں کی نہیں (۳/۷۹ ؛ ۵/۴۸) ۔ رسول اللہؐ کے بعد یہ نظام علٰی حالہ آگے چلا ۔ اسے خلافت علٰی منہاج رسالت کہتے ہیں ۔ (۳/۳۲،۱) الدین ، اپنی اصلی شکل میں صرف قرآنی مملکت کے اندر سامنے آسکتا ہے ۔ یہ انفرادی چیز نہیں ۔ ''خدا کی حکومت'' سے یہی مراد ہے ۔ یعنی قرآن کریم کے مطابق حکومت قائم کرنا ۔ جو ایسا نہیں کرتے ، قرآن کریم انہیں کافر کہتا ہے (۵/۴۴)۔ اس قسم کی حکومت ہر زمانے میں قائم ہو سکتی ہے ۔

ح ل ف

اَلْحَلْفُ والحَلِفُ ۔ دراصل اس قسم کو کہتے ہیں جسکے ذریعہ ایک دوسرے کے ساتھ عہد و پیمان کیا جائے ۔ اس کے بعد اس کا استعمال عام قسم کے لئے بھی ہونے لگا*۔ اَلْحِلْفُ ۔ معاہدہ جو لوگوں کے درمیان ہو ۔ دوستی نیز دوست ۔ اَلْحَلِیْفُ ۔ معاہد ۔ جس کے ساتھ عہد و پیمان کیا گیا ہو ۔ حَلَّافٌ ۔ بہت زیادہ قسمیں کھانے والا** (۶۸/۱۰) حَلَفَ ۔ یَحْلِفُ ۔ قسم کھانا ** (۹/۶۲) ۔ دراصل اس کے بنیادی معنی لزوم کے ہیں ۔ یعنی ایک چیز کا دوسری چیز کے ساتھ لگے رہنا*** ۔ اس سے اس کا مفہوم پابندی کرنا ہو گیا ۔

ح ل ق

حَلْقَةٌ ۔ ہر گول گھیرے یا دائرہ کو کہتے ہیں ۔ خواہ وہ انسانوں کا ہو یا لوہے ، چاندی ، سونے وغیرہ کا ۔ اَلْحَلْقَةُ ۔ زرہ ۔ ہتھیار ۔ رسی ۔ گول نشان جو اونٹ پر بنایا جاتا ہے**۔ ابن فارس نے اس کے بنیادی معنوں میں بال صاف کرنا ، سر کے بال مونڈنا بھی بتائے ہیں ۔ اس سے فعل حَلَقَ یَحْلِقُ کے معنے بال مونڈنے کے ہو گئے ** ۔ راغب نے بھی حَلْقٌ کے اصلی

* محیط ۔ ** تاج ۔ *** ابن فارس ۔

معنے بال کاٹ دینے کے کئے ھیں**۔ اَلْمَحْلَقُ ۔ اس جگہ کو کہتے ھیں جہاں سے جانور کو ذبح کیا جاتا ھے*۔ اس کے اندرونی حصہ کو حُلْقُوْمٌ کہتے ھیں۔

قرآن کریم میں مُحَلِّقِیْنَ رُءُوْسَکُمْ (۴۸/۲۷) آیا ھے ۔ یعنی سر منڈانے والے ۔ اور حُلْقُوْمٌ کا لفظ (۵۶/۸۳) میں بمعنے حلق آیا ھے ۔

مولانا عبید اللہ سندھی نے لکھا ھے کہ ''سیدنا ابراھیمؑ کی اولاد میں پیشانی کے بال مقدس سمجھے جاتے تھے جیسے سکھوں میں کیس ، اور ھندؤں کے ھاں ''بودی،، (چوٹی) رکھنی۔ اھل عرب بال رکھتے اور نہایت عزت سے ان کی پرورش کرتے تھے اور پھر ان کو حج کے ایام میں مقامِ منٰی میں منڈواتے تھے ۔ اور یہ منڈوانا سر کٹانے کے برابر سمجھا جاتا تھا'' ***۔

ح ل ل

حَلَّ ۔ کے اصلی معنے گرہ کھولنے کے ھیں ۔ وَاحْلُلْ عُقْدَۃً مِنْ لِسَانِیْ (۲۰/۲۷)۔ '' میری زبان کی گرہ کھولدے ''۔ اسی طرح جب کسی جمی ھوئی چیز کو پگھلا دیا جائے تو اسے بھی حَلَّ کہتے ھیں۔ یعنے اس کی گرہ کھل گئی ۔ اور وہ حل ھوگئی۔ اسکے بعد حَلَّ الْمَکَانَ کے معنے ھو گئے کسی جگہ اترنا اور قیام کرنا ۔ راغب نے کہا ھے کہ یہ دراصل حَلَّ الْاَحْمَالَ سے ماخوذ ھے جسکے معنے ھیں سامان کی رسیوں کی گرہ کھول کر اسے اونٹوں پر سے اتار لینا ۔ حَالَّہٗ کسی کے ساتھ اترنا ۔ قیام کرنا ۔ اس سے حَلِیْلٌ ھے جسکے معنے خاوند کے ھیں اور حَلِیْلَۃٌ کے معنی بیوی ۔ کیونکہ وہ ایک دوسرے کے ساتھ (ایک ھی مکان میں) رھتے ھیں ۔ یا ایک دوسرے کے لئے حلال ھیں ۔ قرآن کریم میں حَلَائِلُ اَبْنَائِکُمْ آیا ھے (۴/۲۳) ۔ حَلَائِلُ جمع ھے حَلِیْلَۃٌ کی۔ یعنی تمہارے بیٹوں کی بیویاں۔ اَلْمَحَلَّۃُ ۔ محلہ ۔ قوم کی منزل ۔ اَلْحِلَّۃُ ۔ اتری ھوئی قوم ۔ نیز محلہ ۔ اَلْحُلَّۃُ جوڑا (کپڑوں کا) جس میں عموماً قمیص ، ازار ، چادر یا عمامہ ھوتا ھے (یہ لفظ کنایۃً بیوی کے لئے بھی بولا جاتا ھے) ۔ اَلْحِلُّ ۔ حرم کے حدود سے باھر کی جگہ ۔ اَلتَّحِلَّۃُ ۔ وہ چیز جس سے قسموں کا کفارہ ادا کیا جائے (اور اسطرح قسموں کی گرہ کشائی کر لی جائے) حَلَّ اَمْرُ اللّٰہِ عَلَیْہِ ۔ اس پر خدا کا امر واجب ھوگیا ۔ عباب میں ھے کہ یَحِلُّ کے معنی واجب ھو جانے کے ھوتے ھیں اور یَحُلُّ کے معنے نازل ھونے (اترنے) کے *۔

* تاج ۔ ** راغب ۔ *** مولانا سندھی کی تفسیر المقام المحمود ۔ ص ۱۳۶

اَلْحَلَالُ (وَالْحِلَالُ) حرام کی ضد ہے۔ یعنے جس پر رکاوٹ کی گرہ نہ ہو۔ کھلی ہوئی چیزیں، جنکی حدود بندی نہ کی گئی ہو۔ اَلْحِلُّ وَالْحَلِیْلُ کے بھی یہی معنے ہیں*۔

سورۃ مائدہ میں ہے لَا تُحِلُّوْا شَعَآئِرَ اللّٰہِ (۵/۲)۔ یعنے شعائراللہ کے احترام اور تعظیم کی جو گرھیں باندھی گئی ہیں انہیں مت کھولو۔ انکا احترام کرو۔

واجب ہونے کے معنوں میں (۲۰/۸۱) میں ہے فَیَحِلَّ عَلَیْکُمْ غَضَبِیْ "تم پر میرا غضب واجب ہو جائیگا" حج میں جانوروں کے ذبح ہونے کے مقام کے متعلق ہے ثُمَّ مَحِلُّهَا اِلَى الْبَيْتِ الْعَتِيْقِ (۲۲/۳۳) "ان کے ذبح ہونے کا مقام کعبہ ہے"۔سورۃ البلد میں ہے وَاَنْتَ حِلٌّ بِهٰذَا الْبَلَدِ (۹۰/۲)۔ اسکے ایک معنے تو یہ ہیں کہ تو اس شہر میں مقیم ہے۔ لیکن اس میں حِلٌّ سے مراد حَلَالٌ بھی لی جا سکتی ہے (راغب) یعنی انہوں نے تیرے معاملہ میں اس بلد امین کی حرمت کا بھی لحاظ نہیں رکھا اور یہاں بھی تجھے تکالیف بہم پہنچائی ہیں اور تیری جان تک کے پیچھے پڑ گئے ہیں۔ مولانا محمود الحسنؒ نے اس کے معنی لکھے ہیں "اور تجھ پر قید نہیں رہیگی اس شہر کی"۔

جہاں تک حرام و حلال کا تعلق ہے، قرآن کریم کی تعلیم یہ ہے کہ سوائے ان چیزوں کے جنہیں قرآن کریم میں حرام قرار دیدیا گیا ہے (دیکھئے عنوان ح۔ر۔م) کھانے پینے کی سب چیزیں حلال ہیں۔ان پر ممانعت کی کوئی گرہ نہیں باندھی گئی۔ نہ ہی کسی کو یہ اختیار دیا گیا ہے کہ وہ کسی شے کو حرام قرار دیدے۔ (دیکھئے ۵/۸۷؛ ۶/۱۳۶؛ ۶/۱۱۹-۲۰؛ ۱۰/۵۹؛ ۱۶/۱۱۶؛ ۲۲/۳۰) حتیٰ کہ رسول کو بھی اسکا اختیار نہیں دیا گیا (۶۶/۱)۔سورۃ اعراف میں رسول اللہؐ کے متعلق جو کہا گیا ہے کہ يُحِلُّ لَهُمُ الطَّيِّبٰتِ وَيُحَرِّمُ عَلَيْهِمُ الْخَبٰٓئِثَ (۷/۱۵۷)۔ وہ طیبات کو حلال اور خبائث کو لوگوں کے لئے حرام قرار دیگا۔ تو اس سے مراد وحی کے ذریعے ایسا کرنا ہے۔ یعنی قرآن کریم کی رو سے (۶/۱۴۶؛ ۵/۱)۔

لیکن قرآن کریم نے حَلٰلًا کے ساتھ طَيِّبًا بھی کہا ہے (۲/۱۶۸)۔یعنے جتنی حلال چیزیں ہیں ان میں سے جو تمہیں مرغوب ہوں وہ کھاؤ۔ ناخوشگوار چیزیں یا مضر چیزیں مت کھاؤ۔ (حلال) کھانے کی چیزیں دیدہ زیب بھی ہوں۔

* تاج و محیط۔

خوش ذائقہ بھی اور صحت کیلئے مفید بھی۔ یعنی ہر لحاظ سے خوشگوار۔ اس میں ہر فرد کے اپنے اپنے ذوق اور پسند کی رعایت رکھدی گئی ہے۔ نیز اجتماعی مصالح اور مفاد کی گنجائش بھی۔

اس مقام پر ایک نکتہ کا سمجھ لینا ضروری ہے۔ قرآن کریم کی رو سے طیبات، حلال ہیں اور خبائث حرام۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ خدا نے جن چیزوں کو حلال قرار دیا ہے وہ سب فی ذاتہ طیب ہیں۔ یعنی پاکیزہ۔ مفید۔ منفعت بخش۔ لیکن اس کے یہ معنی نہیں کہ ہر حلال چیز کو بالضرور کھایا جائیگا۔ اگر کوئی چیز کسی کو نا پسند ہو، یا مضرت رساں، تو اسے اجازت ہے کہ وہ شے نہ کھائے۔ لیکن اسے حرام نہ سمجھے۔ اسی طرح اجتماعی مصالح کے پیش نظر، اسلامی معاشرہ، وقتی طور پر بعض چیزوں کے استعمال کو ممنوع قرار دے سکتا ہے۔

۔ ایسی پابندیاں عائد کرنے میں بھی کوئی حرج نہیں۔ لیکن کسی حلال چیز کو حرام سمجھ لینا یا اسے حرام قرار دیدینا قطعاً جائز نہیں۔ اسی طرح کسی حرام شے کو حلال قرار دیدینے کا حق کسی کو حاصل نہیں۔

خدا کے نظامِ ربوبیت کے پیش نظر حلال و حرام کے معنے یہ بھی ہونگے کہ عام اشیائے فطرت جنہیں اللہ نے نوعِ انسانی کی پرورش کا ذریعہ بنایا ہے۔ یعنی رزق کے سرچشمے۔ انہیں کھلا (حلال) رہنے دو اور انہیں روک کر لوگوں کو اس کے استفادہ سے محروم نہ کرو۔ یہ بھی خدا کے حلال کو حرام کر دینا ہے۔ یہ قرآنی نظام معیشت کی اصل و بنیاد ہے۔ (Free Goods) کو (Economic Goods) میں تبدیل کرنا کبھی جائز نہیں قرار پاسکتا۔

(حرام و حلال کی مزید تفصیل کے لئے عنوان ح۔ ر۔ م بھی دیکھئے۔ اور عنوان ن۔ ع۔ م میں اَلْاَنْعَامُ بھی۔ صَیْدُ الْبَحْرِ کے حلال ہونے کے لئے دیکھئے عنوان ب۔ ح۔ ر۔ آیت ۵/۹۶)۔

مُحِلٌّ۔ وہ جو حرام کی ہوئی چیز کو حلال سمجھے۔ غَیْرَ مُحِلِّی الصَّیْدِ (۵/۱) شکار کو حلال نہ قرار دینے والے۔ حِلٌّ۔ بمعنی حَلَالٌ (۵/۵)۔ تَحِلَّةٌ۔ قسم کا کفارہ۔ جس سے قسم کی پابندی سے رہائی مل جائے (۶۶/۲)۔

ح ل م

اَلْحُلُمُ۔ اَلْحُلْمُ۔ خواب*۔ جمع اَحْلَامٌ (۱۲/۴۴)۔ خواب میں جماع۔ اور چونکہ یہ کیفیت بالغ ہونے کی دلیل ہے اس لئے سن تمیز و بلوغت کو بھی

* تاج

الحُلُمُ کہتے ہیں*۔ (۲۴/۵۹) ۔ چونکہ سن تمیز کے ساتھ عقل و تمیز بھی آ جاتی ہے اس لئے اَلْحِلْمُ متانت ، وقار و سکون ، عقل و تدبر اور ضبط نفس کے معنوں میں بھی استعمال ہونے لگا ۔ اَمْ تَاْمُرُهُمْ اَحْلَامُهُمْ بِهٰذَا (۵۲/۳۲) کیا ان کا فہم و تدبر ، ان کی متانت و سنجیدگی ، ان کی فرزانگی اور وقار انہیں اسی کا حکم دیتے ہیں ۔ اَلْحِلْمُ کے معنے ہیں طبیعت پر ایسا ضبط رکھنا کہ غیظ و غضب کے موقع پر بھی انسان بھڑک نہ اٹھے**۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی ہیں جلدی نہ کرنا ۔ یعنی ذرا سی بات پر جھٹ سے بھڑک نہ اٹھنا ۔ چنانچہ تَحَلَّمَ الْمَالُ ۔ اس وقت کہتے ہیں جب مویشی فربہ ہو جائیں ۔ (اور ان میں قوت برداشت پیدا ہو جائے) ۔ اَلْحَلِیْمُ خدا کی صفت ہے جس سے مراد یہ ہے کہ نہ اسے نافرمانوں کی نافرمانیاں بھڑکاتی ہیں اور نہ اسے غصہ جلد بازی اور اوچھے پن پر اکساتا ہے ۔ بلکہ اس نے ہر چیز کے لئے ایک پیمانہ (قانون) مقرر کر رکھا ہے جس تک وہ چیز بہرحال پہنچ جاتی ہے*۔ (یعنی ہر عمل کا نتیجہ) ۔ لہذا حَلِیْمٌ کے معنے ہیں سمجھدار۔ ثقہ ۔ بھاری بھرکم ۔ پروقار ۔ ہمیشہ اصول اور قانون کے مطابق کام کرنے والا ۔ جو یونہی جذبات سے بھڑک نہ اٹھے ۔ حضرت ابراهیمؑ کے متعلق قرآن کریم میں ہے اِنَّ اِبْرَاهِیْمَ لَحَلِیْمٌ اَوَّاهٌ مُّنِیْبٌ (۱۱/۷۵) ۔ ”یقیناً ابراهیم بردبار ، غمگسار اور خدا کی طرف رجوع کرنے والا تھا“ ۔ اور حضرت اسمٰعیلؑ کے تذکرہ کے ضمن میں ہے فَبَشَّرْنٰهُ بِغُلٰمٍ حَلِیْمٍ (۳۷/۱۰۱) ۔ ”ہم نے ابراهیم کو ایک حلیم بیٹے کی خوشخبری دی ۔

ہمارے ہاں حِلْم (حلیم الطبع) سے مراد انکسار ۔ فروتنی ۔ نرم مزاجی لی جاتی ہے ۔ یہ ہمارے اپنے لغت کے معنے ہیں ۔ محض فروتنی تو ضعف اور کمزوری کی پیدا کردہ بھی ہوتی ہے لیکن حِلْم قوت اور توانائی کا مظہر ہوتا ہے جس سے انسان کو اپنے اعصاب پر پورا کنٹرول ہوتا ہے اور وہ بڑے سے بڑے اشتعال انگیز حالات میں بھی ضابطہ اور قانون کو ہاتھ سے نہیں جانے دیتا اور کوئی بات بے سمجھی کی نہیں کرتا ۔ جس میں مقابلہ کی قوت نہ ہو اس کا جھکنا شکست اور ذلت ہے ۔ سرکشی کی قوت رکھتے ہوئے ، قانون و ضوابط کے سامنے جھکنا ، شرفِ انسانیت ہے ۔

ح ل ی

اَلْحَلْیُ ۔ زیور، سامانِ آرائش ، جو معدنیات ڈھال کر یا قیمتی پتھر وغیرہ سے تیار کیا جاتا ہے* ۔ جمع حُلِیٌّ ۔ مِنْ حُلِیِّهِمْ عِجْلًا (۷/۱۴۸) ”ان کے

* تاج ۔ **راغب

زیورات سے بچھڑا (بنایا)''۔ اَلْحِلْیَةُ۔ آرائش کی چیز۔ تَسْتَخْرِجُوْا مِنْهُ حِلْیَةً (۱۶/۱۴)۔ تم سمندر سے آرائش کی چیزیں (موتی وغیرہ) نکالتے ہو۔ حَلَّاهَا تَحْلِیَةً۔ اس نے عورت کو زیور پہنایا*۔ یُحَلَّوْنَ فِیْهَا . . . . (۱۸/۳۱) ''انہیں وہاں آرائش و زیبائش کی چیزیں پہنائی جائینگی''۔ اس کے بنیادی معنے تحسین و آرائش کے ہیں (ابن فارس)۔

ح م أ

اَلْحَمْأَةُ وَ اَلْحَمَأُ۔ سیاہ بدبو دار کیچڑ۔ خراب بگڑی ہوئی مٹی۔ حَمِیَ الْمَاءُ۔ پانی سیاہ بدبو دار کیچڑ کے ملنے کی وجہ سے گدلا اور بدبودار ہوا ایسا پانی یا ایسے پانی والی جگہ حَمِیٌ* کہلائیگی، مؤنث حَمِئَة**۔ قرآن کریم نے انسانی تخلیق کے ابتدائی مراحل کے متعلق کہا ہے کہ خَلَقَ الْاِنْسَانَ مِنْ صَلْصَالٍ مِنْ حَمَاٍ مَسْنُوْنٍ (۱۵/۲۶)۔ سیاہ متغیر شدہ مٹی کے اوپر جو پپڑی سی جم جائے، تخلیق انسانی کی ابتدا خدا نے اس سے کی۔ اسی کو طِیْنٍ لَازِبٍ (۳۷/۱۱) کہا گیا ہے۔ اس سے مطلب یہ ہے کہ زندگی کے اولین جرثومہ (Life Cell) کی نمود پانی اور مٹی کے امتزاج سے ہوئی۔ (تفصیل اس اجمال کی میری کتاب ''ابلیس و آدم'' میں ملیگی)۔

قرآن کریم نے بحر اسود کو عَیْنٍ حَمِئَةٍ (۱۸/۸۶) کے الفاظ سے متعارف کرایا ہے۔

نوٹ: عنوان ح۔ م۔ ی کا آخری حصہ بھی دیکھئے۔

ح م د

حَمْدٌ۔ کسی نہایت حسین۔ متناسب۔ نادر شاہکار کو دیکھ کر انسان کے دل میں تحسین و ستائش (Appreciation) کے جو جذبات پیدا ہوں، ان کے اظہار کا نام حمد ہے جس سے مقصد اس شاہکار کے خالق کی عظمت وبرتری کا اعتراف کرنا ہوتا ہے۔ لیکن اس کے لئے چند شرائط ہیں جنہیں صاحبِ محیط نے یوں بیان کیا ہے۔

(۱) جس حسن و رعنائی اور شاہکاری کی ستائش کی جا رہی ہے وہ ایک خارجی حقیقت اور محسوس شے ہونی چاہئے (جیسے افعالِ محمودہ۔ مقامِ محمود۔ صفاتِ محمودہ وغیرہ۔) غیر محسوس اور مشاہدہ میں نہ آنے

---

* تاج۔ ** تاج و محیط و راغب۔

والی چیزوں کے متعلق ہمارے دل میں جذبات تحسین و ستائش پیدا نہیں ہو سکتے ۔ مثلاً ہم کسی مصور کی تعریف اسکی ان تصاویر کے ذریعہ ہی کر سکتے ہیں جو مرئی طور پر ہمارے سامنے آ جائیں ۔ اسی لئے قرآن کریم نے ان نمود و نمائش کا ذوق رکھنے والوں پر طنز کیا ہے جو بغیر تعمیری اور نفع بخش کام کرنے کے اپنی ستائش چاہتے ہیں ۔ يُحِبُّوْنَ اَنْ يُحْمَدُوْا* بِمَا لَمْ يَفْعَلُوْا ($\frac{3}{187}$) ۔ ''وہ چاہتے ہیں کہ ان کی تعریف ان کاموں کی بنا پر کی جائے جنہیں وہ کرتے نہیں'' ۔

(۲) کسی کی جس بات یا جس کام کی تعریف کی جا رہی ہے وہ اس سے اختیاری طور پر سرزد ہونی چاہئے (تا کہ اس کی انفرادی خودی کے زندہ و بیدار ہونے کا اندازہ کیا جا سکے)۔ اضطراری طور پر (خود بخود یونہی میکانکی انداز سے) کسی فعل کا سرزد ہو جانا ستائش کا حق پیدا نہیں کرتا ۔ حتّٰی کہ وہ حسن جو کسی میں پیدائشی طور پر موجود ہو اسکے لئے بھی حمد کا لفظ نہیں بولا جاتا ۔ مدح کا لفظ استعمال کیا جاتا ہے ۔ (مَدَحَ الْجَمَالَ) اگر کوئی مشین نہایت عمدہ چیزیں بنا رہی ہے تو وہ مشین قابل حمد نہیں ۔ بلکہ قابل مدح ہوگی اور اسکا بنانے والا مستحق حمد ۔ یہی صورت رقص طاؤس کی ہے ۔ طاؤس مستحقِ مدح ہے اور اس کا خالق (خدا) سزاوار حمد ۔

(۳) حَمْدٌ کیلئے یہ بھی ضروری ہے کہ جس چیز کی حمد (ستائش) کی جا رہی ہے اسے ستائش کرنے والے کا دل بھی پسند کرتا ہو ۔ کسی کے دباؤ سے اسکی تعریف کرنا حمد نہیں ، مدح ہے ۔ نہ ہی حمد میں ملمع کاری ، نمائش ، منافقت ، یا کسی کو بنانے کے لئے تعریف کرنے کا کوئی دخل ہو سکتا ہے ۔ حمد میں جذبات تحسین بے ساختہ زبان پر آجاتے ہیں ۔

(۴) جس چیز کی حمد کی جا رہی ہے اسکا ٹھیک ٹھیک علم ہونا بھی ضروری ہے ۔ محض گمان کی بنا پر حمد نہیں کی جا سکتی ۔ مبہم تصورات ، دھندلے نقوش ، اور شکوک و تذبذب پیدا کرنے والے خیالات و معتقدات کبھی حمد کا جذبہ پیدا نہیں کر سکتے ۔ حمد ، فریبِ تخیل ، توہم پرستی اور اندھی عقیدت سے نہیں ابھرتی ۔ اسکا سرچشمہ یقینِ محکم اور ایمان مکمل ہوتا ہے ۔ (مدح ظنی چیزوں کی بھی کی جا سکتی ہے مگر حمد نہیں) ۔

(۵) جن نفع بخش ، کشش انگیز باتوں اور حسن و تناسب کے شاہکاروں کی حمد کی جا رہی ہو ان کے لئے ضروری ہے کہ وہ کمال کے درجہ تک پہنچ

* ہو سکتا ہے کہ یہاں حمد مجازاً بمعنی مدح استعمال ہؤا ہو ۔

چکے ہوں اور انکی نفع بخشیاں محسوس* ہوں۔ جو آرٹ تکمیل تک نہ پہنچا ہو یا جو آرٹ انسانیت کے لئے نفع بخش نہ ہو وہ مستحق حمد و ستائش نہیں ہوتا۔ (جیب کترے کی ہاتھ کی صفائی وجہِ حمد نہیں ہو سکتی)

ان شرائط کے ساتھ جذباتِ تحسین و ستائش کے اظہار کا نام حَمْدٌ ہے۔ اگر ان میں سے کسی ایک شرط کی بھی کمی ہے تو اسکے لئے حَمْدٌ نہیں بلکہ مَدْحٌ کا لفظ بولا جائیگا۔ (قرآن کریم میں خدائی شاہکاروں کیلئے ہر جگہ حَمْدٌ کا لفظ آیا ہے۔ مَدْحٌ کا لفظ ایک جگہ بھی نہیں آیا)۔

(واضح رہے کہ ثناء کا لفظ مدح اور ذم دونوں کے لئے استعمال ہو سکتا ہے**)

لہذا جہاں قرآن کریم میں ہے کہ وَيُسَبِّحُ الرَّعْدُ بِحَمْدِهٖ (۱۳/۱۳)۔ "گرج، اس کی حمد کے ساتھ تسبیح کرتی ہے***"۔ یا وَلَهُ الْحَمْدُ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ (۳۰/۱۸) "کائنات کی پستیوں اور بلندیوں میں حمد اسی کے لئے ہے"۔ یا وَاِنْ مِّنْ شَيْءٍ اِلَّا يُسَبِّحُ بِحَمْدِهٖ (۱۷/۴۴) "کوئی شے ایسی نہیں جو حمد کے ساتھ اُس کی تسبیح نہ کرتی ہو"۔ تو اس کے معنی یہ ہیں کہ تمام کائناتی قوتیں، اس قسم کے تعمیری اور منفعت بخش نتائج پیدا کرنے میں مصروفِ عمل ہیں جو خدا کی حمد و تحسین کے زندہ پیکر ہیں۔ حتّٰی کہ اس مقصد کیلئے جب تخریبی قوتوں کو راستہ سے ہٹایا جاتا ہے تو یہ کام بجائے خویش وجہ ستائش ہوتا ہے۔ چنانچہ ظالم قوموں کی تباہی کے سلسلہ میں کہا۔ فَقُطِعَ دَابِرُ الْقَوْمِ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ (۶/۴۵) "ظلم کرنے والی قوموں کی جڑ کٹ گئی۔ اور اللہ رب العالمین کے لئے حمد ہے"۔ اسی لئے خدا کے لئے کہا گیا ہے کہ وہ عَزِيْزٌ بھی ہے اور حَمِيْدٌ بھی (۱۴/۱)۔ یعنی اپنے غلبہ واقتدار سے تخریبی قوتوں کو راستے سے ہٹا کر، تعمیری پروگرام کو اسطرح کامیاب بنانے والا کہ اس کے منفعت بخش نتائج خدا کی حمد و ستائش کی منہ بولتی تصویر بن جائیں۔ دوسری جگہ ہے لَهُ الْمُلْكُ وَلَهُ الْحَمْدُ (۶۴/۱)۔ ہر طرح کا اقتدار و ستائش اس کے لئے ہے۔ جلال و جمال کا سرچشمہ وہی ہے۔ مومنین کی صفات میں یہ بھی ہے کہ وہ حَامِدُوْنَ (۹/۱۱۲) حمد کرنے والے ہیں۔ اس مقصد کے لئے انسان کو علم الاسماء، یعنی اشیائے کائنات کا علم۔ (علم الفطرت) دیا گیا ہے (۲/۳۱) کیونکہ

* (محیط) ** (المنار)۔ *** تسبیح کے معنی ہیں اپنے فرائض کی سرانجام دہی میں پوری قوت کے ساتھ سرگرم عمل رہنا۔ دیکھئے عنوان س۔ ب۔ ح۔

جب ملائکہ (کائناتی قوتوں) نے کہا کہ وَنَحْنُ نُسَبِّحُ بِحَمْدِكَ (۲/۳۰)۔ "ہم تیری حمد وستائش کی نمود کیلئے ہمیشہ سر گرم عمل رہتے ہیں" تو اسکے جواب میں یہی کہا گیا کہ وَعَلَّمَ آدَمَ الْاَسْمَآءَ كُلَّهَا (۲/۳۱) آدم کو تمام اشیائے کائنات کا علم عطا کر دیا گیا"۔ لیکن اسکا یہ علم اُسی صورت میں کائنات کو وجہِ ستائش خداوندی بنا سکتا ہے جب وہ اپنے علم کے ماحصل کو وحی کے تابع رکھے۔ اس لئے اس سے کہدیا گیا کہ فَمَنْ تَبِعَ هُدَایَ فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ (۲/۳۸) جو قوم خدا کی راهنمائی کے پیچھے چلے گی وهی خوف و حزن سے محفوظ رهے گی۔ یہ وہ مَقَامًا مَّحْمُوْدًا ہے۔ (۱۷/۷۹)۔ ایسی پوزیشن جو سراپا وجہ حمد وستائش ھو) جس پر نبی اکرمؐ فائز ہوئے۔ وہ خود اَحْمَدُ (۶۱/۶) (بہت زیادہ حمد وستائش کرنے والے) تھے**۔ اسلئے (جیسا آپ کا دوسرا نام تھا ویسے ہی عملاً) مُحَمَّدٌ (۴۸/۲۹) ھو گئے۔ یعنے وہ جو مسلسل و پیہم وجہِ حمد وستائش ہو* (جسکی یکے بعد دیگرے ستائش کی جائے) رسول اللہؐ کا نام اَحْمَدُ بھی تھا اور مُحَمَّدٌ بھی۔ اِسْمُهٗ اَحْمَدُ (۶۱/۶)۔ اور مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ (۴۸/۲۹)۔ کتاب الاشتقاق میں ہے کہ مُحَمَّدٌ (مُفَعَّلٌ) کے معنی ہیں وہ جس کی یکے بعد دیگرے حمد کی جائے اور مَحْمُوْدٌ وہ ہے جس کی ایک بار حمد کی جائے۔ اقرب الموارد میں مُحَمَّدٌ کے معنی ہیں الذی کثرت خصاله المحمودة۔ جو بکثرت قابل ستائش خصلتیں رکھتا ہو۔

حمد کے جو معانی اوپر دیئے گئے ہیں ان کی روشنی میں قرآن کریم کی سب سے پہلی آیت (اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ - ۱/۱) پر غور کیجئے اور دیکھئے کہ ان چار لفظوں سے قرآن کریم نے کسطرح اس عظیم حقیقت کو بے نقاب کردیا ہے کہ کائنات کا ہر حسین گوشہ اور منفعت بخش پہلو خدا کے اس عالمگیر قانونِ ربوبیت کے وجہِ حمد وستائش ہونے کی زندہ شہادت ہے جو ہر شے کو اس کے نقطۂ آغاز سے بتدریج اوجِ کمال تک لے جا رہا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ حمدیت محض ایک عقیدہ کا نام نہیں بلکہ وہ جذبۂ تحسین ہے جس کا اظہار نظام کائنات پر غور و فکر سے بیساختہ ہو جاتا ہے۔ جو قوم نظام کائنات پر غور نہیں کرتی وہ اس کے خالق کے کمال کو کسطرح (Appreciate) کر سکتی ہے؟ نیز جو اس کے نظام ربوبیت کو عملاً متشکل نہیں کرتی وہ کیسے سمجھ سکتی ہے کہ اس کے نتائج کس درجہ مستحق حمد وستائش

*تاج۔ **بعض کا خیال ہے کہ اس میں فاعلی معنی نہیں بلکہ مفعولی معنی ہی ہیں۔ یعنی جو سب سے زیادہ مستحق ستائش ہو۔

ہیں ۔ ”خدا کی حمد کرنا“ ایک عملی پروگرام ہے ۔ یعنی نظام خداوندی کو عملاً متشکل کر کے ایسے محیرالعقول اور درخشندہ نتائج پیدا کرنا جنہیں دیکھکر دنیا کی ہر قوم پکار اٹھے کہ جس خدا نے ایسے قوانین عطا کئے ہیں وہ واقعی مستحق حمد وستائش ہے ۔

ح م ر

اَلْاَحْمَرُ ۔ سرخ ۔ اسکی جمع حُمْرٌ ہے* ۔

جُدَدٌ بِیْضٌ وَّ حُمْرٌ (۳۵/۲۷) ۔ سفید اور سرخ رنگ کی تہیں یا دھاریاں ۔

اَلْحِمَارُ ۔ گدھا ۔ (۲/۲۵۹) ۔ اس کی جمع حُمُرٌ ہے ۔ سورۃ مدثر میں ہے حُمُرٌ مُّسْتَنْفِرَةٌ (۷۴/۵۰) ۔ گھبرا کر بدکنے والے گدھے ۔

ح م ل

حَمَلَ ۔ یَحْمِلُ ۔ حَمْلاً ۔ بار اُٹھانا ۔ اپنے اوپر لادنا ۔ اِحْتَمَلَ ۔ اٹھانا ۔ اَلْحَمْلَةُ ۔ جنگ میں پلٹ کر حملہ بول دینا* ۔ حَمَّلَ ۔ کسی پر لادنا ' بار اٹھوانا ، کسی کے ذمہ کوئی کام لگا دینا ۔ مَثَلُ الَّذِیْنَ حُمِّلُوا التَّوْرٰةَ (۶۲/۵) جن لوگوں پر احکام تورات کی بجاآوری کی ذمہ داری ڈالی گئی تھی ۔ اِحْتَمَلَ ۔ اپنے اوپر بار لینا ۔ (۴/۱۱۲) ۔ حَمُوْلَةٌ ۔ باربرداری کا جانور* ۔ حَمُوْلَةً وَّ فَرْشًا (۶/۱۴۳) ۔ حَمَّالَةَ الْحَطَبِ (۱۱۱/۴) ۔ چغلخور* ۔ لگائی بجھائی کرنے والی ۔ مخالفت کے سامان جمع کرنے والی ۔ حَمَلَ ۔ کسی کو اپنی جگہ سے اٹھا دینا** ۔ یعنے تباہ و برباد کر دینا ۔ وَ حُمِلَتِ الْاَرْضُ وَ الْجِبَالُ (۶۹/۱۴) ۔ ”اور ارض و جبال تباہ کر دئے جائینگے“ ۔

حَمَلَ الْاَمَانَةَ ۔ امانت میں خیانت کرنا*** ۔ سورۃ احزاب میں ہے اِنَّا عَرَضْنَا الْاَمَانَةَ عَلَی السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ وَ الْجِبَالِ فَاَبَیْنَ اَنْ یَّحْمِلْنَهَا وَ اَشْفَقْنَ مِنْهَا وَ حَمَلَهَا الْاِنْسَانُ اِنَّهٗ کَانَ ظَلُوْمًا جَهُوْلاً (۳۳/۷۲) ۔ ”ہم نے امانت کو آسمانوں زمین اور پہاڑوں پر پیش کیا تو انہوں نے اس میں خیانت کرنے سے انکار کر دیا ۔ اور اس (خیانت) سے ڈر گئے ۔ لیکن انسان اس میں خیانت کرتا ہے ۔

---

* تاج ۔ ** محیط ۔ *** تاج و محیط ۔

یہ بڑا ہی ظالم اور نادان ہے"۔ یعنی خدا نے اپنے قوانین کی اطاعت کی امانت کو خارجی کائنات کے سپرد کیا تو اس نے اس میں کسی قسم کی خیانت نہیں کی ۔ تمام اشیائے کائنات اپنے فرائض مفوضہ کی تکمیل میں سرگرداں رہتی ہیں ۔ لیکن یہی قانون جب انسان کو دیا تو یہ اس میں خیانت کرتا ہے ۔ اسکی اطاعت نہیں کرتا ۔ یہ بڑا نادان ہے اور اپنے آپ پر زیادتی کرتا ہے ۔

سورۃ عنکبوت میں ہے وَ كَاَيِّنْ مِّنْ دَآبَّةٍ لَّا تَحْمِلُ رِزْقَهَا (۲۹/۶۰) ۔ صاحب تاج العروس نے لکھا ہے کہ یہاں حمل رزق کے معنی ذخیرہ اندوزی کرنے کے ہیں* ۔ قرآن کریم نے یہاں ایک اہم حقیقت کیطرف توجہ دلائی ہے ۔ رزق کو سمیٹ کر رکھنے کا جذبہ انسان ہی میں ہے ۔ حیوانات میں نہیں (یہ جو ہم چیونٹیوں ، چوہوں وغیرہ کو ذخیرہ اندوزی کرتے دیکھتے ہیں تو تحقیقات نے بتایا ہے کہ یہ محض عادۃ ایسا کرتے ہیں ۔ کسی مقصد کے ماتحت نہیں ۔) علاوہ ازیں ان کا جمع کردہ ذخیرہ ان کی قوم کے تمام افراد کے کام آتا ہے ۔ وہ گراں فروشی یا نفع اندوزی کے لئے ایسا نہیں کرتے ۔ جب ایک گائے اپنا پیٹ بھر لیتی ہے تو باقیماندہ چارے کو سنبھال کر شام کے لئے نہیں رکھ لیتی۔ یہ انسان ہی کرتا ہے ۔ اور مقصد اس سے گراں فروشی اور نفع اندوزی ہوتا ہے ۔ اس کی یہی ہوس ہے جو تقسیم رزق میں اس قدر فساد کا موجب بنی ہوئی ہے ۔ جس کے پاس قوت ہوتی ہے وہ سب کچھ سمیٹ کر ذخیرہ کر لیتا ہے اور کمزور اور غریب بھوکے مرتے ہیں ۔ قرآن کریم کہتا ہے کہ اللہ یَرْزُقُهَا وَ اِيَّاكُمْ (۲۹/۶۰) ۔ اللہ ان حیوانات کو بھی رزق دیتا ہے اور تمہیں بھی ۔ حیوان صرف ضروریات پورا کرتے ہیں اور تم ذخیرہ اندوزی شروع کر دیتے ہو۔ یہ روش فسادِ آدمیت کا موجب ہے ۔ (تفصیل میری کتاب نظام ربوبیت میں ملیگی ۔)

سورۃ اعراف کی ایک آیت میں دہا گیا ہے کہ اپنے جذبات کا اتباع کرنے والوں کی مثال كَمَثَلِ الْكَلْبِ اِنْ تَحْمِلْ عَلَيْهِ يَلْهَثْ اَوْ تَتْرُكْهُ يَلْهَثْ (۷/۱۷۶) ہے ۔ حَمَلَ عَلٰی کے معنی کسی کو چلا کر تھکا دینے کے ہیں* ۔ لہذا آیت کے معنی یہ ہوئے کہ کتے کی یہ حالت ہے کہ اگر تو اسے چلا چلا کر (دوڑا دوڑا کر) تھکا مارے تب بھی وہ ہانپتا رہے اور اگر اسے ویسے ہی چھوڑ دے تب بھی وہ ہانپتا رہے ۔ اسے کسی شکل میں بھی سکون اور اطمینان نہیں ملتا ۔ یا پھر یہ حَمَلَهُ عَلَى الْاَمْرِ

* تاج و محیط ۔

سے ہو سکتا ہے جسکے معنے ہیں اسے کسی کام پر اکسایا* ۔ جیسے کتے کو شکار پر لپکایا جاتا ہے ، یعنی تم خواہ کتے کو شکار پر لپکا کر دوڑاؤ یا اسے بیٹھا رہنے دو ، وہ بہر حال ہانپتا ہی رہے گا ۔ بیشتر اہل تفاسیر نے یہاں حَمَلَ عَلَيْهِ کے معنے حملہ کرنے ، ٹوٹ پڑنے اور اس کو مار کر بھگانے اور دھتکارنے کے کئے ہیں ۔

ح م م

حَمَّ التَّنُّوْرَ حَمًّا ۔ اس نے تنور میں ایندھن ڈال کر اسے گرم کیا ۔ حَمَّ الشَّحْمَةَ ۔ اس نے چربی کو پگھلایا ۔ حَمَّ الْمَاءَ حَمًّا ۔ اس نے پانی گرم کیا ۔ اَلْحُمَامُ ۔ اونٹوں یا تمام جانوروں کا بخار ۔ حَمٌّ ۔ فکر ۔ غم ۔ اِحْتَمَّ لَهٗ ۔ وہ اس کے لئے فکر مند ہوا** ۔ اِحْتَمَّ الرَّجُلُ ۔ آدمی فکر کی وجہ سے سو نہیں سکا ۔ اِحْتَمَّتِ الْعَيْنُ ۔ بغیر کسی درد کے آنکھ نہیں لگ سکی یعنی نیند نہ آئی*** ۔ اہل جہنم کے متعلق ہے لَهُمْ شَرَابٌ مِنْ حَمِيْمٍ وَّ عَذَابٌ اَلِيْمٌ (۶/ ۷۰) ۔ وہ پینے کی چیز جو راحت جان ہونے کے بجائے سخت اذیت کا موجب بن جائے ۔ یعنی عذاب الیم ۔ لطائف اللغۃ میں ہے کہ اس کے معنی گرم پانی اور سرد پانی دونوں کے ہیں ۔ سورۃ واقعہ میں ہے وَّ ظِلٍّ مِّنْ يَّحْمُوْمٍ (۵۶/ ۴۳) ۔ اس کے معنے ہیں گرم سیاہ دھوئیں کا سایہ ۔

اَلْحَمِيْمُ ۔ قریبی رشتہ دار جس کی خاطر فکر مند رہا جائے ، یا جس کے دل میں تمہاری محبت ہو اور تمہارے دل میں اسکی محبت ہو ، یا وہ جو اپنے متعلقین کی حمایت کا جوش دل میں رکھتا ہو ۔ اور ان کے لئے گرمجوشی اور تپاک کا اظہار کرتا ہو* ۔ قرآن کریم نے اسے دلسوز دوست اور غمخوار رفیق کے معنوں میں استعمال کیا ہے (۴۱/ ۳۴) ۔ نیز حُمَّ الْاَمْرُ کے معنے ہیں اس امر کا فیصلہ ہو گیا ۔ حَمَّ ۔ حَمَّهٗ ۔ اس نے اس کا ارادہ کیا ۔ حَمَّ اللّٰهُ كَذَا وَ اَحَمَّهٗ ۔ خدا نے اس کے لئے ایسا فیصلہ کر دیا ۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنوں میں گرم ہونا اور ارادہ کرنا شامل ہیں ۔

ح م ی

حَمَى الشَّيْءَ ۔ چیز کی حفاظت کی ۔ كَلَاٌ حَمِيٌّ ۔ حفاظت کی ہوئی گھاس ۔ اَلْحَمِيُّ ۔ وہ بیمار جسے نقصان دہ چیزوں سے روک دیا گیا ہو ۔ لہذا اَلْحَامِيَةُ ۔ وہ ہے جو کسی کی حفاظت کرے یا اسے نقصان دہ امور سے روکے* ۔ حمایت میں یہ دونوں چیزیں آجاتی ہیں ۔

---

* تاج و محیط ۔　** حَمَّ در اصل هَمَّ سے اور اِحْتَمَّ لَهٗ اِهْتَمَّ لَهٗ سے بدل کر آئے ہیں ۔　*** تاج و محیط و راغب ۔

حَامٍ - ایام جاهلیت میں یہ رسم تھی کہ وہ نر اونٹ جو مقررہ تعداد میں اونٹنیوں کو حاملہ کر چکا ہو اسے آزاد چھوڑ دیتے تھے - (جیسے ہندؤں میں سانڈ چھوڑ دیتے ہیں) اس سے بار برداری کا کام نہیں لیتے تھے - اور وہ سانڈوں کی طرح آزاد پھرتا تھا جہاں جی چاہے جائے اور جہاں سے جی چاہے کھائے پیئے - اس میں ایک قسم کا توہم پرستانہ تقدس آجاتا تھا - قرآن کریم نے اس سے روکا ہے (۵/۱۰۳) -

حَمِيَتِ الشَّمْسُ وَالنَّارُ تَحْمٰى - سورج اور آگ کی گرمی سخت ہوگئی - قرآن کریم میں ہے نَارٌ حَامِيَةٌ (۱۰۱/۱۱) سخت گرم آگ - ویسے حَمِيْتُ عَلٰى فُلَانٍ کے معنے ہوتے ہیں میں فلاں پر غصہ ہوا **- اَلْحُمَيَّا - جوش یا شدت غضب کو کہتے ہیں *- حَمِيَ الْمِسْمَارُ - میخ گرم ہوگئی* - قرآن کریم میں سرمایہ پرستوں کی دولت کے متعلق ہے يَوْمَ يُحْمٰى عَلَيْهَا فِي نَارِ جَهَنَّمَ (۹/۳۵) - '' جس دن اسے جہنم کی آگ میں تپایا جائیگا '' - اسی (گرمی) سے اَلْحَمِيَّةُ ہے جسکے معنے غیرت اور ضد کے ہیں * - اس سے مطلب یہ ہوتا ہے کہ انسان جس چیز کو عزیز رکھتا ہے اس کی حفاظت کے لئے وہ گرمجوشی دکھائے - اگر وہ شے فی الواقعہ اچھی ہے تو یہ جذبہ قابل ستائش قرار پائیگا - اور اگر وہ شے مذموم ہے تو یہ جذبہ بھی مذمت کے قابل ہو جائیگا - زمانہ قبل از اسلام میں عرب اپنے معاشرہ کے رسوم و رواج کے تحفظ میں بڑی گرمجوشی دکھاتے تھے - چونکہ ان رسوم و رواج میں بیشتر مذموم تھے اس لئے قرآن کریم نے اُس جذبہ کو حَمِيَّةَ الْجَاهِلِيَّةِ (۴۸/۲۶) کہکر پکارا ہے -

اِحْمَوْمَى الشَّيْءُ - چیز سیاہ ہوگئی - جیسے رات اور بادل * -

ح ن ث

اَلْحِنْثُ - گناہ ، معصیت ، نافرمانی **- (خدا کے حکم کی خلاف ورزی کرنا) - سورۃ واقعہ میں ہے وَكَانُوْا يُصِرُّوْنَ عَلَى الْحِنْثِ الْعَظِيْمِ (۵۶/۴۶) '' یہ لوگ بڑے بڑے سخت جرائم پر مصر رہا کرتے تھے - '' اَلْحِنْثُ - عمداً جھوٹی قسم کھانے یا قسم کھا کر اسے پورا نہ کرنے کو بھی کہتے ہیں *** - نیز حق سے باطل کی طرف رجوع کرنے کو بھی **** حَنِثَ فُلَانٌ فِي كَذَا - اس نے کسی بارے میں گناہ اور کوتاہی کی ، اسی سے جب بچہ جوان ہو جائے یعنی اس میں گناہ کرنے کی قوت آجائے تو کہتے بَلَغَ الْغُلَامُ الْحِنْثَ

* تاج - ** راغب - *** تاج و راغب - **** اقرب الموارد -

یہ اس لئے کہ سن شعور کے بعد بچہ اپنے اچھے اور برے کاموں کا ذمہ دار سمجھا جاتا ہے۔ یعنی اگر اس سے کسی حکم کی خلاف ورزی ہو جائے تو وہ مجرم گردانا جاتا ہے۔ (ابن فارس)۔ اور تَحَنَّثَ کے معنے گناہوں سے باز رکھنے کے ہیں *۔

قرآن کریم میں قصہ حضرت ایوب میں ہے وَلَا تَحْنَثْ (۳۸/۴۴) (تو اپنی بیماری کا علاج جڑی بوٹیوں سے کر اور جھاڑ پھونک کی توہم پرستیوں میں مبتلا ہو کر) حق سے باطل کی طرف مائل نہ ہو۔ (اس کے لئے عنوان ض غ ث۔ بھی دیکھئے)

ح ن ج ر

اَلْحَنْجَرَةُ۔ حلق۔*** سانس کی نالی** جمع حَنَاجِرُ (۳۳/۱۰)۔ حَنْجَرَهُ اس نے اسے ذبح کر دیا ***۔

ح ن ذ

اَلْحَنْذُ۔ گرم پتھروں کے درمیان گوشت بھون کر کباب بنا لینا *۔ حَنِیْذٌ۔ اس گرم گرم گوشت کو کہتے ہیں جس سے، بُھننے کے بعد ابھی پانی ٹپک رہا ہو***۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی ہیں کسی چیز کو پکا دینا۔

سورۃ ھود میں ہے کہ حضرت ابراھیم اپنے مہمانوں کے لئے عِجْلٌ حَنِیْذٌ (۱۱/۶۹) لیکر آگئے۔ یعنی بُھنا ہوا بچھڑا (مسلّم)۔

ح ن ف

اَلْحَنَفُ۔ پاؤں کا ٹیڑھا اور مڑا ہوا ہونا۔ رَجُلٌ حَنْفَاءُ۔ مڑا ہوا پاؤں۔ اسی سے حَنِیْفٌ اسے کہتے ہیں جو غلط راستے سے ہٹ کر (مڑ کر) سیدھی راہ پر آجائے۔ راغب نے کہا ہے کہ حَنَفٌ، گمراھی سے ہٹ کر استقامت (صراط مستقیم) کی طرف مائل ہونے کو کہتے ہیں****۔ اس میں یکسو ہونے کا مفہوم غالب ہے۔ تفسیر المنار میں ہے کہ حَنِیْفٌ لغت میں مائل کو کہتے ہیں۔ حضرت ابراھیم پر اس لفظ کا اطلاق اس لئے کیا گیا ہے کہ ان کے زمانے میں لوگ طریقۂ کفر کی پیروی کرتے تھے۔ انھوں نے ان سب کی مخالفت کی اور انکے طریقہ سے ہٹ کر دین مستقیم اختیار کر لیا *****۔

* تاج و راغب۔ ** محیط۔ *** تاج۔ **** تاج و محیط و راغب۔ ***** المنار جلد (۱) صفحہ ۴۸۰۔

قرآن کریم میں رِجْس اور قَوْلَ الزُّوْرِ کے اجتناب کے بعد کہا ہے حُنَفَآءَ لِلّٰہِ (۲۲/۳۱)۔ اس سے حَنِیْف کا صحیح مفہوم سامنے آ جاتا ہے۔ یعنی ہر غیر خداوندی قانون و روش زندگی سے منہ موڑ کر خدا کے قوانین کی طرف آجانے والا۔ غَیْرَ مُشْرِکِیْنَ بِہٖ (۲۲/۳۱) اور ان قوانین کے ساتھ کسی اور کی اطاعت کو نہ شامل کرنے والا۔ اسی کا نام اسلام ہے۔ یعنے پہلے ہر غیر خدائی طاقت سے منہ موڑا جائے (یَکْفُرْ بِالطَّاغُوْتِ) اور اسکے بعد اللہ کے قانون پر ایمان لایا جائے (یُؤْمِنْ بِاللّٰہِ (۲/۲۵۶)۔

یہی مطلب لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ کا ہے۔ "یعنی کوئی صاحب اقتدار ہستی نہیں بجز اللہ کے"۔ لہذا ہر مومن حَنِیْف ہوتا ہے۔ یہی حضرت ابراہیم کی روش تھی جنہیں قرآن کریم نے حَنِیْف کہکر پکارا ہے (۲/۱۳۵)۔ ہر طرف سے منہ موڑ کر صرف قوانین خداوندی کی محکومیت اختیار کرنے والا۔

ح ن ک

اَلْحَنَکُ۔ بعض نے کہا ہے کہ یہ منہ کے اندرونی حصہ (تالو) کو کہتے ہیں۔ لیکن دوسروں نے کہا ہے کہ یہ منہ کے نچلے حصے، یعنی ٹھوڑی کے نچلے حصہ کو کہتے ہیں۔ اسی سے کہتے ہیں تَحَنَّکَ فُلَانٌ۔ وہ اپنی پگڑی کا بل ٹھوڑی کے نیچے سے نکال کر اوپر لے گیا۔ اَلْحِنَاکُ۔ وہ بندھن جس سے قیدی کو اسطرح باندھا جاتا تھا کہ اگر وہ اسے ذرا بھی کھینچے تو اسکی ٹھوڑی کے نچلے حصہ میں تکلیف محسوس ہو**

جانور (گھوڑے گدھے وغیرہ) کے منہ میں ایک تو لگام دی جاتی ہے اور جب لگام نہ ملے تو ایک رسی لے کر اسے اسکے نچلے جبڑے میں دے کر ٹھوڑی کے نیچے بل دیدیا جاتا ہے اور اسطرح اسے پکڑ کر لے چلتے ہیں۔ اسے اِحْتِنَاکٌ کہتے ہیں۔ چنانچہ اہل عرب کہتے ہیں لَمْ اَجِدْ لِجَامًا فَاحْتَنَکْتُ دَابَّتِیْ۔ مجھے لگام نہیں ملی تو میں نے اپنی سواری کے منہ میں رسی ڈال دی اور اسطرح اسے لے چلا۔ اسی سے اسکے معنے کسی پر غالب آجانے کے آتے ہیں۔ اِحْتَنَکَ الْجَرَادُ الْاَرْضَ۔ ٹڈیاں زمین پر چھا گئیں اور جو کچھ پیداوار تھی اسے صفا چٹ کر دیا*۔ اِسْتَحْنَکَ النَّعْضَاءُ۔ جھاڑی جڑ سے اکھڑ گئی**۔

قرآن کریم میں ہے کہ ابلیس نے یہ چیلنج دیا کہ لَاَحْتَنِکَنَّ ذُرِّیَّتَہٗ (۱۷/۶۲) میں بالضرور ابن آدم کی ٹھوڑی میں رسی باندھونگا اور

*تاج- محیط- راغب- ** تاج نیز ابن فارس-

اسطرح اسے جدھر جی چاہے لئے لئے پھرونگا۔ اس میں نہ صرف یہی ہے کہ ابلیس اُسے جدھر جی چاہے لئے لئے پھرتا ہے بلکہ لاحْتَنِکَنَّ میں جو ذلت کا پہلو ہے وہ بھی نمایاں ہے۔ انفرادی مفاد پرستیاں جسطرح انسان کو اپنی گرفت میں لے کر ذلیل و خوار کرتی ہیں وہ سب کے سامنے ہے۔ جسطرح کتے کے پاؤں اُسکی ناک کے پیچھے پیچھے چلتے ہیں، اسی طرح انسان اپنے جذبات کے پیچھے لگا پھرتا ہے اور ذلیل و خوار ہوتا ہے۔ اگر اسکی بجائے وہ انہی جذبات کو وحی کی روشنی میں چلائے تو کونین کی سرفرازیاں اسکے حصہ میں آجائیں۔

جو کچھ انفرادی جذبات پرستیاں ایک فرد کے ساتھ کرتی ہیں، وہی کچھ طاقتور قومیں کمزور قوموں کے ساتھ کرتی ہیں۔ یعنی ان کے جبڑے میں رسی ڈال کر انھیں جدھر جی چاہے لئے لئے پھرتی ہیں۔ یہ بھی ابلیسی قوتیں ہیں۔ چنانچہ مذکورہ بالا آیت ($\frac{17}{62}$) کے بعد دیکھئے کہ قرآن کریم نے اُن طاقتور قوموں کے اُن حربوں کا کسطرح ذکر کیا ہے جنہیں وہ کمزور قوموں کو پھانسنے کے لئے اختیار کرتی ہیں۔ (اسکی تشریح "مفہوم القرآن" میں ملیگی)

ح ن ن

اَلْحَنِیْنُ۔ کسی چیز کی طرف مشتاقانہ کھنچنا۔ شدت سے رونا یا خوش ہونا۔ بے تابانہ اشتیاق کی آواز خواہ غم سے ہو یا خوشی سے۔ صاحب مصباح نے لکھا ہے کہ حَنِیْن کا لفظ صرف ماں کی مامتا کیلئے بولا جاتا ہے۔ اَلْحَانَّةُ۔ اس اونٹنی کو کہتے ہیں جو اپنے وطن سے دور اپنے بچے کیلئے بیحد مضطرب و مشتاق ہو رہی ہو۔ اَلْحَنَّانَةُ۔ وہ عورت جسے اسکے شوہر نے چھوڑ دیا ہو اور وہ اپنے چھوٹے چھوٹے بچوں کے غم میں بیحد اداس اور پریشان رہتی ہو*۔

قرآن کریم میں حضرت یحییٰؑ کے متعلق ہے کہ آتَیْنٰہُ ...... حَنَانًا مِّنْ لَّدُنَّا ($\frac{19}{12}$، $\frac{1}{2}$)۔ ہم نے اُسے اپنے ہاں سے رقت قلب۔ سوز و گداز۔ ماں کی سی محبت رکھنے والا دل عطا کیا۔ اسی اعتبار سے ہمارے ہاں خدا کے اسماء میں ایک نام اَلْحَنَّانُ بھی شمار کیا جاتا ہے۔ لیکن یہ لفظ قرآن کریم میں نہیں آیا۔ اس میں کچھ عیسائیت کے خدا کے تصور (رقت و سوز و گداز) کی جھلک پائی جاتی ہے۔

---

* تاج و راغب

حُنَیْن (۹/۲۵) مکہ کے قریب ایک وادی ہے جہاں نبی اکرمؐ کی مخالفین سے جنگ ہوئی تھی۔

ح و ب

حَوْبَ۔ حَابِ۔ یہ لفظ اونٹوں کو ڈانٹنے کے لئے بولا جاتا ہے*۔

اَلْحَوْبَۃُ۔ حاجت اور ضرورت کو کہتے ہیں۔ ایسی حاجت جو محتاج کو ارتکاب جرم پر آمادہ کر دے**۔ اسکے بعد گناہ کیلئے بھی اسکا استعمال ہونے لگا۔ نیز اسکے معنے ھلاکت۔ غم و فکر۔ اوردرد مند ہونا بھی ہیں*۔ جوگناہ کا لازمی نتیجہ ہے۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی گناہ۔ حاجت یا مسکنت کے ہوتے ہیں۔ قرآن کریم میں یتیم کا مال کھا جانے کو حُوْباً کَبِیْراً کہا گیا ہے (۴/۲)۔ یعنی جرم عظیم۔ بڑی حق تلفی۔ حُوْبٌ کے معنے گناہ، وحشت، تباہی بربادی، آفت اور بیماری بھی ہیں***۔

ح و ت

اَلْحُوْتُ۔ مچھلی، لیکن بیشتر بڑی مچھلی کے لئے بولا جاتا ہے۔ جمع اَحْوَاتٌ وَ حِیْتَانٌ*۔ حَاوَتَہٗ۔ اس نے اسے ایسا دھوکا دیا جیسے مچھلی دھوکا دیتی ہے**۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی تڑپنے اور چلتے وقت رخ بدلنے کے ہوتے ہیں۔ مچھلی کو اسی اعتبار سے حُوْتٌ کہتے ہیں۔ حَاتَ عَلَی الشَّیْءِ کے معنی ہیں کسی چیز کے گرد چکر لگانا****۔ قرآن کریم میں حضرت یونسؑ کے متعلق ہے فَالْتَقَمَہُ الْحُوْتُ (۳۷/۱۴۲)۔ لغوی اعتبار سے اس کے معنی ہیں ”سو بڑی مچھلی نے اسے لقمہ بنایا“۔

سورۃ اعراف میں حِیْتَانُھُمْ (۷/۱۶۳) آیا ہے۔ یعنی ان کی مچھلیاں۔

ح و ج

اَلْحَاجَۃُ۔ اَلْحَائِجَۃُ۔ ضرورت۔ اصل میں اس کے معنے ہوتے ہیں اپنے مطلوب و مقصود تک عدم رسائی۔ جس چیز کو حاصل کرنے کی خواہش ہو اس تک نہ پہنچ سکنا۔ پھر اس کا استعمال عام احتیاج (ضرورتمندی) کے لئے ہونے لگا*۔ اَلْحَاجَۃُ در اصل کانٹے کو کہتے ہیں۔ لہذا اَلْحَاجَۃُ اس ضرورت کو کہتے ہیں جو انسان کے دل میں کانٹے کی طرح چبھ جائے اور

* تاج۔ ** راغب۔ ***محیط۔ ****لین بحوالہ قاموس۔

اٹک جائے**۔ ابن فارس نے کہا ہے اس کے معنیٰ ہیں کسی چیز کے (حصول) کے لئے مضطرب اور مجبور ہو جانا۔

سورۃ یوسف میں ہے اِلَّا حَاجَۃً فِیْ نَفْسِ یَعْقُوْبَ (۱۲/۶۸)۔ یہ محض یعقوب کے دل میں ایک خلش تھی (جو اس نے پوری کرلی)۔ سورۃ مومن میں یہ لفظ مطلوب (جس چیز کی طلب ہو) کیلئے آیا ہے۔ حَاجَۃً فِیْ صُدُوْرِکُمْ (۴۰/۸۰) تمہارا دلی مطلوب و مقصود۔

ح و ذ

اَلْحَوْذُ۔ کسی چیز کو گھیرے میں لے لینا* نیز اس کے معنے جانور کو سختی اور تیزی کے ساتھ ہانکنے کے بھی ہیں۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی ہیں، پھرتی۔ تیزی۔ کسی معاملہ میں چستی کرنا۔ اِسْتَحْوَذَ عَلٰی کَذَا۔ کسی چیز پر تسلط جمالیا، مستولی ہوگیا۔ حَاذُ الْمَتْنِ اس لکیر کو کہتے ہیں جو گھوڑے کی پشت پر دُم سے گردن تک بنتی جاتی ہے۔ (یعنی ریڑھ کی ہڈی کی لکیر) یا پشت پر نمدہ رکھنے کی جگہ یا ران کے پیچھے کا وہ حصہ جس پر دم لگتی ہو۔ ایسے دونوں کنارے حَاذَانِ کہلائینگے*۔ اسی لئے اَلْحَوْذُ کے معنے ہیں ہانکنے والے کا جانور کے پیچھے اس طرح چلنا کہ وہ اسکی دونوں ٹانگوں کے عین بیچ میں رہے اور وہاں سے سختی سے اسے ہانکے جائے***۔ اس نقشہ کو سامنے رکھئے اور پھر اس آیت کا مطلب سمجھئے جس میں کہا گیا ہے کہ اِسْتَحْوَذَ عَلَیْهِمُ الشَّیْطٰنُ (۵۸/۱۹)۔ یعنے مفاد پرستیوں کے سرکش جذبات ان پر غالب آگئے اور انہیں نہایت سختی سے ہانکتے رہے اور وہ انہی کے ڈنڈے سے عمر بھر چلتے رہے۔ یا کمزور قوم جو بالا دست اقوام کے ڈنڈے سے ہانکی جاتی ہے۔ (نیز دیکھئے عنوان ح۔ ن۔ ک)۔

سورۃ نساء میں ہے قَالُوْٓا اَلَمْ نَسْتَحْوِذْ عَلَیْکُمْ وَنَمْنَعْکُمْ مِّنَ الْمُؤْمِنِیْنَ ... (۴/۱۴۱)۔ اس میں نَمْنَعْکُمْ کے معنی ہیں تمہارے دشمنوں سے تمہاری حفاظت کی۔ اور نَسْتَحْوِذْ عَلَیْکُمْ کے معنی ہیں ہم تم پر غالب تھے۔ یعنی جب تم حملہ کرنے کے لئے آئے تو ہم ہی نے تمہیں اسکی جرأت دلائی اور تمہیں اُن کے خلاف چڑھا لائے۔ یعنی ہم نے جماعت مومنین سے تمہاری حفاظت بھی کی اور یہ بھی ہماری جرأت افزائی کا نتیجہ تھا کہ تم ان کے خلاف آگے بڑھے۔

---

* تاج۔ ** محیط۔ *** راغب۔

ح و ر

حَارَ - يَحُوْرُ - حَوْرًا - لوٹنا - واپس ہونا - ایک حالت سے دوسری حالت میں تبدیل ہو جانا - نیز زیادتی کے بعد پھر سے کم ہو جانا (۸۴/۱۴) ابن فارسؒ نے اس کے بنیادی معنی (۱) ایک قسم کا رنگ - (۲) پلٹنا (۳) گھومنا لکھے ہیں - اَلْمُحَاوَرَۃُ وَالتَّحَاوُرُ - ایک دوسرے کو لوٹا کر جواب دینا - تبادلۂ گفتگو (جس میں بات لوٹائی جاتی ہے) (۱۸/۳۴ و ۵۸/۱) - اَلْمِحْوَرُ - وہ لکڑی یا لوہا جسکے گرد کوئی چیز گردش کرتی ہے - اَلْحَوْرُ کے معنے تحیر اور حیرت کے بھی آتے ہیں - (دیکھئے عنوان ح - ی - ر) - اَلْحَوَرُ - ایک لکڑی ہوتی ہے جسے اس کی سفیدی کی وجہ سے بَیْضَاءُ بھی کہتے ہیں - صاغانی نے تصریح کی ہے کہ اس لفظ (حَوْرٌ) کی بنیاد سفید ہونے پر ہے - یعنے اس کے مادہ میں سفید ہونے کا مفہوم ہے - اس لئے اَلْحَوَارِیَّاتُ شہر کی عورتوں کو کہتے ہیں جن کا رنگ بھی سفید ہوتا ہے اور وہ ویسے بھی اجلی رہتی ہیں - اَلْحُوَّارَیٰ میدے کو کہتے ہیں جو آٹے کا لب لباب ہوتا ہے - نیز کھانے کی ہر اس چیز کو جسے صاف اور سفید کر لیا گیا ہو* - حضرت عیسیٰؑ کے ساتھیوں کو اَلْحَوَارِیُّوْنَ (۶۱/۱۴) - کہتے تھے بعض کا خیال ہے کہ وہ چونکہ دھوبی تھے اس لئے انہیں ایسا کہا جاتا تھا - دوسروں کا خیال ہے کہ ان کی اپنی صفائی کی وجہ سے انہیں ایسا کہا جاتا تھا - اکثریت اسطرف گئی ہے کہ ان کی نیت کی صفائی اور عمل کے خلوص کی بنا پر انہیں ایسا کہا گیا ہے - شمر کا قول ہے کہ اَلْحَوَارِیُّ خیر خواہ کو کہتے ہیں** - بہر حال ، یہ لفظ ان کی پاکیزگیٔ خیال - خلوصِ عمل اور حسنِ رفاقت ، سب کا آئینہ دار ہے - صاحب المنار کا خیال ہے کہ حُوَّارَیٰ میدے کو کہتے ہیں جو آٹے کا خلاصہ ہوتا ہے - حضرت عیسیٰؑ کے ساتھیوں کو اس لئے حَوَارِیُّوْنَ کہا جاتا تھا کہ وہ لوگ قوم کے منتخب اور مخصوص افراد تھے*** -

حُوْرٌ - یہ لفظ جمع ہے - اس کا واحد اَحْوَرُ بھی ہے، جو مذکر ہے اور حَوْرَاءُ بھی ، جو مونث ہے - اَلْحَوَرُ کے معنے ہوتے ہیں آنکھ کی سفیدی کا بہت سفید اور سیاہی کا بہت سیاہ ہونا اور جلد کا رنگ صاف ہونا - یا آنکھ کی سیاہی کا اتنا زیادہ ہونا کہ آنکھ اس سے بھری ہوئی معلوم ہو - ایسے مرد اور عورتیں جن میں یہ خصوصیات پائی جائیں - حُوْرٌ کہلائینگے -

---

* تاج محیط و راغب - ** تاج ***المنار جلد ۳ - صفحہ ۳۱۳ -

قرآن کریم میں متقیوں کے متعلق ہے وَ زَوَّجْنٰهُمْ بِحُوْرٍ عِيْنٍ (۴۴/۵۴ و ۵۲/۲۰) ۔ جس طرح حُوْرٌ مذکر اور مونث دونوں کے لئے آتا ہے اسی طرح عِيْنٌ بھی، اَعْيَنُ (مذکر) اور عَيْنَاءُ (مونث) دونوں کی جمع ہے ۔ راغب نے لکھا ہے کہ زَوَّجْنٰهُمْ بِحُوْرٍ عِيْنٍ کے معنے ہم نشین بنانا ہیں ۔ (دیکھئے عنوان ز ۔ و ۔ ج) ۔ اسلئے ان الفاظ کے معنے صرف میاں بیوی بننے کے نہیں بلکہ ہم نشین اور باہمدگر رفقاء بننے کے بھی ہیں* ۔ میاں بیوی بھی باہمی رفاقت کی وجہ سے ایک دوسرے کے زَوْجٌ ہوتے ہیں ۔ اس اعتبار سے قرآن کریم میں، جنتی معاشرہ کی پاکیزہ صفات عورتوں کو بھی حُوْرٌ کہا گیا ہے ۔ (۵۵/۷۲ و ۵۶/۲۲) ۔ نیز لین نے (متعدد اسناد کی تائید سے) لکھا ہے کہ اَحْوَرُ ۔ جسکی جمع حُوْرٌ ہے ۔ کے معنے پاکیزہ عقل (Pure or clean Intellect) کے ہیں ۔ یعنے چالاک اور مکار عقل نہیں، بلکہ پاک اور صاف عقل ۔ چنانچہ مَا يَعِيْشُ بِاَحْوَرَ اس شخص کے متعلق کہتے ہیں جو معاملات کا صاف نہ ہو ۔ جو پاکیزہ عقل کے مطابق زندگی بسر نہ کرے ۔ لہذا جنت کی زندگی میں باہمی رفقاء (حُوْرٌ عِيْنٌ) خواہ وہ عام ہمنشین ہوں یا بیویاں ۔ کی کیفیت یہ ہوگی کہ ان کی عقل و خرد ایک دوسرے کو دھوکا دینے کے کام میں نہیں لائی جائیگی ۔ وہ عقل ادب خوردہ دل ہوگی ۔ یعنے پاکیزہ اور شفاف عقل نہ کہ حیلہ جو اور فریب کار ۔

ح و ط

حِيْطَةٌ کے معنے ہیں حفاظت کرنا ۔ محفوظ رکھنا ۔ نگہبانی کرنا ۔ مدافعت کرنا ۔ کسی کی ضروریات کو پورا کرنا ۔ لَا زِلْتَ فِي حِيَاطَةِ اللهِ ۔ کے معنے ہیں تو ہمیشہ خدا کی حفاظت میں رہے ۔ رَجُلٌ يَتَحَوَّطُ اَخَاهُ ۔ وہ ایسا آدمی ہے جو اپنے بھائی کی خبر گیری کرتا ہے ۔ اَلْحَائِطُ ۔ دیوار کو کہتے ہیں ، کیونکہ وہ اندر کی چیزوں کو اپنی حفاظت میں لے لیتی ہے ۔ اَلْمُحْتَاطُ ۔ اس مقام کو کہتے ہیں جہاں مال مویشی رکھے جائیں اور وہ چاروں طرف سے محفوظ ہو** ۔ کتاب الاشتقاق میں ہے کہ حُطْتُ الشَّيْءَ کے معنی حفاظت کرنے کے ہیں ۔ اور اَلْاِحَاطَةُ میں شدت حفاظت پائی جاتی ہے ۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی ہیں کسی چیز کو اپنے گھیرے میں لے لینا ۔ اَلْحَيْطَةُ ۔ عفیف اور شریف عورت کو کہتے ہیں ۔ یعنے جو بہت زیادہ محتاط ہو*** ۔

---

* راغب ۔ ** تاج ۔ *** محیط ۔

اُحِیْطَ بِالْقَوْمِ کے معنے ہیں ساری کی ساری قوم ہلاکت کے گھیرے میں آگئی * ۔ تباہیوں میں گھر گئی ۔

قرآن کریم میں وَاللّٰہُ مُحِیْطٌ بِالْکَافِرِیْنَ (۲/۱۹) اکثر مقامات پر آیا ہے ۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ یہ لوگ جو سمجھ رہے ہیں کہ ہم ، جو کچھ ہمارے جی میں آئے کرتے رہیں ، ہمیں کوئی پوچھنے والا نہیں ۔ تو یہ خیال غلط ہے ۔ ان کے اعمال کبھی بے نتیجہ نہیں رہ سکتے ۔ خدا کا قانونِ مکافات ان کے تمام اعمال کو اپنی حفاظت میں لئے ہوئے ہے اور ان کے نتائج ، تباہیوں اور بربادیوں کی شکل میں ، انہیں چاروں طرف سے گھیرے ہوئے ہیں اور یہ ضرور ہلاک ہو کر رہینگے ۔ اسطرح ، مُحِیْطٌ میں حفاظتِ اعمال اور انکے نتائج کی وجہ سے ہلاکت کے دونوں پہلو آجاتے ہیں ۔ اسی طرح جہنم کے متعلق ہے وَاِنَّ جَہَنَّمَ لَمُحِیْطَۃٌ بِالْکَافِرِیْنَ (۲۹/۵۴) ''یقیناً جہنم ان انکار کرنے والوں کو اپنے گھیرے میں لئے ہوئے ہے'' ۔ دوسری جگہ ہے وَمَا ھُمْ عَنْھَا بِغَائِبِیْنَ (۸۲/۱۶) '' وہ اسکی نظروں سے اوجھل نہیں ہیں '' ۔

سورۃ کہف میں ہے وَاُحِیْطَ بِثَمَرِہٖ (۱۸/۴۲) جسکے معنی ہیں اسکا مال ومتاع ۔ باغ کے پھل وغیرہ سب تباہی کی لپیٹ میں آگئے ۔ سورۃ نمل میں ہے فَقَالَ اَحَطْتُّ بِمَا لَمْ تُحِطْ بِہٖ (۲۷/۲۲) '' اسنے کہا کہ میں نے ایسی بات معلوم کی ہے جسکی تجھے خبر نہیں '' ۔ یہاں اَحَاطَ کے معنے ہیں کسی چیز کی معلومات فراہم کر لینا ۔ اسے حیطہ علم میں لے لینا ۔ سورۃ البروج میں ہے وَاللّٰہُ مِنْ وَّرَآئِہِمْ مُحِیْطٌ (۸۵/۲۰) ۔ '' اللہ انکے گرد اگرد غیر مرئی طور پر گھیرا ڈالے ہوئے ہے '' ۔ اسکا مطلب وہی ہے جو مُحِیْطٌ بِالْکَافِرِیْنَ کے ضمن میں اوپر بیان ہو چکا ہے ۔ سورۃ بقرہ میں ہے وَلَا یُحِیْطُوْنَ بِشَیْئٍ مِّنْ عِلْمِہٖ (۲/۲۵۵) '' وہ اللہ کے علم میں سے کسی شے کا احاطہ نہیں کر سکتے '' ۔ انکے حیطہ ادراک میں نہیں آسکتا ۔ وہ سمجھ نہیں سکتے ۔

ح و ل

حَوْلٌ کے بنیادی معنی کسی چیز کا تغیر پذیر ہونا ، ایک حالت سے دوسری میں جانا اور دوسری چیزوں سے الگ ہو جانا ہیں ۔ چنانچہ جو چیز

* محیط ۔

اپنی پہلی حالت پر نہ رہے بلکہ اس میں کوئی تغیر واقع ہو جائے اسے حَالَ الشَّیْیُٔ یا اِسْتَحَالَ الشَّیْیُٔ - کہتے ہیں کیونکہ اسکی حالت میں تغیر آجاتا ہے - مُسْتَحَالَۃٌ اور مُسْتَحِیْلَۃٌ - ٹیڑھی کمان کو کہتے ہیں - نیز اس زمین کو بھی کہتے ہیں جس میں کئی سال فصل نہ بوئی گئی ہو (اور وہ اسطرح اونچی نیچی ہو جائے - یعنے اپنی پہلی حالت پر نہ رہے -) راغب نے کہا ہے کہ حَوَّلْتُ الشَّیْیَٔ فَتَحَوَّلَ کے معنی ہیں غَیَّرْتُ الشَّیْئَ فَتَغَیَّرَ - اس سے حِوَلٌ کے معنے تغیر و تبدل کے آتے ہیں - چنانچہ قرآن کریم کی آیت لَا یَبْغُوْنَ عَنْھَا حِوَلاً (۱۸/۱۰۸) میں، حِوَلاً کے معنے تبدیلی اور تغیر کے ہیں - حَوَالُ الدَّھْرِ - زمانے کے تغیرات کو کہتے ہیں - راغب نے کہا ہے کہ انسان کے مال، بدن یا خود اسکے نفس میں جو بدلنے والی کیفیات ہوتی ہیں وہ اسکا حَالٌ کہلاتی ہیں - نیز اَلْحَالُ - زمانہ حاضر کو بھی کہتے ہیں - حَوَلٌ - بھینگا ہونے کو کہتے ہیں کیونکہ اس میں آنکھ اپنی اصلی حالت پر نہیں ہوتی - حِوَلٌ کے معنی زوال یا انتقال کے بھی ہیں * - (اس میں بھی حالت کے بدلنے کا پہلو موجود ہے) - ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی دوری حرکت کے ہیں -

گردش کے اعتبار سے حَوْلٌ - سال کو کہتے ہیں کیونکہ وہ زمین کی گردش سے واقع ہوتا ہے (۲/۲۴۰) - اَحَالَ الشَّیْءُ کے معنے ہیں اس چیز پر ایک سال گزر گیا - اَلْحَوْلِیُّ - اس چار پائے کو کہتے جو ایک سال کا ہو جائے -

حَوْلٌ کے معنے ارد گرد کے بھی آتے ہیں - حَوْلُ الشَّیْیِٔ کے معنے چیز کا کنارہ یا طرف ہیں - حَوَ الَیْکَ اور حَوْلَیْکَ سے مراد وہ اطراف ہیں جو تجھے گھیرے ہوئے ہوں - احاطہ کئے ہوں - مَاحَوْلَ الشَّیْیِٔ کے معنے ہیں کسی چیز کا ارد گرد * -

جدا ہونے کے اعتبار سے، جو چیز دو چیزوں کے درمیان حائل ہو جائے اسے حَالَ بَیْنَھُمَا کہتے ہیں (۳۳/۵۴) - اس چیز کو جو درمیان حائل ہو جاتی ہے حِوَالٌ یا حَوَلٌ یا حُوَلٌ کہتے ہیں - الگ کردینے کی نسبت سے کسی چیز کا رخ تبدیل کر دینے نیز اسے دگرگوں کر دینے، زائل کر دینے کو تَحْوِیْلٌ کہتے ہیں (۱۷/۵۶) * - یہ لازم بھی ہے - اور اس طرح اس کے معنے دگرگوں ہو جانا، ایک حالت سے دوسری حالت میں بدل جانا بھی ہیں - ** اَلتَّحَوَالَۃُ

---

* تاج - ** محیط -

کے معنے ہیں ایک نہر کو دوسری نہر کی طرف موڑ دینا ۔ مُحَال کے معنی ہیں دو متناقض چیزوں کا ایک جگہ جمع ہو جانا ۔ (جو نا ممکن ہے) * نیز باطل اور اپنے صحیح رخ سے ہٹا ہوا ۔

حَوْلَةٌ کے معنے قوت تصرف، غلبہ اور اقتدار کے بھی ہیں ۔ نیز گھوڑے کی پشت پر جم کر بیٹھ جانے کو بھی کہتے ہیں ۔ اپنی پیٹھ پر جو گٹھڑی وغیرہ اٹھائی جائے اسے حَالٌ کہتے ہیں ۔ نیز اس گڈیلنے کو بھی جس کے سہارے بچہ بتدریج چلنا سیکھتا ہے * ۔

حِيْلَةٌ ۔ مہارتِ نگاہ اور نظر کی تیزی نیز معاملات میں تصرف پر قابو اور تدبیر امور پر قدرت حاصل ہونے کو کہتے ہیں ۔ راغب نے کہا ہے کہ حِيْلَةٌ وہ طریقہ ہے جس سے کسی بات تک پوشیدہ طور پر پہنچا جائے ** ۔ ہمارے ہاں یہ لفظ عام طور پر برے معنوں میں استعمال ہوتا ہے لیکن قرآن کریم میں یہ لفظ حالات میں تبدیلی کرنے پر قدرت اور معاملات میں تصرف کرنے کی طاقت، کے لئے استعمال ہوا ہے ۔ لَا يَسْتَطِيْعُوْنَ حِيْلَةً ۔ (۴/۹۸) ۔

حَوِيْلٌ ۔ گواہ اور شاہد کو بھی کہتے ہیں ۔ نیز کفیل کو بھی ۔ حَاوَلْتُ لَهُ بَصَرِيْ کے معنے ہیں، میں نے اسکی طرف تیز نظر سے دیکھا ** ۔

ح و و

اَلْحُوَّةُ ۔ سبزی مائل سیاہی ''گہری سبزی ۔ لوہے کے زنگ جیسا رنگ ۔ یعنے سرخی جو مائل بہ سیاہی'' ۔ اِحْوَاوَتِ الْاَرْضُ ۔ زمین سرسبز ہو گئی * ۔

قرآن کریم میں ہے وَ الَّذِیْٓ اَخْرَجَ الْمَرْعٰی ۔ فَجَعَلَهٗ غُثَآءً اَحْوٰی (۸۷/۴-۵) ۔ ''خدا (کا قانون) زمین سے چارہ نکالتا ہے ۔ پھر اسے خشک کرکے بالکل سیاہ رنگ کا کوڑا کرکٹ بنا دیتا ہے'' ۔ راغب نے بھی اس کی تائید کی ہے *** ۔ فرّاء نے کہا ہے کہ جب گھاس خشک ہو جائے تو اسے غُثَاءٌ کہتے ہیں اور جب وہ پرانی بوسیدہ ہو کر سیاہ پڑ جائے تو اسے اَحْوٰی کہتے ہیں * ۔ (اس کا مؤنث حَوَّاءُ ہے)

(غُثَاءٌ کوڑے کرکٹ کو کہتے ہیں ۔ دیکھئے عنوان (غ ۔ ث ۔ و(ی))

---

*تاج ۔ ** تاج و محیط ۔ ***راغب ۔

ح و ی

اَلْحَوِیَّۃُ - ہر چیز کی گولائی کو کہتے ہیں - (گول لپٹی ہوئی) آنت - جمع حَوَایَا یعنی انتڑیاں* - (٦/۱۴۷)

حَوَاہُ - یَحْوِیْہِ - کسی چیز کو جمع کرنا، اپنے اندر لے لینا ، مالک ہونا - اس کا احاطہ کر لینا - اسے نگاہ میں رکھنا* - ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی جمع کرنے کے ہوتے ہیں -

حَیْثُ

حَیْثُ - جسطرح حِیْنٌ زمانہ پر دلالت کرتا ہے (یعنے ''جب'') - اسی طرح حَیْثُ مکان پر دلالت کرتا ہے - (یعنے ''جہاں'') - لیکن اخفش کا قول ہے کہ حَیْثُ کا استعمال زمانہ کے لئے بھی ہو سکتا ہے** - یعنے حَیْثُ کے معنے ''جب'' بھی ہوسکتے ہیں -

سورۃ بقرہ میں ہے فَکُلُوْا مِنْھَا حَیْثُ شِئْتُمْ (۲/۵۸) - تم جب چاہو یا جہاں سے چاہو - کھاؤ - ''جنتِ آدم'' کے ضمن میں ہے وَ کُلَا مِنْھَا رَغَدًا حَیْثُ شِئْتُمَا (۲/۳۵) - ''تم جہاں سے جی چاہے با فراغت کھاؤ'' - جنتی معاشرہ کی کیفیت یہ ہوگی کہ اس میں ہر فرد کو سامانِ زیست ہر جگہ میسر ہوگا اور با فراغت میسر ہوگا -

ح ی د

حَادَ عَنِ الطَّرِیْقِ - یَحِیْدُ - وہ راستہ سے (ایک طرف کو) ہٹ گیا - اَلرَّجُلُ یَحِیْدُ عَنِ الشَّیْیِٔ - آدمی خوف اور نفرت کی وجہ سے کسی چیز سے رکتا اور باز رہتا ہے - حِمَارٌ حَیْدَی وہ گدھا جو اپنے سایہ سے بدکتا ہو - حَیْدُ الْجَبَلِ - پہاڑ کا اٹھا ہوا کنارہ جو بلند اور آگے کو نکلا ہوا ہو - سخت ٹیڑھی پسلی** - ابن فارس نے اس کے بنیادی معنی راستے سے ہٹ جانا لکھے ہیں -

قرآن کریم میں ہے ذٰلِکَ مَا کُنْتَ مِنْہُ تَحِیْدُ (۵۰/۱۹) - ''یہ وہ ہے جس سے تم بدکتے اور کنارہ کشی اختیار کرتے تھے'' -

---

* تاج ** تاج - صاحب محیط نے بھی اس کی تائید کی ہے -

ح ی ر

حَارَ بَصَرُہٗ ۔ یَحَارُ ۔ کسی چیز کی طرف دیکھنے سے نگاہ کا چندھیا جانا ۔ حَارَ فِی اَمْرِہٖ : وہ اپنے معاملہ کا صحیح حل نہ پا سکا ۔ حَیْرَۃٌ* کے اصلی معنے ھیں چمک سے آنکھوں کا چندھیا جانا (اور اس طرح نگاہ کو ادھر سے پھیر لینا) حَارَ وَاسْتَحَارَ ۔ راستہ نہ پانا ۔ فَھُوَ حَیْرَانٌ ۔ سو وہ متحیر رہ گیا ۔ یعنے صحیح راستہ دکھائی نہ دینے کی وجہ سے مضطرب اور پریشان ھوجانے والا ۔ حَارَ الْمَاءُ فِی الْمَکَانِ ۔ اس وقت بولتے ھیں جب پانی کو آگے جانے کا راستہ نہ ملے اور وہ ایک ھی جگہ رک کر گردش کرتا رھے*۔

اَلْمُسْتَحِیْرُ ۔ لق و دق بیابان کے عرض میں جانے والا راستہ جس کا پتہ ھی نہ چلے کہ کس طرف لے جائیگا* ۔ اس کے معنے راستہ نہ پاسکنے کی وجہ سے پریشان اور مخبوط الحواس ھوجانے والا بھی ھیں۔ قرآن کریم میں ھے کَالَّذِی اسْتَھْوَتْہُ الشَّیٰطِیْنُ فِی الْاَرْضِ حَیْرَانَ (۶/۷۱) ”اس شخص کی مانند جسکے جذبات پر شیاطین قبضہ کرکے اسے زمین میں بھٹکاتے پھریں اور وہ حیران و پریشان ھو۔ یعنی جو اپنے جذبات کے پیچھے چلتا جائے اور اسطرح یوں راہ گم کردے کہ اسے پتہ ھی نہیں چلے کہ اب کدھر جانا ھے ۔

ح ی ز (ح و ز)

حَازَ الشَّیْءَ یَحُوْزُہٗ ۔ کسی چیز کو جمع کرنا اور اپنی جانب یا اپنے اندر لے لینا ۔ اِنْحَازَ عَنْہُ ۔ وہ اس سے ھٹ گیا ۔ اِنْحَازَ اِلَیْہِ ۔ وہ اس کی طرف مائل ھو گیا ۔ تَحَوَّزَ وَ تَحَیَّزَ ۔ سانپ کی طرح بل کھانا ۔ مڑ جانا ۔ ایک طرف کو ھٹ جانا* ۔ قرآن کریم میں ھے اَوْ مُتَحَیِّزًا اِلٰی فِئَۃٍ (۸/۱۶) ۔ اپنی جماعت کی طرف پہنچنے کے لئے مڑ جانے والا۔ راغب نے کہا ھے کہ اس کے معنے ھیں حَیِّزٌ* (خالی جگہ ، کنارہ ، گوشہ) کی طرف ھونے والا ۔ اس کی اصل واو سے ھے جس کے معنے ھیں ھر وہ مجموعہ جس کے اجزا ایک دوسرے سے پیوست ھوں** ۔ لہذا مُتَحَیِّزًا اِلٰی فِئَۃٍ کے معنی ھونگے اپنی (یا کسی) جماعت کے ساتھ مجتمع ھو جانے کی غرض سے ۔

ح ی ص

حَاصَ عَنْہُ یَحِیْصُ ۔ کسی چیز سے ھٹ جانا ۔ الگ ھو جانا کسی سے بچنے کے لئے ایک طرف کو بھاگ جانا*۔ ابن فارس نے کہا ھے کہ اس میں ھٹنے کے

* تاج ۔ **راغب ۔

ساتھ تحیر کا پہلو بھی ہوتا ہے ۔ اَلْمَحِیْصُ ۔ ہٹنے کی جگہ ۔ ایک طرف کو ہو جانے اور بھاگ جانے کی جگہ* ۔ وَلَا یَجِدُوْنَ عَنْھَا مَحِیْصًا (۴/۱۲۱) ۔ ''وہ اس سے بچکر جانے کی کوئی جگہ نہ پائینگے'' وہ فرار ہو کر پناہ گاہ نہیں پائینگے ۔

ایک طرف کو ہٹ جانے کے اعتبار سے اَلْاَحْیَصُ اس آدمی کو کہتے ہیں جس کی ایک آنکھ دوسری سے چھوٹی ہو ۔ (حَیْصَ بَیْصَ کے معنے ہیں کسی بات کا نہایت شدت سے مبہم ہو جانا** ۔ سخت الجھاؤ*) ۔

ح ی ض

حَاضَ السَّیْلُ ۔ سیلاب خوب بڑھ گیا اور اس کا پانی چڑھا اور بہہ نکلا ، ۔ دراصل اس لفظ کے معنے بہنے اور جاری ہونے کے ہیں ۔ حَاضَتِ الْمَرْاَۃُ ۔ عورت کے ماھواری خون کا جاری ہونا *** ۔ اَلْمَحِیْضُ (۲/۲۲۲) ۔ حیض کا جاری ہونا ، حیض کا خون ، حیض کے ایام یا موضع حیض (جہاں سے حیض کا خون برآمد ہوتا ہے) لیکن یہ لفظ خود حیض کے لئے بھی آتا ہے (۶۵/۴) ۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ ببول کے درخت سے جو سرخ رنگ کا پانی نکلتا ہے اس کے لئے حَاضَتِ السَّمُرَۃُ کہتے ہیں ۔ تاج نے بھی اس کی تائید کی ہے ۔

حَاضَتْ ، تَحِیْضُ ۔ حائضہ ہونا ۔ وَالّٰٓئِیْ لَمْ یَحِضْنَ (۶۵/۴) ۔ وہ عورتیں جنہیں کسی وجہ سے حیض نہ آسکا ہو (یعنی عمر کے لحاظ سے انہیں حیض آنا چاہئیے تھا لیکن کسی بیماری کی وجہ سے حیض نہیں آ سکا) ۔

ح ی ف

اَلْحَائِفُ ۔ ٹیڑھی چیز ۔ نیز راستی سے ہٹنے والے کو کہتے ہیں ۔ اَلْحَائِفُ مِنَ الْجَبَلِ ۔ پہاڑ کا ایک طرف نکلا ہوا کنارہ ۔ اَلْحِیْفَۃُ ۔ کنارہ ۔ جانب ۔ پہلو ۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنے جھکاؤ اور میلان کے ہیں ۔ اَلْحَیْفُ ۔ فیصلہ کرنے میں ایک طرف کو جھک جانا ۔ انصاف نہ کرنا ، ظلم و زیادتی ۔ حَافَ عَلَیْہِ ۔ اس پر ظلم و زیادتی کی**** ۔ قرآن کریم میں ہے اَمْ یَخَافُوْنَ اَنْ یَّحِیْفَ اللّٰہُ عَلَیْہِمْ وَرَسُوْلُہٗ (۲۴/۵۰) ,, کیا انہیں اس کا ڈر ہے کہ خدا اور اس کا رسول فیصلہ کرنے میں فریق مخالف کیطرف جھک جائیگا اور ان سے انصاف نہیں برتیگا ،، ! (کس قدر غلط ہے ان کا یہ اندیشہ) ۔

* تاج ۔ **راغب ۔ *** تاج و محیط ۔ **** تاج و محیط و راغب

ح ی ق

حَاقَ بِهِ الشَّیْءُ یَحِیْقُ۔ کسی چیز نے اسے گھیر لیا۔ * وَحَاقَ بِاٰلِ فِرْعَوْنَ سُوْٓءُ الْعَذَابِ (۴۰/۴۵)۔ ''بدترین عذاب نے قوم فرعون کو گھیر لیا''۔ انسانی اعمال کے نتائج جس طرح اُسے چاروں طرف سے گھیر لیتے ہیں اور وہ ان کے اثر سے بچ نہیں سکتا، اسکے لئے یہ لفظ استعمال ہوا ہے۔ فَحَاقَ بِالَّذِیْنَ سَخِرُوْا مِنْھُمْ مَّا کَانُوْا بِهٖ یَسْتَھْزِءُوْنَ (۶/۱۰)۔ ''جو لوگ ان میں سے پیغام خداوندی کا تمسخر اڑاتے تھے، اُنہیں اُس چیز نے گھیر لیا جس کی وہ ھنسی اڑایا کرتے تھے''۔ یعنی ان کے اعمال کے نتائج نے انہیں چاروں طرف سے گھیر لیا۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی ہیں ایک چیز کا دوسری چیز پر چھا جانا۔ اس کے اوپر آ کر بیٹھ جانا اور چپک جانا۔

ح ی ن

اَلْحِیْنُ۔ مطلقاً زمانہ اور وقت کو کہتے ہیں۔ خواہ وہ وقت طویل ہو یا قصیر۔ (کم ہو یا زیادہ)۔ عربی زبان میں حِیْنٌ کا اطلاق ایک لمحہ سے لے کر لامتناہی حد تک ہوتا ہے۔ راغب نے کہا ہے کہ حِیْنٌ اس وقت کو کہتے ہیں جس میں کوئی چیز پہنچے اور حاصل ہو جائے۔ یہ وقت مبہم ہوتا ہے اور اس وقت معین و مخصوص ہو جاتا ہے جب اس کے بعد مضاف الیہ آ جائے۔ حَانَ الْقَوْمُ کے معنے ہیں قوم جو کچھ چاہتی تھی اس کے حاصل ہونے کا وقت آ گیا۔ حِیْنٌ کے معنے مدت کے بھی آتے ہیں۔ اور جب دو وقتوں کا بُعد بتانا ہو، یعنی یہ بتانا ہو کہ ایک کام کے بعد دوسرا ہوا، تو اس کے بعد اِذْ کا اضافہ کر دیتے ہیں۔ جیسے حِیْنَئِذٍ۔ مثلاً اَنْتُمْ حِیْنَئِذٍ تَنْظُرُوْنَ (۵۶/۸۴) یعنی جس وقت جان نکلنے کے لئے حلق تک پہنچتی ہے اس وقت، اس حالت کے بعد، تم اسے دیکھ رہے ہوتے ہو*۔

قرآن کریم میں ہے وَّلَاتَ حِیْنَ مَنَاصٍ (۳۸/۳)۔ یہاں لَاتَ کے بعد مبتدا محذوف ہے۔ آیت کے معنے ہیں یہ وقت بھاگ نکلنے کا وقت نہیں ہے۔

حَیَّنَهٗ۔ اس کے لئے وقت مقرر کیا*۔

سورۂ بقرہ میں ہے۔ وَلَكُمْ فِی الْاَرْضِ مُسْتَقَرٌّ وَّمَتَاعٌ اِلٰى حِیْنٍ (۲/۳۶) اس کے یہ معنے ہونگے کہ تمہیں زمین پر ٹھہرنا ہے اور اس سے

---

* تاج۔

فائدہ حاصل کرنا ہے ایک وقت تک کے لئے جس کی مدت معین نہیں - یہ مدت مختلف افراد اور مختلف اقوام کے لئے مختلف ہوگی - جس قسم کے اعمال کسی قوم سے سرزد ہونگے اس کے مطابق اسکی مدت حیات کا تعین ہو جائیگا - باقی رہا نوعِ انسان کا اس ارض پر قیام ، سو اس کی مدت کے متعلق علمِ انسانی کچھ نہیں کہہ سکتا -

اَلْحَیْنُ - ھلاکت اور موت کو بھی کہتے ھیں - اَحَانَہُ اللہُ - خدا نے اسے ھلاک کر دیا - اَلْحَائِنُ - احمق کو کہتے ھیں اور اَلْحَانِیَۃُ شراب کو* -

ح ی ی

حَیِیَ (حَیَّ) - یَحْیٰی (یَحَیُّ)- وہ زندہ رھا - یا زندہ ھوا - حَیَاۃٌ (حَیٰوۃٌ) زندگی - اَحْیَاہُ - اس نے اسے زندہ کیا - اِحْیَاءٌ - زندگی بخشنا - تَحَیَّا مِنْہُ - وہ اس سے سمٹا سکڑا - (Shrank) - علم الحیات کے ماھرین کہتے ھیں کہ زندگی کی ایک علامت سکڑنا ہے - آپ کسی جاندار چیز (مثلاً کیڑے وغیرہ) کو چھیڑئیے ، اگر وہ زندہ ہے تو اس کا پہلا ردِ عمل یہ ہوگا کہ وہ اپنے آپ کو سکیڑ لیگا - سمٹ جائیگا - اگر وہ زندہ نہیں تو علیٰ حالہٖ رھیگا - اس کا یہ سمٹنا در حقیقت اس کے جذبہ تحفظ خویش (Preservation of Self) کا مظاھرہ ہوتا ہے - اسی سے عربوں نے اس مادہ سے سمٹنے اور سکڑنے کا مفہوم بھی لیا - یہیں سے حَیَاءٌ (شرم) ہے کیونکہ حیاء کا مظاھرہ بھی سمٹنے سے ہوتا ہے - سانپ کو بھی حَیَّۃٌ اس کے سکڑنے اور سمٹنے کی وجہ سے کہتے ھیں * -

راغب نے حَیٰوۃٌ کے معنے قوتِ حاسہ (Faculty of sensation) لئیے ھیں - مَوْتٌ اس کی نقیض ہے - (دیکھئے عنوان م - و - ت) راغب کے نزدیک حَیَاۃٌ کا استعمال مختلف پہلوؤں سے ہوتا ہے - مثلاً (۱) بڑھنے کی قوت (قوت نامیہ) جو نباتات اور حیوانات میں ہوتی ہے - (۲) قوت احساس (۳) قوت عقل وعمل (۴) رنج وغم سے آزادی (۵) حیاتِ اخروی و ابدی جس تک انسان محض اُس حیات سے پہنچ سکتا ہے جو عقل و علم کی حیات ہوتی ہے - اور (۶) وہ حیات جس سے صرف خدا کی ذات متصف ہوتی ہے اور جس میں موت نہیں - (اَلْحَیُّ الْقَیُّوْمُ)** -

اِحْیَاءٌ - زندہ کرنا - اِسْتِحْیَاءٌ - زندہ رکھنا نیز حیا کرنا - لیکن اِنَّ اللہَ لَا یَسْتَحْیٖٓ اَنْ یَّضْرِبَ مَثَلًا (۲/۲۶) میں لَا یَسْتَحْیٖ کے معنے

---

* تاج - ** راغب بحوالہ تاج

ھیں ، اللہ کو اس میں کسی قسم کا باک یا رکاوٹ نہیں کہ وہ اس قسم کی مثال دے**۔ لا حَیَّ عَنْہُ کے معنے ھیں اس سے کوئی رکاوٹ نہیں**۔ اَلْحَیَاءُ کے معنے سر سبزی اور بارش کے بھی آتے ھیں کیونکہ ان سے زمین کی حیات وابستہ ھوتی ھے ۔ حَیَّ عَلٰی یا حَیَّ ھَلْ کے معنے ھیں اس کام کے لئے جلدی کرو''**۔

حَیَّاہُ تَحِیَّۃً کے معنے ھیں اس کے لئے خوشگوار زندگی ، درازی عمر کی آرزو کرنا یا دعا دینا**۔ سلام کرنا*** (۴/۸۶) تَحِیَّاتٌ کا لفظ در حقیقت حیاتِ جاوید کے لئے استعمال ھوتا ھے***۔ نیز ہر قسم کی سلامتی اور آفتوں سے محفوظ رھنے کے لئے**۔ اَلْمَحْیَا کے معنے زندگی ھیں ۔ جسطرح موت کے مقابلہ میں حیات کا لفظ آتا ھے (۶۷/۲) اسی طرح مَمَات کے مقابلہ میں مَحْیَا آتا ھے۔ (۶/۱۶۳)۔ اَلْحَیَاۃُ بعض اوقات منفعت (نفع بخشی) کے معنوں میں بھی آتا ھے*۔ اَلْحَیَاۃُ الطَّیِّبَۃُ ۔ رزق حلال یا جنت کو کہتے ھیں****۔ حَیِیَ الطَّرِیْقُ کے معنے ھیں راستہ ظاہر یا واضح ھو گیا۔ اور طَرِیْقٌ حَیٌّ کے معنے ھیں واضح راستہ****۔

قرآن کریم میں حیاتِ اخروی کے لئے ھے وَ اِنَّ الدَّارَ الْاٰخِرَۃَ لَھِیَ الْحَیَوَانُ (۲۹/۶۴)۔ اس آیت میں حَیَاۃٌ کے بجائے حَیَوَانٌ کا لفظ آیا ھے جسکا وزن فَعَلَانٌ ھے ۔ یہ فرق بڑا معنی خیز ھے ۔ عربی زبان میں فَعَلَانٌ کے وزن کی خصوصیت یہ ھے کہ اس میں شدت ، غلبہ ، ھنگامی طور پر کچھ نمودار ھونا اور حرکت و اضطراب کا پہلو غالب ھوتا ھے ۔ اس کا مطلب یہ ھے کہ حیات اخروی اسی سلسلہ کی ایک کڑی نہیں جو اِس دنیا میں طبعی قوانین کی رو سے قائم ھے ۔ اس میں زندگی اچانک ایک نئی صورت اختیار کریگی*****۔ اور جمود و سکون کے بجائے حرکتِ پیہم اور سعیٔ مسلسل ھوگی****۔ (اس فرق کے لئے آخِرَۃٌ اور قِیَامَۃٌ کے الفاظ بھی دیکھئے جو، ا۔ خ۔ ر اور ق۔ و۔ م کے عنوانات میں ملینگے۔ نیز رَحْمٰنٌ کا لفظ جو ر۔ ح۔ م کے تحت ملیگا)۔

حَیٰوۃٌ ۔ کے مختلف مفہوم جنکا ذکر اوپر آیا ھے قرآن کریم کی متعدد آیات میں مذکور ھیں ۔ لیکن اس حقیقت کو اچھی طرح سمجھ لینا چاھئے کہ

* تاج ۔ **راغب بحوالہ تاج ***لین ۔ لین نے یہ بھی لکھا ھے کہ سانپ کو حیۃ اس کی درازیٔ عمر کی وجہ سے کہتے ھیں ۔ عربوں کا خیال تھا کہ سانپ صرف کسی حادثہ سے مرتا ھے ۔ طبیعی موت مرتا ھی نہیں ۔ ****محیط ۔ *****اس کا مطلب یہ ھے کہ حیات اخروی دنیا کی زندگی کے تسلسل میں تو ھوگی لیکن جن طبیعی قوانین کے ماتحت اس دنیا میں زندگی کی نمود اور بقا ھوتی ھے ، اخروی حیات ان قوانین کے تابع نہیں ھوگی ۔ وھاں اس کے لئے اور قوانین ھونگے ۔

جہاں تک انسانوں کا تعلق ہے قرآن کریم ان کی محض طبیعی زندگی (Physi-cal life) کو حیات نہیں قرار دیتا ۔ اس کے نزدیک حقیقی زندگی وہ ہے جو شرفِ انسانیت کو لئے ہو ۔ جس میں انسان قوانین خداوندی کی روشنی میں علم و عقل سے کام لے کر اپنی ذات کی نشو و نما کرتا چلا جائے ۔ الحَیَاۃُ الدُّنْیَا سے مراد ہے مفادِ عاجلہ ۔ پیش پا افتادہ مفاد ۔ فوری عیش و عشرت ۔ محض قریبی فائدے ۔ یعنی وہ زندگی جس میں مستقبل پر کوئی نگاہ نہ ہو ۔ طبعی زندگی جس میں انسان حیوانی سطح (Animal Level) پر دن بسر کرتا ہے ۔ نہ اس زندگی میں مستقبل کی درخشندگی پر نگاہ رکھتا ہے اور نہ ہی مرنے کے بعد تسلسلِ حیات پر یقین رکھتا ہے، الحَیَاۃُ الدُّنْیَا ہے ۔ قرآن کریم میں الحیاۃ الدنیا اور حیاتِ آخرت کی اہم اصطلاحات کا مفہوم سمجھنے کے لئے ان معانی کو پیشِ نظر رکھنا چاہئے ۔ نیز اس حقیقت کو بھی کہ جس طرح ہمارے ہاں (اردو میں ۔ اور اسی طرح دنیا کی دیگر زبانوں میں) زندگی سے مراد صرف زندہ رہنا (سانس لینا) اور موت سے مراد محض مر جانا (نفس کی آمدوشد کا بند ہو جانا) نہیں بلکہ ان الفاظ کے معانی بہت وسیع ہیں۔ اسی طرح عربی زبان (اور قرآن کریم میں) بھی یہ الفاظ وسیع معنوں میں استعمال ہوئے ہیں ۔ اس لئے ہر مقام پر (نفسِ مضمون کے اعتبار سے) دیکھنا چاہئے کہ وہاں کونسے معانی زیادہ موزوں ہیں ۔ مثلاً جب ہم کہتے ہیں کہ فلاں قوم مردہ ہے تو اس سے یہ مطلب نہیں ہوتا کہ اس کے افراد قبروں میں دفن ہوچکے ہیں ۔ اور جب کہتے ہیں کہ اس قوم کا شمار زندہ قوموں میں ہوتا ہے تو اس سے یہ مراد نہیں ہوتی کہ اس کے افراد سانس لیتے ہیں ۔ مردہ اقوام اور زندہ اقوام کا مفہوم واضح ہے ۔ اسی طرح یہ الفاظ قرآن کریم میں بھی استعمال ہوئے ہیں ۔ مثلاً سورۃ انعام میں ہے اَوَ مَنْ کَانَ مَیْتًا فَاَحْیَیْنٰہُ وَ جَعَلْنَا لَہٗ نُوْرًا یَّمْشِیْ بِہٖ فِی النَّاسِ . . . . . . ($\frac{6}{123}$) ۔ ''اور کیا وہ جو مردہ ہو۔ پھر اسے ہم زندہ کر دیں اور اسے ایسی روشنی عطا کر دیں جس سے وہ لوگوں میں چلے . . . .'' ۔ ظاہر ہے کہ یہاں موت اورحیات سے مراد طبعی موت اور زندگی نہیں بلکہ گمراہی اور ہدایت ہے ۔ موت اور حیات کے معانی کے اس فرق کو ہر مقام پر ملحوظ رکھنا چاہئے ۔ حضرات انبیاء کرام اقوام مردہ کو ایسی زندگی عطا کرنے کے لئے آتے تھے جو انہیں دنیا بھر کی سرفرازیاں عطا کردے ۔ ($\frac{8}{24}$) ۔ یہ زندگی اب قرآن کریم کی رو سے مل سکتی ہے لیکن صرف اُسے جس میں زندہ رہنے کی صلاحیت ہو ($\frac{36}{70}$) ۔ اور جو تباہیوں سے بچنا چاہے ($\frac{8}{42}$) ۔

خ

خ ب أ

خَبَأَهٗ ۔ یَخْبَؤُهٗ ۔ خَبْأً ۔ چھپانا ۔ پردہ میں رکھنا ۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ یہی اس کے بنیادی معنی ہیں ۔ اِمْرَأَۃٌ خُبَأَۃٌ ۔ خانہ نشین عورت جو گھر سے باہر نہ نکلتی ہو۔ اَلْخَبِیئَۃُ ۔ بیج کے وہ دانے جنہیں کسان زمین کے اندر چھپا دیتا ہے ۔ قدرت کے خزانے جو اس نے زمین میں چھپا رکھے ہیں ۔ اَلْخَبْءُ ۔ ذخیرہ کی ہوئی اور چھپائی ہوئی چیز* ۔

قرآن کریم میں اَلْخَبْءَ فِی السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ (۲۷/۲۵) آیا ہے۔ کائنات کی پستیوں اور بلندیوں کے اندر چھپے ہوئے خزانے ۔ ان کی مستور قوتیں اور مضمر صلاحیتیں ۔ ان کے اندر پوشیدہ رزق کے خزانے ۔

خ ب ت

اَلْخَبْتُ ۔ نشیبی زمین جو وسیع بھی ہو** ۔ وسیع میدان جس میں کچھ اُگا ہؤا نہ ہو۔ (ابن فارس) اَخْبَتَ ۔ وہ نشیبی زمین میں پہنچا ، اس کے بعد یہ لفظ نرمی خشوع ، تواضع اور جُھک جانے ، اطاعت کرنے نیز مطمئن ہونے کے معنوں میں استعمال ہونے لگا** ۔

قرآن کریم میں مومنین کے متعلق ہے وَاَخْبَتُوْآ اِلٰی رَبِّهِمْ (۱۱/۲۳) ۔ '' وہ خدا کے (قانون ربوبیت کے) سامنے سر تسلیم خم کرتے ہیں ''۔ یعنی فَتُخْبِتَ لَهٗ قُلُوْبُهُمْ (۲۲/۵۴) ۔ '' اس کے سامنے ان کے دل جھک جائیں یا نرم ہو جائیں '' ۔ انہی کو دوسری جگہ مُخْبِتِیْنَ (۲۲/۳۴) کہا گیا ہے ۔ دل کی نرمی اور جھکاؤ والے ۔ اس سے پہلے فَلَهٗٓ اَسْلِمُوْا (۲۲/۳۴) نے مفہوم واضح کردیا ہے۔ قانونِ خداوندی کے سامنے جھک جانے والے ۔ اسے بطیبِ خاطر تسلیم کر لینے والے ۔

---

* تاج و راغب ۔ ** تاج ۔

خ ب ث

اَلْخَبِیْثُ - طَیِّبٌ کی ضد ہے اس لئے اسکے مفہوم کیلئے ط - ی - ب کا عنوان دیکھنا ضروری ہے - خُبْثٌ کے معنے گندے ، گھناؤنے اور مکروہ کے ہیں خواہ وہ کھانے پینے کی چیزوں میں ہو یا کلام میں - یا افعال میں - یا عقائد و خیالات میں*- اَلْخَبِیْثُ - طَیِّبٌ کی ضد ہے ناپسندیدہ ، ناگوار ، خراب نیز دھوکا دینے والا- اَلْخَابِثُ- مکار آدمی - یا ردی شے*- خَبَثُ الْحَدِیْدِ وَالْفِضَّةِ- لوہے اور چاندی وغیرہ کا میل جو انہیں بوٹی میں پگھلانے سے الگ ہو جاتا ہے*- ملاوٹ - کھوٹ - اَلْخُبْثُ - زنا کو بھی کہتے ہیں *-

سورۃ اعراف میں خَبُثَ - اس زمین کے لئے آیا ہے جو شور ہو اور وہاں کچھ پیدا نہ ہو اور اگر پیدا ہو تو بہت تھوڑا ($\frac{۷}{۵۸}$)

اسی طرح سورۃ ابراھیم میں کَلِمَةٌ طَیِّبَةٌ کے مقابلہ میں کَلِمَةٌ خَبِیْثَةٌ آیا ہے جسے شَجَرَةٌ خَبِیْثَةٌ سے تشبیہ دی گئی ہے ($\frac{۱۴}{۲۴ - ۲۶}$)- اس کے معنے ہیں ایسا درخت جو پھل نہ دے- غلط نظریہٗ حیات دیکھنے میں بالکل صحیح نظریہ کے مطابق نظر آتا ہے لیکن اس کا نتیجہ کچھ نہیں نکلتا - ساری محنت اکارت جاتی ہے - حالانکہ غلط نظریہٗ حیات کی چمک دمک بھی بہت ہوتی ہے اور پھیلتا بھی بڑی کثرت سے ہے ($\frac{۵}{۱۰۰}$) - لیکن اسے ثبات و قرار کبھی نہیں ہو سکتا - اسکی جڑیں زمین کے اوپر اوپر ہوتی ہیں ($\frac{۱۴}{۲۶}$) -

خَبَائِثُ - خَبِیْثَةٌ کی جمع ہے چنانچہ ($\frac{۷}{۱۵۷}$) میں ہے کہ رسول طیبات کو حلال قرار دیتا ہے اور خبائث کو حرام - یعنی قرآن کریم نے جن چیزوں کو حرام قرار دیا ہے وہ خبائث ہیں اور جو چیزیں حلال ہیں وہ طیبات ہیں - (تفصیل کے لئے عنوان ح - ر- م اور ح - ل - ل دیکھئے)

قرآن کریم میں فحش کاری یا فحش کار لوگوں کے لئے بھی خبیث کا لفظ آیا ہے - مثلاً سورۃ نور میں ہے اَلْخَبِیْثٰتُ لِلْخَبِیْثِیْنَ . . . ($\frac{۲۴}{۲۶}$)- یہاں یہ معنی بھی ہو سکتے ہیں کہ خبیث باتیں خبیث لوگوں کے شایان شان ہیں - اور یہ بھی کہ خبیث عورتیں خبیث مردوں کے لئے ہیں - ثانی الذکر مفہوم کی تائید اسی سورۃ کی دوسری آیت سے ہوتی ہے جہاں کہا گیا ہے کہ اَلزَّانِیْ لَا یَنْکِحُ اِلَّا زَانِیَةً ..... ($\frac{۲۴}{۳}$) زانی مرد صرف زانی عورت سے نکاح کر سکتا ہے ...... (اسکی تشریح "مفہوم القرآن" میں ملیگی)

* تاج و محیط-

خ ب ر

اَلْخَبَرُ - جمع اَخْبَارٌ هے (۹۶/۳)خَبَرٌ اور نَبَاٌ میں فرق یہ ہے کہ نَبَاٌ کسی بہت بڑے واقعہ کے متعلق ہوتی ہے اور خَبَرٌ عام واقعات کے متعلق - اہل لغت نے کہا ہے کہ خَبَرٌ عرف اور لغت میں اس بات کو کہتے ہیں جو کسی دوسرے سے نقل کی جائے * - لیکن قرآن کریم میں یہ لفظ اس تخصیص کے ساتھ نہیں آیا - حضرت موسیٰؑ نے اپنے اہل سے کہا کہ میں نے آگ دیکھی ہے سَآتِیْکُمْ مِنْهَا بِخَبَرٍ (۲۷/۷) "میں اس سے تمہارے پاس خبر لاونگا" -

اَلْخَبِیْرُ - خبر کو جاننے یا رکھنے والا - یا خبر دینے والا * - قرآن کریم میں یہ لفظ اللہ تعالیٰ کی صفت کے طور پر آیا ہے - وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِیْرٌ (۲/۲۷۱) - "جو کچھ تم کرتے ہو اللہ اس سے باخبر ہے" -

خُبْرٌ کے معنے بھی کسی چیز کے جاننے کے ہیں * - (۱۸/۶۸) - محیط میں ہے کہ یہ اس واقفیت کو کہینگے جو تجربہ کی بنا پر ہو -

ابن فارس نے اس مادہ کے بنیادی معنی علم بتائے ہیں - اس اعتبار سے خَبَرٌ کے لئے علم اور واقفیت ضروری ہے -

خ ب ز

اَلْخُبْزُ - روٹی * - (۱۲/۳۶) - اصلی معنے اس مادہ میں مارنے اور دفع کرنے کے ہوتے ہیں - چنانچہ اَلْخَبْزُ کے معنے ہوتے ہیں اونٹ کا زمین پر ہاتھ مارنا - چونکہ روٹی بھی اس طرح ہاتھ مارنے سے بنتی ہے اسلئے اسے خُبْزٌ کہتے ہیں - یا اس لئے کہ روٹی سے بھوک مرتی اور دفع ہوتی ہے - کبھی کبھی اس لفظ کا اطلاق ہر اس چیز پر کر دیا جاتا ہے جسے انسان کھائے یا معیشت کیلئے اختیار کرے ** - جیسے ہمارے ہاں بھی جب کہا جائے کہ "اصل سوال تو روٹی کا ہے" تو اس کے معنی رزق یا معیشت ہی کے ہوتے ہیں -

خ ب ط

خَبَطَ - کسی چیز کو زور سے مارنا - پاؤں کو زور سے مار کر کسی چیز کو روندنا - درخت کو لکڑی سے مار کر اسکے پتے جھاڑنا - خَبَطَ اللَّیْلَ - رات

---

* تاج - ** محیط نیز ابن فارس -

کو سمت معلوم کئے بغیر یوں ہی منہ اٹھا کر چلدینا۔ تَخَبَّطَہُ الشَّیْطٰنُ۔ اسے شیطان نے پاگل بنا دیا *۔ راغب نے لکھا ہے کہ بادشاہ کے تشدد اور ظلم کو بھی خَبْطٌ کہتے ھیں۔ اور اِخْتِبَاطُ الْمَعْرُوف کے معنے ھیں کسی سے زبردستی احسان کا مطالبہ کرنا **۔

سورۃ بقرہ میں سود خوار لوگوں کی حالت کا نقشہ یہ کہکر کھینچا گیا ہے کہ لَا یَقُوْمُوْنَ اِلَّا کَمَا یَقُوْمُ الَّذِیْ یَتَخَبَّطُہُ الشَّیْطٰنُ مِنَ الْمَسِّ (۲/۲۷۵)۔ '' یہ لوگ یوں کھڑے ہوتے ھیں جیسے انھیں سانپ نے ڈس لیا ھو ''۔ اسمیں ذھنی جنون اور قلبی اضطراب کی شدت سب کی سب آجاتی ہے جو اس شخص کو چین سے نہیں بیٹھنے دیتی جسکے دل میں ھوس زر نے آگ لگا رکھی ھو۔ اگر اس آیت میں اَلشَّیْطٰنُ سے مراد انسان کے سرکش جذبات لئے جائیں تو اس سے مفہوم ھوگا وہ شخص جو اپنے جذبات کے ھاتھوں پاگل ھو رھا ھو۔لیکن اس میں کمزور پہلو یہ ھوگا کہ اس شخص کی محسوس حرکات کی تشبیہ غیر محسوس شے سے ھوگی۔

خ ب ل

اَلْخَبْلُ۔ اَلْخَبَلُ۔ اس کے بنیادی معنے کسی خرابی کے پیدا ھو جانے کے ھیں۔ مثلاً انسان کے اعضاء میں کوئی خرابی پیدا ھو جانا۔ فالج گر جانا۔ جنون ھو جانا۔ زجاج نے کہا ہے کہ اسکے بنیادی معنے کسی چیز کا جاتے رھنا ھیں۔ اسکے بعد اسکے عام معنے ھلاکت یا نقصان کے آتے ھیں۔* رَجُلٌ مُخَبَّلٌ۔ اس شخص کو کہتے جس کے ھاتھ پیر (اعضاء) کٹ گئے ھوں***
قرآن کریم میں ہے لَا یَاْلُوْنَکُمْ خَبَالًا (۳/۱۱۷) ۔'' تمہارے دشمن، تمہاری تخریب، میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھینگے''۔ اس میں ھر قسم کے نقصانات، شر، فساد آجاتے ھیں۔

خ ب و

خَبَتِ النَّارُ وَ الْحَرْبُ۔ آگ اور جنگ کی تیزی و تندی ساند پڑ گئی۔ پر سکون ھو گئی۔ اس کا شعلہ افسردہ ھوگیا*۔ سورۃ بنی اسرائیل میں ہے کُلَّمَا خَبَتْ . . . . (۱۷/۹۷) ''جب وہ آگ بجھنے لگے گی'' . . . . اس کے بعد زِدْنٰھُمْ سَعِیْرًا (ھم ان کے لئے اسے اور زیادہ بھڑکا دینگے) نے مفہوم واضح کر دیا ہے۔

---

* تاج۔ ** راغب۔ *** محیط۔

خِـبَاءٌ - در اصل اس پردہ کو کہتے ہیں جس سے کسی چیز کو ڈھانپا جائے۔نیز بالی میں دانہ کے اوپر کا خول** - خاکستر کا پردہ جو شعلہ پر پڑ کر اسے دبا دیتا ہے -

(خَبءٌ (۲۷/۲۵) کے لئے دیکھئے عنوان خ - ب - أ - ابن فارس نے کہا ہے کہ خَبْوٌ اور خَبءٌ - دونوں کے معنی چھپانے کے آتے ہیں) -

خ ت ر

اَلْخَتْرُ - بدترین عہد شکنی - عہد شکنی کرنا اور فریب دینا* - در اصل یہ اس عہد شکنی اور غداری کو کہتے ہیں جسے اس قدر کوشش سے کیا جائے کہ انسان تھک کر چور چور ہو جائے - وہ تکان سے کمزور ہو جائے اس کے اعضاء ڈھیلے پڑ جائیں** - اس لئے کہ اَلْخَتَرُ ، اَلْخَدَرُ کے ہم معنی ہے - یعنی ایسی غنودگی و بے حسی جو کسی زہر یا دوا کے پینے سے پیدا ہو جائے اور اعضاء میں کمزوری و اضمحلال کا باعث بنے - رَجُلٌ مُخْتَتِرٌ - وہ آدمی جس کے اعضاء ڈھیلے پڑ جائیں - خَتَّرَهُ الشَّرَابُ - شراب نے اس کے قویٰ کو مضمحل کر دیا* - ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی سستی اور فتور کے ہوتے ہیں -

قرآن کریم میں خَتَّارٍ كَفُوْرٍ (۳۱/۳۲) آیا ہے - اس کے معنی دغاباز، فریب کار کے بھی ہو سکتے ہیں اور ایسے آدمی کے بھی جو محنت نہ کرنے کی وجہ سے سست ہو چکا ہو - یا وہ آدمی جو احکام خداوندی کی بجا آوری میں سستی برتے - (یعنی آثِیْمٌ - دیکھئے عنوان ا - ث - م)۔

خ ت م

خَتْمٌ کے معنے ہیں کسی چیز کو چھپا دینا اور ڈھانک دینا - اس طرح بند کر کے محفوظ کر دینا کہ اس کا کوئی حصہ باہر نہ نکل سکے - چنانچہ زمین میں ہل چلا کر اور بیج ڈال کر جو پہلی مرتبہ پانی دیتے ہیں اسے اہل عرب خَتَمَ الزَّرْعَ کہتے ہیں - اس لئے کہ پانی دینے کے بعد مٹی جم جاتی ہے اور بیج مٹی کے اندر بند ہو کر محفوظ ہوجاتا ہے - اسی طرح شہد کی مکھیاں اپنے چھتہ کے خانوں میں شہد جمع کرکے موم کا نہایت باریک سا پردہ خانوں کے منہ پر بنا دیتی ہیں جس سے شہد اندر بند اور محفوظ ہو جاتا ہے - اسے بھی عرب خَتْمٌ سے تعبیر کرتے ہیں (اس کے بعد خود شہد ، اور ان خانوں کے منہ کو بھی خَتْمٌ کہنے لگ گئے)*** -

* تاج و محیط - ** راغب - *** تاج -

خَتَمَ الشَّيْئَ خَتْمًا ۔ کے معنے کسی چیز کے آخری سرے تک پہنچ جانے کے بھی ہیں*۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ یہ اس کے بنیادی معنی ہیں ۔ خَتْمٌ اور طَبْعٌ کا لفظ دو طرح سے استعمال ہوتا ہے (۱) کسی چیز پر لاکھ وغیرہ لگا کر مہر سے اس پر نشان لگا دینا ۔ اور (۲) وہ نقش یا نشان جو اس طرح مہر لگانے سے بن جائے ۔ پھر قدرے مفہوم میں وسعت پیدا کر کے کسی چیز کو بند کرنے اور روک دینے کے لئے بولا جانے لگا ۔ اس لئے کہ مہر لگا کر خط یا دروازہ بند کر دیا جاتا ہے اور اس کے اندر کی چیز باہر نہیں نکالی جاتی**۔ خِتَامٌ اس لاکھ یا موم وغیرہ کو کہتے ہیں جس سے کسی چیز کو بند کر کے اس پر مہر لگائی جاتی ہے ۔ اور خَاتَمٌ وہ چیز ہے (انگوٹھی وغیرہ) جس سے اس لاکھ پر مہر لگائی جاتی ہے ۔ ہر چیز کا انجام اور آخر خَاتَمٌ کہلاتا ہے ۔ چنانچہ خَاتَمُ الْقَوْمِ کے معنے ہیں قوم کا آخری فرد ۔ ایسے ہی ہر پینے کی چیز کا خِتَامٌ اس کا آخری حصہ ہوتا ہے۔ (ابن فارس)۔ فراء کا قول ہے کہ خَاتَمٌ اور خِتَامٌ دونوں قریب المعنی ہیں ۔ فُلَانٌ خَتَمَ عَلَيْكَ بَابَهٗ کے معنے ہیں ''وہ شخص تجھ سے اعراض برتتا ہے اور اپنا دروازہ تجھ پر بند کر لیتا ہے*۔

قرآن کریم میں خَتَمَ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ (یا طَبَعَ اللّٰهُ ۔ ۔ ۔ ۔) متعدد بار آیا ہے (۲/۷)۔ دلوں پر مہر لگ جانے سے مطلب یہ ہے کہ ان میں سمجھنے اور سوچنے کی صلاحیت باقی نہیں رہتی ۔ چنانچہ سورۃ انعام میں اَخَذَ اللّٰهُ سَمْعَكُمْ وَاَبْصَارَكُمْ نے خَتَمَ عَلٰى قُلُوْبِكُمْ (۶/۴۶) کی وضاحت کر دی ہے ۔ یعنی علم حاصل کرنے کے دروازے ہی اس پر مسدود ہو جاتے ہیں ۔ یہ حالت ان لوگوں کی ہو جاتی ہے جو اپنے دل کی مرضی سے (برضاورغبت) غلط روش اختیار کر لیتے ہیں ، کیونکہ وہ مستقبل کی خوشگواریوں پر مفاد عاجلہ کو ترجیح دیتے ہیں (۱۶/۱۰۸-۱۰۶)۔ اسی طرح وہ لوگ ہیں جو صحیح بات کے سننے سے انکار کر دیتے ہیں اور جب ان کے سامنے اسکا ذکر آئے تو منہ پھیر کر چل دیتے ہیں (۴۵/۲۳-۲۶)۔ جن کی حالت یہ ہوتی ہے کہ تمہاری مجلس میں بیٹھتے ہیں ۔ بظاہر ایسا دکھائی دیتا ہے کہ تمہاری باتیں نہایت غور سے سن رہے ہیں لیکن وہ اس وقت سوچ کچھ اور ہی رہے ہوتے ہیں ۔ یہ صرف اپنے جذبات کے پیچھے چلنا چاہتے ہیں ۔ (۴۷/۱۶-۱۷) ۔ اور قرآن کریم میں غور و فکر نہیں کرتے (۴۷/۲۴)۔ ان لوگوں کے اپنے اعمال خود زنگ بن کر ان کے دلوں

* تاج ۔ ** راغب و تاج ۔ نیز ابن قتیبہ (القرطین ج/۱ صفحہ ۱۳)

پر مہر لگا دیتے ہیں (۸۳/۱۴) * ۔ ان مقامات سے خَتَمَ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوبِهِمْ کا مفہوم واضح ہو جاتا ہے ۔ یعنی اللہ مہر نہیں لگاتا ۔ ان کے اپنے اعمال قوانین خداوندی کے مطابق مہر بن جاتے ہیں ۔

سورۃ تطفیف میں '' جنت میں پینے کی شے ،، کو رَحِيْقٍ مَّخْتُوْمٍ (۸۳/۲۵) کہا گیا ہے ۔ اور اس کے ساتھ ہی یہ بھی کہ خِتَامُهٗ مِسْكٌ (۸۳/۲۶) اس کی مہر (یا وہ ذائقہ جو منہ میں باقی رہ جائے) مشک کا ہوگا ۔ اس لئے کہ مِزَاجُهٗ مِنْ تَسْنِيْمٍ (۸۳/۲۷) ۔ اس میں وہ پانی ملا ہوگا جو بڑی بلندیوں سے آرہا ہے ۔ جس سے زندگی کو بلند ترین منازل تک پہنچنے کی قوت حاصل ہو جائیگی ۔

سورۃ احزاب میں نبی اکرمؐ کو خَاتَمَ النَّبِيّٖنَ (۳۳/۴۰) کہا گیا ہے ۔ خَاتَمٌ کے معنے اوپر لکھے جا چکے ہیں ۔ ان کی رو سے اس کے معنے آخری نبی ہیں ۔ لہذا رسول اللہؐ کے بعد نبوت کو جاری سمجھنا قرآن کریم کی صریح تعلیم کے خلاف ہے ۔ جب قرآن کریم آخری کتاب ہے تو جس نبی پر قرآن کریم نازل ہؤا وہ آخری نبی ہے (نَبِيٌّ کے معنے ۔ن ۔ب ۔ أ کے عنوان میں دیکھئے جہاں اس امر کی بھی تصریح کی گئی ہے کہ کوئی نبی بغیر کتاب کے آ نہیں سکتا) ۔ لہذا نہ قرآن کریم کے بعد کوئی اور آسمانی کتاب اور نہ ہی نبی اکرمؐ کے بعد کوئی اور نبی ۔ یہ تصور کہ نبی اکرمؐ کی مہر سے دوسرے لوگ نبی بن سکتے ہیں ، نبوت کی حقیقت سے بے خبری کی دلیل ہے ۔ نبوت خدا کی طرف سے ایک وہبی خصوصیت تھی جو بلا کسب و ہنر عطا ہوتی تھی ۔ اسے نہ کوئی اپنی محنت سے حاصل کر سکتا تھا اور نہ ہی کوئی نبی ، اسے دوسرے کو عطا کر سکتا تھا (تفصیل ن ۔ب ۔أ میں ملیگی) لہذا نبی اکرمؐ کے بعد نبوت کا دعوی یکسر باطل ہے ۔

لیکن '' دعوائے نبوت ،، کی ایک اور شکل بھی ہے جو بڑی دقیق فلہٰذا بڑی غور طلب ہے ۔ '' نبوت ،، سے مفہوم یہ ہے کہ انسان اللہ تعالیٰ سے براہ راست علم حاصل کرے ۔ یعنی اس علم میں اس کی اپنی عقل و خرد کا کوئی دخل نہ ہو ۔ وہ علم اسے خدا سے براہ راست ملے ۔ ہمارے ہاں (تصوف میں) یہ عقیدہ چلا آ رہا ہے کہ '' اولیاء اللہ ،، یا صوفیائے کرام ، خدا سے براہ راست حقائق کا علم حاصل کرتے ہیں ۔ اسے کشف یا الہام کہا جاتا ہے ۔ بادنٰی تعمق یہ حقیقت سامنے آ جائیگی کہ یہ صرف الفاظ کا فرق ہے ۔ ورنہ کشف و الہام اور وحی میں ، حقیقت کے اعتبار سے ، کوئی فرق نہیں ۔ اس لئے یہ عقیدہ بجائے خویش باب نبوت کو کھول دیتا ہے ۔ قرآن کریم کی رو سے

*(دیکھئے قلب ۔ سمع ۔ بصر ۔)

صحیح بات یہی ہے کہ اللہ تعالیٰ کو جو علم براہ راست دینا تھا وہ آخری نبیؐ کو دیدیا ۔ یہ علم اب قرآن کریم کے اندر محفوظ ہے ۔ اب کسی انسان کو خدا کی طرف سے براہ راست علم حاصل نہیں ہو سکتا ۔ کشف و الہام، انسان کی اپنی نفسیاتی کیفیت کے مظاہر ہوتے ہیں ، خدا کی طرف سے کشف حقائق نہیں ہوتا ۔

خ د د

اَلْخَدُّ ۔ رخسار ۔ (۳۱/۱۸) اَلْخَدُّ ۔ زمین میں کھودا ہوا مستطیل گڑھا ۔ اَلْاُخْدُوْدُ ۔ کھائی یا خندق * ۔

قرآن کریم میں ہے قُتِلَ اَصْحٰبُ الْاُخْدُوْدِ (۸۵/۴) ۔ صاحب محیط نے لکھا ہے کہ ذونواس، شاہِ یمن نے اہل نجران (عیسائیوں) کو مجبور کیا تھا کہ وہ عیسائیت چھوڑ دیں ۔ وہ جب اس پر آمادہ نہ ہوئے تو اسنے خندق کھدوا کر اس میں آگ جلائی اور انہیں اس میں ڈلوا کر جلا دیا ** ۔ صاحب تاج العروس نے لکھا ہے کہ بخت نصر نے خدا پرست یہودیوں کو اسی طرح آگ میں جلایا تھا * لیکن قرآن کریم کے سیاق و سباق سے مترشح ہوتا ہے کہ اس سے مراد وہ تمام مخالفین اسلام ہیں جو رسول اللہؐ سے برسرپیکار تھے اور جنگ کی آگ بھڑکاتے رہتے تھے ۔ قرآن کریم نے انہی کی تباہی کی خبر دی ہے ۔ (نیز دیکھئے عنوان اصحابُ الاُخْدُوْد اور تُبَّع) ۔

خ د ع

خَدْعٌ کے معنے ہیں جو کچھ دل میں ہو اسکے خلاف ظاہر کرنا ۔ کسی کے ساتھ چھپ کر برائی کرنا * ۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی چھپانے اور مخفی رکھنے کے ہیں ۔ اصل میں خَدُوْعٌ اس اونٹنی کو کہتے ہیں جو کبھی تو بہت سا دودھ دیدے اور کبھی بالکل چڑھا جائے ۔ (کچھ نہ دے ***) ۔ عربوں کی شہرت اور شرافت کا مدار انکی مہمان نوازی پر تھا ۔ وہ صحراؤں میں رہتے تھے ۔ ان کے جانوروں کا دودھ (یا گوشت) ہی ہر وقت میسر آنے والی چیز ہو سکتا تھا ۔ اب ذرا سوچئے کہ اگر ایسا ہو کہ مہمان آجائیں ۔ وہ ان کے لئے اونٹنی کا دودھ دوہنے کیلئے جائیں اور اونٹنی دودھ چڑھا جائے ۔ تو اس وقت میزبان کی حالت کیا ہوگی ؟ اس قسم کی اونٹنی جسپر

* تاج **محیط ۔ ***لین ۔

بھروسہ ہی نہ کیا جا سکے خَدُوْعٌ کہلاتی ہے۔ اس سے خَدَعَ کا مفہوم اچھی طرح ذہن میں آسکتا ہے۔ چنانچہ خَیْدَعٌ سراب کو کہتے ہیں*۔ نیز غول بیابانی کو۔ اور اس راستے کو بھی جو بظاہر معلوم ہو کہ منزل کی طرف لئے جا رہا ہے لیکن درحقیقت اس کے خلاف ہو*۔ نیز کسی بڑے کمرہ کے بغل میں ایک چھوٹی سی کوٹھڑی بنا لیتے تھے جس میں گھر کی قیمتی چیزیں بغرض حفاظت رکھتے تھے۔ اسے بھی خَادِعَةٌ کہتے تھے*۔ لطائف اللغۃ میں ہے کہ اَلْخَادِعُ اور اَلْخَدُوْعُ اُس راستے کو کہتے ہیں جو کبھی نکھر کر سامنے آجائے اور کبھی گم ہو جائے۔ لہذا خَدُعٌ زندگی کی وہ روش ہے جس میں بظاہر تو کچھ بتایا جائے اور بباطن کچھ اور۔ یا جس میں توقع کے مطابق امکان تو زیادہ کا ہو اور نکلے کم۔ یا جو ایک حالت پر نہ رہے۔ یعنی کبھی کچھ اور کبھی کچھ۔ چنانچہ خَدَعَ الْکَرِیْمُ اسوقت کہتے ہیں جب کوئی سخی آدمی خلاف توقع بخل کا برتاؤ کرنے لگ جائے۔ خَدَعَ الْمَطَرُ اسوقت کہتے ہیں جب بارش خلاف توقع بہت کم ہو۔ سُوْقٌ خَادِعَةٌ اس بازار کو کہتے ہیں جو ایک حالت پر قائم نہ رہے۔ اور خَدَعَتِ الْاُمُوْرُ اسوقت کہتے ہیں جب حالات دگرگوں ہوتے چلے جائیں۔ کبھی کچھ کبھی کچھ*۔ خَدَعَ کے معنی کم ہو جانے کے بھی آتے ہیں*۔ اَلسِّنُوْنُ الْخَوَادِعُ ان سالوں کو کہتے ہیں جن میں کبھی فراوانی ہو اور کبھی قحط۔ یا جن میں بارش تو بہت ہو لیکن پیداوار کم ہو*۔ دِیْنَارٌ خَادِعٌ اُس دینار کو کہتے ہیں جو دیکھنے میں کھرا معلوم ہو لیکن پرکھنے پر کھوٹا ثابت ہو۔ (ابن فارس)۔ لہذا خَادِعٌ سے مراد یا تو وہ جذباتی شخص ہے جو معاملات کا فیصلہ سوچ سمجھ کر نہیں محض جذبات کی رو سے کرتا ہے۔ ذرا جذبات ابھر آئے تو بڑے بڑے وعدے اور دعوے کر دئے۔ ذرا ان میں کمی اور افسردگی آگئی تو سمٹ اور سکڑ کر بیٹھ گئے۔ یا ایسا مفاد پرست جو اپنی مصلحت کی خاطر، اپنے آپ کو ایسا بنا کر دکھائے جیسا (یا جتنا) وہ درحقیت نہیں اور اسطرح معاشرہ کو دھوکے میں رکھے۔ معاشرہ کے استحکام کیلئے ایسے لوگوں پر کبھی اعتماد نہیں کیا جا سکتا۔ ان کا وجود معاشرہ کے لئے سخت نقصان کا باعث ہوتا ہے۔ صاحب محیط کے الفاظ میں خَدَعَ کے بنیادی معنے اس اخفاء اور پوشیدگی کے ہیں جسکا قبل ازوقت اندازہ نہ لگایا جا سکے***۔ یہ مفاد پرستانہ ذہنیت کا شیوہ ہوتا ہے، یا سطحی جذبات پرستوں کا۔

---

*تاج ** لین۔ *** محیط۔

قرآن کریم نے اس قسم کی فریب دینے والی ذهنیت کو ''دل کا مرض'' (فِیْ قُلُوْبِہِمْ مَّرَضٌ (۲/۱۰)) قرار دیا ہے اور کہا ہے کہ ان کا یہ فریب درحقیقت غیر شعوری طور پر خود ان کی اپنی ذات سے فریب ہوتا ہے۔ (وَمَا یَخْدَعُوْنَ اِلَّآ اَنْفُسَہُمْ وَمَا یَشْعُرُوْنَ (۲/۹))۔ چونکہ خدا کے قانون مکافات کی رو سے ان کی اس روش کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ خود اپنے متعلق دھوکے میں رہتے ہیں اسلئے سورہ نساءؔ میں اسے ان الفاظ سے تعبیر کیا گیا ہے اِنَّ الْمُنٰفِقِیْنَ یُخٰدِعُوْنَ اللّٰہَ وَھُوَ خَادِعُھُمْ (۴/۱۴۲)۔ ''منافق اللہ کو دھوکا دینا چاہتے ہیں لیکن (اس کے قانون مکافات سے ہوتا یہ ہے کہ) وہ اپنے متعلق دھوکے میں رہتے ہیں''۔ یعنی وَمَا یَخْدَعُوْنَ اِلَّآ اَنْفُسَھُمْ (۲/۹)۔ ''خدا فریبی'' ''خود فریبی'' (Self Deception) کا دوسرا نام ہے، لیکن لوگ اسے سمجھتے نہیں۔ مَا یَشْعُرُوْنَ (۲/۹)۔ اس کا شعور نہیں رکھتے۔ ویسے بھی جو شخص جذبات میں اندھا ہو جائے اس کا شعور بیکار ہو جاتا ہے۔

خ د ن

اَلْخِدْنُ۔ ساتھی۔ بات چیت کرنے والا۔ دوست*۔ راغب نے لکھا ہے کہ بیشتر یہ ایسے ساتھی کے لئے بولا جاتا ہے جو شہوت نفسانیہ کی وجہ سے کسی کے ساتھ رہے۔* جن الفاظ میں خاء اور دال اکٹھے آئیں ان میں اثر اندازی کا مفہوم مضمر ہوتا ہے۔** ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی ساتھ رہنے کے ہیں۔

قرآن کریم نے مرد اور عورت کے جنسی اختلاط کیلئے کہا ہے۔ مُحْصَنٰتٍ غَیْرَ مُسٰفِحٰتٍ وَّلَا مُتَّخِذٰتِ اَخْدَانٍ (۴/۲۵)۔ مُحْصَنٰتٍ اور مُسَافِحَاتٍ کے معانی ح۔ص۔ن اور س۔ف۔ح کے عنوانوں کے تحت لکھے گئے ہیں۔ بالخصوص ح۔ص۔ن کے ماتحت۔ وہاں سے معلوم ہو جائیگا کہ سَفْحٌ کے معنے ہیں محض شہوت رانی کی غرض سے جنسی اختلاط۔ یہاں اسکے ساتھ اِتِّخَاذِ اَخْدَان کا اضافہ کیا گیا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ مُسَافَحَۃٌ ''کھلی ہوئی بد کاری تھی''، جسکے لئے عرب جاھلیۃ عورتوں کو پیغام بھیجا کرتے تھے۔ یعنے وہ ان کے معاشرہ کا عام رواج تھا۔ اور خِدْنٌ۔ چوری چھپے کی آشنائی کو کہتے تھے۔ منتہا دونوں کا ایک ہی ہے۔ انہیں الگ الگ بیان کرنے سے مطلب یہ ہے کہ جاھلیت کے

---

* تاج۔ ** العلم الخفاق۔

زمانے میں (نکاح کے علاوہ) جنسی اختلاط کی جتنی صورتیں بھی مروج تھیں ان سب کی تردید ہو جائے، اور اس کی ایک ھی شکل باقی رہ جائے۔ یعنے مُحْصِنِیْنَ۔ قلعہ بند اور حصار عفت میں محفوظ۔ نیز مُسَافِحِیْنَ سے مطلب ھے محض شہوت رانی کی خاطر۔ اس میں زنا کاری بھی آجاتی ھے اور وقتی طور پر یا ویسے ھی نکاح کی رسم پوری کر لینے کے بعد، نکاح کی ذمہ داریوں کو (Avoid) کرتے ہوئے جنسی تعلقات بھی۔ اور مُتَّخِذَاتِ اَخْدَانٍ کے معنی صرف زناکاری ہونگے۔ اگرچہ قرآنِ کریم نے یہ الفاظ لونڈیوں کے ضمن میں کہے ھیں (جو اُس زمانے میں عربوں کے ھاں ھوتی تھیں۔ دیکھئے عنوان م۔ ل۔ ک میں مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ) لیکن اس کا اطلاق عام ھے کیونکہ قرآن کریم کی رو سے زنا کی بہرحال ممانعت ھے خواہ اس کی کوئی شکل ہو۔

بالفاظ دیگر، سَفْحٌ، جنسی جذبات کی تسکین کی (قرآنی نکاح کے علاوہ) ایسی شکل ہوگی جو کسی معاشرہ میں معیوب نہ سمجھی جائے اور خِدْنٌ وہ شکل جسے وہ معاشرہ معیوب سمجھے۔ قرآن کریم کی رو سے جنسی جذبات کی تسکین کی ھر وہ شکل ناجائز ہوگی جو قرآن کریم کی رو سے نکاح اور اس کے مقصد کے خلاف ہو، خواہ کوئی معاشرہ اسے معیوب سمجھے یا نہ سمجھے۔ جنسی اختلاط سے مقصد جائز طریق سے افزائش نسل ھے۔

خ ذ ل

خَذَلَتِ الظَّبْيَةُ۔ ھرنی اپنے گلہ سے پیچھے تنہا رہ گئی ایسی ھرنی کو خَاذِلٌ اور خَذُوْلٌ کہتے ھیں۔ زیادہ تر ایسی ھرنی (یا گائے) اپنے بچے کی وجہ سے پیچھے رہ جاتی ھے*۔ تَخَاذَلَتْ رِجْلَاهُ۔ اس کے پاؤں نے اس کا ساتھ چھوڑ دیا اور وہ اس طرح پیچھے رہ گیا۔ ایسے شخص کو رَجُلٌ خَذُوْلُ الرِّجْلِ کہتے ھیں*۔ اَلْخِذْلَانُ۔ ایسے شخص کا وقت پر ساتھ چھوڑ کر الگ ہو جانا جسکے متعلق گمان ہو کہ وہ پوری پوری مدد کرے گا**۔ ابن فارس نے کہا ھے کہ اس کے بنیادی معنی ساتھ چھوڑ دینے اور مدد نہ کرنے کے ھیں۔

سورۃ آل عمران میں ھے اِنْ يَخْذُلْكُمْ فَمَنْ ذَا الَّذِي يَنْصُرُكُمْ مِنْ بَعْدِهٖ ($\frac{۳}{۱۵۹}$) "اگر وہ تمہیں بےمدد چھوڑ دے تو اس کے بعد کون ھے جو تمہاری مدد کرے گا"۔ جس قوم کا ساتھ خدا کا قانون چھوڑ دے (بمقابلہ

* تاج۔ **راغب۔

یَنْصُرُ (۳/۱۵۹) اور وہ اس طرح باقی قوموں سے پیچھے رہ جائے تو اس کی مدد کوئی نہیں کرسکتا ۔ اس طرح پیچھے رہ جانے والا ، خواہ ایک فرد اپنی جماعت سے پیچھے رہ جائے اور خواہ ایک قوم دوسری قوم سے پیچھے رہ جائے ، زندگی کی خوشگواریوں سے محروم رہ جاتا ہے (۱۷/۲۲) ۔ اسلام کے معنے ہیں تمام رفقائے سفر کا کامل ہم آہنگی سے ملکرساتھ ساتھ چلنا ۔ (دیکھئے عنوان س ۔ ل ۔ م میں تَسَالَمَ) ۔ اور آثِمَ کے معنے ہیں اپنی ذاتی کمزوری کی وجہ سے پیچھے رہ جانا (دیکھئے عنوان ا ۔ ث ۔ م) ۔ لیکن اگر کوئی شخص مختلف قسم کی کششوں سے ، جن میں اولاد کے مفاد کی کشش سب سے زیادہ ہوتی ہے***، جماعت سے پیچھےرہ جائے تو یہ خَذْلٌ ہوگا ۔ بہر حال اس کا نتیجہ وہی ہوگا۔ یعنی اپنے انفرادی مفاد اور ذاتی جذبات کی وجہ سے جماعتِ مومنین سے پیچھے رہ جانا ۔ یا قرآن کریم کے نظام کو چھوڑ دینے سے اقوامِ عالم کی صف میں پیچھے رہ جانا ۔ یہ دونوں خَذْلٌ ہونگے۔

سورۃ الفرقان میں ہے وَكَانَ الشَّيْطٰنُ لِلْاِنْسَانِ خَذُوْلًا (۲۵/۲۹) ۔ یعنی انسان کے سرکش جذبات کی کیفیت یہ ہوتی ہے کہ بظاہر نظر آتا ہے کہ وہ انسان کا آخری وقت تک ساتھ دینگے لیکن وہ عین وقت پر ساتھ چھوڑ دیتے ہیں ۔ یعنی ایسے جذبات ہمیشہ ہنگامی ہوتے ہیں۔

خ ر ب

اَلْخَرَابُ ۔ ویرانی ۔ آبادی یعنی عُمْرَانٌ کی ضد ہے ۔ غیر آباد ہونا ۔ خَرِبَ ۔ غیر آباد ہو جانا ۔ اَخْرَبَ ۔ غیر آباد کر دینا ۔ ویران کر دینا ۔ اَلْخَرِبَةُ ۔ ویرانہ ، غیر آباد جگہ ۔ اَلْخَرْبَةُ ۔ چھلنی ۔ عیب ۔ دینی خرابی ۔ شک و تہمت ۔ ابن فارس نے اس مادہ کے اصل معنی کنارہ ٹوٹ کر خراب ہو جانا اور سوراخ ہو جانا بتائے ہیں، جیسے چاقو وغیرہ کی دھار یا کسی چیز کا کنارہ خراب ہو جانے سے دندانے پڑ جاتے ہیں ۔ (ابن فارس) اَلْخُرْبَةُ ۔ سوراخ کو کہتے ہیں ۔ اَلْخُرَّابَةُ ۔ سوئی کے ناکے کو کہتے ہیں* ۔

قرآن کریم میں ہے يُخْرِبُوْنَ بُيُوْتَهُمْ بِاَيْدِيْهِمْ (۵۹/۲) ۔ "وہ اپنے ہاتھوں سے اپنے گھروں کو ویران کرتے ہیں" ۔ سورۃ بقرہ میں مساجد کے متعلق ہے کہ جو شخص ان میں ذکراللہ کے لئے رکاوٹ کا موجب

*** یہ اس جہت سے کہا گیا ہے کہ خاذل اس ہرنی کو کہتے ہیں جو اپنے بچے کی وجہ سے پیچھے رہ جائے ۔ * تاج ۔ نیز ابن فارس

بنتا ہے ، سَعٰی فِیْ خَرَابِھَا (۲/۱۱۴) "وہ ان کی ویرانی کی کوشش کرتا ہے"۔ لہٰذا مساجد کی ویرانی یہی نہیں کہ ان میں لوگوں کا اجتماع نہ ہو۔ ان کی ویرانی یہ ہے کہ ان میں قوانین خداوندی کا ذکر اذکار اور صفات الٰہیہ کے متعلق بات چیت نہ ہو۔ یہی وجہ ہے کہ اَقَامُوا الصَّلٰوۃَ وَ اَمْرُھُمْ شُوْرٰی بَیْنَھُمْ (۴۲/۳۸) اکٹھا آیا ہے۔ یعنی اقامتِ صلٰوۃ اور باھمی مشورہ ، لازم و ملزوم ہیں۔ دوسری جگہ ہے مشرکین مساجد کو آباد نہیں کر سکتے (۹/۱۷)۔ اس لئے کہ وہ خالص قوانین خداوندی کی اطاعت نہیں کرتے۔

خ ر ج

خُرُوْجٌ کے معنے ہیں ابھرنا ، نکلنا۔ باھر آنا۔ اَلْخَرْجُ۔ خرچ۔ (بمقابلہ آمدنی)۔ خَارِجُ کُلِّ شَیْئٍ۔ ھر چیز کے نکلے ہوئے بیرونی اور ظاھری حصہ کو کہتے ہیں۔ اَلْخَارِجِیُّ۔ اس گھوڑے کو کہتے ہیں جو اپنے ماں باپ سے عمدگی میں بازی لے جائے اور آگے نکل جائے۔ نیز ھر وہ چیز جو اپنی جنس کی چیزوں سے آگے نکل جائے*۔ خَرَجَ فُلَانٌ فِی الصِّنَاعَۃِ کے معنے ہیں فلاں شخص اپنی کاریگری میں بہت ماھر ہوگیا**۔ نَاقَۃٌ مُخْتَرِجَۃٌ۔ وہ اونٹنی جو اونٹنیوں کی صفات سے نکل کر اونٹ کی ھم صفت ہو*۔ یَوْمُ الْخُرُوْجِ۔ عید اور میلے کے دن کو کہتے ہیں جب لوگ زینت و زیبائش کے ساتھ باھر نکلیں*۔ خَرَجَتِ الرَّعِیَّۃُ عَلَی الْوَالِیْ۔ اس وقت کہتے ہیں جب رعیت اپنے امیر سے باغی ہو جائے اور اطاعت چھوڑ دے**۔

قرآن کریم نے یہ کہکر کہ بارش سے کسطرح زمینِ مردہ ازسرنو زندگی حاصل کر لیتی ہے، کہا کَذٰلِکَ الْخُرُوْجُ۔ (۵۰/۱۱)۔ اسی طرح "خروج" ہوگا۔ یہاں خُرُوْجٌ کے معنے حیاتِ نو کے ہیں۔ اسی کو ذرا آگے چل کر یَوْمُ الْخُرُوْجِ (۵۰/۴۲) کہا گیا ہے۔ قرآن کریم میں قیامت۔ ساعت۔ بعث۔ خروج وغیرہ الفاظ اپنا خاص مفہوم رکھتے ہیں۔ لیکن ان سب میں حیات نو کا پہلو مضمر ہوتا ہے۔ یہ حیات نو خواہ کسی قوم کے زوال کے بعد اس کا عروج ہو، یا پوری انسانیت کا اپنے پاؤں پر کھڑے ہو جانا، یا انسان کی موت کے بعد حیاتِ اُخروی۔ یہ تمام تصورات ان اصطلاحات میں شامل ہیں اور سیاق و سباق سے معلوم کیا جاسکتا ہے کہ فلاں مقام پر کونسا مفہوم مراد لیا جائیگا۔

خَرْجٌ اور خَرَاجٌ کا لفظ بھی قرآن کریم میں آیا ہے (مثلاً ۱۸/۹۴؛ ۲۳/۷۲)۔ اس کے معنے ہیں وہ رقم جو اپنی دولت میں سے نکال کر دوسرے کو

* تاج۔ ** محیط۔

دیدی جائے۔ (ہم نے خَرَاج کی فقہی اصطلاح سے بحث نہیں کی کیونکہ اس اصطلاحی مفہوم میں یہ لفظ قرآن کریم میں نہیں آیا)۔ اتنا سمجھ لینا کافی ہوگا کہ عربوں کے ہاں خَرَاج وہ معینہ مقدار ہوتی تھی جو آقا اپنے غلام پر روزانہ یا ماہوار مقرر کر دیتا تھا کہ وہ اس قدر اسے ادا کر دیا کرے۔ اس کے بعد خَرَاج کا لفظ اس ٹیکس کے لئے بولا جانے لگا جو زمین پر لگایا جاتا تھا (جو ٹیکس ذمیوں پر لگایا جاتا تھا۔ یعنے جِزْیَۃ اسے خَرْج کہتے تھے۔ اگرچہ بعض اوقات اسے خَرَاج بھی کہدیتے تھے)۔ اب ہر اس ٹیکس کو کہتے ہیں جو گورنمنٹ لوگوں کے اموال سے وصول کرے۔ دراصل شروع میں خَرَاج زمین کی پیداوار کے لئے استعمال ہوتا تھا لیکن اس کے بعد جائیدادوں سے جو کچھ حاصل ہوتا تھا اس کے لئے بھی یہی لفظ بولا جانے لگا*۔

خَارِجٌ ۔ وہ جو نکل پڑے۔ مَخْرَجٌ ۔ نکلنے کی جگہ۔ اَخْرَجَ ۔ نکالنا۔ پیدا کرنا۔ اِخْرَاجٌ ۔ نکال باہر کرنا۔ پیدا کرنا۔ مُخْرِجٌ ۔ وہ جو پیدا کرے۔ نکالے۔ مُخْرَجٌ ۔ وہ جو پیدا کیا گیا ہو۔ یا وہ جگہ یا وقت
١ جہاں سے یا جس میں کوئی چیز نکالی گئی ہو (١٢/٨٠)۔ اِسْتَخْرَجَ ۔ نکال لینا۔ سورۃ بقرہ میں اِخْرَاجٌ بمقابلہ کِتْمَانٌ آیا ہے (٢/٧٢)۔ یعنی ظاہر کرنا۔ اسی سورہ میں قصۂ آدم کے ضمن میں پہلے آیا ہے فَاَخْرَجَہُمَا ۔ اس نے ان دونوں کو وہاں سے نکال دیا۔ اور اس کے بعد ہے وَقُلْنَا اهْبِطُوْا ۔ (٢/٣٦)۔ اس سے ظاہر ہے کہ خُرُوْجٌ اور ہُبُوْطٌ الگ الگ ہیں۔ خُرُوْجٌ محض نکلنا ہے اور ہُبُوْطٌ میں گراوٹ بھی شامل ہے۔ یعنی اپنے مقام سے نیچے گر جانا۔ (تفصیل میری کتاب ''ابلیس و آدم'' میں ملیگی)۔

خ ر د ل

اَلْخَرْدَلُ ۔ رائی۔ خَرْدَلَ اللَّحْمَ ۔ اس نے گوشت کے بہت سے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے کر دیئے*۔ قرآن کریم میں ہے مِثْقَالَ حَبَّةٍ مِّنْ خَرْدَلٍ (٢١/٤٧)۔ ''رائی کے ایک دانے کے برابر''۔

خ ر ر

اَلْخَرِیْرُ ۔ پانی یا ہوا کے چلنے کی سرسراہٹ۔ اڑنے میں عقاب کے پروں کی آواز۔ سونے میں خراٹوں کی آواز۔ اَلْخَرُّ ۔ دراصل یہ بلندی سے اس طرح گرنے کو کہتے ہیں جس کے ساتھ ہی گرنے کی آواز بھی سنائی دے

---

* تاج ۔

پھر ھر گرنے کے لئے استعمال ھونے لگا * ۔ خَرَّمُوْسٰی صَعِقًا (۷/۱۴۳) ''موسٰی کڑک سے بیہوش ھوکر گر پڑے''۔ یا فَکَاَنَّمَا خَرَّ مِنَ السَّمَاءِ (۲۲/۳۱) ''گویا وہ آسمان (کی بلندیوں) سے گرا ھو''۔ (یہ مشرک کی حالت بیان کی گئی ھے)۔

سورۃ فرقان میں مومنین کی بہت سی صفات گنائی گئی ھیں ۔ ان میں ایک یہ بھی ھے کہ اِذَا ذُکِّرُوْا بِاٰیٰتِ رَبِّهِمْ لَمْ یَخِرُّوْا عَلَیْهَا صُمًّا وَّ عُمْیَانًا (۲۵/۷۳) ''جب ان کے سامنے آیات خداوندی پیش کی جاتی ھیں تو وہ ان پر بہرے اور اندھے بن کر گر نہیں پڑتے''، (بلکہ ان پر غور و فکر کرتے ھیں)۔ صاحب محیط نے لکھا ھے کہ خَرَّ عَلَی الشَّیْءِ کے معنے ھوتے ھیں کسی چیز پر قائم رھنا** ۔ اس سے ظاھر ھے کہ رسمی طور پر تو ایک طرف رھا، جذباتی طور پر، بلا غور و فکر تمسک با لقرآن بھی نتیجہ خیز نہیں ھو سکتا ۔ مومنین کی خصوصیت یہ ھے کہ ان کا عمل بالقرآن غور و فکر کا نتیجہ ھوتا ھے ۔ وہ علٰی وجہ البصیرت جانتے ھیں کہ تمسک بالکتاب سے مقصد کیا ھے ۔ ذرا سوچئے کہ جو خدا اپنی آیات کو بھی بہروں اور اندھوں کی طرح بلا سوچے سمجھے اور دیکھے بھالے ماننے اور ان پر قائم رھنے کی اجازت نہ دیتا ھو وہ غیر خداوندی باتوں کو بلا غور و فکر تسلیم کرلینے کی کب اجازت دے سکتا ھے؟ وہ مومن کی صفت ھی یہ بتاتا ھے کہ وہ بلا سوچے سمجھے کسی بات کے پیچھے نہیں لگ جاتا ۔ اُسے اس کا حکم ھے کہ لَا تَقْفُ مَا لَیْسَ لَکَ بِهٖ عِلْمٌ ۔ اِنَّ السَّمْعَ وَ الْبَصَرَ وَ الْفُؤَادَ کُلُّ اُولٰٓئِکَ کَانَ عَنْهُ مَسْئُوْلًا (۱۷/۳۶)۔ ''جس بات کا تمہیں علم نہ ھو اس کے پیچھے مت لگو۔ یقیناً سماعت ۔ بصارت اور قلب، ھر ایک سے اس کی ذمہ داری کی بابت پوچھا جائیگا ۔ علم کے لئے سمع، بصر (یعنی حواس) اور قلب (Mind) کی شہادت ضروری ھے ۔ اور مومن وہ ھے جو احکام الٰہیہ اور قوانین خداوندی کو علٰی وجہ البصیرت مانتا ھے ۔

خ ر ص

اَلْخَرْصُ ۔ اندازہ کرنا ۔ تخمینہ لگانا ۔ یعنے غیر یقینی چیزوں میں محض ظن و گمان سے کچھ کہنا ۔ خَرْصُ النَّخْلِ ۔ کھجور کے درخت پر اندازہ کرنا کہ اسمیں کسقدر پھل ھوگا ۔ کَمْ خَرْصُ اَرْضِکَ ۔ تمہاری زمین کی پیداوار اندازاً کتنی ھوگی؟ اس اعتبار سے ھر ظنی و تخمینی بات، بلکہ جھوٹی

* تاج ۔ ** محیط ۔

بات ، کو اَلْخَرْصُ کہتے ہیں * ۔ چنانچہ قرآن کریم میں ہے اِنْ یَتَّبِعُوْنَ اِلاَّ الظَّنَّ وَاِنْ هُمْ اِلاَّ یَخْرُصُوْنَ (۶/۱۱۷) ” یہ لوگ صرف ظن کا اتباع کرتے ہیں اور محض اٹکل پچو باتیں کرتے ہیں “ ۔ سورۃ ذاریٰت میں ہے قُتِلَ الْخَرّٰصُوْنَ (۵۱/۱۰) ” محض ظن و قیاس کی اتباع کرنے والے تباہ و برباد ہو جائینگے “ ۔ حقائق کی بنیاد یقین پر ہوتی ہے ۔ اسلئے دین کا سارا مدار یقین پر ہے ۔ کوئی ظنی اور قیاسی بات دین نہیں بن سکتی ۔ قرآن کریم کا ایک ایک لفظ اپنی اصلی شکل میں ہمارے پاس محفوظ ہے (خود قرآن کریم کی داخلی اور تاریخ کی خارجی شہادت اسپر دلالت کرتی ہے) اسلئے بہ یقینی طور پر دین ہے اور حق و باطل کے پرکھنے کا حقیقی معیار ۔ راغب نے کہا ہے کہ ظن و تخمین سے کوئی بات کہنا ، خواہ وہ حق کے مطابق ہی کیوں نہ ہو ، کذب (جھوٹ) ہے ۔ اس اعتبار سے خَرّاصٌ کے معنی کَذَّابٌ (جھوٹا) ہوتے ہیں ۔ ** خَرَصَ ۔ اس نے جھوٹ بولا *** ۔

قرآن کریم کا دعویٰ ہے کہ ظن و تخمین کا اتباع کرنے والے تباہ ہونگے ۔ لہٰذا دین میں ظنیات کا اتباع کرنے والے (قرآن کریم کے دعوے کی رو سے) کبھی کامیاب و کامران نہیں ہو سکتے ۔ خود ہماری اپنی حالت اسکی زندہ شہادت ہے ۔

خ ر ط م

اَلْخُرْطُوْمُ ۔ ناک * یا ناک کا اگلا حصہ ۔ ہاتھی کی سونڈ کو بھی کہتے ہیں *** ۔ ثعلب نے کہا ہے کہ عام طور پر درندوں کی تھوتھنی کو مَخْطَمٌ اور خُرْطُوْمٌ کہتے ہیں ۔ خَرَاطِیْمُ الْقَوْمِ ۔ قوم کے سردار جو ہر معاملہ میں پیش پیش رہتے ہیں * ۔ ہماری زبان میں بھی کہتے ہیں ” فلاں شخص قوم کی ناک ہے “ ۔ یہ باشرف ہونے سے کنایہ ہے ۔ یا کہتے ہیں ” ناک کٹ گئی “ ۔ یعنی وہ بے عزت ہو گیا ۔

قرآن کریم میں ہے سَنَسِمُهٗ عَلَی الْخُرْطُوْمِ (۶۸/۱۶) ” ہم اسکی ناک پر داغ لگائینگے “ ۔ مطلب ذلیل کرنے سے ہے کیونکہ چہرہ یا ناک کا داغی کر دینا انتہائی ذلت کی بات ہوتی تھی ** ۔ اس میں توہین وذلت کا ایسا پہلو ہے جو چھپائے نہ چھپے ۔

خ ر ق

اَلْخَرْقُ ۔ کسی چیز کو بلا سوچے سمجھے بے قاعدہ پھاڑ ڈالنا ۔ یہ اَلْخَلْقُ کی ضد ہے جسکے معنے کسی چیز کو اندازہ کے مطابق خوش اسلوبی

* تاج ۔ ** راغب ۔ *** محیط ۔

بنانے کے ھیں*۔ خَرَقَ الثَّوْبَ۔ اسنے بغیر اندازے کے کپڑے کو پھاڑ ڈالا**۔ سورۃ بنی اسرائیل میں ھے اِنَّکَ لَنْ تَخْرِقَ الْاَرْضَ (۱۷/۳۷)۔ اس کے معنے پھاڑ ڈالنے یا سوراخ کر دینے کے ھیں۔ بعض نے کہا ھے کہ اسکے معنے ایک سرے سے دوسرے سرے تک (مسافت) قطع کرنے کے ھیں**۔ سورۃ کہف میں کشتی میں سوراخ کر دینے کے لئے خَرَقَهَا (۱۸/۷۱) آیا ھے۔

خَرَقَ۔ اس نے جھوٹ بولا۔ خَرَقَ الْكَذِبَ۔ اس نے جھوٹ تراشا۔ اَلتَّخَرُّقُ۔ جھوٹ بنانا۔ اَلتَّخْرِيْقُ۔ کثرت سے جھوٹ بولنا**۔ سورۃ انعام میں ھے وَخَرَقُوْا لَهٗ بَنِيْنَ (۶/۱۰۱) وہ خدا کے لئے اولاد کا عقیدہ رکھتے ھیں جو یکسر جھوٹ ھے۔ ان کا یہ عقیدہ غورو فکر اور قاعدے اور قانون سب کے خلاف ھے۔ اس سے حقیقت کی دھجیاں اڑ جاتی ھیں۔

خ ز ن

اَلْخَزْنُ کے بنیادی معنے کسی چیز کے ذخیرہ کرنے کے ھیں***۔ اَلْخِزَانَةُ والْخَزِيْنَةُ والْمَخْزَنُ وہ جگہ جہاں کوئی چیز ذخیرہ کی جائے***۔ اَلْخَزِيْنَةُ۔ وہ چیز جس کو حفاظت سے چھپا کر، بچا کر رکھا گیا ھو۔ اسکی جمع خَزَائِنُ ھے۔ قرآن کریم میں ھے لَا اَقُوْلُ لَكُمْ عِنْدِيْ خَزَائِنُ اللّٰهِ (۶/۵۰)۔ ”میں تم سے یہ نہیں کہتا کہ میرے پاس اللہ کے خزانے ھیں“۔ خَازِنٌ۔ جمع کرنے والا۔ یا محافظ (اسکی جمع خَازِنُوْنَ اور خَزَنَةٌ ھے) قرآن کریم میں ھے وَقَالَ لَهُمْ خَزَنَتُهَا (۳۹/۷۳) ”جنت کے محافظ اُن سے کہینگے“۔ ابن فارس نے کہا ھے کہ اس لفظ (خَزْنٌ) کے بنیادی معنی بچا کر حفاظت سے رکھنے کے ھیں۔ خَزَائِنُ اللّٰهِ کائنات کی وہ قوتیں اور ذخائر ھیں جو ھنوز انسان کے علم میں نہ آئے ھوں۔

خ ز ی

خِزْیٌ کے معنے ایسی ذلت ھے جس سے شرم آجائے۔ اسی وجہ سے یہ لفظ ذلت اورشرم دونوں کے لئے استعمال ھوتا ھے۔ لہذا اسکے معنے ھونگے ذلت آمیز رسوائی۔ یا ان عیوب کو بطور سزا ظاھر کرنا جن کا اظہار باعث شرم ھو**۔

قرآن کریم میں ضابطہ خداوندی کے خلاف زندگی بسر کرنے کا نتیجہ خِزْیٌ فِی الْحَیٰوۃِ الدُّنْیَا (۲/۸۵) بنایا گیا ھے۔ یعنے اس دنیا کی زندگی میں ذلت آمیز رسوائیاں۔ سورۃ طٰہٰ میں نَذِلَّ وَنَخْزٰی (۲۰/۱۳۴) ساتھ ساتھ آئے ھیں

* راغب ** تاج۔ *** تاج و راغب۔

جہاں اسکے معنے شرم و ندامت ہے۔ یعنے خفیف اور شرمسار ہونا۔ سورۃ الحجر میں یہ لفظ تَفْضَحُوْنِ (۱۵/۶۹) کے ساتھ آیا ہے۔ فضیحت و رسوائی۔ مُخْزِی الْکٰفِرِیْنَ۔ کافروں کو ذلت آمیز رسوائیاں دینے والا (۹/۲)۔ دنیا میں عزت وشرف کی زندگی مومن کا شعار ہے۔ ذلت و رسوائی خدا کا عذاب ہے۔ لہذا جو قوم دنیا میں ذلیل و رسوا ہو وہ مومنین کی جماعت نہیں ہو سکتی۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس لفظ کے بنیادی معنی دور کرنے کے ہیں۔ یعنی ایسی قوم زندگی کی خوشگواریوں سے دور (محروم) کر دی جاتی ہے۔ اور یہ انتہائی ذلت ہے۔

اگر کسی قوم کے متعلق یہ دیکھنا ہو کہ وہ قوانین خداوندی کے مطابق زندگی بسر کر رہی ہے یا نہیں، تو یہ دیکھنا چاہئے کہ وہ دنیا میں سرفرازی و سربلندی، غلبہ و تسلط اور عزت و شرف کی حامل ہے یا اقوام عالم کے مقابلہ میں ذلیل و خوار ہے۔ اگر وہ ذلیل و خوار ہے تو وہ قوانین خداوندی کے مطابق نہیں چل رہی۔ اس ضمن میں اتنا سمجھ لینا ضروری ہے کہ

(۱) جو قوم ان قوانین کے مطابق تو زندگی بسر کرتی ہے جو خارجی کائنات میں کارفرما ہیں (یعنی تسخیر فطرت کرتی ہے) لیکن اپنی تمدنی زندگی کو اپنے بنائے ہوئے قوانین کے تابع رکھتی ہے، اسے مفاد عاجلہ حاصل ہو جاتے ہیں لیکن اس کا مستقبل تاریک ہوتا ہے۔ اقوام مغرب کا شمار انہیں میں ہے۔

(۲) جو قوم تسخیر فطرت بھی کرتی ہے اور اپنی تمدنی زندگی بھی قوانین خداوندی (قرآن کریم) کے مطابق بسر کرتی ہے اس کی دنیاوی زندگی بھی عزت وشرف کی زندگی ہوتی ہے اور آخرت بھی درخشندہ و تابناک۔ یہ جماعت مومنین کی خصوصیت ہے۔ لیکن

(۳) جو قوم نہ تسخیر فطرت کرتی ہے اور نہ اپنی تمدنی زندگی قرآن کریم کے مطابق رکھتی ہے، اسکی دنیا بھی خراب ہوتی ہے اور آخرت بھی تباہ۔ ہم اسی زمرہ میں آتے ہیں۔ خِزْیٌ فِی الْحَیٰوۃِ الدُّنْیَا وَیَوْمَ الْقِیٰمَۃِ یُرَدُّوْنَ اِلٰٓی اَشَدِّ الْعَذَابِ (۲/۸۵) "دنیاوی زندگی میں رسوائی اور قیامت کے دن سخت عذاب کی طرف لوٹنا"۔

خ س أ

اَلْخَسِیْئُ*۔ ردی اُون کو کہتے ہیں جسے بیکار ہونے کی وجہ سے پھینک دیا جاتا ہے۔ اس جہت سے اس مادہ میں حقارت و نفرت کے معنے پیدا ہو گئے

* تاج۔

ہوگئے۔ چنانچہ خَسَأَ الْكَلْبَ کے معنے ہیں اس نے کتے کو دھتکار دیا اور خَسَأَ الْكَلْبُ۔ کتا راندہ ہوا (یہ لازم و متعدی ہے)۔ اَلْخَاسِیءُ۔ ذلیل۔ کمینہ۔ دھتکارا ہوا*۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی دور کر دینے کے ہیں۔

قرآن کریم میں قِرَدَةً خَاسِئِیْنَ آیا ہے (۲/۶۵)۔ "ذلیل بندر"۔ اس کے مفہوم کے لئے دیکھئے عنوان (ق-ر-د) خَسَأَ الْبَصَرُ۔ نگاہ حیران ہوکر تھک گئی*۔ سورۃ الملک میں ہے يَنْقَلِبْ اِلَيْكَ الْبَصَرُ خَاسِئًا (۶۷/۴) "نگاہ درماندہ ہوکر کاشانہ چشم میں لوٹ آئیگی"۔ سورۃ المومنون میں اہل جہنم کے متعلق ہے اِخْسَئُوْا فِيْهَا (۲۳/۱۰۸) "اس میں ذلت و خواری کے ساتھ رہو"۔ زندگی کی خوشگواریوں سے محروم اور دور رہو۔

خ س ر

خَسِرَ فُلَانٌ کے معنے ہیں وہ شخص راستہ سے گم ہوگیا**۔ ہلاک ہوگیا***۔ اَلْخَسْرُ وَالْخُسْرَانُ کے معنے ہیں کمی کرنا۔ نقص۔ خَسَرَ الْوَزْنَ وَالْكَيْلَ وَاَخْسَرَ۔ اس نے ماپ تول میں کمی کی۔ بعض ائمہ لغت نے کہا ہے کہ اَلْخَاسِرُ اس شخص کو کہتے ہیں جو دیتے وقت ناپ تول میں کمی کرے، اور لیتے وقت زیادہ لے**۔ قرآن کریم میں ہے اَوْفُوا الْكَيْلَ وَلَا تَكُوْنُوْا مِنَ الْمُخْسِرِيْنَ (۲۶/۱۸۱) "ماپ کو پورا کیا کرو اور نقصان پہنچانے والوں میں سے نہ ہوجاؤ، یعنی کسی کےحق میں کمی نہ کرو۔ سورۃ تطفیف میں ہے۔ اِذَا اكْتَالُوْا عَلَى النَّاسِ يَسْتَوْفُوْنَ وَاِذَا كَالُوْهُمْ اَوْ وَّزَنُوْهُمْ يُخْسِرُوْنَ (۸۳/۲-۳)۔ "جب لوگوں سے لیتے ہیں تو ماپ تول پورا کرتے ہیں اور جب انہیں دیتے ہیں تو ماپ تول میں کمی کردیتے ہیں"۔ (یہ آیت معاشیات کا بہت بڑا اصول بیان کرتی ہے۔ تفصیل کے لئے دیکھئے عنوان، ب-ی-ع) سورۃ الرحمٰن میں ہے وَاَقِيْمُوا الْوَزْنَ بِالْقِسْطِ وَلَا تُخْسِرُوا الْمِيْزَانَ (۵۵/۹)۔ "وزن کو عدل کے ساتھ پورا رکھو اور تول میں کمی نہ کرو"۔ نیز معاشرہ کے توازن کو مت بگاڑو۔

صَفْقَةٌ خَاسِرَةٌ کے معنے ہیں غیر نفع بخش سودا جس میں نقصان ہو**۔ اَلْخَيْسَرَى کے معنے ہیں دھوکہ۔ فریب۔ عہد شکنی۔ کمینگی، خسارہ۔ خَسَّرَهُ تَخْسِيْرًا۔ اسکو ہلاک کردیا**۔

---

* تاج و محیط۔ ** تاج۔ *** محیط۔

اَلْخَاسِرُ ۔ راستے سے گم ہو جانے والا ۔ ہلاک ہو جانے والا ۔ جو شخص کامیاب نہ ہو سکے**۔ جو تجارت میں گھاٹے میں رہے ۔ راغب نے کہا ہے کہ خُسْرٌ میں مادی اشیاء میں کمی اور معنوی اشیاء کا نقصان دونوں شامل ہیں ۔ یعنی مال و دولت میں نقصان اور عقل و ایمان ، صحت و عزت میں کمی دونوں کے لئے خُسْرٌ بولا جاتا ہے***۔ ابن الاعرابی نے الخَاسِرُ کے معنی اس شخص کے کئے ہیں جو عقل و مال دونوں کھو چکا ہو* ۔

خُسْرٌ ۔ نقصان ۔ تباہی*۔ اِنَّ الْاِنْسَانَ لَفِیْ خُسْرٍ (۱۰۳/۲)۔ اگر انسان (کو بلا وحی کے تنہا چھوڑ دیا جائے تو) یہ نقصان ہی نقصان میں رہے گا ۔ ''اس نقصان میں ہر قسم کا زیاں شامل ہے ۔ خَسَارٌ ۔ ہلاکت ۔ نقصان ۔ نقصان اٹھانے والا ۔ اَخْسَرُ ۔ سب سے زیادہ نقصان اٹھانے والا ۔ تَخْسِیْرٌ ۔ نقصان دینا ۔ گھاٹے میں رکھنا ۔ خیر سے دور کر دینا ۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس مادہ کے بنیادی معنی نقصان اور کمی کے ہیں ۔

خ س ف

خَسَفَ الْمَکَانُ ۔ یَخْسِفُ ۔ خُسُوْفًا ۔ وہ جگہ زمین کے اندر دھنس گئی****۔ ابن فارس نے اس کے معنے اندر گہرائی میں جا کر چھپ جانا اور دھنس جانا بتائے ہیں ۔ قرآن کریم میں ہے فَخَسَفْنَا بِہٖ وَ بِدَارِہِ الْاَرْضَ (۲۸/۸۱) ہم نے قارون کو اور اس کے گھر کو زمین میں دھنسا دیا'' ۔ نیست و نابود کر دیا ۔ خَسْفٌ کے ایک بنیادی معنی جانور کو بلا چارہ اور گھاس کے باندھے رکھنا بھی ہیں ۔ اسی سے اس کے معنے کسی پر جور و ظلم اور زیادتی کرنا ہونگے، پھر یہ لفظ، ذلت ، توہین اور جبر کرنے کے لئے بھی استعمال ہونے لگا ۔ اَلْخَاسِفُ ۔ لاغر ۔ کمزور ۔ بَاتَ الْقَوْمُ عَلَی الْخَسْفِ ۔ لوگوں نے بھوکے رات گزار دی ۔ سَامَہٗ خَسْفًا اس نے اسے ذلیل و خوار کیا ۔ اَلْخَسِیْفُ ۔ اندر کو دھنسا ہوا ۔ اَخْسَفَتِ الْعَیْنُ ۔ آنکھ اندھی ہو گئی**** ۔

قرآن کریم میں یَخْسِفُ اللّٰہُ بِہِمُ الْاَرْضَ (۱۶/۴۵) تباہی اور بربادی کے معنوں میں آیا ہے (یعنی اللہ انہیں زمین میں دھنسا دیگا ۔ تباہ و برباد کر دیگا ۔ خُسُوْفٌ ۔ چاند گہن کو کہتے ہیں****۔ بِئْرٌ مَخْسُوْفَۃٌ ۔ وہ کنواں جس کا پانی غائب ہو گیا ہو*** ۔ قرآن کریم میں (نبی اکرم[ؐ] کے ہاتھوں آنے والے انقلاب کے سلسلہ میں ہے) خَسَفَ الْقَمَرُ (۷۵/۸) ۔

* تاج ۔ ** محیط ۔ *** راغب ۔ **** تاج و محیط ۔

جس کا مطلب یہ ہے کہ عرب جاہلیت (جن کا نشان قمر تھا) کا زور ٹوٹ جائیگا۔ وہ کمزور اور ماند پڑ جائینگے ۔ ان کی مخالفت اور سرکشی ختم ہوجائیگی ۔ یہ مجازی معنی ہیں ۔ لیکن اگر اس کے حقیقی معنی لئے جائیں تو ترجمہ ہوگا ''چاند کو گہن لگ گیا ۔ ماند پڑ گیا'' ۔

خ ش ب

خَشَبٌ ۔ موٹی لکڑی ۔ جمع خُشُبٌ * ۔ قرآن کریم نے منافقین کو خُشُبٌ مُّسَنَّدَۃٌ (۶۳/۴) سے تشبیہ دی ہے ۔ یعنے ایسی لکڑیاں جو دیوار کے آسرے کھڑی کر دی گئی ہوں۔ صاحب محیط نے کہا ہے کہ خَشَبَۃٌ خَشْبَاءُ اس لکڑی کو کہتے ہیں جسے اندر سے گھن نے کھا لیا ہو ** ۔ یعنے نہ ان میں عقل وفکر ہے' نہ زندگی کی کوئی تازگی ۔ نہ دماغ صحیح' نہ قلب زندہ۔ نرے کندہ' نا تراش ہیں ۔ چنانچہ خَشَبَ الشِّعْرَ اُسوقت کہتے ہیں جب کوئی شخص یونہی روانی سے شعر کہہ دے اور اسے کاٹ چھانٹ کر خوبصورت نہ بنائے۔ اور فَحْلٌ خَشِیْبٌ ۔ اس نئے اونٹ کو کہتے ہیں جو سدھایا نہ جا سکا ہو۔ جَبْہَۃٌ خَشْبَاءُ ۔ کھُرّی پیشانی *** ۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی سخت اور کھردرا ہونے کے ہیں ۔ اَلْاَخْشَبُ پتھریلے اور سخت پہاڑ کو کہتے ہیں ۔ نیز اس تلوار کو جو تازہ بننے کی وجہ سے ہموار اور چکنی نہ ہو ۔

ان معانی سے واضح ہوجاتا ہے کہ قرآن کریم نے منافقین کو خُشُبٌ کہہکر کیوں پکارا ہے ۔

خ ش ع

خَشَعَ کے معنے ہیں نگاہ یا آواز کا پست ہو جانا* ۔ خَشَعَتِ الْاَصْوَاتُ (۲۰/۱۰۸) '' آوازیں پست ہو جائیں گی '' ۔ اور خَاشِعَۃً اَبْصَارُھُمْ (۶۸/۴۳) '' ان کی نگاہیں جھکی ہوئی ہوں گی '' ۔ اس کے بعد ہے تَرْھَقُھُمْ ذِلَّۃٌ ۔ (انہیں ذلت آلے گی) ۔ اس سے خَاشِعَۃً اَبْصَارُھُمْ کے معنی واضح ہوجاتے ہیں ۔ یعنی ذلت وخواری کی وجہ سے نگاہوں کا جھک جانا ۔ خَشَعَتِ الْاَرْضُ ۔ زمین خشک ہوئی اور اس پر پانی نہ برسا * خُشُوْعُ الْکَوْکَبِ کے معنی ہیں ستارہ کا غروب ہوتے وقت جھُک جانا ۔ خَشَعَتِ الشَّمْسُ ۔ سورج کو گہن لگ گیا ۔ اِخْتَشَعَ ۔ سر جھکا کر نگاہ

* تاج ** محیط *** راغب۔

نیچی کرنا *۔ اَلْخُشْعَةُ ۔ زمین کے سخت اورسنگلاخ قطعہ کو کہتے ھیں جس میں سبزہ نہ اُگے ۔ نیز اَلْخَاشِعُ ۔ گرد و غبار سے بھری ھوئی جگہ کو کہتے ھیں جہاں پڑاؤ نہ کیا جاسکے *۔ قرآن کریم میں زمین مردہ کے لئے خَاشِعَةً (۴۱/۳۹) آیا ھے ۔ سورۃ غاشیہ میں نَاعِمَةٌ کے مقابلہ میں خَاشِعَةٌ آیا ھے (۸۸/۸-۲) ۔ نَاعِمَةٌ کے معنے شگفتہ و شاداب اور تر و تازہ ھیں اس لئے خَاشِعَةٌ کے معنے افسردہ و پژمردہ ھونگے ۔ قرآن کریم نے اس کے بعد عَامِلَةٌ نَّاصِبَةٌ (۸۸/۳) کہکر اس کی وضاحت کردی ۔ یعنی تھکے ماندے ۔ بے رونق ۔ خَاشِعِیْنَ ۔ ان لوگوں کے لئے بھی آیا ھے جو قوانین خداوندی کے سامنے جھک جائیں ۔ قرآن کریم نے اس کے معنے کئے ھیں اَلَّذِیْنَ یَظُنُّوْنَ اَنَّھُمْ مُّلٰقُوْا رَبِّھِمْ وَاَنَّھُمْ اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ (۲/۴۶) ۔ یعنی وہ لوگ جو اس کا گمان رکھتے ھیں کہ انہیں اپنے رب کا سامنا کرنا ھے ۔ یعنی وہ اپنے اعمال کے بارے میں خدا کے قانون مکافات کے سامنے جواب دہ ھیں اس لئے وہ ہر معاملہ میں اسی کے قانون کی طرف رجوع کرتے ھیں ۔ یہ ھے خُشُوْعٌ سے مقصود ۔ قلب سلیم سے قوانین خداوندی کے سامنے جھک جانا ۔ سر تسلیم خم کردینا ۔ ابن فارس نے کہا ھے کہ خَشَعَ کے معنے ھیں سر کو جھکا دیا ۔

خ ش ی

اَلْخَشِیُّ ۔ خشک پودے کو کہتے ھیں ۔ اَلْخَشَاءُ ۔ خشک پتھریلی زمین جہاں کچھ پیدا نہ ھو*۔ عربوں کے نزدیک پانی کے نہ ملنے کی وجہ سے سبزی کا خشک ھو جانا سخت خطرہ کا موجب ھوتا تھا ۔ اس لئے خَشْیَةٌ کا لفظ کسی نقصان کے احتمال سے خوف زدہ ھو جانے کے لئے استعمال ھونے لگا ۔ صاحب محیط نے (کلیات کے حوالہ سے) لکھا ھے کہ خَشْیَةٌ ۔ خَوْفٌ سے زیادہ شدید ھوتا ھے ۔ اس لئے کہ وہ اھل عرب کے قول شَجَرَةٌ خَاشِیَةٌ سے ماخوذ ھے ، یعنی بالکل خشک درخت جس میں زندگی کی کوئی رمق باقی نہیں رھے ۔ اس کے برعکس خَوْفٌ کا لفظ صرف نقصان کے لئے آتا ھے کیونکہ وہ نَاقَةٌ خَوْفَاءُ سے ماخوذ ھے یعنی بیمار اونٹنی جو مر نہیں گئی بلکہ اس کی زندگی کی آس باقی ھے**۔ نیز خَشْیَةٌ میں احتمال ، امید اورتوقع کے معنے بھی پائے جاتے ھیں جیسے خَشِیْتُ اَنْ یَّکُوْنَ ذَالِکَ اَسْھَلَ لَکَ ۔ مجھے امید یا توقع تھی کہ یہ تمہارے لئے زیادہ آسان ھوگا ۔ اسی طرح اس میں عِلْمٌ (جاننے) کے معنے بھی بتائے گئے ھیں (۱۸/۸۰) (خَوْفٌ

*تاج ۔ **محیط ۔

کا لفظ بھی جاننے کے معنوں میں آتا ہے دیکھئے عنوان خ - و-ف)- جب اس کے معنے خوف کے ہوں تو اس سے مراد ہوتا ہے اس قسم کا خوف جو کسی کی عظمت سے دل پر طاری ہو جائے* - خَشْيَةٌ کے معنے ہوتے ہیں کسی کام کے انجام کا علم ہونے کی وجہ سے اس سے اندیشہ کرنا (۱۸/۸۰) - یا اسے ناپسند کرنا* - خشیت الٰہی سے عام طور پر مراد لی جاتی ہے خدا کا ڈر - لیکن اس ڈر کا صحیح مفہوم خشیت کے بنیادی معنوں سے سمجھ میں آ سکتا ہے - قرآن کریم نے بتایا ہے کہ قوانین خداوندی کے اتباع کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ انسان کی کوششوں کی کھیتی سر سبزوشاداب ہوتی ہے - (هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ (۲/۵) - ان کی محنتوں کا بیج ایک شجر طیب بن جاتا ہے جسکی جڑیں زمین میں مستحکم ہوتی ہیں اور شاخیں آسمان کی پہنائیوں میں پھیلی ہوئی - اور وہ ہر موسم میں مسلسل پھل دیتا رہتا ہے (۱۴/۲۴) - یہ نتیجہ ہے قوانین خداوندی کے مطابق زندگی بسر کرنے کا - اس کے برعکس اگر قوانین خداوندی کے خلاف زندگی بسر کی جائے تو انسان کی کوششوں کی کھیتیاں جھلس جاتی ہیں - اور اس کی محنتوں کے پودے خشک ہو جاتے ہیں - اس امر کا احساس کہ اگر ہم قانون خداوندی کے مطابق نہ چلے تو ہماری کھیتی جھلس کر رہ جائیگی ، خَشْيَةُ اللهِ (خدا کا ڈر) کہلاتا ہے - یعنی قوانین خداوندی سے سرکشی کے نتائج و عواقب کا احساس - یہی وجہ ہے کہ اس میں احتمال ، توقع ، اندیشہ ، اور علم کا پہلو مضمر ہوتا ہے ، اور ان قوانین کے غیر متبدل اور لازمی طور پر نتیجہ خیز ہونے کے یقین سے ان کی عظمت اور قوت کا پہلو بھی- یہ ہے اصل مفہوم خَشْيَةُ اللهِ (خدا کے ڈر) کا - (مزید تفصیل کے لئے دیکھئے خ - و-ف کا عنوان)-

سورۃ توبہ میں ہے اَتَخْشَوْنَهُمْ فَاللهُ اَحَقُّ اَنْ تَخْشَوْهُ (۹/۱۳) - "تم اس سے تو ڈرتے ہو کہ ان لوگوں کی مخالفت کی تو اس کا نتیجہ کیا نکلے گا حالانکہ تمہیں اس کا خیال کرنا چاہئے کہ اگر قانونِ خداوندی کی مخالفت کی تو اس کا نتیجہ کیا نکلے گا؟ " نتائج کا ڈر،، - یہ ہے خَشْيَت کا صحیح مفہوم - اسی سورت میں ذرا آگے چل کر ہے - وَتِجَارَةٌ تَخْشَوْنَ كَسَادَهَا (۹/۲۴) " وہ تجارت جس کے نقصان سے تم ڈرتے ہو،، -

خ ص ص

اَلْخَصَاصُ کے بنیادی معنی ہیں خلل یا شگاف جو دو چیزوں کے درمیان واقع ہو جائے۔ نیز جھید اور سوراخ کو بھی کہتے ہیں - چونکہ شگاف

* تاج بحوالہ راغب نیز ابن فارس-

سے چیز کمزور ہوجاتی ہے اور اس میں نقص پیدا ہو جاتا ہے اس لئے خَصَاصَۃٌ کے معنے تنگی ۔ بد حالی ۔ فقر و فاقہ ۔ ضرورت اور حاجت کے ہو گئے (۹/۵۹) ۔ انگور کی بیل سے پھل توڑ لینے کے بعد کہیں کہیں جو اِکا دُکا چھوٹے چھوٹے خوشے باقی رہ جائیں انہیں اَلْخَصَاصَۃُ کہتے ہیں*۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس مادہ کے بنیادی معنوں میں شکستگی اور خلاء (کھلی جگہ) کا مفہوم ہوتا ہے ۔ اس طرح اَلْخَصَاصَۃُ کے معنی ہوئے فقر اور حالت میں شکستگی ۔

یہ اس کے اولین معنے ہیں ۔ چونکہ جن دو چیزوں کے درمیان شگاف آجائے وہ ایک دوسری سے الگ ہو جاتی ہیں ، اس لئے خُصُوْصٌ کے معنے ہیں کسی کو دوسروں سے الگ کرکے اس کے ساتھ خصوصی برتاؤ کرنا ۔ لہذا خَاصٌّ ۔ عَامٌّ کی ضد ہے ۔ یعنی عمومی کے مقابلہ میں خصوصی آئے گا ۔ خَصَّہٗ وَ اخْتَصَّہٗ ۔ اس کو باقیوں سے الگ کرکے اس کے ساتھ امتیازی سلوک کیا ۔ یعنی ایسا برتاؤ جس میں دوسرے لوگ شریک نہ تھے*۔ (۵/۲۵)۔ خَصَّ الشَّیْءُ ۔ کوئی چیز عام نہ ہوئی ۔ خَصَّ الرَّجُلُ خَصَاصَۃً وہ ضرورت مند اور محتاج ہوا** ۔

دوسروں سے الگ کرکے ، خصوصی برتاؤ کے سلسلہ میں سورۃ بقرہ کی یہ آیت دیکھئے جس میں کہا گیا ہے وَ اللّٰہُ یَخْتَصُّ بِرَحْمَتِہٖ مَنْ یَّشَاءُ (۲/۱۰۵) ۔ ''اللہ اپنی رحمت کے لئے جسے چاہتا ہے مختص کرلیتا ہے'' یہاں رحمت کے معنی وحیٔ خداوندی ہیں ۔ مطلب یہ کہ اللہ عام انسانوں میں سے ایک فرد کو منتخب (الگ) کرکے اسے وحی عطا کردیتا ہے ۔ وحی چونکہ وہبی عطیہ ہے جو اکتسابی طور پر نہیں مل سکتی ، اس لئے وحی کسی کے چاہنے یا نہ چاہنے سے نہیں ملتی ۔ بہ مشیت کے پروگرام کے مطابق اُسے ملتی ہے (بلکہ یوں کہئے کہ اُسے ملتی تھی ۔ کیونکہ اب وحی کا دروازہ بند ہو چکا ہے) جسے خدا اپنی مشیت کے پروگرام کے مطابق دینا چاہے ۔

خ ص ف

اَلْخَصْفُ ۔ وہ جوتا جس میں اوپر تلے برابر کے چمڑے ہوں ۔ اسکا ہر چمڑا خَصْفَۃٌ کہلاتا ہے ۔ خَصَفَ النَّعْلَ یَخْصِفُھَا ۔ جوتے پر دو برابر کے چمڑوں کو اوپر تلے رکھ کر سی دینا ۔ خَصْفٌ کے معنے ملانے اور جمع کرنے نیز جوڑنے ، پیوند لگانے اور گانٹھنے کے بھی آتے ہیں ۔ خَصَفَ الْعُرْیَانُ الْوَرَقَ عَلٰی بَدَنِہٖ ۔ ننگے آدمی نے اپنے بدن پر پتوں کو چپکا لیا

---

* تاج ۔ **محیط ۔

لیا اور انہیں تو برتو رکھ لیا تاکہ ستر ڈھانپا جا سکے *۔ قرآن کریم میں قصہٗ آدم کے ضمن میں ہے وَطَفِقَا یَخْصِفٰنِ عَلَیْھِمَا مِنْ وَرَقِ الْجَنَّةِ (۷/۲۲)۔ ''وہ باغ کے پتوں کو اوپر تلے رکھ کر اپنے آپ کو ڈھانپنے لگے،،۔ جنسی شعور کی بیداری، یعنی حیا کے احساس سے مراد ہے۔ (تفصیل ان امور کی میری کتاب ''ابلیس و آدم،، میں ملیگی)۔

اَلتَّخْصِیْفُ کے معنی ہوتے ہیں جو چیز اپنے پاس نہ ہو اسکے لئے بہ تکلف کوشش کرنا *۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس مادہ کے بنیادی معنی ہیں کسی چیز کا کسی دوسری چیز کے ساتھ مل جانا۔

خ ص م

اَلْخُصُوْمَةُ۔ جھگڑا۔ اَلْخَصْمُ۔ جھگڑا کرنے والا۔ (یہ واحد۔ جمع۔ تثنیہ۔ سب کیلئے آتا ہے)۔ اَلْخَصِیْمُ۔ جھگڑا کرنے والا۔ اَلْخُصْمُ۔ ہر چیز کا کنارا، گوشہ۔ اَلْخُصُوْمُ۔ وادیوں کے دھانے *۔

قرآن کریم میں ہے اَلَدُّ الْخِصَامِ (۲/۲۰۴) ''سخت جھگڑالو،،۔ سورۃ حج میں ہے ھٰذٰنِ خَصْمٰنِ (۲۲/۱۹)۔ ''یہ دو فریق ہیں جو ایک دوسرے سے جھگڑا کرتے ہیں،،۔

سورۃ نحل میں انسان کے متعلق ہے ھُوَ خَصِیْمٌ مُّبِیْنٌ (۱۶/۴)۔ یعنے اگر اسے وحی کی روشنی کے بغیر علی حالہ رہنے دیا جائے تو یہ کھلم کھلا جھگڑا کرنے والا نظر آئیگا۔ (نیز دیکھئے عنوان ج۔ د۔ ل)۔ سورۃ زخرف میں ہے مَاضَرَبُوْهُ لَكَ اِلَّا جَدَلًا ۔ بَلْ ھُمْ قَوْمٌ خَصِمُوْنَ (۴۳/۵۸-۵۹)۔ ''یہ لوگ (ان باتوں کو) تجھ سے صرف جھگڑنے کی خاطر بیان کرتے ہیں۔ یہ ہیں ہی جھگڑالو،،۔ سورہٗ آلِ عمران میں (ہیکل کے پجاریوں کے ضمن میں) ہے وَمَا كُنْتَ لَدَیْھِمْ اِذْ یَخْتَصِمُوْنَ (۳/۴۴) ''تو اُن کے پاس نہیں تھا جب وہ آپسمیں جھگڑتے تھے،،۔

خ ض د

خَضْدٌ۔ کسی گیلی یا سوکھی چیز کو موڑنا یا اسطرح توڑنا کہ وہ ٹوٹ تو جائے لیکن الگ نہ ہو۔ کبھی یہ کاٹنے کے لئے بھی بولا جاتا ہے۔ خَضَدَ الشَّجَرَ۔ اسنے درخت کے کانٹے توڑ ڈالے (اور اس طرح

* تاج۔ محیط۔ راغب۔

اس میں جو ایذا رساں عنصر تھا اسے ختم کر دیا)۔ اِنْخَضَدَتِ الثِّمَارُ۔ پھل پچک گئے اور رس نکل جانے سے ان کی ترو تازگی ختم ہو گئی۔ رَجُلٌ مَخْضُوْدٌ۔ وہ آدمی جس کے پاس کوئی حجت نہ رہے یا جو چلنے پھرنے سے معذور ہو جائے*۔ اِخْتَضَدَ الْبَعِيْرَ۔ اس نے قابو پانے کے لئے اونٹ کے نکیل ڈالی اور اس پر سوار ہو گیا**۔

قرآن کریم میں اہل جنت کے متعلق ہے فِیْ سِدْرٍ مَّخْضُوْدٍ (۵۶/۲۸) ایسی بیریاں جن کی شاخیں پھل کے بوجھ سے ٹوٹی پڑتی ہوں۔ یا ایسی لذتیں جن سے ہر قسم کی خلش اور کانٹا نکال دیا گیا ہو۔ اور اگر اسے استعارةً لیا جائے (دیکھئے عنوان س۔ د۔ ر) تو اسکا مطلب ہوگا، حیرت کی فراوانی لیکن اُس میں شکوک و اضطراب کی کوئی خلش نہ ہو (۵۳/۱۶)۔

خ ض ر

اَلْخُضْرَةُ۔ سبز رنگ۔ جمع خُضَرٌ اورخُضْرٌ۔ قرآن کریم میں ثِيَابٌ سُنْدُسٍ خُضْرٍ (۷۶/۲۱) آیا ہے۔ یعنی سبز رنگ کے ریشمی کپڑے۔ یہاں خُضْرٌ، اَخْضَرُ کی جمع ہے۔ اَلْخَضِرُ۔ سبزہ (۶/۱۰۰)۔ سبز کھیتی۔ اَلْخَضَرُ۔ نرم و نازک اور سبز ہونا۔ اَلْخَضْرَاءُ۔ بھلائی۔ فراخی۔ نعمت۔ سرسبزی و شادابی*۔ چونکہ سبز رنگ زیادہ گہرا ہو کر مائل بہ سیاہی ہو جاتا ہے اسلئے عربوں کے ہاں اَسْوَدُ کو اَخْضَرُ اور اَخْضَرُ کو اَسْوَدُ بھی بولتے ہیں***۔ بلکہ ابن فارس نے تو کہا ہے کہ عربوں کے ہاں جو رنگ سفید رنگ سے مختلف ہو اس میں سیاہ رنگ کا شائبہ ہوتا ہے۔ مُخْضَرَّةٌ (۲۲/۶۳) جو سبز ہو۔

اَلْخِضْرُ۔ اَلْخَضِرُ۔ "آبِ حیات والے خواجہ خضر"، جن کے متعلق مشہور ہے کہ وہ پانیوں کے پیغمبر ہیں اور قیامت تک زندہ رہینگے۔ لیکن یہ محض "شاعری" ہے۔ قرآن کریم میں اسکا کوئی ذکر نہیں۔

خ ض ع

اَلْخُضُوْعُ۔ جھکنے کے معنوں میں آتا ہے۔ خَضَعَ النَّجْمُ۔ ستارہ غروب ہونے کی طرف مائل ہو گیا۔ اَلْاَخْضَعُ۔ وہ شخص جس کی گردن میں پیدائشی طور پر پستی اور جھکاؤ ہو۔ جو بے دست و پا ہو چکا ہو۔

* تاج۔ ** محیط۔ *** راغب۔

خَضَعَهُ الْكِبَرُ ۔ بڑھاپے نے اسے جھکا دیا ۔ اَلْخَضِيْعَةُ ۔ سیلاب کی (نرم نرم) آواز۔ اَخْضَعَ الرَّجُلُ ۔ آدمی نے گفتگو میں لوچ پیدا کی ۔ اَلْخُضَعَةُ ۔ وہ آدمی جو ہر ایک کے سامنے عاجزی اور انکساری کرتا ہو۔ خَضَعَ ۔ وہ ساکن اور مطیع ہو گیا* ۔

قرآن کریم میں اُمہات المومنینؓ (نبی اکرمؐ کی ازواج مطہرات) سے کہا گیا ہے فَلَا تَخْضَعْنَ بِالْقَوْلِ (۳۳/۳۲) ''اپنی گفتگو میں نرمی اور لوچ نہ پیدا کرو''۔ تمکنت اور وقار سے باتیں کرو۔

گردنیں جھک جانے ، یعنے مطیع و فرمانبردار ہوجانے کے لئے خَاضِعٌ کا لفظ (۲۶/۴) میں آیا ہے ۔ اَعْنَاقُهُمْ لَهَا خَاضِعِيْنَ ۔ ''ان کی گردنیں اس کے سامنے جھک جائیں'' ۔

خ ط أ

اَلْخَطْءُ ۔ اَلْخَطَأُ ۔ اَلْخَطَاءُ ۔ غلط ۔ نادرست** ۔ اس کے معنی نشانہ خطا (Miss) کر جانا ہیں*** ۔ کہتے ہیں کہ اَلْخَطَأُ اس قصور کو کہتے ہیں جو عمداً نہ کیا جائے اور اَلْخَطِيْئَةُ وہ قصور ہے جو عمداً سرزد ہو** ۔ لیکن صاحب محیط کے نزدیک اَلْخَطِيْئَةُ ۔ بلا ارادہ اور بلا عمد بھی ہو سکتا ہے ۔ لیکن اِثْمٌ ہمیشہ عمداً ہوتا ہے**** ۔ خَطِيْئَةٌ کی جمع خَطَايَا اور خَطِيْئَاتٌ ہے ۔ در اصل اس سے مراد ایسا کام ہے جو اپنا پورا پورا نتیجہ مرتب نہ کرے ۔ چنانچہ عَلَى النَّخْلِ خَطِيْئَةٌ مِنْ رُطَبٍ ۔ کے معنے ہیں کھجور کے درخت پر تھوڑی سی رطب (کھجوریں) ہیں** ۔ قرآن کریم میں ہے بَلٰى مَنْ كَسَبَ سَيِّئَةً وَ اَحَاطَتْ بِهٖ خَطِيْئَتُهٗ (۲/۸۱) ۔ جو ناہمواریوں کے کام کرتا ہے اور (اس طرح) اسکی خطائیں اسے گھیر لیتی ہیں'' ۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ سَيِّاٰتٌ کا نتیجہ خطاؤں میں گھر جانا ہوتا ہے ۔ یعنے اس کے بعد انسان اپنے نشانے خطا کرتا جاتا ہے ۔ اسے کوئی بات صحیح طور پر سوجھتی نہیں ۔ اس کی کھجوریں پورا پھل نہیں لاتیں ۔ لیکن اگر اس آیت میں واو کو تفسیری مانا جائے تو كَسَبَ سَيِّئَةً کے معنے ہونگے اَحَاطَتْ بِهٖ خَطِيْئَتُهٗ ۔ آیت (۲/۲۸۶) میں نسیان اور خطا کو الگ الگ بیان کیا گیا ہے ۔ لَا تُؤَاخِذْنَا اِنْ نَّسِيْنَا اَوْ اَخْطَاْنَا ۔ ''اگر ہم سے بھول یا خطا ہو جائے تو ہماری گرفت نہ کرنا'' ۔ لیکن (۳۳/۵) میں ہے لَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ فِيْمَا اَخْطَاْتُمْ بِهٖ وَلٰكِنْ مَا تَعَمَّدَتْ قُلُوْبُكُمْ ۔ ''تم پر اس بارے میں گناہ نہیں جو تم سے

---

* تاج و راغب ۔ **تاج ۔ ***لین ۔ ****محیط ۔

خطا ہو جائے - گناہ وہ ہے جو تمہارے دل کے ارادے سے ہو" - اس سے ظاہر ہے کہ خَطَاً اس غلطی کو کہتے ہیں جو سہواً ہو جائے اور اس میں دل کا ارادہ شامل نہ ہو۔ اسی قسم کی بلا عمد خطائیں (سہو) تھیں جن کے متعلق حضرت ابراہیمؑ نے کہا تھا کہ خدا انہیں ان کے مضر اثرات سے محفوظ رکھیگا - وَالَّذِیْٓ اَطْمَعُ اَنْ یَّغْفِرَ لِیْ خَطِیْٓئَتِیْ یَوْمَ الدِّیْنِ (٢٦/٨٢) "وہ ذات جس سے مجھے توقع ہے کہ وہ ظہور نتائج کے وقت میری خطاؤں کے اثرات سے مجھے محفوظ رکھیگا -

سورۃ الحاقّۃ میں خَاطِئُوْنَ کا لفظ اہل جہنم کے لئے آیا ہے (٦٩/٣٧) اور خَاطِئَۃٌ کا لفظ ظلم و سرکشی کے لئے بھی (٦٩/٩) - سورۃ علق میں ہے نَاصِیَۃٍ کَاذِبَۃٍ خَاطِئَۃٍ (٩٦/١٦) - "جھوٹی، خطا کار پیشانی" - ان مقامات میں خَطَاً کے معنی جرم ہیں جس میں قصد و ارادہ شامل ہے - اسی طرح سورہ بنی اسرائیل میں قتلِ اولاد کے سلسلہ میں ہے اِنَّ قَتْلَهُمْ کَانَ خِطْاً کَبِیْرًا (١٧/٣١) - "ان کا قتل یقیناً ایک بہت بڑی غلطی ہے" -

تصریحات بالا سے ظاہر ہے کہ خَطَاً اس غلطی کے لئے بھی آتا ہے جو سہواً ہو، اور اس کے لئے بھی جو بالارادہ ہو - جو بالارادہ ہو، وہ جرم ہوگی اور قابل مؤاخذہ - بعض اہل لغت نے خَطِیَ کے معنے عمداً غلطی کرنا اور اَخْطَاَ کے بغیر قصد غلطی کرنا بتائے ہیں -

خ ط ب

اَلْخَطْبُ - بات، مسئلہ، حالت، معاملہ خواہ چھوٹا ہو یا بڑا - جَلَّ الْخَطْبُ - بات بڑی ہوگئی - معاملہ بڑا ہوگیا* - سورۃ یوسف میں ہے قَالَ مَا خَطْبُكُنَّ (١٢/٥١) "بادشاہ نے پوچھا کہ تمہارا معاملہ کیا تھا" - سورۃ حجر میں ہے قَالَ مَا خَطْبُكُمْ اَیُّهَا الْمُرْسَلُوْنَ (١٥/٥٧) "اس نے کہا کہ اے پیغامبرو! تمہارا معاملہ کیا ہے" - اس میں معاملہ کے اہم ہونے کا تصور ضرور ہوتا ہے - خَطَبَ الْمَرْاَۃَ خَطْبًا وَّ خِطْبَۃً - عورت کو نکاح کا پیغام دیا* - خِطْبَۃٌ (٢/٢٣٥) نکاح کا پیغام - خَطِیْبَۃٌ - منگیتر عورت* -

اَلْخِطَابُ - ایک دوسرے سے بات چیت کرنا نیز جن الفاظ سے کسی کو مخاطب کیا جائے وہ خطاب کہلاتے ہیں** - فَصْلُ الْخِطَابِ - دو ٹوک بات یا معاملہ کا دو ٹوک فیصلہ کر دینا (دیکھئے عنوان ف - ص - ل) - خِطَابَۃٌ -

---

*تاج - **محیط -

اس سے بات کی* ۔ اِذَا خَاطَبَهُمُ الْجٰهِلُوْنَ قَالُوْا سَلٰمًا (۲۵/۶۳) ۔ جب ان سے ناواقف اور جاهل لوگ (بهی) همکلام هوتے (یا معامله کرتے) هیں تو وہ ''سلام'' کہتے هیں یعنی ایسی بات کہتے هیں جس سے وہ غلطی سے محفوظ اور سلامت رهیں ۔ خَاطَبَ میں بات کرنا یا معامله کرنا ۔ دونوں مفهوم هوسکتے هیں ۔

ابن فارس نے کہا هے کہ اس کے بنیادی معنی هوتے هیں (۱) دو آدمیوں کے درمیان باتیں هونا ۔ اور (۲) دو مختلف رنگوں کا هونا ۔

خ ط ط

اَلْخَطُّ ۔ کسی چیز میں لمبی دهاری یا لکیر ۔ نرم زمین میں خفیف اور پتلا سا راستہ ۔ ابن فارس نے کہا هے کہ اس کے بنیادی معنے اس نشان کے هیں جو لمبا هو ۔ نیز هر راستہ ۔اَلْخِطُّ ۔ وہ زمین جس کے ارد گرد بارش هوئی هو لیکن اس میں نہ هوئی هو ۔ وہ زمین جهاں تمهارے اترنے سے پہلے کوئی نہ اترا هو ۔ اَلْخِطَّةُ ۔ زمین کا وہ حصہ جسے آدمی نشان لگا کر اپنے لئے برائے تعمیر مخصوص کرلے ۔ خَطَّ ۔ یَخُطُّ ۔ خَطًّا ۔ لکھنا ، کتابت کرنا ۔ کِتَابٌ مَخْطُوْطٌ ۔ لکھی هوئی کتاب* ۔

سورۃ عنکبوت میں نبی اکرم ؐ کے متعلق هے وَمَا كُنْتَ تَتْلُوْا مِنْ قَبْلِهٖ مِنْ كِتٰبٍ وَّلَا تَخُطُّهٗ بِيَمِيْنِكَ ... (۲۹/۴۸) ۔ ''تو اس سے پہلے نہ تو کوئی کتاب پڑھ سکتا تھا اور نہ هی اپنے دائیں هاتھ سے کچھ لکھ سکتا تھا'' اس میں ''اس (قرآن کریم) سے پہلے'' کی تخصیص صاف بتا رهی هے کہ نزول قرآن کریم سے پہلے تو حضور ؐ لکھنا پڑھنا نہیں جانتے تھے لیکن اس کے بعد یہ صورت نہیں رهی تھی ۔ پھر آپ ؐ نے لکھنا پڑھنا سیکھ لیا تھا ۔ اس لئے یہ عقیدہ کہ حضور ؐ ساری عمر اُمّی (اَن پڑھ) رهے قرآن کریم کی رو سے صحیح نہیں ۔

خ ط ف

خَطْفٌ کے معنے هیں کسی چیز کو تیزی سے اچک لینا ۔ خَاطِفُ ظِلِّهٖ ۔ ایک پرندے کا نام هے جو پانی میں اپنے سایہ کو دیکھ کر اُسے پکڑنے کے لئے جھپٹتا هے** ۔ خُطَّافٌ ۔ ایک سیاہ پرند جو پرواز کرنے میں جھپٹتا هے** ۔ اَلْخَاطِفُ ۔ اس تیر کو کہتے هیں جو زمین پر لگ کر گھستے

---

* تاج و راغب ۔ ** تاج ۔

ہوئے نشانہ پر جالگے۔ گویا وہ کوئی چیز زمین سے اچک رہا ہو اسی سے آج کل اَلْخَطِیْفَۃُ۔ اس لڑکی کو کہتے ہیں جسے کوئی شخص بھگا کر لے جائے***۔

قرآن کریم میں ہے یَکَادُ الْبَرْقُ یَخْطَفُ اَبْصَارَھُمْ (۲/۲۰)۔ "قریب ہے کہ بجلی کی چمک ان کی نگاہوں کو اچک کرلے جائے"۔ سورۃ حج میں ہے فَتَخْطَفُہُ الطَّیْرُ (۲۲/۳۱)۔ "اُسے پرندے اچک کرلے گئے"۔ دوسرے مقام پر ہے اِلَّا مَنْ خَطِفَ الْخَطْفَۃَ (۳۷/۱۰)۔ "بجز اس کے کہ کوئی (یونہی ذرا سی) بات اچک کر لے جائے"۔ سورۃ عنکبوت میں ہے جَعَلْنَا حَرَمًا اٰمِنًا وَّ یُتَخَطَّفُ النَّاسُ مِنْ حَوْلِھِمْ (۲۹/۶۷)۔ "ہم نے حرم کو امن کی جگہ بنا دیا اور (حالانکہ) ان کے گردو نواح سے لوگ اچک لئے جاتے ہیں"۔

خَطِفَ الْخَطْفَۃَ (۳۷/۱۰)۔ اور اسْتَرَقَ السَّمْعَ (۱۵/۱۸)۔ "یونہی اچٹتی ہوئی بات لے اڑنا اور چوری چھپے کچھ سن لینا"۔ (دیکھئے عنوان س۔ ر۔ ق) یہ ان کاہنوں (نجومیوں) کے متعلق ہے جو علم غیب کی باتیں معلوم کرنے کے دعوے کرتے تھے۔ (اور اب بھی کئی جگہ کرتے ہیں جہاں ہنوز علم کی روشنی نہیں پہنچی)۔ قرآن کریم نے کہا ہے کہ یہ محض اٹکلیں دوڑاتے رہتے ہیں۔ کوئی بات یونہی ٹھیک نکل آئی تو اسے اچھالتے پھرے۔ جو غلط ثابت ہو گئی، اس کی تاویل کرلی۔ ورنہ غیب کے علم پر ان کی قطعاً دسترس نہیں۔ لَا یَسَّمَّعُوْنَ (۳۷/۸)۔ اِنَّھُمْ عَنِ السَّمْعِ لَمَعْزُوْلُوْنَ (۲۶/۲۱۲)۔ نزول قرآن کریم کے بعد علم و بصیرت کا دور آ گیا۔ اب توہم پرستیوں کی کوئی گنجائش نہیں۔ اب ایسے عقائد کو علم کی بارگاہ سے آتشیں کوڑے پڑتے ہیں۔ (مزید تفصیل متعلقہ عنوانات میں ملیگی)

خ ط و

اَلْخُطْوَۃُ (وَ الْخَطْوَۃُ) جمع خُطًا و خُطُوَاتٌ۔ وہ فاصلہ جو دو قدموں کے درمیان ہو۔ پھر اس کا استعمال قدم کے لئے بھی ہونے لگا۔ یا راستے کے لئے۔ خُطُوَاتِ الشَّیْطٰنِ (۲/۱۶۸) "سرکش قوتوں کے یا مفاد پرستی کے جذبات کے راستے*"۔ خَطَا الرَّجُلُ یَخْطُوْ اس آدمی نے چلنے کے لئے قدم بڑھایا۔ تَخَطَّیْتُہٗ۔ میں اسے پھاند کر اس سے آگے بڑھ گیا*۔

ابن فارس نے کہا ہے کہ خَطْوٌ کے بنیادی معنی ہیں کسی چیز سے آگے بڑھ جانا۔ اور چلے جانا۔

---

* تاج۔ ** راغب۔ *** محیط۔

خ ف ت

خَفَتَ الصَّوتُ - بھوک کی شدت سے آواز میں پستی آ جانا یا آواز کا نہ نکلنا ، خَفَتَ فُلَانٌ - فلاں آدمی مر گیا کیونکہ اس کی آواز منقطع ہو گئی اور وہ خاموش اور ساکت ہو گیا - اَلْخَفْتُ - چھپا کر بات کرنا - پوشیدہ گفتگو کرنا ، * - (جَهْرٌ کی ضد ہے) دیکھئے (۱۷/۱۱۰) - سورہ طٰہٰ میں ہے یَتَخَافَتُوْنَ بَیْنَهُمْ (۲۰/۱۰۳) - " باہم چپکے چپکے باتیں کرتے ہیں" - ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنے پوشیدہ رکھنے اور چھپانے کے ہوتے ہیں۔

خ ف ض

اَلْخَفْضُ - رَفْعٌ (بلند کرنا) کی ضد ہے - یعنی نیچے کرنا - خَفَضَ رَأْسَ الْبَعِیْرِ - اس نے اونٹ کی گردن نیچے کی طرف جھکا دی تاکہ اس پر سوار ہو - اَلْخَافِضَةُ - پست ٹیلہ کو کہتے ہیں - اَلْخَفْضُ - نرم رفتاری - خَفَضَتِ الْاِبِلُ - اونٹ نے اپنی رفتار نرم کر دی - اسی سے اس کے معنے تواضع - فروتنی - اطمینان - سکون کے آتے ہیں -

عَیْشٌ خَافِضٌ - پرسکون و بافراغت زندگی - خَفْضُ الْعَیْشِ - وسعت اور فارغ البالی کی زندگی * - بغیر کسی دقت اور مشقت - پابندی اور رکاوٹ کے رزق فراواں ملنا - اس مادہ میں بنیادی طور پر یہ مفہوم ہوتا ہے -

قرآن کریم میں ہے وَاخْفِضْ جَنَاحَكَ لِلْمُؤْمِنِیْنَ (۱۵/۸۸)- " تو جماعتِ مومنین کے لئے اپنا بازو جھکا دے" - اسے نرم کردے - ان سب کو اپنے بازو کے نیچے لے لے - اپنے پروں کے نیچے سمیٹ لے - خَفَضَ الطَّائِرُ جَنَاحَهٗ - اس وقت بھی کہتے ہیں جب پرندہ اپنی پرواز کو روکنے کے لئے بازو سمیٹ لے * - ان معانی کی رو سے مندرجہ بالا آیت کا مفہوم یہ بھی ہو سکتا ہے کہ تو اپنی تیز رفتاری میں کمی کر دے تاکہ دیگر افراد کارواں جو اتنے تیز رو نہیں ہیں ، تمہارے ساتھ چل سکیں - ایک قائد کو اپنے پروگرام کی ترتیب میں اپنے رفقاء کی استطاعت اور استعداد کو ملحوظ رکھنا ہوتا ہے - سورۃ واقعہ میں ہے خَافِضَةٌ رَّافِعَةٌ (۵۶/۳) وہ انقلاب سرکشوں اور متمردوں کو پست کر دیگا اور صحیح نظام خداوندی پر چلنے والوں کو بلند کر دیگا - یہاں خَفْضٌ ضد ہے رَفْعٌ کی - یعنی جو اوپر ہیں انہیں نیچے کر دیگا - جو نیچے ہیں انہیں اوپر کر دیگا - تہ و بالا کر دیگا (۱۱/۸۲) -

* تاج و راغب -

خ ف ف

اَلْخِفُّ و اَلْخِفِیْفُ ہلکا (ثقیل کے مقابلہ میں)۔ اَلْخُفَافُ۔ ہلکا۔ بعض لوگوں نے خُفَافٌ اور خَفِیْفٌ میں یہ فرق کیا ہے کہ خُفَافٌ عقل وفکر میں ہلکا اور خَفِیْفٌ جسم میں ہلکا*۔ (خَفِیْفٌ کی جمع خِفَافٌ ہے۔ $(\frac{9}{41})$) راغب نے کہا ہے کہ خفیف کبھی تو قابل مدح صفت ہوتی ہے اور کبھی مذموم۔ مثلاً جس چیز کو ہلکا اور خوش آیند پایا جائے اسے خَفِیْفٌ کہتے ہیں اور جو گراں ہو اسے ثَقِیْلٌ۔ یہ قابل مدح صفت ہے۔ اسکے بر خلاف اوچھا، سطحیت پسند، کم وزن خَفِیْفٌ کہلاتا ہے اور گرانبار و پروقار ثَقِیْلٌ۔ یہاں خفیف مذموم صفت ہوگی۔ اِسْتَخَفَّ فُلَانٌ بِحَقِّیْ۔ اسنے میرے حق کی کوئی عزت نہیں کی اور اسے بے وقعت سمجھا۔ تَخْفِیفٌ۔ کمی کر دینے کو کہتے ہیں۔ اَلْخُفُّ۔ اونٹ یا شتر مرغ کا پاؤں۔ نیز چرمی موزہ جو پاؤں میں پہنا جاتا ہے۔*

ہلکا ہونے کی جہت سے، تیز خرامی (جلدی چلنے) کو بھی اس سے تعبیر کرتے ہیں۔ خَفَّ الْقَوْمُ عَنْ وَطَنِهِمْ۔ لوگ اپنے وطن سے نکل کر تیزی سے سفر میں چلے گئے*۔

قرآن کریم میں بدوؤں کے خیموں کے متعلق ہے تَسْتَخِفُّوْنَهَا $(\frac{16}{80})$ "تم انہیں ہلکا پھلکا پاتے ہو"۔ سورۃ الروم میں ہے لَا يَسْتَخِفَّنَّكَ الَّذِيْنَ لَا يُوْقِنُوْنَ $(\frac{30}{60})$ "جو لوگ خدا کے قانون پر یقین نہیں رکھتے وہ تجھے خفیف نہ سمجھیں"۔ یعنی تم میں کوئی ایسی بات نہیں ہونی چاہئے جس سے مخالفین کے دل میں یہ خیال پیدا ہو کہ تم اپنے دعوے میں ہلکے اور عزائم میں ڈھیلے ہو اس لئے تمہیں تمہارے مقام سے ہٹا کر اپنے ساتھ لے چلنا چنداں دشوار نہیں۔

سورۃ القارعۃ میں ثَقُلَتْ بمقابلہ خَفَّتْ آیا ہے۔ وَ اَمَّا مَنْ ثَقُلَتْ مَوَازِيْنُهُ فَهُوَ فِيْ عِيْشَةٍ رَّاضِيَةٍ۔ وَ اَمَّا مَنْ خَفَّتْ مَوَازِيْنُهُ فَاُمُّهُ هَاوِيَةٌ $(\frac{101}{6-9})$۔ "سو جس کا پلڑا بھاری ہوگا وہ خوشگوار اور پسندیدہ زندگی بسر کریگا۔ اور جس کا پلڑا ہلکا ہوگا وہ تباہی کے عمیق گڑھے میں ہوگا"۔ اس آیت میں ارتقاء کے ایک عظیم اصول کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ مثال کے طور پر یوں سمجھئے کہ طالب علموں کے لئے امتحان میں کامیابی کے لئے "فی صد نمبروں" کا قاعدہ مقرر ہوتا ہے (مثلاً ساٹھ فیصد)

---

* تاج و راغب۔

جو طالب علم سو میں سے ساٹھ نمبر حاصل کر لیتا ہے اس کے متعلق سمجھا جاتا ہے کہ اس میں آگے بڑھنے کی صلاحیت ہے۔ اس کی چالیس فیصد غلطیوں سے در گزر کر دیا جاتا ہے اور اسے اگلی جماعت میں ترقی دیدی جاتی ہے۔ یعنی اس کی صلاحیتوں کا پلڑا جھکا ہوا ہوتا ہے اور غلطیوں کا پلڑا ہلکا ہوتا ہے۔ اس کے بر عکس جو طالب علم چالیس فیصد نمبر حاصل کرتا ہے اسے فیل کر دیا جاتا ہے کیونکہ وہ اس معیار پر پورا نہیں اترتا جو ترقی کے لئے مقرر ہے۔ کائنات میں قانونِ ارتقاء کا اصول بھی یہی ہے۔ جس میں آگے بڑھنے کی صلاحیت پیدا ہو جاتی ہے اس کی تھوڑی بہت کمزوریاں اس کے راستے میں حائل نہیں ہوتیں۔ جس میں اتنی صلاحیت پیدا نہیں ہوتی اس کی تھوڑی بہت صلاحیت اس کے کسی کام نہیں آتی۔ وہ آگے نہیں بڑھ سکتا۔ یہی اصول انسانی ارتقاء کا بھی ہے۔ جس کی صلاحیتوں کا پلڑا جھک جائیگا اسے زندگی کی اگلی منزل میں ترقی مل جائیگی۔ جس کا پلڑا کمزور رہیگا، وہ ترقی نہیں پا سکیگا۔ ''ترقی پانے والوں،، کو اهل جنت کہا گیا ہے اور آگے نہ بڑھنے والوں کو اهل جہنم۔ اسی حقیقت کو دوسری جگہ ان الفاظ سے تعبیر کیا گیا ہے کہ اِنَّ الْحَسَنٰتِ یُذْهِبْنَ السَّیِّاٰتِ (۱۱/۱۱۵) '' یقیناً حسنات (اچھے اعمال) سیاٰت (غلط اعمال) کو دور کردیتے ہیں،،۔ اگر حسنات (تقویت بخش) اعمالِ حیات کا پلڑا بھاری ہو تو کمزوریوں کے مضرت رساں اثرات زائل ہو جاتے ہیں۔ اس مقصد کے لئے انسانی اعمال کا ایک ایک ذرہ سامنے لایا جاتا ہے (۹۹/۷۔۸)۔ لیکن فیصلہ اسی سے ہوتا ہے کہ حسنات کا پلڑا بھاری ہے یا سیاٰت کا۔ انسانی ذات کی نشو و نما اور ضعف و اضمحلال کے لئے یہی اصول کار فرما ہے۔ جو اعمال اس کی تقویت اور استحکام کا موجب بنتے ہیں، اگر ان کا وزن زیادہ ہے تو وہ اعمال جو اس کی کمزوری کا باعث تھے، نیچے دب جاتے ہیں۔ یعنی ان کے اثرات اسکی نشو و نما کو روکتے نہیں۔ لیکن اگر معاملہ اس کے بر عکس ہے' تو تقویت بخش اعمال، اس کے ارتقاء کا موجب نہیں بنتے۔ (مزید تشریح کے لئے ''ن ۔ ج ۔ و،، کا عنوان دیکھئے)۔

خ ف ی

اَلْخَافِیَةُ۔ عَلَانِیَةٌ کی ضد ہے۔ یعنی چھپنا۔ پوشیدگی۔ نیز چھپی ہوئی چیز۔ اَلْخَفَاءُ۔ جو چیز تم پر مخفی رہ جائے۔ اِخْتَفٰی ۔ اَخْفٰی ۔ اِسْتَخْفٰی چھپ گیا۔ پوشیدہ ہو گیا۔ قرآن کریم میں یہ لفظ (یعنی اخفاءٌ) اِبْدَاءٌ کے مقابلہ میں آیا ہے۔ (اِنْ تُبْدُوا الصَّدَقٰتِ فَنِعِمَّا هِیَ۔ وَ اِنْ تُخْفُوْهَا ۔۔۔۔ ۲/۲۷۱) اِبْدَاءٌ کے معنے ظاهر کرنے کے ہیں۔ سورة مائدہ میں اخفاءٌ

تَبْيِيْنٌ کے مقابلہ میں آیا ہے (٥/١٥) اس کے معنے بھی ظاہر کر دینے کے ہیں۔ نِدَاءً خَفِيًّا (١٩/٣) ۔ دھیمی آواز ۔ چھپی ہوئی آواز ۔ سورۃ طٰہٰ میں اَخْفٰی اور سِرًّا ساتھ ساتھ آئے ہیں ۔ (٢٠/٧) ۔ سورۃ الحاقّۃ میں ہے لَا تَخْفٰی مِنْكُمْ خَافِيَةٌ (٦٩/١٨) " کوئی چھپی ہوئی بات چھپی ہوئی نہ رہ سکے گی " ۔ سورۃ النساء میں ہے ۔ يَسْتَخْفُوْنَ مِنَ النَّاسِ (٤/١٠٨) "وہ لوگوں سے چھپنا چاہتے ہیں " ۔ مُسْتَخْفٍ بِالَّيْلِ (١٣/١٠) ۔ جو رات کو چھپ جائے یا چھپ جانا چاہے ۔ الخَفِيُّ ۔ پوشیدہ ۔ جو ظاہر و آشکارا نہ ہو ۔ قرآن کریم میں طَرْفٍ خَفِيٍّ (٤٢/٤٥) کنکھیوں سے دیکھنے کے لئے آیا ہے ۔

اَخْفَاهُ ۔ کسی بات کو ظاہر کر دینا ۔ اس کے خفاء (پوشیدگی) کو دور کر دینا* ۔ محیط میں ہے کہ خَفِيَ لَہٗ کے معنے ظاہر ہونے کے آتے ہیں اور اس کا استعمال ان موقعوں پر ہوتا ہے جہاں کوئی چیز پہلے سے چھپی ہوئی ہو اور پھر ظاہر ہو جائے ۔ یا کسی خفیہ طریقہ سے ظاہر ہو جائے** ۔ لطائف اللغۃ میں ہے کہ یہ لفظ اضداد میں سے ہے جس کے معنی كَتَمَ (چھپا دینا) اور اَظْهَرَ (ظاہر کرنا) دونوں آتے ہیں ۔

ابن فارس نے بھی اس کی تائید کی ہے کہ یہ لفظ اضداد میں سے ہے ۔ سورۃ طٰہٰ میں ہے اَكَادُ اُخْفِيْهَا (٢٠/١٥) اس میں اگر اَكَادُ کے معنی ارادہ کرنے کے لئے جائیں اور اُخْفِيْهَا کے معنی ظاہر کرنے کے تو مطلب یہ ہوگا کہ میں اسے ظاہر کر دینے کا ارادہ رکھتا ہوں ۔ اور اگر اَكَادُ کے معنی نفی کے لئے جائیں اور اُخْفِيْهَا کے معنی پوشیدہ رکھنے کے تو بھی مطلب یہ ہوگا کہ میں اسے پوشیدہ نہیں رکھنا چاہتا بلکہ ظاہر کر دینا چاہتا ہوں ۔ مطلب دونوں صورتوں میں ایک ہی ہوگا ۔ اس نکتہ کی وضاحت عنوان (ک ۔ و ۔ د) میں کی گئی ہے جسے ضرور دیکھ لینا چاہئے ۔

خ ل د

خُلُوْدٌ دوام کو کہتے ہیں ۔ لیکن صاحب محیط نے کلیات کے حوالہ سے لکھا ہے کہ جب کسی چیز میں تغیر اور فساد بہت دیر میں پیدا ہو، یعنے وہ بہت دیر تک نہ بگڑے تو اس کی اس صفت کے لئے خلود کا لفظ استعمال کر دیتے ہیں ۔ لہذا کسی چیز کے عرصہ دراز تک علی حالہ قائم رہنے کو بھی خُلُوْدٌ کہتے ہیں خواہ وہ ہمیشہ رہے یا نہ رہے* ۔ چنانچہ رَجُلٌ مُخْلَدٌ ۔ اس شخص کو کہتے ہیں جس میں بڑھاپا بہت دیر میں آئے ۔ کتاب الاشتقاق میں اس کے معنی طُوْلُ الْعُمْرِ (لمبے عرصہ تک رہنا) اور

---

* تاج ۔ ** محیط ۔

اَلْبَقَاءُ (غیر متغیر رهنا) کے لکھے هیں۔ اَلْخَوَالِدُ۔ پہاڑوں چٹانوں اور پتھروں کو کہتے هیں کیونکہ وہ همیشہ ایک هی حالت پر رهتے هیں۔ خانہ بدوش، صحراء میں کھانا پکانے کیلئے پتھر کھڑے کرکے چولہا بنا لیا کرتے تھے جو انکے کوچ کے بعد وهیں رہ جاتے تھے (وہ انهیں ساتھ نهیں لے جاتے تھے)۔ انهیں بھی خَوَالِدُ کہتے تھے ***۔ خَلَدَ وَاَخْلَدَ بِالْمَكَانِ وَاِلَى الْمَكَانِ کے معنے هیں وہ کسی جگہ مقیم هو گیا اور کافی عرصہ تک اس میں رہا۔ اَخْلَدَ الرَّجُلُ بِصَاحِبِهٖ کے معنے هیں وہ شخص اپنے ساتھی کے ساتھ ساتھ رہا اور اسکا پیچھا نهیں چھوڑا۔ اَخْلَدَ اِلَیْهِ کے معنے هیں وہ اسکی طرف مائل هوا اور اسکے ساتھ هی چمٹ کر رہ گیا *۔ سورۃ اعراف میں هے وَلَوْ شِئْنَا لَرَفَعْنٰهُ بِهَا وَلٰكِنَّهٗٓ اَخْلَدَ اِلَى الْاَرْضِ (۷/۱۷۶)۔ ,,اگر هم چاهتے تو اس کے ذریعے اسے بلندی عطا کر دیتے لیکن وہ زمین کے ساتھ چمٹ گیا،،۔ ابن فارس نے کہا هے کہ اس مادہ کے بنیادی معنے ثبات اور مستقل ساتھ لگے رهنے کے هیں۔ یعنی غیر متغیر هونا اور کسی کے ساتھ چپکے رهنا۔

قرآن کریم میں جنت کے ساتھ خَالِدِیْنَ فِیْهَا یا هُمْ فِیْهَا خَالِدُوْنَ (۲/۲۵) عام طور پر آیا هے۔ اسمیں جہاں اس دنیا کا جنتی معاشرہ مراد هے (دیکھئے جَنّٰتٌ کا لفظ۔ ج۔ ن۔ ن کے عنوان کے نیچے) تو اس کے خُلُوْدٌ سے مقصود یہ هے کہ جب تک وہ معاشرہ قوانین خداوندی کے مطابق رهیگا اس میں تغیر اور بگاڑ پیدا نهیں هوگا۔ لیکن جہاں اس سے مراد اس زندگی کے بعد کی زندگی کی کیفیات هیں، تو اس سے وہ حیاتِ جاوید مقصود هے جو اعمال صالحہ کا نتیجہ هے۔ یاد رهے کہ قرآن کریم میں جنت اور جہنم دونوں کے لئے خُلُوْدٌ کا لفظ آیا هے۔ جنت کا خلود حیات جاوید هے۔ یعنے وہ زندگی جو اپنے ارتقائی منازل طے کرتی هوئی آگے بڑھتی جائے۔ اور جہنم کے خلود سے مراد وہ حالت هے جسمیں صلاحیتوں کی نشوو نما رک جاتی هے اور زندگی، رتقائی منازل طے کرنے کے قابل نهیں رهتی۔ اسلئے اس میں جمود آجاتا هے۔ لہذا یہ خُلُوْدٌ پتھروں اور چٹانوں کا سا خلود هے۔ (تفصیل ان نکات کی قرآن کریم کے مختلف مقامات میں ملیگی)۔

مُخَلَّدُوْنَ۔ کلائیوں اور کانوں میں زیورات پہنے هوئے۔ ان زیورات کو خَلَدٌ (واحد خَلَدَةٌ) کہتے هیں۔ زیورات سے مزین ****۔ وِلْدَانٌ مُّخَلَّدُوْنَ (۵۶/۱۷)۔ کتاب الا شتقاق نے بھی ان معانی کی تائید کی هے۔

اَخْلَدَ۔ ایک زمانہ دراز تک مصیبتوں اور خرابیوں سے بچانا ****۔ قرآن کریم میں هے کہ وہ شخص جو مال کو جمع کرتا هے اور پھر اسے گنتا

* تاج و محیط۔ ** تاج و راغب۔ *** تاج۔ ****۔ غریب القرآن میرزا ابو الفضل بحوالہ بحرالمحیط و لسان العرب۔

رھتا ہے یَحْسَبُ اَنَّ مَالَهٗ اَخْلَدَهٗ (۱۰۴/۳) وہ خیال کرتا ہے کہ اس کا مال زمانہ دراز تک اسے تباھیوں سے محفوظ رکھیگا یا حیات دوام عطا کر دیگا۔ یہ اس کا خیال خام ہے۔ بقا اس کے لئے نہیں جو مال جمع کرکے دوسروں کو اس کے فائدے سے محروم رکھتا ہے۔ بقا اس کے لئے ہے جو نوع انسانی کے لئے نفع رساں ہو۔ وَ اَمَّا مَا يَنْفَعُ النَّاسَ فَيَمْكُثُ فِی الْاَرْضِ (۱۳/۱۷)۔

اُخروی زندگی کی حیات الخلد (زندگیٔ جاوید) کے متعلق یہ نہیں سمجھ لینا چاھئے کہ اس کی ھمیشگی، خدا کی ابدیت کی طرح ہے۔ بالکل نہیں۔ خدا کی ابدیت کے مانند کوئی ابدیت نہیں۔ انسان کی حیات دوام، خدا کے قوانین کے مطابق ھوگی۔ اس کا انجام کیا ھوگا؟ ذھن انسانی کی موجودہ سطح اس کے متعلق نہ کچھ سمجھ سکتی ہے نہ بتا سکتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن کریم نے جنت اور جہنم کے خلود کے ساتھ مَادَامَتِ السَّمٰوٰتُ وَالْاَرْضُ (۱۱/۱۰۷-۱۰۸) کہکر، خدائی ابدیت (Infinity) کیطرف سے خیال کا رخ ھٹا دیا ہے۔ (ان آیات میں اِلَّا مَا شَآءَ رَبُّكَ کے مفہوم کے لئے دیکھئے عنوان ن۔ س۔ ی)۔

خ ل ص

خَلَصَ کے معنے ھیں کھوٹ اور میل سے الگ ھوکر صاف اور خالص ھو جانا۔ خَلَصَ مِنَ الْقَوْمِ۔ وہ قوم سے الگ اور کنارہ کش ھوگیا*۔ اَخْلَصَ الشَّیْءَ: کسی چیز کو خالص کیا، چن لیا۔*** اس لئے اَلْمُخْلَصُ اُسے کہتے ھیں جسے دوسروں سے الگ کرکے کسی کام کیلئے خالص اور مختص کر لیا جائے*۔ اِنَّهٗ مِنْ عِبَادِنَا الْمُخْلَصِيْنَ (۱۲/۲۴)۔ وہ (یوسف) عام لوگوں کی راہ پر چلنے والا نہیں تھا۔ اسے عام لوگوں سے الگ کر لیا گیا تھا۔ وہ ھماری روش خاص پر چلنے والا تھا۔ اسی طرح حضرت یوسفؑ کے بھائیوں کے متعلق ہے خَلَصُوْا نَجِيًّا (۱۲/۸۰) وہ باھمی مشورہ کرنے کے لئے لوگوں سے الگ ھٹ گئے۔ اسی اعتبار سے خَالِصَةً مِنْ دُوْنِ النَّاسِ (۲/۹۴) کے معنے ھیں دوسرے لوگوں کو الگ ھٹا کر، خالص (Exclusively) ان کے لئے۔ اِسْتَخْلَصَهٗ۔ اُسے اپنے لئے خاص کر لیا (۱۲/۵۴)۔

خَالِصٌ۔ جس چیز سے آمیزش کو الگ کر دیا جائے۔ راغب نے لکھا ہے کہ اَلْخَالِصُ۔ اور اَلتَّصَافِیْ۔ دونوں مرادف المعنی ھیں۔ لیکن التصافی کبھی ایسی چیز کے لئے بھی بولدیا جاتا ہے جو پہلے ھی سے

* تاج۔ ** راغب۔ *** محیط۔

صاف ہو۔ اور خَالِصٌ وہ ہوتا ہے جس سے آمیزش دور کرکے اسے صاف کر لیا گیا ہو**۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی کسی چیز کو صاف کرنا اور اس کے زائد اور فالتو حصوں کو چھانٹ دینا ہیں۔

اَلْخِلَاصُ۔ وہ مکھن یا سونا چاندی جسے تپا کر خالص کیا جائے۔ خَلَّصَ اللّٰہُ فُلَانًا۔ خدا نے فلاں کو اس مشکل اور الجھن سے نکال دیا جس میں وہ پڑ گیا تھا۔ جسطرح اُلجھا ہوا دھاگہ سلجھایا جاتا ہے*۔

سورۃ بقرہ میں ہے وَنَحْنُ لَهٗ مُخْلِصُوْنَ ($\frac{2}{139}$)۔ ہم ہر طرف سے الگ ہٹ کر صرف قانون خداوندی کی راہ پر چلنے کیلئے مختص ہو چکے ہیں۔ اسکی وضاحت لَهٗ مُسْلِمُوْنَ اور لَهٗ عٰبِدُوْنَ نے کر دی ہے جو پہلی دو آیتوں میں آئے ہیں ($\frac{2}{136 \cdot 138}$)۔ یعنی صرف اس کے قوانین کی اطاعت کرنے والے۔ اس سے مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ ($\frac{40}{29}$) کے معنے بھی واضح ہو جاتے ہیں۔ یعنی اور سب قوتوں سے منہ موڑ کر، اطاعت کو صرف خدا کے لئے مختص کر دینا۔ سورۃ ص میں حضرات انبیاء کرام کے تذکرہ کے بعد فرمایا اِنَّآ اَخْلَصْنٰهُمْ بِخَالِصَةٍ ذِكْرَى الدَّارِ ($\frac{38}{46}$)۔ ہم نے انہیں عام لوگوں سے الگ ہٹا کر (ایک خاص گروہ بنا دیا) اس خصوصیت کی بنا پر کہ وہ ہمیشہ زندگی کے انجام ومآل کو اپنے پیش نظر رکھتے تھے۔ وہ حقیقی زندگی کے گھر کو پیش نظر رکھتے تھے ($\frac{29}{64}$) تا کہ جہاں اس کا تصادم طبعی زندگی سے ہو (ان دونوں میں (Tie) پڑے) حقیقی زندگی کو طبعی زندگی کے تقاضوں پر ترجیح دی جائے۔

خ ل ط

خَلَطَ اور خَلَّطَ۔ کسی چیز کو کسی دوسری چیز کے ساتھ ملا دینا۔ خواہ وہ اسطرح ملیں کہ پھر جدا بھی کر لی جا سکیں (جیسے اونٹوں کو بھیڑوں کے ساتھ ملا دینا) اور خواہ اسطرح کہ وہ جدا نہ ہو سکیں*۔ صاحب محیط کے نزدیک اَلْمَزْجُ صرف سیّال چیزوں کے آپس میں ملانے کو کہا جاتا ہے اور اَلْخَلْطُ اس سے عام ہے۔*** جو شخص کاروبار میں شریک ہو اسے خَلِيْطٌ کہتے ہیں۔ لیکن جوہری نے کہا ہے کہ اس کے لئے کاروبار میں شرکت ضروری نہیں۔ جو لوگ ویسے ہی آپس میں میل جول رکھیں، مل جل کر رہیں اور اسطرح ان میں دلی تعلق پیدا ہو جائے وہ بھی خَلِيْطٌ کہلاتے ہیں*۔ اس کے معنی ساتھ رہنے والا یا پڑوسی بھی ہیں۔ اسکی جمع خُلَطَاءُ آتی ہے۔ (ابن فارس)۔

* تاج۔ ** راغب۔ *** محیط۔

اِخْتِلَاطٌ کے معنے مباشرت کے بھی ہوتے ہیں۔ رَجُلٌ خِلْطٌ مِلْطٌ۔ اس آدمی کو کہتے ہیں جو مختلط النسب ہو۔ اور الخِلْطُ ولدالزنا کو *۔

خَالَطَہٗ۔ اس کے ساتھ مل کر رہا، گڈ مڈ ہوگیا۔ سورۃ بقرہ میں یتیموں کے متعلق ہے وَاِنْ تُخَالِطُوْھُمْ فَاِخْوَانُكُمْ (۲/۲۲۰)۔ اگر تم ان سے میل جول رکھو یا ان کے کاروبار میں شریک ہو جاؤ تو ہر وقت اسکا خیال رکھو کہ وہ تمہارے اپنے بھائی ہیں۔ سورۃ ص میں خُلَطَاءٌ کا لفظ کاروباری شرکاء کیلئے آیا ہے (۳۸/۲۴)۔ سورۃ توبہ میں خَلَطُوْا عَمَلًا صَالِحًا ...... (۹/۱۰۲) کے معنے ہیں، جنہوں نے اچھے کام کو برے کام کے ساتھ ملا دیا۔ سورۃ انعام میں ہے مَااخْتَلَطَ بِعَظْمٍ (۶/۱۴۷) جو (چربی) ہڈی کے ساتھ ملی (لگی) ہو۔ سورۃ کہف میں ہے فَاخْتَلَطَ بِهٖ نَبَاتُ الْاَرْضِ (۱۸/۴۵)۔ اس (بارش) کے ساتھ زمین کی روئیدگی مل جاتی ہے۔

خ ل ع

خَلْعٌ۔ کسی چیز کو اتار دینا۔ (نَزْعٌ کے معنے میں آتا ہے اس فرق کے ساتھ کہ خَلْعٌ میں مہلت اور آہستگی ہوتی ہے۔ یعنی یہ عمل فوراً نہیں ہوتا۔ اور نَزْعٌ میں جلدی اور تیزی پائی جاتی ہے۔ بعض لوگوں نے خَلْعٌ اور نَزْعٌ کو ہم معنے قرار دیا ہے۔ اَلْخَالِعُ۔ گرا ہوا، ٹوٹا ہوا درخت۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنے ہیں کسی چیز کا اُس چیز سے الگ ہو جانا جس کے ساتھ وہ پہلے شامل تھی۔ اَلْخُلْعُ۔ وہ طلاق جو عورت اپنے خاوند سے حاصل کرے**۔ (یہ فقہی اصطلاح ہے قرآنی نہیں۔)

سورۃ طٰہٰ میں ہے کہ خدا نے حضرت موسیٰؑ سے کہا فَاخْلَعْ نَعْلَيْكَ (۲۰/۱۲)۔ اسکے لفظی معنے ہیں "تو اپنے جوتے اتار دے"۔ لیکن صاحب تاج العروس نے لکھا ہے کہ اسکا مطلب یہ ہے کہ تم اسی جگہ قیام کرو۔ یہیں ٹھہرو۔ جیسے تم اس شخص کو جسے تم چاہو کہ تمہارے پاس کچھ وقت ٹھہر جائے، کہتے ہو کہ ذرا اپنے جوتے موزے اتار کر اطمینان سے بیٹھو**۔ لہذا آیت کے معنے یہ ہونگے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰؑ سے کہا کہ تم جلدی نہ کرو۔ اطمینان سے بیٹھ کر بات سنو۔ اب تمہارا سفر (جو تم تلاش حقیقت میں کر رہے تھے) ختم ہو گیا ہے۔ اب تمہاری مسافتیں سمٹ گئی ہیں۔ (دیکھئے طَوٰی)۔ اب تمہیں وحی کے ذریعے منزلِ مقصود

* تاج۔ ** تاج و راغب۔

کا پتہ بلاکاوش و تردد مل جائیگا۔ قرطبی نے اپنی تفسیر میں لکھا ہے کہ یہاں اِخْلَعْ نَعْلَيْكَ کے معنی یہ ہیں کہ تو اپنے اہل و عیال کے مشاغل سے فارغ ہو جا یعنی ذہن سے ان کے خیال کو نکال دے۔ اس نے کہا ہے کہ عربوں کے ہاں نَعْلٌ سے مراد اہل و عیال بھی لئے جاتے ہیں۔

خ ل ف

خَلْفٌ کے معنے ہیں پیچھے۔ نیز یہ بعد کے لئے بھی بولا جاتا ہے۔ مثلاً خَلْفَكَ۔ تیرے بعد۔ اَلْخَلْفُ۔ ایک قرن کے بعد دوسرا قرن (ایک نسل کے بعد دوسری نسل) نیز ان انسانوں کو کہتے ہیں جو پہلے لوگوں کے جانشین ہوں اور ان سے زیادہ ہوں۔ الخَلَفُ۔ باپ کے بعد اس کی جانشین ہونے والی نیک اولاد، اگر اولاد بداطوار ہو تو وہ خَلْفٌ کہلائیگی۔ لیکن بعض کا خیال ہے کہ یہ دونوں لفظ ایک دوسرے کی جگہ بولدئے جاتے ہیں۔ ابن بڑی کا کہنا ہے کہ الخَلَفُ آدمی کے بعد اس کے پسماندہ جانشینوں کے لئے، نیز بدل و عوض کے معنوں میں آتا ہے اور الخَلْفُ اس کے لئے جو پہلے کے بعد آئے، جیسے قرن کے بعد قرن۔ یا لوگوں کے جانشین خواہ وہ لوگ مر چکے ہوں یا زندہ ہوں۔ ہلاک ہوجانے والوں کے بعد باقی رہ جانے والے۔ ابن اثیر نے کہا ہے کہ خَلْفٌ ہو یا خَلَفٌ، دونوں کے معنے ایک ہی ہیں۔ یعنی گزرے ہوؤں کے بعد آنے والے، البتہ فرق یہ ہے کہ خَلَفٌ خیر میں استعمال ہوتا ہے اور خَلْفٌ شر میں۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس مادہ کے تین بنیادی معنی ہیں (۱) ایک چیز کا دوسری چیز کے بعد آنا اور اس کی جگہ لے لینا۔ (۲) آگے کی ضد۔ یعنی پیچھے۔ اور (۳) تغیر و تبدل۔ خِلْفَةٌ ان پتوں کو کہتے ہیں جو پت جھڑ کے بعد درخت پر نکلیں۔ ایک دوسرے کے بعد آنے اور اس کی جانشینی کرنے کے لئے بھی خِلْفَةٌ بولا جاتا ہے۔ قرآن مجید میں ہے۔ هُوَ الَّذِي جَعَلَ اللَّيْلَ وَالنَّهَارَ خِلْفَةً ($\frac{۲۵}{۶۲}$)۔ "اللہ وہ ہے جس نے رات اور دن کو اس طرح بنایا کہ ایک کے بعد دوسرا آتا ہے۔ اَلْخَالِفُ اس شخص کو کہتے ہیں جو کسی کے بعد اس کی جگہ پر بیٹھے یا جو پیچھے رہ جائے۔ ساتھ شریک نہ ہو ($\frac{۹}{۸۳}$)۔ خَلَفَ آبَاهُ کے معنے ہیں وہ اپنے باپ کا جانشین ہوا۔ اَلْخَلِيفَةُ دوسرے کا جانشین، نیز وہ فرمانروا جو اپنے سے پہلے فرمانروا کا جانشین ہو۔ اس کی جمع خُلَفَاء اور خَلَائِفُ ہے*۔ جب حضرت موسیٰؑ طور پر گئے ہیں تو انہوں نے اپنے بھائی ہارونؑ سے کہا

* تاج۔

اُخْلُفْنِیْ فِیْ قَوْمِیْ (۷/۱۴۲) - تم (میری غیبت میں) قوم میں میرے جانشین بنو۔ یعنے حضرت موسیٰؑ کی عدم موجودگی میں ان کی جانشینی کرنا۔ اس میں حضرت موسیٰؑ کی عدم موجودگی کا تصور خاص طور سے ذھن نشین کرنے کے قابل ھے۔ اس کے معنے یہ ھیں کہ کوئی کسی کی موجودگی میں اس کا خلیفہ نہیں ھوسکتا۔ اُس کی عدم موجودگی ھی میں ھوسکتا ھے۔ خواہ وہ زندہ ھو لیکن اُس جگہ موجود نہ ھو۔ اور خواہ مر چکا ھو۔ چنانچہ سورۃ یونس میں ھے ثُمَّ جَعَلْنَاکُمْ خَلٰٓئِفَ فِی الْاَرْضِ مِنْ بَعْدِھِمْ (۱۰/۱۴) - "ھم نے تمھیں اُن کے بعد ملک میں ان کا جانشین بنایا"۔ سورۃ ھود میں ھے کہ حضرت ھودؑ نے اپنی قوم سے کہا کہ اگر تم نے قوانین خداوندی سے روگردانی کی تو یَسْتَخْلِفُ رَبِّیْ قَوْمًا غَیْرَکُمْ (۱۱/۵۷) "میرا رب تمھاری جگہ ایک دوسری قوم کو لے آئیگا"۔ تم مٹ جاؤ گے اور تمھاری جانشین ایک اور قوم ھوجائیگی۔ قوم عاد کے متعلق ھے جَعَلَکُمْ خُلَفَآءَ مِنْ بَعْدِ قَوْمِ نُوْحٍ (۷/۶۹) - "تمھیں قوم نوح کے بعد ان کا جانشین بنایا"۔ اور ثمود کے متعلق ھے کہ انہیں قوم عاد کے بعد ان کا جانشین بنایا (۷/۷۴)۔

قرآن کریم میں متعدد مقامات میں آدم (انسان) کے متعلق ھے۔ اِنِّیْ جَاعِلٌ فِی الْاَرْضِ خَلِیْفَۃً (۲/۳۰) - اس کے معنے عام طور پر کئے جاتے ھیں خَلِیْفَۃُ اللہِ فِی الْاَرْضِ۔ یعنے زمین پر خدا کا نائب یا قائم مقام۔ یہ معنے بوجوہ غلط ھیں۔ سب سے پہلے تو اس لئے کہ قرآن کریم میں آدم کو کہیں بھی خَلِیْفَۃُ اللہِ (اللہ کا خلیفہ) نہیں کہا گیا۔ خَلِیْفَۃً فِی الْاَرْضِ کہا گیا ھے۔ دوسرے اس لئے کہ ھم دیکھ چکے ھیں کہ خَلِیْفَۃٌ کے معنے ھیں کسی کے بعد یا کسی کی عدم موجودگی میں اسکی جگہ لینےوالا۔ (انگریزی میں اسے Successor کہتے ھیں)۔ خدا ھر وقت اور ھر جگہ موجود ھے اسلئے خدا کے بعد یا خدا کی عدم موجودگی میں اسکی جانشینی کا تصور ھی باطل ھے۔ جو خود موجود ھو اسکا جانشین (Successor) کیسا؟ حضرت ابوبکرؓ خَلِیْفَۃُ الرَّسُوْلِ تھے۔ یعنے رسول اللہؐ کی وفات کے بعد انکے جانشین۔ وہ خَلِیْفَۃُ اللہِ نہیں تھے۔ بیعتِ خلافت کے بعد ایک شخص نے آپ کو "یا خلیفۃ اللہ" کہکر پکارا۔ آپ نے اسے فوراً ٹوکا اور کہا کہ میں "خلیفۃ الرسول" ھوں۔ "خلیفۃ اللہ" نہیں ھوں**۔ انسان دنیا میں خدا کی جانشینی کرنے کیلئے نہیں آیا۔ خدا کے قانون کے مطابق زندگی بسر کرنے

*تاج و محیط۔ **ابوبکر مصنفہ محمد حسین ھیکل (اردو ترجمہ صفحہ ۵۸۳)

اور اس کے قانون کو نافذ کرنے کیلئے آیا ہے۔ آدم (انسان) کو جو خَلِيْفَةٌ فِی الْاَرْضِ کہا ہے تو اسکے معنے یہ ہیں کہ وہ دنیا میں اپنے سے پہلی مخلوق کا جانشین (Successor) ہے۔ (دیکھئے عنوان ا۔ د۔ م اور ج۔ ن۔ ن)۔ چونکہ جانشینی میں غلبہ و تسلط اور اختیار و اقتدار شامل ہوتا ہے اسلئے اِسْتِخْلَافٌ فِی الْاَرْضِ سے مراد ہے ملک کی حکومت۔ کسی دوسری حاکم قوم کی جانشینی۔ (تفصیل ان امور کی میری تصنیف " ابلیس و آدم " میں ملیگی جہاں آدم کے متعلق شرح وبسط سے بحث کی گئی ہے)۔

یہ نظریہ بھی کہ انسان خدا کی نیابت کرتا ہے، قرآن کریم کی رو سے صحیح نہیں۔ نیابت کے معنی ہوتے ہیں کسی کو اپنے اختیارات تفویض کر دینا۔ (Powers Delegate) کر دینا۔ خدا اپنے اختیارات کسی کو تفویض نہیں کرتا۔ دنیا میں کسی کو خدائی اختیارات (Divine Rights) حاصل نہیں۔ نہ کسی بادشاہ کو۔ نہ مذہبی پیشوا کو۔ حتٰی کہ نبی کو بھی نہیں۔ خدا نے اپنے مطلق اختیارات سے قوانین مرتب کئے ہیں۔ خدا کے بندے ان قوانین کو پہلے اپنے آپ پر نافذ کرتے ہیں اور پھر باقی دنیا پر۔ انسان کا فریضہ، قوانین خداوندی کی تنفیذ ہے۔ قوانین سازی کے اختیارات اسے تفویض نہیں کئے گئے۔ خدا کا رسول بھی، خدا کا دین (قانون) دنیا تک پہنچاتا اور اسے نافذ کرتا ہے۔ دین بناتا نہیں۔ اس لئے ان معنوں میں انسان خدا کا نائب نہیں۔ البتہ اس سے اگر مفہوم " خدا کے قوانین کو نافذ کرنے والا " لیا جائے تو اور بات ہے۔ لیکن اس کے لئے " نائب " کا لفظ استعمال نہیں کرنا چاہئے کیونکہ اس سے تفویضِ اختیارات کا باطل مفہوم ذہن میں آجاتا ہے۔

اِخْلَافٌ کے معنے ہیں وعدہ خلافی کرنا۔ اَخْلَفَ وَعْدَهٗ کے معنے ہیں اس نے وعدہ کیا اور بعد میں اسے پورا نہ کیا*۔ فَلَنْ يُّخْلِفَ اللّٰهُ عَهْدَهٗ (۲/۸۰)۔ " اللہ وعدہ خلافی نہیں کرے گا۔ وہ اپنے وعدے کو ضرور پورا کریگا "۔

اِخْتِلَافٌ۔ اتساق (موافق ہونے) کی ضد ہے۔ اسکے معنے یکے بعد دیگرے آنے کے بھی ہوتے ہیں*۔ (جیسے اِخْتِلَافُ الَّيْلِ وَالنَّهَارِ (۲/۱۶۴) رات اور دن کا یکے بعد دیگرے ادل بدل کر آنا۔ اور اختلاف یا مخالفت کرنے کے بھی*۔ جیسے فَاخْتَلَفَ الْاَحْزَابُ مِنْۢ بَيْنِهِمْ (۱۹/۳۷)۔ " پھر ان کے درمیان فرقوں نے اختلاف کیا "۔

---

*تاج و محیط۔

بعض کا خیال ہے کہ خَلَفٌ اولاد صالح کو کہتے ہیں اور خَلْفٌ غیر صالح کو۔ اور بعض نے اس فرق کو تسلیم نہیں کیا *۔ قرآن کریم میں فَخَلَفَ مِنْ بَعْدِهِمْ خَلْفٌ (۷/۱۶۹ ; ۱۹/۵۹) غیر صالح کے لئے آیا ہے۔ تَخَلَّفَ۔ پیچھے رہ جانا (۹/۱۲۰)۔ مُتَخَلِّفُوْنَ۔ پیچھے رہ جانے والے (۹/۸۱)۔ خَالَفَهٗ۔ اسکی مخالفت کی۔ مُخْلِفٌ۔ وہ جو وعدہ خلافی کرے (۱۴/۴۷)۔ مُخْتَلِفٌ۔ الگ الگ (۱۶/۶۹)۔ اِسْتَخْلَفَ۔ جانشین بنانا (۲۴/۵۵)۔ مُسْتَخْلَفٌ وارث (۵۷/۷)۔

اللہ تعالیٰ نے ایمان اور اعمال صالحہ کا نتیجہ استخلاف فی الارض بتایا ہے (۲۴/۵۵)۔ لہذا جس ایمان اور جن اعمال کا نتیجہ اس دنیا میں غلبہ و اقتدار اور حکومت و شوکت نہیں قرآن کریم کی رو سے نہ وہ ایمان ایمان ہے نہ وہ اعمال اعمالِ صالحہ۔ ایمان و اعمال صالحہ کے متعلق یہ سمجھ لینا کہ ان کا نتیجہ صرف آخرت میں (مرنے کے بعد) برآمد ہوگا، اس دنیا سے ان کا کچھ واسطہ نہیں۔ یا ان سے مقصود ایک فرد کی اپنی ”روحانی ترقی“ ہے جسے معاشرہ کی اجتماعی زندگی سے تعلق نہیں۔ قرآن کریم کی تعلیم کے خلاف ہے۔

سورۂ ھود میں ہے کہ حضرت شعیبؑ نے اپنی قوم کو غلط روش زندگی سے باز رہنے کی تلقین کی اور فرمایا وَمَا اُرِيْدُ اَنْ اُخَالِفَكُمْ اِلٰى مَا اَنْهٰكُمْ عَنْهُ (۱۱/۸۸)۔ تاج نے لکھا ہے کہ خَالَفَهٗ اِلَى الشَّيْءِ کے معنی ہیں، کسی چیز سے منع کرنے کے بعد اس کا قصد کرنا۔ لہذا آیت کے معنی یہ ہیں کہ میں جس بات سے تمہیں روکتا ہوں میرا ارادہ قطعاً یہ نہیں کہ میں خود اس کا قصد کروں۔

قرآن کریم کی رو سے کسی قوم میں باہمی اختلاف خدا کا عذاب ہے (۳/۱۰۳) اور اختلافات کا مٹ جانا اللہ کی رحمت (۱۱/۱۱۸-۱۱۹)۔ قرآن کریم، لوگوں کے باہمی اختلافات مٹانے کے لئے آیا ہے (۱۶/۶۴)۔ اور اسی لئے یہ بھی خدا کی طرف سے رحمت ہے۔ جنتی زندگی کے مستحق وہ ہیں جن میں اختلافات نہ ہوں (۳/۱۰۵-۱۰۶)۔ باہم اختلافات اور دین میں تفرقہ شرک ہے (۳۰/۳۱-۳۲)۔ مسلمانوں کے باہمی اختلافات مٹانے کا طریق یہ ہے کہ ان کے ہر متنازع فیہ معاملہ کا فیصلہ قرآن کریم کے مطابق کیا جائے (۴۲/۱۰)۔ لیکن یہ فریضہ امت کا اجتماعی نظام (حکومت قرآنی) سر انجام دیگا۔ (۴/۶۵)۔ (ان امور کی مزید تفصیل ف۔ر۔ق کے عنوان میں ملیگی۔ نیز دیکھئے میری کتاب، سلیم کے نام خطوط۔ جلد دوم)۔

---

* تاج و محیط۔

خ ل ق

خَلْقٌ کے بنیادی معنے ہیں کسی چیز کو بنانے یا کاٹنے کے لئے اسے ماپنا۔ اس کا اندازہ لگانا (یہی مفہوم تقدیر کا بھی ہے دیکھئے ق - د - ر) اسکے تناسب و توازن کو دیکھنا۔ یا کسی چیز کو کسی دوسری چیز کے مطابق بنانا۔ کسی چیز کو نرم و ہموار کرنا*۔ نیز ایک چیز کو دوسری چیز سے بنانا**۔ خَلَقَ الْاَدِیْمَ کے معنے ہیں اسنے کوئی چیز بنانے کے لئے چمڑے کو ناپا اور پہلے اس کا اندازہ لگایا۔ رَجُلٌ تَامُّ الْخَلْقِ۔ اس شخص کو کہتے ہیں جسکی ساخت میں اعتدال ہو۔ جو بناوٹ اور تناسب کے اعتبار سے مکمل اور سڈول ہو۔ اس معنے میں خَلِیْقٌ بھی کہتے ہیں۔ اور خُلُقَۃٌ کے معنے ہیں چکنا پن، ہمواری، برابر ہونا۔ الخَلَقُ کے معنی ہیں کسی چیز کا شگاف وغیرہ سے خالی اور ہموار ہونا*۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی ہیں (۱) کسی چیز کا اندازہ کرنا۔ اور (۲) کسی چیز کا (استعمال کے بعد) ہموار اور صاف اور چکنا ہو جانا۔ (اسی جہت سے پرانی چیز کو خَلَقٌ کہتے ہیں کیونکہ وہ گھس کر سپاٹ ہو جاتی ہے اور اس کا روان زائل ہو جاتا ہے)۔

لہٰذا خَلَقَ کے معنے ہونگے کسی چیز کا اندازہ کرنا۔ اسکے حشو و زوائد کو دور کرنا اور پھر اسے اندازے اور پیمانے کے مطابق بنانا، اسطرح کہ اسکا توازن و تناسب بالکل درست رہے۔ اور وہ صاف اور ہموار ہو جائے۔ بَدَعَ اور فَطَرَ کے معنے ہوتے ہیں کسی چیز کو عدم سے وجود میں لانا۔ پہلی بار پیدا کرنا۔ ایجاد کرنا۔ اس اعتبار سے خَلَقَ کے معنے ہونگے مختلف عناصر کو نئی نئی ترکیبیں دینا اور اسطرح ان سے اور چیزیں پیدا کرتے چلے جانا۔ جیسے خَلَقَ الْاِنْسَانَ مِنْ نُّطْفَةٍ (۱۶/۴)۔ یا خَلَقَ الْاِنْسَانَ مِنْ صَلْصَالٍ (۵۵/۱۴)۔

سورۃ حج میں رحم مادر میں نطفہ اور جنین کے مختلف منازل کا ذکر کرتے ہوئے کہا گیا ہے کہ وہ مُضْغَةٍ میں تبدیل ہو جاتا ہے جس کی دو صورتیں ہوتی ہیں۔ یعنی مُّخَلَّقَةٍ اور غَيْرِ مُخَلَّقَةٍ (۲۲/۵)۔ مُخَلَّقٌ کے معنی ہیں مکمل شدہ۔ یا ہموار کیا ہؤا یا نرم کیا ہؤا (محیط)۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اَلْمُخَلَّقُ اُس تیر کو کہتے ہیں جسے سدعار کر ٹھیک کر دیا جائے۔ اس لئے آیت سے یہ مفہوم لیا جا سکتا ہے کہ مُضْغَةٍ یا تو پورا بچہ بن جاتا ہے اور یا نا تمام رہ کر گر جاتا ہے۔

---

* تاج و لین نیز ** راغب۔

سورۃ شعراء میں ہے اِنْ هٰذَا اِلَّا خُلُقُ الْاَوَّلِیْنَ (٢٦/١٣٧) یعنے یہ تو وہی پہلوں کا دستور، پرانی عادت، یا طریق کہن ہے۔ بعض لوگوں نے اسکے معنے رسم و رواج کے بھی لئے ہیں*۔ اور اسی سے اسکے معنے عادات و اطوار کے بھی آتے ہیں۔ چنانچہ خُلُقٌ کسی کی طبیعی عادت کو کہتے ہیں*۔ اور چونکہ عادت عموماً پرانی ہوتی ہے اس لئے خَلَقٌ کے معنی کہنگی کے بھی ہیں۔ خَلَقَ الثَّوْبُ۔ کپڑا پرانا ہو گیا۔ (٣٨/٧) میں ہے اِنْ هٰذَا اِلَّا اخْتِلَاقٌ۔ یہ گھڑی ہوئی بات ہے۔ خِلْقَةٌ کے معنے ہیں کسی کی طبیعی ترکیب (Natural Constitution)*۔ خَلَاقٌ کے معنے ہیں انداز کے مطابق مقرر کیا ہوا حصہ۔ اُولٰٓئِکَ لَا خَلَاقَ لَهُمْ فِي الْاٰخِرَةِ (٣/٧٦) میں خَلَاقٌ کے یہی معنے ہیں۔ راغب نے کہا ہے کہ خَلَاقٌ کے معنی ہیں وہ فضیلت جو حسن اخلاق کی بنا پر حاصل ہو۔

(قرآن کریم میں خَلْقٌ کے مقابلہ میں اَمْرٌ بھی آیا ہے۔ (٧/٥٤)۔ اسکے متعلق ا ۔ م ۔ ر کا عنوان دیکھئے)۔ خَلَقَ کے معنی ٹھیک اندازہ لگا کر اس کے مطابق عزم کرنے اور منصوبہ باندھنے کے بھی آتے ہیں۔ نیز تربیت کرنے کے بھی**۔

خَلَّاقٌ اور خَالِقٌ اللہ تعالیٰ کی دو عظیم صفات ہیں (٣٦/٨١ و ٥٩/٢٤)۔ لہٰذا جس فرد یا قوم میں صفات خداوندی کی نمود ہوگی اس کا مظاہرہ اس کی قوت تخلیق سے ہوگا۔ اولاد پیدا کرنا تخلیق (Creation) نہیں، تولید (Procreation) ہے۔ یہ وہ حیاتیاتی عمل (Biological Action) ہے جس میں حیوانات بھی انسان کے ساتھ برابر کے شریک ہیں۔ لہٰذا تولید، حیوانی سطح زندگی کا عمل ہے، انسانی سطح پر تخلیق شروع ہوتی ہے جس میں حیوان شریک نہیں ہو سکتے جس قوم میں قوت تخلیق نہیں اس میں صفات خداوندی کی نمود نہیں۔ اسی بنا پر اقبال نے کہا ہے کہ:

ہر کہ او را قوتِ تخلیق نیست — نزد ما جز کافر و زندیق نیست

یہ بھی یاد رہے کہ تخلیق محض (Duplication) نہیں۔ یعنی ایک جیسی چیز کا بار بار بنائے چلے جانا تخلیق نہیں۔ تخلیق نت نئے اضافے چاہتی ہے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ کے متعلق ہے یَزِیْدُ فِي الْخَلْقِ مَا يَشَاءُ (٣٥/١)۔ "وہ اپنی مشیت کے مطابق خلق میں اضافے کرتا رہتا ہے"۔ اس لئے اس کے بندوں کی بھی یہ شان ہونی چاہئیے کہ وہ اپنے تخلیقی کارناموں میں نئے نئے اضافے کرتے رہیں۔ اس کو ایجاد کہتے ہیں۔

*(تاج و لین **غریب القرآن ۔ میرزا ابوالفضل ، بحوالہ صحاح

قرآن کریم میں نبی اکرمؐ کے متعلق ہے وَ اِنَّکَ لَعَلٰی خُلُقٍ عَظِیْمٍ (۶۸/۴) "اور یقیناً تو خلق عظیم کا حامل ہے"۔ جیسا کہ پہلے لکھا جاچکا ہے، خلق کے معانی میں اعتدال، توازن و تناسب پایا جاتا ہے۔ یہ چیز شرف انسانیت کی دلیل ہے۔ نبی اکرمؐ کی ذات گرامی میں یہ شرف اپنی بلند ترین سطح پر تھا۔ ہمارے ہاں جس چیز کو "اخلاقیات" سے تعبیر کیا جاتا ہے وہ ہمارے دور ملوکیت کی تمدنی زندگی کا آئینہ ہیں۔ قرآن کریم نے جو صفات مؤمن کی بیان کی ہیں، وہی صحیح اخلاق ہیں۔ اور ان صفات کی بلند ترین مظہر نبی اکرمؐ کی ذات گرامی ہے جو نوع انسانی کے لئے حسین ترین نمونہ ہے۔ حضورؐ کی سیرت کا یہ نمونہ قرآن کریم کے اندر محفوظ ہے۔

خ ل ل

اَلْخَلُّ۔ وہ راستہ جو ریگزار کے اندر تک جاتا ہو۔ یا جو دو ریگزاروں کے درمیان سے گذرتا ہو۔ اَلْخَلَلُ۔ دو چیزوں کے درمیان کشادگی۔ خِلَالٌ۔ درمیان کی جگہ۔ خِلَالُ الدِّیَارِ۔ گھروں کے درمیان کی جگہ، گھروں کی حدود کے آس پاس کی جگہ۔ تَخَلَّلَ الشَّیْءَ چیز کے اندر گھس جانا۔ خَلَّ الشَّیْءَ۔ چیز میں سوراخ کر دیا اور اس میں سے آر پار چلا گیا۔ اَلْخِلَالُ۔ وہ چیز جس سے آر پار سوراخ کیا جائے۔ اَلْخَلَّةُ۔ احتیاج۔ اضطراری حالت*۔ فَجَاسُوْا خِلٰلَ الدِّیَارِ (۵/۱۷) وہ شہروں کے اندر گھس گئے۔ خِلٰلَهَا (۳۳/۱۸) اس کے اندر۔

خُلَّةٌ۔ دوستی*۔ (۲۵۴/۲) غالباً اس اعتبار سے کہ دوست ایک دوسرے کے دلوں کے اندر گھسے ہوئے ہوتے ہیں، یا انہیں ایک دوسرے کی احتیاج ہوتی ہے۔ خَلِیْلٌ (جمع اَخِلَّاءُ)۔ دوست (۱۲۵/۴) و (۶۷/۴۳)۔ خِلَالٌ۔ باہمی دوستی (۳۱/۱۴)۔

اَلْخَلُّ۔ سرکہ*۔

خ ل و

خَلَا الْمَکَانُ کے معنے ہیں مکینوں کے چلے جانے سے کسی جگہ کا خالی ہو جانا۔ خَلَا الشَّیْءُ۔ کسی چیز کا گذر جانا اور چلا جانا۔ خَلْوَةٌ کے معنے تنہائی ہیں۔ خَلِیَّةٌ۔ شہد کی مکھیوں کا چھتہ*۔ راغب کا قول

---

*تاج۔

ہے کہ خَلَوٌّ کا استعمال زمان اور مکان دونوں کیلئے آتا ہے۔ چونکہ زمانے میں مرور (گذرنا) پایا جاتا ہے اس لئے اہل لغت نے خَلَا الزَّمَانُ کے معنی زمانہ گذر گیا کر لئے*۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی ہیں ایک چیز کا دوسری چیز سے الگ ہو جانا۔

قرآن کریم میں خَلَوْا بمقابلہ لَقُوْا کے آیا ہے (۲/۱۴ و ۲/۷۶) جہاں اسکے معنے علیحدگی اور تنہائی میں ملنے کے ہیں۔ خَلَوْا مِنْ قَبْلِكُمْ (۲/۲۱۴) کے معنے ہیں وہ لوگ جو تم سے پہلے گزر چکے ہیں۔ تِلْكَ اُمَّةٌ قَدْ خَلَتْ (۲/۱۴۱) "یہ ایک جماعت تھی جو گذر چکی"۔ اَلْاَيَّامِ الْخَالِيَةِ (۶۹/۲۴) کے معنے ایام گذشتہ ہیں۔ سورۃ یوسف میں يَخْلُ لَكُمْ وَجْهُ اَبِيْكُمْ (۱۲/۹) کے معنے ہیں تمہارے باپ کی ساری توجہ خالصتاً تمہارے لئے ہو جائیگی۔ کوئی دوسرا اسمیں شریک نہیں ہوگا۔ خَلَا فِيْهَا نَذِيْرٌ (۳۵/۲۴) جسمیں کوئی آگاہ کرنے والا (نہ) گزرا ہو۔ تَخَلَّتْ (۸۴/۴) خالی اور صاف ہو جانا۔ فَخَلُّوْا سَبِيْلَهُمْ (۹/۵) ان کا راستہ چھوڑ دو۔ ان سے تعرض مت کرو۔ خَلَّا سَبِيْلَ الْاَسِيْرِ کے معنی ہیں قیدی کو آزاد کر دیا***۔

خ م د

خَمَدَتِ النَّارُ۔ آگ کے شعلوں کا ساکن ہوجانا اگرچہ اس کے انگارے نہ بجھے ہوں۔ اگر انگارے بھی بجھ جائیں تو اسے هَمَدَتِ النَّارُ کہینگے*۔ ابن فارس نے اس کے بنیادی معنے حرکت کا ساکن ہوجانا نیز گر جانا بتائے ہیں۔ اَخْمَدْتُهَا۔ میں نے آگ کے شعلوں کو ساکن کر دیا۔ اَلْخَمُّوْدُ۔ وہ جگہ جہاں آگ کو دبا دیا جاتا ہے۔ خَمَدَ الْمَرِيْضُ۔ مریض بیہوش ہوگیا یا مر گیا۔ قَوْمٌ خَامِدُوْنَ۔ وہ لوگ جن کی تم کوئی آہٹ تک نہ سنو****۔ بے حس و حرکت لوگ۔ اَخْمَدَ اللّٰهُ اَنْفَاسَهٗ۔ خدا نے اسے ذلیل کیا یا موت دیدی***۔ سورۃ انبیاء میں ہے جَعَلْنٰهُمْ حَصِيْدًا خَامِدِيْنَ (۲۱/۱۵) "ہم نے انہیں نشو و نما کی قوت سے عاری کرکے بے حس و حرکت کٹی ہوئی کھیتی کی طرح کر دیا"۔ دوسری جگہ ہے فَاِذَا هُمْ خَامِدُوْنَ (۳۶/۲۹)۔ "سو دیکھو! وہ بجھے ہوئے انگاروں کی طرح ہو گئے"۔ زجاج نے بھی اس آیت کے معنے بتاتے ہوئے لکھا ہے کہ یہاں اس کے معنے خاموش اور مردہ ہیں***۔ تباہ ہو جانے والی قوموں کے خون سے حرارت سلب ہو جاتی ہے اور

*راغب۔ **تاج و راغب ***محیط۔ ****تاج۔

ان کے پیکر راکھ کا ڈھیر بنکر رہ جاتے ہیں ۔ یہی ان کا خمود ہے ـ بجھے ہوئے انگارے ـ نیز ان کی حیاتِ ملی کی سرسبز و شاداب کھیتیاں کٹ جاتی ہیں اور ان کے صرف نشانات باقی رہ جاتے ہیں ۔

خ م ر

خَمْرٌ ۔ کسی چیز کو ڈھانپ دینا یا چھپا دینا ۔ خَمَرَ الشَّیْءَ یَخْمِرُهٗ ۔ اس کو چھپا دیا ۔ ڈھانپ دیا ۔ خَمَرَ فُلَانٌ الشَّهَادَةَ ۔ فلاں نے گواہی کو چھپا دیا ۔ اَلْخَمَرُ ۔ اوٹ ، آڑ ، پردہ ۔ خِمَارٌ ۔ اوڑھنی جس سے عورتیں اپنے سر کو ڈھانپتی ہیں* ۔ (جمع خُمُرٌ ـ ۲۴/۳۱) ۔ لطائف اللغۃ میں ہے کہ عورتیں پہلے اپنے سر پر اَلْغِفَارَةُ اوڑھتی تھیں اور اس کے اوپر اَلْخِمَارُ ۔ (غِفَارَةٌ کے لئے دیکھئے عنوان غ ۔ ف ۔ ر) اَلْخَمْرُ ۔ ہر نشہ آور چیز ۔ کیونکہ وہ عقل کو ڈھانپ دیتی ہے ۔ حضرت عمرؓ نے کہا ہے ۔ اَلْخَمْرُ مَا خَامَرَ الْعَقْلَ ۔ خمر اسے کہتے ہیں جو عقل میں گڈمڈ اور فتور پیدا کر دے ۔ بعض کا قول ہے ''لَا نَّهَا تَخْمِرُ الْعَقْلَ'' ۔ یعنی شراب کو خمر اس لئے کہا گیا ہے کہ وہ عقل کو ڈھانپ لیتی ہے* ۔ عرب عام طور پر شیرۂ انگور سے شراب بناتے تھے اور اسے خَمْرٌ کہتے تھے ۔ ویسے ان کے ہاں انگور کو بھی خَمْرٌ کہتے ہیں* ۔ تَخْمِیْرٌ کے معنے ہیں خمیر اٹھانا* ۔ خَامَرَ الرَّجُلُ فِی الْبَیْعِ مُخَامَرَةً ۔ اس شخص نے خرید و فروخت میں فریب سے کام لیا اور آزاد کو غلام بنا کر بیچ دیا** ۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی ڈھانپ لینے اور ڈھانپ لینے کے ساتھ گھل مل جانے کے ہیں ۔ اور اَلْاِسْتِخْمَارُ کے معنے ہیں غلام بنا لینا ۔ اس لئے کہ کسی کو غلام بنانے کے لئے اس کی عقل کو سلب کر لینا ضروری ہوتا ہے ۔

قرآن کریم میں خَمْرٌ اور مَیْسِرٌ*** کے متعلق ہے کہ فِیْهِمَا اِثْمٌ کَبِیْرٌ وَّ مَنَافِعُ لِلنَّاسِ ۔ ''ان میں بڑا اثم ہے اور لوگوں کے لئے فائدے بھی'' ۔ وَ اِثْمُهُمَآ اَكْبَرُ مِنْ نَّفْعِهِمَا (۲/۲۱۹) ۔ ''ان کا اثم ان کے فائدوں کی نسبت بہت زیادہ ہے'' ۔ اِثْمٌ کے معنے ہیں اضمحلال ۔ افسردگی ۔ تکان ۔ سستی ۔ ایسی کمزوری جس سے انسان زندگی کی دوڑ میں پیچھے رہ جائے ۔ (دیکھئے عنوان ا ۔ ث ۔ م) ۔ یعنے نشہ آور اشیاء (اور میسر یعنی آسانی سے ہاتھ آئی ہوئی دولت) سے بیشک دوران خون تیز ہو جاتا ہے ۔ انسان میں وقتی طور پر گرمجوشی پیدا ہو جاتی ہے ۔ لیکن اس کے بعد قویٰ اس قدر

---

* تاج و راغب ۔ ** محیط ۔ *** میسرة کے معنے ہیں وہ دولت جو آسانی سے ہاتھ آجائے ۔ جؤا بھی اس میں شامل ہے ۔ (دیکھئے عنوان ی ۔ س ۔ ر)

کمزور ہو جاتے ہیں کہ ان میں جد و جہد اور سعی و عمل کی ہمت باقی نہیں رہتی - اسی لئے انہیں رِجْسٌ مِنْ عَمَلِ الشَّيْطٰنِ قرار دیکر اس سے باز رہنے کی تاکید کر دی گئی (۵/۹۰) اور بتا دیا کہ ان سے تمہارے اندر باہمی عداوت پیدا ہو جائیگی اور تم نظام صلٰوۃ کو قائم کرنے کے قابل ہی نہیں رہوگے - (۵/۹۱)- خَمْرٌ (شراب) کے طبعی اثرات کےمتعلق ڈاکٹروں کی تحقیق یہی ہے کہ اس کا پہلا اثر دورانِ خون کو تیز کرتا ہے - اور یہ چیز بعض حالتوں (بیماریوں) میں اچھے نتائج مرتب کرتی ہے - لیکن اس کے بعد اس کا اثر دورانِ خون کو بہت سست کر دیتا ہے - اور یہ اثر بہت گہرا ہوتا ہے - لہذا اس کے ابتدائی فائدے کے مقابلہ میں اس کا ثانوی نقصان کہیں زیادہ ہوتا ہے -

خَمْرٌ (اور مَيْسِرٌ) سے صرف انسانی جسم ہی میں اضمحلال پیدا نہیں ہوتا بلکہ اس سے انسانی ذات کی توانائیاں بھی افسردہ ہو جاتی ہیں، اور یہ بہت بڑا نقصان ہے -

خ م س

اَلْخَمْسَةُ - پانچ - ۵ - وَ يَقُوْلُوْنَ خَمْسَةٌ (۱۸/۲۲) - يَوْمُ الْخَمِيْسِ - پانچواں دن (جمعرات) - خَمْسُوْنَ - پچاس - ۵۰ - اِلَّا خَمْسِيْنَ عَامًا (۲۹/۱۴) - خُمْسٌ اور خُمُسٌ - پانچواں حصہ - فَاَنَّ لِلّٰهِ خُمُسَهٗ (۸/۴۱) - خَامِسٌ - پانچواں - اس کا مونث اَلْخَامِسَةُ ہے (۲۴/۷)-

مال غنیمت کا خُمُسٌ (پانچواں حصہ) اللہ اور رسول کے لئے ہے (۸/۴۱)- یعنے مرکز نظام خداوندی کے لئے - امیر ملت اس مال کو امت کی اجتماعی ضروریات پر صرف کریگا ، اسی کو فِیْ سَبِيْلِ اللّٰهِ کہا جاتا ہے -

خ م ص

اَلْخَمْصَةُ - بھوک - خَمِصَ الْبَطْنُ - پیٹ کھانے سے خالی ہو گیا اور اندر کو پچک گیا - اَلْاَخْمَصُ - پاؤں کے تلوے کو کہتے ہیں جسکا قعر (Curve) اندر کی طرف ہوتا ہے - چونکہ سخت بھوک میں پیٹ بھی اسی طرح کمر کے ساتھ جا لگتا ہے اسلئے اسطرح کے بھوکے آدمی کو خَمِيْصٌ کہتے ہیں - اور مجازاً زَمَنٌ خَمِيْصٌ قحط سالی کے زمانہ کو*-

قرآن میں مَخْمَصَةٌ سخت بھوک کیلئے آیا ہے (۵/۳)-

* تاج -

خ م ط

خَمَطَ اللَّحْمَ يَخْمِطُهُ ۔ اسنے گوشت کو بھون لیا ۔ اگر اسے پانی میں ابال لیا جائے تو سَمَطَ کہینگے ۔ اَلْخَمْطُ ۔ کھٹا ۔ ھر کڑوی چیز ۔ ھر پودا جس میں کسیلا پن اور کڑواھٹ ھو ۔ ایک قسم کا زھر قاتل یا زھریلا مہلک درخت ۔ ھر بے کانٹوں والا درخت، پیلو کے درخت کا پھل* ۔ راغب نے اس کے معنے پیلو کا درخت کئے ھیں ۔ قرآن کریم میں اھل سبا پر عذاب کے سلسلہ میں کہا گیا ھے کہ ان کے عمدہ باغات کی جگہ ایسے باغات پیدا ھو گئے جو ذَوَاتَیْ اُکُلٍ خَمْطٍ تھے (۳۴/۱۶) ۔ یعنی کڑوے پھلوں والے ۔ اس کے معنی یہ بھی ھو سکتے ھیں کہ ان کی زندگی کی خوشگواریوں کو بدمزگیوں سے بدل دیا ۔

ابن فارس نے کہا ھے کہ اس کے بنیادی معنی ھیں (۱) ننگا اور خالی اور سپاٹ ھونا ۔ اور (۲) تسلط و غلبہ ۔ اس اعتبار سے (معنوی انداز میں) اس کا مفہوم ھوگا کسی کو جور و اکراہ اور ظلم و استبداد کی پاداش میں متاع حیات سے محروم کر دینا ۔ یہی اھل سبا کے ساتھ ھؤا تھا ۔

خ ن ز ر

اَلْخَنْزَرَةُ ۔ موٹا ھونا ۔ بڑا موٹا ھتھوڑا جس سے پتھر توڑے جاتے ھیں ۔ اَلْخِنْزِیْرُ ۔ سؤر ۔ (جمع خَنَازِیْرُ) ۔ خَنْزَرَ ۔ اس نے خنزیر کے سے کام کئے ۔ کسی کو کنکھیوں سے دیکھنے کیلئے بھی یہ لفظ آتا ھے** ۔

قرآن کریم میں لحم خنزیر کا شمار حرام اشیاء کی فہرست میں ھؤا ھے (۲/۱۷۳) ۔ نیز ان لوگوں کیلئے بھی یہ لفظ (خنزیر) آیا ھے جن کی سیرتیں مسخ ھو کر بد ترین حیوانوں جیسی ھو جائیں ۔ (۵/۶۰) ۔ راغب نے لکھا ھے کہ اس کا استعمال مسخ صورت اور مسخ سیرت دونوں کیلئے ھو سکتا ھے*** ۔ (نیز دیکھئے عنوان ق ۔ ر ۔ د) صاحب غریب القرآن نے اسے خَنِزَ + نَزْرٌ سے مرکب لکھا ھے جسکے معنے ھیں سڑی گلی اور ناقص چیز**** ۔

خنزیر (سؤر) کے متعلق یہ عجیب چیز ھے کہ اسے دنیا میں ھر جگہ قابل نفرت سمجھا جاتا ھے ۔ حتٰی کہ یورپ کی جو قومیں اس کا گوشت کھاتی ھیں وہ بھی اس کے نام کو بطور گالی استعمال کرتی ھیں ۔ خود بائبل میں اس کا ذکر اسی انداز سے آیا ھے ۔

---

* تاج ۔ راغب ۔ محیط ۔ **تاج ۔ ***راغب ۔ ****میرزا ابوالفضل ۔

خ ن س

خَنَسَ عَنْهُ۔ یَخْنِسُ۔ خَنْسًا۔ اس سے پیچھے ہٹ جانا۔ خَنَسَهُ۔ کسی کو پیچھے ہٹا دینا۔ اَلْخُنَّسُ۔ ہرنوں کے چھپنے کی جگہ۔ (نیز دیکھئے کُنَّسٌ)۔ خَنَسَ مِنْ بَیْنِ اَصْحَابِهٖ۔ وہ اپنے ساتھیوں کے درمیان میں سے چھپ گیا۔ اَلْخَنَسُ فِی الْقَدَمِ۔ پاؤں کے تلوے کا سپاٹ اور پر گوشت ہونا*۔ اَلْخِنِّیْسُ گھات لگانے والے مکار، نیز حیلہ ساز اور چالباز کو کہتے ہیں*۔

قرآن کریم میں ہے فَلَآ اُقْسِمُ بِالْخُنَّسِ (۸۱/۱۵)۔ اس سے مراد وہ ستارے ہیں جو پیچھے ہٹتے ہیں۔ اور چونکہ ستاروں کی رفتار میں آواز نہیں ہوتی اسلئے دبے پاؤں پیچھے ہٹنے کا مفہوم بھی اسمیں آ جاتا ہے۔ یہ وہی شہادت ہے جو وَالنَّجْمِ اِذَا هَوٰى (۵۳/۱) میں بیان ہوئی ہے (نیز ۵۶/۷۵ میں)۔ کیونکہ اس کے بعد بھی وحی و رسالت کا بیان ہے (۸۱/۲۲-۲۰)۔

سورۃ الناس میں الْوَسْوَاسِ الْخَنَّاسِ (۱۱۴/۴) آیا ہے۔ یعنی کانوں میں کچھ پھونک کر دبے پاؤں پیچھے ہٹ جانے والا۔ چپکے چپکے غلط خیالات پھیلا کر چھپ جانے والا۔ مولانا عبیداللہ سندھی نے لکھا ہے کہ اَلْخَنَّاسُ، چھپنے والی طاقت کو کہتے ہیں۔ یا اسے کہ جب اس پر حملہ کیا جائے تو وہ چھپ جائے**۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اسی کے بنیادی معنی چھپنے اور پوشیدہ ہونے کے ہیں۔

خ ن ق

خَنَقَ۔ یَخْنِقُ۔ گلا گھونٹ دینا۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی تنگی کے ہوتے ہیں۔ چنانچہ اَلْخَانِقُ۔ تنگ گھاٹی کو کہتے ہیں۔ تنگی کی جہت سے اَلْخَنِقُ کے معنی گلا گھونٹنے کے آتے ہیں۔ اَلْخِنَاقُ۔ وہ رسی جس سے گلا گھونٹا جائے۔ اِنْخَنَقَ۔ اس کا گلا گھٹ گیا***۔ (خُنَاقٌ اسی سے ہے) اَلْمُنْخَنِقَةُ۔ جسکا گلا گھٹ جائے (اور وہ اسطرح مر جائے) قرآن کریم نے ایسے جانور کو حرام قرار دیا ہے (۵/۳)۔

خ و ر

خَوِرَ۔ یَخْوَرُ۔ خَوَرًا۔ کمزور ہو جانا۔ بز دل ہو جانا۔ ٹوٹ جانا۔ سست پڑ جانا۔ خَارَتْ قُوَّةُ الْمَرِیْضِ۔ مریض کی قوت کم ہو گئی

---

* تاج و راغب **تفسیر المقام المحمود صفحہ ۲۲۱ - *** تاج۔

یعنی وہ کمزور ہو گیا ۔ خَوِّرَتِ الْاَرْضُ ۔ بارش کی کثرت سے زمین کی مٹی بہ گئی* ۔

اَلْخُوَارُ ۔ گائے بیل بکری ۔ ہرن یا تیروں کی آواز ۔ دراصل یہ گائے بیل کی آواز کے لئے تھا ، پھر دوسری آوازوں کے لئے بھی بولا جانے لگا* ۔ راغب نے کہا ہے کہ خُوَارٌ خاص طور پر گائے بیل کی آواز کو کہتے ہیں پھر استعارۃً اونٹ کی آواز کے لئے بھی بول دیا جاتا ہے* ۔ قرآن کریم نے عِجْلٌ (بچھڑے) کیلئے لَهُ خُوَارٌ کہا ہے (۷/۱۴۸) ۔ یعنی جس سے آواز نکلتی تھی ۔

خ و ض

خَاضَ ۔ یَخُوْضُ ۔ کے بنیادی معنے ہوتے ہیں پانی میں اترنا اور اسمیں چلنا ۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنے کسی چیز کے اندر چلے جانے کے ہیں ۔ اسکے بعد اسکا استعمال کسی معاملہ میں دیر تک مشغول رہنے کیلئے ہونے لگا ۔ قرآن مجید میں اس کا بیشتر استعمال فضول باتوں میں اُلجھنے کیلئے ہوا ہے*** ۔ خَاضَ ۔ اسنے بیکار بات کی (اقرب الموارد) ۔ چنانچہ سورۃ توبہ میں ہے وَخُضْتُمْ كَالَّذِي خَاضُوْا (۹/۶۹) اسکے معنے فضول باتوں میں الجھے رہنا ہیں ۔ سورۃ طور میں ہے اَلَّذِيْنَ هُمْ فِيْ خَوْضٍ يَلْعَبُوْنَ (۵۲/۱۲) ۔ ''جو لوگ باطل میں منہمک اور حق سے غافل ہیں'' ۔ سورۃ مدثر میں مجرمین کی فہرستِ جرائم میں یہ بھی ہے کہ كُنَّا نَخُوْضُ مَعَ الْخَآئِضِيْنَ (۷۴/۴۵) ۔ یہ اس ٹائپ کے لیڈروں کا ذکر ہے جو فلاح عامہ کیلئے عملاً کچھ نہیں کرتے لیکن بیانات دھڑا دھڑ دیتے ، ریزولیشن پاس کرتے ، اسکیمیں بناتے اور ہمیشہ (Planning) میں وقت گزارتے رہتے ہیں ۔ یعنی باتیں ہی باتیں اور کام کچھ نہیں ۔ نیز ایسے علماء اور مفکرین جو نظری مسائل کی موشگافیوں اور نکات آفرینیوں میں لگے رہتے ہیں اور عملی نتائج مرتب کرنے والے امور کو نظر انداز کر دیتے ہیں ۔ یہی لوگ قوموں کی تباہی کا موجب بنتے ہیں (۴/۱۰۴) ۔

خ و ف

خَوْفٌ ۔ قرائن اور شواہد سے کسی آنے والے خطرہ یا نقصان کا اندیشہ کرنا ۔ اسے (Apprehend) کرنا ۔ جسطرح طَمَعٌ کے معنی ہیں قرائن

*تاج و محیط ۔ **تاج ۔ ***تاج و راغب ۔

و شواهد سے کسی فائدہ کی توقع کرنا۔ اسی لئے قرآن کریم میں خَوْفًا وَّ طَمَعًا اکٹھا آیا ہے (۷/۵۶)۔ اسکے برعکس حُزْنٌ بالعموم اس غم کو کہتے ھیں جو حادثہ کے گزر جانے کے بعد اسکے نقصان کی وجہ سے ھو۔ یعنے خَوْفٌ کا تعلق مستقبل (حادثہ واقع ھونے سے پہلے) کے اندیشہ سے ہے۔ اور حُزْنٌ بالعموم گزرے ھوئے واقعہ کے غم کو کہتے ھیں*۔ چنانچہ سورۃ النساء میں ہے وَاِنِ امْرَاَةٌ خَافَتْ مِنْۢ بَعْلِهَا نُشُوْزًا (۴/۱۲۸) جسکے معنے یہ ھیں کہ اگر کسی عورت کو اپنے خاوند کی طرف سے زیادتی کا اندیشہ ھو۔ لہٰذا خوف خدا وندی کے معنے یہ ھیں کہ اس احساس سے کہ قوانین خدا وندی کو چھوڑ دینے سے میرا کسقدر نقصان ھوگا، ان قوانین کا اتباع کرنا۔ غلط روش کے تباہ کن نتائج کے احساس اور اندیشہ سے اس روش سے مجتنب رھنا۔ چنانچہ سورۃ نحل میں اشیائے کائنات، اور ملائکہ کے متعلق ہے یَخَافُوْنَ رَبَّهُمْ مِّنْ فَوْقِهِمْ وَيَفْعَلُوْنَ مَا يُؤْمَرُوْنَ (۱۶/۵۰)۔ "یہ اپنے نشو و نما دینے والے کے غلبہ و اقتدار سے ڈرتے ھیں اور جنو کچھ حکم دیا جاتا ہے وھی کرتے ھیں"۔ یعنی وہ قوانین خدا وندی کی پوری اطاعت کرتے ھیں کیونکہ وہ جانتے ھیں کہ اس کی خلاف ورزی کا نتیجہ فساد ھوگا۔ لہٰذا خدا کا خوف کسی مستبد حاکم کے خوف کے مرادف نہیں۔ اس خوف سے مفہوم ایسا ھی ہے جیسے ھم جلنے کے اندیشہ سے آگ میں ھاتھ نہیں ڈالتے۔ چنانچہ اَلْخَافَةُ اس چرمی جبہ کو کہتے ھیں جسے چھتے سے شہد نکالنے والا اوڑھ لیتا ہے (تاکہ شہد تو مل جائے لیکن وہ مکھیوں کے ڈنک سے محفوظ رہے)۔ نیز تھیلہ جس میں (تلف ھونے کے خوف سے) کسی چیز کو محفوظ کیا جاتا ہے**۔

خَوَافٌ۔ شور و غل کو کہتے ھیں**۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس مادہ کے بنیادی معنی پریشانی اور گھبراھٹ کے ھیں۔ خَوْفٌ کے معنے قتل اور جنگ کے بھی ھیں**۔ چنانچہ (۲/۱۹۳) میں خَوْفٌ کے معنے قتل و قتال کے کئے گئے ھیں۔ تَخَوَّفَ الشَّيْءَ کے معنے ھیں کسی چیز کو کم کر دینا**۔ تَخَوَّفَهُ حَقَّهُ اسکے حق کو کم کر دیا۔ اَوْ يَاْخُذَهُمْ عَلٰى تَخَوُّفٍ (۱۶/۴۷) کے معنے ھیں انہیں بتدریج کم کرتا ھوا تباہ کر دے، دفعۃً نہیں۔ نیز تَخَوُّفٌ کے معنے خوف کرنا، ڈرتے رھنا ھیں۔ اس طرح یہ معنی بھی ھوسکتے ھیں کہ باوجود ان کے خوف کرنے اور ھوشیار رھنے کے انکی گرفت کر لے۔ لیکن اول الذکر معانی زیادہ موزوں نظر آتے ھیں۔

اَلْخِيْفَةُ۔ حالت خوف کو کہتے ھیں***۔

*راغب۔ **تاج۔ ***محیط۔

اتباع ہدایت کا لازمی نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اس قوم کو خوف اور حزن نہیں رہتا (۲/۳۸) - لہٰذا اگر کسی قوم پر خوف چھایا رہے تو اسے سمجھ لینا چاہئے کہ وہ ہدایت خداوندی کا اتباع نہیں کر رہی - مومن اور خوف باطل دو متضاد باتیں ہیں - لفظ مومن کا تو مادہ ہی امن ہے - پھر اسے باطل سے خوف کیوں ؟

خ و ل

اَلْخَالُ - ماں کا بھائی ، یعنی ماموں - (جمع اَخْوَالٌ - اَخْوِلَةٌ - خُؤُوْلٌ) - اَلْخَالَةُ - ماں کی بہن یا خالہ (اس کی جمع خَالَاتٌ ہے) - (۴/۲۳) - اَخْوَالٌ (۲۴/۶۱) میں آیا ہے - اَلْخَالُ - بھلائی کا نشان جو کسی آدمی میں نظر آئے - فوج کا جھنڈا - سیاہ اونٹ - هُوَ خَالُ مَالٍ - وہ اونٹوں کا محافظ ہے* - ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی کسی چیز کی خبر گیری اور نگہداشت کرنے کے ہوتے ہیں - خَوَّلَ (تَخْوِیْلٌ) کسی کو سامان حشم و خدم عطا کر دینا - یا ایسی چیزیں دینا جن کی نگرانی اور دیکھ بھال کی ضرورت پڑے** - اِذَا خَوَّلَه، نِعْمَةً (۳۹/۸) - "جب اللہ اسے سامان آسائش عطا کرتا ہے" -

خ و ن

اَلْخَوْنُ کے بنیادی معنے ہیں کسی چیز کو کم کر دینا - خَوَّنَه، - اس کو کم کر دیا - فِیْ ظَهْرِهٖ خَوْنٌ - اس کی کمر میں کمزوری ہے - نگاہ کی چندھیاہٹ کو بھی خَوْنٌ کہتے ہیں* -

خَانَ - یَخُوْنُ - خَوْنًا سے مراد یہ ہوتی ہے کہ جس شخص کو امانتدار سمجھا جائے وہ اپنی امانت اور عہد کا پاس نہ کرے - اس کا نام خِیَانَةٌ ہے - اس سے ظاہر ہے کہ خِیَانَةٌ دراصل اعتماد اور بھروسہ کو ضائع کر دینے کا نام ہے - چنانچہ کہتے ہیں خَانَ الدَّلْوَ الرِّشَاءُ - رسی نے ڈول سے وفا نہ کی اور درمیان سے ٹوٹ گئی جس کے سبب سے ڈول کنویں میں گر گیا* - ہم رسی کی مضبوطی کے بھروسہ پر ڈول کو بھر کر کھینچتے ہیں - اگر رسی درمیان میں پہنچ کر ٹوٹ جائے تو یہ اس کی خِیَانَةٌ کہلاتی ہے - لہٰذا اَمَانَةٌ تو یہ ہے کہ انسان کسی کی طرف سے مطمئن (امن میں) ہو جائے اور اپنے اعتماد کو نہیں کھوئے - لیکن خِیَانَةٌ میں یہ اعتماد اور بھروسہ

*تاج - **راغب -

باقی نہیں رہتا - یہی وجہ ہے کہ قرآن کریم نے قوانین خداوندی کے متعلق کہا ہے کہ وہ ایک ایسی مضبوط کڑی ہے کہ لَا انْفِصَامَ لَهَا (۲/۲۵۶) - جو کبھی ٹوٹ نہیں سکتی - ان پر پورا پورا بھروسہ کیا جا سکتا ہے - یہ کبھی راستہ میں دغا نہیں دیتے - یہ درمیان میں پہنچکر ٹوٹ نہیں جاتے - صرف ٹوٹ کر نقصان پہنچانا ہی نہیں بلکہ ہر تغیر، کمی اور تبدیلی کرنے کو تَخَوُّنٌ کہتے ہیں* - خَانَهُ الدَّهْرُ - زمانہ نے اس کے ساتھ وفا نہ کی، یعنی اس کی حالت بگاڑ دی* -

قرآن میں ہے اِنَّ اللّٰہَ لَا یُحِبُّ کُلَّ خَوَّانٍ کَفُوْرٍ (۲۲/۳۸) - خَوَّانٌ ہر ایسے شخص کو کہہ سکتے ہیں جس پر اعتماد اور بھروسہ نہ کیا جا سکے، اور وہ دشمن بھی جو تمہاری حالت میں خرابی پیدا کر دینے کی کوشش کرے- نیز بڑا خائن- قرآن کریم نگاہ کی خیانت تک سے منع کرتا ہے (۴۰/۱۹) -

سورۃ بقرہ میں ہے اَنَّکُمْ کُنْتُمْ تَخْتَانُوْنَ اَنْفُسَکُمْ (۲/۱۸۷) راغب نے لکھا ہے کہ اِخْتِیَانٌ سے مراد خیانت کا ارادہ یا تیاری کرنا ہے**- لہذا دوسروں سے تو ایک طرف، خود اپنی ذات سے بھی خیانت نہیں کرنی چاہئے - بلکہ خیانت کا خیال تک بھی دل میں نہیں لانا چاہئے - سب سے بڑا جرم خود اپنے آپ سے خیانت کرنا ہے - یعنی جن امور کو تم صحیح اور سچا مانتے ہو ان کے خلاف عمل کرنا (خواہ اس کا علم کسی دوسرے کو ہو یا نہ ہو) - یہ انسانی خودی کی کمزوری کی دلیل، بلکہ (Dual Personality) کی علامت ہے - یعنی اُن باتوں کو ماننے والا کوئی اور ہوتا ہے اور ان کے خلاف کام کرنے والا کوئی اور- قرآن کریم اس سے روکتا ہے .

سورۃ نساء میں ہے اَلَّذِیْنَ یَخْتَانُوْنَ اَنْفُسَهُمْ (۴/۱۰۷) جو لوگ آپس میں ایک دوسرے کو دھوکا دینے کا ارادہ کرتے ہیں - سورۃ انفال میں ہے کہ تم نہ تو نظام خداوندی کے خلاف سازش کرو- (لَا تَخُوْنُوْا) - اور نہ ہی ان امور میں کسی قسم کی خیانت کرو جو تمہارے سپرد کئے جائیں (۸/۲۸) -

خ و ی

خَوَتِ الدَّارُ - گھر ویران ہو کر گر پڑا - ابن فارس نے اس کے بنیادی معنوں میں خالی ہونا اور گرنا لکھے ہیں- اَرْضٌ خَاوِیَةٌ - ویران زمین* - اَلْخَوَاءُ کے معنے خالی ہونے کے ہیں**- خَوِیَ الْمَکَانُ - جگہ خالی ہوئی***-

---

* تاج - ** راغب - *** محیط -

سورۃ بقرہ میں ایک بستی کے متعلق ہے وَهِيَ خَاوِيَةٌ عَلٰى عُرُوْشِهَا (۲/۲۵۹) - برباد اور ویران' جسکے مکانات گر پڑے تھے - یا اس کے مکان؛ باوجود چھتوں کے قائم ہونے کے خالی تھے - سورۃ الحاقہ میں ہے أَعْجَازُ نَخْلٍ خَاوِيَةٍ (۶۹/۷) اندر سے کھوکھلے ہو کر گر پڑنے والے کھجور کے تنے - تباہ و برباد -

خ ی ب

خَابَ - يَخِيْبُ - خَيْبَةٌ - محروم رہ جانا - نقصان اٹھانا - مایوس ہو جانا - نامراد رہ جانا* - توقعات کا منقطع ہو جانا - مطلوبہ کو حاصل نہ کر سکنا - محتاج و فقیر ہو جانا** - اَلْخَيَّابُ اس چقماق کو کہتے ہیں جس سے آگ نہ نکلے - (ابن فارس) قرآن میں ہے فَيَنْقَلِبُوْا خَائِبِيْنَ (۳/۱۲۶) - ''وہ خاسر و نامراد واپس ہو جائیں،، - قرآن کریم میں خَابَ کا لفظ اَفْلَحَ کے مقابلہ میں آیا ہے - اَفْلَحَ کے معنے ہیں کھیتیوں کا پروان چڑھنا ثمر بار ہونا - لہٰذا خَابَ کے معنے ہونگے، بے ثمر رہ جانا - قَدْ اَفْلَحَ مَنْ زَكّٰهَا - وَقَدْ خَابَ مَنْ دَسّٰهَا (۹۱/۹-۱۰) جسنے انسانی ذات (نفس - Self) کی نشو و نما کی، اسکی زندگی کی کھیتی پروان چڑھ گئی - جسنے اسے دبائے رکھا اور ابھرنے نہ دیا اسکی کشت حیات ویران ہو گئی - اس کا شعلہ' زندگی افسردہ ہو گیا - ایسے چقماق کی مانند ہو گیا جس سے چنگاری نہ نکلے - اسی لئے سورۃ ابراہیم میں خَابَ کی تفسیر هَلَكَ سے کر دی گئی ہے - تباہی اور بربادی (۱۴/۱۳-۱۵) - اسمیں اس زندگی کی بربادی بھی شامل ہے (بلکہ یہ تو سب سے پہلے سامنے آ جاتی ہے اسلئے انسانی ذات (Self) کی نشو و نما کا لازمی نتیجہ اس دنیا کی خوشگواریاں کا حاصل ہو جانا بھی ہے - ترک دنیا سے ''روحانی ترقی،، کا خیال غیر قرآنی ہے - انسانی ترقی تسخیر کائنات سے ہوتی ہے - وہ زندگی جس میں شعلہ نہ ہو، راکھ کا ڈھیر ہے -

خ ی ر

اَلْخَيْرُ - ہر ایسی چیز کو کہتے ہیں جو سب کو مرغوب ہو - نیز مفید چیز - یہ الشَّرُّ کی ضد ہے - اَلْخَيْرُ ، ہر قسم کے مال کو کہتے ہیں - ہرب گھوڑوں کو بھی ان کی افادیت کے اعتبار سے خَيْرٌ کہتے تھے (۳۸/۳۲) - خَيْرَاتٌ - خوبصورت و خوش اخلاق عورتوں کو کہتے ہیں* - (یا جن میں بہت سی

*تاج - **محیط -

خوبیاں ہوں ۔ خوبصورتی بھی ایک خوبی ہے) ۔ خَیَارٌ کے معنے اختیار کے ہیں ۔ یعنے اس امر کا اختیار کہ جس چیز کو چاہے لے لے اور جسے چاہے چھوڑ دے (Choice) ۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی میلان اور جھکاؤ کے ہیں ۔ اَنْتَ بِالْخَیَارِ ۔ تمہیں حسب مرضی کام کرنے کا اختیار ہے ۔ خَیَّرَہٗ بَیْنَ الشَّیْئَیْنِ ۔ اس نے اُسے اختیار دے دیا کہ وہ دو چیزوں میں سے جسے چاہے لے لے* ۔ اِسْتِخَارَۃٌ کے معنے ہیں دو باتوں میں سے بہتر کو طلب کرنا* ۔ چونکہ دو چیزوں میں سے جسے اختیار کیا جاتا ہے وہ بہرحال دوسری چیز سے بہتر ہوتی ہے (یا اُسے ایسا سمجھا جاتا ہے) اس لئے خَیْرٌ کا لفظ شرف و برتری ، فضیلت و کرم کے لئے بھی استعمال ہوتا ہے ۔ ھُوَ خَیْرٌ مِنْکَ ۔ وہ تم سے بہتر ہے، یہ افعل التفضیل ہے ۔ خَارَ الرَّجُلَ عَلٰی غَیْرِہٖ وَ خَیَّرَہٗ تَخْیِیْرًا ۔ اس نے آدمی کو دوسرے لوگوں پر فضیلت اور ترجیح دی ۔ اِخْتَرْتُہٗ عَلَیْہِمْ ۔ میں نے اسے ان سب پر فضیلت دے دی ۔ خَارَہٗ ۔ اُس کو چن لیا ، منتخب کرلیا ۔ اَلْخِیَارُ ۔ ککڑی کو کہتے ہیں* ۔

قرآن کریم میں خَیْرٌ کا لفظ مال و دولت کے معنوں میں متعدد جگہ آیا ہے ۔ (مثلاً ۲/۱۸۰ و ۲/۲۷۲) ۔ اَدْنیٰ کے مقابلہ میں خَیْرٌ (۲/۶۱) میں آیا ہے ۔ مِثْلٌ ۔ کسی چیز کے مانند ۔ اور خَیْرٌ ۔ اس سے بہتر (۲/۱۰۶) ۔ سورۃ انعام میں یہ لفظ ضُرٌّ کے مقابلہ میں آیا ہے (۶/۱۷) ۔ سورۃ حج میں فِتْنَۃٌ کے مقابلہ میں (۲۲/۱۱) اور سورۃ بقرہ میں شَرٌّ کے مقابلہ میں (۲/۲۱۶) ۔ سورۃ نحل میں یہ لفظ ہر اچھی بات یا اچھے کام کے لئے آیا ہے (۱۶/۷۶) ۔ سورۃ آل عمران میں اللہ تعالیٰ کے متعلق ہے بِیَدِکَ الْخَیْرُ (۳/۲۵) ۔ اس میں اختیارات و اقتدارات اور ہر قسم کی بھلائیوں کا تصور موجود ہے ۔ سورۃ احزاب میں خِیَرَۃٌ کا لفظ اختیار و انتخاب کے معنوں میں آیا ہے (۳۳/۳۶) ۔ کائنات میں جو انتخاب طبعی (Natural Selection) کا عمل جاری ہے اس کے لئے یَخْتَارُ کا لفظ آیا ہے (۲۸/۶۸) ۔ سورۃ طٰہٰ میں حضرت موسیٰؑ کے متعلق فرمایا وَ اَنَا اخْتَرْتُکَ (۲۰/۱۳) ۔ میں نے تجھے (ایک مقصد عظیم کے لئے) چن لیا ہے ۔ منتخب کر لیا ہے ۔ سورۃ ص میں حضرات انبیاء کرامؑ کے لئے اَخْیَارٌ کا لفظ آیا ہے (۳۸/۴۷) ۔ یعنے منتخب افراد ۔ ابن فارس نے کہا ہے قَوْمٌ خِیَارٌ اور اَخْیَارٌ کے معنی ہیں بہت سی صلاحیتوں کی مالک قوم ۔

* تاج ۔

(۵۵/۷۰) میں خَیْرٰتٌ حِسَانٌ۔ متناسب الاعضاء اور معتدل سیرت و کردار رکھنےوالی عورتوں کے لئے آیا ہے، یا متوازن اور عمدہ خوشگوار اشیاء کے لئے۔

چونکہ زندگی کی تمام خوشگواریاں اور اختیارات و اقتدارات کی وسعتیں قوانین خداوندی کی رو سے حاصل ہوتی ہیں اس لئے وحی کے لئے بھی خَیْرٌ کی جامع اصطلاح آئی ہے (۲/۱۰۵)۔ لہذا مومنین کی زندگی یہ ہے کہ انہیں وحی کے اتباع سے ساری دنیا کی مفید اور حسین چیزیں میسر ہوں اور ان کے اختیارات کی وسعتیں حدود فراموش ہوں۔ یہ ہے خَیْرٌ جو قوانین خداوندی کی اطاعت کا لازمی نتیجہ ہے۔ اسی لئےسورۃ نحل میں ہے کہ جب مومنین سے ان کے مخالفین سوال کرتے ہیں کہ ہمیں بتاؤ تو سہی کہ تمہارے رب نے تمہارے لئے کیا نازل کیا ہے تو وہ اس کے جواب میں ایک جامع لفظ کہہ دیتے ہیں۔ قَالُوْا خَیْرًا (۱۶/۳۰)۔ یعنی تمام دنیا کی خوشگواریاں اور خوشحالیاں اور اختیارات کی وسعتیں۔ اس کی تفسیر اگلے الفاظ نے یہ کہکر کر دی ہے کہ فِیْ هٰذِهِ الدُّنْیَا حَسَنَةٌ وَلَدَارُ الْاٰخِرَةِ خَیْرٌ (۱۶/۳۰) اس دنیا میں بھی ہر قسم کی خوشگواریاں، اور مستقبل کی زندگی میں بھی خوشگواریاں۔ لہذا ہر وہ عمل جس کا نتیجہ حال اور مستقبل (دنیا اور آخرت) کی خوشگواریاں ہوں، خیر ہےاور جس کا نتیجہ اس کےبرعکس ہو وہ شر ہے۔ خوشگواریوں میں انسانی ذات (Personality) کی نشو و نما (Development) سب سے مقدم ہے۔ بلکہ یوں کہئیے کہ خوشگوار کہتے ہی انہے ہیں جس سے انسانی ذات کی نشو و نما ہو۔ جس سے اس کی نشو و نما رک جائے وہ شر ہے۔ قرآن کریم ایسا پروگرام دیتا ہے جس کا نتیجہ اس قسم کی خوشگواریاں ہوتا ہے۔ اسے وہ اعمال صالحہ سے تعبیر کرتا ہے۔ یعنی ایسے اعمال جن سے انسانی ذات کی صلاحیتیں بیدار ہوں اور معاشرہ میں ہمواریاں پیدا ہوں۔ (دیکھئے عنوان ص۔ل۔ح)

سورۃ بقرہ میں حج کے سلسلہ میں کہا گیا ہے وَ تَزَوَّدُوْا فَاِنَّ خَیْرَ الزَّادِ التَّقْوٰی (۲/۱۹۷)۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ تم حج کے لئے زاد راہ ضرور لیا کرو۔ اس زادِ راہ کا فائدہ یہ ہوگا کہ تم وہاں بھیک مانگنے سے بچے رہوگے۔ (یہاں خَیْرٌ کے معنی فائدے کے ہیں اور تقوٰی کے معنی محتاجی کی ذلّت سے محفوظ رہنے کے۔)

خ ی ط

اَلْخَیْطُ۔ دھاگہ۔ لڑی*۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی کسی چیز کے باریکی کےساتھ دراز ہونے کے ہیں۔ اَلْخِیَاطُ۔ اَلْمِخْیَطُ

* تاج۔

سوئی*۔ فِی سَمِّ الْخِیَاطِ: سوئی کے ناکہ میں (۷/۴۰)۔ خَاطَ الثَّوْبَ۔ کپڑے کے ایک حصے کو دوسرے حصے کے ساتھ سی دینا**۔ خَیَّاطٌ۔ درزی*۔

قرآن کریم میں روزوں کے احکام کے سلسلہ میں اَلْخَیْطُ الْاَبْیَضُ وَ الْخَیْطُ الْاَسْوَدُ آیا ہے (۲/۱۸۷) یعنے سفید دھاگہ اور سیاہ دھاگہ۔ اس سے مراد ہے صبح کی پھٹنے والی روشنی اور رات کی تاریکی*۔ اس سے ظاہر ہے کہ قرآن کریم میں ہر جگہ لفظی معنے نہیں لئے جاتے بلکہ مفہوم کے اعتبار سے مطلب لیا جاتا ہے۔ اسی بنا پر لطائف اللغۃ میں اَلْخَیْطُ الْاَبْیَضُ کے معنی اَلنُّوْرُ (روشنی) کئے گئے ہیں۔

اَلْخَیْطُ۔ رنگ کو بھی کہتے ہیں*۔ اور جماعت کو بھی*۔

خ ی ل

خَالَ۔ یَخَالُ۔ گمان کرنا۔ خیال کرنا۔ خَیَّلَ۔ اندازہ سے معلوم کرنا اور تاڑنا۔ خُیِّلَ اِلَیْہِ اَنَّہٗ کَذَا۔ اس کے وہم میں کوئی چیز ایسی معلوم ہوئی۔ یعنی کوئی چیز جو درحقیقت ایسی نہ ہو لیکن یونہی متخیلہ میں ایسی دکھائی دے۔ چنانچہ اَلسَّحَابَۃُ اَلْمُخَیِّلَۃُ اس بادل کو کہتے ہیں جسے تم دیکھنے پر برستا ہوا خیال کرو۔ اَلْخَیَالُ (Scare - Crow) کو بھی کہتے ہیں۔ یعنے دو لکڑیوں کے اوپر سیاہ رنگ کا کپڑا ڈال کر اسے آدمی کی شکل دیتے ہیں اور کھیت میں کھڑا کر دیتے ہیں تاکہ جانور اسے آدمی سمجھ کر کھیت کے قریب نہ آئیں*۔ انہی معانی کے لحاظ سے سورہ طٰہٰ میں ساحرین دربار فرعون کے متعلق ہے کہ انہوں نے رسیوں کو پھینکا تو یُخَیَّلُ اِلَیْہِ مِنْ سِحْرِہِمْ اَنَّہَا تَسْعٰی (۲۰/۶۶) "ان کی نگاہ بندی کی وجہ سے حضرت موسیٰؑ کے ذہن میں ایسا خیال پیدا ہوا گویا وہ دوڑ رہی ہیں"۔ یعنے وہ درحقیقت دوڑ نہیں رہی تھیں لیکن ایسا معلوم ہوتا تھا گویا وہ متحرک ہیں۔ آپ غور کیجئے کہ قرآن نے سحر (Magic) کے متعلق کتنی بڑی حقیقت کا انکشاف کیا ہے۔ اس نے کہا یہ ہے کہ سحر کے زور سے اشیاء کی ماہیت میں کوئی تبدیلی واقع نہیں ہوتی۔ صرف دیکھنے والے کے خیال میں تبدیلی واقع ہوتی ہے جس سے اسے وہ اشیاء ایسی نظر آنے لگ جاتی ہیں، یعنی اس کا اثر محض نفسیاتی ہوتا ہے۔

---

* تاج۔ ** محیط۔

لیکن یہ مفہوم اسی صورت میں لیا جائیگا جب دربار فرعون کے منتریوں کی ''رسیوں اور لاٹھیوں'' کو حقیقی معنوں میں لیا جائے ۔ اگر ان کے مجازی معنے لئے جائیں تو پھر مطلب اور ہوگا ۔ تفصیل ان امور کی اپنے اپنے مقام پر ملیگی ۔ (نیز دیکھئے عنوان س ۔ ح ۔ ر)

اسی سے خُیَلَاءُ کے معنے ہیں ایسا غرور جو انسان اپنے اندر یونہی کسی ذہنی بڑائی کی بناء پر پیدا کرلے ۔ یعنے وہ بڑائی در حقیقت اس میں موجود نہ ہو لیکن وہ خود فریبی سے ایسا سمجھ لے کہ اس میں وہ بڑائی ہے اور پھر اس پر فخر کرنے لگ جائے ۔ ایسا کرنے والے کو مُخْتَالٌ کہتے ہیں**۔ (۳۱/۱۸) یعنے خود فریبی میں مبتلا ۔

ابن فارس نے کہا ہے کہ اس مادہ کے بنیادی معنی ایسی حرکت کے ہیں جس میں تلون بھی شامل ہو ۔ خَیَالٌ اسی سے ہے ۔ خَیَالٌ درحقیقت اس چیز کو کہتے ہیں جسے انسان خواب میں دیکھے ۔ ایک تو خواب میں ہر شے متلون ہوتی ہے ۔ ابھی کچھ ابھی کچھ ۔ دوسرے انسان سمجھتا یہ ہے کہ جو کچھ وہ دیکھ رہا ہے وہ فی الواقعہ ایسا ہے ۔ حالانکہ اسکی حقیقت کچھ نہیں ہوتی ۔ اس سے اس آیت کا مفہوم اور بھی واضح ہوجاتا ہے جس میں ساحرین کی سحرطرازی کا ذکر ہے (اور جو اوپر درج کی جا چکی ہے ۔ یعنی (۲۰/۶۶) ۔

راغب نے کہا ہے کہ اسی سے لفظ خَیْلٌ (۳/۱۳) ہے (یعنے گھوڑے یا گھڑ سواروں کا دستہ ۔ (۱۶/۸)) کیونکہ گھوڑا بھی اپنی رفتار میں اٹھلاتا ہوا چلتا ہے ۔ اور گھڑ سوار کے دل میں بھی ایک عجیب قسم کا تکبر سا ہوتا ہے*۔

خ ی م

تَخْیِیْمٌ کے معنے ہوتے ہیں خیمے نصب کر کے قیام کرنا ۔ عرب اپنے قیام کیلئے جو عارضی سا گھر بنا لیتے تھے اسے خَیْمَةٌ کہتے تھے ۔ اسکی ساخت کے متعلق بہت سے اقوال ہیں لیکن عام طور پر یہی کہا جاتا ہے کہ چار لکڑیاں کھڑی کر کے ان پر درختوں (جھاؤ وغیرہ) کے پتے ڈال دئے جاتے تھے ۔ اسے خَیْمَةٌ کہتے تھے ۔ جو خیمہ کپڑے سے بنایا جاتا تھا اسے مِظَلَّةٌ کہتے تھے ۔ خَیَّمَ الشَّیْئَ کے معنے ہیں اُسنے کسی چیز کو دوسری چیز سے ڈھانپ دیا*** ۔ خَیْمَةٌ کی جمع خِیَامٌ ہے ۔ یہ لفظ (۵۵/۷۲) میں آیا ہے ۔ حُوْرٌ مَّقْصُوْرَاتٌ فِی الْخِیَامِ ۔

*تاج ۔ **لین ۔ ***تاج و محیط ۔

د

د أ ب

اَلدَّأْبُ - اَلدَّاَبُ - (کسی کام میں) مسلسل لگے رہنا - لگا تار کوشش کرتے رہنا - تسلسل اور مداومت کی وجہ سے اسکے معنے عادت مستمرہ یا حالت، دستور، طور طریق کے ہو گئے* - دَاَبَ فُلَانٌ* - اس شخص نے لگا تار کوشش کی، تھکا اور مصروف عمل رہا**- کتاب الاشتقاق میں بھی یہی کہا گیا ہے کہ دَأْبٌ اس کام کے لئے بولتے ہیں جو مسلسل، بلا انقطاع کیا جائے - ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی مداومت کے ہیں -

سورۃ آل عمران میں ہے کَدَاْبِ اٰلِ فِرْعَوْنَ (۳/۱۰) - قوم فرعون کی روش کے مطابق - سورۃ یوسف میں دَاَبًا (۱۲/۴۷) کے معنے ہیں، بہت زیادہ محنت اور کوشش کے ساتھ مسلسل- سورۃ ابراہیم میں ہے وَالشَّمْسَ وَ الْقَمَرَ دَائِبَيْنِ (۱۴/۳۳) - سورج اور چاند مسلسل اپنی رفتار کے مطابق چلتے رہتے ہیں - وہ اپنے فریضہ کی سر انجام دھی میں مسلسل مصروف ہیں -

داؤد علیہ السلام

قرآن کریم نے بتایا ہے کہ آپ حضرت ابراہیم؏ کی ذریت (نسل) میں سے تھے- وَمِنْ ذُرِّيَّتِهٖ دَاوٗدَ (۶/۸۴)- اللہ نے انہیں ایک کتاب (زَبُوْرًا - ۴/۱۶۳) دی تھی - (واضح رہے کہ زَبُوْرًا کے معنی ’’ایک کتاب،، ہیں - لیکن سورۃ انبیاء میں اَلزَّبُوْرُ بھی آیا ہے - ۲۱/۱۰۵ - جس کے معنے خاص کتاب کے ہیں - ہوسکتا ہے کہ یہ حضرت داؤد؏ پر نازل شدہ کتاب کا نام ہو) آپ کو علم کی فراوانی عطا کی گئی تھی (۲۷/۱۵) اور محکم سلطنت (۳۸/۲۰) - تا کہ آپ لوگوں میں حق کے ساتھ حکومت کریں (۳۸/۲۶)- پہاڑی قبائل کے بڑے بڑے سردار آپ کے مطیع و فرمان پذیر تھےاور آپ کے پروگرام کی تکمیل میں سرگرم عمل رہتے تھے (۳۸/۱۸) - نیز قبیلۂ طیر کے خانہ بدوش افراد بھی جن سے نہ صرف

*راغب - **تاج و محیط و اقرب الموارد -

وسالے (گھوڑوں کے لشکر) مرتب ہوئے تھے (۳۸/۱۹) - آپ نے اس سے قبل بنی اسرائیل کے لشکر کے ساتھ جالوت کے لشکر کو شکست دی تھی اور جالوت کو قتل بھی کیا تھا (۲/۲۵۱) - معلوم ہوتا ہے کہ لڑائیوں میں پہننے کا لباس (زرہ بکتر) آپ کی ایجاد تھی یا آپ کو اس میں خصوصی ملکہ حاصل تھا (۲۱/۸۰) - آپ کا زمانہ اندازاً ۱۰۰۰ ق - م - سمجھنا چاہئے - کہتے ہیں کہ حضرت داؤد بڑے خوش آواز تھے - وہ پہلے شخص ہیں جنہوں نے عبرانی موسیقی مدون کی اور مصری اور بابلی مزامیر (مازوں) کو ترقی دے کر نئے نئے آلاتِ موسیقی ایجاد کئے - جب وہ پہاڑوں پر بیٹھ کر اپنا بربط بجاتے تھے تو شجر و حجر جھومنے لگ جاتے تھے - تورات اور ہماری تفسیری روایات سے اس کی تائید ہوتی ہے**۔

د ب ب

دَبَّ النَّمْلُ يَدِبُّ دَبًّا - خاموشی کے ساتھ آہستہ آہستہ چلنا۔ اس سے دَبَّ الشَّرَابُ فِي الْجِسْمِ کہتے ہیں - یعنی شراب کا جسم میں آہستہ آہستہ سرایت کر جانا - اَلدَّابَّةُ ہر اس چیز کو کہتے ہیں جو زمین پر چلے - ہر رینگنے اور چلنے والا جاندار* - الدِّبَّةُ - آہستہ رفتار - ابن فارس نے کہا ہے کہ یہ اس رفتار کو کہتے ہیں جو مَشْيٌ سے خفیف ہوتی ہے -

اَلدَّبَّابَةُ - کھالوں اور لکڑیوں سے بنائی ہوئی ایک بہت بڑی سی محفوظ گاڑی جس میں بیٹھ کر سپاہی قلعہ کی دیوار تک پہنچ جاتے تھے تاکہ اسے توڑ سکیں* - (آجکل ٹینک کو دَبَّابَةٌ کہتے ہیں) - یہ آہستہ آہستہ چلتی تھی اور اس میں بیٹھنے والا دشمن کی زد سے محفوظ رہتا تھا - اَلدَّبْدَبَةُ - سخت زمین پر چلنے سے قدموں کی آواز - نیز شور - ڈھول بجانا اور ڈھول کی آواز کو بھی کہتے ہیں* -

[قاعدہ کے مطابق اس لفظ کو دب دب کے عنوان کے تحت آنا چاہئے لیکن چونکہ اسے محض ضمنی طور پر لکھا گیا ہے اور قرآن میں یہ لفظ نہیں آیا اس لئے اسے الگ لکھنے کی ضرورت نہیں محسوس کی گئی -]

قرآن کریم میں دَابَّةٌ کا لفظ ، رینگنے والے جانور ، دو پاؤں پر چلنے والے اور چار پاؤں پر چلنے والے جانور ، سب کے لئے آیا ہے - (۲۴/۴۵) - دَابَّةٌ کی جمع دَوَابُّ ہے - سورۃ حج میں یہ لفظ انسانوں کے علاوہ باقی ذی حیات کے لئے آیا ہے (۲۲/۱۸) - سورۃ فاطر میں یہ لفظ انسانوں اور مویشیوں کے علاوہ دیگر ذی حیات کے لئے آیا ہے - (۳۵/۲۸) - سورۃ نحل میں ہے لَوْ يُؤَاخِذُ اللّٰهُ النَّاسَ بِظُلْمِهِمْ مَا تَرَكَ عَلَيْهَا مِنْ دَابَّةٍ (۱۶/۶۱) نیز

*تاج - نیز لطائف اللغۃ - **ترجمان القرآن (ابوالکلام آزاد - جلد دوم صفحہ ۴۸۰)

(۳۵/۴۵) ۔ ''اگر اللہ لوگوں کے ظلم کی وجہ سے ، ان کی (فوری) گرفت کرتا تو زمین پر کوئی دابۃ نہ چھوڑتا'' ۔ اس سے مترشح ہوتا ہے کہ یہاں ''دابۃ'' کا لفظ خود انسانوں کے لئے آیا ہے کیونکہ انسانوں کے غلط اعمال کی وجہ سے انسانوں کو ہلاک ہونا چاہئے ، نہ کہ دیگر مخلوقات کو بھی ۔ لیکن اگر اس کے مفہوم کی وسعت کو دیکھا جائے تو اس سے مراد ، انسان اور دیگر ذی حیات بھی ہو سکتے ہیں ۔ سورۃ انفال میں ، عقل و خرد سے کام نہ لینے والے انسانوں کو شَرَّ الدَّوَآبِّ (۸/۲۲) کہا گیا ہے ۔ یعنی چلنے والے جانوروں (یا ذی حیات) میں سب سے زیادہ بدتر ۔ یعنی حیوانات سے بھی زیادہ راہ گم کردہ ۔ (۷/۱۷۹) ۔

سورۃ النمل میں ہے وَإِذَا وَقَعَ الْقَوْلُ عَلَيْهِمْ أَخْرَجْنَا لَهُمْ دَابَّةً مِّنَ الْأَرْضِ تُكَلِّمُهُمْ (۲۷/۸۲) ۔ راغب نے لکھا ہے کہ اس سے مراد وہ شریر لوگ ہیں جو جہالت میں جانوروں کی طرح ہیں ۔ اس طرح یہ لفظ جمع ہو جائیگا* ۔ لیکن جب قرآن نے دَابَّةً کا لفظ انسانوں کیلئے بھی استعمال کیا ہے تو پھر ان شریر انسانوں کی جانوروں کے ساتھ مماثلت کی بھی ضرورت نہیں رہتی ۔ اس سے مراد جنگجو قومیں ہونگی ۔ اسکی وضاحت تُكَلِّمُهُمْ نے بھی کر دی ہے جسکے معنے زخمی کرنے کے ہیں ۔ لیکن اگر تُكَلِّمُهُمْ کے معنی بات کرنے کے بھی لئے جائیں تو بھی دَابَّةً کے مندرجہ بالا مفہوم پر کوئی اثر نہیں پڑتا ۔ (دیکھئے عنوان ک ۔ ل ۔ م) ۔ سورۃ سبا میں حضرت سلیمانؑ کے نالائق (جانشین بیٹے) کیلئے یہ لفظ آیا ہے (۳۴/۱۴) ۔ یعنی وہ انسان نہیں تھا، محض حرکت کرنے والا پیکر تھا ۔ (تفصیل سلیمانؑ کے عنوان میں ملیگی) سورۃ ہود میں ہے وَمَا مِنْ دَآبَّةٍ فِي الْأَرْضِ إِلَّا عَلَى اللَّهِ رِزْقُهَا (۱۱/۶) ۔ ''اس زمین میں کوئی دَابَّةً ایسا نہیں جس کے رزق کی ذمہ داری اللہ پر نہو'' ۔ دَابَّةً سے مراد خواہ تمام حیوانات (انسان سمیت) ہوں یا صرف انسان، ان سب کے رزق کی ذمہ داری اللہ پر ہے ۔ یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر ان کے رزق کی ذمہ داری خدا پر ہے تو پھر دنیا میں لوگ بھوک سے کیوں مرتے ہیں ؟ ایک ایک قحط میں مرنے والوں کی تعداد لاکھوں تک پہنچ جاتی ہے ۔ اور عام حالات میں بھی کروڑوں انسان ایسے ہیں جنہیں پیٹ بھر کر کھانے کو نہیں ملتا ۔ اگر انکے رزق کی ذمہ داری خدا پر ہے تو وہ ذمہ داری پوری کیوں نہیں ہوتی؟ یہ سوال بڑا اہم ہے اور نہایت غور طلب ۔ (جیسا کہ میں

*تاج ۔

نے اپنی کتاب ''نظام ربوبیت'' میں تفصیل سے لکھا ہے) ایسے مقامات میں اللہ کی ذمہ داری اس نظام کی وساطت سے پوری ہوتی ہے جو قوانین خداوندی کے مطابق متشکل ہوتا ہے ۔ یعنی یہ نظام ان تمام ذمہ داریوں کو اپنے اوپر لے لیتا ہے جنکی نسبت (قرآن میں) اللہ کی طرف کی گئی ہے اوراسی طرح وہ حقوق و واجبات بھی، اسکی طرف منتقل ہو جاتے ہیں جنہیں خدا کے حقوق کہا جاتا ہے ۔ اس صورت میں خدا کی اطاعت اس نظام کی رو سے کی جاتی ہے جو خدا کے احکام کو نافذ کرتا ہے۔ اور عَلَى اللهِ رِزْقُهَا کے معنے یہ ہو جاتے ہیں کہ ان تمام انسانوں کے رزق کی ذمہ داری اس نظام کے سر پر عائد ہو جاتی ہے ۔ لہذا نظام خداوندی میں تمام افراد کی ضروریات زندگی کا بہم پہنچانا اس نظام کےذمہ ہوتا ہے ۔ رزق کے سر چشمے اصلاً اس نظام کی تحویل میں بطور امانت رہتے ہیں اور وہ نظام خدا کے دئیے ہوئےرزق کی تقسیم اسطرح کرتا ہے کہ کوئی متنفس اس سے محروم نہیں رہنے پاتا ۔ اسطرح خدا کی ذمہ داریاں خود بخود پوری ہوتی رہتی ہیں ۔ لیکن جب وہ نظام قائم نہ ہو تو مستبد قوتیں رزق کے سر چشموں پر قابض ہو جاتی ہیں اور کمزور انسان ان کے رحم و کرم پر زندگی بسر کرتے ہیں ۔ وہ جسے چاہتے ہیں رزق دیتے ہیں اور جتنا چاہتے ہیں دیتے ہیں ۔ آسمانی انقلاب ، رزق کے سر چشموں کو ان کے ہاتھ سے چھین کر، انسانیت کی پرورش کے لئے نظام خداوندی کی تحویل میں دیدیتا ہے ۔

سورۃ شوریٰ میں ہے وَمِنْ اٰيٰتِهٖ خَلْقُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَا بَثَّ فِيْهِمَا مِنْ دَآبَّةٍ ۔ وَهُوَ عَلٰى جَمْعِهِمْ اِذَا يَشَآءُ قَدِيْرٌ ($\frac{42}{29}$) ۔ ''اور اللہ کی نشانیوں میں سے یہ بھی ہے کہ اس نے ارض وسمٰوٰت، زمین اور فضائی کروں، کو پیدا کیا اور (جو) ان کے اندر اس نے ذی حیات (دابۃ) پھیلا دئیے ہیں ۔ اور وہ اپنے قانون مشیت کے مطابق انہیں جمع کرنے پر قادر ہے'' ۔ اس آیت سے آسمانی کروں میں ذی حیات آبادی کا سراغ ملتا ہے۔ نیز، اب غالباً وہ زمانہ قریب آ رہا ہے جب زمین کی آبادی، آسمانی کروں کی آبادی کے ساتھ مل جائے (دونوں جمع ہو جائیں) ۔ قرآن نے انسان کے متعلق واضح الفاظ میں کہہ رکھا ہے کہ ارض وسمٰوات میں جو کچھ ہے وہ اس کے لئے تابع تسخیر کر دیا گیا ہے ۔ اس لئے اسکی یہ کوشش کہ آسمانی کروں تک جا پہنچے، قرآنی تعلیم کے مطابق ہے ۔ ان کروں میں سے جن میں آبادی ہوگی وہ اسطرح زمین کی آبادی کے ساتھ مل جائیگی ۔ دیکھا آپ نے کہ انفس و آفاق کی نشانیاں کسطرح قرآنی حقائق کی صداقت کا ثبوت بہم پہنچائے چلی جا رہی ہیں ؟ ($\frac{41}{53}$)۔

د ب ر

اَلدُّبُرُ ۔ اَلدُّبْرُ ۔ ہر شے کا پچھلا حصہ۔ بات کا انجام، نیز اس کے معنے پشت اور مقعد کے بھی کئے گئے ہیں۔ ابن فارس نے بھی اس کے بنیادی معنے کسی چیز کا آخری اور پچھلا حصہ بتائے ہیں۔ جمع اَدْبَارٌ ۔ سورۃ قمر میں ہے یُوَلُّوْنَ الدُّبُرَ (۵۴/۴۵)۔ وہ پیٹھ پھیر دینگے۔ سورۃ یوسف میں ہے مِنْ دُبُرٍ (۱۲/۲۵)۔ پیچھے سے۔ سورۃ نمل میں ہے وَلّٰی مُدْبِرًا (۲۷/۱۰)۔ وہ پیٹھ پھیر کر بھاگا۔

اِدْبَارٌ ۔ پیچھے ہٹنا، آخری وقت۔ اِدْبَارَ النُّجُوْمِ (۵۲/۴۹)۔ آخر شب میں ستاروں کے ڈوبنے کا وقت* ۔ ستاروں کا پیچھے ہٹنا۔

اَلدَّابِرُ ۔ ہر چیز کا آخر۔ اصل و بنیاد*۔ فَقُطِعَ دَابِرُ الْقَوْمِ (۶/۴۵)۔ اس قوم کا آخری آدمی تک بھی ہلاک ہو گیا۔ اسکی جڑ کٹ گئی۔ اَلتَّدْبِیْرُ ۔ اَلتَّدَبُّرُ ۔ کسی معاملہ کے انجام پر نظر رکھتے ہوئے اس میں غور و فکر کرنا۔ آخری منزل (مقام تکمیل) کو سامنے رکھکر نظم و نسق کرنا۔ یُدَبِّرُ الْاَمْرَ (۳۲/۵)۔ وہ تدبیر امور کرتا ہے۔ اَفَلَا یَتَدَبَّرُوْنَ الْقُرْاٰنَ (۴/۸۲) "کیا یہ اس پر غور و فکر نہیں کرتے کہ قرآن کیا کہتا ہے" اور کاروان انسانیت کو کس منزل کی طرف لیجاتا ہے۔ سورۃ ص میں ہے لِیَدَّبَّرُوْا اٰیٰتِهٖ (۳۸/۲۹)۔ تاکہ وہ اس کی آیات پر غور کریں۔

اَلْمُدَبِّرٰتِ اَمْرًا (۷۹/۵)۔ معاملات کو تکمیل تک پہنچانے والے۔ تدبیر امور کرنے والے۔

سورۃ ق میں ہے فَاصْبِرْ عَلٰی مَا یَقُوْلُوْنَ وَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ قَبْلَ طُلُوْعِ الشَّمْسِ وَقَبْلَ الْغُرُوْبِ ۔ وَمِنَ الَّیْلِ فَسَبِّحْهُ وَاَدْبَارَ السُّجُوْدِ (۵۰/۳۹-۴۰)۔ رسول اللہ ؐ سے کہا گیا ہے کہ تمہارے مخالفین جو کچھ کہتے ہیں اس سے مضطرب و بیچین نہ ہو۔ اور خدا کی ربوبیت کو مظہر حمد و ستائش بنانے کے لئے سرگرم عمل رہو۔ طلوع شمس اور غروب شمس سے پہلے۔ اور رات میں بھی اس کے پروگرام کی تکمیل کے لئے جد و جہد کرو۔ اور اَدْبَارَ السُّجُوْدِ میں بھی۔ سورۃ طور کے اخیر میں بھی یہی مضمون قریب قریب انہی الفاظ میں آیا ہے۔ لیکن وہاں اِدْبَارَ النُّجُوْمِ ہے۔ اس کے معنی ستاروں کے ڈوبنے یا پیچھے ہٹنے کے ہیں۔ لیکن سورۃ

*تاج و محیط۔

ق میں اَدْبَار آیا ہے جو دُبُرٌ کی جمع ہے - دوسرا لفظ سُجُوْد ہے جو مصدر ہے اور اس کے معنی جھکنے یا مائل ہونے کے ہیں - اس سُجُوْد کے اَدْبَار کیا ہیں، یہ چیز غور طلب ہے - عام تفاسیر اور کتب لغت میں اس کے معنی ''نماز کے بعد،، لکھے ہیں*- لیکن یہ معنی جچتے نہیں - بالخصوص اس لئے کہ یہاں لفظ اَدْبَار آیا ہے اِدْبَار نہیں - نیز دُبُر کسی شے کے آخری اور پچھلے حصہ کو کہتے ہیں جو اس میں شامل ہوتا ہے - اور ''بعد،، کا لفظ اس وقت بولا جاتا ہے جب کوئی واقعہ یا چیز ختم ہو جائے اور اس کے بعد کوئی اور واقعہ یا چیز شروع ہو- ہم اپنی اس وقت تک کی تحقیق کے مطابق متعین طور پر نہیں کہہ سکتے کہ اس سے مقصود کیا ہے-

د ث ر

اَلدِّثْرُ - مالِ کثیر یا ہر کثیر شے کو کہتے ہیں - مَالٌ دِثْرٌ - بہت زیادہ مال - اَلدِّثَارُ- وہ کپڑا جس میں آدمی لپٹ جائے- تَدَثَّرَ بِالثَّوْبِ وہ کپڑے میں لپٹ گیا - دَثَرَ الشَّجَرُ دُثُوْرًا - درخت نے نئے پتے نکال لئے اور اسکی سبز شاخیں پھیلیں - هُوَ دَثْرُ مَالٍ - وہ اونٹوں کی اچھی خبر گیری کرنے والا ہے - تَدَثَّرَ الطَّائِرُ - پرند کا اپنے گھونسلے کو درست کرنا - نیز اَلدُّثُوْرُ - سست رفتار- بوجھل - اور زیادہ سونے والے آدمی کو بھی کہتے ہیں - (جو کپڑوں میں لپٹا رہے) - اور دَثَرَ الاَثَرُ نشان کے مٹ جانے کو کہتے ہیں** - ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی ہیں چیزوں کا اوپر تلے آ جانا - تہ بہ تہ جم جانا - یا اوپر چڑھ جانا- ان معانی کی رو سے راغب نیز ابن فارس نے اس مادہ کے مختلف استعمالات بیان کئے ہیں جن سے مفہوم کسی کے اوپر چھا جانا ہے - مَنْزِلٌ دَاثِرٌ - وہ منزل جس کے آثار (نشانات) مٹ گئے ہوں یا تہ بہ تہ مٹی چڑھ جانے سے چھپ گئے ہوں -

قرآن کریم میں نبی اکرمؐ کو یَا اَیُّهَا الْمُدَّثِّرُ (٧٤/١) کہکر پکارا گیا ہے - اَلدِّثَارُ کے اعتبار سے اس کے عام طور پر معنے کئے جاتے ہیں - اے کپڑا اوڑھنے والے - لیکن تَدَثَّرَ الطَّائِرُ کے مفہوم کی رو سے اس کے معنے ہونگے، گھر کو ٹھیک کرنے والا - اور دِثْرُ مَالٍ کے مفہوم کے پیش

*لسان العرب - تفسیر فتح القدیر (شوکانی) - تفسیر روح المعانی (آلوسی) ** تاج - محیط - راغب -

نظر اسکے معنے ہونگے، اچھی خبر گیری کرنے والا ۔ لہذا اسکا یہی مفہوم زیادہ مناسب نظر آتا ہے کہ اے وہ جس کے ذمہ انسانیت کے سنوارنے کا فریضہ ہے۔ یا اے وہ جو نوع انسانی کے معاملات کو حسن تدبیر سے سلجھانے کیلئے آیا ہے ۔ اور دَثَرَ الشَّجَرُ کے اعتبار سے معنے ہونگے، اے وہ جسکی آمد سے ایک نئی دنیا وجود میں آنے والی ہے ۔ یا جسکی آمد سے چمن عالم پر بہار آنے والی ہے ۔ اس تخاطب کے بعد آپؐ سے کہا گیا قُمْ فَاَنْذِرْ (۷۴/۲) ''اٹھ اور دنیا کو غلط روش کے عواقب سے آگاہ کر دے،، ۔ اس کے بعد اس دعوت انقلاب کے مختلف اجزا کو سامنے لایا گیا ہے ۔ اس سے بھی واضح ہے کہ اَلْمُدَّثِّرُ میں انقلاب آفرینی اور نوع انسان کی خیر سگالی کا پہلو نمایاں ہے۔ یہی ایک آسمانی داعی انقلاب کی خصوصیت اور ذمہ داری ہوتی ہے ۔ راغب نے جو مفہوم بیان کیا ہے اسکی رو سے اس کے معنی باطل کے ہر تصور اور نظریہ پر چھا جانے والا ۔ (غالب آ جانے والا) بھی ہو سکتے ہیں ۔ لِيُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ (۹/۳۳) ''تاکہ اسے تمام ادیان پر غالب کرے،، ۔ اسی مفہوم کی وضاحت کرتا ہے۔ ابن فارس نے اس مادہ کے استعمال کی مثالیں دیتے ہوئے کہا ہے کہ تَدَثَّرَ الرَّجُلُ فَرَسَهٗ کے معنی ہیں آدمی اپنے گھوڑے پر اچھل کر سوار ہو گیا* ۔ اس میں ''اچھل کر یا اچک کر،، کی خصوصیت قابل غور ہے ۔ یہ چیز بتدریج نہیں ہوتی بلکہ یک لخت ہوتی ہے ۔ جو انقلاب نبی اکرمؐ کے ہاتھوں سے رونما ہوا تھا اس کا طریق (Revolutionary) تھا ۔ یعنی انقلاب کا دفعۃً رونما ہو جانا ۔ اس کے بعد اب قرآنی تصورات حیات کا غلبہ بتدریج ہو رہا ہے ۔ اسے (Evolutionary) طریق کہتے ہیں ۔ زمانہ ایک چیز کو لیتا ہے۔ اس کا تجربہ کرتا ہے اور اپنے ناکام تجارب کے بعد اس نتیجہ پر پہنچتا ہے کہ صحیح نظریہ وہی ہے جسے قرآن نے پیش کیا تھا اور نبی اکرمؐ نے عملاً کر کے دکھا دیا تھا ۔ لہذا اب قرآنی تصورات کا باطل کے تصورات پر غلبہ تدریجاً ہو رہا ہے ۔ لیکن اگر انسانوں کی کوئی جماعت اس نظام کو لیکر اٹھے یا کوئی مملکت اسے اپنے ہاں نافذ کر کے اس کے انسانیت ساز تعمیری نتائج دنیا کے سامنے لے آئے تو یہ نظام پھر اچک کر، دوسرے نظامہائے حیات پر غالب آ سکتا ہے ۔ دیکھنا یہ ہے کہ سنت رسول اللہؐ کے اتباع میں تدثّر کا یہ عمل خیر کس قوم کے ہاتھوں سر انجام پاتا ہے؟ وہی قوم اس دور میں انسانیت کی سب سے بڑی محسن ہوگی، اسی کے ہاتھوں شجر ہستی کے پھول کھلینگے اور چمن کائنات پر پھر بہار آئیگی ۔

* نیز لسان العرب ۔

تفسیر روح المعانی میں ہے کہ اَلْمُدَّثِّرُ کے معنی ہیں انسانی کمالات اور شرف نبوت سے آراستہ و پیراستہ ہونے والا - نیز اس نے کہا ہے کہ اَلْمُدَّثِّرُ کے معنی کنایۃً ایسے شخص کے ہیں جس کے پاس کوئی پروگرام نہ ہو اور وہ فارغ بیٹھا ہو۔ اس مفہوم کے اعتبار سے مطلب یہ ہوگا کہ اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے قُمْ فَاَنْذِرْ کہکر حضورؐ کو عظیم الشان انقلابی پروگرام عطا کر دیا - تفسیر فتح القدیر (شوکانی) نے اس کے معنی لکھے ہیں، نبوت اور اسکی ذمہ داریوں کا بوجھ اٹھانے والا۔

عام خیال یہ ہے کہ اَلْمُدَّثِّرُ دراصل اَلْمُتَدَثِّرُ تھا - (یعنی تَفَعُّلٌ کے خاندان سے)۔ تاء مدغم ہو گئی دال میں۔ اور اسطرح اَلْمُدَّثِّرُ بن گیا -

د ح ر

اَلدَّحْرُ - کسی کو نکال دینا - دور کر دینا - دھکا دینا - ذلت کے ساتھ جبراً نکال دینے کو کہتے ہیں* - سورۃ صٰفّٰت میں ہے وَيُقْذَفُوْنَ مِنْ كُلِّ جَانِبٍ دُحُوْرًا ($\frac{۳۷}{۸-۹}$) "اور ہر طرف سے ملامت کئے جاتے ہیں، دھتکارے ہوئے" - دور اور دفع کرنے کے معنوں میں، سورۃ اعراف میں ابلیس کے متعلق ہے مَذْءُوْمًا مَّدْحُوْرًا ($\frac{۷}{۱۸}$) - "ذلیل - دھتکارا ہوا - دور کیا ہؤا" -

د ح ض

دَحْضٌ - اسکے اصلی معنے پھسلنے کے ہوتے ہیں - پھر اسکا استعمال کسی چیز کو اپنی جگہ سے ہٹانے، مٹانے یا باطل کر دینے، کیلئے ہونے لگا - کیونکہ دَحَضَ بِرِجْلِهٖ - اسوقت بولتے ہیں جب کوئی ذبح کئے ہوئے جانور کی طرح اپنے پاؤں زمین پر مارتا اور رگڑتا ہے - مَكَانٌ دَحْضٌ - پھسلنی جگہ کو کہتے ہیں* - ابن فارس نے اس مادے کے بنیادی معنی ہٹ جانے اور پھسلنے کے لکھے ہیں -

سورۃ کہف میں ہے لِيُدْحِضُوْا بِهِ الْحَقَّ ($\frac{۱۸}{۵۶}$) - تا کہ وہ (باطل کے ذریعہ) حق کو اپنے مقام سے پھسلا دیں اور بیکار کر دیں - سورۃ شوریٰ میں ہے - حُجَّتُهُمْ دَاحِضَةٌ ($\frac{۴۲}{۱۶}$) انکی دلیل اور دعویٰ (خدا کے نزدیک) بالکل بودا اور بے ثبات ہے۔ سورۃ صٰفّٰت میں ہے فَكَانَ مِنَ الْمُدْحَضِيْنَ ($\frac{۳۷}{۱۴۱}$)۔ اسکا پاؤں پھسل گیا - یا اسمیں طاقت نہ رہی - وہ کمزور و ناتوان ہو گیا

*تاج و محیط و راغب -

د ح و (ی)

دَحٰی - پھیلا دینا - بچھا دینا - وسیع کر دینا*- دَحَا الْمَطَرُ الْحَصَا - بارش نے کنکریوں کو بہا دیا - دَحَی الْاِبِلَ - اس نے اونٹوں کو ہانکا**- مَرَّ الْفَرَسُ یَدْحُوْ دَحْوًا - گھوڑا اپنے سم زمین پر لگاتا مٹی اڑاتا ہوا دوڑا*** - هُوَ یَدْحُوْ بِالْحَجَرِ - وہ پتھر پھینکتا ہے**** - تاج نے اس معنے میں یَدْحُو الْحَجَرَ بِیَدِہٖ لکھا ہے -

دَحَا کے ان معانی کو پیش نظر رکھئے اور پھر قرآن کی اس آیت پر غور کیجئے جس میں اجرام سماوی کی تخلیق کے سلسلہ میں کہا گیا ہے کہ وَالْاَرْضَ بَعْدَ ذٰلِکَ دَحٰهَا (۷۹/۳۰) - ''اور زمین کو اس کے بعد پھینکا - اور ہموار کیا،، - سورۃ انبیاء میں کہا ہے کہ اَنَّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ کَانَتَا رَتْقًا فَفَتَقْنٰهُمَا (۲۱/۳۰) - اجرام فلکی (ارض و سما) کا ہیولی پہلے باهمدگر پیوست تھا - پھر انہیں الگ الگ کیا گیا - اسطرح زمین کے کرہ کا جداگانہ وجود عمل میں آیا - پھر اس میں مزید تغیرات سے ہمواری پیدا کی گئی - اس حقیقت کو دَحَاهَا سے تعبیر کیا گیا ہے - یعنے اَرْضٌ (زمین) کو اس ہیولی سے یوں الگ کیا جسطرح گوپئے سے پتھر پھینکا جاتا ہے - یا جیسے بارش کنکریوں کو بہا کر دور لیجاتی ہے - یا جیسے گھوڑا گرد و غبار اڑاتا چلا جاتا ہے - ذرا سوچئے کہ آج سے قریب ڈیڑھ ہزار سال پہلے، اجرام فلکی کی تخلیق سے متعلق یہ باتیں وحی کے علاوہ اور کون بتا سکتا تھا؟ نیز بَعْدَ ذٰلِکَ اس حقیقت کا انکشاف کرتا ہے کہ ارض (زمین) کی تخلیق اس ہیولی کے بعد ہوئی - یعنے یہ دوسری اسٹیج تھی - پہلے وہ ہیولی وجود میں آیا جو باهمدگر پیوست تھا - پھر اس میں سے مختلف کرے (منجملہ ارض) تیزی سے الگ ہوئے اور اپنے اپنے ''فلک،، میں تیرنے لگے (۳۶/۴۰) -

د خ ر

دَخَرَ - یَدْخَرُ و دَخِرَ - یَدْخَرُ - چھوٹا ہونا - مطیع ہو کر جھک جانا - اَلدَّاخِرُ - جھکنے والا - دُخُوْرٌ - ذلت اور کمتری کو کہتے ہیں - اَلدَّخَرُ - تحیر کو کہتے ہیں جو عقل کی بیچارگی اور عاجزی کی دلیل ہے - اَدْخَرَہٗ - اس نے اسے ذلیل کر دیا - عاجز بنا دیا***** -

قرآن کریم میں اشیائے کائنات کے متعلق ہے کہ وہ دَاخِرُوْنَ ہیں (۱۶/۴۸) - یعنی قوانین خداوندی کے سامنے سجدہ ریز - یہ معانی اس سے ملحقہ

---

*تاج **محیط ***راغب ****لسان العرب - *****تاج - راغب و محیط -

آیت نے واضح کر دئے ہیں جس میں ہے کہ لِلّٰہِ یَسْجُدُ مَافِی السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الْاَرْضِ (۱۶/۴۹)۔ ''کائنات کی پستیوں اور بلندیوں میں جو کچھ ہے اللہ (کے قانون) کے سامنے سجدہ ریز ہے،،۔ (تفصیل کے لئے دیکھئے عنوان س - ج - د)۔

انسانوں کے خود ساختہ مذہب نے، مظاہر فطرت (اشیائے کائنات) کو معبود قرار دیکر، انسان کو ان کے سامنے جھکنا سکھایا ہے۔ قرآن کریم نے یہ اعلان کر کے کہ تمام اشیائے کائنات ان قوانین خدا وندی کے سامنے جھکی ہوئی ہیں جن کا علم انسان کو دیدیا گیا ہے، دنیائے انسانیت میں کتنا عظیم انقلاب برپا کر دیا ؟

د خ ل

دَخَلَ یَدْخُلُ۔ اندر داخل ہوا۔ خَرَجَ کی ضد ہے (۲/۱۱۱)۔ اَدْخَلَ۔ داخل کیا (۴/۵۷)۔ دَاخِلَۃُ الْاَرْضِ۔ وہ چیزیں جو زمین کے اندر چھپی ہوئی ہوں۔ اَلدَّخْلُ۔ جو کچھ اپنی جائداد سے آمدنی ہو۔ اَلدَّخَلُ۔ مکر و فریب، دھوکا، نیز عقلی یا جسمانی ابتری اور فساد کو بھی کہتے ہیں*۔ راغب نے اندرونی ابتری اور دشمنی کے لئے بھی دَخَلٌ کا استعمال کنایَۃً بتایا ہے**۔ سورۃ نحل میں ہے تَتَّخِذُوْنَ اَیْمَانَکُمْ دَخَلًا بَیْنَکُمْ (۱۶/۹۲) ''تم اپنی قسموں کو باہمی فساد کا موجب بنا لیتے ہو،،۔ یہاں دَخَلٌ کے معنے فساد اور ابتری کے ہیں۔

دَخَلَ بِالْمَرْاَۃِ کے معنی ہیں، اس نے عورت سے مباشرت کی۔ سورۃ نساء میں ہے مِنْ نِسَآئِکُمُ الّٰتِیْ دَخَلْتُمْ بِہِنَّ (۴/۲۳)۔ اسمیں اسکے معنے مباشرت کے ہیں - یعنی ان عورتوں کے بطن سے جن سے تم زنا شوئی کے تعلقات قائم کر چکے ہو۔

سورۃ توبہ میں منافقین کی ذہنیت کا ذکر کرتے ہوئے کہا گیا ہے کہ یہ لوگ طوعًا و کرھًا تمہارے ساتھ میدان جنگ میں آ تو گئے ہیں لیکن ان کی حالت یہ ہے کہ لَوْ یَجِدُوْنَ مَلْجَاً اَوْ مَغٰرٰتٍ اَوْ مُدَّخَلًا لَّوَلَّوْا اِلَیْہِ وَھُمْ یَجْمَحُوْنَ (۹/۵۷) اگر انہیں کوئی پناہ گاہ یا (چھپنے کے لئے) غار یا گھسنے کے لئے کوئی مقام مل جائے تو یہ بد حواسی سے اسکی طرف بھاگ نکلیں - یہاں قرآن کریم نے مُدَّخَلًا کا لفظ استعمال کیا ہے - یہ باب

*تاج - **راغب -

افتعال سے ہے جس کے خواص میں کسی کام کو پورا زور لگا کر بہ مشقت کرنا داخل ہے ۔ اس باب کے انتخاب سے قرآن کریم نے ان کی بدحواسی اور میدان سے بھاگ نکلنے کی شدت آرزو کا نقشہ کھینچکر رکھ دیا ہے ۔ یعنی اگر ان کے سامنے کوئی چھوٹی سی چھپنے کی جگہ بھی آ جائے تو یہ اس میں گھسنے کی کوشش کرینگے خواہ اس میں کتنا ہی زور کیوں نہ لگانا پڑے۔

د خ ن

اَلدُّخَانُ ۔ دھواں ۔ دَخَنَ الْغُبَارُ دُخُوْنًا ۔ غبار بلند ہو گیا *۔ دَخَنَ الْفِتْنَةِ ۔ فتنہ کو ظاہر کرنا اور بر انگیختہ کرنا **۔ خُلُقٌ دَاخِنٌ ۔ خراب اخلاق ۔ اَلدُّخَانُ ۔ قحط سالی، خشک سالی، اور بھوک کو بھی کہتے ہیں کیونکہ بھوکے آدمی کو بھوک کی شدت کی وجہ سے اپنے اور آسمان کے درمیان دھواں سا نظر آتا ہے ۔ بعض نے کہا ہے کہ بھوک کو دُخَانٌ اسلئے کہتے ہیں کہ خشک سالی میں زمین سے غبار اڑ کر آسمان میں دھواں سا بن جاتا ہے ۔ اَلدُّخَانُ ۔ شر، خرابی اور ابتری کے لئے بھی بولا جاتا ہے ۔ يَوْمٌ دَخْنَانٌ ۔ سخت گرمی اور مصیبت کا دن** ۔

قرآن کریم میں ہے کہ اَرْضٌ کو دو مراحل میں پیدا کیا ۔ ثُمَّ اسْتَوٰى اِلَى السَّمَاءِ وَهِيَ دُخَانٌ (۴۱/۱۱) ۔ پھر وہ دیگر اجرام فلکی کی طرف متوجہ ہوا جبکہ وہ بالکل دھوئیں (گیس) کی حالت میں تھے ۔ سائنس کے انکشافات اس حقیقت کی شہادت دے رہے ہیں جسے قرآن کریم نے اتنا عرصہ پہلے بیان کیا تھا ۔ اجرام سماوی کے اولین ہیولٰی (Nebulae) کو ایسا ہی بتایا جاتا ہے ۔

سورۃ دخان میں ہے ۔ يَوْمَ تَاْتِي السَّمَاءُ بِدُخَانٍ مُّبِيْنٍ (۴۴/۱۰)۔ جب ساری فضا میں گرد و غبار (یا دھواں) پھیل جائیگا۔ جب مصائب و آلام عام ہو جائینگے ۔ ہر طرف فتنہ و فساد پھیل جائیگا ۔ یا بھوک اور قحط کی وجہ سے آسمان دھواں ہی دھواں نظر آئیگا ۔ یہ عذاب الیم ہوگا (۴۴/۱۱) ۔

د ر أ

دَرَاَهُ ۔ يَدْرَؤُهُ ۔ دَرْاً ۔ دفع کرنا ۔ رد کرنا **۔ سختی سے ہٹانا ***۔ دَرَاَ عَلَيْهِمْ دُرُوْاً ۔ یکایک کسی کے سامنے نمودار ہو جانا ۔ جَاءَ

*تاج ۔ محیط ۔ راغب ۔ **تاج ***محیط ۔

السَّیْلُ دَرْأً ۔ سیلاب کہیں دور سے آگیا، نہ معلوم کہاں سے یکایک آگیا*۔

دَرَأْتُہٗ عَنِّیْ ۔ میں نے اسے اپنے پاس سے ہٹایا (۳/۱۱۶)۔ مُدَارَاۃٌ ۔ کے معنے مخالقت اور مدافعت کے ہوتے ہیں* ۔

قرآن کریم میں ہے وَ یَدْرَؤُا عَنْہَا الْعَذَابَ (۲۴/۸)۔ ''یہ بات عورت سے سزا کو دفع کرسکتی ہے'' ۔ اس سے اس کی سزا رک سکتی ہے ۔ سورۃ قصص میں ہے وَ یَدْرَءُوْنَ بِالْحَسَنَۃِ السَّیِّئَۃَ (۲۸/۵۴)۔ حسنات کے ذریعہ سیّئات کا ازالہ کرتے ہیں ۔ یہ ایک عظیم حقیقت ہے جسے قرآن کریم نے متعدد مقامات پر، متنوع اسالیب سے بیان کیا ہے ۔ وہ کہتا یہ ہے کہ تخریب کی روک تھام دوسری قسم کی تخریب سے نہیں ہوتی ۔ اس کی مدافعت اس سے قوی تر اور مؤثر تر تعمیر سے ہوتی ہے ۔ آپ کمزور ہیں اس لئے ہر قسم کے تخریبی جراثیم آپ پر غالب آجاتے ہیں اور آپ بیمار ہو جاتے ہیں ۔ اس کا علاج یہ ہے کہ آپ اپنی قوتِ مدافعت بڑھائیں ۔ اس طرح آپ کی تخریب رک جائیگی اور تعمیر کا سلسلہ آگے چلیگا ۔ زندگی کے ہر گوشے میں ، تخریب کی مدافعت کا یہی صحیح طریق ہے ۔ اسی کو ''نیکیوں کا پلڑا جھکنا'' کہتے ہیں ۔

تَدَارَءُوْا فِی الْخُصُوْمَۃِ ۔ کے معنے ہوتے ہیں جھگڑے میں ایک دوسرے کو دھکا دینا یا بات کو ایک دوسرے پر ڈالنا اور اسطرح باہم اختلاف کرنا* ۔ یعنے ایک کا کہنا کہ یہ اس نے کیا ہے اور دوسرے کا کہنا کہ نہیں اس نے کیا ہے۔ ان معنوں میں یہ لفظ (۲/۷۲) میں آیا ہے ۔ یعنی فَادّٰرَءْتُمْ فِیْہَا ۔ اھل لغت کا کہنا ہے کہ یہ اصل میں تَدَارَأْتُمْ تھا ۔ لیکن ہمارا خیال ہے کہ یہ ایک الگ باب ہے جسے قرآن کریم نے تو استعمال کیا ہے لیکن صرفیون نے اسے الگ شمار نہیں کیا ۔

د ر ج

دَرَجَ ۔ چلنا ۔ بہت آہستہ آہستہ ، کھسک کھسک کر چلنا* اوپر چڑھنے والے کی طرح چلنا** ۔ مَدْرَجَۃُ الطَّرِیْقِ ۔ راستے کا واضح اور کھلا حصہ ۔ دَرَجَ الْقَوْمُ ۔ (آہستہ آہستہ) قوم ختم ہو گئی اور اس کی نسل باقی نہ رہی* ، قرآن کریم میں ہے سَنَسْتَدْرِجُہُمْ مِنْ حَیْثُ لَا یَعْلَمُوْنَ (۷/۱۸۲) ۔ اس کے معنے یہی ہیں کہ ہم انہیں یوں اسطرح آہستہ آہستہ پکڑ لینگے اور ختم کر دینگے کہ انہیں معلوم بھی نہ ہوگا کہ یہ تباہی کہاں سے آگئی ۔

* تاج ۔ **راغب ۔

دَرَجَ الشَّیْئَ ۔ اس نے چیز کو تہ کیا اور لپیٹ لیا ۔ اَلْمُدْرَجُ ۔ وہ چیز جس پر کچھ لکھا ہوا ہو ۔ دَرْجُ الْکِتَابِ ۔ کتاب کی تہ* ۔

اَلدَّرَجَۃُ ۔ سیڑھی کا ایک ڈنڈا (Step) (دَرَجَاتٌ اوپر کی طرف لے جانے والے ڈنڈے (Steps) اور دَرَکَاتٌ نیچے کی طرف لانے والے**) ۔ راغب نے کہا ہے کہ مَنْزِلَۃٌ اور دَرَجَۃٌ تقریباً ایک ہی چیز ہے ۔ لیکن مَنْزِلَۃٌ (اترنے کی جگہ) کو دَرَجَۃٌ اس وقت کہتے ہیں جب اس پر چڑھا جا رہا ہو ۔ نیز دَرَجَۃٌ سے بلند منزلت بھی مراد لی جاتی ہے ۔ اسی اعتبار سے دَرَجَاتٌ کے معنی مراتب ہیں ۔ ایک دوسرے کے اوپر طبقات ۔ اَلْمَدَارِجُ ۔ پہاڑی راستوں کی کیفیت یہ ہوتی ہے کہ عام طور پر ہر موڑ کے بعد راستہ اور بلند ہو جاتا ہے ۔ ان موڑوں کو اَلْمَدَارِجُ کہتے ہیں* ۔

مجاہدین کے متعلق فرمایا کہ انہیں قَاعِدِیْنَ (بیٹھے رہنے والوں) پر دَرَجَۃٌ حاصل ہے ($\frac{4}{95}$) ۔ سورۃ توبہ میں ہے کہ مجاہدین اور مہاجرین اَعْظَمُ دَرَجَۃً عِنْدَ اللّٰہِ ($\frac{9}{20}$) "اللہ کے ہاں بہت بڑا درجہ" رکھتے ہیں۔

قرآن کریم میں مردوں اور عورتوں کے متعلق ہے کہ وَلَھُنَّ مِثْلُ الَّذِیْ عَلَیْھِنَّ بِالْمَعْرُوْفِ ($\frac{2}{228}$) ۔ عورتوں کے لئے، از روئے معروف، ان ذمہ داریوں کے مطابق حقوق ہیں جو ان پر عائد ہوتی ہیں ۔ یعنی جس طرح مردوں کے حقوق عورتوں پر ہیں اسی طرح عورتوں کے حقوق مردوں پر ہیں ۔ بلحاظ حقوق و فرائض ان میں کسی کو کسی پر افضلیت نہیں ۔ دونوں مساوی ہیں ۔ لیکن اس کے بعد ہے وَلِلرِّجَالِ عَلَیْھِنَّ دَرَجَۃٌ ($\frac{2}{228}$) ۔ مردوں کو ایک بات میں ان پر فوقیت حاصل ہے ۔ وہ ایک بات کیا ہے؟ اس کا ذکر خود اسی آیت میں موجود ہے ۔ طلاق کے بعد عورت کے لئے عدت کی میعاد مقرر ہے جس میں وہ کسی سے نکاح نہیں کرسکتی لیکن مرد کے لئے عدت کی کوئی قید نہیں ۔ نیز اگر طلاق مرد کی طرف سے ہو اور اسے اپنی غلطی کا احساس ہو جائے تو وہ عدت کے دوران میں بھی مطلقہ بیوی کو پھر سے اپنی زوجیت میں لاسکتا ہے ۔ وَبُعُوْلَتُھُنَّ اَحَقُّ بِرَدِّھِنَّ فِیْ ذٰلِکَ اِنْ اَرَادُوْا اِصْلَاحًا ($\frac{2}{228}$) ۔ یہ ہے وہ بات جس میں مرد کو عورت کے مقابلہ میں رعایت یا دَرَجَۃٌ (ایک فضیلت) حاصل ہے ۔ یہ نہیں کہ مرد (Men) عورتوں (Women) کے مقابلہ میں افضل (Superior) ہیں ۔ آپ تاریخ انسانیت پر غور فرمائیے ۔ عورتوں اور مردوں کے تعلقات کے سلسلہ میں ہرجگہ

* تاج ۔ ** لین ۔ *** راغب ۔

"عَلَیۡهِنَّ" نمایاں طور پر دکھائی دیگا۔ یعنی مردوں کے حقوق ھی حقوق ہونگے اور عورت کی ذمہ داریاں ھی ذمہ داریاں ۔ عورت کا کوئی حق تسلیم نہیں کیا جائیگا۔ یعنی عورت کسی بات کو مرد سے بطور استحقاق (As of Right)طلب نہیں کرسکیگی ۔ یہ انقلاب آفریں آواز آپ کو قرآن کریم کی عدالت سے بلند ہوتی سنائی دے گی کہ عورت کے بھی اسی طرح حقوق ھیں جس طرح مرد کے ۔ اور اس باب میں دونوں برابر ھیں ۔ جس قسم کے مردوں کے حقوق عورتوں پر (عَلَیۡهِنَّ) اسی قسم کے عورتوں کے حقوق مردوں پر (لَهُنَّ) ۔ انسان کی عمرانی اور معاشرتی زندگی میں کتنا بڑا انقلاب ھے جو ان چار لفظوں کی رو سے پیدا کر دیا گیا ھے ۔ اور کسقدر جامع ھیں یہ چار لفظ—وَلَهُنَّ مِثۡلُ الَّذِیۡ عَلَیۡهِنَّ—اس کے بعد بِالۡمَعۡرُوۡفِ کہکر اس کی بھی صراحت کر دی کہ یہ بات کسی فرد یا معاشرہ کی مرضی پر نہیں چھوڑ دی گئی ۔ اس کی (Provision) قانونِ خداوندی میں کر دی گئی ھے ۔ اسی قانون (قرآن کریم) نے یہ بھی بتایا ھے کہ وہ ایک بات کیا ھے جس میں مرد کو عورت کے مقابلہ میں ایک فوقیت (دَرَجَةٌ) حاصل ھے ۔

حقوق اور ذمہ داریوں کی مساوات کا یہ مطلب نہیں کہ فطرت کی طرف سے جو فرائض مرد اور عورت پر عائد ہوتے ھیں وہ بھی یکساں ھیں ۔ تقسیم عمل کے لحاظ سے فطرت نے مرد اور عورت کی تخلیق میں فرق رکھا ھے ۔ اس لئے جو فرائض عورت کے ذمے عائد کئے گئے ھیں انہیں عورت کو سرانجام دینا ہوگا اور جو مرد کے ذمے ھیں انہیں مرد کو ۔ عورت کا مختص فریضہ جسے مرد ادا نہیں کرسکتا ، اولاد کی پیدائش اور تربیت ھے ۔ اور چونکہ اس میں عورت کا بہت سا وقت صرف ہو جاتا ھے اس لئے کسبِ معاش کا فریضہ مردوں کے ذمہ عائد کیا گیا ھے ۔ اَلرِّجَالُ قَوّٰمُوۡنَ عَلَی النِّسَآءِ (۴/۳۴) ۔ کے یہی معنی ھیں ۔ (تفصیل ان امور کی اپنے مقام پر ملیگی)

د ر ر

اَلدَّرُّ ۔ دودھ (لیکن اس میں موٹی دھار کا تصور اور کثرت کا مفہوم پایا جاتا ھے) اَلدِّرَّةُ ۔ دودھ کی فراوانی ۔ اِسۡتَدَرَّ اللَّبَنُ ۔ دودھ کثیر ہوگیا۔ دَرَّتِ السَّمَآءُ بِالۡمَطَرِ ۔ آسمان سے بکثرت (موسلادھار) بارش برسی۔ ایسے موسلادھار برسنے والے بادل مِدۡرَارٌ کہلائینگے*-(۶/۶) ۔ دَرَّ السِّرَاجُ ۔ چراغ خوب روشن ہو گیا ۔ کَوۡکَبٌ دُرِّیٌّ ۔ چمکدار روشن ستارہ* ۔

*تاج و راغب **محیط ۔

جسمیں سے نور کی ندیاں رواں ہوں (۲۴/۳۵) ۔ یہ لفظ دُرَّۃٌ (ایک موتی) میں یائے نسبتی لگا کر بنایا گیا ہے ۔ یعنی موتی جیسا ۔ صاحب محیط نے کہا ہے آلقدرؓ کے بنیادی معنے کسی چیز کے کسی دوسری چیز سے پیدا ہونے کے ہیں* ۔ جیسے، جانور سے دودھ ۔ چراغ سے روشنی ۔ تارے سے چمک ۔ ابن فارس نے بھی کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی ایک چیز کا دوسری چیز سے پیدا ہونا ہیں ۔ نیز حرکت و اضطراب ۔ اس سے دودھ کی دھار اور ستارے کی جھلملاتی روشنی کا منظر سامنے آ جاتا ہے ۔ اللہ نے اپنے نور ہدایت (قرآن کریم) کو : کَوْکَبٌ دُرِّیٌّ (۲۴/۳۵) سے تشبیہ دی ہے ۔ یعنی ایسا ستارہ جس سے علم و بصیرت کی کرنیں ، اس ندی کی طرح رواں ہوں جس میں جمود نہ ہو بلکہ پیہم حرکت ہو ۔ یہ نور علم خداوندی سے پیدا ہو اور دنیا میں روشنی پیدا کرتا چلا جائے ۔

د ر س

دَرَسَ الشَّیْئُ کے معنے ہیں کوئی چیز پرانی ہوئی اور اس کا نشان مٹ گیا ۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی مخفی ہونا ، پست ہونا اور مٹنا ہیں ۔ دَرَسَہُ الْقَوْمُ ۔ لوگوں نے اسکے نشان کو مٹا دیا ۔ طَرِیْقٌ مَدْرُوْسٌ اس راستے کو کہتے ہیں جو لوگوں کی کثرت آمد و رفت کی وجہ سے پٹ کر دب گیا ہو ۔ اسی طرح دَرَسَ الْحِنْطَۃَ کے معنے ہیں گیہوں کو گاہ دینا ۔ گیہوں (یا دوسرے اناج) کی بالوں کو زمین پر بچھا کر اس پر بیلوں کو مسلسل اور متواتر چلاتے رہتے ہیں جس سے بھوسہ اور اناج الگ الگ ہو جاتے ہیں ۔ اسے گاھنا کہتے ہیں ۔ لہذا دَرَسَ کے معنے ہیں کسی چیز کو اس کثرت سے گھسنا یا ملنا کہ اسکا نشان مٹ جائے ۔ اسی سے دَرَسَ النَّاقَۃَ ہے جسکے معنے یہ ہیں کہ اونٹنی کو اس کثرت سے چلایا جائے کہ وہ مطیع و منقاد ہو جائے ۔ اَلْمُدَارَسَۃُ کے معنے ہوتے ہیں کسی چیز کیلئے پیہم مشقت کرنا یا اسکی خبر گیری کرنا** ۔ اور دَرَسَ الْکِتَابَ یَدْرُسُہٗ، کے معنے ہیں کتاب کو اس کثرت سے بار بار پڑھنا کہ وہ ازبر ہو جائے*** ۔

سورۃ آل عمران میں ہے بِمَا کُنْتُمْ تَدْرُسُوْنَ (۳/۷۹) کتاب کو اسطرح گاھنا کہ اسکے معانی نکھر اور ابھر کر (الگ ہو کر) سامنے آجائیں ۔ اس پر مسلسل غور و فکر کرنا تا کہ الفاظ کے پردوں میں جو حقائق مستور ہیں وہ نکھر کر سامنے آ جائیں ۔ یا جو حقائق انسانی تخیلات کے پردوں میں چھپ گئے ہیں وہ بے نقاب ہو جائیں ۔

---

* محیط ۔ **تاج ۔ ***تاج و لسان ۔

سورۃ انعام میں دِرَاسَةٌ کا لفظ آیا ھے (۶/۱۵۷) - یعنی نہایت غور کے ساتھ مطالعہ کرنا - وَاِنْ کُنَّا عَنْ دِرَاسَتِهِمْ لَغٰفِلِيْنَ (۶/۱۵۷) ؛ ہم ان کے مطالعہ کرنے سے یقیناً بے خبر تھے -

د ر ک

اَلدَّرَکُ - کسی کا پیچھا کر کے اس سے جا ملنا - اس تک پہنچ جانا- اسے جا پکڑنا* - ابن فارس نے کہا ھے کہ یہی اس کے بنیادی معنی ھیں - سورۃ طٰہٰ میں ھے لَا تَخَافُ دَرَکًا (۲۰/۷۷) - ''تجھے اسکا ڈر نہیں ھوگا کہ فرعون تجھے پیچھے سے آ کر پکڑ لیگا،، - سورۃ شعراء میں ھے کہ حضرت موسیٰؑ کے ساتھیوں نے کہا اِنَّا لَمُدْرَکُوْنَ (۲۶/۶۱)- ''بس ھم پکڑے گئے،، - فرعون کے لشکر نے ھمارا پیچھا کر کے ھمیں پکڑ لیا - تَدَارُکٌ - کسی سے جا کر مل جانا - اسے پا لینا - اس تک پہنچ جانا - اس میں یکے بعد دیگرے پہنچتے رھنے کا تصور ھے - مثلاً - سورۃ قلم میں ھے لَوْلَاۤ اَنْ تَدَارَکَهٗ نِعْمَةٌ (۶۸/۴۹)- اگر (اسکے رب کی) نعمت اس تک نہ پہنچ جاتی- یعنی اس (حضرت یونس ؑ) پر مختلف واقعات گزرتے رھے لیکن خدا کی نعمت مسلسل اور متواتر اس کے شامل حال رھی - اَلدِّرَاکُ - ایک چیز کا دوسری چیز کے پیچھے مسلسل آنا- اَلتَّدْرِیْکُ مِنَ الْمَطَرِ - بارش کا یکے بعد دیگرے مسلسل گرنا*- اَلدَّرْکُ و اَلدَّرَکُ- کسی چیز کی گہرائی کا آخری حصہ - تہ - اَلدَّرْکُ- دَرَجٌ کے مقابل میں آتا ھے - سیڑھی کے ڈنڈوں کو اوپر چڑھنے کے لحاظ سے دَرَجٰتٌ کہتے ھیں اور نیچے اترنے کے لحاظ سے دَرَکَاتٌ* - یہی وجہ ھے کہ قرآن کریم نے جنت کے مراتب و منازل کو دَرَجَاتٌ کہا ھے - اس کے برخلاف جہنم کے منازل کو دَرَکَاتٌ - فِی الدَّرْکِ الْاَسْفَلِ مِنَ النَّارِ (۴/۱۴۵) جہنم کی سب سے نچلی تہ - غور کیجئے - سیڑھی وھی ھوتی ھے اور اس کے ڈنڈے بھی وھی - جو شخص اوپر چڑھنا چاھتا ھے سیڑھی اسے بلندی تک پہنچانے کا ذریعہ بن جاتی ھے - جو نیچے اترنا چاھتا ھے، وھی سیڑھی اسے پستی کیطرف لے جانے کا موجب ھو جاتی ھے - زندگی ایک ھی ھے - جو اسے جس انداز سے بسر کرنا چاھے یہ اسے اسی انداز کی منزل تک پہنچانے کا ذریعہ بن جاتی ھے -

اَدْرَکَهٗ : اسے جا لیا، پا لیا - اَدْرَکْتُهٗ بِبَصَرِیْ - میں نے اسے نگاہ سے پا لیا - دیکھ لیا* - اسی اعتبار سے اِدْرَاکٌ اس علم کو کہتے ھیں

*تاج -

جو محسوسات (حواس) کے ذریعہ حاصل ہو۔ سورۃ یونس میں ہے حَتّٰی اِذَا اَدْرَکَہُ الْغَرَقُ (۱۰/۹۰) "جب اسے غرق ہونے نے آ لیا"۔ یعنی جب اسنے اپنے غرق ہونے کو اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا۔ جب اسنے محسوس کر لیا کہ وہ غرق ہو چلا ہے۔

اَدْرَکَ الشَّیْءُ۔ چیز اپنے وقت کو پہنچ گئی اور مکمل ہو گئی۔ انتہا کو پہنچی*۔ قرآن کریم میں ہے بَلِ ادّٰرَکَ عِلْمُھُمْ فِی الْاٰخِرَۃِ (۲۷/۶۶)۔ اہل لغت نے اس کے معنی یہ کئے ہیں کہ ان لوگوں کا آخرت کے متعلق علم ختم ہو گیا۔ یہ اسکی حقیقت کو نہ پا سکے۔ اس سے بے خبر رہے*۔ راغب نے ان معانی کے ساتھ یہ بھی لکھا ہے کہ بعض لوگوں نے اس کے معنے یوں بھی کئے ہیں کہ انہیں آخرت میں جا کر اس بات کا علم ہو جائیگا**۔ لیکن ہمارے نزدیک ان معانی کی رو سے آیت کا مطلب واضح نہیں ہوتا۔ اس سے کچھ بات بنتی نہیں۔ اِدّٰارَکَ کے معنی ہیں کسی چیز کا مسلسل اور پیہم اسطرح آگے چلتے آنا کہ اس کا آخری حصہ پہلے حصے سے ملا ہؤا ہو۔ قرآن کریم کا کہنا یہ ہے کہ آخرت کے متعلق ان لوگوں کو مسلسل اور پیہم علم پہنچتا رہا ہے۔ لیکن اس کے باوجود یہ [illegible] کے بارے میں شک و شبہ میں ہیں بلکہ اندھوں کی طرح تاریکی میں۔ بَلْ ھُمْ فِیْ شَکٍّ مِّنْھَا۔ بَلْ ھُمْ مِّنْھَا عَمُوْنَ (۲۷/۶۶)۔

د ر ھـ م

اَلدِّرْھَمُ۔ ایک چاندی کے سکہ کا نام ہے۔ اسکی جمع دَرَاھِمُ ہے۔ یہ عربی لفظ نہیں۔ بعض نے اسکی اصل فارسی قرار دی ہے اور بعض نے یونانی*۔ لیکن معلوم ہوتا ہے کہ یہ رومی لفظ (Drawbrug) کا معرب ہے۔ اسیطرح دینار (Dinarins) کا، اور فلس (Fails) کا۔

سورۃ یوسف میں ہے دَرَاھِمَ مَعْدُوْدَۃٍ (۱۲/۲۰)۔ (انہوں نے حضرت یوسفؑ کو) چند درہموں کے عوض (بیچ دیا)۔

د ر ی

دَرَیْتُہٗ۔ میں نے اسے جان لیا۔ (۲/۱۰۹)۔ اَدْرَاہُ بِہٖ۔ اس کو اس کے متعلق بتلایا*۔ دِرَایَۃً کے معنے ہیں کسی قسم کی کوشش یا تدبیر سے معلوم کرنا یا ایسی چیز کو معلوم کرنا جس میں پہلے شک ہو۔ یہی وجہ ہے

*تاج۔ **راغب۔

کہ اس لفظ کا اطلاق اللہ تعالیٰ پر نہیں کیا جاتا تھا* ۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنوں میں کسی چیز کا قصد کرنا اور اسے طلب کرنا ہیں ۔ نیز کسی چیز میں تیزی ۔ چنانچہ مِدْرًی کنگھی کو کہتے ہیں کیونکہ اس کے دندانوں میں نکیلا پن اور تیزی ہوتی ہے ۔ (اس سے دِرَایَۃٌ میں طلب و قصد کے ساتھ ، تیزی فہم کا تصور بھی ہو سکتا ہے)

راغب نے لکھا ہے کہ قرآن کریم میں جہاں جہاں مَا اَدْرَاکَ (تجھے کیا خبر ہے یا تجھے کس نے آگاہ کیا) آیا ہے اسکے بعد اس چیز کی بابت بیان کر دیا گیا ہے ۔ مثلاً (۹۷/۲) ۔ لیکن جہاں جہاں مَا یُدْرِیْکَ (تجھے کیا چیز بتاتی ہے) آیا ہے وہاں اس چیز کے بعد اس کے متعلق بیان نہیں کیا گیا** ۔ بلکہ اس کے بعد لَعَلَّ (شاید) کہکر ، پیش نظر بات کہی گئی ہے (دیکھئے ۴۲/۱۷ و ۳۳/۶۳ و ۸۰/۳) ۔ یعنی مَا اَدْرَاکَ کے بعد بات کا علم یقینی طور پر دے دیا گیا ہے لیکن مَا یُدْرِیْکَ کے بعد کہا ہے کہ شاید (یا ہوسکتا ہے) کہ یہ اس طرح ہوجائے ۔ مثال کے طور پر سورۃ القدر میں پہلے کہا گیا ہے کہ وَمَا اَدْرَاکَ مَا لَیْلَۃُ الْقَدْرِ (۹۷/۲) ۔ "تجھے کیا خبر کہ لیلۃ القدر کیا ہے" اس کے بعد باقی آیات میں لیلۃ القدر کے متعلق مزید صراحت ہے ۔ اس کے برعکس سورۃ شوریٰ میں ہے ۔ وَمَا یُدْرِیْکَ لَعَلَّ السَّاعَۃَ قَرِیْبٌ (۴۲/۱۷) "تجھے کیا خبر؟ ہو سکتا ہے کہ انقلاب کی گھڑی قریب ہی ہو"

ان مثالوں سے مَا اَدْرَاکَ اور مَا یُدْرِیْکَ کے استعمال کا فرق سامنے آجاتا ہے ۔

د س ر

دُسُرٌ ۔ دِسَارٌ کی جمع ہے ۔ دِسَارٌ کے معنے کیل یا میخ کے ہیں ۔ دَسْرٌ کے اصلی معنے سختی اور زور سے دھکا دینے کے ہیں** ۔ دَسَرَ الدِّسَارَ ۔ کیلوں کو زور سے ٹھونکا ۔ ویسے اَلدِّسَارُ کھجور کے ریشے کی رسی کو بھی کہتے ہیں جس سے کشتی کے تختوں کو آپس میں باندھا جاتا ہے ۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اَلدِّسَارُ کے یہ معنی خلافِ قیاس ہیں ۔ دَسْرَاءُ خود کشتی کو بھی کہتے ہیں* اس لئے کہ وہ پانی کو دھکیلتی ہوئی آگے بڑھتی ہے ۔ قرآن کریم میں کشتیٔ حضرت نوحؑ کو ذَاتِ اَلْوَاحٍ وَّدُسُرٍ (۵۴/۱۳) کہا گیا ہے ۔ یعنے تختوں اور میخوں سے بنی ہوئی کشتی ۔ اگر دُسُرٌ

* تاج ۔ ** راغب ۔

سے مراد میخیں ہی ہیں (ریشوں کی رسی نہیں) تو اس سے واضح ہوتا ہے کہ حضرت نوح ؑ کا زمانہ وہ تھا جس میں دھات کا استعمال ہونے لگ گیا تھا اور کشتیاں محض درختوں کے تنوں کو کھوکھلا کرلینے سے نہیں بنا لیتے تھے بلکہ تختوں اور میخوں سے بنائی جاتی تھیں - لیکن کشتی حضرت نوح ؑ کے متعلق قرآن کریم میں یہ بھی ہے کہ اسے خدا کی زیر نگرانی ، اس کی وحی کے مطابق بنایا گیا تھا (۱۱/۳۷) - ممکن ہے اُس زمانہ میں اس قسم کی صنعتی نادرہ کاری کا علم بھی (پہلے پہل) وحی کے ذریعے دیا جاتا ہو اور پھر اسکا استعمال عام ہو جاتا ہو -

تاریخ انسانیت سے پردے اُٹھ جانے سے نہ معلوم کیا کیا حقائق سامنے آئینگے ، اور کتنی ایسی چیزیں ، جن کے متعلق آج بھی سمجھا جاتا ہے کہ ان کی ابتدا عقلِ انسانی نے کی تھی ، وحی کی رہینِ منت متحقق ہونگی؟

د س س (د س و)

الدَّسّ - کسی چیز کو کسی دوسری چیز کے نیچے چھپا دینا یا دبا دینا - دفن کر دینا* - راغب نے اس کے معنوں میں مجبور کرنے کا اضافہ کیا ہے - یعنی کسی چیز کو بزور کسی چیز کے اندر داخل کر دینا** - دَسَسْتُ الشَّیْءَ فِی التُّرَابِ - میں نے اس چیز کو مٹی میں چھپا دیا* - سورۃ نحل میں ہے کہ جب (جاہلیت عرب میں) انہیں لڑکی پیدا ہونے کی اطلاع ملتی تو وہ سوچتے کہ اَمْ یَدُسُّہٗ فِی التُّرَابِ (۱۶/۵۹) - "یا وہ اسے زمین میں دفن کر دے" - سورۃ شمس میں نفس انسانی کے متعلق ہے قَدْ اَفْلَحَ مَنْ زَکّٰھَا (۹۱/۹) - "جس نے اس کی نشوو نما کرلی وہ کامیاب و کامران ہو گیا" اس کی کھیتی پروان چڑھ گئی - وَ قَدْ خَابَ مَنْ دَسّٰھَا (۹۱/۱۰) - "جس نے اسے دبا دیا وہ نامراد و ناکام رہا" - کھیتی (اَفْلَحَ) کی نسبت سے بیج کی مثال کو سامنے لائیے - اس کی برومندی کے لئے اسے مٹی میں ملانا پڑتا ہے - اگر پانی - مٹی - ہوا - حرارت - روشنی کا تناسب صحیح صحیح ہو تو بیج کی صلاحیتیں نشوو نما پالیتی ہیں - وہ شگوفہ بنکر پھوٹتا ہے - کونپل بنکر ابھرتا ہے اور تناور درخت کی شکل میں فضا میں جھومتا ہے - لیکن اگر اسی بیج پر مٹی زیادہ مقدار میں پڑ جائے تو اس کی تمام صلاحیتیں فنا ہو جاتی ہیں - انسانی ذات میں بڑھنے پھولنے اور پھلنے کی صلاحیتیں مضمر کردی گئی ہیں - لیکن ان صلاحیتوں کی نشوو نما (موجودہ سٹیج پر) مادی دنیا کے اندر ہوتی ہے -

* تاج - ** راغب -

اگر مادی قوتوں سے مناسب کام لیا جائے تو انسانی ذات کی مضمر صلاحیتیں برومند ہو جاتی ہیں ۔ اگر یہ مفاد پرستیوں کے بوجھ کے نیچے دب جائے تو اس کی صلاحیتیں سلب ہو جاتی ہیں ۔

دَسّٰی اصل میں دَسَّسَ تھا ۔ چونکہ تین سین کا یکجا جمع ہونا گراں گزرتا ہے اس لئے اسے دسّٰی بنا دیا ۔ فراء اور زجاج نے کہا ہے کہ اس سے مراد بخل ہے ۔ کیونکہ بخیل آدمی اپنے آپ کو چھپاتا ہے اور سخی اپنے آپ کو نمایاں اور کھلا ہؤا رکھتا ہے ۔ یہ معنے اس اعتبار سے (ایک گونہ) صحیح ہیں کہ قرآن کریم نے خود نفسِ انسانی کی نشو و نما کا راز اَعْطٰی (دوسروں کو دینے) میں بتایا ہے اور بُخل کو اس کی تباہی کا موجب قرار دیا ہے ۔ فَاَمَّا مَنْ اَعْطٰی وَ اتَّقٰی . . . . فَسَنُيَسِّرُهٗ لِلْيُسْرٰی ۔ وَ اَمَّا مَنْ بَخِلَ وَاسْتَغْنٰی . . . . . . فَسَنُيَسِّرُهٗ لِلْعُسْرٰی (۹۲/۵-۱۰) ۔ اسی کو ربوبیت کہتے ہیں ۔ یعنی دوسروں کی پرورش سے اپنی ذات کی نشو و نما کرنا ۔ اور یہی قرآنی تعلیم کا مقصود و منتہٰی ہے ۔

چھپانے کے اعتبار سے اَلدَّسِيْسَةُ اس مکر و فریب کو کہتے ہیں جو چھپا ہوا ہو ۔ مخفی طور پر داخل ہونے والی چیز** ۔

اہل لغت نے دَسّٰهَا میں دَسّٰی کا مادہ د ۔ س ۔ و یا د ۔ س ۔ ی بھی بتایا ہے ۔ ان مادوں کے بنیادی معنوں میں یکسانیت کی وجہ سے ہم نے دَسَّهٗ اور دَسَاهُ کو ایک ہی عنوان کے تحت دیدیا ہے ۔

د ع ع

اَلدَّعُّ ۔ سختی کے ساتھ دھکا دینا ۔ دَاعِ دَاعِ ۔ بکریوں کو ڈانٹنے کی آواز ۔ اَلدَّعَاعُ ۔ آدمی کے چھوٹے بال بچے* ۔ (جن کی وجہ سے اسے دھکے کھانے پڑتے ہیں ۔)

قرآن کریم میں ہے فَذٰلِكَ الَّذِيْ يَدُعُّ الْيَتِيْمَ (۱۰۷/۲) ۔ "یہ وہی ہے جو یتیم کو دھکے دیتا ہے" ۔ سورۃ طور میں ہے ۔ يَوْمَ يُدَعُّوْنَ اِلٰی نَارِ جَهَنَّمَ دَعًّا (۵۲/۱۳) ۔ "جس دن یہ آتش جہنم کی طرف نہایت سختی سے دھکیلے جائینگے" ۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی دھکیلنے اور اضطراب کے ہیں ۔

* تاج ۔ ** محیط ۔ *** راغب ۔

سورۃ الماعون کی مذکورہ بالا آیت (۱۰۷/۴) پر ایک مرتبہ پھر غور کیجئے سورۃ کی ابتدا اس طرح ہوتی ہے کہ اَرَءَیْتَ الَّذِیْ یُکَذِّبُ بِالدِّیْنِ (۱۰۷/۱) ''کیا تو نے اس شخص کی حالت پر بھی غور کیا ہے جو دین کو جھٹلاتا ہے؟،، کون ہے جو یہ معلوم کرنا نہ چاہیگا کہ دین کی تکذیب کون کرتا ہے؟ اس کا جواب اگلی دو آیات میں یہ دیا گیا ہے کہ فَذٰلِکَ الَّذِیْ یَدُعُّ الْیَتِیْمَ وَ لَا یَحُضُّ عَلٰی طَعَامِ الْمِسْکِیْنِ (۱۰۷/۲-۳)۔ ''یہ وہی ہے جو یتیم کو دھکے دیتا ہے اور مسکین کو کھانا کھلانے کی ترغیب نہیں دیتا،،۔ آپ نے غور کیا کہ دین اور معاشیات میں کتنا گہرا تعلق ہے؟ بلکہ صلوٰۃ اور معاش میں بھی؟ اس لئے کہ اگلی آیات میں یہ کہا گیا ہے کہ ان مصلین کے لئے تباہی ہے جو صلوٰۃ کی حقیقت سے بے خبر ہیں۔ وہ نماز کے محسوس و مرئی ارکان کی تو پابندی کرتے ہیں لیکن رزق کے ان سرچشموں کو جنہیں بہتے پانی کی طرح، رواں، دواں ہر ایک ضرورت مند تک پہنچنا چاہئے، بند لگا کر روک لیتے ہیں۔ (مزید تشریح متعلقہ عنوانات میں ملیگی)۔

د ع و

دَعَا کے معنے کسی کو پکارنے اور بلانے کے ہیں۔ چنانچہ اَلدَّعَّاعَۃُ۔ اس انگلی (سبابہ) کو کہتے ہیں جس سے اشارہ کر کے کسی کو بلایا جائے۔ اَلدَّاعِیَۃُ۔ جنگ میں گھوڑوں کی چیخ پکار کو کہتے ہیں۔ ھُوَ مِنِّیْ دَعْوَۃَ الرَّجُلِ کے معنے ہیں وہ مجھ سے اتنی دور ہے کہ وہاں تک آدمی کی آواز پہنچ جاتی ہے*۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی ہیں کسی کو اپنی آواز یا بات سے اپنی طرف مائل کرنا۔

دَعَاہُ اِلَی الْاَمِیْرِ کے معنے ہیں وہ اسے امیر کیطرف لے گیا۔ اس اعتبار سے دَاعٍ صرف بلانے والے ہی کو نہیں کہتے بلکہ اسے بھی کہتے ہیں جو کسی کو کسی دوسرے کیطرف لے جائے*۔ اِدِّعَاءٌ۔ (یَدَّعُوْنَ) کے معنے تمنا کرنے کے ہیں*۔ یا کسی چیز کو پکار پکار کر بلانے کے (۳۶/۵۷)۔

تَدَاعَوْا عَلَیْہِ کے معنے ہیں وہ اسکے خلاف جمع ہو گئے۔ اور تَدَاعٰی عَلَیْہِ الْعَدُوُّ مِنْ کُلِّ جَانِبٍ کے معنے ہیں دشمن نے ہر طرف سے اس پر حملہ کر دیا۔ تَدَاعَتِ الْحِیْطَانُ کے معنے ہیں دیواریں یکے بعد دیگرے گر پڑیں*۔

*تاج

دَعَوْتُہٗ زَیْدًا ۔ میں نے اسکا نام زید رکھ دیا ۔ اَلدَّعِیُّ ۔ وہ لڑکا جسے متبنی بنا لیا جائے*۔ (اسکی جمع اَدْعِیَاءٌ ہے ۳۳/۴)۔

اَلدَّاعِیَۃُ ۔ اس دودھ کو کہتے ھیں جسے تھنوں میں اسلئے چھوڑ دیا جاتا ھے کہ اسکے سہارے باقی ماندہ دودھ نکالا جا سکے*۔ نیز سبب یا باعث۔ اَلدَّوَاعِیْ ۔ ان چیزوں کو کہتے ھیں جو انسان کے جذبات کو ابھار دیں اور اسکے اندر ھیجان پیدا کر دیں**۔ (ان معانی کو اچھی طرح پیش نظر رکھنا چاھئے کیونکہ ان سے دُعَاءٌ کے مفہوم پر روشنی پڑتی ھے)۔

وَادْعُوْا شُھَدَاءَکُمْ (۲/۲۳) کے معنے ھیں تم اپنے مددگاروں کو بلاؤ۔ سورۃ کہف میں نَادَیٰ اور دَعَا دونوں مرادف معنوں میں استعمال ھوئے ھیں (۱۸/۵۲)۔ سورۃ اعراف میں دَعَا کے مقابل میں صَمَتَ کا لفظ آیا ھے (۷/۱۹۳) جسکے معنے چپ رھنے کے ھیں۔ لہذا دَعَا کے معنی پکارنے یا بلانے کے ھوئے۔

سورۃ بقرہ میں ھے فَادْعُ لَنَا رَبَّکَ (۲/۶۱)۔ جسکے معنے ھیں ھمارے لئے اپنے پروردگار کو پکار۔ اَلدَّعْوَیٰ ۔ پکار ۔ مطالبہ ۔ تقاضا ۔ (۱۰/۱۰)۔

اب ھمارے سامنے دُعَا کا وہ گوشہ آتا ھے جو مذھب اور فلسفہ کی دنیا میں سب سے مشکل مسئلہ سمجھا جاتا ھے اور جس کا صحیح مفہوم سامنے نہ ھونے سے طرح طرح کے شکوک اور خدشات لاحق ھو جاتے ھیں۔ یہ گوشہ ھے "خدا سے دعا مانگنے" کا۔ ان شکوک و خدشات کو سمجھنے کے لئے جن کی طرف اوپر اشارہ کیا گیا ھے ایک مثال پر غور کیجئے۔ کسی مقدمہ میں زید مدعی ھے اور بکر مدعا علیہ ۔ زید خدا سے دعا کرتا ھے کہ مقدمہ کا فیصلہ اس کے حق میں ھو جائے۔ اس سے حسب ذیل سوالات سامنے آتے ھیں ۔

(الف) ایک گروہ کا عقیدہ یہ ھے کہ انسان کے تمام معاملات کے فیصلے خدا کے ھاں پہلے سے طے شدہ ھوتے ھیں ۔ اگر یہ ٹھیک ھے تو اس کا مطلب یہ ھے کہ یہ چیز بھی پہلے سے طے شدہ ھوگی کہ اس مقدمہ میں زید کو شکست ھوگی یا فتح ۔ اب سوال یہ ھے کہ اگر یہ پہلے سے طے شدہ تھا کہ زید کو شکست ھوگی تو کیا زید کے دعا کرنے سے خدا اپنے پہلے فیصلے کو بدل دیگا اور زید مقدمہ ھارنے کے بجائے جیت جائیگا؟ اگر ایسا ھو تو اس کے یہ معنی ھوئے کہ خدا اپنے فیصلوں کو انسانوں کی مرضی کے مطابق بدلتا

*تاج ۔ **محیط ۔

رهتا ھے۔ یعنی خدا، انسانوں کی مرضی کے تابع چلتا ھے۔ خدا کے متعلق یہ تصور کسی طرح بھی صحیح نہیں ھو سکتا۔

(ب) فرض کیجئے کہ زید اپنے دعویٰ میں جھوٹا تھا۔ اب سوال یہ ھے کہ کیا اس کے دعا کرنے سے، خدا مقدمہ کا فیصلہ اس کے حق میں کر دیگا؟ اگر ایسا ھو تو اس کا مطلب یہ ھوگا کہ خدا نے جھوٹے کے حق میں فیصلہ کر دیا اور سچے کو اس کے حق سے محروم کر دیا۔ خدا کے متعلق یہ تصور بھی غلط ھے۔

(ج) فرض کیجئے کہ زید اپنے دعویٰ میں سچا ھے۔ اگر زید خدا سے دعا نہ کرے تو کیا مقدمہ کا فیصلہ اس کے حق میں ھوگا یا نہیں؟ اگر دعا کے بغیر فیصلہ اس کے حق میں نہیں ھو سکتا تو اس کا مطلب یہ ھؤا کہ خدا از خود سچے کے حق میں فیصلہ نہیں دیتا۔ سچے کو اپنے حق میں فیصلہ لینے کے لئے خدا سے منت خوشامد کرنی پڑتی ھے۔ خدا کے متعلق یہ تصور بھی غلط ھے۔

اور اگر خدا سچے کے حق ھی میں فیصلہ کرتا ھے خواہ وہ دعا کرے یا نہ کرے، تو زید کے دعا کرنے یا نہ کرنے سے کچھ فرق نہیں پڑیگا۔ خدا کو بہرحال اس کے حق میں فیصلہ کرنا تھا۔ اس صورت میں دعا ایک بیکار عمل ھؤا۔

(د) یہ ظاھر ھے کہ مقدمہ میں کامیابی حاصل کرنے کے لئے انسان کو کوشش کرنی پڑتی ھے۔ ناجائز نہ سہی، جائز ھی سہی۔ کوشش تو ضرور کرنی پڑتی ھے۔ اب سوال یہ ھے کہ اگر زید صرف دعا کرے لیکن کوشش نہ کرے تو کیا وہ مقدمہ جیت جائیگا؟ اگر وہ صرف دعا سے مقدمہ جیت جائے تو اللہ تعالیٰ نے انسان کے لئے عمل (کوشش کرنے) پر جو اسقدر زور دیا ھے تو وہ سب بیکار ھوگا۔

اور اگر کوشش کے بغیر مقدمہ نہیں جیتا جا سکتا تو پھر دعا کا فائدہ کیا ھؤا؟

(س) اگر زید اپنی جگہ خدا سے دعا کرے اور بکر اپنی جگہ۔ تو پھر مقدمہ کا فیصلہ کس کے حق میں ھوگا؟ خدا کس کی دعا قبول کریگا اور کس کی رد کریگا؟

یہ اور اس قسم کے اور بہت سے شکوک و خدشات ھیں جو دعا کے اس مفہوم سے پیدا ھوتے ھیں اور جن کے حل کرنے کے لئے مذھب* اور فلسفہ

---

*مذھب سے مراد انسانوں کا خود ساختہ مسلک ھے۔ دین خدا کی طرف سے ملتا ھے۔

صدیوں سے (ناکام) کوششوں میں مصروف ہے۔ قرآن کریم نے بتایا کہ دعا کا یہ تصور غلط ہے اور اس دور کا پیدا کردہ جب ذھن انسانی اپنے عہد طفولیت میں تھا اور کائنات میں قانون اسباب (Law of Causality) کے تصور سے نا آشنا تھا۔ اس نے بتایا کہ۔

(۱) کائنات میں ہر شے خدا کے لگے بندھے قانون کے مطابق سرگرم عمل ہے۔ اور خدا اپنے قانون میں کبھی تبدیلی نہیں کرتا۔ وَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّةِ اللّٰهِ تَبْدِيلًا (۳۳/۶۲)۔ "تو قانون خداوندی میں کوئی تبدیلی نہیں پائیگا"۔

(۲) انسانی دنیا میں بھی خدا ہی کا قانون کارفرما ہے۔ جو شخص اس قانون کے مطابق جسقدر کوشش کریگا اسی قدر وہ کامیاب ہوگا۔ لَيْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَا سَعٰى۔ وَاَنَّ سَعْيَهٗ سَوْفَ يُرٰى (۵۳/۳۹-۴۰) "انسان کے لئے اس کے سوا کچھ نہیں جس کی وہ کوشش کرے۔ اور اسکی کوشش کا نتیجہ بلاتاخیر سامنے آ جائیگا"۔

اس کے ساتھ ہی اس نے یہ بھی کہدیا کہ جو شخص خدا کے قانون کے مطابق کوشش نہیں کرتا اور محض دعا مانگنے سے سمجھتا ہے کہ مقصود حاصل ہو جائیگا، اس کا نہ تو خدا کے متعلق تصور صحیح ہے اور نہ ہی اسے کبھی کامیابی ہو سکتی ہے۔ سورۃ رعد میں ہے لَهٗ دَعْوَةُ الْحَقِّ۔ انسان کی جو دعوت تعمیری نتائج پیدا کر سکتی ہے۔ جو حق پر مبنی قرار پا سکتی ہے۔ وہ وہی دعوت ہے جو خدا کے لئے (یعنی اس کے قانون کے مطابق) ہو۔ وَالَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِهٖ لَا يَسْتَجِيْبُوْنَ لَهُمْ بِشَيْءٍ۔ اور جو لوگ خدا کے علاوہ اوروں سے اپنی طلب وابستہ کرتے ہیں۔ یعنی چاہتے ہیں کہ خدا کے قانون کو چھوڑ کر، اپنی توہم پرستیوں کے زور پر کامیاب ہو جائیں، تو وہ غلطی پر ہیں۔ ان کی یہ خود ساختہ قوتیں ان کی کوئی مانگ پوری نہیں کر سکینگی۔ ایسے لوگوں کی مثال كَبَاسِطِ كَفَّيْهِ اِلَى الْمَاءِ لِيَبْلُغَ فَاهُ وَمَا هُوَ بِبَالِغِهٖ۔ ہے، یعنی جیسے کوئی شخص (دریا کے کنارے) اپنے دونوں ہاتھ پانی کیطرف پھیلا کر بیٹھا رہے (اور دعا کرتا رہے کہ پانی اس کے منہ میں آ جائے تو) اسطرح پانی اس کے منہ تک کبھی نہیں پہنچ سکتا۔ لہذا، وَمَا دُعَاءُ الْكٰفِرِيْنَ اِلَّا فِيْ ضَلٰلٍ (۱۳/۱۴)۔ جو لوگ خدا کے قانون سے انکار کرتے ہیں ان کی دعا کبھی نتیجہ خیز نہیں ہو سکتی۔ کیا تم دیکھتے نہیں کہ وَلِلّٰهِ يَسْجُدُ

مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ طَوْعًا وَّ كَرْهًا . . . (۱۳/۱۵) - کائنات کی ہر شے، طوعًا و کرھًا، خدا کے قانون کے مطابق سر گرم عمل ہے - سو جب ساری کائنات کا سلسلہ خدا کے قانون کے مطابق چل رہا ہے، تو انسان اس سے مستثنٰے کسطرح ہو سکتا ہے؟

لہذا، قرآن کریم کی رو سے ''خدا سے دعا،، کے معنی ہیں خدا کے قانون سے مدد چاہنا - یعنی اس کی اطاعت سے اپنی کوششوں میں صحیح نتائج مرتب کرانا۔ اس حقیقت کو قرآن کریم نے متعدد مقامات پر واضح کر دیا ہے۔ مثلاً سورۃ المؤمن میں ہے وَقَالَ رَبُّكُمْ ادْعُوْنِيْ اَسْتَجِبْ لَكُمْ - تمہارا نشو و نما دینے والا کہتا ہے کہ تم مجھے پکارو - میں تمہاری پکار کا جواب دونگا (اس کا مفہوم ذرا آگے چل کر بیان کیا جائیگا) - اس کے بعد ہے اِنَّ الَّذِيْنَ يَسْتَكْبِرُوْنَ عَنْ عِبَادَتِيْ سَيَدْخُلُوْنَ جَهَنَّمَ دَاخِرِيْنَ (۴۰/۶۰) - یقینًا جو لوگ میری محکومیت اختیار کرنے سے سر کشی برتتے ہیں، وہ ذلیل و خوار ہو کر جہنم میں داخل ہوتے ہیں - آیت کے دونوں ٹکڑوں کے ملانے سے بات بالکل واضح ہو جاتی ہے کہ ''خدا کو پکارنے،، سے مراد اس کے احکام و قوانین کی محکومیت اختیار کرنا ہے - اور خدا کیطرف سے اس پکار کا جواب ملنے سے مراد انسان کی سعی و کاوش کا ثمر بار ہونا - دوسرے مقام پر اس حقیقت کو ان الفاظ میں بیان کیا گیا ہے کہ اِنَّمَا يُؤْمِنُ بِاٰيٰتِنَا الَّذِيْنَ اِذَا ذُكِّرُوْا بِهَا خَرُّوْا سُجَّدًا وَّسَبَّحُوْا بِحَمْدِ رَبِّهِمْ وَهُمْ لَا يَسْتَكْبِرُوْنَ (۳۲/۱۵)۔ ہمارے احکام پر ایمان لانے والے وہی لوگ ہیں کہ جب ان کے سامنے وہ احکام پیش کئے جاتے ہیں تو وہ سر تسلیم خم کر دیتے ہیں اور اپنے نشو و نما دینے والے (کے پروگرام کو) در خور حمد و ستائش بنانے کے لئے سر گرم عمل رہتے ہیں - اور وہ ان احکام سے سر تابی نہیں کرتے - تَتَجَافٰى جُنُوْبُهُمْ عَنِ الْمَضَاجِعِ يَدْعُوْنَ رَبَّهُمْ خَوْفًا وَّ طَمَعًا وَّ مِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ (۳۲/۱۵-۱۶) - وہ ان احکام کی تعمیل میں اسطرح سر گرم عمل رہتے ہیں کہ نیند تک کی بھی پرواہ نہیں کرتے - راتوں کو بھی جا گتے ہیں۔ اور اسطرح اپنے رب کو دفع مضرت اور جلب منفعت کے لئے پکارتے ہیں - کیونکہ انہیں علم ہوتا ہے کہ ان احکام کی تعمیل سے کیسے عمدہ نتائج مرتب ہونگے اور ان کی خلاف ورزی سے کسقدر تباہیاں آئیں گی ، جو کچھ ہم نے انہیں دے رکھا ہوتا ہے وہ اسے (نوع انسانی کی بہبود کے لئے) کھلا رکھتے ہیں - سورۃ المؤمن میں ہے فَادْعُوْهُ مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ . . . . (۴۰/۶۵)

خدا کو پکارو تو اسطرح کہ فرمان پذیری کے ہر گوشے کو خالصۃً اُسی کے لئے وقف اور مختص کردو۔ سورۃ شوریٰ میں ہے وَ یَسْتَجِیْبُ الَّذِیْنَ آمَنُوْا وَ عَمِلُوا الصَّالِحَاتِ...... (۴۲/۲۶)۔ "وہ ان کی پکار کا جواب دیتا ہے جو اس کے قوانین کی صداقت پر یقین رکھتے ہیں اور اس کے مطابق صلاحیت بخش کام کرتے ہیں"۔ یہاں سے بھی واضح ہے کہ "پکار اور اس کے جواب" سے مفہوم کیا ہے۔ سورۃ اعراف میں ہے اُدْعُوْا رَبَّكُمْ تَضَرُّعًا وَّ خُفْيَةً اِنَّهٗ لَا يُحِبُّ الْمُعْتَدِيْنَ (۷/۵۵)۔ "تم اپنے نشو و نما دینے والے کو دل کے پورے جھکاؤ اور سکون سے پکارو۔ اس طرح کہ یہ پکار تمہارے دل کی گہرائیوں سے نکلے۔ یاد رکھو! جو لوگ اس کے قانون سے سرکشی برتتے ہیں اور حد سے تجاوز کر جاتے ہیں، وہ انہیں کبھی پسند نہیں کرتا"۔ اس سے بھی واضح ہے کہ "خدا کو پکارنے" سے مراد اس کے احکام کی اطاعت ہے۔ اس سے اگلی آیت نے اسی مفہوم کی تشریح کردی ہے جہاں کہا ہے وَ لَا تُفْسِدُوْا فِی الْاَرْضِ بَعْدَ اِصْلَاحِهَا وَادْعُوْهُ خَوْفًا وَّ طَمَعًا ۔ اِنَّ رَحْمَتَ اللّٰهِ قَرِيْبٌ مِّنَ الْمُحْسِنِيْنَ (۷/۵۶-۵۷)۔ یعنی تم معاشرہ میں ہمواری پیدا ہو جانے کے بعد نا همواریاں مت پیدا کرو۔ اور خدا کو دفع مضرت اور جلب منفعت کے لئے پکارو۔ یاد رکھو! جو لوگ حسن کارانہ انداز سے معاشرہ کا توازن قائم رکھتے ہیں، خدا کی رحمت ان سے بہت قریب ہوتی ہے"۔

یہاں "خدا کی رحمت" کو قریب کہا ہے۔ سورۃ بقرہ میں خود خدا کے متعلق کہا ہے کہ وہ قریب ہے۔ وَاِذَا سَاَلَكَ عِبَادِیْ عَنِّیْ فَاِنِّیْ قَرِيْبٌ ۔ اُجِيْبُ دَعْوَةَ الدَّاعِ اِذَا دَعَانِ ۔ "اور جب میرے بندے تجھ سے میری بابت پوچھیں تو ان سے کہو کہ میں (کہیں دور نہیں ہوں۔ ان سے بہت) قریب ہوں۔ (ان کی رگ جان سے بھی زیادہ قریب - ۵۰/۱۶)۔ میں ہر پکارنے والے کی پکار کا جواب دیتا ہوں جب وہ مجھے پکارتا ہے"۔ اس کے بعد ہے۔ فَلْيَسْتَجِيْبُوْا لِیْ وَلْيُؤْمِنُوْا بِیْ لَعَلَّهُمْ يَرْشُدُوْنَ (۲/۱۸۶) "پس انہیں چاہئیے کہ میری فرمانبرداری کریں اور میرے قوانین کی صداقت پر یقین رکھیں۔ تاکہ یہ اپنی منزلِ مقصود تک پہنچنے کا راستہ پالیں"۔

اس سے واضح ہے کہ خدا کو پکارنے (دعا) سے مراد اس کے احکام کی اطاعت ہے۔ اور دعا کا جواب دینے سے مفہوم اُس اطاعت پذیری کے نتائج مرتب ہونا۔

سورۃ نمل میں پہلے کائناتی نظام کے مختلف گوشوں کیطرف توجہ دلائی گئی ہے کہ وہاں کسطرح ہر بات خدا کے قانون کے مطابق ہوتی ہے۔ اس کے بعد، اس جماعت مؤمنین کو مخاطب کیا گیا ہے جو اپنے نظام کے ابتدائی مراحل میں سخت مصیبتوں اور پریشانیوں سے گذر رہی تھی اور قدم قدم پر پکار رہی تھی کہ مَتٰی نَصْرُاللہِ (۲/۲۱۴) - خدا کی نصرت کب آئیگی ؟ ان سے کہا کہ اَمَّنْ یُّجِیْبُ الْمُضْطَرَّ اِذَا دَعَاہُ وَیَکْشِفُ السُّوْٓءَ وَیَجْعَلُکُمْ خُلَفَآءَ الْاَرْضِ . . . (۲۷/۶۲) (خدا کے علاوہ) وہ کون ہے جو (تمہارے) قلب مضطر کی پکار کا جواب دیتا ہے اور تمہاری پریشانیوں اور مشکلات کو دور کر کے تمہیں استخلاف فی الارض عطا کر سکتا ہے! لیکن یہ استخلاف فی الارض، تمہارے اعمال کے نتیجہ میں مل سکیگا (۲۴/۵۵) - اس لئے تم گھبراؤ نہیں - خدا کے قانون کے مطابق عمل کرتے جاؤ۔ وہ تمہاری بیکسی اور بے چارگی کو غلبہ و تسلط سے تبدیل کردیگا - اگر تم اس راستے پر چلتے رہے تو ہماری کائناتی قوتیں، ان مخالفین کی ضرر رسانیوں سے تمہاری حفاظت طلب کرتی رہینگی (۴/۲)۔ جماعت مومنین تو ایکطرف، خود حضرات انبیاء کرامؑ سے بھی یہی کہا گیا - مثلاً سورۃ یونس میں حضرت موسٰیؑ کے قصہ کو دیکھئے - حضرت موسٰیؑ اور ہارونؑ فرعون کا مقابلہ کرنے کے لئے دعائیں مانگتے ہیں - اسکے جواب میں ان سے کہا جاتا ہے - قَدْ اُجِیْبَتْ دَّعْوَتُکُمَا، فَاسْتَقِیْمَا (۱۰/۸۹)۔ تم دونوں کی ''دعاء قبول ہوگئی ہے''۔ بس اب تم اپنے پروگرام پر پوری پوری استقامت سے کاربند رہو۔ ظاہر ہے کہ اگر دعاء قبول ہو جانے کا مطلب یہ ہوتا کہ جو کچھ تم نے مانگا ہے وہ تمہیں دیدیا گیا ہے (یا وہ تمہیں مل جائیگا) تو اسکے بعد اسکے لئے کسی کوشش کی ضرورت نہ تھی - لیکن یہاں کہا یہ گیا ہے کہ تمہاری دعاء قبول ہو گئی ہے - لہٰذا اب تم نہایت استقامت سے اس پروگرام پر کاربند رہو۔ اس سے واضح ہے کہ جو کچھ حضرت موسٰیؑ اور حضرت ہارونؑ سے کہا گیا تھا وہ فقط اتنا ہی تھا کہ تمہاری یہ آرزوئیں ہمارے قانون کے مطابق ہیں لہٰذا تم ان کے حصول میں نہایت مستقل مزاجی سے کوشش کرو۔ تم ضرور کامیاب ہو جاؤ گے -

تصریحات بالا سے یہ حقیقت واضح ہے کہ قرآن کریم کی رو سے خدا سے دعا کرنے کے معنی اس کے احکام و قوانین کی اطاعت کرنا ہیں - اسی ''دعا'' کا حکم رسول اللہؐ کو دیا گیا تھا۔ قُلْ اِنَّمَآ اَدْعُوْا رَبِّیْ وَلَآ اُشْرِکُ بِہٖٓ اَحَدًا (۷۲/۲۰) - ان سے کہدو کہ میں صرف اپنے رب کو پکارتا

ہوں اور اس میں کسی اور کو اس کے ساتھ شریک نہیں کرتا ۔ یعنی اس کی حاکمیت میں کسی اور کو شریک نہیں کرتا (۱۸/۲۶) ۔

"دعا،، کے اس قرآنی مفہوم کے بعد ان شکوک و خدشات کی کوئی گنجائش ہی نہیں رہتی جن کا ذکر پہلے کیا جا چکا ہے ۔

اب ذرا آگے بڑھئے ۔ جن باتوں کو ہم اپنی اصطلاح میں "دعا،، کہتے ہیں، قرآن کریم میں وہ بھی ہیں ۔ مثلاً رَبَّنَا اغْفِرْ لَنَا ذُنُوْبَنَا وَ اِسْرَافَنَا فِیْ اَمْرِنَا وَ ثَبِّتْ اَقْدَامَنَا ۔ وَانْصُرْنَا عَلَی الْقَوْمِ الْکَافِرِیْنَ (۳/۱۴۶) ۔ " اے ہمارے نشو و نما دینے والے! تو ہماری کوتاہیوں، اور معاملات میں حد سے بڑھ جانے کے مضر نتائج سے ہماری حفاظت کر ۔ ہمارے قدموں کو استقامت عطا فرما اور ہمیں قوم کفار پر کامیابی عطا کر دے،، ۔ یعنی وہ دعائیں جن میں انسان اپنی کسی آرزو کے بر آنے کی درخواست کرتا ہے ۔ یہ دعائیں در حقیقت انسان کی آرزو کی شدت کا مظاہرہ ہوتی ہیں ۔ اس شدت آرزو سے انسان کی اپنی ذات میں ایسا تغیر واقع ہوتا ہے جس سے اسکی خفیہ قوتیں بیدار ہو جاتی ہیں اور مضمر صلاحیتیں بروئے کار آجاتی ہیں ۔ انکی وجہ سے اس کا عزم راسخ اور ہمت بلند ہو جاتی ہے اور وہ موانعات کا مقابلہ کرنے اور شدائد پر غلبہ پا لینے کے قابل ہو جاتا ہے ۔ (اَلدَّاعِیَۃُ اور اَلدَّوَاعِیْ کے جو معنی شروع میں دئے گئے ہیں ۔ ان پر غور کیجئے) یعنی سب سے پہلے تو یہ کہ انسان وہی کچھ چاہے جو قانون خدا وندی کے مطابق ہو ۔ اور پھر اس مقصد کے حصول کے لئے آرزو میں شدت پیدا کرے ۔ اس سے اس کے اندر ایسی انقلابی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے جس کے نتائج حیرت انگیز ہوتے ہیں (واضح رہے کہ قرآن کریم نے یہ بھی کہا ہے کہ تمہاری ہر آرزو، قانون خداوندی کے مطابق ہونی چاہئے، ورنہ تم وہ کچھ طلب کرنے لگ جاؤ گے جو تمہارے لئے در حقیقت مضر ہوگا ۔ ۱۷/۱۱) ۔ اس حقیقت کو علامہ اقبالؒ نے ان الفاظ میں بیان کیا ہے کہ ۔

تری دعا سے قضا تو بدل نہیں سکتی
مگر ہے اس سے یہ ممکن کہ تو بدل جائے

کہا جا سکتا ہے کہ اگر انسان اپنے کسی مقصد کے حصول کے لئے اپنے اندر ویسے ہی شدت آرزو پیدا کر لے تو اس سے بھی اسکی قوتیں بیدار ہو جاتی ہیں ۔ پھر اس میں اور خدا سے دعاء کرنے میں کیا فرق ہے؟ یہ ٹھیک ہے کہ اسطرح بھی انسان کی قوتیں بیدار ہو جاتی ہیں لیکن مقصد

صرف قوتوں کی بیداری نہیں - سب سے پہلی چیز خود مقصد کا تعین ہے - یعنی وہ مقصد ہے کیا جسکے حصول کیلئے آرزو کی جا رہی ہے - اور وہ ہے کیسا ؟ - پھر اسکے حصول کیلئے طریقے کیا کیا اختیار کئے جائینگے - اور اس تمام سعی و کاوش کے ماحصل کو کس مصرف میں لایا جائیگا - ایک مرد مومن (قرآنی انسان) ان تمام امور کا فیصلہ خدا کے احکام کی روشنی میں کرتا ہے اسلئے وہ، پہلے قدم سے آخری قدم تک، خدا کو اپنے سامنے رکھتا ہے - اسکی طلب و آرزو کی شدت بھی اس سلسلہ کی ایک کڑی ہوتی ہے - اسلئے وہ اسکے لئے بھی خدا ہی کو پکارتا ہے - خدا کی طرف سے سب کچھ اسکے قانون کے مطابق ہوتا ہے - حتیٰکہ دعاء کے نتیجہ میں انسان کی خفیہ قوتوں کی بیداری بھی اسکے قانون ہی کے مطابق ہوتی ہے - علاوہ بریں، ایک اور بھی نقطہ ہے جس کا سمجھ لینا ضروری ہے - خدا نے انسانی ذات میں ایسی صلاحیت دے رکھی ہے کہ وہ مناسب نشو و نما سے اپنے اندر (علٰی حید بشریت) ان صفات کو اجاگر کرتی جائے جنہیں (لا محدود طور پر) صفات خداوندی یا الاسماء الحسنٰی کہا جاتا ہے - اس نقطہ نگاہ سے خدا کی ذات (یعنی ان صفات حسنٰی کی حامل ذات) انسانی ذات کی نشو و نما کے لئے معیار (Standard) بن جاتی ہے - انسان کا اپنی شدت آرزو میں خدا کو پکارنے سے مقصد یہ ہوتا ہے کہ وہ اپنے اندر ان صفات خداوندی کو اجاگر کرنا چاہتا ہے جن سے مقصد پیش نظر میں کامیابی ہو جائے - یہ ہے فرق ''خدا سے دعا مانگنے،، اور اپنے طور پر شدت آرزو پیدا کرنے میں -

(دعا کی اجابت کے لئے عنوان ج و ب بھی دیکھئے)

اب رہیں حضرات انبیاء کرام ؑ کی وہ ذاتی دعائیں جن کا ذکر قرآن میں ہے - سو نبوت کا معاملہ عام انسانی معاملات سے بالکل الگ ہے - اسکے متعلق ہم نہ کچھ سمجھ سکتے ہیں نہ سمجھا سکتے ہیں - ہم ان کے لائے ہوئے پیغام کو سمجھتے ہیں اور اسی کی اطاعت ہمارا فریضہ ہے - باقی رہا ان کی دعاؤں سے یہ نتیجہ نکالنا کہ جسطرح خدا ان کی دعا کے جواب میں ان سے ہم کلام ہوتا تھا، اسی طرح دیگر (غیر از انبیاء) انسانوں سے بھی ہم کلام ہو سکتا ہے - تو یہ چیز وحی اور نبوت کے قرآنی تصور کے یکسر خلاف ہے - خدا، حضرات انبیاء کرام ؑ کے علاوہ کسی انسان سے ہمکلام نہیں ہوتا - اور نبی اکرم ؐ کے بعد ایسا سمجھنا ختم نبوت کی مہر کو توڑنا ہے -

نہ ہی یہ عقیدہ صحیح ہے کہ خدا ہماری دعا کو نہیں سنتا اس لئے ''خدا کے کسی مقرب،، سے درخواست کی جائے کہ وہ ہمارے لئے خدا سے

دعا کرے ۔ قرآن کی رو سے خدا اور بندے کے درمیان کوئی قوت حائل نہیں ہو سکتی ۔ ایسا سمجھنا شرک ہے ۔ ''خدا تک پہنچنے،، یا اس تک اپنی آواز پہنچانے کے لئے کسی ذریعے اور واسطے کی ضرورت نہیں ہوتی ۔ ہر انسان، اس کے قوانین کے اتباع سے ''اس تک پہنچ سکتا ہے،، اور اپنی آواز اس تک پہنچا سکتا ہے ۔ (وسیلہ کے قرآنی مفہوم کے لئے متعلقہ عنوان دیکھئے) اور اس کے قوانین کا اتباع، قرآنی معاشرہ کے اندر رہ کر ہوتا ہے ۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن کریم نے جو دعائیں مومنین کے لئے بتائی ہیں وہ عام طور پر اجتماعی ہیں ۔ مثلاً ۱/۵-۷ و ۲/۲۰۱ و ۲/۲۸۶ و ۳/۸ و ۳/۱۳۶ و ۳/۱۹۲) ۔

سورۃ بقرہ کی جو آیت اوپر درج کی گئی ہے ۔ یعنی وَ اِذَا سَاَلَکَ عِبَادِیْ عَنِّیْ فَاِنِّیْ قَرِیْبٌ ۔ (۲/۱۸۶) ۔ ''جب تجھ سے میرے بندے میرے متعلق پوچھیں تو (ان سے کہدو کہ) میں قریب ہوں،، ۔ یا نَحْنُ اَقْرَبُ اِلَیْهِ مِنْ حَبْلِ الْوَرِیْدِ ۔ (۵۰/۱۶) ''میں انسان سے اسکی رگ جان سے بھی قریب ہوں،، ۔ تو ان میں ضمناً خدا کے موجود فی الکائنات (Immanence) اور خارج از کائنات (Transcendence) کی طرف بھی اشارہ موجود ہے ۔ وہ ہر انسان سے، اسکی رگ جان سے بھی قریب ہے ۔ تو اس سے ظاہر ہے کہ خدا کائنات میں ہر جگہ موجود ہے ۔ لیکن اسطرح موجود نہیں جسطرح کوئی چیز کسی خاص مقام میں مقید ہوتی ہے ۔ چونکہ ہمارے حواس کسی ایسی شے کا تصور نہیں کر سکتے جو فضا (Space) کے اندر مقید نہ ہو اس لئے ہم اسے سمجھ ہی نہیں سکتے کہ خدا، اس کائنات میں، بغیر جگہ (Space) گھیرے کسطرح موجود ہے ۔ اسی لئے قرآن کریم نے کہدیا ہے کہ لَا تُدْرِکُهُ الْاَبْصَارُ ۔ وَ هُوَ یُدْرِکُ الْاَبْصَارَ (۶/۱۰۳) ۔ انسانی نگاہیں اس کا ادراک نہیں کر سکتیں ۔ لیکن وہ انسانی نگاہوں کا ادراک و احاطہ کئے ہوئے ہے ۔ لیکن اس کے قانون کا ہم ادراک بھی کر سکتے ہیں اور نتائج سے اس کا مشاہدہ بھی ہو سکتا ہے ۔ اس لئے قرآن کریم نے ہمارا تعلق خدا کے قانون سے بتایا ہے ۔ خود خدا کی ذات سے نہیں ۔ دُعَا (پکارنے) کا تعلق بھی خدا کے قانون سے ہے ۔ ہم اس کے قانون کو آواز دیتے ہیں اور جب ہم اس کے مطابق عمل کرتے ہیں تو وہ ان اعمال کے مشہود نتائج کو سامنے لا کر ہماری پکار کا جواب دیتا ہے ۔

باقی رہا خدا کا علم، سو جس چیز کو ہم ''ماضی ۔ حال ۔ مستقبل،، کہتے ہیں، علم خداوندی کی رو سے اسکی کوئی حقیقت نہیں ۔ خدا کے سامنے ماضی، حال اور مستقبل سب بیک وقت (Eternal now کی شکل میں) موجود

ہوتے ہیں ۔ یعنی ایسے ہونے والے واقعات کا اسطرح علم ہوتا ہے جیسے وہ سامنے اسوقت ہو رہے ہوں۔ لیکن اس چیز کا ہمارے اس اختیار و ارادے پر کچھ اثر نہیں پڑتا جو ہمیں خدا نے عطا کیا ہے ۔ نہ ہی اس بات پر کوئی اثر پڑتا ہے کہ ہمارے لئے جو کچھ ہوتا ہے وہ ہمارے اپنے اعمال کا نتیجہ ہوتا ہے ۔ سب کچھ خدا کے سامنے ہو رہا ہوتا ہے (ایسے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ ہمیں کیا کرنا ہے) لیکن وہ ہمارے اختیار و ارادہ کو سلب نہیں کرتا ۔ ہم جو چاہتے ہیں کرتے ہیں ۔ اور جو کچھ کرتے ہیں اس کا نتیجہ بھگتتے ہیں۔ اگر ہم خدا کے قانون کے مطابق کرتے ہیں تو اس کا نتیجہ خوشگوار ہوتا ہے ۔ اس کے خلاف کرتے ہیں تو نقصان اٹھاتے ہیں ۔ کسی میں اس کی طاقت نہیں کہ خدا کے قانون کے خلاف کرے اور اس کا نتیجہ خوشگوار مرتب کرے۔ خدا کے قانون کے مطابق قدم اٹھانا، خدا کو پکارنا یا دعا کرنا ہے ۔ اور اس کا خوشگوار نتیجہ مل جانا، دعا کا قبول ہو جانا ۔

د ف أ

اَلدِّفْءُ ۔ حرارت اور گرمی۔ نیز وہ چیز جو گرمی پہنچائے ۔ اَدْفَاَہٗ ۔ اس نے اسے ایسا کپڑا پہنا دیا جو اسے گرم کردے۔ اَلدِّفَاءُ ۔ ہر وہ چیز جو گرمی پہنچائے ۔ مثلاً اون وغیرہ* ۔ قرآن کریم میں مویشیوں کے متعلق ہے لَکُمْ فِیْھَا دِفْءٌ وَّ مَنَافِعُ (۱۶/۵) ۔ یعنی ان میں تمہارے لئے (اون وغیرہ سے) گرمی یا گرمی بہم پہنچانے والا سامان اور دیگر فائدے ہیں ۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ دِفْءٌ ۔ اونٹوں کے بچوں ، ان کے دودھ اور ان کی دیگر منفعت بخش اشیاء کے لئے بولا جاتا ہے ۔

د ف ع

دَفْعٌ ۔کسی چیز کو قوت سے دور کردینا ۔ ہٹا دینا** ۔ (۲/۲۵۱) صاحب محیط نے کہا ہے کہ اَلدَّفْعُ کے معنے ہیں کسی بات کو وارد ہونے سے پہلے ہی دور کر دینا اور اَلرَّفْعُ کے معنے ہیں، اسے وارد ہو جانے کے بعد دور کرنا***۔ بصائر میں ہے کہ جب دَفْعٌ کے بعد اِلٰی آئے تو اس کے معنے سونپنے یا ادا کر دینے کے ہونگے۔ جیسے۔ فَادْفَعُوْا اِلَیْھِمْ اَمْوَالَھُمْ (۴/۶) میں یعنی۔ ''ان کے مال انہیں سونپ دو'' ۔ اور جب اس کے بعد عَنْ آئے تو اس کے معنے حمایت کرنے یا حفاظت کرنے کے ہوتے ہیں**۔ جیسے

*تاج و راغب ۔ ** تاج ۔ *** محیط ۔

اِنَّ اللّٰهَ یُدٰفِعُ عَنِ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا (۲۲/۳۸)۔ ''یقیناً اللہ (کا قانون) ان کی حفاظت کرتا ہے جو اس کی صداقت پر یقین رکھتے ہیں''۔ اَلْمُدَافَعَۃُ ۔ ایک دوسرے کو ہٹانا اور دھکے دینا*۔ دَافِعٌ ۔ ہٹانے والا (۵۲/۸)۔

د ف ق

دَفَقَ الْمَآءَ یَدْفُقُ ۔ اس نے پانی گرا دیا بہا دیا ۔ دَفَقَ الْکُوْزَ ۔ پیالہ کے پانی کو یکبارگی گرا کر منتشر کردیا ۔ دَفَقَ الْمَآءُ ۔ پانی یکبارگی ابل پڑا ۔ سَیْلٌ دُفَاقٌ ۔ وہ سیلاب جس کا پانی وادی سے اوپر اچھل جائے ۔ اَلدِّفَقُّ ۔ تیز رفتار اونٹ ۔ اَلدِّفِقّٰی ۔ ایک ایسی تیز رفتار جس میں جانور اچھل کر چلے**۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی ہوتے ہیں کسی چیز کو آگے کی طرف دھکا دینا ۔

قرآن کریم میں انسانی تخلیق کے سلسلہ میں ہے خُلِقَ مِنْ مَّآءٍ دَافِقٍ (۸۶/۶) ۔ ''اسے پیدا کیا گیا ہے تیزی سے اچھل کر گرنے والے پانی (مادہ تولید) سے ۔ (یہ مَآءٌ مَدْفُوْقٌ کے معنوں میں آیا ہے)۔

د ک ک

اَلدَّکُّ ۔ کوٹنا ۔ توڑنا (دیوار یا پہاڑ کو) منہدم کر دینا ۔ دراصل یہ کسی چیز کو توڑ کوٹ کر زمین کے برابر کر دینے کے لئے استعمال ہوتا ہے*** ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی پست ہوجانے اور بچھ جانے کے ہیں۔ اَلدَّکَّۃُ ۔ اَلدَّکُّ ۔ ہموار جگہ ۔ زمین کے نشیب و فراز (اونچائی نیچائی) کو ہموار کر دینا*** ۔ اِذَا دُکَّتِ الْاَرْضُ دَکًّا دَکًّا (۸۹/۲۱) ۔ ''جب زمین کے نشیب و فراز کو مٹا کر ہمواری پیدا کر دی جائے گی'' ۔ جب معاشی**** ہمواریاں پیدا کر دی جائینگی اور اونچ نیچ سب مٹا دی جائینگی ۔ فَدُکَّتَا دَکَّۃً وَّاحِدَۃً (۶۹/۱۴) ۔ ایک ہی مرتبہ ہموار کر دی جائیگی ۔ جَعَلَہٗ دَکًّا (۷/۱۴۳) ۔ اسے ہموار کر دیا ۔ نشیب و فراز مٹا دیا ۔ جَعَلَہٗ دَکَّآءَ (۱۸/۹۸) اسے توڑ کر ہموار کردے گا ۔ (یہاں اَرْضٌ محذوف ہے جس کے لئے دَکَّآءُ مؤنث آیا ہے) ۔ تاج نے لکھا ہے کہ اَلدَّکَّآءُ مٹی کے ٹیلے کو کہتے ہیں ۔ اس اعتبار سے جَعَلَہٗ دَکَّآءَ کے معنی یہ ہونگے کہ وہ دیوار مسمار ہو کر ٹیلہ سا بن جائیگی ۔ اَرْضٌ دَکَّآءُ ۔ ہموار زمین***** ۔

اَلدُّکَّانُ ۔ ایسی جگہ جسکا اوپر کا حصہ بیٹھنے کے لئے ہموار کرلیا جائے*** ۔

*تاج ۔ **تاج و راغب و محیط ۔ ***تاج و محیط ۔ ****دیکھئے عنوان ارض۔
*****راغب ۔

د ل ک

دَلَکَہٗ یدْلُکُہٗ دَلْکًا - کسی چیز کو ہاتھ سے ملنا اور رگڑنا - دَلَکَتِ الشَّمْسُ دُلُوْکًا - آفتاب کا غروب ہونا، کیونکہ اسکی طرف دیکھنے والا اپنی آنکھوں کو ملنے لگتا ہے* - (لیکن ہمارے نزدیک یہ توجیہ کمزور سی ہے) دَلَکَتْ دُلُوْکًا - آفتاب کا زرد ہو جانا اور زوال یا غروب کی طرف مائل ہو جانا- آفتاب کا ظہر کے وقت وسط آسمان سے نیچے کی طرف ڈھل جانا**- ازہری نے کہا ہے کہ اسکے یہی معنے صحیح ہیں کیونکہ کلام عرب میں دُلُوک کے معنے زوال کے آتے ہیں - ابن فارس نے بھی اس مادہ کے بنیادی معنے کسی چیز کا دوسری چیز سے ہٹ جانا (زوال) بتائے ہیں - لیکن اس نے کہا ہے کہ دُلُوْک میں کسی چیز کا نرمی اور آسانی سے ہٹ جانا پایا جاتا ہے - ملنے رگڑنے کے لئے بھی یہ لفظ اسی جہت سے استعمال ہوتا ہے کیونکہ ایسی صورت میں ہاتھ ایک جگہ نہیں ٹھہرتا -

آلوسی نے روح المعانی میں لکھا ہے کہ اس مادہ کے بنیادی معنی ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل ہونے کے ہیں - اس لئے زوال بھی دلوک ہے اور غروب بھی دلوک ہے- جب آفتاب نصف النہار میں زوال کر جاتا (ڈھل جاتا) ہے تو اسے دَالِکَۃ کہتے ہیں - ایسے ہی جب وہ غروب ہو جائے تب بھی اسے دَالِکَۃ کہتے ہیں، **کیونکہ دونوں حالتوں میں اسے زوال ہوتا ہے- لیکن نوادر الاعراب میں ہے کہ اسکے معنی آفتاب کے بلند اور اونچا ہونے کے آتے ہیں - ابن فارس نے کہا ہے کہ دال (د) جہاں بھی لام (ل) کے ساتھ آئیگا تو وہ حرکت کرنے، آنے جانے، اور ایک جگہ سے دوسری جگہ زوال پذیر ہونے، پر دلالت کریگا - چنانچہ دَلَکَ الثَّوْبَ کے معنے ہیں کپڑے کو دھونے کیلئے ملا - دَلَکَتِ الْمَرْاَۃُ الْعَجِیْنَ : عورت نے آٹا گوندھا - تَدَلَّکَ الرَّجُلُ - آدمی نے نہاتے ہوئے اپنے بدن کو ملا - اَلدَّلُوْکُ - خوشبو یا دوا وغیرہ جسے ملا جائے - بَعِیْرٌ مَدْلُوْکٌ - اس اونٹ کو کہتے ہیں جسے سفروں میں برابر کام میں لایا گیا ہو- اَلدَّالِیْکُ- چلنے میں پلا پاؤں جمائے تیزی سے چلنا* - ان تمام معانی سے واضح ہے کہ اصل معنے اس مادہ کے حرکت کرنے ہی کے ہیں - لہذا جب آفتاب طلوعِ صبح سے دوپہر تک بلند ہوتا جاتا ہے تو اسے بھی دُلُوْک کہینگے (جیسا کہ نوادرالاعراب کے حوالہ سے اوپر لکھا گیا ہے) اور جب وہ نصف النہار

*تاج - محیط - راغب - **اسکی تائید ابن درید نے جمہرۃ اللغۃ میں کی ہے -

تک پہنچکر نیچے کی طرف حرکت کریگا (یعنے ڈھلنا شروع ہوگا) تو اسے بھی دُلُوْکٌ ہی کہینگے (جیسا کہ اوپر لکھا گیا ہے۔ نیز راغب نے بھی اسکے معنے سائل بہ غروب ہونے کے لکھے ہیں*) ابن درید نے جمہرۃ اللغۃ میں کہا ہے کہ دلوک کے معنی غروب اور غائب ہو جانا ہیں۔

قرآن کریم میں ہے أَقِمِ الصَّلٰوةَ لِدُلُوْكِ الشَّمْسِ اِلٰى غَسَقِ اللَّيْلِ وَ قُرْآنَ الْفَجْرِ (۱۷/۷۸)۔ اس کا عام ترجمہ یہ ہوگا "صلٰوۃ قائم کرو دلوک شمس سے غسق لیل تک۔ اور فجر کا قرآن"۔ یہاں اگر دُلُوْکٌ کے معنے عام حرکت کے لئے جائیں تو اسمیں طلوع آفتاب سے غروب آفتاب تک کا سارا وقت آجاتا ہے۔ اور قُرْآنَ الْفَجْرِ۔ طلوع آفتاب سے پہلے، اور غَسَقِ اللَّيْلِ۔ غروب آفتاب کے بعد۔ یعنے اسطرح اس آیت میں سونے کا وقت نکال کر باقی دن رات کا سارا وقت آجاتا ہے۔ مفہوم ظاہر ہے کہ صلٰوۃ کیلئے یہ سارا وقت تمہارے لئے کھلا رکھا ہے۔ اور اگر دُلُوْکٌ کو زوال آفتاب سے غروب تک مقید کر دیا جائے تو پھر (اوپر کے مفہوم کی رو سے) طلوع آفتاب سے لیکر اسکے نصف النہار تک پہنچنے کا وقت خارج ہو جائیگا۔ دوسری جگہ صَلٰوةٌ کیلئے طَرَفَيِ النَّهَارِ وَ زُلَفًا مِّنَ اللَّيْلِ (۱۱/۱۱۴) کے الفاظ آئے ہیں۔ یعنے دن کے دونوں کناروں اور رات کے (ابتدائی) حصوں میں۔ دن کے دونوں کنارے فجر اور مغرب ہیں اور رات کے (ابتدائی) حصے غَسَقُ اللَّيْلِ۔ سورۃ نور میں صَلٰوةُ الْفَجْرِ اور صَلٰوةُ الْعِشَاءِ (۲۴/۵۸) کا خصوصیت سے نام لیا گیا ہے۔ اس سے ظاہر ہے کہ نزول قرآن کریم (رسول اللہؐ) کے زمانہ میں ان دونوں اوقات میں اجتماعات صلٰوۃ ہوتے تھے۔ یہ قُرْآنَ الْفَجْرِ اور غَسَقُ اللَّيْلِ کے اوقات تھے۔ باقی وقت دُلُوْکُ الشَّمْسِ سے غَسَقُ اللَّيْلِ تک کا ہے۔ اسے صبح سے شام کہہ لیجئے یا سورج ڈھلنے سے شام تک کا وقت۔ دُلُوْکٌ کے عام مفہوم کے اعتبار سے پہلے معانی (صبح سے شام تک کا وقت) لغوی اعتبار سے زیادہ موزوں ہونگے۔

(غَسَقٌ۔ ابتداءِ شب کی تاریکی کو کہتے ہیں۔ دیکھئے عنوان غ۔ س۔ ق)۔

صلٰوۃ سے متعلق عنوان (ص۔ ل۔ و) میں آپ دیکھینگے کہ صلٰوۃ سے مراد صرف وقتی اجتماعات نماز ہی نہیں۔ اس سے مراد قرآنی نظام یا قرآن کریم کے مطابق متعین کردہ فرائض زندگی بھی ہے۔ اس اعتبار سے اگر اس آیت (۱۷/۷۸) میں بھی اقامت صلٰوۃ کے معنی فرائض زندگی کی سر انجامدہی

---

* تاج۔ محیط۔ راغب۔

یا قرآنی نظام کے قیام کے لئے جائیں تو اس کے معنی یہ ہونگے کہ آغاز کار سے پہلے (ہر روز، صبحدم) یہ دیکھو کہ زیر نظر پروگرام کے لئے قرآن کریم کی طرف سے کیا راہ نمائی ملتی ہے (یہ قُرْآنَ الْفَجْرِ ہوگا) اور پھر صبح سے شام تک اس پروگرام کی تکمیل میں مصروف کار رہو۔ یہ اقامت صلٰوۃ دلوک شمس سے غسق لیل تک ہوگا۔

د ل ل

دَلَّتِ الْمَرْاَۃُ وَدَلَالُھَا عَلٰی زَوْجِھَا۔ بیوی کا اپنے شوہر سے ناز و نخرے کرنا۔ اسکا فرط ناز میں ایسی حرکات کرنا جن سے بظاہر نظر آئے کہ وہ شوہر کی مخالفت کر رہی ہے لیکن درحقیقت ایسا نہ ہو۔ دَلَّہٗ عَلٰی الشَّیْءِ۔ اسے کوئی چیز بتائی، اس تک رہنمائی کی۔ اَدَلَّ عَلَیْہِ۔ وہ اس سے بے تکلف ہوا، اس پر جری ہوا، اس کی محبت پر مکمل اعتماد کی وجہ سے اس پر زیادتی کی۔ اَلدَّالَّۃُ۔ نازوادا۔ اَلدَّلٰی۔ واضح راستے کو کہتے ہیں۔ اور اَلدَّلِیْلُ۔ رہنما جس سے کسی چیز کا پتہ نشان معلوم کیا جائے۔ وہ چیز جس سے بات واضح کی جائے۔ اَلدَّلَالَۃُ۔ کسی کو راستہ دکھا دینے نیز علامتوں سے کسی چیز کا پتہ دینے کو کہتے ہیں۔ راغب نے کہا ہے کہ اس سے مراد وہ چیز ہوتی ہے جس سے کسی دوسری چیز کی معرفت حاصل کی جائے*۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی ہیں کسی چیز کو کسی ایسی علامت کے ذریعے ظاہر کر دینا جسے تم غور و فکر کے بعد بتدریج جانو۔ یعنی معلوم علامت کے ذریعے اظہار حقیقت۔ نیز کسی چیز میں اضطراب اور حرکت کا موجود ہونا۔ قرآن مجید میں ہے کہ تم اپنے رب کے سایہ بڑھانے (کی حکمت) پر غور نہیں کرتے۔ اسکے بعد ہے ثُمَّ جَعَلْنَا الشَّمْسَ عَلَیْہِ دَلِیْلًا (۲۵/۴۵)۔ سایہ کے اس طرح گھٹنے اور بڑھنے کو معلوم کرنے کا ذریعہ (یا اسکا موجب) سورج کی روشنی ہے۔ اگر سورج کی روشنی نہ ہو تو سایہ بھی نہ ہو اور اسکا گھٹنا بڑھنا معلوم نہ ہو سکے۔ سورۃ السبأ میں ہے مَادَلَّھُمْ عَلٰی مَوْتِہٖ اِلَّا .... (۳۴/۱۴)۔ کسی چیز نے انہیں (حضرت سلیمانؑ کی) موت کا پتہ نہیں دیا بجز .... یعنی وہ چیز بتدریج، غور و فکر کے بعد، ذریعہ بنی اس امر کا کہ لوگوں کو معلوم ہو جائے کہ حضرت سلیمانؑ فی الواقعہ وفات پا چکے ہیں۔ (اسکی تفصیل عنوان حضرت سلیمانؑ میں ملیگی)۔ لہذا دلیل وہ ذریعہ ہے جس سے کسی بات کا علم غور و فکر کے بعد بتدریج ہو سکے۔

*تاج و محیط و راغب۔

د ل و (ی)

اَلدَّلْوُ۔ ڈول ۔ (جب ڈول پانی سے بھرا ہوا ہو تو اسے ذَنُوْبٌ* کہتے ہیں*** لیکن یہ کلیہ نہیں ہے ۔) دَلَوْتُ ۔ اَدْلَیْتُ ۔ میں نے ڈول کنویں میں ڈالا* ۔ یا ڈول بھر کر کنویں سے نکالا** ۔ اسی سے اَدْلٰی کے معنے ہیں کسی چیز تک پہنچنے کے لئے ذریعہ یا وسیلہ فراہم کرنا ۔ جیسے پانی تک پہنچنے کے لئے ڈول ڈالنا پڑتا ہے ۔ اَدْلٰی اِلَیْہِ بِمَالِہٖ : اسے اپنا مال دیا* ۔ دَلٰی حَاجَتَہٗ دَلْوًا ۔ اس نے اپنی ضرورت کو طلب کیا۔ اَدْلٰی بِرَحِمِہٖ ۔ اسنے اپنی رشتہ داری کو ذریعہ بنا کر چاہا کہ دوسرے تک پہنچ جائے اور اپنا کام نکال لے* ۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی ہیں نرمی اور سہولت کے ساتھ کسی چیز کے قریب ہو جانا ۔ قرآن کریم میں ہے تُدْلُوْا بِهَا اِلَی الْحُكَّامِ ($\frac{۲}{۱۸۸}$) مال کے ذریعہ (رشوت دیکر) حکام تک پہنچ کر اپنے حق میں فیصلہ لے لینا ۔

ڈول کو کنویں میں لٹکانے کی جہت سے تَدَلّٰی کے معنے ہوتے ہیں لٹکنا۔ قریب ہو جانا ۔ سورۃ النجم میں ہے ثُمَّ دَنَا فَتَدَلّٰی ($\frac{۵۳}{۸}$) وہ قریب ہوا ۔ (ہم رنگ ہو گیا) ۔ ان حقائق کی گہرائیوں میں ڈوب گیا۔ یہ مقام نبوت کی خصوصیات میں سے ہے ۔ سورۃ اعراف میں ہے فَدَلّٰهُمَا بِغُرُوْرٍ ($\frac{۷}{۲۲}$) انہیں فریب دیکر پستیوں کی طرف گرا دیا ۔ دَالَاۃٌ ۔ مُدَالَاۃٌ ۔ اس سے نرمی اور مداراۃ کی** ۔ دَلِیَ ۔ یَدْلٰی ۔ متحیر ہونا*

د م د م

دَمْدَمَ الْقَوْمَ وَدَمْدَمَ عَلَیْهِمْ ۔ قوم کو ہلاک و برباد کر دیا۔ دَمْدَمَ عَلَیْهِ ۔ اس پر غصہ ہوا اور غصہ میں اس سے بات کی* ۔ دَمْدَمَ عَلَیْهِمْ ۔ انہیں ہلاک کیا اور پریشان و بے چین کیا**** ۔ اَلدَّمْدَمَةُ پریشان کن گفتگو ۔ غضب* ۔ تباہ و برباد کرنا***** اَلدَّمْدَمُ ، سوکھی گھاس* ۔ دَمْدَمَ الرَّعْدُ ۔ گرج زور دار ہوئی** ۔

قرآن کریم میں ہے فَدَمْدَمَ عَلَیْهِمْ رَبُّهُمْ ($\frac{۹۱}{۱۴}$) ۔ ان کے رب (کے قانون مکافات) نے انہیں اسطرح ہلاک کر دیا کہ ان کا نام و نشان تک باقی نہ رہا ۔

---

* تاج ۔ **لین ۔ *** محیط ۔ **** لطائف اللغۃ ۔ ***** راغب ۔

****** ابن فارس ۔

د م ر

اَلدُّمُوْرُ - اَلدَّمَارُ - ہلاک ہو جانا - ہلاک کر دینا - اَلتَّدْمِیْرُ ہلاک کر دینا - بیخکنی کر دینا - راغب نے لکھا ہے کہ اس کے معنی ہیں تباہی و بربادی کو کسی چیز میں داخل کر دینا - دَمَّرَ عَلَیْھِمْ - وہ بغیر اجازت ، برائی کی نیت سے ان کے پاس آیا - وہ اچانک ان پر حملہ آور ہوا* - قرآن کریم میں ہے وَدَمَّرْنَا (۷/۱۳۷) ہم نے تباہ و برباد کر دیا - ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی گھر وغیرہ میں داخل ہونے کے ہیں - بعض اس پر یہ اضافہ کرتے ہیں کہ یہ داخلہ بغیر اجازت کے ہوتا ہے -

د م ع

اَلدَّمْعُ - آنسو خواہ وہ غم کے ہوں یا خوشی کے - اَلدَّمْعَةُ - آنسو کا ایک قطرہ - دَمَعَتِ الْعَیْنُ - آنکھ نمناک ہو گئی* -

دَمَعَتِ السَّحَابَةُ - بادل سے پانی برسا** - سورۃ مائدہ میں ہے - تَرَىٰ اَعْیُنَھُمْ تَفِیْضُ مِنَ الدَّمْعِ (۵/۸۳) "تو دیکھیگا کہ ان کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو جاتے ہیں"-

د م غ

اَلدِّمَاغُ - بھیجا (سر کا گودا) دَمَغَہٗ - یَدْمَغُ - اسنے اسے ایسا زخم لگایا کہ وہ دماغ تک پہنچ گیا - اَلدَّامُوْغُ - وہ چیز جو کسی چیز کو توڑ پھوڑ کر رکھدے - دَمَغَہٗ - وہ اس پر غالب آ گیا* - دَمَغَ الْحَقُّ الْبَاطِلَ - حق نے باطل کو ختم کر دیا - اسے مٹا دیا** - حُجَّةٌ دَامِغَةٌ - دماغ توڑ دلیل*** -

سورۃ انبیاء میں حق کے متعلق ہے فَیَدْمَغُہٗ (۲۱/۱۸) وہ باطل کا بھیجا نکال دیتا ہے - اسے مٹا کر رکھدیتا ہے - حق و باطل کی کشمکش میں (جو تعمیری اور تخریبی قوتوں کی شکل میں کائنات کے ذرے ذرے میں جاری ہے) حق (تعمیری پہلو) ہمیشہ باطل (تخریبی پہلو) پر غالب آتا ہے اور اسطرح یہ سلسلۂ کائنات ارتقائی منازل طے کرتا چلا جاتا ہے - اگر تخریب غالب رہے تو ارتقاء تو ایکطرف کائنات کا وجود ہی باقی نہ رہے - لہذا سنت اللہ یہ ہے کہ بَلْ نَقْذِفُ بِالْحَقِّ عَلَى الْبَاطِلِ فَیَدْمَغُہٗ فَاِذَا ھُوَ زَاھِقٌ (۲۱/۱۸) - " ہم حق کے ذریعہ باطل پر ضرب لگاتے ہیں - سو حق ،

*تاج - **محیط - ***راغب -

باطل کا مغز توڑ دیتا ہے ۔ سو دیکھو ! وہ (باطل کسطرح) نیست و نابود ہو رہا ہے !،، ۔ اس کشمکش میں خدا کے تعمیری پروگرام کا، تخریبی پروگراموں پر غالب آنا، قانون کائنات ہے ۔ اس کے خلاف ہو نہیں سکتا ۔ لیکن اس کے غلبہ اور تسلط کی رفتار (ہمارے پیمانوں کے مطابق) بہت سست ہے ۔ خدا کا ایک ایک دن ہزار ہزار سال کا (بلکہ پچاس پچاس ہزار سال کا) ہوتا ہے ۔ (۳۲/۵ و ۷۰/۴) لیکن اگر انسان، خدا کے قانون کا رفیق بن جائے، تو پھر اس کے نتائج، خود انسان کے حساب و شمار کے مطابق مرتب ہونے شروع ہو جاتے ہیں ۔

د م و (ی)

دَمٌ کے معنے ہیں خون ۔ اَلدِّمَاءُ (۲/۸۴) اسکی جمع ہے* ۔ (دَمٌ ۔ در اصل دَمَوٌ ۔ یا دَمَیٌ تھا) ۔ قرآن کریم نے دَمًا مَّسْفُوْحًا (۶/۱۴۶) "بہتے ہوئے لہو" کو حرام قرار دیا ہے ۔ (مزید تشریح س ۔ ف ۔ ح کے عنوان میں ملیگی) ۔

د ن ر

دِیْنَارٌ ۔ ایک طلائی سکے کا نام ہے ۔ اسکی جمع دَنَانِیْرُ آتی ہے ۔ غیر عربی لفظ کو عربی بنا لیا گیا ہے ۔ عرب اسے قدیم زمانہ سے بولتے چلے آ رہے تھے اسلئے یہ عربی ہو گیا* ۔ قرآن کریم میں یہ لفظ (۳/۷۴) میں آیا ہے ۔

بعض کا کہنا ہے کہ یہ لفظ در اصل دِنَّارٌ تھا ۔ اسی لئے اسکی جمع دَنَانِیْرُ آتی ہے* ۔ اس کے معنی پونڈ یا گنی یا اشرفی کے ہیں جو طلائی ہوتی ہے ۔ معلوم ہوتا ہے کہ یہ، رومی لفظ (Dinarins) کا معرب ہے ۔ عربوں کے ہاں رومیوں کے سکوں کا زیادہ رواج تھا ۔ (نیز دیکھئے درھم) ۔

د ن و

دَنَا ۔ یَدْنُوْ ۔ دُنُوًّا ۔ دَنَاوَةً ۔ قریب ہونا ۔ اَلدُّنْیَا ۔ نزدیک ترین چیز (یہ مؤنث ہے ۔ اس کا مذکر اَدْنٰی ہے) ۔ دَنِیَ ۔ یَدْنٰی کے معنے ہیں کمزور اور ضعیف ہونا ۔ اَدْنَی الرَّجُلُ اِدْنَاءً ۔ اس شخص نے تنگی اور عسرت کی زندگی بسر کی ۔ اَدْنَی الشَّیْءَ کسی چیز کو قریب کیا ۔

*تاج ۔

أَدْنَتْ ثَوْبَهَا عَلَيْهَا ۔ اس نے اپنا کپڑا اپنے اوپر ڈال لیا*** ۔ اسی سے ہے يُدْنِينَ عَلَيْهِنَّ مِنْ جَلَابِيبِهِنَّ (۳۳/۵۹) ''وہ اپنی چادریں (جلباب) اپنے اوپر ڈال لیا کریں،،۔

اَلْاَدْنٰی کے معنے ہیں زیادہ قریب ، لیکن کبھی اس سے مراد اَصْغَرُ ہوتا ہے ۔ ایسی صورت میں اسکے مقابلہ میں اَكْبَرُ آتا ہے ۔ کبھی اس سے مراد اَرْذَلُ ہوتا ہے تو اسکے مقابلہ میں خَيْرٌ آتا ہے ۔ جب اس سے مراد اَوَّلُ ہوتا ہے تو اسکے مقابلہ میں آخِرٌ آتا ہے ۔ جب اس سے مراد اَقْرَبُ ہوتا ہے تو اسکے مقابلہ میں اَقْصٰی آتا ہے**۔

قرآن کریم میں ہے فِيْ اَدْنَى الْاَرْضِ (۳۰/۳) ۔ یعنے قریب کی سر زمین ۔ سورۃ النجم میں ہے ثُمَّ دَنَا ۔ ۔ ۔ اَوْ اَدْنٰى (۵۳/۸-۹) ۔ اسکے معنے ہیں پھر وہ قریب ہوا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ یا قریب تر ۔ سورۃ الرحمٰن میں دَانٍ (۵۵/۵۴) بمعنے قریب آیا ہے ۔ سورۃ الحاقہ میں ہے ۔ قُطُوْفُهَا دَانِيَةٌ (۶۹/۲۳) ۔ اسکے معنے بھی قریب ہیں ۔ اَلسَّمَآءُ الدُّنْيَا (۳۷/۶ و ۶۷/۵) کے معنے ہیں قریب ترین آسمان ۔ (دیکھئے عنوان س ۔ م ۔ و کے تحت سماء) ۔

اَلدُّنْيَا (قریب تر) بمقابلہ اَلْقُصْوٰى (بعیدتر) (۸/۴۲) میں آیا ہے ۔ اَكْبَرُ کے مقابلہ میں یہ لفظ (۳۲/۲۱) میں آیا ہے ۔ اور اَكْثَرُ کے مقابلہ میں (۵۸/۷) میں ۔ خَيْرٌ کے مقابلہ میں (۲/۶۱) میں ۔

قرآن کریم میں اَلْحَيٰوةُ الدُّنْيَا ۔ بمقابلہ آخِرَةٌ ۔ اکثر مقامات پر آیا ہے ۔ اور یہی وہ تقابل ہے جو زیادہ غور طلب ہے ۔ اسلئے کہ اس تقابل میں اَلْحَيٰوةُ الدُّنْيَا کو آخرت کے مقابلہ میں کم قیمت قرار دیا گیا ہے ۔

عام مذاہب عالم میں، جہاں روح اور مادہ کی ثنویت (Duality) کا عقیدہ رائج ہے، دنیا اور اسکی متاع کو بڑا ذلیل اور حقیر قرار دیا گیا ہے۔ ہندو دھرم کی رو سے دنیا ہے ہی مایا یعنے فریب ۔ اور اس فریب سے چھوٹ جانے کا نام نجات پا سکتی ہے ۔ بدھ مت میں دنیا کے متعلق ہر آرزو ایک تکلیف کا پیش خیمہ ہوتی ہے ۔ اسلئے اصلِ حیات ترکِ آرزو کا نام ہے ۔ یہی عقیدہ عیسائیت میں ہے جہاں نیکوکاروں کی بادشاہت آسمان میں ہے۔ چنانچہ انکے ہاں ترک دنیا سب سے بڑی ولایت ہے ۔ یہی عقیدہ تصوف کی اصل ہے اور اس سے متاثر ہو کر خود ہمارے (مسلمانوں کے) ہاں بھی دنیا کو بڑا حقیر اور قابل نفرت سمجھا جاتا ہے ۔ چنانچہ ''دنیا دار،، اور گنہگار،، قریب قریب

* تاج و محیط ۔ ** تاج و راغب ۔ *** لین بحوالہ مغنی اللبیب ۔

مرادف المعنی الفاظ ہو چکے ہیں۔ اس کے بر عکس، دین اور دنیا ایک دوسرے کے مقابلے میں بولے جاتے ہیں۔ لیکن یہ تصور قرآنی تعلیم کے خلاف ہے۔ وہ مومن کو (آخرت کے علاوہ) فِی هٰذِهِ الدُّنْيَا حَسَنَةً (۷/۱۵۶) کی دعا سکھاتا ہے اور واضح الفاظ میں کہتا ہے کہ لِلَّذِيْنَ اَحْسَنُوْا فِيْ هٰذِهِ الدُّنْيَا حَسَنَةٌ (۱۶/۳۰) حسن عمل کا نتیجہ (آخرت کے علاوہ) اس دنیا کی خوشگواریاں ہیں۔ اسکے مقابلہ میں وہ ذِلَّةٌ فِى الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا (۷/۱۵۲)۔ ''دنیا میں ذلت و خواری،، کو خدا کا غضب اور اسکی لعنت قرار دیتا ہے۔ اس قسم کی آیات متعدد مقامات پر آئی ہیں۔ لہذا قرآن کریم کی رو سے یہ تصور باطل ہے کہ دنیا قابل نفرت ہے اور اسکی آسائشیں اور آرائشیں گناہ کی آلودگیاں!

لیکن قرآن کریم میں ایسی آیت بھی ہیں جن میں متاع دنیا کو قلیل اور اسکی زندگی کو لہو و لعب قرار دیا گیا ہے۔ اس نکتہ کو سمجھنے کیلئے (ا ۔ خ ۔ ر) اور (ع ۔ ج ۔ ل) کے عنوانات دیکھئے جن میں بتایا گیا ہے کہ مَتَاعِ عَاجِلَہ اور مَتَاعِ آخِرَہ سے قرآن کریم کا مطلب کیا ہے۔ وہاں آپ دیکھیں گے کہ قرآن کریم ان لوگوں کی سخت مخالفت کرتا ہے جو اپنی نگاہوں کو مفاد عاجلہ (فوری حاصل ہو جانے والے مفاد) پر مرکوز رکھتے ہیں اور مستقبل کی خوشگواریوں کو نظر انداز کر دیتے ہیں۔ اسی مفاد عاجلہ کو وہ مَتَاعُ الدُّنْيَا قریبی مفاد، یا پیش پا افتادہ مفاد کہکر پکارتا ہے اور ان لوگوں کو سخت مطعون کرتا ہے جو ان پیش پا افتادہ مفادات کی خاطر مستقبل کی خوشگواریوں کو قربان کر دیتے ہیں۔ لہذا جو چیز قرآن کریم کی رو سے مذموم ہے وہ یہ ہے کہ انسان قریبی مفاد (Immediate Gain) کی خاطر مستقبل (Future) کی تابناکی کو نظر انداز کر دے۔ یعنی وہ زندگی اسی طبعی زندگی ہی کو سمجھ لے۔ اور یہ بھی مذموم ہے کہ انسان دنیا کو ترک کرکے صرف ''عاقبت سنوارنے،، کے خیال میں لگ جائے (اسے رہبانیت کہتے ہیں جسے قرآن کریم جائز قرار نہیں دیتا۔ دیکھئے عنوان ر ۔ ہ ۔ ب)۔ اسکی تعلیم یہ ہے کہ رَبَّنَا آتِنَا فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً وَّ فِي الْاٰخِرَةِ حَسَنَةً (۲/۲۰۱)۔ اس دنیا میں، بھی خوشگواریاں اور اسکے بعد کی زندگی میں بھی خوشگواریاں۔ حال بھی درخشندہ اور مستقبل بھی تابناک۔ قریبی مفاد بھی اور مستقبل کے مفاد بھی۔

اس نے یہ بھی کہدیا ہے کہ جسکا حال درخشندہ نہیں وہ سمجھ لے کہ اسکا مستقبل بھی تاریک ہی ہے۔ وَ مَنْ كَانَ فِيْ هٰذِهٖٓ اَعْمٰى فَهُوَ فِي الْاٰخِرَةِ اَعْمٰى وَ اَضَلُّ سَبِيْلًا (۱۷/۷۲)۔ ''جو یہاں کا اندھا ہے وہ وہاں

بھی اندھا ہی ہوگا بلکہ اس سے بھی زیادہ گیا گزرا،،۔ (آعمٰی کے مفہوم کیلئے دیکھئے عنوان ع ۔ م ۔ ی) ۔ لہذا ۔

(۱) یہ تصور بھی غلط ہے کہ دنیا کی خوشگواریاں قابل نفرت ہیں ۔

(۲) اور یہ بھی غلط ہے کہ زندگی صرف اسی دنیا کی زندگی ہے، لہذا مفاد صرف اسی زندگی کے پیش پا افتادہ مفاد ہیں ۔

(۳) صحیح تصور یہ ہے کہ اس دنیا کے مفاد بھی حاصل ہوں اور انسانی ذات اپنی صلاحیتوں کی نشو و نما سے اس قابل ہو جائے کہ وہ اسکے بعد کی زندگی کی خوشگواریاں بھی حاصل کرے۔ نیز اس دنیا میں نگاہ صرف اپنے ذاتی مفاد پر نہ رہے بلکہ تمام نوع انسانی اور آنے والی نسلوں کی خوشحالی پر بھی نگاہ رہے ۔ یہ مستقبل اس دنیا میں ہوگا اور دوسرا مستقبل اسکے بعد کی زندگی میں (مزید تفصیل کیلئے دیکھئے عنوان ا ۔ خ ۔ ر) ۔

حقیقت یہ ہے کہ قرآن کریم کی تعلیم کا ماحصل یہ ہے کہ وہ انسان کو اقدار (Values) متعین کر کے دیتا ہے ۔ وہ ہر شے کے متعلق بتاتا ہے کہ انسانیت کی میزان میں اسکی قدر و قیمت کیا ہے ۔ اس کے بعد وہ کہتا ہے کہ عقل اور ایمان کی رو سے صحیح مسلک زندگی یہ ہے کہ انسان، بلند قدر و قیمت کی شے کے لئے کم قدر و قیمت کی شے کو قربان کر دے۔ وہ بتاتا ہے کہ دنیاوی سامان زندگی اور اس کی خوشنمائیاں اپنی‌قدر رکھتی ہیں ۔ انہیں ضرور حاصل کرنا اور سنبھال کر رکھنا چاہئے ۔ لیکن جب کبھی ایسا ہو کہ دنیاوی زندگی (یعنی انسان کی طبعی زندگی ۔ Physical Life) کے کسی تقاضے میں اور انسانی زندگی (انسانی ذات) کے کسی تقاضے میں تصادم واقع ہو جائے (ان میں (Tie) پڑ جائے) تو اسوقت، انسانی ذات کے بلند تقاضہ کی خاطر طبعی زندگی کے کمتر درجہ کے تقاضہ کو قربان کر دینا چاہئے ۔ یہ ہیں وہ مقامات جہاں قرآن کریم نے (طبعی زندگی اور انسانی ذات کا مقابلہ کرتے ہوئے) دنیاوی زندگی اور اس کے سازو سامان کو کم قیمت بتایا ہے ۔ اس کے یہ معنی نہیں کہ دنیاوی زندگی قابل نفرت ہے ۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ جب طبعی زندگی اور انسانی زندگی (جسے مرنے کے بعد بھی قائم رہنا ہے) کا مقابلہ ہو تو پھر طبعی زندگی کی قیمت، انسانی زندگی کے مقابلہ میں کمتر سمجھنی چاہئے ۔ یہ ہے قرآن کریم کی صحیح تعلیم ''دنیا اور آخرت،، کے متعلق ۔

د ھ ر

اَلدَّھْرُ ۔ دراصل مدتِ عالم کو کہتے ھیں جو اسکی ابتداء آفرینش سے لیکر اسکے اختتام تک ھوتی ھے ۔ پھر، طویل مدت کیلئے بھی اس کا استعمال ھونے لگا ۔ برخلاف زَمَانٌ کے جسکا اطلاق مدتِ قلیلہ اور مدتِ کثیرہ دونوں پر ھوتا ھے* ۔ قرآن کریم میں (تخلیق انسانی کے سلسلہ میں) حِیْنٌ مِنَ الدَّھْرِ (۷۶/۱) آیا ھے ۔ یعنی ایک زمانہ ۔ یا زمانے کی ایک مدت ۔

ابن فارس نے کہا ھے کہ اس کے بنیادی معنی غلبہ اور زبردستی کے ھونے ھیں ۔ زمانہ کو دَھْرٌ اس لئے کہتے ھیں کہ وہ ھر چیز پر سے گزرتا اور اس پر غالب آ جاتا ھے ۔ اَلدَّھَارِیْرُ ۔ زمانہ کے حوادث اور گردشیں ۔ دَھَرَھُمْ اَمْرٌ ۔ ان پر کوئی مصیبت نازل ھو گئی **۔

قرآن کریم میں ان لوگوں کا قول نقل کیا گیا ھے جو زندگی کو اس طبعی زندگی تک محدود سمجھتے ھیں ۔ کہ وَمَا یُھْلِکُنَا اِلَّا الدَّھْرُ (۴۵/۲۴)۔ یہ صرف مرور زمانہ (Time) ھے جو ھمیں ھلاک کر دیتا ھے ۔ وقت گزرنے سے انسان کے قویٰ مضمحل ھو جاتے ھیں اور اسطرح وہ (Deteriorate) ھوتا ھوا مر جاتا ھے اور زندگی کا سلسلہ ختم ھو جاتا ھے ۔ اسکے بعد کوئی اور زندگی نہیں ۔ یہ وھی تصور ھے جسے دورِ حاضر کی اصطلاح میں (Materialistic Concept of Life) مادی نظریۂ حیات کہتے ھیں ۔ قرآن کریم کہتا ھے کہ وَمَا لَھُمْ بِذٰلِکَ مِنْ عِلْمٍ اِنْ ھُمْ اِلَّا یَظُنُّوْنَ (۴۵/۲۴)۔ ان کا یہ عقیدہ علم پر مبنی نہیں ۔ یہ محض ظن و قیاس سے کام لیتے ھیں ۔ قرآن کریم نے یہ بات چودہ سو سال پہلے کہی تھی ۔ اب ھمارے دور میں دھر (Time) کے متعلق جو جدید فلسفیانہ (اور سائنٹفک) تصورات قائم ھونے ھیں ان کی رو سے زمان (Time) کی حقیقت ھی کچھ اور ھو گئی ھے ۔ اور ابھی تو اس نہایت مشکل اور نازک موضوع پر تحقیق و تفتیش اور بحث و نظر کی ابتداء ھوئی ھے ۔ آگے چلکر دیکھئے اس کے متعلق کیا کیا تصورات قائم ھوتے ھیں ۔ بہر حال یہ عقیدہ کہ زندگی محض طبعی زندگی (Physical Life) ھے اور مرور زمانہ سے اسکا خاتمہ ھو جاتا ھے، اب عہد کہن کا فرسودہ خیال سمجھا جاتا ھے ۔ اب تحقیقات کا رخ اسی طرف کو ھے کہ زندگی مسلسل آگے بڑھتی ھے ۔ (اسکے متعلق تفصیل سے معارف القرآن

*راغب ۔ **تاج ۔

کی آخری جلد میں لکھا جائیگا جو آخرت سے متعلق ہوگی ۔ لیکن ضمنی طور پر، میری کتاب ''انسان نے کیا سوچا،، میں بھی لکھا جا چکا ھے) ۔ مرور زمانہ سے انسان کا جسم مضمحل ہوتا ھے ۔ اسکی ذات (Personality) پر اس کا کچھ اثر نہیں پڑتا ۔ وہ زمانے کے اثرات سے غیر متاثر رهتی ھے ۔ قرآن کریم کی رو سے، انسان صرف اس کے جسم سے عبارت نہیں ، جسم کے علاوہ، اسکی ذات بھی ھے ۔ اگر اس کی نشو و نما قرآن کریم کے طریق کے مطابق ہو جائے تو موت سے اس کا کچھ نہیں بگڑتا ۔ وہ زندگی کے مراحل طے کرنے کے لئے آگے بڑھ جاتی ھے ۔ اسی لئے، دھر (زمانہ) کا اس پر کچھ اثر نہیں ہوتا ۔

قرآن کریم نے اَلدَّھْرُ اس زمانے کو بھی کہا ھے جب انسان ھنوز وجود میں بھی نہیں آیا تھا ۔ ھَلْ اَتٰی عَلَی الْاِنْسَانِ حِیْنٌ مِّنَ الدَّھْرِ لَمْ یَکُنْ شَیْئًا مَّذْکُوْرًا (٧٦/١) ۔ لیکن اس کے یہ معنی بھی نہیں کہ خود زمانہ (دھر) کو خدا مان لیا جائے ۔ بہر حال، جیسا کہ پہلے کہا جا چکا ھے ، زمانہ یا دھر (Time) کے متعلق بحث، بڑی فلسفیانہ ھے جو ھمارے پیش نظر موضوع سے خارج ھے ۔ قرآن کریم میں یہ لفظ (دھر) انہی دو مقامات میں آیا ھے جن کا ذکر اوپر کر دیا گیا ھے ۔ اُن مقامات میں اس لفظ کا مفہوم بالکل صاف اور سیدھا ھے جس کے سمجھنے کے لئے کسی فلسفیانہ بحث میں پڑنے کی ضرورت نہیں ۔

د ھ ق

دَھَقَ الْکَاْسَ ۔ اسنے پیالہ بھر دیا ۔ مَاءٌ دِھَاقٌ ۔ کثیر پانی ۔ کَاْسٌ دِھَاقٌ ۔ صاف پیالہ ۔ بھرا ہوا پیالہ ۔ اَلدَّھْقُ کے معنے ہوتے ھیں زور سے دبانا ۔ اَلدَّھَقُ ۔ شکنجے کو کہتے ھیں ۔ اَلْمُدَھَّقُ ۔ زور سے دبایا ہوا* ۔ (بھرے ہوئے کیلئے دِھَاقًا کا لفظ غالباً اسلئے بولتے ھیں کہ اس میں چیز دبا دبا کر بھری جاتی ھے) ۔

قرآن کریم میں کَاْسًا دِھَاقًا ۔ (٧٨/٣٤) آیا ہے ۔ یعنے پاک اور صاف ، لبالب اور چھلکتا ہوا پیالہ ۔ لبریز بھی اور مصفا بھی ۔ یہی جنتی معاشرہ کی خصوصیت ھے ۔ صحیح زندگی ایسی ھی ہونی چاھئے ۔ بھر پور اور مصفا ۔ جس میں زندگی، پاکیزگی اور حرکت بڑھانے والے عناصر کی فراوانی ہو، سب کچھ فراوانی اور پاکیزگی سے ملے ۔ جس میں (طبعی ضروریات کے علاوہ) انسان کی مضمر صلاحیتوں کی پوری پوری نشو و نما ہو جائے اور تطہیر قلب و نگاہ

*تاج ۔

بھی میسر ہو۔ زندگی کے پیالے پاکیزہ اور قوت بخش خوشگواریوں سے بھرے ہوئے ہوں۔

ابن فارس نے کہا ہے کہ اس میں لبریز ہونے کے علاوہ چھلکنے (یعنی متحرک ہونے) کا پہلو بھی ہوتا ہے۔

د ھ م

اَلدُّھْمَۃُ ۔ سیاھی ۔ اِدْھَامَّ الشَّیْئُ ۔ چیز سیاہ ہوگئی ۔ اِدْھَامَّ الزَّرْعُ : سیرابی کی وجہ سے کھیتی سیاھی مائل ہوئی۔ حَدِیْقَۃٌ دَھْمَاءُ وَمُدْھَامَّۃٌ ۔ سر سبز باغ جو اپنی سر سبزی کی شدت سے مائل بہ سیاھی ہو رہا ہو۔ عربوں کے ھاں گہرے رنگ کی سبزی کو دُھْمَۃٌ کہدیتے تھے کیونکہ گہری سبزی سیاھی مائل ہو جاتی ہے ۔ اور ھلکے رنگ کی سیاھی کو خُضْرَۃٌ کہتے تھے کیونکہ وہ سبز رنگ کے قریب قریب آ جاتی ہے*۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی تاریکی کے ساتھ کسی چیز پر چھا جانا ھیں۔ بعد میں کثرت استعمال سے اس میں تاریکی کی شرط بھی نہ رہی۔ قرآن کریم نے جنتی باغات کی شادابی و سر سبزی کی شدت کی بنا پر، اُنہیں مُدْھَامَّتٰنِ (۵۵/۶۴) کہا ہے۔ ایسی زندگی جس میں تازگی، شادابی، سر سبزی، شگفتگی، اپنی انتہا تک پہنچ چکی ہو۔

د ھ ن

اَلدُّھْنَۃُ ۔ چکناھٹ ۔ اَلدُّھْنُ ۔ تیل ۔ اَلْمُدْھُنُ ۔ تیل کی شیشی ۔ اِدَّھَنَ ۔ اس نے تیل مل لیا** ۔ قرآن کریم میں زیتون کے متعلق ہے تَنْبُتُ بِالدُّھْنِ (۲۳/۲۰) وہ روغن (تیل) لیے ہوئے نکلتا ہے ۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی نرمی اور سہولت اور قلت کے ہونے ھیں ۔ اور اَدْھَنَ کے معنی خیانت کرنے کے ۔ اَلْمُدَاھَنَۃُ ۔ فریب ۔ بناوٹ ۔ تصنع، نمائش (چکنی چپڑی باتوں کے اعتبار سے) ۔ اَلْاِدْھَانُ ۔ فریب دینا۔ باطن کے خلاف ظاھر کرنا ۔ نرمی برتنا۔ رعایت کرنا ۔ سنجیدگی اور حقیقت کا دامن چھوڑ دینا** ۔ سورۃ قلم میں ہے وَدُّوْا لَوْ تُدْھِنُ فَیُدْھِنُوْنَ (۶۸/۹) ۔ یہ چاھتے ھیں کہ اگر تو تھوڑا سا اپنے مقام سے ھٹ جائے تو وہ بھی اپنے مقام سے ھٹ کر تجھ سے ''مفاھمت'' (Compromise) کر لیں ۔ لیکن جو شخص حق پر ھو وہ اگر اپنے مقام سے ذرا سا بھی ھٹ جائے تو وہ باطل پر

*تاج و راغب ۔ ** تاج و محیط و راغب ۔

پہنچ جاتا ہے ۔ اس کے بر عکس، باطل اگر اپنے مقام سے ہٹ جائے تو اس کا کچھ نہیں بگڑتا ۔ وہ باطل کا باطل ہی رہتا ہے ۔ مثلاً زید کہتا ہے کہ تین اور تین چھ ہوتے ہیں اور بکر کہتا ہے کہ نہیں ۔ تین اور تین چار ہوتے ہیں ۔ اب ان میں ''مفاہمت،، کرانے والا کہتا ہے کہ کچھ تم گھٹو اور کچھ تم بڑھو اور دونوں یہ مان لو کہ تین اور تین پانچ ہوتے ہیں ۔ بکر کا اس سے کچھ نہیں بگڑیگا کیونکہ وہ جیسا پہلے غلطی پر تھا ویسا ہی اب رہیگا ۔ لیکن اس سے زید فوراً اپنے مقامِ حق سے باطل پر آ جائیگا ۔ یہ وجہ ہے کہ حق کسی کی خاطر اپنے مقام سے ہٹ نہیں سکتا ۔ وہ اپنے مقام پر اٹل ہوتا ہے ۔ دین کے محکم اصول اپنے اندر کسی قسم کی کمی بیشی کی گنجائش ہی نہیں رکھتے ۔ سورۃ واقعہ میں پہلے قرآن کریم کے متعلق کہا گیا ہے کہ یہ کسقدر عظیم کتاب ہے ۔ اس کے بعد ہے ۔ اَفَبِھٰذَا الْحَدِیْثِ اَنْتُمْ مُدْھِنُوْنَ (۵٦/۸۱) اس کے دو معنی ہو سکتے ہیں ۔ ایک تو یہ کہ کیا تم ایسی کتاب میں خیانت کرتے ہو ۔ اپنی چکنی چپڑی باتوں سے اس کی صحیح تعلیم میں، کمی بیشی کرتے ہو ۔ اور دوسرے یہ کہ تم اس کتاب کے ذریعے لوگوں کو ان کے صحیح مقام سے پھسلاتے ہو؟ مفہوم درحقیقت دونوں سے ایک ہی ہے ۔ مذہبی پیشوائیت کرتی ہی یہ ہے کہ قرآن کریم کی تعلیم میں کمی بیشی کرتی ہے اور اسطرح لوگوں کو حق کے مقام سے ہٹا دیتی ہے ۔ اور یہ سب اس لئے کہ اس سے ان کی روٹی کا سامان بہم پہنچتا رہے ۔ وَ تَجْعَلُوْنَ رِزْقَکُمْ اَنَّکُمْ تُکَذِّبُوْنَ (۵٦/۸۲) ۔ اس تکذیب کو تم اپنے لئے ذریعہ معاش بناتے ہو؟

اَلدِّھَانُ ۔ سرخ رنگ کی کھال ۔ تیل کی تلچھٹ*۔ سورۃ رحمٰن میں ہے کہ آسمان وَرْدَۃً کَالدِّھَانِ (۵۵/۳۷) ہو جائیگا ۔ دوسری جگہ ہے کَالْمُھْلِ (۷۰/۸) ۔ پگھلی ہوئی دھات کیطرح ہو جائیگا ۔

د ھ ی (و)

دَھَاہُ ۔ دَھْیًا ۔ اس نے اس میں عیب نکالا ۔ اس کی تنقیص کی ۔ اسے سخت تکلیف پہنچائی ۔ اَلدَّاھِیَۃُ ۔ امر عظیم ۔ سخت مصیبت ۔ دَوَاھِی الدَّھْرِ ۔ زمانہ کے ہاتھوں جو سخت مصیبتیں آتی رہتی ہیں ۔ اَلدَّھْیُ ۔ اَلدَّھَاءَ ۔ حیرت انگیز ہوشیاری اور چالاکی، نیز رائے کی عمدگی ۔ دَھِیَ ۔ اس نے نہایت درجہ ہوشیاری سے کام کیا** ۔ چنانچہ رَجُلٌ دَاہٍ ۔ انتہائی

*تاج ۔ **تاج و محیط

هوشیار اور چالاک آدمی کو کہتے ہیں* ۔ (دنیا کی مصیبتوں کا بیشتر حصہ عقلِ فریب کار کی چالاکیوں ہی کا پیدا کردہ ہوتا ہے) ۔

قرآن کریم میں ہے وَ السَّاعَةُ اَدْهٰى (۵۴/۴۶) ۔ وہ انقلاب کی گھڑی سخت مصائب والی ہوگی اور اچانک اور تحیر انگیز طریق سے آئیگی ۔

ابن فارس نے کہا ہے کہ دَهْیٌ کے بنیادی معنی ہیں کسی ایسی چیز کا سامنے آجانا جو خوشگوار نہ ہو ۔ لیکن حیرت انگیز اور اچانک طریق سے سامنے آنا جس سے انسان بھونچکا رہ جائے ۔ انقلاب کہتے ہی ایسے ہیں جو اچانک نمودار ہو اور دیکھنے والے متحیر ہو جائیں ۔

د و ر

دَارَ ۔ یَدُوْرُ ۔ دَوْرًا ۔ کسی چیز کا اسطرح گھومنا کہ وہ گھوم پھر کر وہیں آجائے جہاں سے چلی تھی ۔ اَلدَّوَّارَۃُ ۔ پرکار ۔ اَلدَّائِرَۃُ ۔ حلقہ (سرکل) اس کی جمع دَوَائِرُ ہے ۔ اَلدَّارُ (جمع دِیَارٌ) ۔ مکان ۔ اس لئے کہ اس میں لوگ گھومتے پھرتے رہتے ہیں ۔ یا گھوم پھر کر وہاں آجاتے ہیں ۔ محلہ ۔ شہر ۔ علاقہ ۔ ٹھہرنے اور سکونت پذیر ہونے کی جگہ ۔ تیز ساری دنیا کو بھی کہتے ہیں ، اور زمانہ کو بھی جو گردش کرتا رہتا ہے ۔ دَارَۃٌ ۔ مصیبت گردش ۔ اَلْمَدَارُ ۔ گھومنے کی جگہ** ۔

ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی ہوتے ہیں کسی چیز کا کسی دوسری چیز کو چاروں طرف سے گھیر لینا ۔ چنانچہ قرآن کریم میں ہے عَلَیْهِمْ دَائِرَۃُ السَّوْءِ (۴۸/۶) ۔ تباہی اور بربادی نے انہیں ہر طرف سے گھیر لیا ۔ یہاں دائرہ کے معنے ہیں وہ چیز جو کسی کو محیط ہوجائے ۔ جو اسے ہر طرف سے گھیر لے ۔ جیسا کہ دائرہ (سرکل) ہر طرف سے گھیر لیتا ہے ۔ سورۃ توبہ میں ہے یَتَرَبَّصُ بِکُمُ الدَّوَائِرَ (۹/۹۸) ۔ ''وہ تم پر گردشوں کے آنے کا انتظار کرتے ہیں''

سورۃ نوح میں دَیَّارًا (۷۱/۲۶) کے معنے ہیں ، بسنے والا ۔ مکین ۔ نیز یہ نفی کے بعد ، کسی ایک ، کوئی ایک ، کے معنوں میں بھی مستعمل ہوتا ہے** ۔

دَارُالْاٰخِرَۃِ (۲/۹۴) کی اصطلاح قرآن کریم میں متعدد بار آئی ہے ۔ اسکے معنے ہیں ''آخرت کا گھر'' ۔ یعنے مستقبل کی زندگی اور اُس زندگی کی آسائشیں ۔ (دیکھئے عنوان ا ۔ خ ۔ ر) ۔

---

* تاج و محیط ۔ ** تاج و محیط و راغب ۔

سورة بقرہ میں تجارت کے متعلق ہے تُدِیْرُوْنَهَا (۲۸۲/۲) - جس کا تم لوٹ پھیر کرتے ہو - یعنی آپس میں مبادلہ کرتے ہو - چیزوں کو گردش دیتے ہو -

د و ل

اَلدَّالَةُ - شہرت - اَلدَّوْلَةُ - باری اور نوبت - صَارَ الْفَیْئُ دَوْلَةً بَیْنَهُمْ - مال غنیمت ان میں منقسم ہو کر گردش کرنے لگ گیا*۔ دَاوَلَ - پھیرنا۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی ہیں کسی چیز کا ایک جگہ سے دوسری جگہ چلے جانا۔ قرآن کریم میں ہے تِلْكَ الْاَیَّامُ نُدَاوِلُهَا بَیْنَ النَّاسِ (۱۳۹/۳) - ''یہ وہ حالات ہیں جنہیں ہم لوگوں میں ادلتے بدلتے رہتے ہیں'' - کبھی اسکی باری کبھی اُسکی باری - تَدَاوَلُوْهُ انہوں نے اسے باری باری لیا*۔

دُوْلَةٌ* اور دَوْلَةٌ* - بعض نے کہا ہے کہ ان دونوں کے معنی ایک ہی ہیں - یعنی گردش کرنا - پھرتے رہنا - لیکن بعض نے کہا ہے کہ دَوْلَةٌ* کے معنے ہیں دو لشکروں کا باری باری ایک دوسرے کو شکست دینا اس طرح کہ پہلے ایک کو شکست ہو لیکن پھر شکست کھانے والا غلبہ حاصل کر لے* - اور دُوْلَةٌ ان طور طریقوں کو کہتے ہیں جو ادلتے بدلتے رہیں - بعض نے کہا ہے کہ دُوْلَةٌ* اس چیز کو کہتے ہیں جو مختلف ہاتھوں میں گھومتی پھرتی اور آتی جاتی رہے - اور دَوْلَةٌ* اس چیز کے ادلنے بدلنے کو کہتے ہیں* -

قرآن کریم نے مال کی گردش کے متعلق کہا ہے کَیْ لَا یَكُوْنَ دُوْلَةً بَیْنَ الْاَغْنِیَاءِ مِنْكُمْ (۷/۵۹) - تاکہ وہ تم میں سے دولت مندوں کے اندر ہی نہ گھومتا پھرتا رہے - معاشیات (Economics) کا کتنا بڑا اصول ہے جسے قرآن کریم نے چار لفظوں میں بیان کر دیا ہے - معاشرہ کا فساد اسی سے ہوتا ہے کہ دولت ایک خاص (اوپر کے) طبقہ میں گردش کرتی رہتی ہے - قرآن کریم کی رو سے نہ کسی کے پاس فاضلہ دولت (Surplus Money) رہنی چاہئے، نہ دولت کو ایک خاص سرکل کے اندر گردش کرنا چاہئیے - علاوہ بریں، قرآن کریم میں یہ اصول بالخصوص مالِ فیٔ کے سلسلہ میں بیان ہوا ہے جس کے معنے یہ ہیں کہ حکومت کے روپیہ کو بھی اوپر کے طبقہ (یعنی ارباب حل و عقد) کے اندر صرف نہیں ہوتے رہنا چاہئیے - اسے رفاہِ عامہ کے لئے گردش کرنا چاہئیے -

* تاج -

د و م

دَوَامٌ کے معنی ھیں کسی چیز کا ایک حالت پر قائم رھنا ۔ دَامَ الشَّیْءُ اسوقت بولتے ھیں جب کسی چیز پر لمبا زمانہ گزر جائے* ۔ اس سے اَلْمَاءُ الدَّائِمُ ۔ ٹھہرے ھوئے یا ساکن پانی کے معنوں میں استعمال کرتے ھیں ۔ اَلْمُدَامُ اُس بارش کو کہتے ھیں جو لگاتار ھوتی رھے ۔ لہذا اس مادہ میں کسی چیز کا لمبے زمانے تک یا ایک حالت پر رھنے کا تصور ھوتا ھے ۔ ابن الاعرابی نے کہا ھے کہ دَامَ الشَّیْءُ کے معنے ھوتے ھیں چیز گھومی ۔ نیز یہ فعل تھکنے یا ٹھہرنے کے لئے بھی بولا جاتا ھے ۔ گھومنے کے اعتبار سے ، اَلدَّوَّامَةُ لٹو کو کہتے ھیں جس سے بچے کھیلتے ھیں ۔ ابن کیسان نے لکھا ھے کہ مَادَامَ میں ، ما کے معنے وقت کے ھوتے ھیں ۔ چنانچہ جب کہتے ھیں قُمْ مَادَامَ زَیْدٌ قَائِماً ۔ تو اسکے معنے ھوتے ھیں جب تک زید کھڑا رھے تم بھی کھڑے رھو** ۔ سورۃ رعد میں جنت کے متعلق ھے اُکُلُهَا دَائِمٌ ($\frac{13}{35}$) ۔ ''اس کے پھل قائم رھینگے'' ۔ یعنی جنت کی منفعت بخش چیزوں کا سلسلہ جاری رھیگا ۔ کبھی منقطع نہیں ھوگا ۔ وھاں رزق کی کمی نہیں ھوگی ۔ اور سورۃ ھود میں ھے خَالِدِیْنَ فِیْهَا مَادَامَتِ السَّمٰوٰتُ وَالْاَرْضُ ($\frac{11}{108}$) ۔ جب تک زمین و آسمان موجودہ حالت میں رھینگے ۔ یعنی بہت لمبے عرصہ تک کے لئے ۔ (تفصیل خ ۔ ل ۔ د کے عنوان میں دیکھئیے)

سورۃ آلِ عمران میں ھے اِلَّا مَادُمْتَ عَلَیْهِ قَائِمًا ($\frac{3}{74}$) ۔ سوائے اس کے کہ تو اس کے سر پر کھڑا رھے ۔

د و ن

دُوْنَ ۔ کئی معنوں میں استعمال ھوتا ھے ۔ فَوْقٌ (اوپر) کے برخلاف نیچے کے معنوں میں ۔ ھُوَ دُوْنَهُ ۔ وہ اس کے نیچے ھے ۔ کبھی قریب کے معنوں میں ۔ زَیْدٌ دُوْنَکَ ۔ زید تجھ سے (مرتبہ وغیرہ میں) قریب ھے ۔ سامنے کے معنوں میں ۔ مَشٰی دُوْنَهُ ۔ وہ اس کے آگے آگے چلا ۔ پرے کے معنوں میں ۔ ھُوَ اَمِیْرٌ عَلٰی مَادُوْنَ جَیْحُوْنَ ۔ وہ جیحون سے پرے کے علاقہ کا امیر ھے ۔ علاوہ کے معنوں میں ۔ وَیَعْمَلُوْنَ عَمَلًا دُوْنَ ذٰلِکَ ۔ وہ اسکے علاوہ اور بھی کام کرتے ھیں ۔ صاحب لطائف اللغۃ نے کہا ھے کہ یہ لفظ

---

* تاج و راغب ۔ ** تاج ۔

اضداد میں سے ہے اور اس کے معنی پیچھے اور آگے، نیچے اور اوپر' سب آتے ہیں - شَیْءٌ دُوْنٌ - ذلیل چیز کو کہتے ہیں - لیکن اس کے برعکس شریف اور اچھی چیز کو بھی کہتے ہیں * - قرآن کریم میں ہے وَاَنَّا مِنَّا الصّٰلِحُوْنَ وَمِنَّا دُوْنَ ذٰلِكَ (۷۲/۱۱) ہم میں سے بعض صالح ہیں اور بعض اس سے کم تر درجے پر ہیں -

علاوہ یا پہلے کے معنوں میں یہ لفظ (۳۲/۲۱) میں آیا ہے جہاں کہا ہے کہ وَلَنُذِيْقَنَّهُمْ مِنَ الْعَذَابِ الْاَدْنٰى دُوْنَ الْعَذَابِ الْاَكْبَرِ .... ہم انہیں عذاب اکبر کے علاوہ - یا اس سے پہلے عذاب ادنیٰ کا مزہ بھی چکھائینگے - مِنْ دُوْنِ کے معنے ہیں ''علاوہ،، لَا يَتَّخِذِ الْمُؤْمِنُوْنَ الْكٰفِرِيْنَ اَوْلِيَآءَ مِنْ دُوْنِ الْمُؤْمِنِيْنَ (۳/۲۷) - ''مومن مومنوں کے علاوہ کافروں کو اپنا دوست نہ بنائیں'' - یعنی ایسا کبھی نہ کریں کہ مومنوں کو بھی دوست رکھیں اور ان کے ساتھ کفار کو بھی - انہیں مومنوں کو دوست رکھنا ہوگا یا کفار کو - اگر وہ کفار کو دوست رکھیں گے تو انہی میں سے ہوجائینگے - قرآن کریم میں مِنْ دُوْنِ اللّٰہِ بھی اکثر مقامات پر آیا ہے جس کے ایک معنے تو یہ ہیں کہ یہ لوگ خدا کے ساتھ ساتھ اور قوتوں کی بھی اطاعت اختیار کرتے ہیں اور یہ بھی کہ یہ لوگ خدا کے قانون تک نہیں پہنچتے - اس سے پہلے (یا ورے) ہی انسانوں کے خود ساختہ قانون و شریعت کو اپنے لئے واجب الاتباع مان لیتے ہیں - کتنے معبود ہیں جو انسانوں نے خدا سے ورے ہی اپنی ''پرستش،، کے لئے تجویز کر رکھے ہیں - یہ معبود مٹی اور پتھر کے بت نہیں - انسانی جذبات کے بت، ارباب اقتدار کے بت، مذہبی پیشواؤں کے بت، غرضیکہ ہر آن ایک نیا بت -

می تراشد فکرِ ما ہر دم خداوندے دگر
رست از یک بند تا افتاد در بند دگر

یہی وہ بت ہیں جو انسان کو خالص قوانین خداوندی کے اتباع سے روکتے ہیں -

راغب نے کہا ہے کہ کسی چیز تک پہنچنے سے قاصر رہ جانے کے لئے دُوْن بولا جاتا ہے - اس اعتبار سے مِنْ دُوْنِ اللّٰہِ کا مفہوم یہ ہوگا کہ اللہ تک پہنچنے سے قاصر رہتے ہوئے اس سے ورے ہی اور چیزوں کو اپنا مقصود و منتہیٰ قرار دے لینا - نزول قرآن کے بعد خدا تک پہنچنے سے قاصر رہنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا، کیونکہ خدا تک پہنچنے کا ذریعہ اس کی کتاب کا اتباع ہے اور وہ کتاب ہر ایک کے سامنے ہے -

* تاج -

د ی ن

دِیْنٌ۔ یہ لفظ بہت سے معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔ ازانجملہ، غلبہ۔ اقتدار۔ حکومت۔ مملکت۔ آئین۔ قانون۔ نظم و نسق۔ فیصلہ۔ ٹھوس نتیجہ۔ جزا و سزا۔ بدلہ، ہیں۔ دوسری طرف یہ لفظ اطاعت اور فرمانپذیری کے معنوں میں بھی استعمال ہوتا ہے*۔ صاحب لطائف اللغۃ نے بھی اس کے معانی حساب۔ غلبہ۔ تدبیر اور عادت کے لکھے ہیں۔ کتاب الاشتقاق میں اس کے معنی اطاعت۔ روش (دَاْبٌ) اور ملت کے لکھے ہیں۔ قرآن کریم میں یہ لفظ ان تمام معانی میں استعمال ہوا ہے۔ سورۃ بقرہ میں، اَسْلَمْتُ لِرَبِّ الْعٰلَمِیْنَ۔ عالمگیرنشو و نما دینے والے کے قوانین واحکام کے سامنے سر تسلیم خم کر دینے، کو اَلدِّیْنُ کہا گیا ہے (۲/۱۳۱-۱۳۲)۔ اسی کو دوسری جگہ اَلْاِسْلَامُ کہا گیا ہے (۳/۱۸)۔ سورۃ واقعہ میں غَیْرَ مَدِیْنِیْنَ (۵۶/۸۶) کے معنی ہیں وہ جو کسی کے ماتحت نہ ہوں۔ سورۃ توبہ میں ہے وَلَا یَدِیْنُوْنَ دِیْنَ الْحَقِّ (۹/۲۹)۔ وہ نظام خداوندی کی اطاعت اختیار نہیں کرتے۔ سورۃ یوسف میں دِیْنِ الْمَلِکِ (۱۲/۷۶) کے معنی بادشاہ کا قانون ہیں۔ اور سورۃ نور میں جہاں زنا کی سزا کا ذکر ہے وہاں دِیْنِ اللّٰہِ (۲۴/۲) کے معنی خدا کا قانون یا ضابطہ حکومت ہیں۔ اسی طرح سورۃ توبہ میں، جہاں سال کے بارہ مہینوں اور ان میں سے چار حرمت والے مہینوں کا ذکر ہے، کہا گیا ہے کہ ذٰلِکَ الدِّیْنُ الْقَیِّمُ (۹/۳۶) اسمیں بھی دِیْنٌ کے معنی ضابطہ قانون ہے۔ لیکن یَوْمَئِذٍ یُّوَفِّیْهِمُ اللّٰہُ دِیْنَهُمُ الْحَقَّ (۲۴/۲۵) میں دِیْنٌ کے معنی اعمال کا بدلہ (جزا و سزا) ہیں۔ (اس میں دین کے معنی حساب بھی ہوسکتے ہیں**۔ اس سے بھی مطلب مکافات عمل ہی ہے۔) سورۃ صٰفّٰت میں ہے ءَاِنَّا لَمَدِیْنُوْنَ (۳۷/۵۳)۔ کیا ہمیں ہمارے اعمال کا بدلہ ملیگا؟ کیا ہمارا حساب ہوگا؟۔

غلبہ و اقتدار اور قانون و اختیار کے مفہوم کے اعتبار سے قرآن کریم نے یَوْمُ الدِّیْنِ کے معنی خود واضح کر دئے ہیں جہاں کہا ہے کہ مَآ اَدْرٰکَ مَا یَوْمُ الدِّیْنِ۔ ''تجھے کیا معلوم کہ یوم الدین کیا ہے''۔ جواب میں کہا کہ یَوْمَ لَا تَمْلِکُ نَفْسٌ لِّنَفْسٍ شَیْئًا وَّالْاَمْرُ یَوْمَئِذٍ لِّلّٰہِ (۸۲/۱۸-۱۹)۔ جس دور میں کوئی انسان کسی دوسرے انسان کیلئے کچھ اقتدار و اختیار نہیں رکھیگا۔ اور تمام معاملات قانون خداوندی

* تاج و محیط۔ ** ابن قتیبہ (القرطین ج/۱ صفحہ ۴)

کے مطابق فیصل ہونگے ۔ اسی کے متعلق سورۃ فاتحہ میں مٰلِکِ یَوْمِ الدِّیْنِ (۱/۳) کہا گیا ہے۔ یعنی جس دور میں انسانی زندگی آئین خدا وندی کے مطابق بسر ہوگی۔ اس کی بنیادی خصوصیت یہ ہوگی کہ اس میں کسی انسان کو کسی دوسرے انسان پر کوئی غلبہ و اقتدار نہیں ہوگا ۔ غلبہ و اقتدار صرف قانون خدا وندی کا ہوگا ۔ کتنی بڑی آزادی ہے جو انسان کو آئین خدا وندی کے تابع حاصل ہوتی ہے!

دِیْنٌ کے معنے عادت مستمرہ کے بھی آتے ہیں ۔ چنانچہ دِیْنٌ اس بارش کو بھی کہتے ہیں جو عادۃً ہمیشہ ایک جگہ آ کر برستی ہو* ۔ اس مفہوم میں بھی قانون اور ضابطہ کی شان جھلکتی ہے ۔ خارجی کائنات میں قوانین خدا وندی کو قوانین فطرت کہا جاتا ہے ۔ انسانوں کی دنیا میں خدا کا قانون وحی کے ذریعے (بوساطت حضرات انبیاء کرام ؑ) ملتا ہے ۔ یہ قانون اپنی مکمل اور آخری شکل میں قرآن کریم کے اندر محفوظ ہے۔ اس کا نام اَلدِّیْنُ ہے ۔ اس کے مطابق عمل کرنے کو اَلْاِسْلَامُ کہتے ہیں ۔

حقیقت یہ ہے کہ دنیا میں، نظام معاشرہ ۔ ضابطہ زندگی ۔ قانون حکومت آئین مملکت۔ عدل وغیرہ کی مختلف اصطلاحات رائج ہیں لیکن قرآن کریم نے ان سب کی جگہ ایک جامع اصطلاح دی ہے ۔ اور وہ ہے الدین ۔ یہی ہمارے معاشرہ کا نظام ۔ ہماری زندگی کا ضابطہ ۔ ہماری حکومت کا قانون اور ہماری مملکت کا آئین ہے ۔ اس آئین کی رو سے، انسانوں کی آزادی اور پابندی کی حدود مقرر کرنے کا پورا اقتدار خدا کو حاصل ہوتا ہے ۔ کسی اور کو نہیں ہوتا ۔ اس لئے الدین میں اقتدار اعلیٰ (Sovereignty) خدا کی ہوتی ہے ۔ اس کا یہ اقتدار اعلیٰ اس کی کتاب (قرآن کریم) کے ذریعے بروئے کار آتا ہے ۔ اس لئے اسلامی مملکت میں عملاً اقتدار اعلیٰ کتاب اللہ کو حاصل ہوتا ہے ۔ اسلامی مملکت، قرآنی اصولوں کو دنیا میں نافذ کرنے کا ذریعہ (Agency) ہوتی ہے ۔ اور چونکہ انسانی اعمال کے غلط اور صحیح ہونے کا معیار بھی یہی کتاب ہے، اس لئے جزا اور سزا (اعمال کے نتائج) بھی اس کی رو سے متعین ہوتے ہیں ۔ اس جہت سے دین کا یہ مفہوم (جزا و سزا) بھی عملاً سامنے آ جاتا ہے ۔ اسے نظام عدل کہا جائیگا جس کا دائرہ صرف عدالتی عدل تک محدود نہیں بلکہ زندگی کے ہر شعبے کو محیط ہے ۔ اسلامی مملکت کا کانسٹی ٹیوشن قرآن کریم کے غیر متبدل اصولوں کا دوسرا نام ہے ۔ اس مملکت کا تمام کاروبار انہی اصولوں کی حدود کے اندر سر انجام پاتا ہے ۔ اور مقصود اس سے نظام عدل و توازن کا قائم رکھنا ہے ۔ اس کا نام الدین ہے ۔

---

* تاج ۔

لہذا، الدین سے مراد ہے خدا کا عطا کردہ نظام زندگی جو ہماری آزادی اور پابندی کی حدود متعین کرتا ہے اور جس کے مطابق ہمارے اعمال کے نتائج مرتب ہوتے ہیں۔ جس دور میں انسان اپنے آپ کو اس نظام کے تابع لے آئینگے وہ تمام دوسرے انسانوں کی محکومی سے آزاد ہو کر صرف قوانین خداوندی کے محکوم ہونگے۔ اس لئے کہ ''مالک یوم الدین'' خدا کے سوا کوئی اور نہیں۔ ہر وہ فیصلہ جو قوانین خداوندی کے مطابق ہوگا، دینی فیصلہ کہلائیگا اور عدل کے محکم اصول پر مبنی ہوگا۔ سورۃ فاتحہ میں دیکھئے۔ خدا کی صفت ربوبیت، رحمانیت اور رحیمیت کے ساتھ ہی اس کے نظام عدل و قانون (مالک یوم الدین) کا ذکر آگیا ہے۔ اس سے مراد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے نوع انسان کو سامان زیست اور اسباب نشو و نما تو بلا مزد و معاوضہ عطا کر دیئے ہیں لیکن انسانی مدارج کا تعین، ان کے اعمال کی رو سے ہوگا۔ اس کا نام آئین و قوانین کے مطابق عدل کی زندگی ہے۔ اور یہ چیز حیوانیت سے آگے بڑھ کر، خاصہ انسانیت ہے۔

مَدِیْنَۃٌ کے متعلق بعض محققین کا خیال ہے کہ یہ لفظ دِیْنٌ کے اس مفہوم سے بنایا گیا ہے جسکا تعلق نظم و نسق سے ہے۔ کیونکہ مَدِیْنَۃٌ وہی مرکزی مقام ہوتا ہے جو شہری نظم و نسق کے محاسن رکھتا ہو۔ بعض کا خیال ہے کہ یہ اطاعت کے مفہوم کے اعتبار سے وضع ہوا ہے کیونکہ مَدِیْنَۃٌ (شہر) میں قانون اور ضابطہ کی پابندی کرنی پڑتی ہے*۔ صاحب کتاب الاشتقاق کے نزدیک یہ لفظ در اصل مَدْیِنَۃٌ تھا، اور دِیْنٌ سے مشتق۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ دِیْنٌ کے بنیادی معنوں میں اطاعت پائی جاتی ہے اور شہر کو مَدِیْنَۃٌ اس لئے کہتے ہیں کہ اس میں حکومت کی اطاعت کی جاتی ہے۔ اور قرض کو دَیْنٌ اس لئے کہتے ہیں کہ اس میں مقروض کو جھکنا پڑتا ہے۔

دَیْنٌ۔ قرضہ۔ اور تَدَایُنٌ۔ ایک دوسرے سے قرض کا معاملہ کرنا ($\frac{2}{282}$)۔ دَیْنٌ اس قرضہ کو کہتے ہیں جسکی ادائیگی کیلئے مدت مقرر کر لی جائے۔ جس قرض کیلئے مدت متعین نہ ہو وہ دَیْنٌ نہیں بلکہ قَرْضٌ کہلاتا ہے*۔ محیط المحیط میں، تاج کے قول کی تائید کے ساتھ، یہ بھی لکھا ہے کہ عرف عام میں دَیْنٌ اس قرضے کو کہتے ہیں جو مدت معینہ کیلئے سود پر دیا جائے۔ لیکن قرآن کریم نے چونکہ ربوٰا کو حرام قرار دیا ہے اسلئے اسمیں مسلمانوں کے باہمی لین دین میں دَیْنٌ کا لفظ قرضہ بلا سود ہی کے لئے ہے ($\frac{2}{282}$)۔

*تاج۔

جیسا کہ اوپر لکھا جا چکا ہے، اسلام کیلئے قرآن کریم نے دِیْنٌ کا لفظ استعمال کیا ہے جسکے معنے ضابطۂ حیات کے ہیں۔ اِنَّ الدِّیْنَ عِنْدَ اللّٰہِ الْاِسْلَامُ (۳/۱۸)۔ وَ رَضِیْتُ لَکُمُ الْاِسْلَامَ دِیْنًا (۵/۳)۔ یہی اَلدِّیْنُ ہے جسے دیکر نبی اکرمؐ کو بھیجا گیا تھا۔ ھُوَ الَّذِیْ اَرْسَلَ رَسُوْلَہٗ بِالْھُدٰی وَ دِیْنِ الْحَقِّ لِیُظْھِرَہٗ عَلَی الدِّیْنِ کُلِّہٖ (۹/۳۳)۔ نیز (۴۸/۲۸) "خدا وہ ہے جس نے اپنے رسول کو ہدایت اور دین حق کے ساتھ بھیجا تا کہ وہ اس دین (نظام حیات) کو، دیگر تمام ادیان (نظام ہائے حیات) پر غالب کر دے خواہ مشرکین کو یہ چیز کتنی ہی ناگوار کیوں نہ گذرے"۔ مَذْھَبٌ کا لفظ قرآن کریم میں کہیں نہیں آیا۔ اسلئے اسلام کو مذہب نہیں کہنا چاہئے۔ دِیْنٌ ہی کہنا چاہئے۔ مَذْھَبٌ اس راستے کو کہتے ہیں جو انسانوں کا وضع کردہ ہو۔ اور دِیْنٌ اس قانون یا نظام کو کہتے ہیں جو خدا کی طرف سے ملا ہو۔ (مَذْھَبٌ کے معنے کیلئے دیکھئے عنوان ذ۔ ہ۔ ب)۔ یہی وجہ ہے کہ مذہب میں مختلف فرقے ہوتے ہیں لیکن دین میں فرقہ سازی کو شرک قرار دیا گیا ہے۔ (۳۰/۳۲)۔ جو دین خدا کی طرف سے ملا تھا وہ سب کے لئے ایک ہی تھا۔ اس میں مختلف فرقوں کا کیا سوال؟ فرقے، مختلف انسانوں کے بنائے ہوئے راستے (مذہب) پر چلنے سے پیدا ہوتے ہیں۔ اقوام سابقہ کے پاس خدا کا دین (بوساطت حضرات انبیاء کرامؑ) آتا رہا لیکن انہوں نے اپنی آسمانی کتابوں کو ضائع کر کے، ان کی جگہ انسانوں کے تراشیدہ راستوں کو اختیار کر لیا۔ اسطرح ان سے دین گم ہو گیا اور اس کی جگہ مذہب نے لے لی۔ اللہ تعالیٰ نے دین کو اسکی اصلی شکل میں قرآن کریم میں عطا کر کے اسے محفوظ کر دیا۔ یہی دین تھا جو اس مملکت کا آئین (Constitution) تھا جسے نبی اکرمؐ نے متشکل فرمایا تھا۔ اس کے بعد، ہم نے، خدا کی کتاب کو پس پشت ڈال دیا اور انسانوں کی دی ہوئی تعلیم کے پیچھے چل پڑے۔ اسطرح ہم نے بھی دین کی جگہ مذہب اختیار کر لیا۔ اس نہج سے ہم بھی اقوام سابقہ کی سطح پر آ گئے۔ لیکن ہم میں اور ان میں ایک فرق ہے۔ ان کے پاس دین اپنی اصل شکل میں موجود نہیں اس لئے وہ اپنے مذہب کو خدا کے عطا کردہ دین سے بدل نہیں سکتے۔ لیکن ہمارے پاس خدا کی کتاب اپنی اصل شکل میں موجود ہے اس لئے ہم جسوقت بھی چاہیں اپنے مروجہ مذاہب کو دین خداوندی سے بدل سکتے ہیں۔ (اسی طرح دیگر اقوام عالم بھی چاہیں تو اپنے اپنے مذہب کو چھوڑ کر، قرآن کریم میں دئے ہوئے دین کو اختیار کر سکتی ہیں)۔ جب تک ہم ایسا نہیں کرتے، زندگی کی منزل مقصود تک نہیں پہنچ سکتے۔

ذ

ذا

ذَا۔ یہ ۔ اس کا مونث ذِہٖ ۔ ذِہٖ ۔ ذِہِیْ ۔ تَا ۔ تِیْ وغیرہ ھیں ۔ اس کا تثنیہ (دو کے لئے) ذَانِ اور ذَیْنِ ۔ (مونث کے لئے تَانِ ۔ تَیْنِ) آتا ھے ۔ اور جمع اُولَآءِ (دیکھئے عنوان اولاء) اس سے پہلے اکثر ھَا سلا ھوا ھوتا ھے ۔ جیسے ھٰذَا (اس کا مونث ھٰذِہٖ آتا ھے) یہ اشارہ قریب کے لئے ھے ۔ اشارہ بعید کے لئے ذَالِکَ (مذکر) تِلْکَ (مونث)۔ اس کے آخر میں مخاطب کے مطابق ضمیر بدلتی رھتی ھے ۔ مثلاً ھمارا مخاطب ایک مرد ھے اور ھم اُس سے کہہ رھے ھیں کہ اُس چیز کو دیکھو۔ تو ھم ذَالِکَ کہینگے ۔ اور اگر مخاطب دو مرد ھوں تو ذَالِکُمَا کہینگے۔ بہت سے ھوں تو ذَالِکُمْ۔ اسی طرح اگر مخاطب ایک عورت ھو تو ذَالِکِ کہینگے ۔ اور بہت سی عورتیں ھوں تو ذَالِکُنَّ کہینگے ۔

ذَا کے مختلف استعمال یہ ھیں ۔ ذَاکَ۔ ذَانِکَ ۔ (ھَاتَاکَ ۔ ھَاتِیْکَ) ۔ جمع کے لئے اُولَاکَ یا اُوْلٰئِکَ ۔ کبھی ذَاکَ کے درمیان ل ۔ لا کر ، ذَالِکَ (مونث کے لئے تِلْکَ) بنا لیتے ھیں ۔ اس سے پہلے کاف آنے سے کَذَالِکَ ھو جاتا ھے ۔ اس کے استعمال کی مثالیں یہ ھیں ۔

(۱) مَنْ ذَاالَّذِیْ یَشْفَعُ عِنْدَہٗ ...... (۲/۲۵۵) ۔ وہ کون ھے جو اس کے ھاں کسی کے ساتھ کھڑا ھوسکے ۔

(۲) یَسْئَلُوْنَکَ مَاذَا یُنْفِقُوْنَ .... (۲/۲۱۵) ۔ تجھ سے پوچھتے ھیں کہ وہ کیا ھے جسے کھلا رکھا جائے ۔

(۳) اِنْ ھٰذَانِ لَسَاحِرَانِ ... (۲۰/۶۳) ۔ یہ تو بس دو جادوگر ھیں ۔

(۴) ذَالِکَ الْکِتَابُ ... (۲/۲) ۔ یہ وہ کتاب ھے ... تِلْکَ اُمَّةٌ قَدْ خَلَتْ (۲/۱۳۴) یہ ایک جماعت تھی جو گذر چکی ۔

(٥) فَذَانِکَ بُرْهَانٰنِ۔ ۔ ۔ (۲۸/۳۲)۔ یہ دونوں روشن دلیلیں ہیں۔

جیسا کہ اوپر کہا گیا ہے ذَالِکَ اشارہ بعید (وہ) ہے لیکن یہ اشارہ قریب (یہ) کے لئے بھی آتا ہے۔ قرآن کریم میں ذَالِکَ اشارہ قریب (یہ) کے لئے زیادہ اور اشارہ بعید (وہ) کے لئے کم آیا ہے۔ مثلاً سورۃ روم میں فِطْرَتَ اللّٰہِ الَّتِیْ فَطَرَ النَّاسَ عَلَیْھَا۔ لَا تَبْدِیْلَ لِخَلْقِ اللّٰہِ کے بعد ہے ذَالِکَ الدِّیْنُ الْقَیِّمُ (۳۰/۳۰)۔ یہی دینِ قیم ہے۔ یا مثلاً سورۃ بنی اسرائیل میں ماپ تول کے متعلق ضروری ہدایت کے بعد فرمایا ذَالِکَ خَیْرٌ وَّ اَحْسَنُ تَاْوِیْلًا (۱۷/۳۵) "یہ بہتر اور انجام کار بہت خوبی کی بات ہے"۔ ان مقامات میں ذَالِکَ اشارہ قریب کے لئے ہے۔

اس کے برعکس سورۃ کہف میں جہاں حضرت موسیٰؑ کے ایک سفر کا ذکر ہے۔ وہاں (اس مقام پر جہاں آپ کا ساتھی مچھلی پیچھے بھول آیا تھا) کہا کہ ذَالِکَ مَا کُنَّا نَبْغِ (۱۸/۶۴) "وہی توجگہ تھی جسکی ہمیں تلاش تھی"۔ یہاں ذَالِکَ اشارہ بعید کے لئے ہے۔

راغب نے کہا ہے کہ ذَالِکَ آتا تو ہے بعید کے لئے لیکن اس سے بُعدِ مسافت ہی مراد نہیں۔ جو شے بلندیٔ مرتبت کی وجہ سے اونچے مقام پر ہو اور یوں دور ہو، اس کے لئے بھی ذَالِکَ آتا ہے خواہ وہ چیز ویسے قریب ہی رکھی ہو۔ اسی اعتبار سے ذَالِکَ الْکِتَابُ لَا رَیْبَ فِیْہِ (۲/۲) کے معنے ہونگے یہ کتاب جو بڑی باعظمت اور رفیعُ الشان ہے

ذَاالْکِفْل

قرآن کریم نے آپ کا نام انبیاء کرامؑ کے سلسلہ میں لیا ہے (۲۱/۸۵ و ۳۸/۴۸) لیکن مزید تعارف نہیں کرایا۔ قیاس یہ ہے کہ آپ حزقی ایل نبی ہیں جن کا صحیفہ تورات میں موجود ہے۔ (نیز دیکھئے عنوان ک۔ ف۔ ل)

ذَاالنُّوْن

حضرت یونسؑ کا لقب ہے (۲۱/۸۷)۔ تفصیل کے لئے دیکھئے عنوان "یونس" اور "نون"۔

ذ أ ب

اَلذِّئْبُ۔ بھیڑیا (۱۲/۱۳)۔ اَلذَّاْبُ۔ ڈرانا۔ مذمت کرنا۔ سخت آواز*۔ بدزبانی۔ ذَاَبَ الرَّجُلُ۔ آدمی زور سے چیخا**۔ ابن فارس نے کہا ہے

* تاج۔ ** محیط۔

کہ اس کے بنیادی معنے کم ٹھہرنا ، بے قراری ہیں - نیز کسی چیز کی ایسی حرکت جو ایک سمت سے نہ ہو۔ مثلاً تَذَاءَبَتِ الرِّیحُ کے معنی ہیں ہوا ہر طرف سے آئی - بھیڑیے کو ذِئبٌ اسی لئے کہتے ہیں کہ وہ کبھی ایک طرف سے آتا ہے کبھی دوسری طرف سے -

ذ أ م

ذَاَمَہٗ - یَذْاَمُہٗ - کسی کو حقیر و مذموم گرداننا - نیز اسکے معنے عیب لگانے ، رسوا کرنے ، کے آتے ہیں - کسی کو جھڑک کر نکال دینے کے بھی* - راغب نے مَذْؤُم بمعنی مَذْمُوْم لکھا ہے -

آذْاَمَہٗ - اسے مرعوب و خوفزدہ کر دیا* -

قرآن کریم میں ابلیس کے متعلق ہے - قَالَ اخْرُجْ مِنْهَا مَذْءُوْمًا مَدْحُوْرًا ($\frac{۷}{۱۸}$) - اسکے معنے ذلیل اور حقیر ہی کے ہیں - یا جھڑک کر نکالے ہوئے کے -

ذ ب ب

ذُبَابٌ - مکھیاں - واحد ذُبَابَۃٌ - صاحب محیط نے جاحظ کے حوالے سے لکھا ہے کہ (عام مکھیوں کی جملہ اقسام کے علاوہ) عربوں کے ہاں ذُبَابٌ کا اطلاق ہر قسم کی بھڑوں، شہد کی مکھیوں اور مچھروں پربھی ہوتا ہے** - قرآن کریم میں ہے - لَنْ يَّخْلُقُوْا ذُبَابًا ($\frac{۲۲}{۷۳}$) -"وہ مکھی بھی نہیں پیدا کر سکینگے" - مکھیوں کو ذُبَابٌ اس لئے کہا جاتا ہے کہ انہیں ہٹایا اور دور کیا جاتا ہے - یا اس وجہ سے کہ انہیں ایک جگہ قرار نہیں ہوتا - اس مادہ میں یہ دونوں مفہوم پائے جاتے ہیں - ابن فارس نے کہا ہے کہ اس مادہ کے بنیادی معنی اضطراب و حرکت کے بھی ہیں - راغب نے لکھا ہے کہ اَلذَّبْذَبَۃُ معلق شے کے ہلنے کی آواز کو کہتے ہیں - پھر، یہ لفظ ہر حرکت و اضطراب (ترددا ور ڈھلمل یقینی) کے لئے آتا ہے*** - بَعِیْرٌ ذَابٌّ - اُس اونٹ کو کہتے ہیں جو ایک جگہ پر کھڑا نہ رہے**** -

ذَبْذَبَۃٌ - اگرچہ یہ لفظ ذ ب ذ ب کے تحت آنا چاہئے لیکن بعض اہل لغت نے اسے ذ ب ب کے تحت لکھا ہے - ہر دو میں اشتراک معنی کی وجہ سے ہم بھی اسے یہاں (ذ ب ب کے تحت) درج کر رہے ہیں - قرآن کریم میں منافقین کے متعلق کہا ہے مُذَبْذَبِيْنَ بَيْنَ ذٰلِكَ ($\frac{۴}{۱۴۳}$) اور

*تاج و محیط - **محیط - ***راغب - ****تاج -

اسکی تشریح یہ کہکر کر دی ہے۔ لَاۤ اِلٰی هٰٓؤُلَاۤءِ وَلَاۤ اِلٰی هٰٓؤُلَاۤءِ (۴/۱۴۳)۔ نہ یکسو ہو کر ادھر کے اور نہ ہی یکسو ہو کر اُدھر کے۔ انہی کے متعلق ہے مَنْ یَّعْبُدُ اللّٰہَ عَلٰی حَرْفٍ (۲۲/۱۱)۔ جو کنارے پر کھڑے ہو کر (Sitting on the Fence) قوانین خدا وندی کی اطاعت کرے۔ ادھر فائدہ دیکھا تو ادھر جھک گئے۔ اُدھر دیکھا تو اُدھر جھک گئے۔ مکھی کی طرح، کہ کوئی کہہ ہی نہیں سکتا کہ جہاں وہ بیٹھی ہے اسکے بعد اڑ کر کہاں جا بیٹھیگی۔ یہ کیفیت، ایمان اور یقین کی یکسر نقیض ہے۔ ایمان کی کیفیت تو یہ ہے کہ اِنَّ الَّذِیْنَ قَالُوْا رَبُّنَا اللّٰہُ ثُمَّ اسْتَقَامُوْا (۴۱/۳۰)۔ ایک مرتبہ خدا کی ربوبیت کا اقرار کر لیا تو پھر اس پر جم کر بیٹھ گئے۔ ایمان اور استقامت، یہ ہے مومن کا شعار۔ برعکس منافق کے جو موقع پرست (Opportunist) ہوتا ہے۔

ذ ب ح

ذَبَحَ۔ یَذْبَحُ۔ اندر کی طرف سے سر اور گردن کے جوڑ سے حلق کاٹ دینا۔ چیر دینا۔ پھاڑ دینا۔ شق کر دینا*۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ یہی اس کے بنیادی معنی ہیں۔ ذَبَحَتْہُ الْعَبْرَۃُ۔ آنسوؤں نے اسکا گلا گھونٹ دیا۔ اَلتَّذْبِیْحُ۔ بہت زیادہ ذبح کرنا۔ سر کو اسقدر جھکا دینا کہ وہ کمر سے نیچا ہو جائے۔ اَلذِّبْحُ۔ وہ چیز جو ذبح کی جائے*۔

قرآن کریم میں بنی اسرائیل کے متعلق ہے کہ قوم فرعون یُذَبِّحُوْنَ اَبْنَآءَکُمْ وَیَسْتَحْیُوْنَ نِسَآءَکُمْ (۲/۴۹ و دیگر مقامات)۔ "تمہارے ابناء کو ذبح کر دیتے تھے اور نساء کو زندہ رکھتے تھے"۔ عام طور پر اس سے مفہوم یہ لیا جاتا ہے کہ فرعون نے حکم دے رکھا تھا کہ بنی اسرائیل کے ہاں جو لڑکے پیدا ہوں انہیں پیدا ہوتے ہی مار دیا جائے اور لڑکیوں کو زندہ رکھا جائے۔ سوال یہ ہے کہ یُذَبِّحُوْنَ سے مراد سچ مچ ذبح کر دینا ہے یا اسکے معنے کچھ اور بھی ہیں۔ سورۃ اعراف میں یُذَبِّحُوْنَ کی جگہ یُقَتِّلُوْنَ آیا ہے (۷/۱۴۱)۔ یعنی وہ تمہارے ابناء کو قتل کر ڈالتے تھے اور نساء کو زندہ رکھتے تھے۔ اس سے ظاہر ہے کہ قرآن کریم نے اس باب میں ذَبْحٌ اور قَتْلٌ کو مرادف معنوں میں استعمال کیا ہے۔ اب ہمیں دیکھنا یہ ہے کہ قَتْلٌ کے معنے کیا ہیں۔ اس لفظ کے متعلق عنوان ق۔ ت۔ ل میں تفصیل سے بحث کی گئی ہے۔ وہاں آپ دیکھینگے کہ اسکے

* تاج۔

معنے صرف مار ڈالنا نہیں بلکہ اسکے معنے ذلیل و خوار کرنا۔ کسی کو کمزور اور غیر مؤثر کر دینا ۔ ایسا بنا دینا کہ اسکی موجودگی اور عدم موجودگی برابر ہو۔ کسی کو حقیر کر دینا، بھی ہیں ۔ نیز اسکے معنے کسی کو علم و تربیت سے محروم رکھنا بھی ہیں ۔ (ان معانی کی اسناد ق ۔ ت ۔ ل کے عنوان میں ملینگی) ۔ قرائن سے مترشح ہوتا ہے کہ بنی اسرائیل کے معاملہ میں ذَبْح یا قَتْل سے مراد سچ مچ قتل کر دینا نہیں بلکہ انہیں ذلیل و حقیر کرنا اور کمزور و غیر مؤثر بنا دینا ہیں ۔ سچ مچ قتل کر دینے کے خلاف حسب ذیل قرائن ہیں ۔

(۱) یہ ظاہر ہے کہ حضرت موسیٰ کے زمانے میں بنی اسرائیل کی قوم کی تعداد بہت بڑی تھی ۔ اگر کسی قوم کی حالت یہ ہوجائے کہ اسکے تمام لڑکے مار دئے جائیں اور صرف لڑکیاں زندہ رکھی جائیں تو کچھ وقت کے بعد وہ قوم ہی ختم ہو جائیگی* ۔

(۲) حضرت موسیٰ کے بڑے بھائی (حضرت ہارون) بھی زندہ موجود تھے ۔ اور حضرت موسیٰ بھی پیدا ہوتے ہی مار نہیں ڈالے گئے تھے ۔ اس سے بھی ظاہر ہے کہ بنی اسرائیل کے لڑکوں کو پیدا ہوتے ہی مار نہیں دیا کرتے تھے ۔

(۳) سورۃ یونس میں ہے کہ فَمَآ اٰمَنَ لِمُوْسٰٓى اِلَّا ذُرِّيَّةٌ مِّنْ قَوْمِهٖ (۱۰/۸۳) ''موسیٰ پر اسکی قوم کی ذُرِّيَّتٌ ایمان لائی'' ۔ ذریت نئی پود (یا نو جوانوں) کو کہتے ہیں ۔ (دیکھئے ذ ۔ ر ۔ ر)۔ اگر بنی اسرائیل کے لڑکوں کو پیدا ہوتے ہی مار دیا کرتے تو یہ ذریت موجود ہی نہ ہوتی ۔ (قوم کے نو جوانوں کے ایمان لانے کی وجہ سمجھنے کے لئے عنوان ذ ۔ ر ۔ ر ۔ دیکھئے) ۔

(۴) جب حضرت موسیٰ فرعون کے پاس آئے ہیں تو اسنے کہا کہ ہم نے تیری پرورش کی اور تجھ پر اسقدر احسانات کئے اور تو ان احسانات کا یہ بدلہ دے رہا ہے ۔ تو اسکے جواب میں حضرت موسیٰ نے کہا کہ وَتِلْكَ نِعْمَةٌ تَمُنُّهَا عَلَيَّ اَنْ عَبَّدْتَّ بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ (۲۶/۲۲) ۔ ''یہ وہ نعمت ہے جسے تو مجھ پر جتاتا ہے کہ تونے بنی اسرائیل کو غلام (محکوم) بنا رکھا ہے'' ۔ آپ دیکھئے ۔ حضرت موسیٰ نے فرعون کے خلاف جو الزام عائد کیا ہے وہ بنی اسرائیل کو غلام بنائے رکھنے کا ہے ۔ اگر وہ ان کے لڑکوں کو قتل کرنے کا مجرم بھی ہوتا تو آپ سب سے پہلے اسکا ذکر

* بعض تفاسیر میں ہے کہ فرعون نے بنی اسرائیل کے نوے ہزار بچوں کو قتل کیا تھا ۔

کرے کیونکہ یہ جرم، قوم کو غلام (محکوم) بنانے سے کہیں زیادہ سنگین تھا۔ لیکن آپ سارے قرآن کریم میں دیکھ جائیے۔ حضرت موسیٰؑ نے کسی جگہ بھی فرعون اور اسکی قوم کو اس جرم سے مطعون نہیں کیا۔

ان شواہد سے ظاہر ہے کہ فرعون اور اسکی قوم بنی اسرائیل کے بچوں کو سچ مچ ذبح نہیں کیا کرتے تھے۔ یعنے انہیں مار نہیں ڈالا کرتے تھے۔ کہا جائیگا کہ اگر یہ بات نہیں تھی تو پھر حضرت موسیٰؑ کی والدہ نے (خدا کے حکم سے) حضرت موسیٰؑ کو صندوق میں ڈالکر دریا میں کیوں بہا دیا تھا۔ اس سے ظاہر ہے کہ اسوقت بنی اسرائیل کے بچوں کو پیدا ہوتے ہی مار دیا جاتا تھا اور اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰؑ کو محفوظ رکھنے کیلئے یہ تدبیر کی تھی۔

سب سے پہلے تو یہ دیکھئے کہ خود قرآن کریم میں اسکی تصریح موجود ہے کہ فرعون نے یہ حکم (کہ بنی اسرائیل کے لڑکوں کو ذبح کر دیا جائے*) اُسوقت دیا تھا جب حضرت موسیٰؑ اپنی دعوتِ انقلاب لیکر آئے ہیں۔ چنانچہ سورۃ اعراف میں ہے کہ حضرت موسیٰؑ کی انقلابی دعوت کا عالمگیر اثر دیکھکر فرعون کے امیروں اور وزیروں نے فرعون سے کہا کہ انکے خلاف کوئی سخت اقدام کیوں نہیں کیا جاتا؟ انہیں اسطرح کھلی چھٹی کیوں دے رکھی ہے کہ یہ جو جی میں آئے کرتے جائیں؟ اسکے جواب میں فرعون نے کہا کہ نہیں! میرے سامنے ایک تجویز ہے۔ اور وہ یہ کہ سَنُقَتِّلُ اَبْنَآءَهُمْ وَنَسْتَحْیٖ نِسَآءَهُمْ ($\frac{7}{127}$)۔ "عنقریب ہم ان کے لڑکوں کو قتل کر دینگے اور انکی عورتوں کو زندہ رکھینگے"۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ یہ تدبیر اسوقت عمل میں لائی گئی تھی جب حضرت موسیٰؑ کی دعوت پھیلی ہے۔ حضرت موسیٰؑ کی پیدائش کے وقت یہ حکم موجود نہیں تھا۔ سورۃ المومن میں اسے اور بھی واضح کر دیا گیا ہے۔ وہاں کہا گیا ہے کہ جب حضرت موسیٰؑ فرعون کے پاس دعوت لیکر گئے تو اسنے کہا کہ اُقْتُلُوْٓا اَبْنَآءَ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ وَاسْتَحْیُوْا نِسَآءَهُمْ ($\frac{40}{25}$)۔ "جو لوگ موسیٰؑ پر ایمان لائیں انکے بیٹوں کو قتل کر دو اور انکی عورتوں کو زندہ رکھو"۔ اس سے نہ صرف یہی واضح ہے کہ یہ حکم دعوت حضرت موسیٰؑ کے زمانہ میں دیا گیا تھا بلکہ یہ بھی کہ یہ

*جبتک ان الفاظ کا صحیح مفہوم آگے جا کر واضح نہیں ہو جاتا ہم یہی الفاظ لکھتے جائینگے۔ یعنے بنی اسرائیل کے بچوں کو ذبح کرنے کا حکم وغیرہ۔

حکم تمام بنی اسرائیل کیلئے نہیں تھا ۔ صرف ان کے متعلق تھا جو حضرت موسیٰؑ پر ایمان لائے تھے* ۔

ان شواھد سے واضح ھے کہ حضرت موسیٰؑ کی پیدائش کے وقت یہ حکم نافذ نہیں تھا ۔ لہذا جب یہ حکم ھی نہ تھا تو یہ سمجھنا صحیح نہیں کہ حضرت موسیٰؑ کو اسلئے دریا میں بہا دیا گیا تھا کہ اللہ تعالیٰ انہیں اس تدبیر سے زندہ رکھنا چاھتا تھا ۔

حضرت موسیٰؑ کو دریا میں کیوں بہا دیا گیا تھا ۔ اسکا جواب خود قرآن کریم نے دیا ھے۔ یہ ظاھر ھے کہ بنی اسرائیل مصر میں حضرت یوسفؑ کے زمانہ میں داخل ہوئے تھے۔ اور حضرت یوسفؑ کو جو وقار مصر میں حاصل تھا اس پر قرآن کریم شاھد ھے ۔ مملکت کے خزانے کی چابیاں ان کے ھاتھ میں تھیں ۔ اس قوم کا وقار حضرت یوسفؑ کے بعد بھی کچھ عرصہ تک باقی رھا ھوگا۔ لیکن اسکے بعد حاکم قوم نے بنی اسرائیل کو محکوم قوم کا درجہ دیدیا ھوگا۔ اگرچہ آج بھی دنیا میں محکوم قوموں کی کوئی حیثیت نہیں ھوتی لیکن اُس زمانے میں تو محکوم قوم کی حیثیت غلاموں کی سی ھوتی تھی۔ نہ اُنکے بچوں کیلئے تعلیم و تربیت کے کوئی مواقع ھوتے تھے، نہ بڑوں کیلئے حکومت کے کاروبار میں عمل دخل کی کوئی صورت۔ مشیت کے پروگرام کے مطابق حضرت موسیٰؑ کو فرعون کے ساتھ ٹکر لینے کیلئے پیدا کیا گیا تھا ۔ اس مقصد کیلئے ضروری تھا کہ انکی تعلیم و تربیت بھی اعلیٰ درجہ کی ھوتی اور انہیں رموز مملکت اور غوامض سیاست سمجھنے کے بھی مواقع حاصل ھوتے ۔ اس مقصد کیلئے تجویز یہ کیا گیا کہ انکی پرورش خود فرعون کے محلات میں ھو اور انکا ابتدائی زمانہ فرعون کے متبنّٰی کی حیثیت سے گزرے۔ یہ تھا وہ مقصد جس کیلئے انہیں دریا میں بہا کر فرعون کے محلات تک پہنچایا گیا۔ چنانچہ قرآن کریم میں ھے کہ یہ اس لئے کیا گیا تھا لِتُصْنَعَ عَلٰی عَیْنِیْ (۲۰/۳۹) ''تا کہ تیری تربیت ھماری زیر نگرانی ھو،، ۔ یعنے اس سے مقصد حسن تربیت تھا (جس پر بنی اسرائیل کے بچوں کے دروازے بند تھے)۔ اور یہ اس پروگرام کی ایک کڑی تھی جسکے مطابق حضرت موسیٰؑ کو اس مہم کیلئے تیار کیا جا رھا تھا ۔ چنانچہ اس سے ذرا آگے ھے ۔ ثُمَّ جِئْتَ عَلٰی قَدَرٍ یّٰمُوْسٰی (۲۰/۴۰)۔ ''اسطرح آھستہ آھستہ تم، اے موسیٰ، ھمارے پیمانے پر پورے اتر آئے،، ۔

---

*یہ بات آگے چلکر بتائی جائیگی کہ جو لوگ حضرت موسیٰؑ پر ایمان لائے تھے انکے خلاف تو فرعون نے کچھ نہیں کیا ۔ انکے بیٹوں کو قتل کرنے کا حکم کیوں دیا؟ اُن بچوں کا کیا قصور تھا؟ ۔

سورۃ القصص میں البتہ یہ مذکور ہے کہ حضرت موسیٰؑ کی ماں سے کہا گیا کہ اَرْضِعِيْهِ فَاِذَا خِفْتِ عَلَيْهِ فَاَلْقِيْهِ فِي الْيَمِّ (۲۸/۷) - ''تو اس بچہ کو دودھ پلاتی رہ - اور جب تجھے اسکے متعلق خوف ہو تو اسے دریا میں ڈال دینا''۔ اس سے یہ نتیجہ نکالا جاتا ہے کہ یہ خوف اس بات کا تھا کہ فرعون کے لوگ بچے کو قتل کر دینگے - لیکن جب قرآنی شواہد سے یہ ظاہر ہے کہ قتل ابناء کا حکم حضرت موسیٰؑ کی دعوت کے زمانے کا ہے تو اس سے یہ اندازہ صحیح نہیں ہو سکتا - اس خوف کا باعث کچھ اور سمجھنا ہوگا - اس سے آگے فرعون کی بیوی کے متعلق کہا ہے کہ جب فرعون کے لوگوں نے صندوق پکڑ لیا تو اسنے اپنے خاوند سے کہا کہ لَا تَقْتُلُوْهُ (۲۸/۹) ''اسے قتل نہ کرو''۔ اسے ہم متبنٰے بنا لیتے ہیں - اس سے بھی یہی نتیجہ اخذ کیا جاتا ہے کہ اُس زمانے میں بنی اسرائیل کے بچوں کو قتل کیا جاتا تھا - لیکن یہ قیاس اس لئے صحیح نہیں کہ اس بچے کے متعلق (جسے دریا کی لہروں سے اٹھایا گیا تھا) یہ کسطرح معلوم ہو گیا کہ وہ بنی اسرائیل کی قوم کا بچہ ہے نہ قوم فرعون میں سے کسی کا بچہ نہیں - لہذا یہاں لَا تَقْتُلُوْهُ کے معنے قتل کرنا نہیں ہونگے بلکہ حقیر سمجھکر پھینک دینے کے ہونگے - (دیکھئے عنوان ق - ت - ل)۔

اسکے بعد یہ سوال سامنے آتا ہے کہ يُذَبِّحُوْنَ اَبْنَآءَهُمْ وَ يَسْتَحْيُوْنَ نِسَآءَهُمْ کا صحیح مفہوم کیا ہے - یہ ہم دیکھ چکے ہیں کہ یہ فیصلہ اُس زمانے کا ہے جب حضرت موسیٰؑ کی دعوتِ عام ہو رہی تھی اور فرعون اور اس کی قوم کو اس سے خطرہ لاحق ہو رہا تھا - چنانچہ فرعون کے ارباب حل و عقد نے اس سے کہا تھا کہ اس فتنے کو کب تک اس طرح کھلا رہنے دیا جائیگا - اس کا کچھ علاج کرنا چاہئے (۷/۱۲۷) تو اسکے جواب میں اس نے کہا تھا کہ اس کے متعلق میں نے ایک تجویز سوچ لی ہے - ہم اس پر عمل پیرا ہونگے - اور وہ تجویز یہی (قتل ابناء کی) تھی - چنانچہ قرآن کریم نے اس تجویز کو كَيْدٌ (۴۰/۲۵) سے تعبیر کیا ہے، جس کے معنے ہیں ایک گہری چال - یہ چال کیا تھی؟ فرعون کے متعلق سورۃ قصص میں ہے کہ وَجَعَلَ اَهْلَهَا شِيَعًا يَّسْتَضْعِفُ طَآئِفَةً مِّنْهُمْ (۲۸/۴) - ''وہ اپنی رعایا میں پارٹیاں بناتا رہتا تھا اور ایک گروہ کو کمزور کرتا جاتا تھا''۔ اس کے بعد ہے يُذَبِّحُ اَبْنَآءَهُمْ وَ يَسْتَحْيٖ نِسَآءَهُمْ (۲۸/۴)۔ یعنے ان کے اَبْنَآءَ کو ذبح کرتا تھا اور نِسَآءَ کو زندہ رکھتا تھا - اس کی تدبیر یہ تھی کہ بنی اسرائیل کو پارٹیوں میں تقسیم

کر دیا جائے تاکہ اُس قوم میں پھوٹ پڑی رہے اور وہ باہمی آویزشوں میں الجھی رہے۔ یہ وہ چال ہے جو ہر سیاستدان حکمران قوم، قومِ محکوم کے ساتھ کرتی رہتی ہے۔ اس کے بعد قرآن کریم نے بتایا ہے کہ اِس پارٹی بازی میں وہ کرتا یہ تھا کہ قوم کا وہ طبقہ جس میں اسے جوہرِ مردانگی نظر آتے۔ جن کے متعلق وہ سمجھتا کہ اُن کا اُبھرنا خطرناک ہے۔ انہیں دباتا۔ اُنہیں ہر طرح حقیر و ذلیل رکھتا۔ اور جس طبقہ کو دیکھتا کہ وہ مرد نہیں بلکہ عورتوں جیسے ہیں، اُنہیں ابھار کر معزز و مقرب بنا لیتا اور ان کے ہاتھوں انہی کی قوم کا گلا گھونٹتا رہتا۔ یہ کچھ بھی ہر ماہرِ سیاست حاکم قوم کرتی ہے۔ وہ ہمیشہ محکوم قوم کے ان افراد کو ذلیل و خوار رکھتی ہے جن میں انہیں جوہر مردانگی نظر آتے ہیں اور ان لوگوں کو جن سے کسی خطرہ کا امکان نہ ہو، آگے بڑھاتی رہتی ہے۔ قرآن کریم نے اول الذکر طبقہ کو قوم کے آبْنَاء کہا ہے اور ثانی الذکر کو نِسَاء۔ اور قَتْلِ آبْنَاء سے مراد ہے انہیں ذلیل و حقیر رکھنا۔ اور اِسْتِحْيَاءِ نِسَاء سے مفہوم ہے اس دوسرے طبقہ کو ابھار کر آگے بڑھانا۔ اس طرح وہ پوری کی پوری قومِ بنی اسرائیل کو کمزور کئے جا رہا تھا۔

قرآن کریم کے شواہد سے اندازہ یہی ہوتا ہے کہ قَتْل یا ذَبْحِ آبْنَاء سے یہی مراد ہے۔ لیکن بہر حال یہ ایک اندازہ ہے جس پر مزید غور کیا جا سکتا ہے۔ اسی سے یہ بات بھی سمجھ میں آجاتی ہے کہ فرعون کے اس حکم کا مطلب کیا تھا کہ جو لوگ موسیٰ پر ایمان لائے ہیں ان کے آبْنَاء کو قتل کر دیا جائے (۴۰/۲۵)۔ یعنے اس کی تدبیر یہ تھی کہ اس جماعت میں اس طرح سے پھوٹ ڈالی جائے کہ ان کی پارٹیاں بنا دی جائیں اور اس طرح ان میں جتنے لوگ ایسے ہیں جن سے خطرہ ہوسکتا ہے انہیں ایسا غیر موثر بنا دیا جائے کہ کوئی ان کی بات ہی نہ سنے (قَتْل کے یہ معنے عنوان ق۔ت۔ل میں دیکھئے)۔ ورنہ یہ بات سمجھ میں نہیں آتی کہ ایمان تو لائیں یہ لوگ، اور حکم یہ دیا جائے کہ ان کے پیدا ہونے والے بچوں کو قتل کر دیا جائے۔ حالانکہ دوسری طرف جب دربارِ فرعون کے ساحرین ایمان لائے ہیں تو اس نے ان ہی کے متعلق حکم دیا تھا کہ انہیں سولی پر لٹکا دیا جائے۔ نہ یہ کہ ان کے بچوں کو قتل کر دیا جائے۔

بہر حال، جیسا کہ اوپر لکھا جا چکا ہے،۔ قرآنی شواہد سے قیاس کا رخ اس طرف جاتا ہے کہ ذَبْحِ آبْنَاءَ اور اِسْتِحْيَاءِ نِسَاء کے الفاظ استعارۃً استعمال ہوئے ہیں۔ سچ مچ ذبح کر دینے کے معنوں میں استعمال

نہیں ہوئے۔ لیکن جیسا کہ ہم نے کہا ہے، یہ ہمارا قیاس ہے جس کے دلائل اوپر دئیے گئے ہیں۔ اگر ان دلائل کو قوی نہ سمجھا جائے تو ذَبْح اَبْنَآء کو حقیقی معنوں میں لیا جائیگا۔ یعنی فرعون، بنی اسرائیل کے لڑکوں کو سچ مچ ذبح کر دیا کرتا تھا۔ اسوقت تک مصر کی قدیم تاریخ سے جسقدر پردے اٹھے ہیں ان میں بنی اسرائیل کے بچوں کے قتل کر دینے کا کوئی واقعہ سامنے نہیں آیا۔ ممکن ہے جب تاریخ کے مزید اوراق سامنے آئیں تو ان میں اس کے متعلق کوئی ذکر ہو۔ اسوقت تک صرف تورات میں یہ ملتا ہے کہ فرعون نے بنی اسرائیل کے بچوں کو مار ڈالنے کا حکم دے رکھا تھا (کتاب خروج) لیکن تاریخی نقطہ نگاہ سے موجودہ تورات کی جو حیثیت ہے وہ ارباب علم سے پوشیدہ نہیں۔

سورۃ مائدہ میں ان جانوروں کو جو بتوں کے استھانوں پر قربانی دئیے جاتے تھے مَا ذُبِحَ عَلَی النُّصُبِ (۳/۵) کہا ہے۔

سورۃ صٰفّٰت میں حضرت ابراھیمؑ اور اسمعیلؑ کے تذکار جلیلہ میں ہے کہ جب حضرت ابراھیمؑ اپنے بیٹے کو (اپنے خیال کے مطابق) ہماری راہ میں قربان کرنے اور حضرت اسماعیلؑ اپنے آپکو اسطرح قربان کر دینے کیلئے تیار ہو گئے تو ہم نے انہیں آواز دیکر اس سے روک دیا اور وَفَدَیْنٰہُ بِذِبْحٍ عَظِیْمٍ (۳۷/۱۰۷)۔ ''اسماعیل کو ایک ذبح عظیم کے بدلے میں بچا لیا''۔ جیسا کہ قرآن کریم کے متعدد مقامات سے واضح ہے، اس ذبح عظیم سے مراد یہ ہے کہ انہیں شام کے سر سبز و شاداب علاقہ کی سرداری کی بجائے عرب کی بے برگ و گیاہ سر زمین میں خانۂ کعبہ کی تولیت کیلئے متعین کر دیا۔ یہ وہ قربانی تھی جو ساری عمر کیلئے تھی۔ نہ صرف اپنی ساری عمر کے لئے بلکہ اپنی آنے والی نسل کی بھی قربانی۔ وَتَرَکْنَا عَلَیْہِ فِی الْاٰخِرِیْنَ (۳۷/۱۰۸) اسلئے یہ ذبح عظیم تھی۔ یعنی بہت بڑی قربانی۔ (مزید تفصیل میری کتاب ''جوئے نور'' میں ملیگی۔ اور بنی اسرائیل کے حالات ''برق طور'' میں)۔

ذ خ ر

ذَخَرَ۔ یَذْخَرُ۔ کسی چیز کو لے لینا۔ اپنا لینا۔ کسی چیز کو اسلئے چھپا رکھنا کہ وہ بوقت ضرورت کام آئے۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی ہیں کسی چیز کو محفوظ رکھنے کی غرض سے سمیٹ لینا۔ اِدَّخَرَ اِدِّخَارًا باب افتعال سے بمعنی ذَخَرَ ہی ہے۔ (اِدِّخَارًا اصل میں

اذْ تِیخَارًا تھا) - اَلْمُدَّخِرُ - اس گھوڑے کو کہتے ھیں جو دوڑنے میں اپنی پوری طاقت خرچ نہ کرے بلکہ کچھ طاقت بچا رکھے* - اَلْذَاخِرُ فربہ - موٹا** -

سورۃ آل عمران میں ھے مَا تَدَّخِرُوْنَ فِی بُیُوْتِکُمْ (۳/۴۸)- اسکے معنے ذخیرہ کرنے کے ھیں- معلوم ھوتا ھے کہ حضرت مسیح ؑ (خدا کے ایک سچے داعیِ انقلاب ھونے کی وجہ سے) یہودیوں کی ذخیرہ اندوزی (Hoarding) سے نالاں تھے- اس میں اسی کی طرف اشارہ ھے -

ذ ر أ

ذَرَاَ الْاَرْضَ - زمین میں بیج ڈال دیا* - ذَرَاَ اللّٰہُ الْخَلْقَ - اللہ نے مخلوق کو پیدا کیا اور اسے بڑھایا - کثیر کر دیا* - چنانچہ قرآن کریم میں ھے - یَذْرَؤُکُمْ فِیْہِ (۴۲/۱۱) - ''وہ اسطرح تمہیں بڑھاتا اور پھیلاتا رھتا ھے'' - سورۃ المومنون میں ھے ھُوَ الَّذِیْ ذَرَاَکُمْ فِی الْاَرْضِ (۲۳/۷۹) - ''وھی ھے جس نے تمہیں زمین میں بڑھایا اور پھیلایا ھے'' -

ذُرِّیَّۃٌ کے متعلق بعض کا خیال ھے کہ یہ ذَرَاَ سے مشتق ھے - لیکن بعض کے نزدیک یہ ذَرٌّ سے مشتق ھے - ھم نے اسے (ذ - ر - ر) کے نیچے لکھا ھے -

ذ ر ر

اَلذَّرُّ - بہت چھوٹی چھوٹی چیونٹیاں - نیز وہ چھوٹے چھوٹے ذرات جو دھوپ میں منتشر نظر آتے ھیں - اَلذَّرُّ کا واحد ذَرَّۃٌ ھے - نہایت چھوٹی اور کم وزن چیز کو بھی اسی جہت سے ذَرَّۃٌ کہا جاتا ھے - سورۃ زلزال میں مَنْ یَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّۃٍ (۹۹/۶) آیا ھے - ذرہ کے وزن برابر - یعنے خفیف سے خفیف - ذَرَّ - کسی چیز کو چھڑکنا - متفرق کرنا - ابن فارس نے کہا ھے کہ اس کے بنیادی معنی باریکی اور انتشار ھوتے ھیں - ذَرَّ الْمِلْحَ عَلَی اللَّحْمِ - اسنے گوشت پر نمک چھڑکا - ذَرَّ الْحَبَّ فِی الْاَرْضِ - اسنے زمین میں بیج بکھیر دیا* -

اَلذُّرِّیَّۃُ - اَلذِّرِّیَّۃُ - آدمی کی اولاد اور نسل، خواہ نر ھو یا مادہ - لیکن کبھی اسکا اطلاق انسان کے والدین اور آبا و اجداد پر بھی ھوتا ھے - یعنی یہ لفظ اضداد میں سے ھے*- (اس کے متعلق ذرا آگے چل کر لکھا جائیگا) -

---

*تاج - **محیط -

راغب نے کہا ہے کہ اسکے اصلی معنے تو چھوٹے بچے ہیں لیکن یہ کبھی چھوٹے اور بڑے سب بچوں پر بولا جاتا ہے - یہ لفظ ہے تو جمع ہی کیلئے لیکن پھر واحد اور جمع سب کیلئے یکساں آتا ہے - بعض کے نزدیک ذُرِّيَّةٌ کا مادہ ذرأ ہے - جسکے معنے پیدا کرنے اور بڑھانے کے ہیں - (لین) -

ذَرُّ الْبَقْلِ - سبزی پھوٹی* -

قرآن کریم میں ذُرِّيَّةٌ بمعنے اولاد اور نسل (۲/۱۲۴) میں آیا ہے - سورۃ یٰسین میں جہاں کہا ہے کہ اِنَّا حَمَلْنَا ذُرِّيَّتَهُمْ فِي الْفُلْكِ (۳۶/۴۱)- "ہم نے ان کی ذریت کو کشتی میں سوار کیا" - تو وہاں ذریت کے معنے (اس نسل کے) چھوٹے بڑے سب ہیں - اس آیت (۳۶/۴۱) ہی کی وجہ سے اہل لغت نے الذُّرِّيَّة میں اولاد اور آباء کے معنی تسلیم کئے ہیں اور اسی بناء پر یہ لفظ اضداد میں مانا گیا ہے، لیکن قرآن کریم کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ لفظ کہیں بھی آباء کے لئے نہیں بولا گیا بلکہ آباء کے بالمقابل اولاد کے لئے ہی استعمال ہوا ہے (۶/۸۸)- مذکورۃ الصدر آیت (۳۶/۴۱) میں بھی یہ بات صاف ہو جاتی ہے کہ ذُرِّيَّةٌ اولاد ہی کے لئے ہے، جبکہ ہم الفُلْكِ الْمَشْحُوْن سے مراد حضرت نوحؑ کی ایک معین کشتی لیں جو وحی کے ذریعہ بنوائی گئی تھی اور ذریتَهُمْ سے مراد اُس زمانہ کے انسانوں کی نسل لی جائے - اس طرح اس لفظ میں متضاد معانی باقی نہیں رہینگے -

سورۃ یونس میں ہے فَمَا اٰمَنَ لِمُوْسٰى اِلَّا ذُرِّيَّةٌ مِّنْ قَوْمِهٖ (۱۰/۸۳) - بعض نے کہا ہے کہ اسکے معنے ہیں بہت تھوڑے لوگوں نے*** - اور بعض نے کہا ہے کہ اسکے معنے ہیں اسکی قوم کے نوجوان**** - ہمارے نزدیک دوسرے معنے زیادہ واضح ہیں - انقلاب آفرین پیغام پر، ابھرنے والی نسلیں جلدی ایمان لاتی ہیں - پرانے لوگ اپنے قدیم معتقدات اور عادات و خصائل میں پختہ ہو چکے ہوتے ہیں - نیز بڑھاپے کی وجہ سے ان میں اپنے اندر نئی تبدیلی پیدا کرنے، یا نئے ماحول سے مطابقت، کی ہمت بہت کم ہوتی ہے - یہ قوم کا نوجوان طبقہ ہوتا ہے جو ظلم و استبداد کے علی الرغم، کسی قسم کا خوف نہ کرتے ہوئے، دعوت انقلاب پر لبیک کہتا اور حالات کی تلاطم انگیزیوں سے نبرد آزما ہوتا ہے - (نیز دیکھئے عنوان ذ - ب - ح) -

*تاج و محیط - **راغب - ***ابن عباس - ****ابو الکلام آزاد مرحوم -

ذ ر ع

اَلذِّرَاعُ ۔ ہاتھ کا کہنی سے لیکر درمیانی انگلی کے آخر تک کا حصہ۔ کلائی کے لئے بھی بولا جاتا ہے ، نیز ایک پیمانہ جس سے ناپا جاتا ہے* ۔ سورۃ کہف میں ہے وَ کَلْبُھُمْ بَاسِطٌ ذِرَاعَیْہِ (۱۸/۱۸) ۔''ان کا کتا اپنے دونوں ہاتھ (یعنی اگلی ٹانگیں) بچھائے ہوئے تھا''۔ ذَرْعُہٗ کَذَا ۔ اسکا طول اسقدر ہے** ۔ ذَرْعُھَا سَبْعُوْنَ ذِرَاعًا (۶۹/۳۲) ۔ ''اسکی پیمائش ستّر ہاتھ ہے''۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی ہیں کسی چیز کا لمبا ہونا اور آگے کیطرف حرکت کرنا ۔ مَالِیْ بِہٖ ذَرْعٌ ۔ مجھے اسکی دسترس نہیں* ۔ ضِقْتُ بِہٖ ذَرْعًا ۔ کسی کام کی دسترس نہ رکھنا ۔ سورۃ ھود میں حضرت لوطؑ کے متعلق ہے ضَاقَ بِھِمْ ذَرْعًا ۔ (۱۱/۷۷) ۔ اسنے ان کے معاملہ میں اپنے آپکو کوتاہ دست پایا ۔

اَلذَّرِیْعَۃُ ۔ اس اونٹنی کو کہتے ہیں جو شکار کیلئے بطور آڑ استعمال کی جاتی ہے* ۔ نیز ہر اس شے کو کہتے ہیں جس کے توسط سے مقصد تک ہاتھ پہنچ سکے ۔

ذ ر و

ذَرَتِ الرِّیْحُ الشَّیْئَ ذَرْوًا ۔ ہوا اس چیز کو اڑا کر لے گئی ۔ ذَرَا الْحِنْطَۃَ یَذْرُوْھَا ذَرْوًا ۔ اسنے گیہوں کو بھوسے سے صاف کرنے کے لئے ہوا میں اڑایا ۔ فَتَذَرَّتْ ۔ پس گیہوں بھوسے سے الگ ہو کر صاف ہو گیا ۔ ذُرَاوَۃُ النَّبْتِ ۔ پودے کے جھڑے ہوئے خشک اجزاء جو ہوا میں اڑ جائیں ۔

ذُرْوَۃُ الشَّیْئِ ۔ چیز کا بلند تر اور اونچا حصہ* ۔

سورۃ کہف میں ہے تَذْرُوْہُ الرِّیٰحُ (۱۸/۴۵) ۔ ''ہوائیں اسے اڑائے اڑائے پھرتی ہیں''۔ سورۃ ذاریات میں ہے ۔ وَالذّٰرِیٰتِ ذَرْوًا ۔ (۵۱/۱) ۔ ذَرْوٌ ۔ پھیلا دینا ۔ بکھیر دینا ۔ ذَارٍ (اَلذَّارِیْ) بکھیر دینے والا ، پھیلا دینے والا (نشرو اشاعت کرنے والا) ۔ وہ قوتیں جو کسی پیغام (یا نظام) کی نشرو اشاعت کا ذریعہ بنتی ہیں ۔ جن سے وہ آواز دنیا میں پھیلتی ہے ۔ ذرائع رسل و رسائل و مواصلات و نشرو اشاعت ۔

*تاج ۔ **محیط ۔ *تاج و راغب ۔

ذ ع ن

آلْاِذْعَانُ - اطاعت میں جلدی کرنا - دوڑ کر حکم کی تعمیل کرنا - نَاقَۃٌ مِذْعَانٌ - مطیع اونٹنی - مُذْعِنِیْنَ (۲۴/۴۹) لپک کر اطاعت کرنے والے* - اَذْعَنَ لَہٗ - اس کے لئے جھکا اور اس کا تابع فرمان ہوا** -

صاحب محیط نے آلْاِذْعَانُ کے اصطلاحی معنے بتاتے ہوئے لکھا ہے کہ الاِذْعَانُ اعتقاد یعنی دلی عزم کو کہتے ہیں - اور عزم، تردد کے بعد ارادے کی پختگی کو کہتے ہیں - اذْعَان کے مختلف مراتب ہوتے ہیں جن میں سے ادنیٰ ترین کو ظن اور اعلیٰ ترین کو یقین کہا جاتا ہے - اور ان دونوں کے درمیان تقلید اور جہل مرکب کا مرتبہ ہوتا ہے** -

ذ ق ن

آلذَّقَنُ - ٹھوڑی* - جمع اَذْقَانٌ - (۳۶/۸) - مجازاً چہرے کو بھی کہدیتے ہیں - جیسے یَخِرُّوْنَ لِلْاَذْقَانِ سُجَّدًا (۱۰۷/۱۷) میں منہ کے بل گرنے کیلئے یہ لفظ آیا ہے -

ذ ک ر

آلذِّکْرُ وَالتَّذْکَارُ - کسی چیز کو محفوظ کر لینا - کسی بات کا دل میں حاضر کر لینا - یہ لفظ نَسْیٌ کے مقابلہ میں آیا ہے (۶/۶۸) - نَسْیٌ کے معنے ہوتے ہیں کسی بات کو بھلا دینا - لہذا ذِکْرٌ کے معنے ہوئے کسی بات کو یاد کرنا -

اِدَّکَرَ - اِسْتَذْکَرَ - تَذَکَّرَ - کے ہام معنے ہیں کسی بات کو یاد کر لینا - لیکن ابواب کے خواص کے لحاظ سے ان کے مفہوم میں لطیف سا فرق ہے - اِذَّکَرَ اصل میں اِذْتَکَرَ ہے - صوتی گرانی کی وجہ سے ذال کو دال کر دیا - پھر تاء کو دال میں مدغم کر دیا - اسی سے مُدَّکِرٌ اسم فاعل ہے -

آلتَّذْکِرَۃُ - جس سے کسی ضرورت کو یاد دلایا جائے - (۶/۴۹)

آلذِّکْرٰی (۶/۶۹) یاد دہانی -

ذَکَرَ حَقَّہٗ - اسکے حق کی حفاظت کی اور اسکو ضائع نہیں کیا -

اُذْکُرُوْا نِعْمَۃَ اللّٰہِ عَلَیْکُمْ - تم پر جو خدا کے احسانات ہیں انکی حفاظت کرو اور انہیں ضائع مت کرو* -

*تاج و راغب - **محیط -

شہرت کو بھی ذِکْرٌ کہتے ہیں - نیز کسی کے متعلق اچھی بات کہنے کو بھی - اور شرف و عزت کو بھی - اور عبرت و موعظت کو بھی - ذِکْرٌ اُس کتاب کو بھی کہتے ہیں جس میں دین کی تفصیلات اور امتوں کے قوانین درج ہوں* -

اَلذَّکَرُ - قوی اور شجاع مرد - تلوار کی تیزی اور سختی کو بھی کہتے ہیں* - نیز نر ، بمقابلہ الاُنْثیٰ (۳/۳۵) میں آیا ہے -

مُذَکَّرٌ - مؤنث کی ضد ہے - نیز سخت مصیبت جس کا مقابلہ مرد ہی کر سکیں* -

قرآن کریم کو الذِّکْرُ کہا گیا ہے (۱۵/۹) - کیونکہ اسمیں اقوام و ملل کے عروج و زوال کے قوانین بھی ہیں اور تاریخی یاد داشتیں بھی - اشیائے فطرت پر غور و فکر کرنے والوں کو لِقَوْمٍ یَذَّکَّرُوْنَ (۱۶/۱۳) کہا گیا ہے - نیز غیر خدائی قوتوں کے خلاف معرکہ آرائی کو ذِکْرٌ سے تعبیر کیا گیا ہے - یعنے ان قوانین خداوندی کو سامنے لانے کی جد و جہد جنہیں اُنہوں نے پس پشت ڈال رکھا ہے - (۲/۳۲ و ۲/۴۴) - اسلئے میدان جنگ میں ثابت قدم رہنے اور اسطرح قوانین خداوندی کو عملاً غالب کرنے کو بھی ذِکْرٌ کہا گیا ہے (۸/۴۵) - اسکے معنے یہ بھی ہیں کہ زندگی کے کسی گوشہ میں ، حتّٰی کہ میدان جنگ میں بھی، قوانین خداوندی کو اپنی نگاہوں سے اوجھل نہ ہونے دو - انہیں ہمیشہ اپنے سامنے رکھو - خود قوانین خداوندی ذِکْرُ اللّٰہِ (۳۹/۲۳) ہیں - شرف اور عظمت کے معنوں میں یہ لفظ (۲۳/۷۱) میں آیا ہے - نیز (۴۳/۴۴) میں ، جہاں قرآن کریم کے متعلق کہا ہے کہ اِنَّہٗ لَذِکْرٌ لَّکَ وَ لِقَوْمِکَ کہ تمہاری اور تمہاری قوم کی عظمت اور بڑائی کا راز اسی میں پوشیدہ ہے کہ تم قرآن کریم پر عمل پیرا رہو - سورۃ قمر میں مُدَّکِرٌ آیا ہے (۵۴/۱۵) - سورۃ دھر میں جہاں آیا ہے کہ انسان پر ایک زمانہ ایسا بھی گزرا ہے لَمْ یَکُنْ شَیْئًا مَّذْکُوْرًا (۷۶/۱) - تو اسمیں مَذْکُوْرًا کے معنے ہیں ایسی چیز جو اپنی ذات سے وجود میں آ گئی ہو اور قائم ہو** - (Existing by Itself) -

سورۃ بقرہ میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے فَاذْکُرُوْنِیْ اَذْکُرْکُمْ (۲/۱۵۲) - اسکے معنے یہ ہیں کہ تم میرے قوانین کو اپنے سامنے رکھو تو میں تمہارے حقوق کی حفاظت کرونگا اور تمہیں عظمت و سطوت عطا کرونگا - تم

*تاج - **لین و تاج -

ان قوانین کا اتباع کرو تو انکے خوشگوار نتائج یقیناً تمہارے سامنے آ جائینگے۔ (یہاں، علاوہ دیگر امور کے یہ نکتہ بھی غور طلب ہے کہ ابتدا (Initiative) انسان کی طرف سے ہوتی ہے اور خدا اسکا جواب دیتا ہے ۔ جس قسم کا عمل انسان سے سرزد ہوتا ہے اسی قسم کا رد عمل خدا کی طرف سے ہوتا ہے) ۔ لہذا ذِکْرُ اللّٰہِ کے معنے قوانین خدا وندی کا اتباع ہیں (نہ کہ تسبیح کے دانوں پر اللہ اللہ گنتے رہنا) ۔ اور اس اتباع کا لازمی نتیجہ شرف و عظمت اور غیر خدائی قوتوں پر غلبہ و تسلط ہے ۔ جیسا کہ سابقہ حوالوں میں بتایا جا چکا ہے، صاحب ضرب کلیمی کا فرعون کے مقابلہ کے لئے جانا، ذکر اور تسبیح ہے ۔ (تَسْبِیْح کیلئے دیکھئے س ۔ ب ۔ ح کا عنوان) ۔ میدان جنگ میں ثابت قدم رہنا ذکر ہے ۔ اشیائے کائنات پر غور و فکر کرنا ذکر ہے ۔ اقوام سابقہ کی تاریخ سے عبرت وموعظت حاصل کرنا ذکر ہے ۔ زندگی کے ہر شعبہ میں، ایک ایک قدم پر قانون خدا وندی کو سامنے رکھنا اور اس کے مطابق فیصلے کرنا ذکر ہے ۔ ان قوانین کا عام چرچا کرنا بھی ذکر ہے ۔ اسی کو آجکل کی اصطلاح میں نشرو اشاعت کرنا کہتے ہیں ۔ یہی وہ ''ذکر اللہ'' ہے جس سے دلوں کو سچا اطمینان حاصل ہوتا ہے (۱۳/۲۸)۔ ہم نے اطمینان کے ساتھ ''سچے'' کی تخصیص اس لئے کی ہے کہ جھوٹا اطمینان انسان کو ہر طریق سے حاصل ہو سکتا ہے ۔ اگر جھوٹا اطمینان حاصل نہ ہوتا ہو تو لوگ باطل مذاہب پر جمے کسطرح رہیں؟ سچا اطمینان، علیٰ وجہ البصیرت حاصل ہوتا ہے ۔ یعنی جب کسی بات پر علم و بصیرت کی رو سے غور کرنے کے بعد، یا اس کے عملی نتائج سامنے آ جانے کے بعد، ہم اس نتیجہ پر پہنچ جائیں کہ وہ بات حق وصداقت پر مبنی ہے، تو اس سے سچا اطمینان حاصل ہو جاتا ہے جو دل اور دماغ دونوں کے لئے وجہ سکون ہوتا ہے ۔ جھوٹا اطمینان، اپنے آپ کو فریب دینے سے حاصل ہوتا ہے ۔ سچا اطمینان، جماعت مومنین کو بدر کے میدان میں حاصل ہؤا تھا جب انہیں اپنے سے تین گنا فوج پر عظیم فتح حاصل ہوئی تھی (۳/۱۲۵) ۔ یہ حجروں اور خانقاہوں میں حاصل نہیں ہوتا ۔

ذ ک و

ذَکَاءٌ ۔ کے بنیادی معنے ہیں کسی چیز کا مکمل ہو جانا ۔ خلیل نے کہا ہے کہ اَلذَّکَاءُ فِی السِّنِّ ۔ عمر کے پختہ ہو جانے کو کہتے ہیں جب انسان کی قوتیں کمال تک پہنچ جاتی ہیں ۔ اسی اعتبار سے اَلذَّکَاءُ ذہانت اور فطانت کی تیزی اور تکمیل کو کہتے ہیں ۔ ذَکِیٌّ ۔ تیز فہم ۔

بڑا ذھین - ذَکَتِ النَّارُ - آگ بھڑک اٹھی *۔ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی تیزی اور نفوذ کے ہوتے ہیں -

اَلتَّذْکِیَۃُ کے معنے جانور کو ذبح کر دینے کے ہوتے ہیں - راغب نے کہا ہے کہ اسکے معنے حرارت غریزی نکال دینے کے ہوتے ہیں* - (ذَکَتِ النَّارُ کی جہت سے) - باب تفعیل کا ایک خاصہ سلب ماخذ ہوتا ہے - یہ اسکی مثال ہے - یعنی ذَکَاءٌ کے معنی حرارت - اور ذکّی کے معنی حرارت نکال لی - سلب کر لی - اسی کو سلب ماخذ کہتے ہیں - یعنی لفظ کے مادہ کی جو خصوصیت ہو اسے سلب کر لینا - قرآن کریم میں ہے اِلَّا مَا ذَکَّیْتُمْ (۵/۳) - '' بجز اسکے جسے تم ذبح کر لو ''-

ذ ل ل

ذِلَّۃٌ - ذَلَالَۃٌ کے معنی ہیں کسی کی سختی اور منہ زوری کا ٹوٹ جانا اور اسکا مطیع و فرمانبردار ہو جانا - راغب نے اَلذُّلّ - زور و قہر کی وجہ سے جھکنے کو کہا ہے اور اَلذِّل اس جھکنے کو کہتے ہیں جس میں طبیعت کی تیزی و سختی ازخود مغلوب ہو جائے - اس نے یہ بھی لکھا ہے کہ جب ذُلّ کسی غیر کے دباؤ اور جبر سے نہ ہو تو یہ مذموم صفت نہیں رہتی - ذَلُوْلٌ - (جمع ذُلُلٌ) جو تابع فرمان ہو جائے اور منہ زور نہ رہے* - سورۃ بقرہ میں ہے اِنَّھَا بَقَرَۃٌ لَّا ذَلُوْلٌ (۲/۷۱) '' وہ سانڈ ہے جسے ہل میں نہیں جوتا گیا ''- عَیْرٌ الْمَذَلَّۃِ اس گدھے کو کہتے ہیں جس کے اوپر بوجھ لدا ہو اور پیچھے سے لاٹھی سے ہانکا جا رہا ہو** - اس سے ذِلَّت کا صحیح نقشہ سامنے آجاتا ہے -

ذُلِّلَ الْکَرْمُ تَذْلِیْلًا کے معنی ہیں انگور کے خوشے نیچے جھکا دیئے گئے* -

قرآن کریم میں تُذِلّ ، تُعِزّ کے مقابلہ میں آیا ہے (۳/۲۵) - اور وہیں ان دونوں لفظوں کا مفہوم بھی بیان کر دیا گیا ہے - یعنے عِزّت کے معنے ہیں حکومت اور مملکت مل جانا - غلبہ و اقتدار حاصل ہو جانا - اور ذِلّت کے معنے حکومت و مملکت کا چھن جانا - غلبہ و اقتدار کا کھو جانا - سورۃ یٰسٓ میں مویشیوں کے متعلق ہے فَھُمْ لَھَا مَالِکُوْنَ - وَذَلَّلْنٰھَا (۳۶/۷۲-۷۱) - انسانوں کو ان پر غلبہ و اقتدار حاصل ہے - انہیں انسانوں کا مطیع

* تاج - **محیط -

و فرمانبردار بنا دیا ہے۔ سورۃ طٰہٰ میں نَذِلَّ وَ نَخْزٰی (۲۰/۱۳۴)۔ ذلت و رسوائی کے الفاظ اکٹھے آئے ہیں۔ میدان جنگ میں کمزوری کیلئے یہ لفظ (۳/۱۲۲) میں آیا ہے۔ سورۃ مائدہ میں جماعت مومنین کی یہ صفت بتائی گئی ہے کہ اَذِلَّةٍ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ اَعِزَّةٍ عَلَى الْكَافِرِيْنَ (۵/۵۴)۔ ابن الاعرابی نے کہا ہے کہ یہاں اَذِلَّةٍ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ کے معنے رُحَمَاءُ بَيْنَهُمْ (۴۸/۲۹) ہیں۔ یعنے ایک دوسرے کے ساتھ مشفق و ہمدرد۔ اور مخالفین کے مقابلہ میں سخت۔ جَنَاحَ الذُّلِّ (۱۷/۲۴) نرمی تواضع اور مہربانی کے لئے آیا ہے۔

قرآن کریم نے ذلت و مسکنت، محکومی اور کمزوری کی زندگی کو خدا کا غضب قرار دیا ہے۔ (۲/۶۱)۔ یہ ذلت اسی دنیا کی ذلت ہے جو ہر ایک کو نظر آسکتی ہے (۷/۱۵۲)۔ اسکے برعکس کہا ہے کہ مومنین کی زندگی غلبہ و اقتدار اور قوت و سطوت کی زندگی ہے۔ وَلِلّٰهِ الْعِزَّةُ وَلِرَسُوْلِهٖ وَلِلْمُؤْمِنِيْنَ (۶۳/۸)۔ "غلبہ واقتدار اللہ اور اس کے رسولؐ اور جماعت مومنین کے لئے ہے"۔ مومنین کی زندگی اَعْلَوْنَ (۳/۱۳۸)۔ سب پر غالب رہنے کی زندگی ہے۔ حکومت اور سلطنت کی زندگی ہے (۲۴/۵۵)۔ لہذا جس زندگی میں غلبہ واقتدار اور شوکت و حشمت نہیں وہ مومنین کی زندگی نہیں۔ اس دنیا میں ذلت و خواری کی زندگی خدا کا عذاب ہے۔ وَضُرِبَتْ عَلَيْهِمُ الذِّلَّةُ وَالْمَسْكَنَةُ وَبَاءُوْ بِغَضَبٍ مِّنَ اللّٰهِ (۲/۶۱) "ان پر ذلت و مسکنت کی مار ماری گئی۔ یعنی وہ عذاب خداوندی کے مستوجب بن گئے"۔ اس دنیا کو اغیار کے حوالے کرکے، بیکسی و بے بسی، محتاجی اور محرومی کی ذلیل زندگی بسر کرنا اور یہ سمجھنا کہ اس سے انسان کو "روحانی ترقی" حاصل ہوتی ہے، وہ فریب ہے جو مستبد قوتیں کمزوروں اور محکوموں کو دیتی ہیں۔ قرآن کریم اس فریب کا پردہ چاک کرنے کے لئے آیا تھا۔ اس نے کھلے الفاظ میں کہا کہ اس دنیا میں عزت و اقتدار سرفرازی و سربلندی۔ شوکت و حشمت۔ دولت و قوت۔ حکومت و سطوت کی زندگی، ایمان و اعمال صالحہ کا فطری نتیجہ ہے۔ اور ذلت و خواری، محکومی و محتاجی کی زندگی خدا کا عذاب۔ اس کے ساتھ یہ بھی کہہ دیا کہ جو یہاں خدا کے عذاب میں مبتلا ہے وہ عاقبت میں خدا کا مقرب نہیں ہو سکتا۔ جس کا حال تاریک ہے اس کا مستقبل بھی تاریک ہوگا۔ وَمَنْ اَعْرَضَ عَنْ ذِكْرِيْ فَاِنَّ لَهٗ مَعِيْشَةً ضَنْكًا وَّنَحْشُرُهٗ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ اَعْمٰى (۲۰/۱۲۴)۔ "جو ہمارے قانون سے اعراض برتیگا تو اسکی روزی تنگ ہو جائیگی اور ہم

* تاج۔ ** محیط۔

اسے قیامت کے دن بھی اندھا اٹھائینگے''۔ یہ ایک ایسا معیار ہے جس سے ہم ہر وقت اپنے اعمال کو پرکھ سکتے ہیں۔

ذ م م

ذَمَّهٗ۔ یَذُمُّهٗ۔ ذَمًّا۔ مَذَمَّةٌ۔ مَدْحٌ کی ضد ہے۔ برائی کرنا۔ اِسْتَذَمَّ۔ اسنے قابل مذمت کام کیا۔ بِہٖ ذَمِیْمَةٌ۔ اسے کوئی ایسا عارضہ یا آفت لاحق ہے جسکی وجہ سے وہ باہر نہیں نکل سکتا*۔ مَذْمُوْمٌ (۱۸/۱۷) میں انہی معانی میں آیا ہے۔

ذِمَّةٌ۔ ہر وہ ذمہ داری۔ معاہدہ۔ قول و قرار جسکے ضائع کر دینے سے مذمت لازم آتی ہو**۔ جس عہد وغیرہ کے توڑ دینے پر انسان کی مذمت کی جاتی ہو***۔

اَلذِّمَّةُ۔ امان۔ کفالت۔ ضمانت۔ ذِمِّیٌّ۔ وہ آدمی جسے عہد حاصل ہو۔ جس کی حفاظت کی ذمہ داری لے لی گئی ہو۔ جسے ہر طرح کی ضمانت دیدی گئی ہو۔ قرآن کریم میں ہے لَا یَرْقُبُوْا فِیْکُمْ اِلًّا وَّلَا ذِمَّةً (۹/۸) ''یہ کسی حق اور حرمت۔ عہد و پیمان کا خیال نہیں کرتے''۔ (اسکی تشریح کیلئے عنوان ا ل ل دیکھئے)۔

ذ ن ب

اَلذَّنَبُ۔ دُمْ۔ ذَنَبَهٗ۔ وہ اسکے (دُم کے) پیچھے پیچھے رہا۔ مُسْتَذْنِبٌ۔ اس شخص کو کہتے ہیں جو اونٹوں کی دموں کے پیچھے پیچھے رہے۔ اَلذِّنَابُ۔ ہر چیز کا پچھلا حصہ نیز اس رسی کو کہتے ہیں جس سے اونٹ کی دم کو کجاوہ سے باندھ دیا جائے۔ اس جہت سے اس مادہ کے معنوں میں کسی چیز کے آخری حصہ کا مفہوم پایا جاتا ہے۔ ذَنَبَةُ الْوَادِیْ۔ وادی کے آخری حصہ کو کہتے ہیں۔ اور اَلذَّنَابَةُ پیچھے لگنے والے کو۔ انہی معانی کے پیش نظر راغب نے لکھا ہے کہ اَلذَّنْبُ در اصل کسی چیز کے پچھلے حصے یا دم کے پکڑنے کو کہتے ہیں۔ نیز ہر اس کام کو جس کا انجام برا ہو۔ نیز کسی کام کے نتیجہ (انجام) کو بھی ذَنْبٌ کہتے ہیں**۔ اس اعتبار سے یہ لفظ جرم اور معصیت کے معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔ فَدَمْدَمَ عَلَیْهِمْ رَبُّهُمْ بِذَنْبِهِمْ (۹۱/۱۴) میں اسکے معنے جرائم کے ہیں۔ یعنی ان کے رب نے ان کے جرائم کی وجہ سے انہیں تباہ و برباد کر دیا۔ نیز ذَنَبٌ۔ خسیس چیز اور رذیل اور کمینہ کو بھی کہتے ہیں*۔

*تاج۔ **محیط۔ ***راغب۔

چونکہ دُم ہمیشہ جانور کے پیچھے لگی رہتی ہے اسلئے ان اتہامات کو بھی ذُنُوْبٌ کہا جا سکتا ہے جو یونہی کسی کے پیچھے چپکا دئے جائیں۔ (جسطرح اَلْقِفْوَۃُ دُم کو کہتے ہیں لیکن اس کے معنی تہمت کے بھی ہیں۔ دیکھئے عنوان ق۔ ف۔ و)۔ چنانچہ سورۃ فتح میں جہاں نبی اکرمؐ کے متعلق کہا ہے لِيَغْفِرَ لَكَ اللّٰهُ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْبِكَ وَمَا تَأَخَّرَ (۴۸/۲)۔ تو اسکے معنے یہ ہیں کہ یہ فتح عظیم اسلئے دی جا رہی ہے کہ ان تمام اتہامات سے تمہاری حفاظت ہو جائے جو تمہارے مخالفین تم پر لگاتے رہے ہیں یا آئندہ لگانا چاہیں۔ مخالفین کہتے تھے کہ (معاذ اللہ) آپ اپنے دعاوی میں جھوٹے ہیں۔ دیوانے ہیں۔ کسی نے ان پر جادو کر دیا ہے۔ یونہی لوگوں کو سبز باغ دکھا کر ورغلاتے رہتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے کہا کہ یہ فتح مبین، جس سے مخالفین کی قوتیں ٹوٹ گئی ہیں، ان تمام اتہامات کا جواب ہے کہ دیکھ لو انجام کار کون سچا ثابت ہوا۔ (نیز دیکھئے عنوان ق۔ د۔ م)۔

ذَنُوْبٌ اس گھوڑے کو کہتے ہیں جسکی دُم کے بال گھنے ہوں اور وہ بالوں سے بھری ہوئی ہو۔ نیز اس بڑے ڈول کو بھی کہتے ہیں جس میں پانی بھرا ہوا ہو۔ (اگر وہ خالی ہو تو اُسے دَلْوٌ کہا جائیگا)۔ نیز ایسے دن کو بھی کہتے ہیں جس کا شر بہت طویل ہو جائے، اتنا طویل کہ ختم ہوتا نظر نہ آتا ہو۔

سورۃ ذاریات میں ہے فَاِنَّ لِلَّذِيْنَ ظَلَمُوْا ذَنُوْبًا مِّثْلَ ذَنُوْبِ اَصْحَابِهِمْ (۵۱/۵۹)۔ تاج، محیط اور راغب نے کہا ہے کہ ذَنُوْبٌ کے معنی نصیبہ یا حصہ کے ہیں۔ اس اعتبار سے آیت کے معنی یہ ہوئے کہ جو لوگ ظلم کر رہے ہیں ان کا نصیبہ بھی ویسا ہی ہوگا جیسا ان لوگوں کا نصیبہ تھا جو ان کی مثل تھے۔

بعض لوگ اپنے آپ کو، ازرہ کسر نفسی، مُذْنِب (عاصی پُر معاصی وغیرہ) کے لقب سے یاد کرتے ہیں۔ ذنب یا گناہ، حکومت خدا وندی کے جرم کو کہتے ہیں۔ جب ہم اپنے آپ کو "مجرم" کہنا پسند نہیں کرتے تو مذنب یا عاصی وغیرہ کیوں کہلوائیں؟ اگر ہم سے واقعی کوئی جرم صادر ہوگیا ہے تو اس پر ہمیں ندامت ہونی چاہئے، نہ کہ اسے اپنے لئے نشان امتیاز یا پہچانے جانے کی علامت قرار دیدیا جائے۔

ذ ہ ب

ذَهَاب* کے معنے ہیں چلا جانا - گزر جانا - ذَهَبَ بِهٖ کے معنے ہیں لے جانا - ذَهَبَ عَلَيَّ كَذَا کے معنے ہیں، میں فلاں بات کو بھول گیا - اگر ذَهَبَ کے ساتھ عَنْ آئے تو اسکے معنے چھوڑ دینے کے ہوتے ہیں - اور اگر اسکے ساتھ اِلٰی آئے تو اسکے معنے متوجہ ہو جانے کے آتے ہیں* - صاحب کشاف نے کہا ہے کہ اَذْهَبَهٗ کے معنے ہیں اسکو زائل کر دیا - دور کر دیا - لے گیا - (۳۴/۳۵) - اور ذَهَبَ بِهٖ کے معنے ہیں اسکو اپنے ساتھ لے گیا - یعنے خود بھی اسکے ساتھ چلا گیا** - لیکن قرآن کریم میں جہاں آیا ہے ذَهَبَ اللّٰهُ بِنُوْرِهِمْ (۲/۱۷) تو اسکے معنے لے جانے کے ہیں- ساتھ چلے جانے کے نہیں - اَلْمَذْهَبُ - جانا، جانے کی جگہ، راستہ، طریقہ، وہ عقیدہ جس کی طرف کسی کا رجحان ہو - نیز بیت الخلاء کو بھی کہتے ہیں جہاں قضائے حاجت کیلئے جائیں* - لیکن قرآن کریم میں مَذْهَب* کا لفظ کہیں نہیں آیا - اسلام کیلئے دِیْن* کا لفظ آیا ہے - در حقیقت مذہب کے معنے مکتب فکر (School of Thought) کے ہیں - ابتدائے اسلام میں صرف دِیْن* تھا - بعد میں جب مختلف ائمہ فکر و فقہ کی نسبتوں سے مختلف طریقے پیدا ہوئے تو دِیْن کی جگہ مَذْهَب (طریقہ) نے لے لی - چنانچہ ذَهَبَ فِي الدِّيْنِ مَذْهَبًا کے معنے ہیں اس نے دین کے بارے میں فلاں عقیدہ اختیار کیا - اور فُلَانٌ يَذْهَبُ اِلٰی قَوْلِ اَبِيْ حَنِيْفَةَ کے معنے ہیں فلاں شخص امام ابو حنیفہ کے مسلک کے مطابق چلتا ہے*** - اس سے دِیْن* (یعنے وہ ضابطۂ حیات جو خدا کی طرف سے ملا تھا) گم ہو گیا اور مختلف شخصیتوں کی طرف منسوب کردہ مَذَاهِب آگے چل پڑے - جبتک اشخاص کی طرف منسوب کردہ مَذَاهِب نہیں مٹتے دِیْن قائم نہیں ہو سکتا - "مٹنے" کے معنے یہ ہیں کہ ان چیزوں کو صرف یہ حیثیت دی جائے کہ یہ اُن حضرات کا دین کے متعلق فہم تھا - یا وہ جزئیات تھیں جنہیں انہوں نے اپنے زمانے کے تقاضوں کے مطابق متعین کیا تھا - انکی حیثیت ابدی نہیں ہے- ابدی صرف خدا کا دین ہے جو قرآن کریم کے اندر ہے - لہذا، اسلاف کے مختلف مذاہب کے نام سے جو کچھ ہمارے پاس چلا آ رہا ہے اسے قرآن کریم کی کسوٹی پر پرکھنا چاہئے- جس بات کو قرآن کریم صحیح کہے وہ صحیح سمجھی جائے - جسے وہ غلط قرار دے اُسے غلط ٹھہرایا جائے - باقی

*تاج - **محیط - ***لین -

رھیں فقہی جزئیات ، تو ان کی حیثیت دائمی ھو ھی نہیں سکتی - ھر دور کی فقہ قرآن کریم کے ابدی اصولوں کی روشنی میں اپنے زمانے کے تقاضوں کے مطابق مرتب ھوگی -

مغرب میں چونکہ عیسائیت ایک (Religion) کی حیثیت رکھتی تھی اسلئے وھاں مذھبِ اسلام کا ترجمہ (Religion of Islam) ھو گیا اور اس سے دِین کا تصور بالکل مٹ گیا ، اور اسلام بھی دیگر مذاھب عالم میں سے ایک مذھب سمجھا جانے لگا - حالانکہ اسلام، دِین* (ضابطہ حیات) کا نام تھا - مذھب (Religion) نہیں تھا -

لفظ (Religion) کے بنیادی معنوں کے متعلق علمائے لغت میں اختلاف ھے لیکن اس پر عمومی اجماع ھے کہ اسکے اصلی معنے "دیوتاؤں کی تعظیم" کے ھیں - اسکے بعد کسی مافوق الفطرت ھستی کی پرستش کے قواعد و ضوابط کے مجموعہ کا نام ریلیجن رکھا گیا اور ان ھی معنوں میں یہ لفظ بالعموم رائج ھے (دیکھئے Century Dictionary) - ظاھر ھے کہ اسلام اس معنے میں ریلیجن نہیں - یہ ایک مکمل ضابطہ حیات یا زندگی کا قانون ھے - لہذا اسلام کو ریلیجن یا مذھب نہیں کہنا چاھئے - یہ دِین* ھے -

"مذھب" درحقیقت اُس زمانے کی یادگار ھے جب ذھن انسانی اپنے عہد طفولیت میں تھا - وہ اسوقت یہ نہیں سمجھ سکتا تھا کہ کائنات میں فطرت کے جو حوادث رو نما ھوتے ھیں، وہ خدا کے مقرر کردہ قوانین کے مطابق ھوتے ھیں - وہ چونکہ ان کی علت (Cause) کو نہیں سمجھتا تھا اس لئے ان سے ڈرتا اور لرزتا تھا اور خوشامد سے انہیں راضی کرنے کے لئے ان کے سامنے جھکتا اور گڑگڑاتا تھا - ان تک اپنی درخواست پہنچانے کے لئے وسیلے تلاش کرتا تھا - سفارش کرنے والے ڈھونڈتا تھا - انسان کی اپنی تو ھم پرستیوں نے دیوی، دیوتاؤں کی تخلیق کی اور اسی سے ان کی بھگتی یا پرستش کا جذبہ پیدا ھؤا - ان میں جو لوگ ذرا زیادہ سمجھدار تھے انہوں نے عوام کی اس سادہ لوحی سے فائدہ اٹھایا اور اپنے آپ کو ان دیوتاؤں کے نمائندے یا مقرب بنا کر اپنی پرستش شروع کرا دی - اسطرح مذھبی پیشوائیت اور روحانی اقتدار کے ادارے وجود میں آ گئے - حکمران طبقہ نے ان "خدائی نمائندگان" سے گٹھ جوڑ پیدا کیا توانہوں نے انہیں "ایشورکا اوتار" - "ظل اللہ علی الارض" - اور خدائی اختیارات کا حامل قرار دیکر، عوام کو ان کے حضور جھکنا سکھایا - ان تمام تصورات کے مجموعہ کا نام "مذھب" (Religion) ھے جو انسانوں میں اب تک متوارث چلا آ رھا ھے -

مذہب کے اس باطل تصور کو مٹانے کے لئے، خدا کی طرف سے، بوساطت حضرات انبیاء کرام ؑ دین ملتا رہا ۔ اس نے انسان کو، کائنات میں، اس کے صحیح مقام سے شناسا کرایا ۔ اس نے کہا کہ کائنات کا سلسلہ خدا کے مقرر کردہ قوانین کے مطابق سرگرم عمل ہے اور انسان کو ان قوانین کا علم دے دیا گیا ہے ۔ انسان کا کام یہ ہے کہ ان قوانین کی رو سے کائنات کی قوتوں کو مسخر کرے اور انہیں نوع انسان کی نشو و نما اور بہبود و ترفع کے لئے استعمال کرے ۔ اس نے (دین نے) اپنی دعاوی کو دلائل و براہین کی رو سے پیش کیا اور علم و بصیرت کی رو سے ماننے کی دعوت دی ۔ خدا کا یہ دین، اپنی آخری اور مکمل شکل میں قرآن کریم کے اندر محفوظ ہے اور ''مذہب،، کے خلاف کھلا ہؤا چیلنج ہے ۔ دنیا میں چونکہ علم و بصیرت عام ہو رہا ہے اس لئے آہستہ آہستہ مذہب کا دور دورہ بھی ختم ہو رہا ہے ۔ اسطرح دین کے قیام کے لئے راستہ صاف ہو رہا ہے ۔ آپ نے دیکھا نہیں کہ دنیا کسطرح ملوکیت ۔ سرمایہ داری ۔ مذہبی پیشوائیت سے بیزار ہوتی چلی جا رہی ہے؟ یہی قرائن بتا رہے ہیں کہ اب وہ دور آ رہا ہے جب خدا کا دین، اپنی تابانیوں کے ساتھ عالمتاب ہوگا ۔ اب انسان سن شعور کو پہنچ رہا ہے ۔ اب اسے نہ بچپن کی توہم پرستیاں ڈرا سکتی ہیں ، نہ کاغذ کے پھول بہلا سکتے ہیں ۔ اب اس کا اطمینان زندگی کی ٹھوس حقیقتوں ہی سے ہو سکتا ہے اور وہ قرآن کریم کے علاوہ اور کہیں نہیں مل سکتیں ۔

اَلذَّھَبُ ۔ (۹/۳۴) اس سونے کو کہتے ہیں جو کان سے نکال کر صاف کر لیا گیا ہو ۔ (جو ابھی کان میں ہو اور گلا کر صاف نہ کیا گیا ہو' اسے تِبْرٌ کہتے ہیں) ۔ جس چیز پر سونے کا ملمع کیا گیا ہو یا سونے کا پترہ چڑھایا گیا ہو اسے مُذَھَّبٌ کہتے ہیں ۔ ذَھِبَ الرَّجُلُ ۔ اس وقت کہتے ہیں جب کوئی شخص ایک دم کان میں بہت سا سونا دیکھے اور اسے دیکھکر سراسیمہ و مبہوت ہو جائے ۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس مادہ کے بنیادی معنی (۱) چلے جانے اور (۲) حسن و تازگی کے ہیں ۔ سونے کو ذَھَبٌ ان دوسرے معانی کی جہت سے کہتے ہیں ۔ اَلذِّھْبَۃُ ۔ ہلکی سی بارش یا سخاوت کو کہتے ہیں* ۔

ذ ھ ل

ذَھَلَہٗ ۔ ذَھَلَ عَنْہُ ۔ کسی چیز سے ربط و ضبط رکھنے کے باوجود اسے چھوڑ دینا ۔ یا جانتے بوجھتے چھوڑ دینا ۔ یا کسی شغل میں منہمک ہو

*تاج ۔

جانے کی وجہ سے بھول جانا ۔ بعض لوگوں نے کہا ہے کہ ذُھُوْلٌ کے معنے ہیں محبوب چیز کی یاد باقی نہ رہنا اور اس کی عدم موجودگی کے باوجود دل کا خوش رہنا اور کسی قسم کی کمی محسوس نہ کرنا* ۔ صاحب محیطؒ نے اس پر یہ اضافہ کیا ہے کہ ذُھُوْلٌ کسی دہشت کی وجہ سے محبوب کو چھوڑ دینا ہے ۔ ذَھِلَ ۔ ہوش و حواس جاتے رہنا** ۔

ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی ہیں گھبراہٹ اور پریشانی وغیرہ کی وجہ سے کسی چیز سے غافل ہو جانا ۔ اسی بنا پر قرآن کریم میں انقلاب کے متعلق کہا ہے کہ یَوْمَ تَرَوْنَھَا تَذْھَلُ کُلُّ مُرْضِعَۃٍ عَمَّآ اَرْضَعَتْ وَ تَضَعُ کُلُّ ذَاتِ حَمْلٍ حَمْلَھَا (۲۲/۲) ۔ "جب تم اسے دیکھو گے اس وقت ہر دودھ پلانے والی اپنے بچہ کو چھوڑ دے گی اور ہر حمل والی اپنا حمل ڈال دیگی" ۔ یہ چیز اس انقلابی ساعت کی ہولناکی کے لئے کہی گئی ہے ۔ لیکن اگر اس سے مراد خود انقلابی دور ہو تو اس سے ہمارا زمانہ سامنے آ جاتا ہے جس میں مائیں بچوں کو دودھ نہیں پلاتیں اور کوئی لڑکی (شادی کے باوجود) حاملہ ہونا نہیں چاہتی ۔ اور ان فطری نسوانی فرائض کو چھوڑ کر انہیں کچھ افسوس نہیں ہوتا بلکہ اس سے خوش ہوتی ہیں ۔ اور مقصود اس سے یہ ہوتا ہے کہ یہ چیزیں ان کے دوسرے مشاغل میں حارج نہ ہوں ۔ ذَھَلَ میں یہ تمام معانی آ جاتے ہیں ۔ یا ویسے ہی پریشانی اور اضطراب کا وہ عالم جس میں ہم سب گرفتار رہتے ہیں اور اسطرح اپنی ضروری ذمہ داریوں تک سے غافل ہوجاتے ہیں ۔

ذ و

ذُوْ ۔ صاحب، والا (جیسے ہم، صاحب اولاد یا عقل و فکر والا، کہتے ہیں) ۔ اسکی جمع ذَوُوْنَ اور ذَوِیْنَ نیز اُولُوْ آتی ہے ۔ مونث ذَاتٌ ۔ تثنیہ ذَوَاتَانِ ۔ جمع ذَوَاتٌ ۔ قاعدے کی رو سے ذُوْ کبھی ذِیْ اور کبھی ذا ہو جاتا ہے ۔ ذُوْعُسْرَۃٍ ۔ (۲۸۰/۲) ۔ صاحب عسرت ۔ جو تنگدستی میں پڑا ہو ۔ فَذُوْ دُعَآءٍ عَرِیْضٍ (۵۱/۴۱) ۔ لمبی چوڑی دعائیں مانگنے والا ۔ ذَوِی الْقُرْبٰی (۲/۱۷۷) ۔ رشتے دار ۔ ذَاتَ الْیَمِیْنِ وَ ذَاتَ الشِّمَالِ (۱۸/۱۸) دائیں اور بائیں طرف ۔ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ ۔ (۳/۱۵۳) دلوں کے اندر کی باتیں ۔ یعنی جو کچھ دل کے اندر ہے ۔

ذَوَاتَا اَفْنَانٍ (۵۵/۴۸) ۔ مختلف علوم و فنون والے ۔

* تاج ۔ **محیط ۔

ذوالقرنین

ایران کا وہ خدا ترس بادشاہ جس نے یہودیوں کو بابل کی اسیری سے رھائی دلا کر یروشلم میں دوبارہ آباد کرایا تھا ۔ قرآن کریم نے (سورۂ کہف میں) اس کا تفصیلی ذکر کیا ہے (۱۸/۸۳-۱۰۱) (تفصیل کے لئے دیکھئے عنوان ق ۔ ر ۔ ن) ۔

ذ و د

اَلذَّوْدُ ۔ ھانکنا ۔ دفع کرنا ۔ جھڑک کر نکالدینا ۔ ھٹا دینا ۔ اَلْمِذْوَدُ ۔ وہ جگہ جہاں جانوروں کو چارہ ڈالا جاتا ہے ۔ بیل کے سینگ جس سے وہ اپنی مدافعت کرتا ہے، یعنے جس سے وہ دوسروں کو ھٹا کر دور رکھتا ہے * ۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی ھیں کسی چیز کو دوسری چیز سے الگ اور یک سو کر دینا ۔

سورۂ قصص میں ہے کہ جب حضرت موسیٰؑ مدین پہنچے تو انہوں نے دیکھا کہ ایک پیاؤ (گھاٹ) پر دوسرے لوگوں کے جانور (بعد میں آ کر) پانی پیتے چلے جاتے ھیں لیکن دو لڑکیاں ھیں جو اپنے جانوروں کو روکے کھڑی ھیں (تَذُوْدَانِ ۲۸/۲۳) کہ وہ کہیں آگے بڑھ کر پانی تک نہ پہنچ جائیں ۔ اس نقشے کو پھر سامنے لائیے کہ پیاسے جانور پانی کی طرف بڑھنا چاھیں اور ان کا چرواھا انہیں اُدھر جانے سے روکے ۔ اسے اَلذَّوْدُ سے تعبیر کیا گیا ہے ۔ حضرت موسیٰؑ کو اس پر تعجب ھوا کہ وہ لڑکیاں اپنے جانوروں کو پانی کی طرف آنے سے روک کیوں رھی ھیں ۔ انہوں نے ان سے پوچھا تو لڑکیوں نے کہا کہ لَا نَسْقِیْ حَتّٰی یُصْدِرَ الرِّعَاءُ (۲۸/۲۳) ۔ ھم اپنے جانوروں کو اس وقت تک پانی نہیں پلا سکتیں جب تک یہ (طاقتور چرواھے) اپنے اپنے جانوروں کو اچھی طرح پانی پلا کر واپس نہ لے جائیں ۔ اسکے ساتھ ھی اسکی وجہ بھی بتائی کہ وَاَبُوْنَا شَیْخٌ کَبِیْرٌ (۲۸/۲۳) (ھم لڑکیاں ھونے کی وجہ سے کمزور ھیں) اور ھمارا باپ بہت بوڑھا ہے ۔ اسلئے ھم کب جرأت کر سکتی ھیں کہ ھمارے جانور پہلے پانی پی لیں ۔

غور کیجئے ۔ قرآن کریم نے ایک کہانی کے دو ٹکڑوں میں نوع انسانی کی پوری داستان کس حسن و خوبی سے بیان کر کے رکھدی ہے ۔ دنیا میں یہی ھوتا چلا آیا ہے اور یہی ھو رہا ہے کہ طاقتور کا جانور پہلے پانی پیتا ہے اور اس سے اگر کچھ بچ جائے تو غریب کے جانور کی باری

* تاج ۔ محیط ۔ راغب ۔

آتی ہے ۔ اسمیں استثناء ہے تو اُنھی کی جو آسمانی انقلاب کا پیغام لیکر آتے ہیں ۔ ان کا کام یہ ہوتا ہے کہ وہ کمزوروں کے جانوروں کو انکی باری پر پانی پلانے کا انتظام کریں ۔ چنانچہ حضرت موسیٰؑ نے ۔ فَسَقٰى لَهُمَا (۲۸/۲۴) (بلا مزد و معاوضہ) ان کے جانوروں کو پانی پلا دیا ۔ پیغمبر بھی کچھ کرنے کے لئے آتے تھے ۔ اور ان کا لایا ہوا نظام دنیا میں بھی کچھ کریگا ۔ یعنی رزق کے جن سرچشموں پر ارباب اقتدار اپنا قبضہ جمائے ہوں انہیں نوع انسانی کے مفاد عامہ کے لئے آزاد کرا دینا تاکہ ہر فرزند آدم کی ضروریات یکساں طور پر پوری ہوتی رہیں ۔ اگرچہ حضرت موسیٰؑ اسوقت ابھی منصب نبوت پر سرفراز نہیں ہوئے تھے لیکن طبیعت کا رجحان ایسی ہی باتوں کی طرف تھا ۔

ذ و ق

ذَاقَ ۔ چکھنا ۔ مزہ معلوم کرنا* ۔ راغب نے لکھا ہے کہ یہ در اصل تھوڑی سی چیز کھانے کے لئے بولا جاتا ہے ۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے معنی کسی چیز کو کھا کر اسکی اندرونی حالت کو معلوم کرنا ہیں ۔ یہ اسکے اصلی معنے ہیں ۔ پھر اسکا اطلاق ہر تجربہ پر ہونے لگا** ۔ یعنے کسی چیز کا تجربہ ہو جانا ۔ فَلَمَّا ذَاقَا الشَّجَرَةَ (۷/۲۲) ۔ جب انہیں "شجرہ" کا تجربہ ہو گیا ۔

ذَائِقٌ ۔ چکھنے والا ۔ جو تجربہ حاصل کرے (۳/۱۸۴) ۔ (مؤنث ذَائِقَةٌ) ۔

اَذَاقَ ۔ مزہ چکھانا ۔ تجربہ حاصل کرانا (۱۶/۱۱۲) ۔ قرآن کریم میں یہ لفظ بالعموم عذاب کے ساتھ آیا ہے (اگرچہ بعض مقامات پر رَحْمَةٌ کے ساتھ بھی آیا ہے) ۔ اسکے معنے یہ ہیں کہ انسان اپنے اعمال کے نتائج کو اسطرح محسوس کرے گویا اس نے ان کا مزہ چکھ لیا ہے ۔ اسے اسکا عملی تجربہ ہو جائے کہ فلاں کام کا نتیجہ کیا ہوتا ہے ۔

ذ ی ع

ذَاعَ ۔ يَذِيعُ ۔ پھیل جانا ۔ ظاہر ہو جانا ۔ عام ہو جانا ۔ اَذَاعَ سِرَّهٗ ۔ اسنے اسکے راز کو افشا کر دیا ۔ ظاہر کر دیا ۔ اور لوگوں میں مشہور کر دیا ۔ زجاج نے کہا ہے کہ اسکے معنے لوگوں میں پکار کر کہدینا اور اعلان کر دینا ہیں*** ۔ (۴/۸۳) میں یہ لفظ انہی معانی میں آیا ہے جہاں کہا ہے کہ وَ اِذَا جَآءَهُمْ اَمْرٌ مِّنَ الْاَمْنِ اَوِ الْخَوْفِ اَذَاعُوْا بِهٖ ۔ "جب ان تک کوئی امن یا خوف کی بات پہنچتی ہے تو یہ اسے خوب پھیلاتے اور اڑاتے ہیں" ۔

---

*تاج ۔ **محیط ۔ ***تاج و محیط ۔

ر

رأس

اَلرَّاْسُ۔ (جمع رُءُوْسٌ) سر۔ ہر چیز کا اعلیٰ حصہ۔ سردار قوم۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی اکٹھا ہونے اور بلند ہونے کے ہیں۔ رَئِیْسٌ۔ سردار قوم۔ رَاْسُ الْمَالِ۔ اصل مال۔ اَلرَّائِسُ۔ والی۔ حاکم۔ اَلْمَرْؤُوْسُ۔ رعیت*۔

قرآن کریم میں مناسکِ حج کے ضمن میں ہے۔ وَلَا تَحْلِقُوْا رُءُوْسَکُمْ (۲/۱۹۶)۔ اپنے سروں کو نہ منڈاؤ۔ دیکھئے (عنوان ح۔ ل۔ ق)۔

اصلی سرمایہ کیلئے رُءُوْسُ اَمْوَالِکُمْ آیا ہے (۲/۲۷۹)۔ یعنی "سرمایہ"، (تفصیل ر۔ ب۔ و کے عنوان میں دیکھئے)۔

رأف

اَلرَّاْفَۃُ۔ رحمت اور رافت مرادف المعنی الفاظ ہیں۔ صاحب محیط نے لکھا ہے کہ رَاْفَۃٌ تو یہ ہے کہ تم سے ان امور کو دفع کر دیا جائے جو ضرر رساں ہوں اور رَحْمَۃٌ یہ ہے کہ تمہیں ایسے امور بہم پہنچائے جائیں جو راحت رساں ہوں**۔ اسکی تائید صاحب المنار نے کی ہے جس میں لکھا ہے کہ رَاْفَۃٌ کا نتیجہ دفع بلا ہے اور رَحْمَۃٌ سے مراد خوشحالیوں کا زیادہ عطا کرنا ہے***۔ لہذا رَءُوْفٌ اور رَحِیْمٌ سلبی (Negative) اور ایجابی (Positive) دونوں پہلوؤں کو محیط ہو جاتے ہیں۔ ان اسباب و عناصر کا دفع کرنا جو کسی کی نشو و نما کے راستہ میں حائل ہوں اور اسکے ساتھ ہی اس ساز و سامان کا بہم پہنچانا جس سے اسکی نشو و نما ہوتی جائے۔

---

*تاج۔ **محیط۔ ***المنار جلد۲۔ صفحہ ۱۲۲۔

خدا کی رَاْفَت و رَحْمَت کسطرح ملتی ہے، اسکے متعلق سورۃ بقرہ میں کہدیا کہ وَمَا کَانَ اللّٰہُ لِیُضِیْعَ اِیْمَانَکُمْ ۔ اِنَّ اللّٰہَ بِالنَّاسِ لَرَءُوْفٌ رَّحِیْمٌ (۲/۱۴۳) ۔ اللہ کبھی ایسا نہیں کرتا کہ وہ کسی کے ایمان کو یونہی بلا حفاظت، چھوڑ دے اور وہ بلا نتیجہ رہ جائے ۔ وہ تو رَءُوْفٌ رَّحِیْمٌ ہے ۔ یعنی وہ کرتا یہ ہے کہ انسان کے ایمان کے نتیجہ خیز ہونے کی راہ میں جسقدر موانع آئیں انہیں راستہ سے ہٹائے اور ایمان کے مثبت نتائج پیدا کرتا جائے ۔ لہذا اسکی رَاْفَت اور رَحْمَت ، اِیْمَان کا نتیجہ ہوتی ہے ۔ یہی انسانیت کی صحیح نشو و نما کا ذریعہ ہے ۔ ایمان کے معنے ہیں قانون خدا وندی کی صداقت پر یقین اور اعتماد رکھنا اور اسکی اطاعت کو اپنی زندگی کا نصب العین بنا لینا ۔

چونکہ عام طور پر انسانوں کی تکلیف رفع کرنے کا جذبہ محرکہ، رقتِ قلب (دل کی نرمی) ہوتا ہے اسلئے رَاْفَۃٌ کے معنے نرمی کے بھی آتے ہیں ۔ مثلاً سورۃ نور میں زانی اور زانیہ کی سزا کے سلسلہ میں کہا ہے وَلَا تَاْخُذْکُمْ بِهِمَا رَاْفَۃٌ فِیْ دِیْنِ اللّٰہِ (۲۴/۲) ۔ "قانونِ خدا وندی کے نفاذ میں نرمی سے کام مت لو"، ۔ ایسا نہو کہ اس خیال سے کہ یہ سزا اُنہیں تکلیف پہنچائیگی تم مجرمین کو جرم کی سزا ہی نہ دو یا اس میں نرمی برتو ۔ اسلئے کہ اگر ظالمین اور مجرمین کو سزا نہ دی جائے تو مظلوموں کی داد رسی کیسے ہو ۔ عیسائیت نے خدا ترسی کا بھی غلط مفہوم اپنے سامنے رکھا جسکی وجہ سے ظالموں کی رسیاں دراز ہوتی گئیں اور رفتہ رفتہ مذہب کو کلیساؤں اور خانقاہوں کے اندر محبوس ہونا پڑا اور سیاست بے مہار ہو گئی ۔ قرآن کریم نے اسی لئے رہبانیت کے متعلق کہا ہے کہ یہ انکا خود تراشیدہ مسلک تھا اور جذبات رافت و رحمت کی غلط تعبیر کا پیدا کردہ (۵۷/۲۷) ۔ اسلام عدل قائم کرنا سکھاتا ہے جسکے لئے زیادتی کرنے والوں کی قوتوں کو توڑنا پڑتا ہے ۔ لہذا اسمیں رَاْفَت کے ساتھ غِلْظَت (نرمی کے ساتھ سختی) کی بھی ضرورت ہوتی ہے ۔ (دیکھئے عنوان غ ـ ل ـ ظ) ۔

ر أ ی

رُؤْیَۃٌ ۔ کسی مرئی چیز کا ادراک کر لینا ۔ یہ لفظ آنکھوں سے دیکھنے یا عقل و بصیرت سے معلوم کرنے یا خواب و خیال میں دیکھنے اور تصور کرنے سب کے لئے آتا ہے ۔ جوہری نے کہا ہے کہ جب اس کے ساتھ صرف ایک مفعول آئے تو اس کے معنے آنکھ سے دیکھنا ہوتے ہیں اور جب دو مفعول

آئیں تو اس کے معنے جاننے یا علم حاصل کرنے کے ہوتے ہیں ۔ راغب نے کہا ہے کہ جب اسکے بعد دو مفعول آئیں تو اس میں علم کے معنے ہوتے ہیں اور جب اس کے بعد اِلٰی آئے تو اسکے معنے ہوتے ہیں اس طرح دیکھنا (یا غور و فکر کرنا) کہ اس کے بعد انسان کو عبرت و موعظت حاصل ہو*۔ صاحب محیط نے کہا ہے کہ رَاٰی رُؤْیَۃً ۔ آنکھ سے دیکھنے کو ۔ رُؤْیَا خواب دیکھنے کو ، اور رَاْیًا دل سے دیکھنے اور غور کرنے کو کہتے ہیں**۔ اَلْمَرْاٰی والمَرْآۃُ ۔ منظر ۔ اَلْمِرْآۃُ ۔ آئینہ ۔ اَلرُّؤْیَا ۔ خواب ۔ اَلرَّاْیُ ۔ رائے۔ خیال ۔ جب کوئی بات یقینی نہ ہو ، ظنی ہو تو اس کے دو متناقض پہلوؤں میں سے کسی ایک پہلو کو اختیار کرلینا رائے کہلاتا ہے* ۔ اَرَاَیْتَکَ ۔ (۱۰۷/۱) عرب اس معنے میں بولتے ہیں جس معنے میں ہم کہتے ہیں "بتاؤ تو سہی" ۔ "ذرا خبر تو دو"۔ اور اَلَمْ تَرَ اِلٰی . . . . . (۱۰۵/۱) تعجب کے موقعہ پر بولتے ہیں "تم نے دیکھا نہیں"! یعنے تمہیں اس بات پر تعجب نہیں آتا؟* لیکن ایسے موقعوں پر اس میں عبرت خیز نظر ڈالنے کی دعوت بھی ہوتی ہے ۔ سورۃ آل عمران میں یَرَوْنَہُمْ رَاْیَ الْعَیْنِ ۔ (۳/۱۲) ۔ تاکید اور وضاحت کے لئے آیا ہے ۔ جیسے ہم لوگ "آنکھوں دیکھی" وغیرہ بولتے ہیں ۔ اور سورۃ مریم میں رِءْیًا (۱۹/۷۴) منظر یا ظاہری حالت کے معنوں میں آیا ہے ۔ رِئَاءَ النَّاسِ (۲/۲۶۴) لوگوں کے دکھانے کے لئے ۔ یُرَاءُوْنَ النَّاسَ (۴/۱۴۲) لوگوں کو دکھاتے ہیں ۔ ھُمْ یُرَاءُوْنَ (۱۰۷/۶) وہ لوگوں کو دکھاتے ہیں (کہ وہ نمازی ہیں) لیکن صلٰوۃ کی حقیقت کو فراموش کر چھوڑتے ہیں ۔ یعنی رزق کے جن سرچشموں کو آب رواں کی طرح کھلا رہنا چاہئے انہیں بند لگا کر روکے رکھتے ہیں (۱۰۷/۷)۔ سورۃ مومن میں ہے مَا اُرِیْکُمْ اِلَّا مَا اَرٰی (۴۰/۲۹) "میں تمہیں وہی کچھ بتاتا ہوں جو میں سمجھتا ہوں"۔

سورۃ شعراء میں ہے فَلَمَّا تَرَآءَ الْجَمْعٰنِ ۔ (۲۶/۶۱) "جب دونوں جماعتوں نے ایک دوسرے کو دیکھا" ۔ بَادِیَ الرَّاْیِ (۱۱/۲۷) کے لئے دیکھئے عنوان (ب ۔ د ۔ و)

ر ب ب

رَبٌّ کے معنی نشو و نما دینا ہیں ۔ یعنے کسی چیز کو نئی نئی تبدیلیوں سے اسلئے گزارنا کہ وہ بتدریج نشوونما پاتی ہوئی اپنی تکمیل تک پہنچ جائے***۔ جسطرح فطرت ، قطرۂ نیساں کو موتی بنانے کے لئے نئی نئی تبدیلیوں

---

* تاج ۔ ** محیط ۔ ***راغب ۔

سے گزارتی اور رفتہ رفتہ اسکی نشوونما کئے جاتی ہے*۔ یہ طریق نشوونما ربوبیت کہلاتا ہے۔ کہتے ہیں رَبَّ وَلَدَہٗ رَبًّا ورَبَّبَہٗ وتَرَبَّبَہٗ۔ اس نے بچے کی پرورش و تربیت کی۔ نگرانی کی تاآنکہ وہ بالغ ہوگیا۔ حضرت حسان بن ثابت رضؓ کا شعر ہے۔

مِنْ دُرَّۃٍ بَیْضَاءَ صَافِیَۃٍ
مِمَّا تَرَبَّبَ حَائِرَ الْبَحْرِ

یعنی (ممدوح) اس صاف اور سفید موتی سے (بھی زیادہ خوبصورت ہے) جس نے سمندر کی گہرائیوں میں پرورش پائی۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی ہیں (۱) کسی چیز کی دیکھ بھال کرنا اور اسے سنوارنا۔ اسی سے الرَّبُّ۔ مالک، خالق، کسی چیز کی نگرانی اور اصلاح کرنے والے کو کہتے ہیں (۲) کسی چیز کا جمے رہنا اور ایک جگہ قائم رہنا۔ چنانچہ کہتے ہیں اَرَبَّتِ السَّحَابَۃُ بِہٰذِہِ الْبَلْدَۃِ۔ بدلی برابر اس شہر پر ٹھہری یا برستی رہی۔ اور (۳) کسی شے کو دوسری شے کے ساتھ ملا دینا۔ لہذا تسلسل کے ساتھ نشوونما دیتے چلے جانا اور درست کرتے رہنا ربوبیت ہے۔ مجازاً بچہ کو تھپک کر سلا دینے کے لئے رَبَّتِ الْمَرْأَۃُ صَبِیَّھَا کہتے ہیں*۔ کیونکہ نیند اور آرام و سکون کا وقفہ بچہ کی نشوونما سے براہ راست تعلق رکھتا ہے۔

کسی معاملہ کی اصلاح اور درستگی اور اسکے استحکام کے لئے بھی رَبَّ یَرُبُّ رَبًّا کہا جاتا ہے*۔ اور کسی چیز کو جمع کرنے اور بڑھاتے چلے جانے کو بھی*۔ چنانچہ رِبَابَۃٌ اس تھیلہ کو کہتے ہیں جس میں بہت سے تیروں کو اکٹھا رکھا جائے۔ اور رَبَّ الدُّھْنَ کے معنی ہیں، اس نے تیل کی اصلاح کرکے اسے خوشبودار بنایا**۔

چونکہ نشو و نما کا لازمی نتیجہ شگفتگی اور شادابی ہے اس لئے اَلرِّبَّۃُ اُن پودوں کو کہتے ہیں جو گرمیوں میں بھی مرجھاتے نہیں بلکہ ان کی سرسبزی و تازگی، سردی اور گرمی دونوں میں یکساں رہتی ہے*۔ اور اَلْمَرَبُّ اُس زمین کو کہتے ہیں جہاں درخت اور پودے بکثرت پائے جائیں اور جہاں ہمیشہ سرسبزی و شادابی رہے*۔ اسی طرح اَلرِّبَّۃُ کے معنے ہیں بہت سے گھنے درخت۔ بہت بڑی جماعت (جو دس ہزار یا اس سے لگ بھگ ہو)۔ یا سامان عیش کی کثرت و فراوانی*۔ ابن قتیبہ نے لکھا ہے کہ جماعت کو رِبِّیٌّ کہا جاتا ہے گویا یہ رِبَّۃٌ کی طرف منسوب ہوتی ہے۔ اسکی جمع

* تاج۔ ** محیط۔

رِبِّیُّوْنَ آتی ھے* ۔ (دیکھئے ۳/۱۴۵) ۔ اَلرِّبَابَۃُ ۔ تہ بر تہ بادل کے ٹکڑے کو کہتے ھیں**۔ اور اَلرَّبَبُ ۔ شیریں پانی جو کثرت سے ایک جگہ جمع ھوگیا ھو**۔ اَلرَّبِیْبَۃُ کے معنی عہد و میثاق اور مملکت کے بھی ھیں***۔ کیونکہ اس سے ایک قوم دوسری قوم کے ساتھ مل جاتی ھے ۔ (ابن فارس) ۔ اَلرَّبِیْبَۃُ ۔ اس کی جمع رَبَائِبُ ہے (۴/۲۳) میں یہ لفظ ان لڑکیوں کے لئے استعمال ہوا ہے جو بیویوں کے ساتھ (جہیز میں) آجائیں اور ان کے پہلے شوہروں سے ہوں ۔ نیز وہ بکری جسے چراگاہ میں نہ بھیجا جائے بلکہ گھریلو چارہ پر پرورش کیا جائے تاکہ جس وقت ضرورت ھو اسکا دودھ دوہ لیا جاسکے**۔

مندرجہ بالا تصریحات کے پیش نظر رَبٌّ کے معنی واضح ھو جاتے ھیں ۔ یعنی نشوونما دینے والا ۔ پایۂ تکمیل تک پہنچانے والا ۔ انتظام کرنے والا ۔ اصلاح کرنے والا ۔ اسلئے قوم کے مدبر اور منتظم سردار کو رَبُّ الْقَوْمِ کہا جاتا ھے ۔ اور گھر کے مالک کو رَبُّ الْبَیْتِ **۔ رَبَّ الْقَوْمَ کے معنی ھیں اس نے قوم کی سیاست کو اپنے ھاتھ میں لے لیا اور ان پر سیادت کی**۔ رَبٌّ کی جمع اَرْبَابٌ آتی ہے (۱۲/۳۹) ۔

بڑے بھائی کو بھی رَبٌّ کہا جاتا ھے****۔ اس اعتبار سے جہاں بنی اسرائیل نے حضرت موسیٰؑ سے کہا تھا کہ (فَاذْھَبْ اَنْتَ وَرَبُّکَ فَقَاتِلَآ ... ۵/۲۴) ۔ تو اسکے معنی یہ ھوں گے کہ تو اور تیرا بڑا بھائی (ھارونؑ) دونوں جاؤ اور دشمن سے جنگ کرو ۔ یہ بھی ھوسکتا ھے کہ انہوں نے حضرت موسیٰؑ سے طنزاً کہا ھو کہ تو اور تیرا رب دونوں جا کر دشمن سے جنگ کرو ۔ اَلرَّبَّانِیُّ ۔ جس کی نسبت رب کی طرف ھو ۔ یا وہ معلم جو لوگوں کو بڑے بڑے علوم سے پہلے چھوٹے چھوٹے علوم کی غذا دیکر انکی ذھنی نشوونما کرے ۔ ھر صاحب علم کو بھی رَبَّانِیٌّ کہا جاتا ھے ۔ اور راسخ فی العلم کو بھی**۔ انھی معنوں میں رِبِّیٌّ بھی استعمال ھوتا ھے ۔

قرآن کریم کی ابتدا اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ (۱/۱) سے ھوتی ھے ۔ یعنی کائنات کا ھر حسین گوشہ خدا کی صفت ربوبیت کا پیکر حمد و ستائش ھے ۔ کائنات میں ھر شے اپنے منہ سے کہہ رھی ھے کہ یہاں ایک عظیم الشان پروگرام کارفرما ھے جس میں ایک ادنیٰ سا بیج اپنی نشوونما کے مختلف مراحل طے کرتا ھوا اپنے نقطۂ تکمیل تک پہنچ جاتا ھے ۔ اسی کو خدا کا نظام ربوبیت کہتے ھیں ۔ اللہ تعالےٰ اسی لئے قابل حمد و ستائش ھے کہ وہ ھر شے کو ربوبیت عطا کرتا ھے ۔ قرآن کریم کہتا ھے کہ جسطرح

* القرطبین جلد ۱ صفحہ ۱۰۶ ۔ ** تاج ۔ *** محیط ۔ **** منتھی الارب ۔

خدا کا یہ نظام ربوبیت خارجی کائنات میں از خود کارفرما ہے اسی طرح انسانوں کو چاہئے کہ وہ اپنی داخلی اور معاشری دنیا میں اسی نظام ربوبیت کو نافذ کریں ۔ اس کا طریق یہ ہے کہ رزق کے تمام سر چشمے تمام افراد کی پرورش کے لئے عام ہو جائیں اور ہر فرد اپنی اپنی استعداد اور صلاحیت کو دوسرے افراد کی نشوونما کے لئے وقف کر دے ۔ اس طرح تمام نوع انسانی کی مضمر صلاحیتیں نشوونما پاتی ہوئی اپنے نقطۂ تکمیل تک پہنچ جائینگی ۔ جو لوگ اس نظام کو قائم کر دیں گے وہ رَبّانِیّوْنَ کہلائینگے (۳/۷۸) ۔ اور اس نظام کا قیام قرآن کریم کی تعلیم کو عام کرنے اور اس پر عمل پیرا ہونے سے ہوگا ۔ یہی قرآن کریم کی ساری تعلیم کا مقصود و منتہیٰ ہے ۔ یعنی دنیا میں نظام ربوبیت کا قیام ۔ اسی کے لئے وہ معاشرہ وجود میں آتا ہے جسے اسلامی مملکت کہا جاتا ہے ۔ قرآن کریم کی رو سے مملکت مقصود بالذات نہیں ہوتی ۔ وہ ذریعہ ہوتی ہے افراد انسانیہ کی ربوبیت کا ۔ چونکہ ربوبیت میں انسان کی طبعی (جسمانی) زندگی کی پرورش بھی شامل ہوتی ہے اور اس کی ذات کی نشوونما بھی ، اس لئے اسلامی مملکت کا فریضہ یہ ہے کہ وہ تمام افراد کی بنیادی ضروریات زندگی بہم پہنچائے اور ایسے وسائل و ذرائع ، ہر ایک کے لئے یکساں طور پر، مہیا کرے جن سے ان کی ذات کی صلاحیتوں کی نشوونما ہوتی جائے ۔ جب انسانی ذات کی اسطرح نشوونما ہو جائے تو موت سے بھی اس کا کچھ نہیں بگڑتا ۔ وہ زندگی کی مزید ارتقائی منازل طے کرنے کے بعد آگے بڑھ جاتی ہے ۔ اسے حیات آخرت کہتے ہیں ۔ خدا کی ربوبیت کا سلسلہ وہاں بھی جاری رہتا ہے ۔

"ربوبیت عالمینی" ۔ بس یہ ہے اسلامی معاشرہ کا مقصود و منتہٰی ۔ یعنی تمام نوع انسانی کی ربوبیت بلا لحاظ نسل و رنگ اور بلا امتیاز خون و وطن ۔ جب تک خدا کی یہ صفت ، افراد ۔ اور ان کے مجموعہ معاشرہ، میں منعکس نہیں ہوتی ، ان کی زندگی اسلامی نہیں کہلا سکتی ۔ یہ قرآن کریم کی پہلی آیت اور اس کی تعلیم کا نقطۂ آغاز ہے ۔ جس کے اندر یہ صفت خداوندی منعکس ہوتی ہے ، وہ پوری محنت سے کماتا ہے اور اپنی ضروریات سے زائد سب کچھ ، دوسروں کی نشوونما کے لئے دیدیتا ہے ۔ اسی لئے اس معاشرہ میں ، نہ جائدادیں کھڑی کرنے کا تصور پیدا ہو سکتا ہے ، نہ دولت اکٹھی کرنے کا خیال ۔ نہ رزق کے سرچشموں پر انفرادی ملکیت کا سوال پیدا ہوتا ہے ، نہ دوسروں کی محنت کو غصب کر لینے کا خیال ۔ قرآن کریم کا مقصود اسی قسم کے معاشرہ کی تشکیل اور قیام ہے

اور یہی معاشرہ ہے جو دنیا کو محسوس طریق پر دکھا سکتا ہے کہ خدا کا تجویز کردہ نظام کسقدر در خور حمد و ستائش ہے ۔ یہ عملی تفسیر ہے ۔ الحمد للّٰہ رب العالمین کی ۔

رُبَّ (حرف)

رُبَّ ۔ رُبَ ۔ رُبَّمَا ۔ رُبَمَا ۔ یہ ان معنوں میں استعمال ہوتا ہے جن میں ہم اپنے ہاں ''اکثر و بیشتر'' کا لفظ بولتے ہیں ۔ ''اکثر ایسا ہوتا ہے'' ۔ ''عام طور پر کہا جاتا ہے'' ۔ ''عموماً حالت یہ ہوتی ہے'' ۔ وغیرہ ۔ نیز یہ تاکید اور شدت کو ظاہر کرنے کے لئے بھی بولا جاتا ہے ۔ جیسے ہم کہتے ہیں، وہ بہتیرا چاہتے رہے ۔ انہوں نے اس کے لئے کتنی ہی بار کوشش کی ۔ وغیرہ ۔ رُبَمَا یَوَدُّ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا لَوْ کَانُوْا مُسْلِمِیْنَ (۱۵/۲) ۔ انکار کرنے والے بہتیرا چاہینگے کہ اے کاش وہ بھی مسلمان ہوتے ۔ یا انکار کرنے والوں کی اکثر یہ آرزو ہوتی ہے کہ وہ بھی مسلمان ہوتے ۔ یا یہ لوگ ہمیشہ اس حسرت میں رہیں گے کہ وہ بھی مسلمان ہوتے ۔ اس کے بر عکس یہ حرف ان معنوں میں بھی استعمال ہوتا ہے جن معنوں میں ہم کہتے ہیں ''کبھی کبھی'' ۔ قرآن کریم میں سیاق و سباق سے اس کا فیصلہ کیا جا سکتا ہے کہ یہ حرف کن معنوں میں استعمال ہؤا ہے ۔

ر ب ح

رِبْحٌ ۔ تجارت میں چیزوں کے تبادلے سے جو نفع حاصل ہوتا ہے اسے رِبْح* کہتے ہیں* ۔ ابن فارس نے بھی اس مادہ کے بنیادی معنی تجارت میں زیادتی، اضافہ اور کامیابی بتائے ہیں ۔ رِبْحٌ و رَبَاحٌ ۔ تجارت میں اضافہ و ترقی کو کہتے ہیں** ۔ اَرْبَحَ النَّاقَةَ ۔ اسوقت کہتے ہیں جب کوئی شخص صبح کے وقت بھی اونٹنی کا دودھ دوہے اور پھر دوپہر کے وقت بھی ۔ لیکن تَرَبَّحَ الرَّجُلُ کے معنے ہیں آدمی حیران رہ گیا*** ۔

قرآن کریم میں آیا ہے فَمَا رَبِحَتْ تِجَارَتُهُمْ (۲/۱۶) ۔ ''ان کی تجارت نے انہیں کوئی نفع نہ دیا'' ۔

ر ب ص

تَرَبُّصَ ۔ انتظار کرنا ۔ کسی پر خیر یا شر واقع ہونے کا انتظار کرنا** ۔ یا سودے وغیرہ کے سستا یا مہنگا ہونے کا انتظار کرنا یا کسی بات کے واقع ہونے یا زائل ہونے کا انتظار کرنا* ۔

---

*راغب ۔ **تاج ۔ ***تاج و محیط ۔

سورۃ بقرہ میں یہ لفظ ایلاء کے سلسلہ میں انتظار کیلئے آیا ہے - لِلَّذِیْنَ یُؤْلُوْنَ مِنْ نِّسَاءِ هِمْ تَرَبُّصُ اَرْبَعَةِ اَشْهُرٍ . . . (۲/۲۲۶) ''جو لوگ اپنی عورتوں کے پاس نہ جانے کی قسم کھا لیں ان کے لئے چار ماہ کی مدت تک انتظار ہے،،۔ یعنی وہ عورتوں کو اس حالت میں غیر معین عرصہ تک نہیں چھوڑ سکتے - انہیں چار ماہ کے اندر قطعی فیصلہ کرنا ہوگا کہ انہیں نکاح میں رکھنا ہے یا آزاد کر دینا ہے - مُتَرَبِّصٌ* - انتظار کرنے والا (۲۰/۱۳۵) -

ر ب ط

رَبَطَهٗ - اسے باندھ دیا - اَلرِّبَاطُ - وہ چیز جس سے کسی چیز کو باندھا جائے - اَلرَّابِطَةُ - تعلق - بندھن- ابن فارس نے اس مادے کے بنیادی معنی پختگی سے باندھنا اور جمے رہنا دئے ھیں - اَلرِّبَاطُ - کسی کام کو مسلسل کرتے رہنا - دشمن کی سرحدوں پر مسلسل پہرہ دیتے رہنا - رِبَاطُ الْخَیْلِ - سرحد پر حفاظت کیلئے فوج کے اڈے بنانا* - (۸/۶۰)-

سورۃ آل عمران میں ہے اِصْبِرُوْا وَ صَابِرُوْا وَ رَابِطُوْا (۳/۱۹۹) - اس میں رَابِطُوْا کے معنی اپنی حفاظت کا مستحکم انتظام کرنا ، اور ایک دوسرے سے جڑ کر رہنا یا مسلسل مقصد کے لئے سر گرم عمل رہنا ھیں -

رَبَطَ اللّٰهُ عَلٰی قَلْبِهٖ - خدا نے اسے صبر و ضبط کی توفیق دی اور اسکے دل کو مضبوط کر دیا *- سورۃ انفال میں ہے وَلِیَرْبِطَ عَلٰی قُلُوْبِكُمْ وَ یُثَبِّتَ بِهِ الْاَقْدَامَ (۸/۱۱) - ''تا کہ وہ تمہارے دلوں کو تقویت دے اور اس کے ذریعے تمہارے قدموں میں ثبات عطا کر دے،، -

اِرْتِبَاطٌ - ایک دوسرے کے ساتھ بندھ جانا - تعلق *-

ر ب ع

اَرْبَعَةٌ - چار کا عدد (مذکر کیلئے) (۲/۲۶۰) اور اَرْبَعٌ مؤنث کیلئے (۴/۳) - اَرْبَعُوْنَ و اَرْبَعِیْنَ - چالیس - (۲/۵۱) اَلرُّبُعُ اور اَلرُّبُعُ ایک چوتھائی* (۴/۱۲) رُبَاعَ - چارچار - (۴/۳)- رَابِعٌ - چوتھا (۱۸/۲۲) - ابن فارس نے کہا ہے کہ (''چار کے عدد،، کے علاوہ) اس کے بنیادی معنی کسی چیز پر قائم رہنا اور اسے اوپر اٹھانا بھی ھیں -

*تاج -

ر ب و

رَبَا - يَرْبُوْ - زیادہ ہونا - بڑھنا - پھولنا* - لِيَرْبُوَا فِی اَمْوَالِ النَّاسِ (۳۰/۳۹) - "تا کہ لوگوں کے اموال میں بڑھوتی ہو" - سبزی کا بڑھنا اور پھولنا (۲۲/۵) - رَبَا السَّوِیْقُ - اس نے ستو میں پانی ملایا اور اس طرح ستو پھولا* - رَابٍ - مونث رَابِیَۃٌ - وہ چیز جو اوپر چڑھ جائے - جو اوپر آجائے - زَبَدًا رَّابِیًا (۱۳/۱۷) - وہ خس و خاشاک یا جھاگ جو اوپر آجائے - اَخْذَۃً رَّابِیَۃً - سخت گرفت - بہت زیادہ (بڑھی ہوئی) گرفت* - ایسی گرفت جو انسان کے اوپر چھا جائے اور اسے مغلوب کر دے - (۶۹/۱۰) - اَرْبیٰ - زیادہ کثیر - مال و دولت میں زیادہ بڑھا ہوا* - (۱۶/۹۲) - رَبْوَۃٌ - زمین کا بلند حصہ - سطح مرتفع* - (۲۳/۵۰) - رَبَّیْتُہٗ - میں نے اسے بڑھایا ؛ اسے غذا دی - اسے پالا - پرورش کیا** - (۲۶/۱۸) - اَلرِّبَا (الرِّبٰوا) - وہ سود جو قرض پر وصول کیا جاتا ہے - رأس المال پر زیادہ لینا*** (تفصیل آگے آتی ہے) -

سورۃ آل عمران میں ہے لَا تَاْکُلُوا الرِّبٰوٓا اَضْعَافًا مُّضٰعَفَۃً (۳/۱۲۹) - سود مت کھاؤ - تم سمجھتے ہو کہ اس سے دولت میں اضافہ ہوتا ہے - حالانکہ درحقیقت اس سے قومی سرمایہ میں کمی ہوتی ہے - (دیکھئے عنوان ض - ع - ف) - قرآن کریم نے جو معاشی نظام تجویز کیا ہے اس میں سود کی کہیں گنجائش نہیں - جب اس میں دولت کا جمع کرنا ہی منع ہے تو پھر سود تو کجا، اس میں قرضہ کا بھی سوال نہیں پیدا ہوتا - اس میں فالتو سرمایہ (Surplus Money) کسی فرد کے پاس رہتا ہی نہیں - سارے معاشرے میں بٹ جاتا ہے - قرآن کریم میں قرضہ وغیرہ کے متعلق جو احکام ہیں ، وہ اس عبوری دور سے متعلق ہیں جب ہنوز قرآن کریم کا معاشی نظام ربوبیت متشکل نہ ہوا ہو -

سود تو ایک طرف - اس نظام میں کسی کو عطیۃ بھی کوئی چیز اس نیت سے نہیں دی جاسکتی کہ اس سے زیادہ واپس ملیگی - وَمَآ اٰتَیْتُمْ مِّنْ رِّبًا لِّیَرْبُوَا فِیْٓ اَمْوَالِ النَّاسِ (۳۰/۳۹)**** - جو کچھ تم لوگوں کو ان کے واجبات سے زیادہ دو اور اس سے غرض یہ ہو کہ اس میں بڑھوتی ہو تو نظام خداوندی میں اس میں بڑھوتی نہیں ہوسکتی - اس کی تفسیر (۶/۴۳) میں یہ کہکر

---

* تاج و محیط - ** اس کے لئے عنوان ر - ب - ب بھی دیکھئے - *** راغب -

**** تاج نے اس کے معنی "عطیہ" کئے ہیں لیکن ہمارے نزدیک یہ ہر اس چیز کے لئے بولا جائے گا جو کسی کے واجب سے زیادہ دے جائے -

کر دی کہ لَا تَمْنُنْ تَسْتَكْثِرُ۔ کسی پر اس مقصد کے لئے احسان نہ کر کہ تجھے اُس سے زیادہ واپس ملے ۔ اس نظام کی تو بنیاد ھی اِيْتَاۓِ زَكٰوة پر ھے ۔ یعنی دوسروں کی نشو و نما کا سامان بہم پہنچانا ۔ اس لئے (۳۰/۳۹) میں رِبًا کے مقابلہ میں زَكٰوة آیا ھے ۔

قرآن کریم نے اَلرِّبٰو کو یہ کہہ کر حرام قرار دیا ھے کہ وَاَحَلَّ اللّٰهُ الْبَيْعَ وَحَرَّمَ الرِّبٰو (۲/۲۷۵)۔ ”خدا نے بیع کو حلال ٹھہرایا ھے اور ربوٰ کو حرام“ ۔سوال یہ ھے کہ ربٰو کسے کہتے ھیں ؟ اس مقام پر قرآن کریم ربوٰ کو بیع کے مقابلہ میں لایا ھے جس کا مطلب یہ ھے کہ ربوٰ، بیع کی ضد ھے۔ بیع کیا ھے، اس کی تشریح، عنوان (ب ۔ ی ۔ ع) میں کی جا چکی ھے ۔ اسے ایک نظر دیکھ لیجئے ۔

جو کچھ ھم کسی دوسرے سے لیتے ھیں، اسکی مختلف شکلیں ھو سکتی ھیں ۔ مثلاً عطیہ ۔ اجرت ۔ سود (عام معنوں میں)۔ منافع (تجارت میں)۔ جوئے کی جیت ۔ اب دیکھئے کہ ان میں فرق کیا ھوتا ھے۔

(۱) عطیہ ۔ اس میں نہ محنت کرنی پڑتی ھے، نہ سرمایہ لگانا پڑتا ھے۔ دینے والا اسے کچھ واپس لینے کے خیال کے بغیر، تحفةً دیتا ھے ۔ لہذا اسے لین دین کی مد میں نہیں لایا جا سکتا ۔ اسلئے یہ شکل ھمارے زیر نظر موضوع سے خارج ھے ۔

(۲) اُجرت ۔ یہ محنت (Labour) کا معاوضہ ھوتا ھے ۔ اس میں سرمایہ (Capital) کچھ نہیں لگایا جاتا ۔

(۳) سود ۔ اس میں دوسرے کو سرمایہ (Capital) دیا جاتا ھے اور اس سرمایہ پر، اصل سے کچھ زائد وصول کیا جاتا ھے ۔ اس میں محنت کا کوئی دخل نہیں ھوتا ۔

(۴) منافع (تجارت میں)۔ اس میں سرمایہ بھی لگایا جاتا ھے اور محنت بھی کی جاتی ھے ۔

(۵) قمار ۔ اس میں نہ سرمایہ لگایا جاتا ھے ۔ نہ محنت کی جاتی ھے ۔

قرآن کریم نے اصول یہ بیان کیا ھے کہ لَيْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَا سَعٰى (۵۳/۳۹) ۔ ”انسان کے لئے وھی ھے جس کے لئے وہ محنت کرے“ ۔ یعنی وہ صرف محنت کا معاوضہ جائز قرار دیتا ھے ۔ سرمایہ (Capital) استعمال کرنے کا معاوضہ جائز نہیں قرار دیتا ۔ چونکہ یہ اصول لوگوں کی نگاھوں کے سامنے

نہیں تھا اس لئے ان کی سمجھ میں یہ بات نہیں آتی تھی کہ بیع کے منافع اور ربوٰ میں فرق کیا ہے ؟ ایک شخص سو روپے کی چیز خرید کر ایک سو دس روپے میں بیچدیتا ہے۔ اسے دس روپے اصل سے زائد ملتے ہیں۔ دوسرا شخص کسی کو سو روپے قرض دے کر اس سے ایک سو دس روپے وصول کرتا ہے۔ اس میں بھی اسے دس روپے اصل سے زائد ملتے ہیں۔ وہ یہ کہتے تھے کہ جب یہ دونوں، اصل پر زائد ہیں، تو ان میں فرق کیا ہے ؟ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ قَالُوْٓا اِنَّمَا الْبَيْعُ مِثْلُ الرِّبٰوا (۲/۲۷۵)۔ وہ بیع اور ربوٰ کو ایک ہی بات سمجھتے تھے۔ لیکن قرآن کریم نے کہا کہ یہ دونوں ایک نوعیت کی چیز نہیں ہیں۔ بیع میں سرمایہ اور محنت دونوں صرف ہوتے ہیں۔ سرمایہ کے بدلے میں سرمایہ واپس آجاتا ہے، اور دکاندار کو اسکی محنت کا معاوضہ سرمایہ سے الگ ملتا ہے۔ یہ حلال ہے۔ لیکن ربو میں صرف سرمایہ لگتا ہے۔ محنت کچھ صرف نہیں ہوتی۔ لہذا اس میں جو کچھ زائد ملتا ہے وہ سرمایہ کا معاوضہ ہے، جو حرام ہے۔ لہذا قرآن کریم کی رو سے اصول یہ ٹھہرا کہ

(۱) محنت کا معاوضہ لینا حلال ہے۔ اور

(۲) سرمایہ پر زائد لینا حرام ہے۔

اگر تجارت میں بھی کوئی شخص، اپنی محنت سے زائد منافع لیتا ہے تو وہ ربوٰ ہے۔ (اس بات کا تعین معاشرہ کریگا کہ اس شخص کی محنت کا معاوضہ کیا ہونا چاہئے۔ وہ اس معاوضہ سے زیادہ منافع نہیں لے سکتا)۔ لہذا، ہر وہ کاروبار جس میں انسان صرف سرمایہ لگا کر، اپنے اصل سے زائد وصول کرے، قرآن کریم کی رو سے الربوٰ میں داخل ہوگا۔ خواہ وہ زمین کی بٹائی ہو یا کاروبار میں (Sleeping Partner) کا منافع میں حصہ۔ آجکل کی اصطلاح میں اسے (Un- earned Income) کہتے ہیں۔ یعنی وہ آمدنی جو محنت سے کمائی نہ جائے۔

اور جب نہ سرمایہ لگایا جائے نہ محنت کی جائے تو وہ آمدنی جوئے کی ہے۔ (دیکھئے عنوان ی۔ س۔ ر)۔ عام طور پر کہا جاتا ہے کہ بیع (تجارت) میں انسان (Risk) لیتا ہے۔ یعنی اس میں نفع یا نقصان دونوں کا احتمال ہوتا ہے۔ اور ربوٰ میں (Risk) نہیں ہوتا۔ لیکن یہ معیار تفریق صحیح نہیں۔ اگر کسی آمدنی کو حلال قرار دینے کی شرط (Risk) ہو تو جوا عین حلال ہونا چاہئے کیونکہ اس میں ہر داؤ میں (Risk) ہوتا ہے۔ بیع اور ربوٰ میں اصل فرق وہی ہے جسے اوپر بیان کیا جا چکا ہے۔ بیع میں رأس المال+ محنت کا

معاوضہ (اجرت) واپس ملتے ہیں۔ اور ربوٰ میں رأس المال+ رأس المال کا معاوضہ ملتا ہے۔ اجرت حلال ہے۔ رأس المال کا معاوضہ حرام ہے، خواہ وہ سود کے نام سے پکارا جائے یا تجارت کے ''منافع'' کے نام سے۔ قرآن کریم کے معاشی نظام میں رأس المال پر اضافہ کسی شکل میں بھی جائز نہیں ہوگا۔ اگر تجارت اُس زمانہ میں ہوگی جب ہنوز افراد معاشرہ کی ضروریات زندگی کی ذمہ داری معاشرہ نے اپنے اوپر نہیں لی، (یعنی عبوری دور میں) تو رأس المال کے علاوہ اتنے منافع کی اجازت ہوگی جو دکاندار کی دن بھر کی محنت کے معاوضہ کے برابر ہو۔ اور جب دوکاندار کی ضروریات زندگی بھی معاشرہ پوری کریگا تو تجارت میں اشیاء کی فراہمی بلا منافع ہوگی۔ معلوم نہیں انسان کو قرآن کریم کے نظامِ معاش تک پہنچنے میں ابھی کتنا وقت لگے۔ لیکن جتنا وقت بھی لگے، انسان اپنے خود ساختہ جہنم سے اسی وقت نکل سکے گا جب اس نے قرآنی نظام اختیار کیا۔ موجودہ نظام معیشت جس میں سرمایہ کے استعمال کے معاوضہ کو حلال و طیب سمجھا جاتا ہے، قرآنی نظام کے خلاف اعلان جنگ ہے ($\frac{2}{279}$)۔

ر ت ع

رَتَعَ۔ یَرْتَعُ۔ رَتْعًا۔ سرسبز مقام میں سیر ہو کر کھانا پینا اور حسب مرضی گھومنا پھرنا۔ رَتْعٌ کا لفظ در اصل جانوروں کے کھانے چرنے کیلئے آتا ہے اور جی بھر کر کھانے کے لئے، پھر استعارۃً انسانوں کیلئے بھی استعمال ہوتا ہے*۔ جَمَلٌ رَاتِعٌ (جمع۔ اِبِلٌ رِتَاعٌ) آزادی کے ساتھ کھانے پینے والا اونٹ۔ اَلْمَرْتَعُ۔ چراگاہ۔ اَرْتَعَتِ الْاَرْضُ۔ زمین میں گھاس اور چارہ بکثرت ہو گیا*۔

سورۃ یوسف میں ہے کہ برادران حضرت یوسفؑ نے اپنے باپ سے کہا کہ یوسفؑ کو ہمارے ساتھ باہر جنگل میں جانے کی اجازت دیجئے یَرْتَعْ وَ یَلْعَبْ ($\frac{12}{12}$)۔ تا کہ یہ وہاں ہنسی خوشی سے کھائے پیے اور کھیلے کُودے۔ ''یَرْتَعْ و یَلْعَبْ''، کا تقریبًا وہی مفہوم ہے جو آجکل ہمارے ہاں پکنک (Picnic) کا ہے۔

ر ت ق

رَتْقٌ۔ شگاف کو بند کر دینا، بھر دینا، ملا دینا۔ نیز جڑی ہوئی اور ملی ہوئی چیز۔ اِرْتَتَقَ الشَّیْیُٔ۔ چیز مل گئی اور جڑ گئی۔ اس میں

*تاج و محیط و راغب۔

کہیں شگاف نہ رہا* ۔ راغب نے کہا ہے کہ اَلرَّتْقُ جوڑنا اور ملانا ہے خواہ وہ خلقی ہو خواہ مصنوعی** ۔ قرآن کریم میں ارض و سمٰوات کے متعلق ہے کہ کَانَتَا رَتْقًا فَفَتَقْنٰهُمَا ۔ (۲۱/۳۰) ۔ شروع میں اس تمام مادی کائنات کا ہیولٰی ملا جلا تھا۔ پھر اس میں سے مختلف کرّے الگ الگ ہو گئے ۔ (۲۱/۳۰) ۔ غور کیجئے کہ یہ اعلان چھٹی صدی عیسوی میں ہوتا ہے ۔ جب کسی انسان کے ذہن میں اسکا تصور تک بھی نہیں آ سکتا تھا کہ یہ مختلف اجرام شروع میں ایک ہی ہیولٰی تھے اور بعد میں یہ الگ الگ ہوئے ۔ آج سائنس کی تحقیقات نے اس اعلان پر مہر تصدیق ثبت کر دی ہے لیکن اُسوقت اِس حقیقت کو خالقِ کائنات کے سوا اور کون بیان کر سکتا تھا ؟

ر ت ل

اَلرَّتَلُ ۔ دانتوں کا موتیوں کی لڑی کی طرح سفید، آبدار، اور نہایت خوبصورت ترتیب کے ساتھ ہونا ۔ کسی چیز کا حسنِ تناسب کے ساتھ مربوط و مرتب ہونا ، حسنِ ترتیب اور حسنِ نظم لئے ہوئے ہونا ۔ اَلرَّتَیْلَاءُ ۔ ایک قسم کی مکڑی جو اپنے جالے کو نہایت عمدہ حسن اور تناسب سے تنتی ہے*** ۔

قرآن کریم کے متعلق ہے وَرَتَّلْنٰهُ تَرْتِیْلًا (۲۵/۳۲) ۔ ہم نے اسے نہایت عمدہ ترتیب، تناسب اور نظم کے ساتھ نازل کیا ہے۔ اس کے اجزاء کو نہایت خوبصورتی سے باہمدگر جوڑا ہے ۔ اسکی ساری تعلیم، ایک خاص نظم کے ساتھ، اسکے مرکزی فکر کے گرد گھومتی ہے ۔ نبی اکرمؐ سے کہا گیا وَرَتِّلِ الْقُرْاٰنَ تَرْتِیْلًا (۷۳/۴)۔ تم بھی اِسے اِسی طرح حسنِ نظم و تناسب کے ساتھ عمل میں لاتے چلے جاؤ۔

ر ج ج

اَلرَّجُّ ۔ ہلانا ۔ شدت سے حرکت دینا ۔ زلزلہ ڈال دینا ۔ کسی چیز کو ہلا کر اسکی جگہ سے ہٹا دینا، بے جگہ کر دینا ۔ اِرْتَجَّ الْبَحْرُ ۔ سمندر متموج اور متلاطم ہو گیا ۔ اَلرَّجَاجَۃُ ۔ شیر کی کچھار**** ۔

قرآن کریم میں ہے اِذَا رُجَّتِ الْاَرْضُ رَجًّا (۵۶/۴) ۔ جب زمین سخت حرکت سے متزلزل ہو جائیگی ۔ دوسری جگہ ہے ۔ اِذَا زُلْزِلَتِ الْاَرْضُ زِلْزَالَهَا (۹۹/۱) ۔ ’’جب زمین کو ہلایا جائیگا اس کا ہلایا

*تاج ۔ **راغب ۔ ***تاج و محیط ۔ ****تاج و محیط و راغب

جانا،، ۔ یعنی پوری شدت سے ہلائی جائیگی ۔ قرآن کریم کے اس قسم کے بیاناتؔ سے، کائنات کا طبیعی انقلاب بھی مقصود ہو سکتا ہے اور تمدنی انقلاب بھی ۔

ر ج ز

رِجْزٌ (اور رُجْزٌ) کے بنیادی معنے اضطراب پیہم اور مسلسل حرکت کے ہیں ۔ اَلرَّجَزُ ۔ اونٹ کی ایک بیماری کا نام ہے جس میں اسکی ٹانگیں یا جسم کا پچھلا حصہ اتنا کمزور ہو جاتا ہے کہ جب وہ کھڑا ہونے لگے تو اسکی ٹانگیں اور رانیں کپکپانے لگ جاتی ہیں اور وہ دو تین مرتبہ کوشش کرنے کے بعد اٹھنے کے قابل ہو سکتا ہے* ۔

رِجْزٌ ۔ وہ عذاب ہے جس میں کوئی قوم اضطراب پیہم میں مبتلا رہے اور ایسی کمزور ہوتی جائے کہ اس کے لئے اٹھنا دشوار ہو جائے ۔ عَذَابٌ مِنْ رِجْزٍ اَلِیْمٌ ($\frac{۳۴}{۵}$) ۔ ,,وہ عذاب جو درد ناک اضطراب ہے،،۔ دوسری جگہ ہے ۔ رِجْزًا مِنَ السَّمَاءِ ($\frac{۲۹}{۳۴}$) ۔ وہ تباہیاں اور بربادیاں جو خارجی حوادث کی رو سے آئیں ۔ سورۃ اعراف میں ان مختلف قسم کی تباہیوں کو رِجْزٌ سے تعبیر کیا گیا ہے جو قوم فرعون کو پیش آئی تھیں ۔ ($\frac{۷}{۱۳۴}$) ۔

سورۃ انفال میں ہے کہ ہم نے (بدر کے میدان میں) شیطان کے پیدا کردہ رِجْزٌ کو تم سے دور کر کے تمہارے دلوں میں تقویت اور پاؤں میں استقامت پیدا کر دی ($\frac{۸}{۱۱}$) ۔ یہاں سے رِجْزٌ کے معنے واضح ہو جاتے ہیں ۔ یعنے پائے استقلال میں لغزش آ جانا ۔ ایسی کمزوری پیدا ہو جانا جس سے دلوں میں اضطراب اور پاؤں میں لڑکھڑاہٹ پیدا ہو جائے ۔ اسلئے سورۃ المدثر میں جب نبی اکرمؐ سے کہا گیا کہ ,,اب تو اس دعوت انقلاب کو لیکر اٹھ،، ۔ تو اسکے ساتھ ہی کہا کہ وَالرُّجْزَ فَاهْجُرْ ($\frac{۷۴}{۵}$) ۔ اس کمزوری کو جھٹک کر الگ کر دے جو اٹھنے میں لڑکھڑاہٹ کا موجب بن جائے ۔ تم اور تمہارے رفقاء اپنے اندر اتنی قوت پیدا کر لو کہ تم اس بار گراں کو لیکر مردانہ وار اٹھ کھڑے ہو ۔ اس سورۃ میں تخاطب تو نبی اکرمؐ سے ہے لیکن یہ تعلیم تمام جماعت کے لئے ہے ۔ ایسا عظیم انقلاب اسی جماعت کے ہاتھوں برپا ہو سکتا ہے جس کے پائے استقلال میں کبھی لغزش نہ آئے ۔

---

*تاج ۔

رج س

اَلتَّرجُسُ - سخت آواز - کسی بہت بڑی اور مختلف قسم کی مخلوط چیزوں کی آواز کو کہتے ہیں - جیسے فوج یا سیلاب کا شور یا بادل کی گرج اور بجلی کی کڑک - رَجَسَتِ السَّمَاءُ - بادل بڑے زور سے گرجا - اِرْتَجَسَ الْبِنَاءُ - عمارت اسطرح ہلی یا لرزی کہ اسکی آواز سنائی دی - اَلرَّجَّاسُ - سمندر کو کہتے ہیں کیونکہ اسمیں سخت اضطراب بھی ہوتا ہے اور شور بھی - لہذا رِجْسٌ کے معنے ہوتے ہیں التباس - شک - تردد - اضطراب - کسی معاملہ کا صاف اور یکسو نہ ہونا - هُمْ فِیْ مَرْجُوْسَةٍ مِنْ اَمْرِهِمْ - وہ لوگ اپنے معاملہ میں شک - اضطراب اور التباس میں ہیں* - ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی اختلاط اور التباس کے ہیں - گندگی کو بھی اَلرِّجْسُ اسی لئے کہتے ہیں کہ وہ لتھڑ اور چپک جاتی ہے - اور خود اس میں بھی کئی آلائشیں ہوتی ہیں - قرآن کریم میں ہے وَيَجْعَلُ الرِّجْسَ عَلَى الَّذِيْنَ لَا يَعْقِلُوْنَ (۱۰/۱۰۰)- ''جو لوگ عقل و فکر سے کام نہیں لیتے ان پر اللہ رجس ڈال دیتا ہے،،- یہاں عقل سے کام نہ لینے کا نتیجہ رِجْسٌ بتایا گیا ہے - لہذا معنے واضح ہیں - یعنے شک - التباس - اضطراب - نیز اسکے معنے ایسی باتیں ہیں جن کا ذکر تک بھی قبیح ہو اور ان میں بہت زیادہ قباحت ہو* - نا خوش آئند امور- قرآن کریم نے خَمْرٌ- مَيْسِرٌ- اَنْصَابٌ- اَزْلَامٌ کو رِجْسٌ مِنْ عَمَلِ الشَّيْطٰنِ کہا ہے (۵/۹۰) - اس میں قباحت ازز نا پسندیدگی بھی ہے اور اضطرابی کیفیت بھی - اسی طرح کھانے کی حرام چیزوں کے متعلق کہا ہے- فَاِنَّهٗ رِجْسٌ (۶/۱۴۶) - رَجَسَهٗ عَنِ الْاَمْرِ کے معنے ہیں، اُس نے اسے اس کام سے روک دیا* - لہذا رِجْسٌ وہ کام ہیں جن سے انسانی شرف کے نشو و نما میں خلل اور رکاوٹ پیدا ہو جائے - تاج نے کہا ہے کہ اس سے وہ کام مراد ہیں جو انسان کو عذاب (تباہی) کیطرف لے جائیں- بات ایک ہی ہے- مِرْجَاسٌ اس پتھر کو بھی کہتے ہیں جو یہ دیکھنے کے لئے کنویں میں لٹکایا جائے کہ پانی کی گہرائی کس قدر ہے* -

سورة احزاب میں اہل بیت نبوی کے متعلق ہے يُرِيْدُ اللّٰهُ لِيُذْهِبَ عَنْكُمُ الرِّجْسَ اَهْلَ الْبَيْتِ (۳۳/۳۳) - خدا چاہتا ہے کہ تم سے رِجْسٌ دور کر دے- یعنے اضطرابات اور التباسات - یا وہ موانع جو تمہاری صحیح

*تاج -

نشو و نما کے راستہ میں حائل ہوں۔ سورۃ انعام میں ایمان والوں کے متعلق کہا گیا ہے کہ ان کا سینہ اسلام کے لئے کھل جاتا ہے۔ اس کے بر عکس، غلط راستے پر چلنے والوں کا سینہ تنگ ہوتا ہے۔ ان کی سانس پھول جاتی ہے۔ اس کے بعد ہے کَذٰلِکَ یَجْعَلُ اللّٰہُ الرِّجْسَ عَلَی الَّذِیْنَ لَا یُؤْمِنُوْنَ (۶/۱۲۶)۔ اس سے ظاہر ہے کہ رجس کے اندر دل کی تنگی۔ تعصب۔ تنگ نگہی ضد۔ ہٹ دھرمی۔ عقل و فکر سے کام نہ لینا۔ نیز شکوک۔ اضطراب وغیرہ سب کا مفہوم آ جاتا ہے۔ اسی بنا پر منافقین کو رجس مجسم کہا گیا ہے (۹/۹۵)۔ یعنی شکوک و اضطراب اور صحیح نظام کے راستے میں خلل اور رکاوٹ۔ بر عکس ایمان والوں کے (۹/۱۲۴-۲۵)۔

ر ج ع

رُجُوْعٌ کے معنے ہیں پلٹنا۔ لوٹنا۔ واپس ہونا۔ اور رَجْعٌ کے معنی ہیں پلٹانا*۔ لیکن اس حقیقت کو شروع ہی میں سمجھ لینا چاہئے کہ ہمارے ہاں جس مفہوم کیلئے رجعت کا لفظ استعمال ہوتا ہے وہ اس کا صحیح مفہوم نہیں۔ ہمارے ہاں رجعت سے مراد ہوتی ہے پسپائی۔ کسی کا اپنے مقام سے پیچھے ہٹ جانا۔ (رجعت پسند Re-actionary کو کہتے ہیں)۔ یعنے اسمیں تنزل۔ پستی اور اپنے مقام سے پیچھے ہٹ جانے کا پہلو نمایاں ہوتا ہے۔ بر عکس اسکے عربی زبان میں اسکے معنے یا تو اُسی پہلی حالت کی طرف رجوع کرنے کے ہوتے ہیں۔ اور یا اُس سے بہتر کیفیت لئے ہوئے۔ چنانچہ اَلرَّجْعَۃُ کسی عورت کو طلاق دینے کے بعد، پھر ازدواجی تعلق قائم کر لینے (میاں بیوی بن جانے) کو کہتے ہیں۔ یعنی اُسی پہلی حالت کیطرف لوٹ آنے کو۔ اور لَیْسَ لِیْ مِنْ فُلَانٍ رَجْعٌ کے معنے ہیں مجھے اس شخص سے کوئی نفع نہیں پہنچا۔ یعنی اس کے ہاں سے کوئی چیز پلٹ کر نہیں آئی۔ اسی طرح عربوں کے ہاں ضرب المثل ہے مَا ھُوَ اِلَّا سَجْعٌ لَیْسَ تَحْتَہٗ رَجْعٌ۔ یہ نرا سجع ہی سجع ہے جسکے تحت کوئی (رجع) فائدہ نہیں۔ چنانچہ اَرْجَعَتِ الْاِبِلُ اُسوقت کہتے ہیں جب اونٹ لاغر ہو جانے کے بعد پھر فربہ ہو جائے۔ اور سَفْرَۃٌ مُرْجِعَۃٌ اس سفر کو کہتے ہیں جس میں فائدہ ہو۔ مَتَاعٌ مُرْجِعٌ۔ بہت نفع بخش جنس۔ رَجِیْعٌ۔ اس رسی کو کہتے ہیں جسکے بٹ کھل گئے ہوں اور اسے دوبارہ بٹ دیا جائے*۔

---

*تاج۔

رَجْعٌ کے معنی پلٹانا ہیں ۔ جو چیز گردش کرتی ہے وہ پلٹ کر اُسی مقام پر آتی ہے جہاں سے وہ چلی تھی ۔ اس اعتبار سے دیکھئے تو ہر گردش میں رَجْعٌ پایا جاتا ہے ۔ سورۃ الطارق میں ہے وَالسَّمَاءِ ذَاتِ الرَّجْعِ (۸۶/۱۱) ۔ اس کے معنی یہی معلوم ہوتے ہیں کہ کائنات کی بلند فضا یا اس کے اندر جو کُرّے ہیں وہ گردش کرتے ہیں ۔ اور جس مقام سے چلتے ہیں پلٹ کر وہیں آ جاتے ہیں ۔ یا اس کے معنی ہیں وہ بلند فضا جس کی خصوصیت یہ ہے کہ وہ کروں کو یا دیگر اشیا کو پلٹاتی ہے ۔ (اور انکی گردش سے کائناتی زندگی کے نئے نئے پہلو سامنے آتے ہیں) ۔ پیچھے لوٹنے کے معنوں میں یہ لفظ (۳۶/۶۷) میں آیا ہے جہاں اس کے مقابلہ میں مُضِیًّا ہے جس کے معنی آگے چلنے کے ہیں ۔

رَجَعَ اِلَیْہِ کے معنے ہوتے ہیں کسی کی طرف امداد وغیرہ کیلئے رجوع کرنا ۔ (Having a Recourse to)** ۔ نیز رَجْعٌ کے معنے ردِ عمل (Reaction) یا نتائج مرتب ہوجانے کے بھی ہوتے ہیں ۔ چنانچہ کہتے ہیں رَجَعَ الْعَلَفُ فِی الدَّابَّۃِ ۔ جانور پر چارہ کا اثر نمایاں ہو گیا* ۔ رَجَعَ کَلَامِیْ فِیْہِ ۔ میری بات نے اس پر اثر کیا* ۔ اَلتَّرْجِیْعُ مِنَ الْکَلَامِ کے معنے ہیں وہ بات جو خود کہنے والے کی طرف لوٹا دی جائے* ۔

ژالہ (اولے) کو بھی رَجْعٌ کہتے ہیں کیونکہ وہ اس پانی کو واپس دیدیتا ہے جو اس نے زمین سے حاصل کیا تھا ۔ نیز بارش کو بھی* ۔ اور اس پانی کو بھی جو سطح ارض پر بہ رہا ہو*** ۔ اس اعتبار سے وَالسَّمَاءِ ذَاتِ الرَّجْعِ (۸۶/۱۱) کے معنی ہونگے وہ بلندی جو بخارات کو پانی (بارش) کی شکل میں پلٹا دیتی ہے ۔

قرآن کریم میں ہے صُمٌّ بُکْمٌ عُمْیٌ فَھُمْ لَا یَرْجِعُوْنَ (۲/۱۸) ۔ ایسے مقامات پر یَرْجِعُوْنَ کا مفہوم سمجھنے کے لئے ایک بات کا تمہیداً سمجھ لینا ضروری ہے ۔ جب نبی اکرم ؐ نے اپنی دعوت پیش کی تو سامنے دو قسم کے لوگ تھے ۔ ایک اہل کتاب، جو کسی وقت میں حق پر تھے لیکن بعد میں حق کے راستے سے ہٹ گئے ۔ ان سے بھی کہا گیا کہ تم پھر حق کیطرف پلٹ کر آ جاؤ ۔ وہ اس سے انکار کرتے تھے تو ان کے متعلق کہا جاتا تھا کہ وہ حق کی طرف پلٹ کر نہیں آتے ۔ لیکن دوسرا گروہ وہ تھا جن کی طرف حق پہلے پہل آیا تھا ۔ وہ جب حق کیطرف نہیں آتے تھے تو ان کے

*تاج ۔ **لین ۔ ***محیط ۔ ****کتاب الاشتقاق ۔

متعلق کہا جاتا تھا کہ وہ حق کی طرف رجوع ہی نہیں کرتے ۔ اسکی طرف آتے ہی نہیں ۔ اسکی طرف توجہ ہی نہیں دیتے ۔ اس کے لئے بھی قرآن کریم نے لاَ یَرْجِعُوْنَ کا لفظ استعمال کیا ہے ۔ ان مقامات میں صحیح ترجمہ "رجوع کرنا" ہوگا ۔ ویسے یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ وہ اپنی موجودہ غلط روش کو چھوڑ کر حق کیطرف نہیں پلٹتے ۔

سورۃ طٰہٰ میں حضرت موسیٰؑ کے متعلق ہے فَرَجَعْنٰکَ اِلٰی اُمِّکَ (۲۰/۴۰) ۔ "ہم نے تجھے تیری ماں کی طرف لوٹا دیا ۔" سورۃ نور میں ہے ۔ وَاِنْ قِیْلَ لَکُمُ ارْجِعُوْا فَارْجِعُوْا (۲۴/۲۸) ۔ "اگر صاحب خانہ تم سے کہیں کہ واپس چلے جاؤ ۔ تو واپس ہوجاؤ" ۔ حضرت یوسفؑ کے بھائی جب باپ کی طرف لوٹ کر آئے ہیں تو اس کے لئے فَلَمَّا رَجَعُوْا اِلٰی اَبِیْھِمْ ۔ کے الفاظ آئے ہیں (۱۲/۶۳) ۔

سورۃ النمل میں ہے کہ حضرت سلیمانؑ نے اپنے قاصد کو خط دیکر ملکہ سبا کی طرف بھیجا تو اس سے کہا کہ خط دینے کے بعد پیچھے مڑ آنا ۔ اورپھر انتظار کرنا کہ ان کا رد عمل کیا ہوتا ہے ۔ فَانْظُرْ مَاذَا یَرْجِعُوْنَ (۲۷/۲۸) ۔ سورۃ قٓ میں موت کے بعد دوبارہ زندگی کو رَجْعٌ کہا گیا ہے (۵۰/۳) ۔ یعنے مرنے کے بعد پھر زندگی کی طرف لوٹ آنا ۔ (اس دنیا کی طرف لوٹنا نہیں ۔ بلکہ مرنے کے بعد زندہ ہو جانا) ۔

اس مقام پر اس غلط تصور کا ازالہ ضروری ہے جو رَجْعَت اِلَی اللّٰہِ کے غیر قرآنی مفہوم سے عام طور پر ذہنوں میں پیدا ہوتا ہے ۔ ہمارے ہاں کسی کی موت کی خبر سن کر کہا جاتا ہے اِنَّا لِلّٰہِ وَ اِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ (۲/۱۵۶) ۔ اور اس کے معنے کئے جاتے ہیں "ہم اللہ کے ہیں اور اس کی طرف لوٹ کر جانے والے ہیں" ۔ اس سے ذہن دو صورتوں کی طرف منتقل ہو جاتا ہے ۔ ایک تو یہ کہ ہم پیدا ہونے سے پہلے خدا کے پاس تھے اور مرنے کے بعد (حشر کے دن) ایک میدان میں جمع ہونگے جہاں اللہ تعالےٰ بھی ہونگے اور اس طرح ہم لوٹ کر اُس کی طرف چلے جائینگے ۔ یہ تصور اس لئے غیر قرآنی ہے کہ اس سے یہ تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ خدا کسی ایک مقام میں محدود ہے اور تمام انسانوں کو اس مقام کی طرف لوٹ کر جانا ہے ۔ خدا کے لئے کسی خاص مقام کا تعین باطل تصور ہے ۔ وہ ہر مقام پر ہے ۔ ھُوَ مَعَکُمْ اَیْنَمَا کُنْتُمْ (۵۷/۴) ۔ مرنے کے بعد اگلی زندگی کی کیفیت کیا ہوگی ، اعمال کے جزا و سزا کا رنگ کیا ہوگا ۔ یہ وہ باتیں ہیں جن کی ماہیت اس زندگی میں

سمجھ میں نہیں آسکتی ۔ قرآن کریم نے اس باب میں جو کچھ کہا ہے اس کی تشریح کا یہ موقعہ نہیں ۔ لیکن ایک بات بالکل واضح ہے۔ اور وہ یہ کہ مُردوں کا کسی ایسے مقام کی طرف جانا جہاں خاص طور پر خدا موجود ہوگا قرآنی تصور کے مطابق نہیں۔قرآن کریم تو یہ بھی کہتا ہے کہ وَ جَآءَ رَبُّكَ وَ الْمَلَكُ صَفًّا صَفًّا (۸۹/۲۲)۔ تیرا رب اور ملائکہ صف در صف آئینگے ۔ وَ جِاْیٓءَ يَوْمَئِذٍ بِجَهَنَّمَ (۸۹/۲۳)۔ اُس دن جہنم لائی جائیگی ۔ خدا کے متعلق کسی خاص مقام یا سمت کا تصور جہاں ہم مرنے کے بعد جائینگے، قرآن کریم کی رو سے درست نہیں۔

دوسری صورت جسکی طرف ذہن (اِنَّا لِلّٰهِ . . . . . سے) منتقل ہوتا ہے تصوف کی پیدا کردہ ہے ۔ ویدانت (ہندوؤں کے "تصوف") کی رو سے یہ مانا جاتا ہے کہ انسانی روح (آتما) درحقیقت روحِ کائنات، یعنی خدا (پرماتما) کا ایک جزو ہے ۔ یہ جزو اپنے کل سے جدا ہو کر مادہ کی دلدلوں میں پھنس چکا ہے اور یہاں سے نکلنے کے لئے تناسخ کے چکر کاٹ رہا ہے۔ آخر الامر یہ جزو پھر اپنے کل میں جا ملیگا جس طرح، (اپنشد کے الفاظ میں) "شام کو پرندے اپنے گھونسلوں میں واپس چلے جاتے ہیں" ۔ ویدانت کا بھی تصور ہمارے تصوف میں آیا جسکی رو سے سمجھا جاتا ہے کہ "انسانی روح*" خدا کا ایک جزو ہے اور یہ جزو اپنے کل سے ملنے کےلئے مضطرب و بیقرار ہے ۔

بشنو از نے چوں حکایت می کند
از جدائیہا شکایت مے کند (رومی)

مرنے کے بعد نیک لوگوں کی روح اپنے کُل (خدا) میں جا ملیگی ۔ یہی زندگی کی کامیابی و کامرانی ہے ۔

عشرتِ قطرہ ہے دریا میں فنا ہو جانا (غالب)۔

"اِلَیْهِ رٰجِعُوْنَ" سے (ان کے نزدیک) مراد ہے جزو کا اپنے کل کی طرف لوٹ جانا اور اُس سے جا کر مل جانا۔ اسی لئے یہ لوگ موت کو وصال کہتے ہیں ۔ (فلاں صاحب کا وصال ہو گیا ۔ یا فلاں بزرگ واصل بالحق ہو گئے) وصال کے معنے مل جانے کے ہیں ۔

یہ تصور بھی غیر قرآنی ہے، اسلئے کہ انسان اور خدا کا تعلق جزو اور کل کا نہیں ۔ کسی کل سے اگر کوئی جزو الگ ہو جائے تو کُل نا تمام رہ جاتا ہے ۔ اور یہ چیز ذات خداوندی میں نقص کا باعث ہے ۔ لہذا، اِنَّا اِلَیْهِ رٰجِعُوْنَ کا یہ مفہوم بھی غلط ہے ۔

* "انسانی روح" کی ترکیب بھی غیر قرآنی ہے ۔ تفصیل کے لئے دیکھئے عنوان (ر-و-ح)۔

سمت یا مقام کا تصور رَاجِعُوْنَ کے علاوہ اِلَیْہِ (اس کی طرف) کے لفظ سے بھی پیدا ہوتا ہے۔ لیکن یہ بھی اسلئے کہ ہم اِلَیْہِ یا اِلَیْنَا سے خود ہی سمت مراد لے لیتے ہیں۔ حالانکہ قرآن کریم میں اس کا ہر جگہ یہی مفہوم نہیں۔ مثلاً قرآن کریم میں ہے اَلَمْ تَرَ اِلٰی رَبِّکَ کَیْفَ مَدَّ الظِّلَّ۔ تو نے اس پر غور نہیں کیا کہ تیرا رب سائے کو کسطرح پھیلاتا ہے۔ وَلَوْ شَآءَ لَجَعَلَہٗ سَاکِنًا ثُمَّ جَعَلْنَا الشَّمْسَ عَلَیْہِ دَلِیْلًا۔ اگر وہ چاہتا تو اپنے قانون مشیت کی رو سے ایسا بھی کر سکتا تھا کہ سائے نہ گھٹتے نہ بڑھتے۔ لیکن اس نے ایسا نہیں کیا۔ اس نے سورج کو اس انداز سے بنایا ہے کہ وہ اسکے گھٹنے بڑھنے کی دلیل (موجب) بن گیا ہے۔ اسکے بعد ہے ثُمَّ قَبَضْنَاہُ اِلَیْنَا قَبْضًا یَّسِیْرًا (۴۶-۲۵/۴۵)۔ پھر ہم اسے (یعنے سائے) کو اپنی طرف (اِلَیْنَا) کھینچ لیتے ہیں، نہایت آسانی سے کھینچ لینا۔ اس آیت میں اِلَیْنَا کا لفظ صاف بتا رہا ہے کہ اس سے مراد کوئی خاص سمت نہیں بلکہ مقصد یہ ہے کہ خدا کے قانون کائنات کے مطابق سائے سمٹ جاتے ہیں۔ لہذا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ کا ایک مفہوم ''خدا کے قانون طبعی کے مطابق نقل و حرکت کرنا'' بھی ہے۔ مثلاً سورۃ آل عمران میں ہے وَلَہٗ اَسْلَمَ مَنْ فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ طَوْعًا وَّکَرْھًا وَّاِلَیْہِ یُرْجَعُوْنَ (۳/۸۲)۔ کائنات کی پستیوں اور بلندیوں میں جو کچھ ہے سب اسکے قانون کے سامنے سربسجود ہے۔ طوعاً و کرھاً۔ اور اسطرح ہر شے کا قدم اُسی مرکز کی طرف اُٹھتا ہے۔ ہر شے اُسی محور کے گرد گردش کر رہی ہے۔ اُسی قانون کے مطابق سرگرم عمل ہے۔ سورۃ یٰسین میں ہے فَسُبْحٰنَ الَّذِیْ بِیَدِہٖ مَلَکُوْتُ کُلِّ شَیْءٍ وَّاِلَیْہِ تُرْجَعُوْنَ (۳۶/۸۳)۔ اللہ کی ذات (انسان کے خود پیدا کردہ غلط تصورات سے) بہت دور اور بلند ہے۔ ہر شے کی باگ ڈور اسی کے قبضہ و اختیار میں ہے۔ اس لئے ہر شے اس کے مقرر کردہ قانون کے مطابق گردش کرتی ہے۔ اس کا ہر قدم اسی قانون کیطرف اٹھتا ہے۔ اس سے وہ ادھر اُدھر ہٹ نہیں سکتی۔ اور چونکہ ''اشیاء'' میں خود انسان بھی شامل ہیں اسلئے یہ بھی اس قاعدے سے مستثنٰے نہیں۔ اس کا ہر عمل بھی قانونِ مکافات کی زنجیروں کے ساتھ بندھا ہوا ہے۔ اسلئے اس کا ہر قدم بھی اسی کی سمت اٹھ رہا ہے۔ (وَاِلَیْہِ تُرْجَعُوْنَ)۔

اب یہاں سے ہم خارجی کائنات کے قانونِ طبیعی سے آگے بڑھ کر انسانی دنیا کے قانونِ مکافات کیطرف آ گئے۔ اس سلسلہ میں قرآن کریم کی متعدد آیات میں اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ (یا اسی قسم کے دیگر الفاظ) آئے ہیں۔ مثلاً

ارشاد ہے کَلَّآ اِنَّ الْاِنْسَانَ لَیَطْغٰی ۔ اَنْ رَّاٰہُ اسْتَغْنٰی ۔ جب انسان اپنے متعلق یہ سمجھ لیتا ہے کہ وہ کسی کی مدد کا محتاج نہیں (ہر ایک سے مستغنی ہے) تو پھر سرکشی اختیار کر لیتا ہے حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ وہ لاکھ اپنے آپکو مستغنی سمجھے ۔ اِنَّ اِلٰی رَبِّکَ الرُّجْعٰی (۹۶/۸-۵) ۔ وہ خدا کے قانونِ مکافات کے دائرے سے باہر جا ہی نہیں سکتا ۔ اسے بہرحال اسی قانون کی طرف آنا ہے ۔ اس حقیقت کو وَ اِلَی اللّٰہِ تُرْجَعُ الْاُمُوْرُ (۳۵/۴) سے تعبیر کیا گیا ہے ۔ یعنی یہاں ہر معاملہ کا فیصلہ اسی کے قانون کے مطابق ہوتا ہے ۔ سورۃ انبیاء میں ہے کہ تمام نوع انسانی ایک ہی جماعت اور ایک ہی برادری ہے لیکن لوگوں نے اپنی اپنی مفاد پرستیوں کی بنا پر اسے الگ الگ ٹکڑوں میں بانٹ دیا ہے ۔ وَ تَقَطَّعُوْٓا اَمْرَھُمْ بَیْنَھُمْ (۲۱/۹۳) ۔ اسکے بعد ہے کُلٌّ اِلَیْنَا رٰجِعُوْنَ ۔ اور اسکے بعد ہے فَمَنْ یَّعْمَلْ مِنَ الصّٰلِحٰتِ وَ ھُوَ مُؤْمِنٌ فَلَا کُفْرَانَ لِسَعْیِہٖ وَ اِنَّا لَہٗ کٰتِبُوْنَ (۲۱/۹۴) ۔ پس جو شخص صلاحیت بخش پروگرام پر کاربند رہتا ہے اور وہ مومن بھی ہے تو اسکی کوششیں بے نتیجہ نہیں رہتیں ۔ ہم ان سب کو لکھتے رہتے ہیں ۔ اس سے کُلٌّ اِلَیْنَا رٰجِعُوْنَ کا مفہوم واضح ہو جاتا ہے ۔ یعنی تمام انسانوں کے اعمال کے نتائج ہمارے قانونِ مکافات عمل کے مطابق مرتب ہوتے ہیں ۔ تمام اعمال اس محور کے گرد گردش کرتے ہیں ۔ ہر ایک کا قدم اسی کی طرف اٹھتا ہے ۔ کوئی اس سے بھاگ کر کہیں نہیں جا سکتا ۔ یہ لوگ ہمارے قانون کی خلاف ورزی کرکے بزعم خویش سمجھتے ہیں کہ وہ ہماری گرفت سے دور جا رہے ہیں حالانکہ وہ ہمارے قانونِ مکافات کی طرف از خود کھنچے چلے آ رہے ہیں ۔ کُلٌّ اِلَیْنَا رٰجِعُوْنَ ۔ نیز دیکھئے (۶/۱۶۵ و ۲/۲۸۱-۸۲) جہاں مکافات عمل کا مفہوم واضح طور پر سامنے آ جاتا ہے ۔

اعمال کے نتائج کے متعلق بھی ہمارے ذہن میں یہ تصور ہے کہ یہ نتائج صرف دوسری زندگی میں جا کر مرتب ہونگے ۔ یہ تصور بھی صحیح نہیں ۔ اعمال کے نتائج، عمل سرزد ہونے کے ساتھ ہی مرتب ہونا شروع ہو جاتے ہیں ۔ پھر ان میں سے بعض نتائج کا ظہور اسی دنیا میں ہو جاتا ہے اور بعض کا ظہور اسکے بعد کی زندگی میں ہوتا ہے ۔ لہذا قرآن کریم میں جہاں یہ آیا ہے کہ اِلَیَّ مَرْجِعُکُمْ فَاُنَبِّئُکُمْ بِمَا کُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ (۲۹/۸) ۔ اور جس کے معنے یہ کئے جاتے ہیں کہ ”تمہیں میری طرف لوٹ کر آنا ہے ۔ پس میں تمہیں تمہارے اعمال کی خبر دونگا“۔ تو اسکا یہ مطلب نہیں کہ

جب انسان مرنے کے بعد خدا کی طرف جائیگا تو اعمال کے نتائج سامنے آئینگے۔ اس کا مطلب یہی ہے کہ تمہارے تمام اعمال ہمارے قانونِ مکافات کے گرد گردش کرتے ہیں - اس قانون کی رو سے انکے نتائج مرتب ہوتے ہیں۔ تم اس کے احاطہ سے باہر نہیں رہ سکتے۔ اسی کی رو سے انکے نتائج تمہارے سامنے آجاتے ہیں - چنانچہ خود نبی اکرمؐ سے کہا گیا کہ فَاِمَّا نُرِیَنَّکَ بَعْضَ الَّذِیْ نَعِدُ ھُمْ اَوْ نَتَوَفَّیَنَّکَ فَاِلَیْنَا یُرْجَعُوْنَ (۴۰/۷۸) - ہم ان مخالفین کو جس سزا کی وعید دے رہے ہیں ہو سکتا ہے کہ اس میں سے کچھ تمہاری آنکھوں کے سامنے ظہور میں آ جائے - اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ایسا تیری وفات کے بعد ہو۔ لیکن زود ہو یا بدیر۔ ان کے اعمال کے نتائج بہر حال ہمارے ہی قانون کے مطابق مرتب ہونگے۔ یہ اس کے دائرے سے باہر جا نہیں سکتے - (فَاِلَیْنَا یُرْجَعُوْنَ) -

لیکن جن اعمال کے نتائج انسان کی اس زندگی میں سامنے نہیں آتے وہ اسکے بعد کی زندگی میں سامنے آ جاتے ہیں - یہ ہے وہ مقام جہاں یہ آیا ہے کہ تم مرنے کے بعد بھی اِلَیْہِ تُرْجَعُوْنَ - ''خدا کیطرف لوٹو گے،، - یعنے تم یہ نہ سمجھ لو کہ اب تو ہم مر گئے اس لئے اب ہم پر کسی کی گرفت نہیں - تم مرنے کے بعد بھی خدا کے قانون مکافات کی طرف جاؤ گے - اس سے تمہارے لئے کہیں مفر نہیں - یہ ہے قرآن کریم کی رو سے اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ کا مفہوم -

بعض مقامات پر یہ لفظ ٹھیک ان معنوں میں بھی آیا ہے جن معنوں میں ہمارے ہاں رجوع کرنے کا لفظ استعمال ہوتا ہے - مثلاً اَنَّھُمْ اِلَیْھِمْ لَا یَرْجِعُوْنَ (۳۶/۳۱) - یہ لوگ اپنے رسولوں کی طرف رجوع نہیں کرتے تھے۔

ان تصریحات کی روشنی میں اِنَّا لِلّٰہِ وَ اِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ کا صحیح مفہوم سمجھئے - قرآن کریم میں جہاں اِنَّا لِلّٰہِ وَ اِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ آیا ہے اس سے پہلی آیات میں یہ ذکر ہے کہ نظام خداوندی کے قیام و استحکام میں بڑی بڑی مشکلات کا سامنا ہوتا ہے - حتّٰکہ اس میں جان تک بھی دیدینی پڑتی ہے - اس اصولی حقیقت کو بیان کرنے کے بعد جماعتِ مومنین سے کہا گیا ہے کہ تمہارے سامنے بھی زندگی کے مختلف پہلو آئینگے۔ دشمنوں کی طرف سے ایذا رسانی کا خوف۔ بھوک - اموال و ثمرات اور نفوس کا اتلاف۔ یہ سب کچھ ہوگا۔ اسکے بعد ہے وَ بَشِّرِ الصّٰبِرِیْنَ - الَّذِیْنَ اِذَآ اَصَابَتْھُمْ مُّصِیْبَۃٌ قَالُوْٓا اِنَّا لِلّٰہِ وَ اِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ (۲/۱۵۶)۔ تو خوشگوار نتائج کی بشارت دیدے ان لوگوں کو جن کی کیفیت یہ ہے کہ

انہیں جب بھی اس قسم کے واقعات پیش آتے ہیں تو وہ دل کے پورے اطمینان سے کہدیتے ہیں کہ اس میں گھبرانے کی کوئی بات نہیں ۔ ہماری ساری زندگی خدا (کے نظام) کیلئے وقف ہے ۔ اور ہم ان مشکلات کا مقابلہ کرنے کیلئے اُسی کے قانون کی طرف رجوع کرتے ہیں ۔ یا یہ کہ جب ہماری ساری زندگی اُسکے نظامؐ کیلئے وقف ہے تو یہ مشکلات و مصائب ہمیں اسکے راستے سے ہٹا نہیں سکتیں ۔ ان کے علی الرغم ہمارا ہر قدم اُسی کی طرف اٹھتا ہے ۔ ہماری ہر حرکت اسی محور کے گرد گردش کرتی ہے ۔ (اِنَّآ اِلَيْهِ رٰجِعُوْنَ) ۔ اور ہماری اس جد و جہد کے نتائج بھی اسی کے قانون کے مطابق مرتب ہونگے جس پر ہمیں پورا پورا بھروسہ ہے ۔ جتنے موانعات آنا چاہتے ہیں آئیں ۔ جتنی رکاوٹیں کوئی ڈالنا چاہتا ہے ڈال لے ۔ ہم ان سے گھبرا کر اپنا رخ کسی دوسری سمت کو کبھی نہیں موڑینگے ۔ ہمارا ہر قدم، بہر حال و بہر طور، اسی منزل کی طرف اٹھیگا جو ہمارے خدا نے ہمارے لئے متعین کی ہے اور جو ہماری زندگی کا منتہی و مقصود ہے ۔ (اِنَّآ اِلَيْهِ رٰجِعُوْنَ) ۔ اس کے بعد ہے اُولٰٓئِكَ عَلَيْهِمْ صَلَوٰتٌ مِّنْ رَّبِّهِمْ وَ رَحْمَةٌ وَ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُهْتَدُوْنَ ($\frac{2}{155-157}$) ۔ یہ ہیں وہ لوگ جن پر اللہ کی طرف سے تبریک و تہنیت کے پھولوں کی بارش ہوتی ہے ۔ اور یہی وہ لوگ ہیں جن کا قدم صحیح راستے پر اٹھ رہا ہے۔ ''اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُهْتَدُوْنَ'' خود ''اِلَيْهِ رٰجِعُوْنَ'' کی تشریح کر رہا ہے ۔

قرآن کریم کے ان مقامات سے واضح ہے کہ اِنَّآ اِلَيْهِ رٰجِعُوْنَ کے یہ معنے نہیں کہ خدا کسی خاص مقام میں ہے اور ہم لوٹ کر اُس مقام کی طرف اسکے پاس جائینگے ۔ نہ ہی یہ کہ ہماری ''روح'' اُس کل کا ایک جزو ہے اور یہ جزو آخرالامر اپنے کل سے جا ملیگا ۔ بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ ہماری ساری زندگی، نظامِ خداوندی کیلئے وقف ہے ۔ (اِنَّا لِلّٰهِ) ۔ اور دنیا بھر کی مشکلات و مصائب کے باوجود ہمارا ہر قدم اُسی نظام کی طرف اٹھتا ہے ۔ اُسی سے ہم توانائیاں حاصل کرتے ہیں اور اس کی رو سے ہمارے اعمال نتیجہ خیز ہوتے ہیں ۔ ہماری زندگی کی ہر حرکت اسی محور کے گرد گھومتی ہے ۔ وہی ہمارے دائرۂ حیات کا مرکز ہے ۔ ہماری تمام تگ و تاز کا رخ اسی قبلہ کی طرف ہے ۔ (اِنَّآ اِلَيْهِ رٰجِعُوْنَ) ۔ نیز یہ کہ ہمارا ہر عمل اِس کے قانون مکافات کیطرف کشاں کشاں چلا جاتا ہے ۔ وہ اس سے اِدھر اُدھر کہیں ہٹ نہیں سکتا ۔ وہ نتیجہ خیز ہو کر رهتا ہے ،خواہ اس کا نتیجہ اس زندگی میں سامنے آ جائے یا مرنے کے بعد دوسری زندگی میں ۔ اس لئے کہ اس کا قانون مکافات اسی دنیا تک محدود نہیں ۔

ر ج ف

اَلرَّجْفُ - کسی چیز کا متحرک ہو جانا - یا لرز اٹھنا۔ اس میں حرکت کے ساتھ اضطراب اور پریشانی کا ہونا ضروری ہے - رَجْفُ الْقَلْبِ - گھبراہٹ کی وجہ سے دل کا شدید اضطراب*۔ راغب نے کہا ہے کہ اَلرَّجْفُ - اضطراب شدید کو کہتے ہیں** - اَلرَّاجِفُ - لرزہ کے ساتھ بخار - اَرْجَفَتِ الرِّیْحُ الشَّجَرَ - ہوا نے درختوں کو ہلا ڈالا - رَجَفَتِ الْاَرْضُ - زمین متزلزل ہوئی - اَلرَّجْفَۃُ - زلزلہ - اَلْاَرَاجِیْفُ - فتنوں کو بیدار کرنے والی، بے حقیقت، اضطراب انگیز خبریں* - اس سے فعل اَرْجَفَ آتا ہے۔ اَلْمُرْجِفُوْنَ فِی الْمَدِیْنَۃِ (۳۳/۶۰) - شہر میں ایسی خبریں پھیلانے والے لوگ جن سے خواہ مخواہ اضطراب پیدا ہو جائے* -

قرآن کریم میں قوم ثمود کے متعلق ہے فَاَخَذَتْھُمُ الرَّجْفَۃُ (۷/۷۸) - ''انہیں زلزلہ نے آن پکڑا''۔ سورۃ نَازِعٰت میں ہے - یَوْمَ تَرْجُفُ الرَّاجِفَۃُ (۷۹/۶) - ''جس دن کانپ اٹھنے والی کانپ اٹھیگی'' - دوسری جگہ ہے یَوْمَ تَرْجُفُ الْاَرْضُ (۷۳/۱۴) - جسوقت نچلے درجہ کے لوگ (عوام) سخت اضطراب میں ہونگے - یا جسدن زمین لرز اٹھیگی -

ر ج ل

رِجْلٌ - (جمع اَرْجُلٌ) - پاؤں (۳۸/۴۲) - رِجَالٌ - پا پیادہ چلنے والے (یہ رَاجِلٌ کی جمع ہے) بمقابلہ رُکْبَانًا (۲/۲۳۹) نیز خَیْلٌ (رسالہ) کے مقابلہ میں رَجِلٌ بمعنی پیادہ لشکر (۱۷/۶۴)۔ رَجُلٌ - مرد - جمع رِجَالٌ (۲/۲۲۸) لوگ - اشخاص (۷/۴۶) - صاحب محیط نے کہا ہے کہ مرد کو اس کی قوت اور بہادری کی بنا پر رَجُلٌ کہا جاتا ہے - اسی بنا پر راغب نے کہا ہے کہ جَآءَ مِنْ اَقْصَی الْمَدِیْنَۃِ رَجُلٌ یَّسْعٰی (۳۶/۲۰) اور وَقَالَ رَجُلٌ مُّؤْمِنٌ مِّنْ اٰلِ فِرْعَوْنَ (۴۰/۲۸) میں رَجُلٌ کے معنے قوی اور بہادر آدمی کے ہونگے***۔ (ابن فارس نے کہا ہے کہ اس مادہ کے بیشتر مشتقات ٹانگ کے معنوں سے مشتق ہیں لیکن الرَّجُلُ بمعنی مرد اس معنے سے جداگانہ مفہوم رکھتا ہے۔

ر ج م

رَجْمٌ کے اصلی معنی ہیں پتھروں سے مارنا (ابن فارس) - پھر اس کے معنے قتل کرنے کے بھی ہوگئے - نیز تہمت لگانا اور گالی دینا - جھڑک کر

* تاج و محیط - **راغب - ***تاج و راغب و محیط -

نکال دینا ۔ کسی کو چھوڑ دینا یعنے قطع تعلق کر لینا* ۔ نیز اَلرَّجْمُ کے معنے ہیں کسی کو مطعون کرنا* ۔ اَلرِّجَامُ ۔ پتھروں کو کہتے ہیں ۔ اور مِرْجَامٌ (Sling) یعنی گوپھیا کو جس سے پتھر کو دور پھینکا جاتا ہے**۔

سورۃ یٰسٓ میں ہے لَئِنْ لَّمْ تَنْتَهُوْا لَنَرْجُمَنَّكُمْ (۳۶/۱۸) ۔ ''اگر تم باز نہ آئے تو ہم تمہیں سنگسار کر دینگے'' ۔ یا قتل کر دینگے ۔ سورۃ شعراء میں ہے لَتَكُوْنَنَّ مِنَ الْمَرْجُوْمِيْنَ (۲۶/۱۱۶) ۔ ''تو ان میں سے ہوگا جنہیں سنگسار یا قتل کر دیا جاتا ہے'' ۔ سورۃ حجر میں شیطان کو رَجِیْمٌ کہا گیا ہے جس کی تفسیر یہ کہکر کر دی گئی اِنَّ عَلَيْكَ اللَّعْنَةَ (۱۵/۳۴-۳۵) ۔ لہذا رَجِیْمٌ اور مَلْعُوْنٌ ہم معنے ہیں ۔ (مَلْعُوْنٌ کے لئے دیکھئے عنوان ل۔ ع ۔ ن) ۔ یعنے وہ جو خدا کی نوازشات سے محروم رہ جائے ۔ جو اس سے دور ہو جائے ۔ جس سے قطع علائق کر لیا جائے ۔ جس سے کچھ واسطہ نہ رکھا جائے ۔

رَجْمٌ ۔ اٹکل پچو باتیں کرنا ۔ چنانچہ حَدِیْثٌ مُرَجَّمٌ کے معنے ہیں ایسی ظنی بات جس کی حقیقت معلوم نہ ہوسکے* ۔ رَجَمَ الرَّجُلُ بِالْغَیْبِ کے معنے ہیں اس آدمی نے غیب کے متعلق ایسی بات کہی جسے وہ جانتا نہیں ۔ قَالَهٗ رَجْمًا ۔ اس نے یونہی اٹکل پچو بات کہہ دی**۔ سورۃ کہف میں ہے کہ یہ لوگ جو اصحاب کہف کی تعداد بتاتے ہیں یونہی رَجْمًا بِالْغَیْبِ (۱۸/۲۲) باتیں کہتے ہیں ۔ یعنی قیاس آرائیاں کرتے ہیں ۔ بے جانے بوجھے (حقیقت کا علم رکھے بغیر) اٹکلیں دوڑاتے ہیں ۔ صاحب لطائف اللغۃ نے بھی اَلرَّجْمُ کے معنی اَلظَّنُّ لکھے ہیں ۔

زمانہ قدیم میں مندروں اور معبدوں میں کاہن ہوتے تھے جو لوگوں کو غیب کی باتیں بتایا کرتے تھے ۔ (اب بھی مندروں کے پجاری اور خانقاہوں کے پیشوا یہی کچھ کرتے ہیں) ۔ ان کا دعویٰ یہ ہوتا تھا کہ ہم یہ باتیں ''آسمان'' سے سنکر آتے ہیں ۔ قرآن کریم نے متعدد مقامات پر کہا ہے کہ یہ سب رَجْمًا باتیں کرتے ہیں ۔ یعنے محض اٹکلیں دوڑاتے ہیں ۔ ان میں سے کبھی کبھار کوئی بات ٹھیک بھی نکل آتی ہے (جیسے دس قیاسی باتوں میں سے ایک آدہ ٹھیک نکل آیا کرتی ہے) ورنہ انہیں علم و حقیقت سے دور کا بھی واسطہ نہیں ۔ دیکھئے (۱۵/۱۷-۱۸ و ۳۷/۶-۹ و ۶۷/۵ و ۷۲/۸-۹) ۔ نزول قرآن کے بعد علم و بصیرت کا زمانہ آگیا، اس لئے اس قسم کی توہم پرستیوں کیلئے اب کوئی گنجائش نہ رہی ۔ اب ان خرافات کو ''آسمان سے آتشیں کوڑے'' پڑتے ہیں ۔

---

*تاج ۔ ** لین ۔ *** محیط ۔

جیسا کہ (ل ـ ع ـ ن) کے عنوان میں بتایا جائیگا ، قرآن کریم کی رُو سے لَعْنَت گالی نہیں بلکہ ایک حقیقت کا بیان ہے ۔ یعنی غلط روش کی بنا پر زندگی کی ان خوشگواریوں سے محرومی جو قوانین خداوندی کے مطابق زندگی بسر کرنے کا لازمی نتیجہ ہیں ۔ جسنے اس طرح خوشگواریوں سے محروم کر دیا گیا ہو وہ مَلْعُوْنٌ کہلائیگا ۔ یہی معنی رَجِیْمٌ کے ہیں۔ یعنی دور پھینکا ہوا۔ یعنی جو ان خوشگواریوں سے محروم ہو ۔ اسکے متعلق ہمیں تاکید کی گئی ہے کہ اس سے قطع تعلق کر لیا جائے ۔ اس سے کچھ واسطہ نہ رکھا جائے ۔ اس سے دور دور رہا جائے۔ ہروہ قوت یا جذبہ جو ہمیں قوانین خداوندی کے خلاف سرکشی پر آمادہ کرے یا جہالت اور بے بصری کیطرف مائل کرے ، اس قابل ہے کہ اس سے دور دور رہا جائے ۔ اسی کو ملعون یا رجیم کہا جائیگا ۔

ر ج و

اَلرَّجَاءُ ۔ امید (یَاْسٌ کی ضد ہے)*۔ بالعموم یہ ایسی امید کو کہتے ہیں جو موہوم نہ ہو۔ راغب نے لکھا ہے کہ یہ ایسے ظن کے لئے بولا جاتا ہے جس میں مسرت حاصل ہونے کا امکان ہو ۔ لیکن چونکہ خوشی اور ڈر دونوں لازم ملزوم ہیں اس لئے پھر یہ ایسے ظن کے لئے بھی بولا جانے لگا جس میں خوف ہو۔ صاحب محیط نے کہا ہے کہ آمَلٌ اور رَجَاءٌ میں فرق یہ ہے کہ آمَلٌ تو پسندیدہ امر کے لئے آتا ہے اور رَجَاءٌ پسندیدہ اور غیر پسندیدہ دونوں کے لئے**۔ ازھری نے کہا ہے کہ رَجَاءٌ کے ساتھ اگر حرف نفی ہو تو اسکے معنے خوف کے آتے ہیں *۔ ابن قتیبہ نے بھی لَا یَرْجُوْنَ کے معنی لَا یَخَافُوْنَ کئے ہیں (القرطین ـ جلد ۱)۔ ابن فارس نے بھی کہا ہے کہ بعض اوقات رَجَاءٌ کا لفظ بول کر خوف کے معنی مراد لئے جاتے ہیں ۔ اَلْاِرْجَاءُ ۔ موخر کرنا ۔ کسی چیز کو پیچھے ہٹا دینا ۔ معاملہ کو ملتوی کرنا ۔ اَلرَّجَا ۔ کنارہ ۔ کنویں کا کنارہ ، اوپر سے نیچے تک *۔ طرف ۔ جمع اَرْجَاءٌ (۶۹/۱۷) ۔ مُرْجَوٌّ ۔ جس سے امیدیں وابستہ ہوں (۱۱/۶۲) ۔ مُرْجَوْنَ ۔ جنہیں انتظار میں رکھا جائے ۔ جن کا معاملہ تعویق میں ڈال دیا جائے ۔ (۹/۱۰۶) ۔ سورۃ شعراء میں ہے قَالُوْٓا اَرْجِہٗ (۲۶/۳۶) ۔ " انہوں نے کہا کہ اسکے معاملہ کو تاخیر میں ڈال دو " ۔ (نیز ۷/۱۱۱) ۔ سورۃ احزاب میں ہے تُرْجِیْ مَنْ تَشَآءُ مِنْهُنَّ وَتُؤْوِیْٓ اِلَیْكَ مَنْ تَشَآءُ (۳۳/۵۱)۔ یہاں تُرْجِیْ کے معنی ہیں پیچھے رکھنا ۔ الگ ہٹا دینا ۔ کنارے کی طرف ڈال دینا ۔ بمقابلہ تُؤْوِیْ ۔ اپنے پاس جگہ دینا ۔

---

*تاج ۔ **محیط ۔

ر خ ب

رَحُبَ الشَّيْءُ رَحْبًا ۔ وسیع ہونا ۔ اَرْحَبَهٗ ۔ اس نے اسے وسیع کر دیا ۔ ابن فارس نے بھی اس مادے کے بنیادی معنی وسعت اور کشادگی بتائے ہیں ۔ طَرِیْقٌ رَحْبٌ ۔ وسیع راستہ ۔ مَرْحَبًا بِکَ ۔ تو کشادہ جگہ میں آیا ہے ۔ تجھ سے یہاں وسعت اور کشادہ ظرف کا سلوک ہوگا ۔ رَحْبَةٌ ۔ مکان کا صحن *۔ قرآن کریم میں ہے وَضَاقَتْ عَلَیْکُمُ الْاَرْضُ بِمَا رَحُبَتْ (۹/۲۵)۔ '' زمین اپنی فراخیوں کے باوجود تم پر تنگ ہو گئی ''۔ سورۃ صٓ میں اہل جہنم کے متعلق ہے لَا مَرْحَبًا بِکُمْ (۳۸/۶۰)۔ '' تمہارے لئے کشادگی نہیں ''۔ تمہیں کوئی خوش آمدید نہیں کہتا ۔ یہ ہے جہنم کی زندگی جس میں کوئی ایک دوسرے کو دیکھکر خوش نہ ہو ۔ جہاں کوئی کسی آنے والے کو مرحبا نہ کہے ۔ جہاں نہ دل میں کشادگی ہو نہ نگاھوں میں وسعت ۔ نہ کسی کے لئے پیشانی خندہ ہو نہ لب متبسم ۔ اگر ہوں بھی تو محض دکھاوے کے لئے ۔ دل میں ہر ایک ، دوسرے کیلئے کہے کہ لَا مَرْحَبًا بِکُمْ ۔ یہ مصیبت کہاں سے آگئی ؟

ر ح ق

رَحِیْقٌ ۔ خالص پرانی ، عمدہ خوشبو والی ، بہترین شراب ۔ وہ شراب جس میں کسی قسم کی آمیزش نہ ہو ۔ اسی جہت سے ہر خالص شے کو رَحِیْقٌ کہتے ہیں ۔ مثلاً حَسَبٌ رَحِیْقٌ ۔ خالص حسب ۔ مِسْکٌ رَحِیْقٌ ۔ وہ مشک جس میں کچھ ملاوٹ نہ ہو*۔

قرآن کریم نے اہل جنت کے سلسلہ میں رَحِیْقٍ مَّخْتُوْمٍ (۸۳/۲۵) کہا ہے ۔ یعنی خالص مشروب ، اور پھر اسطرح محفوظ کیا ہوا کہ بعد میں بھی اس میں کسی قسم کی ملاوٹ کا امکان نہ رہے ۔ زندگی کی پاکیزہ سرور آور خوشگواریاں ۔

ر ح ل

اَلرَّحْلُ ۔ (جمع رِحَالٌ) ۔ کجاوہ ۔ ہر وہ چیز جسے اونٹ پر اسلئے باندھا جائے کہ اس پر سوار ہو کر سفر کیا جائیگا ۔ پھر یہ لفظ خود اونٹ کے لئے ، نیز جس چیز پر بیٹھا جائے ، یا جہاں اترا جائے ، نیز مکان کے لئے بولا جاتا ہے * اس لفظ کا اطلاق ان چیزوں پر بھی ہوتا ہے جن میں سامان وغیرہ رکھکر لادا جاتا ہے ۔ مثلاً خرجیں ۔ یا بوریاں *۔ سورۃ یوسف میں ہے فِیْ رِحَالِهِمْ (۱۲/۶۲)۔ '' ان کی بوریوں میں ''۔

---

* تاج و محیط ۔

آلرِّحْلَةُ۔ سفر*۔ نیز وہ جگہ جہاں کا انسان سفر کرے۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس مادہ کے بنیادی معنی سفر جاری رکھنے اور سفر کرتے رہنے کے ہیں۔ قرآن کریم میں ہے رِحْلَةَ الشِّتَاءِ وَالصَّيْفِ (۱۰۶/۲)۔ ''گرمی اور سردی کے سفر''۔ آلمَرْحَلَةُ۔ وہ مسافت جسے آدمی ایک دن میں عادۃً طے کر لیتا ہو*۔ منزل۔

رح م

رِحْمٌ و رَحِمٌ۔ بطنِ عورت کا وہ خانہ جسمیں بچہ پرورش پاتا ہے اور اس غلاف میں خارجی اثرات سے محفوظ رہتا ہے*۔ اس معنی میں رُحْمٌ بھی بولا جاتا ہے (راغب)۔ رَحْمَةٌ وہ عطیہ جو کسی کی ظاہر و باطن کمی کو پورا کر دے (اور جیسے ضرورت کے تقاضے کے مطابق دیا جائے)*۔ عطیہ کے معنے یہ ہیں کہ وہ چیز بغیر قیمت اور بلا مزد یا بے معاوضہ دی جائے۔ لہذا رَحْمَت وہ سامانِ نشو و نما ہے جو خدا کی طرف سے بلا معاوضہ ملتا ہے۔ سورۃ روم میں ہے وَ اِذَا آذَقْنَا النَّاسَ رَحْمَةً فَرِحُوْا بِهَا۔ وَ اِنْ تُصِبْهُمْ سَيِّئَةٌ بِمَا قَدَّمَتْ آيْدِيْهِمْ اِذَا هُمْ يَقْنَطُوْنَ (۳۰/۳۶) ''اور جب ہم لوگوں کو رحمت سے لطف اندوز کراتے ہیں تو وہ اس پر اترا جاتے ہیں۔ اور جب ان پر ان کے اپنے اعمال کی وجہ سے مصیبت آتی ہے تو وہ مایوس ہو جاتے ہیں''۔ یہاں رحمۃ بمقابلہ سیئۃ آیا ہے۔ لہذا اس سے مراد زندگی کی تمام خوشگواریاں مراد ہیں۔ لیکن اس سے اگلی آیت میں رزق کی بسط وکشاد کا ذکر ہے۔ اس سے ظاہر ہے کہ یہاں رحمۃ سے مراد رزق (سامان زیست) ہے جو خدا کیطرف سے بلا مزد و معاوضہ ملتا ہے۔ سورۃ بنی اسرائیل میں والدین کے سلسلہ میں اولاد کی آرزو بتائی گئی ہے کہ وَ قُلْ رَّبِّ ارْحَمْهُمَا كَمَا رَبَّيٰنِيْ صَغِيْرًا (۱۷/۲۴)۔ ''اے میرے رب تو ان کی نشو و نما کر جیسا انہوں نے مجھے اسوقت پالا تھا جب میں چھوٹا سا تھا''۔ سامانِ رزق جو بارش سے پیدا ہوتا ہے، یعنے فصلیں، رَحْمَت ہیں (۳۰/۴۶ و ۲۸/۴۲)۔ زندگی کی خوشگواریاں (نَعْمَاءُ) جو بلا معاوضہ ملتی ہیں، رَحْمَت ہیں۔ (۱۱/۹،۱۰)۔ قصہ حضرت موسیٰؑ میں ہے کہ دو یتیم بچوں کا خزانہ جو دیوار کے نیچے مدفون تھا، اسے اللہ کے حکم سے اسطرح محفوظ کر دیا گیا تھا کہ وہ انہیں بلوغت کے بعد ملے۔ اس خدائی انتظام کو رَحْمَت سے تعبیر کیا گیا ہے (۱۸/۸۲)۔

---

*تاج۔ **محیط۔

نیز رَحْمَةٌ کے معنے کسی کو ڈھانپ لینے اور سامانِ حفاظت بہم پہنچانے کے بھی ہوتے ہیں* - اسی لئے قرآن کریم میں ضَرَرٌ کے مقابلہ میں رَحْمَةٌ آیا ہے (۲۱/۱۰ و ۳۳/۴۴) اور سَیِّئَةٌ کے مقابلہ میں بھی (۳۰/۳۶) - اور اَهْلَكَ کے مقابلہ میں رَحِيمَ بھی (۶۷/۲۸) -

چونکہ خدا کی ربوبیت کے معنے صرف انسانی جسم کی نشو و نما نہیں بلکہ اس کے شرفِ انسانیت (انسانی ذات۔ Self) کی نشو و نما (Development) بھی ہے جو اُس ضابطۂ حیات کی رو سے ہوتی ہے جو وحی کے ذریعہ ملتا ہے، اسلئے وحی کو بھی رَحْمَت کہا گیا ہے - (۲/۱۰۵ و ۳۳/۴۲) - حقیقت یہ ہے کہ وحی کی راہ نمائی سب سے بڑا ذریعہ نشو و نما ہے جو یکسر وہبی طور پر ملتا ہے،اس لئے رحمتِ خصوصی ہے -

چونکہ خدا رَبُّ الْعَالَمِيْنَ ہے (یعنے تمام کائنات کو نشو و نما دینے والا اور نوع انسانی کی صلاحیتوں کی تکمیل کرنے والا) اس لئے اسنے سامانِ نشو و نما کا وہبی طور پر عطا کرنا اپنے ذمہ لے رکھا ہے - كَتَبَ رَبُّكُمْ عَلٰى نَفْسِهِ الرَّحْمَةَ (۶/۵۴)- ''تمہارے رب نے سامانِ نشو و نما کا بہم پہنچانا اپنے اوپر واجب قرار دے رکھا ہے،، - اسطرح وہ کائنات کی ہر شے کو اپنے دامنِ ربوبیت و پردۂ رحمت میں لئے ہوئے ہے (۴۰/۷) - اسی لئے سورۃ فاتحہ میں، رَبِّ الْعَالَمِيْنَ کے ساتھ ہی - اَلرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ - بھی آیا ہے (۱/۱-۲) - زبان کے قاعدے کے لحاظ سے رَحِيْمٌ کے معنے ہونگے عمومی طور پر مسلسل سامانِ نشو و نما بہم پہنچانے والا - اور رَحْمٰنٌ وہ جو کسی ہنگامی ضرورت کے [illegible] شدت اور غلبہ کے ساتھ سامانِ رحمت بہم پہنچائے**۔ اول الذکر طریق نشو و نما کا عام ارتقائی ذریعہ اور ثانی الذکر کو انقلابی ذریعہ کہا جا سکتا ہے۔ یا دَوْرِ حاضر کے علم الحیات (Biology) کی اصطلاح میں اول الذکر (Progressive Evolution) ہوگی - اور آخر الذکر فجائی ارتقاء (Emergent Evolution) - یہ فرق تھوڑی سی وضاحت چاہتا ہے - سورۃ الرحمٰن میں ہے يَسْئَلُهٗ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ - كُلَّ يَوْمٍ هُوَ فِيْ شَاْنٍ (۵۵/۲۹)- ارض و سمٰوٰت میں جو کچھ ہے (اپنی

---

* تاج- **المنار- رَحْمٰنٌ کا وزن فَعْلَانٌ ہے(جیسے عَطْشَانٌ- غَضْبَانٌ) اور رَحِيْمٌ کا وزن فَعِيْلٌ ہے (جیسے عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ وغیرہ) - فَعْلَانٌ ان صفات کے لئے آتا ہے جو شدید اور ہنگامی ہوں اور فَعِيْلٌ ان کے لئے جو لازم و ثابت ہوں -

نشو و نما کے لئے) خدا (کے ذرائع ربوبیت) کا محتاج ہے ۔ پھر، ان چیزوں کا یہ عالم نہیں کہ وہ ہمیشہ ایک ہی حالت پر رہتی ہیں اس لئے انہیں ایک ہی قسم کا سامانِ نشو و نما ملتا رہتا ہے ۔ یہ چیزیں ہر آن تغیر پذیر رہتی ہیں ۔ ان کی حالت میں ہر وقت تبدیلی پیدا ہوتی رہتی ہے ۔ اس لئے ان کی نشو و نما کے تقاضے بھی بدلتے رہتے ہیں ۔ رحم مادر کے اندر جنین کی نشو و نما کا تقاضا کچھ اور۔ بچے کی پرورش کا تقاضا کچھ اور۔ بڑے کی پرورش کا تقاضا کچھ اور۔ جب تک کوئی شے ایک حالت میں رہتی ہے، خدا کی صفت رحیمیت کے مطابق اس کی نشو و نما ایک انداز سے ہوتی جاتی ہے ۔ لیکن جونہی اس کی حالت بدلتی ہے اس کی صفتِ رحمانیت کے مطابق اس کی نشو و نما کے انداز و طریق میں بھی ہنگامی تبدیلی آجاتی ہے ۔ یوں عمومی ارتقاء اور ہنگامی ارتقاء کے قوانینِ خداوندی کے مطابق ہر شے اپنے نقطہ آغاز سے منزل تکمیل تک پہنچ جاتی ہے ۔ یہ ہے رب ۔ رحمٰن اور رحیم سے مراد ۔

رِحْمٌ کے اعتبار سے اس لفظ کا اطلاق قرابت (رشتہ داری) پر بھی کیا جاتا ہے*۔ چنانچہ کہا جاتا ہے ۔ بَيْنَهُمَا رِحْمٌ (ان دونوں کے درمیان قریبی قرابت داری ہے) ۔ اَرْحَامٌ ۔ رِحْمٌ کی جمع ہے (۳/۵) یعنی رحم مادر۔ نیز اسکے معنے رشتہ داری کے آتے ہیں ۔ (۳/۱)۔ نیز (۳/۱)۔ اُولُوالاَرْحَامِ کے معنے رشتہ داروں کے ہیں (۸/۷۵) ۔

چونکہ رِحْمٌ میں نرمی ہوتی ہے اسلئے یہ لفظ سختی کے مقابلہ میں نرمی کیلئے بھی استعمال ہوتا ہے ۔اَشِدَّاءُ عَلَى الْكُفَّارِ رُحَمَاءُ بَيْنَهُمْ (۴۸/۲۹) ۔ مخالفین کے مقابل میں سخت اور باہمدگر بہت نرم ۔ سورۃ کہف میں اَقْرَبَ رُحْمًا (۱۸/۸۱) آیا ہے ۔ اس کے معنی ہیں رشتے داری کا زیادہ پاس کرنے والا ۔ لیکن ابن فارس نے اَلرُّحْمُ اور اَلرُّحْمَةُ ہم معنے بتائے ہیں۔ اس لحاظ سے اس آیت کا مفہوم یہ ہوگا کہ زیادہ مہربان اور ہمدردی کرنے والا ، نرم خواور و فا کیش۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی رقت (نرمی) اور تعطف و میلان کے ہیں ۔

چونکہ عیسائیوں کا عقیدہ ہے کہ ہر انسانی بچہ (اپنے پہلے ماں باپ کے گناہ کی پاداش میں) گنہگار پیدا ہوتا ہے اور یہ گناہ عمل سے زائل نہیں ہوسکتا ، اس لئے ان کے نزدیک نجات صرف خدا کے رَحْم (Mercy) سے ملتی ہے ۔ رَحْم کا یہ تصور غیر قرآنی ہے ۔ قرآن کریم کی رو سے فلاح و فوز (کامیابی و کامرانی) اعمالِ صالحہ کا فطری نتیجہ ہے اور یہ سب کچھ خدا

*تاج ۔

کے مقرر کردہ قانون کے مطابق ہوتا ہے جسے قانونِ مکافات عمل کہتے ہیں ۔ اس قانون کا بنیادی اصول یہ ہے کہ لَیْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَا سَعٰی (۵۳/۳۹)۔ انسان کو وہی کچھ ملتا ہے جس کے لئے وہ جد و جہد کرے ۔ البتہ اس سعی و عمل کے لئے ، انسان کو مختلف صلاحیتیں ، خارجی کائنات میں سامانِ نشو و نما اور عقل کی راہنمائی کے لئے وحی کی روشنی ، خدا کی طرف سے بلا مزد و معاوضہ ملتی ہے ، اس لئے یہ سب رَحْمَۃ میں داخل ہے ۔ یعنی یہ تمام نشو و نما خدا کی طرف سے مفت ملتا ہے ۔ اب جو شخص ان چیزوں سے فائدہ اٹھا کر خدا کے قانون کے مطابق اپنی ذات کی نشو و نما کرلیگا (جو ایک صحیح معاشرہ کے اندر دوسروں کی ربوبیت سے ہوتی ہے) وہ زندگی کی خوشگواریوں سے بہرہ یاب ہو جائیگا ۔ جو ایسا نہ کریگا ، وہ ان سے محروم رہ جائے گا ۔ اسے خدا کا قانون مکافات کہتے ہیں ۔ لہذا انسان اپنی منزلِ مقصود تک خدا کی (Grace) سے نہیں بلکہ اپنے اعمال کے نتائج کی رو سے ، خدا کے قانونِ مکافات کے مطابق پہنچتا ہے ۔ عیسائیت اور اسلام کا یہی وہ بنیادی فرق ہے جس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے علامہ اقبال نے کہا ہے کہ

آں بہشتے کہ خدائے بتو بخشد همه هیچ

تا جزائے عملِ تست ، چناں چیزے هست

اسی بنیادی تصور سے قرآن کریم ایسی قوم تیار کرتا ہے جو اپنی جنت کے گل و لالہ اپنے خونِ جگر سے کھلاتی ہے ۔ اور اپنا جہانِ نو خدا کے قانونِ مکافات کے مطابق اپنی قوت بازو سے پیدا کرتی ہے ۔

ر خ و

اَلرِّخْوُ ۔ نرم چیز ۔ رَخُوَ الشَّیْءُ وَ رَخِیَ ۔ رَخَاً ۔ کسی چیز کا نرم یا ڈھیلا ہو جانا ۔ اِسْتَرْخٰی کے بھی یہی معنی ہیں ۔ اَرْخَاہُ ۔ رَاخَاہُ ۔ اسنے اسکو نرم کردیا اَرْخٰی دَابَّتَہٗ : اسنے اپنے جانور کی لگام ڈھیلی چھوڑ دی اور اسے اسکی حسب مرضی چلنے دیا ۔ اَلرُّخَاءُ ۔ نرم رفتار ہوا * ۔ قرآن کریم میں ہے تَجْرِیْ بِاَمْرِہٖ رُخَاءً (۳۸/۳۶)۔ وہ (ہوا) اُس کے حکم سے نرمی اور سبک رفتاری اور آزادی سے چلتی تھی ۔ فَرَسٌ رِخْوَۃٌ* ۔ سبک رفتار اور نرم خو گھوڑے کو کہتے ہیں* ۔

ر د أ

اَلرِّدْءُ ۔ بھاری بوجھ جو ایک دوسرے کے ہم وزن ہوں ۔ رَدَاَ الشَّیْءَ بِہٖ ۔ اس نے کسی چیز کے ذریعے کسی چیز کو سہارا دیا ۔ تقویت

* تاج و راغب و محیط ۔

دی ۔ مددگار بنایا ۔ اصل میں اَلرِّدْءُ مددگار، معین اور ناصر کو کہتے ہیں *۔ جب کسی جانور پر اسطرح بوجھ لادا جائے کہ اسکے دونوں طرف کے بوجھ ہم وزن ہوں تو ان میں سے ہر ایک کو رِدْءٌ کہتے ہیں ۔ وہ اسطرح ایک دوسرے کا سہارا بنتے ہیں *۔

قرآن کریم میں ہے فَاَرْسِلْهُ مَعِيَ رِدْاً (۲۸/۳۴)۔ ''اسے میرے ساتھ مددگار بنا کر بھیجدے''۔

رَدِیٌّ ۔ پیچھے پیچھے آنے والے کو کہتے ہیں لیکن بعد میں اسے مذموم شے کیلئے استعمال کرنے لگ گئے ** (کیونکہ عموماً پیچھے لگنے والی چیز اگلی سے کمتر ہوتی ہے)۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے دو بنیادی معنی ہیں جو ایک دوسرے سے متبائن ہیں (۱) کسی چیز کا خراب یا ردی ہو جانا ۔ اور (۲) مدد کرنا ۔

ر د د

رَدَّ ۔ یَرُدُّ ۔ کسی کو لوٹا دینا ۔ واپس کر دینا ۔ رَدَّهٗ عَنِ الْاَمْرِ ۔ اسنے اسے اس بات سے لوٹا دیا ۔ رَدَّ کے بعد اگر عَلٰی آئے تو اس میں تحقیر اور اہانت کا پہلو ہوتا ہے ۔ مثلاً رَدَّ عَلَيْهِ الشَّیْءَ ۔ اس نے اسکی چیز قبول نہ کی اور حقارت کے ساتھ اسے واپس کر دیا ۔ لیکن اگر اسکے بعد اِلٰی ہو تو اسمیں عزت و اکرام کا پہلو ہوتا ہے ۔ فَرَدَدْنٰهُ اِلٰی اُمِّهٖ (۲۸/۱۳) ہم نے موسٰی کو اسکی ماں کی طرف (عزت و اکرام کے ساتھ) واپس کر دیا ۔ (لیکن یہ قاعدہ کلیہ نہیں) اَلرَّدُّ ۔ ردی شے ۔ دِرْهَمٌ رَدٌّ ۔ کھوٹا سکہ ۔ لَامَرَدَّةَ فِيْهِ ۔ اسمیں کوئی فائدہ (Return) نہیں ۔ اِرْتَدَّ الشَّیْءُ ۔ چیز واپس ہو گئی، پلٹ گئی ۔ * راغب نے لکھا ہے کہ الارْتِدَادُ اسی راستہ پر پلٹنے کو کہتے ہیں جس سے کوئی آیا ہو**۔ تَرَدَّدَ اِلَيْهِ ۔ وہ اسکے پاس بار بار آیا گیا ۔ یہیں سے تَرَدَّدَ فِی الْاَمْرِ کے معنے ہیں کسی معاملہ میں مذبذب رہنا اور کسی فیصلہ تک نہ پہنچ سکنا **۔ سورۃ بقرہ میں ہے وَبُعُوْلَتُهُنَّ اَحَقُّ بِرَدِّهِنَّ (۲/۲۲۸) ان کے خاوندوں کا زیادہ حق ہے کہ انہیں واپس لے لیں ۔ سورۃ الشوریٰ میں ہے یَوْمٌ لَا مَرَدَّ لَهٗ (۴۲/۴۷) وہ دن جو آ کر پھر واپس نہیں جائیگا ۔ جسے ٹالا نہیں جا سکیگا ۔ (۱۹/۷۶) میں خَيْرٌ مَّرَدًّا آیا ہے ۔ اس کے معنی ہیں انجام کار کے لحاظ سے نفع بخش ۔ سورۃ شوریٰ میں ہے هَلْ اِلٰی مَرَدٍّ مِّنْ سَبِيْلٍ (۴۲/۴۴) ۔ ''کیا اسکے واپس چلے جانے کی کوئی سبیل ہو سکتی ہے''؟ [فَرَدُّوْا اَيْدِيَهُمْ فِیْ اَفْوَاهِهِمْ (۱۴/۹) کیلئے

* تاج ۔ **راغب ۔

دیکھئے عنوان ی ۔ د ۔ ی] اس لفظ میں ماٰل اور انجام کار کا پہلو پوشیدہ ہوتا ہے ، اسلئے اعمال کے نتائج کے لئے اس کا استعمال عام طور پر ہوتا ہے۔

سورۃ حٰمٓ السجدہ میں ہے اِلَیْهِ یُرَدُّ عِلْمُ السَّاعَةِ (۴۱/۴۷) انقلاب کس وقت آئیگا ' اسکا علم خدا ہی کیلئے مخصوص ہے ۔ اس کا علم اُسی سے متعلق ہے ۔ اُسی کی طرف لوٹ کر جاتا ہے ، اور کسی کی طرف نہیں جاتا ۔ اور کسی کو اس کا علم نہیں ہو سکتا ۔ اوروں کو صرف قیاس اور اندازہ ہو سکتا ہے ۔ (نیز دیکھئے عنوان س ۔ و ۔ ع)

مَرْدُوْدٌ ۔ واپس کیا ہوا ، لوٹایا ہوا (۷۹/۱۰)۔ سورۃ ہود میں ہے عَذَابٌ غَیْرُ مَرْدُوْدٍ (۱۱/۷۶)۔ جسے واپس نہ کیا جا سکے ۔ جو آ کر رہے۔

سورۃ نحل میں ایک آیت ہے جو قرآنی نظام ربوبیت کے بنیادی اصولوں میں سے ہے ۔ اس میں اللہ تعالیٰ نے کہا ہے کہ مختلف افراد میں اکتساب رزق کی مختلف استعداد ہوتی ہے [اسکا مقصد ۴۳/۳۲ میں بیان کیا گیا ہے ۔ یعنی اس سے معاشرہ کے چھوٹے بڑے، ہر قسم کے کام چلتے رہتے ہیں دیکھئے عنوان س ۔ خ ۔ ر] لیکن اس کے یہ معنے نہیں کہ جن لوگوں کو یہ استعداد زیادہ ملی ہے وہ اسکے ماحصل (رزق) کو اپنے ہی لئے مخصوص کر لیں ۔ یعنی وہ یہ سمجھ لیں کہ چونکہ یہ ہماری ہنر مندیوں سے حاصل ہوا ہے اسلئے ہم ہی اسکے مالک ہیں ۔ یہ غلط ہے ۔ فَمَا الَّذِیْنَ فُضِّلُوْا بِرَآدِّیْ رِزْقِهِمْ عَلٰی مَا مَلَکَتْ اَیْمَانُهُمْ فَهُمْ فِیْهِ سَوَآءٌ (۱۶/۷۱) ۔ ” جن لوگوں کو یہ استعداد زیادہ ملی ہے وہ اپنے رزق کو اپنے زیردستوں کیطرف نہیں لوٹاتے (اس ڈر سے کہ) اسطرح یہ سب اس میں برابر کے شریک ہو جائیں گے“؟ بِرَآدِّیْ کا لفظ غور طلب ہے ۔ یہ نہیں کہا کہ انہیں بطور خیرات کے دیدیں ۔ کہا یہ ہے کہ یہ فالتو رزق ، درحقیقت اُن کیلئے ہے جو ان کی ماتحتی میں کام کرتے ہیں اور جنہیں اسکی ضرورت ہے، اسلئے جسکے لئے یہ ہے اُسی کی طرف اسے لوٹا دینا چاہیئے ۔ اگر تم ایسا نہیں کرتے تو اسکے معنے یہ ہیں کہ تم اس سے انکار کرتے ہو کہ کمانے کی استعداد اور رزق کے اسباب و ذرائع خدا کی نعمتیں ہیں جو اسکی طرف سے مفت ملی ہیں ۔ اَفَبِنِعْمَةِ اللّٰهِ یَجْحَدُوْنَ (۱۶/۷۱)۔ ”کیا یہ لوگ جو اپنی زائد از ضرورت دولت کو ان کی طرف نہیں لوٹاتے جنہیں اسکی ضرورت ہے ، خدا کی نعمت سے انکار کرتے ہیں“ ؟ یہ ہے قرآن کریم کا سوشل آرڈر ۔ عمرانی اور معاشی نظام ۔ (اسکی تفصیل میری کتاب ” نظام ربوبیت ،، میں ملیگی)۔

ر د ف

اَلرِّدْفُ ۔اَلرَّدِیْفُ۔ سوار کے پیچھے جو دوسرا شخص سوار ہو وہ اس کا رَدِیْفُ یا رِدْفُ کہلاتا ہے ۔ ایسے ہی ہر وہ چیز جو کسی دوسری چیز کے پیچھے ہو۔ رَدِفَہٗ و رَدَفَہٗ ۔ اس کے پیچھے پیچھے ہونا* ۔ قرآن کریم میں ہے عَسٰۤی اَنْ یَّکُوْنَ رَدِفَ لَکُمْ (۲۷/۷۲) ۔ ''ہوسکتا ہے کہ وہ تمہارے پیچھے آرہی ہو'' ۔تمہارے بالکل قریب ہو۔ ساتھ لگی ہوئی ہو۔ اس کا مطلب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ وہ تمہارے پیچھے لگ بھی چکی ہو۔

مُرْدِفٌ ۔ اپنے پیچھے کسی کو سوار کرنے والا نیز کسی کے پیچھے لگنے والا* ۔ مِنَ الْمَلٰٓئِکَۃِ مُرْدِفِیْنَ (۸/۹) ۔ ''یکے بعد دیگرے مسلسل آنے والے'' ۔ راغب نے کہا ہے کہ اَلْمُرْدِفُ اگلے سوار کو کہتے ہیں جو اپنے پیچھے دوسرے شخص کو بٹھالے**۔ رَادِفٌ ۔ پیچھے (یا قریب) آنے والا ۔ تَتْبَعُھَا الرَّادِفَۃُ (۷۹/۷) ۔ ''پیچھے آنے والی اس کے پیچھے آئیگی''۔ یعنی جزا و سزا کی ساعت ۔ خدا کا قانون مکافات ۔ ظہور نتائج کا وقت ۔ ہر عمل کا نتیجہ جو اسکے پیچھے لگا رہتا ہے ۔

ر د م

اَلرَّدْمُ ۔ کسی خلا یا شگاف کو بند کردینا ۔ سَدٌّ بھی اس کا مترادف ہے ۔ لیکن رَدْمٌ میں سَدٌّ سے کچھ زیادہ مضبوطی پائی جاتی ہے ۔ رَدَمَ الْبَابَ ۔ دروازہ بند کر دینا ۔ اسکا ایک تہائی حصہ بند کردینا*** ۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی کسی شگاف کے بند کردینے کے ہوتے ہیں ۔ سورۃ کہف میں ہے اَجْعَلْ بَیْنَکُمْ وَ بَیْنَھُمْ رَدْمًا (۱۸/۹۵) ۔ اس سے پہلی آیت میں سَدًّا کہا گیا ہے (۱۸/۹۴) ۔ یعنی اس قوم نے ذوالقرنین سے کہا کہ ہمارے لئے ایک روک سی (سَدًّا) بنا دے ۔ اس نے کہا کہ روک سی کیوں! میں تمہارے لئے اچھی خاصی اونچی دیوار (رَدْمٌ) بنائے دیتا ہوں ۔

ر د ی

رَدَیَ و تَرَدّٰی ۔ (فِی الْبِئْرِ) وہ کنوئیں میں گر پڑا (اس معنی میں رَدَیَ کے ساتھ رَدِیَ بھی بولاجاتا ہے)۔نیزپہاڑ سے گر کر مر گیا* ۔ مَا یُغْنِیْ عَنْہُ مَالُہٗۤ اِذَا تَرَدّٰی (۹۲/۱۱) ۔ جب وہ تباہیوں کے جہنم میں سر کے بل

---

* تاج ۔ **راغب ۔ ***تاج و راغب ۔

گریگا تو اس کا جمع کردہ مال اس کے کسی کام نہ آسکیگا۔ راغب نے کہا ہے کہ تَرَدّٰی کے معنے ہیں اپنے آپ کو تباہیوں کے سامنے پیش کر دینا۔ یعنی جو شخص مال سمیٹ کر رکھتا ہے اور اسے انسانیت کی بہبود کے لئے کھلا نہیں رکھتا وہ تباہیوں کو آواز دیکر اپنے گھر بلاتا ہے۔اَلْمُتَرَدِّیَۃُ۔ اس جانور کو کہتے ہیں جو گر کر مرجائے۔ اسے قرآن کریم نے حرام قرار دیا ہے (۵/۳)۔ اس کے بعد اس لفظ کے معنے عام ہلاکت کے بھی لئے جاتے ہیں۔ رَدِیَ فُلَانٌ۔ وہ ہلاک ہو گیا۔ فَھُوَرَدٍ۔ وہ ہلاک ہونے والا ہے۔ اَرْدَاہُ غَیْرُہٗ۔ اسے کسی نے ہلاک کر دیا**۔اَلرَّدٰی۔ تباہی بربادی۔ ہلاکت*۔ (اَلرِّدَاءُ۔چادر)۔ سورۃ طٰہٰ میں ہے فَتَرْدٰی(۲۰/۱۶)۔ تو ہلاک ہوجائے۔ سورۃ حٰمٓ السجدہ میں ہے اَرْدَاکُمْ (۴۱/۲۳)۔ اس کے معنے تباہ و برباد کر دینا ہیں۔ اَلْمِرْدٰی۔ پھینکے ہوئے پتھر کو کہتے ہیں**۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس مادہ میں بنیادی معنی پھینکنے کے ہوتے ہیں۔ ابن فارس نے اَلتَّرَدِّی کے معنے لاابالی پن سے کسی ہلاکت گاہ میں گر جانا بھی لکھے ہیں۔ رَادٰی عَنِ الْقَوْمِ کے معنے ہیں اس نے قوم کی مدافعت میں پتھر پھینکے**۔ (رِدْءٌ ۔ کے لئے عنوان دیکھئے ر د ا)۔

ر ذ ل

اَلرَّذْلُ ۔ وہ چیز جس سے اس کے ردی اور نکما ہونے کی وجہ سے بے رغبتی کی جائے*۔ اَلرَّذْلُ ۔ اَلرُّذَالُ ۔ اَلرَّذِیْلُ ۔ وہ آدمی جو دوسروں سے کمتر درجہ کا ہو۔ حقیر اور کم مرتبہ انسان**۔ نیز ردی اور نکمی چیز جس میں سے اچھی چیزیں نکال لی گئی ہوں***۔

اَلْاَرْذَلُ ۔ بہت زیادہ حقیر گھٹیا اور نکما۔ اس کی جمع اَرْذَلُوْنَ اور اَرَاذِلُ آتی ہے۔ قرآن کریم میں ہے کہ قوم نوح کے سرداروں نے حضرت نوحؑ سے کہا تھا کہ جو لوگ تیری جماعت میں شامل ہوئے ہیں ''ھُمْ اَرَاذِلُنَا'' (۱۱/۲۷)۔ وہ ہمارے معاشرے کے حقیر اور رذیل لوگ ہیں۔

اَرْذَلِ الْعُمُرِ (۱۶/۷۰) عمر کا ردی حصہ۔ بڑھاپے کا وہ حصہ جس میں حالت یہ ہوجاتی ہے کہ لَا یَعْلَمَ بَعْدَ عِلْمٍ (۱۶/۷۰)۔ انسان ان چیزوں کو بھی بھول جاتا ہے جن کا اسے پہلے علم ہوتا ہے۔ حافظہ جاتا رہتا ہے۔

* راغب۔ ** تاج۔ *** محیط۔

ر ز ق

رِزْقٌ - ہر وہ چیز جس سے نفع اٹھایا جائے - یا جو غذا خدا کی طرف سے ذی حیات کو بطور سامان نشو و نما ملے - بارش کو بھی رِزْقٌ کہتے ہیں اور مقررہ آمدنی کو بھی - چنانچہ مُرْتَزِقَةٌ ان لوگوں کو کہتے ہیں جن کی تنخواہیں یا راشن اور روزینے مقرر ہوں - نیز رَزْقَةٌ اس سامان خوراک کو کہتے ہیں جو فوجی کو بطور راشن دیا جاتا ہے* - ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی ہیں کسی چیز کو وقت مقرر پر دینا - اسکے بعد بلا قید وقت ہر عطیہ پر اس کا اطلاق ہونے لگ گیا -

قرآن کریم نے تمام کھانے پینے کی چیزوں کو رِزْقُ اللّٰہِ (۲/۶۰) کہا ہے - سورۃ حجر میں مَعَایِشَ اور رِزْقٌ ہم معنی استعمال ہوئے ہیں - (۱۵/۲۰) - لیکن چونکہ قرآن کریم کے نزدیک انسان کی زندگی صرف طبعی زندگی نہیں بلکہ زندگی موت کے بعد بھی مسلسل آگے چلتی ہے اس لئے اس کے نزدیک سامان نشو و نما کی ضرورت صرف طبعی جسم کی پرورش ہی کے لئے نہیں بلکہ انسانی ذات کی نشو و نما کے لئے بھی ہے - اس لئے قرآن کریم نے مرنے کے بعد انسانی ذات کی نشو و نما کے اسباب و ذرائع کو بھی رِزْقٌ سے تعبیر کیا ہے (۲۲/۵۸) - اس سے یہ بھی واضح ہے کہ جنت زندگی کے ارتقائی منازل میں سے ایک منزل ہے - وہاں بھی انسانی ذات کی نشو و نما کا سلسلہ جاری رہے گا - (تفصیل ج - ن - ن کے عنوان میں ملیگی) -

لہذا رِزْقٌ سے مراد ہیں وہ تمام اسباب و ذرائع جن سے انسانی جسم اور اس کی ذات کی نشو و نما ہوتی جائے - حقیقت یہ ہے کہ اگر دنیا میں سامانِ زیست (ضروریات زندگی) کی تقسیم قانونِ وحی کے تابع ہو (جسے نظام ربوبیت کہتے ہیں) تو انسانی جسم کی نشو و نما اور اسکی ذات کی نمود و بالیدگی بلا مشقت ہوتی چلی جاتی ہے - یہ نظام ان لوگوں کے ہاتھوں متشکل ہوتا ہے جن کے متعلق فرمایا کہ وَ مِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ (۲/۳) - جو کچھ سامانِ نشو و نما ہم انہیں دیتے ہیں ، وہ اسے ربوبیتِ عامہ کے لئے کھلا رکھتے ہیں - اسے سمیٹ کر نہیں بیٹھ جاتے ، اور نہ ہی تالے لگا دیتے ہیں ، بلکہ اسے کھلا رکھتے ہیں (دیکھئے عنوان ن - ف - ق) - چونکہ یہ نظام قانونِ خداوندی کے تابع متشکل ہوتا ہے اس لئے اس نظام کی وساطت سے تقسیم رزق کے متعلق

*تاج -

اللہ نے کہا ہے کہ یہ رزق ہماری طرف سے ملتا ہے ۔ نَحْنُ نَرْزُقُکُمْ وَاِیَّاھُمْ (٦/١٥١ و ١٧/٣١)۔ ”ہم تمہیں بھی رزق دیتے ہیں اور تمہاری اولاد کو بھی“ ۔ اس طرح خدا کی یہ ذمہ داری کہ وہ ہر متنفس (چلنے والے) کو رزق دیتا ہے (١١/٦) بطریق احسن پوری ہوتی چلی جاتی ہے ۔ ورنہ (اگر ایسا معاشرہ قائم نہ ہو اور رزق کی تقسیم انسانوں کے خود ساختہ نظام کی رو سے ہو تو جیسا کہ ہم دیکھتے ہیں) لاکھوں انسان بھوک سے مرجاتے ہیں اور کروڑوں ایسے ہیں جنہیں پیٹ بھر کر کھانے کو نہیں ملتا ۔ غلط معاشرہ میں رزق کی ذخیرہ اندوزی شروع ہو جاتی ہے اور نچلے طبقہ کے لوگ نشو و نما سے محروم رہ جاتے ہیں ۔ صحیح (قرآنی) معاشرہ میں رزق کے سر چشمے تمام ضرورتمندوں کے لئے یکساں طور پر کھلے رہتے ہیں (٤١/١٠) ۔ اس لئے کہ جو کچھ زمین سے پیدا ہوتا ہے اس میں انسان کی صرف محنت (Labour) ہوتی ہے ۔ باقی سب کچھ قانونِ خداوندی کے مطابق ہوتا ہے ۔ لہذا انسان صرف اپنی محنت کے ماحصل کا حقدار ہے ۔ باقی سب کچھ خدا کا ہے اور اسے اس کے احکام کے مطابق تقسیم ہو جانا چاہئے ۔ (٥٦/٦٣-٦٤) ۔ (تفصیلِ ان امور کی میری کتاب نظام ربوبیت میں ملیگی جس میں قرآنی معاشرہ میں تقسیم رزق کے اہم مسئلہ کے مختلف پہلوؤں سے بحث کی گئی ہے ۔) بہر حال اسے ایک مرتبہ پھر سن رکھنا چاہئے کہ جو حکومت قوانین خداوندی کو نافذ کرنے کے لئے قائم ہوتی ہے (اسے اسلامی حکومت کہتے ہیں) اس کا بنیادی منشور یہ ہوتا ہے کہ تمام افراد مملکت کی بنیادی ضروریات زندگی (سامان رزق) بہم پہنچانے کی ذمہ داری مملکت کے سر ہے ۔ اس نظام میں ، رزق کے سرچشمے افراد کی ملکیت میں رہنے کے بجائے اُمت کی تحویل میں رہتے ہیں اور فاضلہ دولت بھی کسی کے پاس نہیں رہتی ۔ یعنی اس میں ہر شخص پوری محنت سے کام کرتا ہے ۔ اپنی محنت کے ماحصل میں سے اپنی ضروریات کے مطابق رکھکر باقی سب دوسروں کی پرورش کے لئے عام کر دیتا ہے ۔ یوں مملکت ہر فرد کے رزق کی ذمہ داری سے عہدہ برا ہوتی ہے ۔ خدا کے دئے ہوئے رزق کی، خدا کے بندوں کی ضروریات کے مطابق تقسیم ، یہ ہے اسلامی حکومت کا بنیادی مقصد ۔

سورۃ واقعہ میں ہے وَتَجْعَلُوْنَ رِزْقَکُمْ (٥٦/٨٢)۔ راغب نے کہا ہے کہ یہاں اس کے معنے تَصِیْبٌ* یعنے حصہ کے ہیں** ۔ لیکن اس کے صاف معنی یہ ہیں کہ تم قرآن جیسی کتاب کو اس لئے جھٹلاتے ہو کہ اس سے تمہاری روٹی چلتی رہے !

**راغب ۔

ر س خ

رَسَخَ - یَرْسَخُ - رُسُوْخاً - کسی چیز کا اپنے مقام پر محکم اور جائے گیر ہو جانا - رَسَخَ الْمَطَرُ - بارش کا پانی زمین میں جذب ہو گیا *- یہ اسوقت بولینگے جب بارش کا پانی اس حد تک زمین کے اندر چلا جائے کہ وہ زمین کی نمی سے جا ملے -

قرآن کریم میں اَلرَّاسِخُوْنَ فِی الْعِلْمِ آیا ہے (۳/۷) - اسکے معنے ہونگے وہ لوگ جو علم میں پختگی حاصل کر لیں اور علم کی تہہ میں اتر جائیں - راغب نے کہا ہے کہ رَاسِخٌ فِی الْعِلْمِ وہ ہے جو علم میں اس حد تک تحقیق کر چکا ہو کہ اسکا کوئی شبہ باقی نہ رہا ہو**-

قرآن کریم اپنی دعوت علی وجہ البصیرت پیش کرتا ہے اور اسے غور و فکر اور علم و تحقیق کی رو سے ماننے کی تلقین کرتا ہے - لہذا رَاسِخٌ فِی الْعِلْمِ وہ شخص ہے جو اپنی تحقیق کی رو سے یقینی نتائج تک پہنچ جائے اور اسطرح اسکا ایمان علی وجہ البصیرت محکم ہو جائے - (آیت ۳/۷ کے مفہوم کے لئے، عنوان ح - ک - م کے تحت، محکمات و متشابہات کی بحث دیکھئے)-

ر س س

اَلرَّسُّ - کھودنا - دبا دینا - یہیں سے میت کے دفن کرنے کو بھی رَسٌّ کہتے ہیں - پرانا کنواں خواہ پختہ ہو یا نہو - نیز اَلرَّسُّ کسی چیز کی ابتدا کو بھی کہتے ہیں - رَسُّ الْحُمّٰی وَ رَسِیْسُہٗ - بخار کی ابتدائی علامات - جیسے انگڑائیاں آنا *- راغب نے کہا ہے کہ اسکے معنے اس تھوڑے سے اثر کے ہوتے ہیں جو کسی چیز میں موجود ہوتا ہے **- اَھْلُ الرَّسِّ - ان لوگوں کو کہتے ہیں جو ابتداءً خود ہی کوئی جھوٹ گھڑیں اور پھر اسکی تشہیر کریں - یہ دراصل رَسَّ بَیْنَ الْقَوْمِ سے ماخوذ ہے جسکے معنے فساد اور عداوت پیدا کرنے کے ہوتے ہیں *- ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے معنی جم جانے کے ہیں -

قرآن کریم میں اَصْحَابُ الرَّسِّ (۲۵/۳۸) عاد اور ثمود کے ساتھ کسی سابقہ قوم کے لئے آیا ہے - اسکے متعلق، لغت میں بہت سے اقوال ہیں - ایک قول یہ ہے کہ اَلرَّسُّ ایک وادی کا نام ہے - ممکن ہے اس وادی میں کوئی پرانا کنواں ہو جس سے اسکا نام ایسا مشہور ہو گیا ہو - ** لیکن اگر معنوی

* تاج - ** راغب -

خصوصیت مراد لی جائے تو اس سے مراد یہ ہوگی کہ وہ قوم غلط باتیں وضع کرکے لوگوں میں فساد ڈلوایا کرتی تھی۔ یا ایسی قوم تھی جس میں انکے نبی کی تعلیم کا یونہی سا اثر باقی رہ گیا تھا۔

ر س ل

رِسْلٌ کے اصلی معنے ہیں (کسی چیز کے سامنے جو رکاوٹ ہو اس کا دور ہو جانا اور اسطرح اس کا) اطمینان اور نرمی وسکون کے ساتھ چل پڑنا۔* چنانچہ نَاقَۃٌ رَسْلَۃٌ۔ نرم رفتار اونٹنی کو کہتے ہیں۔ اِبِلٌ مَرَاسِیْلُ۔ نرم رفتار اونٹوں کو۔ اسی سے رَسُوْلٌ ہے، جس کے معنے ہیں چل پڑنے والا، روانہ ہونے والا۔ پھر کبھی صرف نرمی اور سکون کے لحاظ سے علٰی رِسْلِکَ کہہ دیتے ہیں، یعنی تم اپنے حال پر سکون اور اطمینان سے جسطرح جی چاہے رہو۔ اور کبھی صرف چل پڑنے کے لحاظ سے رَسُوْلٌ کہدیا جاتا ہے*۔ نرمی کے اعتبار سے اَلتَّرَسُّلُ۔ نرم رفتار کو کہتے ہیں۔ اَلْاِسْتِرْسَالُ کے معنے ہیں جانور کی رفتار میں آہستگی **

ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی انبعاث ہیں۔ یعنی چل پڑنا۔ اسی اعتبار سے جماعت اور گلّہ کو اَلرَّسَلُ کہتے ہیں۔ جَاءَتِ الْخَیْلُ اَرْسَالًا۔ گھوڑے ٹکڑی ٹکڑی آئے**۔ (اس میں تسلسل کا پہلو بھی ہے)۔ اَلْاِرْسَالُ۔ (کسی کی طرف) بھیجنا۔ اَرْسَلَہٗ عَلَیْہِ۔ اسنے اسے کسی پر مسلط کر دیا۔ اَلرَّسُوْلُ۔ جو شخص خدا کی طرف سے بندوں کی طرف بھیجا جائے۔ خود وہ شخص بھی رَسُوْلٌ کہلاتا ہے اور اسکا پیغام بھی رَسُوْلٌ کہلاتا ہے۔ یعنی لفظ رَسُوْلٌ۔ رِسَالَۃٌ اور مُرْسَلٌ دونوں معنوں میں آتا ہے**۔ یعنی پیغام اور جسے پیغام دیکر بھیجا گیا ہو،وہ۔ اَلتَّرْسِیْلُ فِی الْقِرَاءَۃِ کے معنی ہوتے ہیں آہستہ آہستہ سنوار کر پڑھنا**۔ لہذا اَلرَّسُوْلُ کے معنی ہوئے جو شخص اپنے بھیجنے والے کی طرف سے مسلسل، بتدریج، نہایت نرم روی سے پیغام دے۔ نیز خود اسکا پیغام بھی اَلرَّسُوْلُ ہے۔

وہ حضرات جنہیں خدا کی طرف سے وحی ملتی ہے اور اس وحی کو وہ انسانوں تک پہنچاتے ہیں خدا کے رسول کہلاتے ہیں۔ قرآن کریم نے انہیں اَنْبِیَاءٌ بھی کہا ہے اور رُسُلٌ بھی۔ نبی اور رسول میں کوئی فرق نہیں ہوتا۔ یہ ایک ہی ذات کے دو منصب ہیں۔ نبوت خدا کی طرف سے وحی کا

* راغب۔ ** تاج۔ *** محیط۔

ملتا ہے اور رسالت اس وحی کا آگے پہنچانا ۔ نہ نبوت بغیر رسالت کے ہوسکتی ہے اور نہ رسالت بغیر نبوت کے ۔ (تفصیل اس اجمال کی ن۔ب۔ا کے تحت ملیگی جہاں یہ بتایا گیا ہے کہ یہ جو کہا جاتا ہے کہ رسول صاحب شریعت ہوتا ہے اور نبی بلاشریعت ، یہ خیال غیر قرآنی ہے ۔ قرآن کریم نے رسول اور نبی میں اس قسم کی کوئی تخصیص نہیں کی ۔ ہر نبی صاحب کتاب تھا (۲/۲۱۳) اور ہر رسول بھی (۵۷/۲۵)

جیسا کہ اوپر کہا گیا ہے ، رسول کا فریضہ یہ ہے کہ وہ خدا کے پیغامات جو اسے بذریعہ وحی ملتے ہیں انسانوں تک پہنچائے ۔ حضرت نوح ؑ نے اپنی قوم سے کہا تھا کہ میں خدا کیطرف سے رسول ہوں ۔ اُبَلِّغُکُمْ رِسٰلٰتِ رَبِّیْ (۷/۶۲) ۔ "میں اپنے نشوونما دینے والے کے پیغامات تم تک پہنچاتا ہوں" ۔ نبی اکرم ؐ کے متعلق ہے بَلِّغْ مَآ اُنْزِلَ اِلَیْکَ مِنْ رَّبِّکَ (۵/۶۷) ۔ "جو کچھ تیرے نشوونما دینے والے کی طرف سے تیری طرف نازل ہوا ہے اسے دوسروں تک پہنچا دے" ۔ لہٰذا رسول اللہ ؐ کو جو کچھ خدا کی طرف سے ملا تھا آپ اسے خود اُمت کو دیکر گئے تھے ۔ اسے دوسروں پر نہیں چھوڑا تھا ۔

رسول ، جنہیں انسانوں تک پیغام پہنچانے کے لئے چنا جاتا تھا ، انسان ہوتے تھے (۱۸/۱۱۰) اور انسانوں میں سے بھی مرد (۱۶/۴۳ ؛ ۱۲/۱۰۹ ؛ ۲۱/۷) ۔ رسول سب سے پہلے خود اپنی وحی پر ایمان لاتا تھا کہ وہ من جانب اللہ ہے اور صداقتوں سے معمور (۲/۲۸۵) اور سب سے پہلے اس پر عمل پیرا ہوتا تھا ۔ یعنی اس جماعت کا سب سے پہلا رکن ہوتا تھا جسے وہ قوانین خداوندی کی اطاعت اور نظام خداوندی کی تشکیل کے لئے وجود میں لاتا تھا (۳۰/۶۶) ۔ وہ خود بھی اپنی وحی کا اتباع کرتا تھا (۱۰/۱۰۹ ؛ ۶/۵۰) اور اس وحی کو ایک عملی نظام زندگی بنانے کیلئے دوسروں سے اسکی اطاعت کراتا تھا (۴/۶۴) ۔ وہ اپنے حکم کی اطاعت کسی سے نہیں کراتا تھا ۔ نہ ہی یہ چیز کسی رسول ؐ کے شایان شان تھی کہ وہ انسانوں کو قوانین خداوندی کی بجائے اپنے احکام کا محکوم بنائے (۳/۷۸ ، ۷۹) ۔ اسطرح رسول کی وساطت سے قوانین خداوندی کی اطاعت ، خود خدا کی اطاعت قرار پا جاتی تھی (۴/۸۰) ۔ لہٰذا یہ اطاعت اس نظام کی اطاعت ہوتی تھی جو رسول کے ہاتھوں قوانین خداوندی کی عملی تنفیذ کیلئے متشکل ہوتا تھا ۔

وحی کا سلسلہ نبی اکرم ؐ کی ذات گرامی پر ختم ہو گیا ۔ اسکے بعد وہ نظام آگے چلا جو قرآنی قوانین کی رو سے قائم ہوا تھا ۔ اس نظام میں

خلیفۃالرسولؑ وہ فرائض سرانجام دیتا تھا جنھیں اپنی زندگی میں رسولؐ سرانجام دیتا تھا - یعنی منظم اور اجتماعی طور پر قوانین خداوندی کی اطاعت کرنا اور کرانا - اسطرح ,, اطاعت خدا و رسول '' کا یہ سلسلہ قائم رہا - لیکن یہ سلسلہ زیادہ دیر تک باقی نہ رہا - اب اگر پھر اسی قسم کا نظام قائم ہو جائے جسمیں قرآنی قوانین عملاً نافذ ہوں تو پھر اُسی اطاعت کا سلسلہ جاری ہو سکتا ہے جسے ,, خدا اور رسولؐ '' کی عملی اطاعت کہا جاتا ہے - (ان امور کی تفصیل میری کتاب ,, اسلامی نظام ,, * میں ملیگی جسمیں بتایا گیا ہے کہ قرآن کریم کے متعدد مقامات میں ,, اللہ اور رسول '' کا ذکر آیا ہے لیکن اس کے بعد ضمیر یا صیغہ واحد کا استعمال ہوا ہے - اسکے معنے یہ ہیں کہ ,, اللہ اور رسول '' کی اطاعت دو الگ الگ اطاعتیں نہیں ہوتیں - اس سے مراد ہوتی ہے قوانین خداوندی کی اطاعت جو اس نظام کی وساطت سے کی جاتی ہے جسے رسول متشکل کرتا ہے اور جو رسول کی وفات کے بعد اسکے جانشینوں کے ذریعہ آگے چلتا ہے) -

صاحب تاج العروس نے لکھا ہے کہ اَلرَّسُوْلُ اس شخص کو بھی کہتے ہیں جو تیر اندازی میں تمہارا ساتھی اور موافق ہو** - اگرچہ لسان العرب میں ہے کہ اس معنے میں رَسِیْلٌ آتا ہے - رَسُوْلٌ نہیں*** - لیکن خدا اور اسکا رسول ، درحقیقت ,, تیر اندازی ,, میں ایک دوسرے کے رفیق ہوتے ہیں - انسانوں کی دنیا میں خدا کے احکام رسول (اور اسکے متبعین کی جماعت) کے دست و بازو کی قوت سے عملاً نفاذ پذیر ہوتے ہیں - اسی لئے بدر کی جنگ کے موقع پر خدا نے کہا تھا کہ وَمَا رَمَيْتَ اِذْ رَمَيْتَ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ رَمٰى ($\frac{8}{17}$) - ,, وہ تیر تم نہیں چلا رہے تھے خود خدا چلا رہا تھا ,, - خدا اور رسول (اور اسکی جماعت) کی یہی باہمی رفاقت ہے جس سے دنیا میں نظام خداوندی کا قیام عمل میں آتا ہے - (اسکی مزید تفصیل قَابَ قَوْسَيْنِ ($\frac{53}{9}$) میں دیکھئے - عنوان ق - و - س) -

جیسا کہ ہم پہلے لکھ چکے ہیں ، قرآن کریم کی رو سے نبی اور رسول ایک ہی حقیقت کے دو رخ ہوتے ہیں - ان میں کچھ فرق نہیں ہوتا - اس لئے قرآن کریم نے نبی یا رسول کی جو خصوصیات بیان کی ہیں وہ نبی اور رسول کی الگ الگ خصوصیات نہیں - اس اعتبار سے قرآن کریم کے مختلف مقامات کو

---

* نیز ,, سلیم کے نام خطوط '' (جلد دوم) میں اطاعت رسول سے متعلق خطوط ہیں -
** تاج و محیط - *** لسان العرب

دیکھئے جہاں نبی یا رسول کی خصوصیات یا تفصیلی تذکرہ آیا ہے۔ مثلاً رسول کسی سے اپنا حکم نہیں منواتا، صرف کتاب خداوندی کی اطاعت کراتا ہے (۳/۷۸)۔ وہ اگر کسی معاملہ میں غلطی کرتا ہے تو وہ اسکی ذاتی غلطی ہوتی ہے۔ صحیح راستہ وحی کے ذریعے دکھاتا ہے (۳۴/۵۰)۔ رسول خود اپنی ذات کے لئے بھی نفع یا نقصان کا اختیار نہیں رکھتا (۱۰/۴۹)۔ وہ کسی سے اجر رسالت نہیں مانگتا (۱۰/۷۲)۔ رسولوں کے بیوی بچے ہوتے تھے (۱۳/۳۸)۔ تمام رسول اپنے اپنے وقت پر آئے اور تشریف لے گئے (۳/۱۴۴)۔ لیکن نبی آخرالزمان ؑ کی بعثت کے بعد، نجات و سعادت حضور ؑ پر ایمان اور قرآن کریم پر عمل کرنے ہی سے مل سکتی ہے (۷/۱۵۸)۔ رسول ہمیشہ مرکزی مقامات میں آیا کرتے تھے (۲۸/۵۹)۔ رسول کو رسالت ملنے سے پہلے قطعاً علم و احساس نہیں ہوتا تھا کہ اسے رسالت ملنے والی ہے (۴۲/۵۲ ؛ ۲۸/۸۶)۔ نبی اکرم ؑ نبوت ملنے سے پہلے ان پڑھ تھے (اس کے بعد نہیں)۔ (۲۹/۴۸)۔ نبی اکرم ؑ خدا کے آخری نبی تھے (۳۳/۴۰)۔ اس لئے اب نہ کوئی نبی آسکتا ہے نہ رسول۔ رسول صرف خدا کا راستہ دکھاتے تھے۔ دوسروں کو اس راستے پر لگانا ان کے ذمے یا اختیار میں نہیں تھا (۲۸/۵۶)۔ بعض رسولوں پر ایمان لانا اور بعض پر نہ لانا کفر ہے (۴/۱۵۰)۔ یہ اور اس قسم کی دیگر خصوصیات، انبیاء کرام اور رسولوں کے سلسلہ میں قرآن کریم میں مذکور ہیں۔ حتکہ یہ بھی کہا گیا ہے کہ اگر (بفرض محال) رسول بھی مداہنت برتے یا اپنی وحی میں کسی قسم کی تبدیلی کرلے تو اس پر خدا کا عذاب آجائے (۶۸/۹ ؛ ۱۰/۱۵ ؛ ۱۱/۱۱۳ : ۱۷/۷۴)۔

چونکہ قرآن کریم کی حفاظت کا ذمہ خدا نے خود لے لیا ہے اور وہ دین کا مکمل ضابطہ ہے، اس لئے نبوت کے ختم ہو جانے سے انسانی راہ نمائی کے سلسلہ میں کسی قسم کی کمی واقع نہیں ہوئی۔ سوال صرف اس نظام کے قائم کرنے کا ہے جسے رسول اللہ ؑ نے قائم فرمایا تھا۔ وہ آج بھی قائم ہو سکتا ہے۔

اِرْسَال* کے معنے چھوڑ دینے کے بھی ہیں۔ اَرْسَلَ الْخَیْلَ فِی الْغَارَۃِ۔ حملہ میں گھوڑوں کی باگیں کھلی چھوڑ دیں*۔ قرآن کریم میں یہ لفظ اِمْسَاک* (روک لینے) کے مقابلہ میں آیا ہے (۳۵/۲) جہاں اسکے معنے کھلا چھوڑ دینے کے ہیں۔ اَرْسَلَ عَلَی کے معنے ہیں کسی پر مسلط کرنا (۱۹/۸۳)۔

* تاج و محیط۔

ر س و

رَسَا الشَّیْءُ یَرْسُوْ ۔ رُسُوًّا ۔ اِرْسَاءً ۔ کسی شے کا قرار گیر ہو جانا ۔ جم جانا ۔ رَسَتِ السَّفِیْنَۃُ تَرْسُوْ ۔ کشتی لنگر انداز ہو گئی ۔ اَرْسَی السَّفِیْنَۃَ : کشتی کو لنگر انداز کیا ۔ ٹھہرایا ۔ اَلْمِرْسَاۃُ ۔ کشتی کا لنگر* ۔ مَجْرٖھَا وَ مُرْسٰھَا (۱۱/۴۱) ۔ کشتی کا چلنا اور اس کا لنگر انداز ہونا ۔ سورۃ اعراف میں اَلسَّاعَۃُ کے متعلق ہے اَیَّانَ مُرْسٰھَا (۷/۱۸۷) ۔ اس کا وقوع کب ہوگا ۔ وہ کب رُک کر ہمارے سامنے آئے گی ۔ مُرْسٰی اسم مفعول ہے جو ظرف کے معنوں میں بھی استعمال ہوسکتا ہے ۔ اس کے معنے رکنے کا وقت اور رکنے کا مقام دونوں ہوسکتے ہیں ۔ قُدُوْرٍ رّٰسِیٰتٍ (۳۴/۱۳) ۔ دیگیں جو ایک جگہ مضبوطی سے جمی ہوئی ہوں ۔ رَوَاسِیَ (۱۳/۳) ۔ جمے ہوئے پہاڑ (واحد رَاسِیَۃٌ*) ۔

ر ش د

رَشَدَ یَرْشُدُ ۔ رُشْدًا ۔ نیز رَشِدَ ۔ یَرْشَدُ ۔ رَشَدًا وَّرَشَادًا ۔ معاملہ کا صحیح حل ، یا صحیح راستہ، پالینا** ۔ اَلرُّشْدُ ۔ سختی سے راہ راست پر استقامت کو کہتے ہیں** ۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے معنی راستہ پر پختگی سے جم جانے کے ہیں ۔ اَلرَّشَدُ وَالرُّشْدُ ۔ غَیٌّ کی ضد ہے ۔ یہ صحیح راھنمائی اور ھدایت کے معنوں میں استعمال ہوتا ہے*** ۔ (۲/۲۵۶) ۔ سورۃ نساء میں رُشْدًا (۴/۶) آیا ہے جس کے معنے معاملہ فہمی کی صلاحیت یا عقل کی پختگی کے ہیں ۔ اِسْتَرْشَدَ فُلَانٌ لِاَمْرِہٖ ۔ اس شخص نے اپنے معاملہ کا صحیح حل پا لیا ۔ اَرْشَدْتُہٗ ۔ میں نے اسے ٹھیک راہ بتائی ۔ اَلرَّشِیْدُ (۱۱/۸۷) ۔ صحیح راستہ بتانے والا ۔ نیز وہ شخص جو معاملات کا ٹھیک ٹھیک اندازہ لگائے یا جس کے اندازہ کئے ہوئے معاملات پوری طرح بغیر کسی کی مدد اور رہنمائی کے انتہا تک پہنچ جائیں** ۔

سورۃ کہف میں ہے کہ ان نوجوانوں نے خدا سے دعا کی کہ ہماری اس انقلابی مہم میں ہمیں سامانِ رحمت و ربوبیت عطا کر دے اور ہمارے معاملہ میں ہماری راھنمائی کا سامان فراہم کردے ۔ وَ ھَیِّیْٔ لَنَا مِنْ اَمْرِنَا رَشَدًا (۱۸/۱۰) ۔ اس کے بعد ہے کہ تمہارا نشو و نما دینے والا تمہیں سامانِ رحمت بھی دے گا ۔ وَ یُھَیِّیْٔ لَکُمْ مِنْ اَمْرِکُمْ مِرْفَقًا (۱۸/۱۶) ۔ اور تمہارے مقصد کی کامیابی کے لئے آسانیاں بھی بہم پہنچا

* تاج و محیط ۔ ** تاج ۔ *** راغب ۔

دے گا۔ اس سے ظاہر ہے کہ رَشَدًا صرف صحیح راستے کی طرف راہنمائی ہی نہیں بلکہ منزل مقصود تک پہنچنے کے لئے ضروری تدابیر اور انکی کامیابی کے کے لئے آسانیاں بہم پہنچانا بھی ہے ۔ چنانچہ اَلْمَرَاشِدُ ان راستوں کو کہتے ہیں جو منزل مقصود تک پہنچادیں ۔ قرآن کریم میں رَشَدًا ۔ ضَرًّا ۔ (نقصان) کے مقابلہ میں آیا ہے (۷۲/۲۱) ۔ لہذا رُشْدٌ ایک جامع لفظ ہے جس میں ھدایت ، حکمت و بصیرت سے لیکر منزل مقصود تک پہنچنے کے لئے عملی تدابیر اور راستے کے خطرات اور نقصانات سے بچنے کے سامان سب آ جاتے ہیں۔ اسی لئے انبیائے کرام (انقلاب خداوندی کی طرف دعوت دینے والوں) کو رُشْدٌ عطا ہوتا تھا (۲۱/۵۱) ۔ اور جماعت مومنین رَاشِدُوْنَ کی جماعت ہوتی ہے (۴۹/۷)۔ یہ سب کچھ قوانین خداوندی کی اطاعت سے ملتا ہے ۔ اس لئے قرآن کریم نے اس کی تصریح کر دی ہے کہ خدا کے سوا نہ کوئی وَلِیٌّ ہے اور نہ کوئی مُرْشِدٌ (۱۸/۱۷) ۔ لیکن ہم ہیں کہ انسانوں کو اپنا پیر و مرشد بناتے ہیں ۔ اور اس کا نتیجہ بھی بھگت رہے ہیں!

ر ص د

رَصَدَہٗ ۔ وہ اسکے انتظار میں رہا ۔ اَلرَّاصِدُ ۔ منتظر اور کسی کی نقل و حرکت پر نگرانی کرنے والا ۔ اَلرَصِیْدُ ۔ درندہ جو حملہ کرنے کا منتظر رہے* ۔ قرآن کریم میں ہے یَجِدْ لَہٗ شِہَابًا رَّصَدًا (۷۲/۹) ۔ وہ ایک شعلہ کو اپنے انتظار یا گھات میں بیٹھا ہوا پائیگا ۔ اِرْصَادٌ کے معنے ہیں کسی کا انتظار کرنا اور (انتظار میں) تیاری کرنا* ۔ اِرْصَادًا لِّمَنْ حَارَبَ اللّٰہَ وَ رَسُوْلَہٗ (۹/۱۰۷) "خدا و رسول" (نظام خداوندی) کے خلاف جنگ کرنے والے کے لئے گھات بنانے اور تاک میں رہنے کے لئے۔ نیز مخالفانہ کاروائیاں کرنے کے لئے ۔ اَلْمَرْصَدُ ۔ اَلْمِرْصَادُ (۹/۵ و ۸۹/۱۴) وہ راستہ یا جگہ جہاں بیٹھکر دشمن کی تاک لگائی جائے*۔

خدا کے مِرْصَادٌ (گھات) میں ہونے (۸۹/۱۴) کے یہ معنے ہیں کہ اس کا قانونِ مکافات ہر ایک پر نگاہ رکھتا ہے اور جب ظہورِ نتائج کا وقت آتا ہے تو اسے فوراً دبوچ لیتا ہے ۔ کوئی شخص اُس قانون کی نگاہوں سے اوجھل نہیں رہ سکتا ۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس مادہ کے بنیادی معنی یہ ہیں کہ جس راستے سے کسی چیز کو گذرنا ہو وہاں اس کی تاک میں بیٹھنا ۔ انسان

*تاج ۔

کا ہر عمل ، قانونِ خداوندی کے معین کردہ راستے سے گذر کر اپنی منزل و منتہیٰ تک پہنچتا ہے، جسے اس کا نتیجہ کہا جاتا ہے ۔ لہٰذا کوئی عمل بلا نتیجہ رہ نہیں سکتا ۔

ر ص ص

رَصَّهٗ ۔ یَرُصُّهٗ ۔ رَصًّا ۔ اس نے کسی چیز کے اجزا کو ایک دوسرے میں پیوست کر دیا اور انہیں باہمدگر مضبوطی سے جوڑ کر ملا دیا، جیسے انہیں سیسہ پلا دیا گیا ہو ۔ اَلرَّصَاصُ سیسے کو کہتے ہیں* ۔

قرآن کریم میں ہے کہ مومن خدا کی راہ میں اس طرح صف بستہ لڑتے ہیں کَاَنَّهُمْ بُنْیَانٌ مَّرْصُوْصٌ (۶۱/۴) ۔ گویا وہ ایک ایسی محکم دیوار ہیں جسے سیسہ پلا دیا گیا ہو ۔ یہ بات اسی صورت میں پیدا ہوسکتی ہے جب قلوب ایک دوسرے سے پیوست ہوں ۔ اور قلوب کی پیوستگی ، مقصدِ زندگی اور ضابطۂ حیات کے ایک ہونے سے ہوتی ہے ۔ آپ غور فرمائیے کہ جس جماعت (اُمت مسلمہ) کی کیفیت یہ ہونی چاہئے تھی وہ آج کس طرح فرقوں میں بٹی ہوئی ہے اور اس کے باوجود اپنے آپ کو حاملِ قرآن سمجھ رہی ہے!

ر ض ع

رَضِعَ یَرْضَعُ ۔ رَضَعَ یَرْضِعُ ۔ رَضْعًا و رَضَاعًا و رَضَاعَةً ۔ بچہ کا ماں کے پستان کو چوس کر دودھ پینا** ۔ اَخَوٰتُكُمْ مِنَ الرَّضَاعَةِ (۴/۲۳) تمہاری دودھ شریک بہنیں (جن سے نکاح حرام ہے) ۔ اَرْضَعَ ۔ دودھ پلانا ۔ الاِسْتِرْضَاعُ ۔ دودھ پلوانا چاہا** ۔ وَاُمَّهٰتُكُمُ الّٰتِیٓ اَرْضَعْنَكُمْ (۴/۲۳) ۔ تمہاری وہ مائیں جنہوں نے تمہیں دودھ پلایا ہے (ان سے بھی نکاح حرام ہے) ۔ مَرَاضِعُ ۔ دودھ پینے کی جگہ ۔ چھاتیاں*** ۔ (واحد ۔ مَرْضَعٌ) سورۃ قصص میں ہے ۔ وَحَرَّمْنَا عَلَیْهِ الْمَرَاضِعَ (۲۸/۱۲) ۔ یعنی ہم نے موسیٰ کو دودھ پینے سے روک دیا ۔ اس میں مَرَاضِعُ ۔ مَرْضَعٌ کی جمع بھی ہوسکتی ہے اور مُرْضِعَةٌ کی بھی ۔ پہلی شکل میں اس کا مفہوم چھاتیاں، اور دوسری شکل میں دودھ پلانے والیاں، ہوگا ۔ مُرْضِعَةٌ ۔ دودھ پلانے والی عورت ۔ اُنثیٰ ۔ (۲۲/۲) ۔ اس کی جمع بھی مَرَاضِعُ ہے ۔ اِسْتَرْضَعَ ۔ بچے کو (انثیٰ سے) دودھ پلوانا چاہا ۔ (۲/۲۳۳) ۔

---

* تاج و راغب ۔ **تاج ۔ ***کشاف ۔

ر ض ی

رَضِیَ یَرْضٰی رِضْوَاناً و رِضاً کے معنے ہوتے ہیں کسی سے متفق ہونا۔ کسی کی بات کی تصویب کر دینا۔ (Approve) کر لینا۔ لیکن اس میں دل کی رضامندی اور رغبت وخوشی کا پہلو پایا جاتا ہے جس میں کسی قسم کی کراہت اور جبر نہ ہو۔ تَرَاضِیَاہُ۔ دونوں نے کسی بات پر آپس میں برضا ورغبت اتفاق کر لیا۔ اسے باہمی (Agreement) سے کیا۔ اس پر دونوں کی رضامندی ہو گئی۔ اِذَا تَرَاضَوْا بَیْنَھُمْ بِالْمَعْرُوْفِ (۲/۲۳۲) " جب وہ (میاں بیوی) قاعدے کے مطابق ایک دوسرے سے رضامندی کے ساتھ متفق ہو جائیں "*۔ رَضِیَہُ لِھٰذَا الْاَمْرِ۔ اسے اس کام کا اہل سمجھا۔ اِرْتَضَاہُ لِصُحْبَتِہٖ وَخِدْمَتِہٖ۔ اسے اپنی صحبت اور خدمت کا اہل سمجھا اور اسکے لئے منتخب کر لیا۔ رَضِیْتُ الشَّیْءَ وَبِہٖ۔ میں نے اس چیز کو پسند کر لیا اور اسے اختیار کر لیا*۔ لَنْ تَرْضٰی عَنْکَ الْیَھُوْدُ وَلَا النَّصٰرٰی (۲/۱۲۰)۔ " تجھ سے یہود اور نصاریٰ کبھی متفق نہ ہونگے "۔ تجھ سے کبھی راضی نہ ہونگے۔

قرآن کریم میں مومنین کی خصوصیت یہ بتائی گئی ہے کہ رَضِیَ اللّٰہُ عَنْھُمْ وَرَضُوْا عَنْہُ (۹/۱۰۰)۔ اس کا ترجمہ عام طور پر کیا جاتا ہے " اللہ ان سے راضی ہو گیا اور وہ اللہ سے راضی ہو گئے "۔ چونکہ راضی ہو جانا اور ناراض ہو جانا انسانی جذبات ہیں اسلئے اس سے ذہن اسطرف منتقل ہو جاتا ہے کہ یہی جذبات خدا میں بھی ہیں۔ وہ بھی کسی بات سے خوش ہو جاتا ہے اور کسی سے ناراض ہو جاتا ہے۔ خدا خوشی اور ناراضگی کے ان انسانی جذبات سے مبرا ہے۔ اس لئے رَضِیَ اللّٰہُ عَنْھُمْ وَرَضُوْا عَنْہُ کا مفہوم اس سے مختلف ہے۔ اس کا صحیح مفہوم سمجھنے کے لئے ایک بات کا تمہیداً سمجھ لینا ضروری ہے۔ جب ذہن انسانی اپنے عہد طفولیت میں تھا تو اس نے دیوی دیوتا یا خدا کا تصور ایسا ہی پیدا کیا جیسا وہ اپنے سامنے بادشاہ کو دیکھتا تھا، اس لئے کہ اس کے نزدیک بادشاہ سے بڑھ کرقوت اور اقتدار کا مالک کوئی اور نہیں ہوتا تھا۔ اس کے ذہن نے خدا کو بھی (بادشاہ کیطرح) ایک تخت پر بٹھایا۔ پھر یہ سمجھا کہ بادشاہ کے امراء و وزراء کیطرح خدا کے بھی مقربین ہیں جنہیں اس کے کاروبار میں عمل دخل ہے۔ نیز اس کے حاجب و دربان بھی ہیں۔ بندے اسکی رعایا ہیں جنہیں اس

* لین و تاج۔

کے سامنے دم مارنے کی جا نہیں۔ اگر انسان نے اپنی کوئی درخواست اُس کے حضور پیش کرنی ہو تو اس کے ساتھ کوئی نذرانہ بھی پیش کرنا ضروری ہوگا۔ نیز اس درخواست کو، بادشاہ کے مقربین میں سے کسی کی وساطت سے وہاں تک پہنچانا ہوگا تاکہ وہ سفارش کرے۔ ان درخواستوں کے فیصلے (یا بادشاہ کے دیگر احکام) کسی قاعدے اور قانون کے مطابق نہیں ہوتے۔ اس کا انحصار بادشاہ کے مزاج پر ہوتا ہے۔ اگر وہ خوش ہوگیا تو گاؤں بخش دیا۔ اگر ناراض ہو گیا تو گدھوں کے ہل چلوا دیئے۔ بادشاہ کی خوشی اور ناراضگی بھی کسی اصول کے مطابق نہیں ہوتی۔ سعدی کے الفاظ میں، مزاج شاہاں کی کیفیت یہ ہوتی ہے کہ ''گاہے بہ سلامے برنجند و گاہے بہ دشنامے خلعت بہ بخشند''۔ کبھی سلام کرنے پر ناراض ہو جاتے ہیں اور کبھی گالی دینے پر انعام دیتے ہیں۔ لہذا بندوں کی تمام تر کوشش یہ ہونی چاہیئے کہ کسی طرح خدا کو راضی رکھیں۔ اسے خوش کر لیں۔ ایشور کی بھکتی۔ ڈنڈوت۔ پوجا پاٹ۔ اس کے چرنوں (قدموں) میں شردھا (عقیدت) کے پھول چڑھانا۔ دیوتاؤں کے استھانوں پر قربانیاں دینا سب اس غرض سے تھا کہ کسی طرح ایشور پرماتما کو خوش رکھا جائے۔ وہ اپنے بھکتوں سے راضی رہے۔

قرآن کریم نے (اور اس سے پہلے انبیاء سابقہؑ کیطرف وحی نے) اس توہم پرستانہ تصور کو مٹا کر، اسکی جگہ خدا کا صحیح تصور دیا۔ اس تصور کی رو سے بتایا گیا کہ خدا مستبد حکمرانوں کیطرح نہیں۔ اس نے ہر بات کے لئے قاعدہ اور قانون مقرر کر رکھا ہے اور کائنات کے تمام امور اس کے متعین کردہ قوانین و اصول کے مطابق سر انجام پاتے ہیں۔ انسانی زندگی کے لئے بھی اس نے قوانین مقرر کر رکھے ہیں (جن کا علم انسان کو انبیاء کرامؑ کی وساطت سے دیا جاتا رہا ہے اور اب وہ قوانین قرآن کریم کے اندر محفوظ ہیں)۔ انسان کے ہر عمل کا نتیجہ ان قوانین کے مطابق مرتب ہوتا ہے۔ وہ (بادشاہوں کی طرح) یونہی خوش ہوکر نہ کسی کو انعام دیتا ہے، نہ یونہی ناراض ہوکر عذاب میں مبتلا کرتا ہے۔

اس کے ساتھ ہی اس نے یہ بھی بتایا کہ خدا نے انسانی زندگی کے سامنے ایک مقصد رکھا ہے اور اس نے جو قوانین عطا کئے ہیں وہ اس لئے ہیں کہ انسان ان کے مطابق زندگی بسر کرکے، اپنی منزل مقصود تک پہنچ جائے۔ انسانوں کے لئے یہ راستہ خدا کا پسندیدہ ہے۔ یعنی اگر انسان اس راستے پر چلتا ہے تو وہ خدا کی منشاء کے مطابق زندگی بسر کرتا ہے۔ اگر اس کے

خلاف جاتا ہے تو وہ خدا کی منشاء کے خلاف ہوتا ہے۔ قرآن کریم میں جہاں "خدا کی رضامندی" (یا اس کے خلاف، غضب وغیرہ) کے الفاظ آئے ہیں تو وہ اسی مفہوم کے ترجمان ہیں۔ مثلاً سورۃ المائدہ میں ہے وَرَضِيتُ لَكُمُ الْإِسْلَامَ دِينًا (۵/۳)۔ "میں نے تمہارے لئے اسلام کو بطور ضابطۂ حیات پسند کیا ہے"۔ اگر انسان اس ضابطۂ حیات کے مطابق زندگی بسر کرتا ہے تو وہ خدا کے پسندیدہ راستے پر چلتا ہے۔ اسے "رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ" سے تعبیر کیا گیا ہے۔ دوسری طرف، ایک مومن کے دل کی کیفیت یہ ہو جاتی ہے کہ وہ خدا کے پسندیدہ راستے کو محبوب رکھتا ہے اور اس کے خلاف دوسرے راستوں کو ناپسند کرتا ہے۔ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ حَبَّبَ إِلَيْكُمُ الْإِيمَانَ وَزَيَّنَهُ فِي قُلُوبِكُمْ وَكَرَّهَ إِلَيْكُمُ الْكُفْرَ وَالْفُسُوقَ وَالْعِصْيَانَ۔ أُولٰئِكَ هُمُ الرَّاشِدُونَ۔ فَضْلًا مِنَ اللّٰهِ وَنِعْمَةً۔ وَاللّٰهُ عَلِيمٌ حَكِيمٌ (۴۹/۸)۔ "لیکن اللہ نے تمہارے دلوں میں ایمان کو محبوب و مزین بنادیا ہے اور کفر و فسق وعصیان کو نامرغوب۔ ایسے ہی لوگ صحیح راستے پر چلنے والے ہیں۔ یہ اللہ کیطرف سے فضل اور نعمت ہے۔ اور اللہ علیم و حکیم ہے"۔ ایمان کا دلوں میں اسطرح مرغوب بن جانا، "رَضُوا عَنْهُ" ہے۔

اس سے رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَرَضُوا عَنْهُ (۹/۱۰۰) کا مفہوم سمجھ میں آجائیگا۔ یعنی "اللہ کے راضی ہونے" سے مراد یہ ہے کہ خدا کے پسندیدہ راستہ (قرآن کریم) کے مطابق چلا جائے۔ اور انسانوں کے خدا سے راضی ہونے کا مطلب یہ ہے کہ خدا کا تجویز کردہ راستہ، ان کے دلوں میں محبوب و مرغوب بن جائے۔ قرآن کریم کے دیگر مقامات سے بھی اس مفہوم کی وضاحت ہو جاتی ہے۔ مثلاً سورۃ توبۃ میں منافقین کے متعلق ہے کہ يُرْضُونَكُمْ بِأَفْوَاهِهِمْ وَتَأْبٰى قُلُوبُهُمْ (۹/۸)۔ "وہ اپنے منہ سے تم کو راضی کرتے ہیں اور ان کے دل انکار کرتے ہیں"۔ یہاں اِرْضَاءٌ بمقابلہ آبیٰ آیا ہے۔ آبیٰ کے معنے ہیں سختی سے انکار کرنا۔ لہٰذا رِضیٰ کے معنے برضاو رغبت موافقت کرنے اور دلی طور پر ہم آہنگی کے ہونگے۔ یہ مفہوم سورۃ بقرہ سے بھی واضح ہو جاتا ہے۔ پہلے منکرین کے متعلق ہے کہ جب ان سے کہا جاتا ہے کہ اتَّقِ اللّٰهَ (۲/۲۰۶)۔ قوانین خداوندی کی نگہداشت کرو، تو وہ ایسا نہیں کرتے۔ اسکے بعد مومنین کا ذکر ہے کہ وہ ابْتِغَاءَ مَرْضَاتِ اللّٰهِ (۲/۲۰۸) کی زندگی بسر کرتے ہیں۔ اس سے آگے ہے اُدْخُلُوا فِي السِّلْمِ كَافَّةً (۲/۲۰۸)۔ خدا کی اطاعت شعاری میں پورے کے پورے داخل

ہو جاؤ۔ یعنی لَا تَتَّبِعُوْا خُطُوٰتِ الشَّیْطٰنِ (۲/۲۰۸)۔ غیر خدائی قوتوں کے احکام و قوانین کا اتباع مت کرو۔ ان تمام ٹکڑوں کو سامنے رکھنے سے مَرْضَاتِ اللّٰہِ کا مفہوم واضح ہو جاتا ہے۔ یعنی خدا کے احکام و قوانین کی پوری پوری اور برضا و رغبت اطاعت۔ یہی معنے رَضِیَ اللّٰہُ عَنْھُمْ وَرَضُوْا عَنْہُ کے ہیں۔ یعنی یہ لوگ قوانین خداوندی کے ساتھ بطیب خاطر پوری ہم آہنگی کی زندگی بسر کرتے ہیں۔ ان کی ساری زندگی ان قوانین کے مطابق ہوتی ہے۔ اور قوانین خداوندی کے خوشگوار نتائج ان سے ہم آہنگ ہوتے ہیں۔ ان کی سعادتیں اور برکتیں ان کے شامل حال ہوتی ہیں۔ اس سے ان کے دلوں میں قوانین خداوندی کی محبت اور بھی زیادہ ہو جاتی ہے۔

اسی کو اِتَّبَعَ رِضْوَانَ اللّٰہِ (۳/۱۶۱) سے تعبیر کیا گیا ہے جس کے مقابلہ میں بَآءَ بِسَخَطٍ مِّنَ اللّٰہِ کہا ہے (دیکھئے عنوان س۔ خ۔ ط)۔ سورۃ محمد میں واضح کر دیا ہے کہ رِضْوَانَہٗ کے معنے ہیں مَا نَزَّلَ اللّٰہُ یعنی قرآن۔ پہلے کہا گیا ہے کَرِھُوْا مَا نَزَّلَ اللّٰہُ (۴۷/۹)۔ اور اس کے بعد ہے کَرِھُوْا رِضْوَانَہٗ (۴۷/۲۸)۔ یعنی، رِضْوَانَہٗ قرآن کریم (مَا نَزَّلَ اللّٰہُ) کا اتباع ہے اور سَخَطٌ غیر قرآنی احکام کا اتباع۔ لہذا مومنین کا شعار یہ ہے کہ وہ قرآن کریم (مَا اَنْزَلَ اللّٰہُ) کا پورا پورا اتباع کرتے ہیں۔ اپنی زندگی کو اس سے پورے طور پر ہم آہنگ اور متفق رکھتے ہیں۔ اور اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اللہ کے قانون مکافات کے مطابق زندگی کی خوشگواریاں اور شادابیاں ان کے ہمرکاب ہوجاتی ہیں۔ اسی زندگی کا نام عِیْشَۃٍ رَّاضِیَۃٍ (۱۰۱/۷) ہے۔

سورۃ مریم میں ہے کہ حضرت زکریاؑ نے خدا سے بیٹے کی دعا مانگی اور کہا وَاجْعَلْہُ رَبِّ رَضِیًّا (۱۹/۶)۔ یہاں رَضِیًّا کے معنے یا تو محبوب و مقبول کے ہیں۔ اور یا یہ کہ وہ تیرے احکام کے مطابق زندگی بسر کرنے والا ہو۔ تاج میں رَضِیٌّ کے معنے مطیع بھی لکھے ہیں۔

سورۃ توبہ میں ہے کہ اللہ نے مومنین سے جَنّٰتٍ اور مَسٰکِنَ طَیِّبَۃً کا وعدہ کر رکھا ہے۔ اس کے بعد ہے وَرِضْوَانٌ مِّنَ اللّٰہِ اَکْبَرُ ذٰلِکَ ھُوَ الْفَوْزُ الْعَظِیْمُ (۹/۷۲)۔ اللہ کی ''رضوان'' ان سب سے بڑھ کر ہے۔ اور یہ ایک عظیم کامرانی (Achievement) ہے۔

یہ آیۃ جلیلہ ایک عظیم حقیقت کی طرف توجہ مبذول کرتی ہے۔ سوال یہ ہے کہ ایمان و اعمال صالحہ سے ہوتا کیا ہے؟

انسان نام ہے اس کی طبعی زندگی (Physical Life) اور انسانی ذات (Self) کا - زندگی کی کامیابی سے مقصود یہ ہے کہ انسان کی طبعی زندگی بھی خوشگوار رہے اور اس کی ذات کی بھی نشو و نما ہو جائے - انسان کی نشو و نما سے مراد یہ ہے کہ اس میں جس قدر مضمر صلاحیتیں ہیں وہ بیدار ہو جائیں - خدا کی ذات ایک مکمل ترین ذات ہے جس میں اس کی تمام صفات بطریق احسن جلوہ فرما ہیں - وہی صفات انسان کی ذات میں بھی ہیں لیکن علٰی قدرِ بشریت - یعنی چھوٹے پیمانے پر - انسانی ذات کی نشو و نما کے معنی یہ ہیں کہ اس میں ان صفات کی نمود ہوتی جائے - اب ظاہر ہے کہ انسانی ذات کو جسقدر زیادہ نشو و نما حاصل ہوگی یہ اُتنی ہی زیادہ صفاتِ خداوندی سے ہم آہنگ ہوتی جائے گی -

ایمان و اعمال صالحہ سے ہوتا یہ ہے کہ انسانی ذات کی اس طرح نشو و نما ہوتی جاتی ہے لیکن اس کے ساتھ ہی اُسے زندگی کی خوشگواریاں بھی ملتی چلی جاتی ہیں - قرآن کریم کہتا ہے کہ زندگی کی یہ خواشگواریاں بڑی خوش آئند اور مبارک ہیں اور ان کا حاصل ہو جانا بھی بڑی چیز ہے - لیکن حقیقی کامرانی وکامیابی یہ ہے کہ اس سے انسانی ذات، صفاتِ خداوندی سے ہم آہنگ ہو جاتی ہے- ذٰلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ - ان اعمال کا بدلہ (یا نتیجہ) ایک تو اس طرح مرتب ہوتا ہے کہ انسان کی خارجی دنیا حسین وخوشگوار ہو جاتی ہے - اور دوسرے یہ کہ اس کی داخلی دنیا میں بھی ایک عظیم انقلاب آجاتا ہے - یہ انقلاب (یعنی انسانی ذات کا نشو و نما پا جانا) بہت بڑی کامرانی ہے - یہی چیز ہے جسے باندازِ دگر یوں کہا گیا ہے کہ لَهُمْ مَا يَشَاؤُنَ فِيهَا وَلَدَيْنَا مَزِيْدٌ (۳۵/۵۰) "جنت میں ان کے لئے وہ سب کچھ ہوگا جس کی وہ خواہش کرتے ہیں - اور ہمارے پاس (اس سے بھی) بڑھ کر (کچھ اور) ہے" - یعنی انسان کی خواہش اس کے علم و جذبات کی موجودہ سطح کے مطابق ہی ہوسکتی ہیں - لیکن جب جنت کی زندگی میں یہ سطح ہی بلند ہوجائیگی تو وہاں جو کچھ ملیگا وہ ان کی موجودہ خواہشوں اور آرزوؤں سے کہیں زیادہ ہوگا - اس کی ذات کی نشو و نما بایں نمط ہوگی کہ اس کے شعور کی موجودہ سطح اس کا اندازہ نہیں کر سکتی -

لیکن اس حقیقت کو فراموش نہیں کرنا چاہئے کہ انسانی ذات کی یہ نشو و نما صرف اس معاشرہ کے اندر ہوسکتی ہے جو قرآن کریم متشکل کرتا ہے - خانقاہوں کی تجردگاہوں میں نہیں ہوسکتی - لہذا بات پھر وہیں آجاتی

ہے کہ رضوان من اللہ یا مرضات اللہ ، قرآن کریم کے مطابق زندگی بسر کرنے اور اس کے خوشگوار نتائج کا نام ہے ۔

سورۃ انبیاء میں ہے وَلَا یَشْفَعُوْنَ اِلَّا لِمَنِ ارْتَضٰی (۲۱/۲۸) ۔ اس کے لئے عنوان ش ۔ف ۔ ع دیکھئے ۔

ر ط ب

اَلرُّطَبُ ۔ یَابِسٌ* (خشک) کی ضد ہے ۔ یعنی تر و تازہ چیز جس میں نمی ہو ۔ نرم و نازک شاخ ۔ ہری بھری گھاس ۔ سرسبز زمین ۔ اَلرُّطَبُ ۔ گدری کھجور* ۔ قرآن کریم میں رُطَبًا جَنِیًّا (۱۹/۲۵) آیا ہے ۔ چنی ہوئی گدری کھجوریں ۔ سورۃ انعام میں ہے وَلَا رَطْبٍ وَّلَا یَابِسٍ اِلَّا فِیْ کِتٰبٍ مُّبِیْنٍ (۶/۵۹) ۔ اس کے معنے تازہ اور خشک پھل کے بھی ہوسکتے ہیں، لیکن اس کا مطلب ہر تر اور خشک چیز ہے ۔ یعنی کائنات کی مختلف چیزیں ۔ اور کتاب مبین صحیفۂ فطرت یا کائناتی قوانین کا ضابطہ ہے ۔

(رَطْبٌ وَ یَابِسٌ کے لئے ی ۔ ب ۔ س کا عنوان بھی دیکھئے) ۔

آیت (۱۹/۲۵) کو سامنے لائیے ۔ اس میں کہا گیا ہے کہ حضرت عیسٰےؑ کی پیدائش اس موسم میں ہوئی تھی جب درختوں پر پکی ہوئی کھجوریں لٹک رہی تھیں ۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ قرآن کریم کی رو سے حضرت عیسٰےؑ کی پیدائش ، دسمبر کے مہینے میں نہیں ہوئی تھی ۔ اس زمانے میں فلسطین میں سخت سردی ہوتی ہے اور تازہ کھجوروں کا موسم نہیں ہوتا ۔ اب عیسائی مورخ خود اس کے قائل ہو رہے ہیں کہ ۲۵ دسمبر حضرت عیسٰےؑ کا یوم پیدائش نہیں ۔ عیسائیوں نے بعد میں یہ عقیدہ ایرانیوں سے مستعار لیا تھا جن کے ہاں ۲۵ دسمبر متھرا کا یوم پیدائش تسلیم کیا جاتا تھا ۔ اور ۲۵ مارچ اس کے مر کر جی اٹھنے کا دن ۔ ان کا یہ عقیدہ بھی تھا کہ متھرا آخری زمانے میں پھر دنیا میں آئے گا ۔ (دیکھئے معراج انسانیت صفحہ ۱۰۵)

ر ع ب

رَعَبَ الْحَوْضَ ۔ حوض کو بھر دیا ۔ رَعَبَ السَّیْلُ الْوَادِیَ ۔ سیلاب نے وادی کو بھر دیا ۔ اسکے ایک معنی تو ہیں بھر دینا اور دوسرے معنے ہیں کسی چیز کو کاٹ دینا ۔ رَعَبَ السَّنَامَ ۔ اسنے کوہان کو کاٹ لیا ۔ اَلتَّرْعِیْبَۃُ ۔ کوہان کا کٹا ہوا ٹکڑا* ۔

* تاج ۔

اس اعتبار سے راغب کے نزدیک اَلرُّعْبُ کے معنے ہیں خوف سے بھر جانے کی وجہ سے بول چال سے منقطع ہو جانا *۔ صرف ڈر کو بھی کہتے ہیں۔ سورۃ کہف میں ہے وَلَمُلِئْتَ مِنْهُمْ رُعْبًا (۱۸/۱۸)۔ ''تو ان کی وجہ سے خوف کھا جائے''۔

جماعت مؤمنین کو اسقدر قوت حاصل ہونی چاہیئے کہ میدان جنگ میں مخالفین ان کو دیکھکر رعب سے کانپنے لگ جائیں۔ لیکن یہ چیز صرف اسطرح حاصل ہوتی ہے کہ انسان دنیا میں قانون خداوندی کے علاوہ کسی اور کے سامنے نہ جھکے۔ اسی کو توحید کہتے ہیں۔ اور شرک کا لازمی نتیجہ خوف بتایا گیا ہے۔ سورۃ آل عمران میں ہے سَنُلْقِي فِي قُلُوبِ الَّذِينَ كَفَرُوا الرُّعْبَ بِمَا أَشْرَكُوا بِاللّٰهِ .... (۳/۱۵۰)۔ '' ہم کفار کے دلوں میں رعب ڈال دینگے اس لئے کہ وہ خدا کے ساتھ شرک کرتے ہیں''۔

ر ع د

رَعْدٌ بادل کی گرج۔ اسکے معنے کپکپانے اور تھر تھرانے کے بھی آتے ہیں۔ مجازاً زجر و توبیخ کو بھی کہتے ہیں۔ اَلرَّعَّادُ۔ اس آدمی کو کہتے ہیں جو بہت باتیں بناتا ہو۔ زیادہ بڑ بڑ کرتا ہو۔** ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی حرکت اور اضطراب کے ہیں۔

قرآن کریم میں یہ لفظ بادلوں کی آواز کے معنوں میں آیا ہے (۲/۱۹؛ ۱۳/۱۳)۔ وَيُسَبِّحُ الرَّعْدُ بِحَمْدِهٖ (۱۳/۱۳)۔ رَعْدٌ اپنے فرائض مفوضہ کی تکمیل میں ہمہ تن مصروف رہتی ہے اور اپنے تعمیری نتائج سے خدا کی حمد و ستائش کی زندہ پیکر بن جاتی ہے۔ (دیکھئے عنوانات س۔ب۔ح اور ح۔م۔د)۔ کائنات کی ہر قوت اپنے اپنے فرائض کی سرانجام دہی کیلئے سرگرداں رہتی ہے۔ اور ان کی نقل و حرکت کا مجموعی نتیجہ کائنات میں تعمیری اضافے ہوتا ہے۔ ہم جب ان قوتوں کو الگ الگ دیکھتے ہیں تو ہمیں بعض قوتیں محض ڈر اور خوف کا موجب نظر آتی ہیں (جیسے بجلی کی کڑک) لیکن یہ ہیئت مجموعی ان سب کا نتیجہ تعمیری ہے۔ اور یہی چیز خدا کی حمد و ستائش کی مظہر ہے۔

ر ع ن

اَلرُّعُوْنَةُ = حماقت کو کہتے ہیں۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ رُعُوْنَةٌ فکر کی کمی کو کہتے ہیں اور حُمْقٌ بطلانِ فکر کو***۔

* راغب۔ ** تاج۔ *** محیط

اَلْاَرْعَنُ ۔ وہ شخص جس کی باتوں میں بے تکا پن ہو۔ احمق ۔ سست اور ڈھیلا ۔ رَعَنَ الرَّجُلُ ۔ وہ احمق بے تکا اور ڈھیلا ہوا۔ رُعِنَ ۔ وہ بیہوش ہو گیا* ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی (۱) آگے کو ابھرا ہوا اور اونچا ہونا (۲) بے تکا پن، پریشانی اور اضطراب کے ہوتے ہیں ۔

رَاعِنَا (۲/۱۰۴) ۔ ایک کلمہ تھا جس سے یہودی رسول اللہؐ کو مخاطب کیا کرتے تھے۔ اس سے ان کا مقصد رسول اللہؐ کو رعونت سے متہم کرنا ہوتا تھا لیکن وہ اسے اس طرح بولتے تھے جس سے یہ ابہام پیدا ہو کہ وہ رَاعِنَا کہتے ہیں جس کے معنے ہیں ہماری رعایت فرمائیے ۔ ہمارا خیال رکھئیے**۔ (یوں سمجھئیے جیسے انگریزی میں کہتے ہیں (I beg your Pardon) ۔

(رَاعِنَا کے لئے عنوان ر ۔ ع ۔ ی بھی دیکھئیے)

ر ع ی

اَلرَّعْیُ ۔ گھاس ۔ الرِّعْیُ ۔ اَلْمَرْعٰی ۔ گھاس چرانا ۔ اَلْمَرْعٰی۔ چراگاہ نیز گھاس جو چری جائے ۔ رَعَیٰ ۔ یَرْعٰی ۔ رَعْیًا ۔ جانوروں نے چرا،یا جانوروں کو چرایا اور چرنے کے لئے چھوڑا (لازم و متعدی) ۔ اَلرَّاعِیْ ۔ چرواہا ۔ اس کی ایک جمع رِعَاءٌ بھی ہے دیکھئیے (۲۸/۲۳)*۔ راغب نے لکھا ہے کہ رَعْیٌ در اصل حیوان کی دیکھ بھال نگرانی اور ہر طرح سے اس کی حفاظت کرنے کو کہتے ہیں خواہ وہ غذا دیکر اس کی زندگی کی حفاظت کرنا ہو یا دشمنوں سے بچا کر** ۔ لیکن بعد میں یہ ہر چیز کی حفاظت ، نگرانی اور خیال رکھنے کے لئے بولا جانے لگا۔ مثلاً رَعٰی اَمْرَہٗ : اپنے معاملہ کا خیال رکھا اوراس کی حفاظت کی۔ رَعَی النُّجُوْمَ وَرَاعَاھَا : اس نے تاروں اور انکی رفتار میں غور کیا اور ان کا خیال رکھا*۔ اس سے مُرَاعَاۃٌ کے معنے ہیں کسی بات کا خاص خیال رکھنا ۔ کسی کی حفاظت و نگرانی کرنا ۔ رَاعٰی اَمْرَہٗ ۔ اس نے اپنے معاملہ کی اچھی طرح نگہداشت کی اور اس کے مآل پر نگاہ رکھی ۔ اَلرَّعِیَّۃُ ۔ وہ مویشی جن کی نگہداشت کی جائے اور انہیں چرایا جائے ۔ نیز وہ لوگ جنکے امور کا کوئی منتظم و نگران ہو اور جن پر کوئی نگہبان و فرمانروا ہو*۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی حفاظت اور نگہبانی کرنے کے ہیں ۔

سورۃ طٰہٰ میں ہے وَارْعَوْا اَنْعَامَکُمْ (۲۰/۵۴) ۔ "اپنے مویشیوں کو چارہ کھلاؤ" ۔ اور اَلْمَرْعٰی (۸۷/۴) کے معنے ہیں گھاس یا چارہ ۔ سورۃ حدید

*تاج ۔ **راغب ۔

میں رہبانیت کے مسلک کے متعلق ہے فَمَا رَعَوْهَا حَقَّ رِعَايَتِهَا (۵۷/۲۷) ''وہ اس کی نگہداشت نہ کرسکے جیسا کہ اس کی نگہداشت کا حق تھا''۔ سورۃ المومنون میں ہے وَالَّذِيْنَ هُمْ لِاَمٰنٰتِهِمْ وَعَهْدِهِمْ رٰعُوْنَ (۲۳/۸)۔ ''جو لوگ اپنی امانات کی حفاظت کرتے ہیں اور اپنے وعدوں کی نگہداشت رکھتے ہیں''۔

سورۃ بقرہ میں جماعت مومنین سے کہا گیا ہے کہ تم (یہودیوں کی طرح) رَاعِنَا مت کہو (۲/۱۰۴)۔ اور (۴/۴۶) میں ہے کہ وہ لوگ (یہودی) رسول اللہ کو مخاطب کرتے وقت الفاظ کو توڑ مروڑ کر کہا کرتے تھے جس سے ان کا مفہوم بدل جائے۔ انہی الفاظ میں رَاعِنَا کا لفظ بھی شامل تھا۔ یہ ان کی دناءت کی انتہا تھی کہ جوشِ مخالفت میں عام آدابِ معاشرت کو چھوڑ کر بالکل بازاری سطح پر اتر آتے تھے۔ بعض نے کہا ہے کہ وہ رَاعِناً کہدیا کرتے تھے جو رُعُوْنَت سے ہے۔ (دیکھئے عنوان ر- ع- ن)۔ لیکن صاحب المنار نے لکھا ہے کہ راعِنَا، مُرَاعَاۃ سے ہے (جو باب مفاعلہ سے ہے) اور اس باب کی خصوصیت اشتراک ہے۔ اس طرح رَاعِنَا کے معنے یہ ہوئے کہ تم ہماری رعایت کرو تو ہم تمہاری رعایت کرینگے۔ تم ہمارا خیال رکھو تو ہم تمہارا خیال رکھینگے۔ اس قسم کے کلمات رسول خدا کی شان میں استعمال کرنا کھلی بے ادبی اور گستاخی ہے**۔ یعنی انہیں غیر مشروط طور پر اطاعت رسول کا اقرار کرنا چاہئے، جو در اصل اطاعت خدا ہے اور یہی ان کا فریضۂ حیات ہے۔ انہیں رسول سے کہنا یہ چاہئے کہ اُنْظُرْنَا آپ ہم پر نگاہ رکھئے کہ ہم بے راہ نہ ہونے پائیں۔ اور اس کے بعد ان کا فریضہ یہ ہونا چاہئے کہ آپ کے تمام احکامات کو سن کر ان کی اطاعت کریں۔ وَاسْمَعُوْا (۲/۱۰۴)۔

لیکن ہمارا خیال ہے کہ اس آیت میں اہل ایمان کو ایسے قول (لہذا ایسے فعل سے بھی) روکا گیا ہے جس میں غلط اور صحیح ملتبس ہوجائیں اور حق و باطل کا امتیاز واضح نہ ہو۔ اگر کسی قول یا عمل سے اہانتِ رسول یا تنقیص توحید کا شائبہ تک بھی پیدا ہوتا ہو تو اس سے بچنا چاہئے اور محض نیک نیتی کو اس کے جواز کے لئے آڑ نہیں بنانا چاہئے۔ مسلمان کی ہر بات اور ہر عمل کو صاف، واضح اور بین ہونا چاہئے۔ ان امور میں (بالخصوص) شاعری جس قسم کا لائسنس لے لیتی ہے اس کی کبھی اجازت نہیں ہونی چاہئے۔

**المنار - جلد ۱ صفحہ ۴۱۰۔

ر غ ب

رَغْبَۃٌ کے اصلی معنے کسی چیز کے وسیع ہو جانے کے ہیں ۔ رَغُبَ الشَّیْئُ ۔ چیز وسیع ہو گئی ۔ حَوْضٌ رَغِیْبٌ ۔ وسیع حوض ۔ الرَّغْبَۃَ و الرَّغَبُ ۔ بہت زیادہ چاہنا ، ارادہ کی وسعت *۔ ابن فارس نے اس کے بنیادی معنے (۱) طلب کرنا ۔ چاہنا (۲) وسعت بتائے ہیں ۔ وَادٍ رَغِیْبٌ ۔ بڑی کشادہ وادی جس میں بہت زیادہ پانی سما جائے ۔ تَرَاغَبَ الْمَکَانُ ۔ جگہ وسیع ہو گئی ۔ اَرْغَبَ اللّٰہُ قَدْرَکَ ۔ خدا تیرے مرتبہ کو بڑھائے ۔ اَلرِّغَابُ بہت دودھ دینے والے اور کثیر المنفعت جانور ۔ نیز ہر وسیع و کشادہ چیز کو رَغِیْبٌ کہتے ہیں **۔ اسی سے راغب نے کہا ہے کہ جب رَغِبَ فِیْہِ یا رَغِبَ اِلَیْہِ کہا جائے تو اس کے معنے ہوتے ہیں ۔ (ارادے کی وسعت کے ساتھ) کسی چیز کو چاہنا اور اس کی حرص کرنا ۔ اِنَّآ اِلَی اللّٰہِ رَاغِبُوْنَ ($\frac{9}{59}$) میں بھی یہی معنے ہیں ۔ (نیز $\frac{68}{32}$) میں ۔ اور جب رَغِبَ عَنْہُ کہا جائے تو اس کا مطلب ہوتا ہے رغبت کو اس سے پھیر لینا* ۔ جیسے وَمَنْ یَّرْغَبُ عَنْ مِّلَّۃِ اِبْرَاہِیْمَ ($\frac{2}{130}$) ۔ نیز ($\frac{19}{46}$) میں رَاغِبٌ کے بعد عَنْ آیا ہے ۔ ان مقامات میں اس کے معنی پھر جانا ۔ رغبت ہٹا لینا ہیں ۔

سورۃ نساء میں ہے لَا تُؤْتُوْنَہُنَّ مَا کُتِبَ لَہُنَّ وَتَرْغَبُوْنَ اَنْ تَنْکِحُوْہُنَّ ($\frac{4}{127}$) ۔ یہاں تَرْغَبُوْنَ کا صلہ کوئی نہیں (نہ اِلٰی نہ عَنْ) لیکن سیاق عبارت کا تقاضا ہے کہ اس کا صلہ اِلٰی ہو ۔ مطلب یہ ہے کہ تم بیوہ عورتوں اور یتیم لڑکیوں کو وہ کچھ تو دینا نہیں چاہتے جو قانون خداوندی کی رو سے انہیں ملنا چاہئے اور چاہتے یہ ہو کہ ان سے نکاح کرلو ۔ تاج نے صراحت کی ہے کہ رَغِبَ فِیْہِ کے معنوں میں رَغِبَہٗ بغیر فِیْ کے بھی آتا ہے ۔ یعنی اُسے چاہا ۔ اس کا ارادہ کیا ۔

سورۃ انبیاء میں رَغَبًا بمقابلہ رَہَبًا آیا ہے ($\frac{21}{90}$) رَہَبٌ کے معنی خوف کے ہیں ۔

ر غ د

عِیْشَۃٌ رَغْدٌ و رَغَدٌ ۔ خوشگوار کشادہ اور فراخ روزی ۔ بافراغت روزی ۔ رَغِدَ عَیْشُہُمْ ۔ انکی زندگی خوشگوار اور روزی کشادہ ہو گئی ۔ اَرْغَدُوْا مَوَاشِیَہُمْ ۔ انہوں نے آزادی سے اپنے مویشی چرنے کے لئے چھوڑ دئے ۔

*راغب ۔ **تاج ۔

اَرْغَدُوْا : وہ سر سبز و شاداب جگہ پہنچے *۔ اَلرَّغَدُ مال ، پانی ، گھاس ، روزی وغیرہ کا وافر ، کثیر اور بافراط حصہ جو طبیعت میں تکدر نہ پیدا کرے اور وجہ پریشانی نہ ہو **۔

سورۃ بقرہ میں جنّت آدم کی خصوصیت یہ بتائی گئی ہے کہ اس میں رزق کی کیفیت رَغَدًا حَیْثُ شِئْتُمَا (۲/۳۵) تھی۔ یعنے جہاں سے جی چاہے نہایت فراغت سے سامان زیست مل جائے۔ اسی کے متعلق سورۃ طٰہٰ میں ہے کہ اس میں کھانے پینے کا سامان۔ لباس اور مکان (یعنے انسان کی بنیادی ضروریات زندگی) بغیر جگر پاش مشقت کے مل جاتے تھے (۲۰/۱۱۸)۔ وہ ان ضرویات سے محروم نہیں رہتا تھا۔ سورۃ نحل میں ہے یاْتِیْهَا رِزْقُهَا رَغَدًا مِنْ کُلِّ مَکَانٍ (۱۶/۱۱۲)۔ یہ اس دنیا میں جنتی معاشرہ کی بنیادی خصوصیت ہے کہ اس میں ہر فرد کو سامان زیست نہایت فراوانی سے مل جاتا ہے۔ ہر جگہ اور بافراط۔ اس میں لوگ لکیریں کھینچ کھینچ کر رزق کے سرچشموں کو اپنے قبضے میں نہیں لے سکتے۔ تمام سامان و ذرائع رزق ، نوع انسان کی پرورش اور اسکی صلاحیتوں کی نشوو نما کیلئے کھلے رہتے ہیں اور یہ اُس نظام کی ذمہ داری ہوتی ہے کہ وہ دیکھے کہ کوئی فرد سامان زیست سے محروم نہ رہنے پائے اور اسے ہر شے افراط اور فراوانی سے ملے۔ رَغَدًا حَیْثُ شِئْتُمَا۔ جہاں سے چاہے نہایت فراغت سے مل جائے۔

ر غ م

اَلرَّغْمُ ۔ (راء کی تینوں حرکتوں۔ زیر۔ زبر۔ پیش کے ساتھ)۔ ناپسندیدگی۔ کراہت۔ جبر۔ اصل میں اَلرَّغْمُ ۔ اَلرَّغَامُ ۔ خاک کو کہتے ہیں۔ اَرْغَمَهُ الذُّلُّ ۔ ذلت نے اسے خاک میں ملا دیا۔ اس سے اسکے معنے کسی سے زبردستی اطاعت کرانے کے آتے ہیں۔ ویسے اَلْمَرْغَمُ ناک کو کہتے ہیں **۔ اَلْمُرَاغَمُ ۔ وہ جگہ جہاں کوئی ، کسی سے ناراض ہو کر یا بھاگ کر چلا جائے۔ اس کے بعد اسکے معنے قلعہ نیز راستہ اور وسعت اور فراخی کے بھی لئے جانے لگے **۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس مادہ کے دو بنیادی معنی ہیں (۱) مٹی اور (۲) راستہ یا بھاگنے کی جگہ۔

قرآن کریم میں ہے کہ جو شخص نظام خداوندی کے لئے اپنی جگہ سے ہجرت کرے گا۔ یَجِدْ فِی الْاَرْضِ مُرَاغَمًا (۴/۱۰۰)۔ اسے دنیا میں بہت سی پناہ گاہیں مل جائینگی جہاں اسے وسعت اور فراخی نصیب ہوگی ***۔ اگر

* تاج و محیط۔ ** تاج۔ *** راغب۔

دشمنوں نے اس پر ایک راستہ بند کر دیا ہے تو اسے کئی راستے کشادہ مل جائیں گے۔

ر ف ت

رُفَاتٌ ۔ بھوسہ یا سوکھی چیز میں سے جھڑ جانے والا چورا۔ بوسیدہ ٹکڑے اور ریزے۔ نیز رسّی کے ٹکڑے۔ اِرْفَتَّ الحَبْلُ ۔ رسی ٹکڑے ٹکڑے ہو گئی ۔ رَفَتَہٗ ۔ یَرْفُتُہٗ ۔ کسی چیز کو توڑنا ، کوٹنا یا ہاتھ سے بُھر بُھرا دینا۔ جیسے مٹی کے ڈھیلے یا بوسیدہ ھڈی کو بھر بھرا دیا جاتا ہے *۔

سورۃ بنی اسرائیل میں ہے ءَاِذَا کُنَّا عِظَامًا وَّ رُفَاتًا (۱۷/۴۹)۔ کیا جب ہم ھڈیاں ہو جائینگے اور ایسے بوسیدہ کہ یونہی بھر بھرا جائیں یا چورا چورا ہو جائیں (تو اسکے بعد بھی اٹھائے جائینگے)؟ ۔ عصر حاضر کے مادہ پرستوں (Materialists) کی طرح ان کا بھی یہی خیال تھا کہ زندگی صرف طبیعی عناصر کے سہارے قائم رہ سکتی ہے ۔ اگر یہ سہارے ٹوٹ جائیں تو پھر زندگی کا امکان نہیں رھتا۔ ان کے اس خیال خام کی تردید کی گئی اور کہا گیا کہ جس خدا نے زندگی کو پہلی مرتبہ بلا طبیعی سہاروں کے پیدا کر دیا تھا وہ اس پر قادر ہے کہ اسے موجودہ طبیعی سہاروں کے بغیر (بلا سہارا یا کسی اور نوعیت کے سہاروں کے ساتھ) قائم رکھے ۔ (۱۷/۵۱) ۔ اسی کو حیات بعد الممات کہا جاتا ہے ۔

ر ف ث

اَلرَّفَثُ ۔ یہ ایک جامع لفظ ہے جو ان تمام باتوں کو محیط ہوتا ہے جو جنسی اختلاط کے سلسلہ میں سرزد ہوتی ہیں ۔ یعنی ابتدائی گفتگو سے لیکر انتہائی منزل تک کی تمام تفاصیل اس میں آجاتی ہیں ** ۔ محیط میں ہے کہ لغت میں اس کے اصلی معنے ہیں وہ گفتگو جو جماع کی طرف داعی ہو ۔ نیز مقدمات جماع ۔ راغب نے لکھا ہے کہ اس سے مراد وہ فحش باتیں ہیں جن کا ذکر اچھا نہیں سمجھا جاتا۔ مثلاً جماع اور دواعی جماع کا ذکر۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اَلرَّفَثُ کے اصلی معنی جماع ہیں لیکن یہ ہر اس بات کے لئے آتا ہے جس کے ظاہر کرنے سے انسان شرمائے ۔ نیز اَلرَّفَثُ فحش کلامی کو کہتے ہیں ۔ چنانچہ حج کے ضمن میں ہے فَلَا رَفَثَ (۲/۱۹۷)۔ اس سے مراد یہ

* تاج و راغب ۔ ** تاج

ہے کہ حج کے اجتماع میں کوئی فحش خیال یا ایسی بات یا حرکت سرزد نہیں ہونی چاہیئے جس میں جنسی میلان پایا جاتا ہو۔ روزوں کے سلسلہ میں قرآن کریم میں ہے اُحِلَّ لَكُمْ لَيْلَةَ الصِّيَامِ الرَّفَثُ اِلٰى نِسَآئِكُمْ (۲/۱۸۷)۔ "تمہارے لئے روزوں کی رات میں اپنی عورتوں کی طرف رفث حلال کیا گیا ہے"۔ یہاں قرآن کریم نے اِلٰی نِسَآئِکُمْ کا ٹکڑا بڑھا کر واضح کر دیا ہے کہ اس سے کنایہ جماع ہے۔

ر ف د

اَلرِّفْدُ۔ عطا۔ صلہ۔ ایسی چیز جس سے کسی کو سہارا دیا جائے۔ مدد، حصہ و نصیب۔ رَفَدَهٗ۔ یَرْفِدُهٗ۔ رَفْدًا۔ اسنے اسکی مدد کی۔ اسے دیا۔ اَلْاِرْفَادُ۔ مدد دینا۔ عطا کرنا۔ اصل میں الاِرْفَادُ زین یا کجاوہ کے نیچے کپڑا وغیرہ (رِفَادَةٌ) رکھنے کو کہتے ہیں تاکہ جانور کی پیٹھ زخمی نہ ہو جائے۔ اَلرِّفَادَةُ۔ کپڑے کا ٹکڑا یا پھاہا جس سے زخم کا مداوا کیا جائے۔ نیز وہ عطیہ اور چندہ جو (زمانۂ جاہلیت میں) قریش اکھٹا کرکے اس سے محتاج حاجیوں کے لئے کھانے پینے کا سامان خریدا کرتے تھے۔ اَلْاِرْتِفَادُ۔ کسب کرنا۔ کمانا *۔

سورۃ ھود میں ہے بِئْسَ الرِّفْدُ الْمَرْفُوْدُ (۱۱/۹۹) کتنا برا عطیہ اور صلہ ہے۔ کتنی بری مدد ہے جس سے ان کا مداوا کیا گیا ہے اور جس کا انہیں سہارا دیا گیا ہے۔

ر ف ع

رَفَعَ۔ یَرْفَعُ۔ بلند کرنا۔ راغب نے کہا ہے کہ رَفْعٌ کبھی تو مادی چیز جو پڑی ہوئی ہو اسے اس کی جگہ سے اٹھا کر بلند کرنے کے لئے بولا جاتا ہے۔ کبھی تعمیر کے وقت دیوار وغیرہ کو کھڑا کرنے اور اوپر لے جانے کے لئے۔ کبھی ناموری اور شہرت یا ذکر بلند کرنے کے لئے اور کبھی مرتبہ بلند کرنے کے لئے آتا ہے*۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی ہیں، اونچا کرنا اور اٹھا لینا۔ اسی سے اس کے معنی کسی چیز کو قریب کرنے کے بھی ہوتے ہیں۔ نیز پھیلانے اور ظاہر کرنے کے۔

رَفَعَ۔ متعدد معانی میں استعمال ہوتا ہے۔ اس کے بنیادی مفہوم میں شدت یا مبالغہ پایا جاتا ہے۔ یعنی جو کام کرنا اسے تیزی اور شدت سے کرنا۔

---

* تاج و راغب۔

مثلاً رَفَعَ الْبَعِيْرُ فِيْ سَيْرِہٖ ۔ اونٹ نے اپنی رفتار (بہت تیز) کر دی ۔
رَفَعَ الْقَوْمُ ۔ لوگ ملک کے بلند علاقوں پر چڑھ گئے ۔ بَرْقٌ رَافِعٌ ۔
بلندی پر چمکنے والی بجلی ۔ اَلرَّ فَاعَۃُ (را کی تینوں حرکتوں کے ساتھ)
آواز کی سختی اور شدت ۔ رَفُعَ ۔ رِفْعَۃٌ ۔ شریف اور عالی مرتبہ ہونا* ۔

قرآن کریم میں ہے رَفَعْنَا فَوْقَكُمُ الطُّوْرَ (۲/۶۳) ۔ ہم نے تمہارے سر پر طور کا پہاڑ کھڑا کر دیا تھا ۔ یعنے تم اس کے دامن میں تھے اور پہاڑ تمہارے اوپر تھا ۔ عمارت کی بلندی کے لئے تعمیر کعبہ کے ضمن میں ہے اِذْ يَرْفَعُ اِبْرٰهٖمُ الْقَوَاعِدَ (۲/۱۲۷) ۔ ''جب ابراھیم (اس گھر کی) بنیادیں اُٹھاتا تھا'' ۔ رَفَعَ صَوْتًا ۔ آواز بلند کی ۔ رَفَعَ صَوْتَهٗ فَوْقَ صَوْتِہٖ کے لفظی معنے تو کسی کی آواز پر اپنی آواز بلند کرنا ھیں لیکن اس سے مراد کسی کی رائے پر اپنی رائے کو فائق کرنا بھی ھوتا ہے (۴۹/۲) ۔ درجات کی بلندی کے لئے حضرت ادریس[ؑ] کے متعلق ہے وَّرَفَعْنٰهُ مَكَانًا عَلِيًّا (۱۹/۵۷) ۔ ''ہم نے اسے بلند درجات عطا کر دئے'' ۔ خود اللہ تعالیٰ نے اپنے آپ کو رَفِيْعُ الدَّرَجٰتِ (۴۰/۱۵) کہا ہے ۔ اس میں اگر رَفِيْعٌ کو مَرْفُوْعٌ کے معنے میں لیا جائے تو مطلب ھوگا مَرْفُوْعٌ عَنِ الدَّرَجٰتِ ۔ یعنی وہ بتدریج اپنے مقام بلند تک نہیں پہنچا بلکہ وہ ہے ھی اسی مقام پر مستوی ۔ مطلب یہ ہے کہ وہ تدریج اور ارتقاء کی منازل سے بلند اور بالاتر ہے ۔ اس سے اقتدار اعلیٰ اور بالا دستی بھی مراد ہے ۔ نیز رَفِيْعُ الدَّرَجٰتِ کے معنی عَالِي الدَّرَجٰتِ بھی ھو سکتا ہے ۔ یعنی بلند مرتبوں والا ۔ اور اگر ھم رَفِيْعٌ کو بمعنی فاعل (یعنی رَافِعٌ) لیں تو اس کے معنی ھونگے ''درجات کا بلند کرنے والا'' ۔ سورۃ واقعہ میں جہاں خَافِضَۃٌ کے مقابلہ میں رَافِعَۃٌ آیا ہے (۵۶/۳) وہاں بھی یہی مفہوم ہے ۔ یعنی بلند مدارج و مقام پر لے جانے والی ۔ یہاں سے یہ واضح ھوجاتا ہے کہ جہاں حضرت عیسیٰ[ؑ] کے متعلق کہا گیا ہے کہ بَلْ رَّفَعَهُ اللّٰهُ اِلَيْهِ (۴/۱۵۸) تو اس کے معنے بھی یہی ھیں کہ اللہ نے ان کے مدارج بلند کر دیے اور اس طرح اپنا مقرب بنا لیا ۔ ورنہ اگر رَفَعَ کے معنے جسمانی طور پر اوپر اٹھا لینے کے لئے جائیں تو اِلَيْهِ (خدا کی طرف) کے لفظ سے یہ ماننا پڑیگا کہ خدا کسی ایک مقام پر ہے ۔ اس لئے کہ جب بھی کسی جسمانی شے کے متعلق کہا جائیگا کہ وہ فلاں کی طرف گئی ہے تو جس کی طرف وہ چیز جائیگی اس کا کوئی مقام متعین کرنا ضروری ھوگا ۔ خدا کو کسی ایک مقام میں محدود سمجھنا قرآن کریم کے خلاف ہے ۔

*تاج ۔

اس لئے بَل ْ رَّفَعَہُ اللّٰہُ اِلَیْہِ کے معنے یہی ھیں کہ اللہ نے اس کے درجات بلند کرکے اسے اپنا مقرب بنا لیا ۔ (تفصیل ان امور کی میری کتاب "شعلہ مستور" میں حضرت عیسیٰ ؑ کے تذکرہ جلیلہ میں ملیگی) ۔ نبی اکرم ؐ کے متعلق ھے وَرَفَعْنَالَکَ ذِکْرَکَ (۹۴/۴) ھم نے تیری عظمت کو تیرے لئے بہت بلند کر دیا ۔ (رَفَعَ اور صَعِدَ کے لئے دیکھئے ص ۔ ع ۔ د ۳۵/۱۰)

ر ف ف

رَفّ ۔ کے بہت سے معنے ھیں لیکن قرآن کریم میں (۵۵/۷۶) صرف رَفْرَفٌ کا لفظ آیا ھے (جو ثلاثی نہیں رباعی ھے) اس لئے ھم رفّ کی بحث کو ضروری نہیں سمجھتے ۔ رَفَّ الطَّائِرُ و رَفْرَفَ ۔ پرند نے فضا میں پر کھولے اور انہیں ھلایا ۔ الرَّفْرَفُ ۔ منتشر پتے ۔ اَلرَّفْرَفُ ۔ فرش ، بچھونے ، گدے تکیے ، نیز سبز رنگ کے گدیلے جو سونے کے لئے دری وغیرہ پر بچھائے جاتے تھے ۔ بعض نے کہا ھے کہ اس سے مراد (خیمہ کے پردے وغیرہ کا) وہ زائد حصہ (جھالر) ھے جو لٹکا رھے لیکن عام طور پر اس کے معنے فرش یا بچھونے ھی کے ھیں* ۔ ابن فارس نے رَفْرَفٌ کے معنی باغیچے ، بچھونے اور سبز کپڑے کے لکھے ھیں ۔

ر ف ق

اَلْمِرْفَقُ (جمع مَرَافِقُ) کہنی ۔ نیز نرمی و سہولت ۔ رَفَقَ النَّاقَۃَ ۔ اونٹنی کے بازو (کہنی) کو باندھ دیا تاکہ وہ بھاگ نہ جائے ۔ وہ رسی جس سے اس کے بازو کو (پچھلی ٹانگ کے ساتھ) باندھا جاتا ھے رِفَاقٌ کہلاتی ھے ۔ اسی سے اَلرِّفْقَۃُ کے معنے ھم سفر جماعت کے ھیں (کیونکہ چلتے وقت ان کی کہنیاں ایک ساتھ ھلتی ھیں) لیکن جب وہ جماعت ایک دوسرے سے الگ ھو جائے تو پھر ان کے لئے رِفْقَۃٌ کا لفظ نہیں بولا جاتا، البتہ ان میں سے ھر ایک ساتھی کو رَفِیْقٌ کہا جاسکتا ھے ۔ اَلرِّفَاقَۃُ ۔ جماعت ۔ اِرْتَفَقَ ۔ اس نے کہنی پر ٹیک لگائی ۔ اَلْمُرْتَفَقُ ۔ جس چیز پر ٹیک لگائی جائے ۔ تکیہ، سہارا*** ۔ چونکہ اس طرح ٹیک لگانے سے راحت ملتی ھے اس لئے اِرْتَفَقَ بِہٖ کے معنے ھیں اس سے فائدہ اٹھایا ۔ رَفَقَ بِہٖ یا رَفَقَ عَلَیْہِ ۔ اس کے ساتھ نرمی کا برتاؤ کیا** ۔ ابن فارس نے کہا ھے کہ اس مادہ کے بنیادی معنی سختی اور تشدد کے بغیر ایک دوسرے کے قریب اور ھمنوا ھونے اور باھم

---

*تاج و راغب ۔ **تاج ۔ ***محیط ۔

موافقت کرنے کے ہیں۔ قرآن کریم میں ہے حَسُنَ اُولٰٓئِکَ رَفِیْقًا (۴/۶۹)۔ ''یہ اچھے ساتھی ہیں''۔ ایسے رفقائے سفر جن کی رفاقت سے انسان کی خامیاں پوری ہو کر اس کی ذات کا اور معاشرہ کا توازن قائم رہے۔ اور یہ سب کچھ بطیبِ خاطر ہو۔ کشتی کے لئے یہ لفظ (۵/۹) میں آیا ہے۔ سورۃ کہف میں ہے یُھَیِّیءْ لَکُمْ مِّنْ اَمْرِکُمْ مِّرْفَقًا (۱۸/۱۶)۔ وہ تمہارے پیش نظر مقصد میں آسانیاں پیدا کر دیگا۔ اسی سورۃ میں جہنم کو سَآءَتْ مُرْتَفَقًا (۱۸/۲۹) اور جنت کو حَسُنَتْ مُرْتَفَقًا (۱۸/۳۱) کہا گیا ہے۔ یعنی ٹیک لگانے کی جگہ۔ جس کے آسرے سے اوپر اٹھا جائے۔ جہنم کی زندگی ایسی ہے جس کے سہارے انسان، زندگی کے ارتقائی منازل طے نہیں کر سکتا۔ جنت کی زندگی ایسی ہے جو انسان کے اوپر اٹھنے اور بلندیوں کی طرف جانے کا بہترین سہارا بنتی ہے۔ ایسا سہارا جس سے کبھی توازن نہیں بگڑتا (حَسُنَتْ مُرْتَفَقًا)۔ انسان اُسی سہارے سے اوپر اٹھ سکتا ہے جو اُس کے توازن کو قائم رکھے۔ توازن بگڑ جانے سے انسان لڑکھڑا کر گر پڑتا ہے۔ (سَآءَتْ مُرْتَفَقًا)۔ سہارے تو جہنمی معاشرہ میں بھی ہوتے ہیں لیکن وہ بڑے ناہموار ہوتے ہیں اس لئے انسان ان کے ذریعے اپنے پاؤں پر کھڑا نہیں ہوسکتا۔ ان سے اس کی ذات کی نشو و نما نہیں ہو سکتی۔ یہ صرف جنتی معاشرے کے سہارے ہیں جن سے افراد کی ذات کی نشو و نما ہوتی ہے اور وہ اپنا توازن قائم رکھتے ہوئے اوپر اٹھتے اور آگے بڑھتے چلے جاتے ہیں۔

ر ق ب

اَلرَّقَبَۃُ۔ گردن کو کہتے ہیں۔ رَقَبَہٗ۔ اس کی گردن میں رسی ڈالی*۔ ظاہر ہے کہ جب کسی کی گردن میں رسی ڈال دی جائے تو وہ تابع و منقاد ہوجاتا ہے، چنانچہ عرف عام میں الرَّقَبۃ غلام کے معنوں میں استعمال ہونے لگا۔ اس کی جمع الرِّقَابُ ہے۔ آیت (۲/۱۷۷) میں الرِّقَاب کے معنے غلام ہی ہیں۔ واحد کے لئے رَقَبَۃٌ (۴/۹۲) وغیرہ میں بمعنے غلام آیا ہے*۔

رَقَبَ۔ یَرْقُبُ۔ کے معنے انتظار کرنا، اور حفاظت و نگہداشت کرنا، دونوں آتے ہیں۔ جیسے وَلَمْ تَرْقُبْ قَوْلِیْ۔ (۲۰/۹۴) میں اس کے معنے جہاں انتظار کرنے کے لئے جا سکتے ہیں وہاں نگہداشت کرنا، پاس اور لحاظ رکھنا بھی ہوسکتے ہیں۔ اور (۲۸/۱۸) میں یَتَرَقَّبُ کے بھی یہی معنی ہیں، لیکن باب کی خاصیت کے لحاظ سے اس میں بار بار کوشش اور تجسس سے

*تاج۔

کسی چیز کا انتظار کرنا اور نگہداشت کرنا مراد ہوگا۔ تاج میں اس کے معنی کسی چیز کی توقع کرنا اور اس کا انتظار کرنا لکھے ہیں ۔ راغب نے اسکے معنے انتظار کرتے ہوئے کسی چیز سے بچنا کئے ہیں ۔ مطلب یہ ہے کہ انہیں باربار اس کا خیال آتا تھا اور گردن اٹھا اٹھا کر دیکھتے تھے کہ کوئی آ تو نہیں رہا ۔ الرَّقِیْبُ کے معنے ہیں کسی چیز کی حفاظت اور نگہداشت کرنے والا اور کسی چیز کا انتظار کرنے والا ۔ نگران اور حفاظت کرنے والا ۔ ان معنوں میں وَ کَانَ اللّٰهُ عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ رَّقِیْبًا (۳۳/۵۲ و ۴/۱) آیا ہے ۔ (۵۰/۱۸) میں رَقِیْبٌ بھی انہی معنوں میں آیا ہے ۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی کسی چیز کی دیکھ بھال کے لئے کھڑے رہنے کے ہیں۔ گردن کو بھی اَلرَّقَبَۃُ اس لئے کہتے ہیں کہ وہ ایستادہ رہتی ہے ۔

بات کا لحاظ رکھنے اور پاسداری کرنے کے لئے یہ لفظ (۹/۸) میں آیا ہے ۔ اور جیسا کہ اوپر کہا گیا ہے، (۲۰/۹۴) میں بھی اسکے یہ معنے ہوسکتے ہیں ۔

اِرْتَقَبَ الشَّیْءَ ۔ کسی چیز کا انتظار کیا ۔ اِرْتَقَبَ الْمَکَانَ ۔ کسی جگہ کے اوپر چڑھنا ۔ بلند ہونا۔ مَرْقَبَۃٌ ۔ چڑھنے کی جگہ ۔ اَلتَّرَقُّبُ تحفظ اور ڈرنے گھبرانے، دونوں معنوں میں آتا ہے*سورۃ دخان میں فَارْتَقِبْ آیا ہے (۴۴/۱۰ و ۴۴/۵۹) ۔ اس کے معنے انتظار کرنے کے ہیں ۔ سورۃ یونس میں اس حقیقت کو ان الفاظ میں بیان کیا گیا ہے قُلْ فَانْتَظِرُوْا اِنِّیْ مَعَکُمْ مِنَ الْمُنْتَظِرِیْنَ (۱۰/۱۰۲) ۔ "ان سے کہو کہ تم انتظار کرو، میں بھی تمہارے ساتھ انتظار کرنے والوں میں سے ہوں" ۔

ر ق د

اَلرَّقْدُ ۔ اَلرُّقَادُ ۔ اَلرُّقُوْدُ ۔ سونا (نَوْمٌ)*۔ قرآن کریم میں یہ مادہ یَقَظٌ (بیداری) کے مقابلہ میں آیا ہے ۔ وَتَحْسَبُهُمْ اَیْقَاظًا وَّهُمْ رُقُوْدٌ (۱۸/۱۸) ۔ " تو خیال کرتا ہے کہ وہ جاگتے ہیں حالانکہ وہ سو رہے ہیں "۔ مَرْقَدٌ ۔ خوابگاہ (سونے کی جگہ) ۔ سورۃ یٰس میں ہے مَنْ بَعَثَنَا مِنْ مَّرْقَدِنَا (۳۶/۵۲) ۔ " ہمیں ہماری خوابگاہوں سے کس نے اٹھا دیا "۔

راغب نے کہا ہے کہ اَلرُّقَادُ تھوڑی سی خوشگوار نیند کو کہتے ہیں**۔ ان معانی کے اعتبار سے سورۃ کہف کی آیت (۱۸/۱۸) کا مفہوم واضح ہو

* تاج ۔ ** راغب ۔

جاتا ہے کہ وہ لوگ زیادہ دیر تک نہیں سوتے تھے۔ تھوڑی سی نیند کر لیتے تھے اور وہ بھی اس احتیاط کے ساتھ کہ باہر سے دیکھنے والا یہی سمجھے کہ وہ جاگ رہے ہیں۔ وہ اپنی حفاظت سے کسی وقت بھی غافل نہیں ہوتے تھے۔

ر ق ق

اَلرَّقُّ۔ اَلرِّقُّ۔ باریک جھلی یا کھال جس پر لکھا جاتا ہے۔ اَلرَّقُّ۔ سفید صحیفہ۔ سفید ورق جس پر لکھا ہوا ہو*۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی پتلا پن اور نرمی ہیں۔

اَلرَّقُّ۔ اَلرَّقِیْقُ۔ پتلی اور باریک چیز۔ اَلرِّقَّۃُ۔ طبیعت کی نرمی۔ اَلرِّقُّ۔ غلامی*۔

قرآن کریم میں ہے وَکِتٰبٍ مَّسْطُوْرٍ فِیْ رَقٍّ مَّنْشُوْرٍ (۵۲/۲-۳)۔ "لکھی ہوئی کتاب' پھیلی ہوئی باریک جھلی پر"۔

ر ق م

رَقَمَ۔ یَرْقُمُ۔ رَقْمًا۔ لکھنا۔ رَقَمَ الْکِتَابَ: کتاب کو اسطرح لکھا کہ حروف، نقاط، اعراب وغیرہ کے لحاظ سے وہ واضح اور مبین ہوئی**۔ قرآن کریم میں ہے کِتٰبٌ مَّرْقُوْمٌ (۸۳/۹)۔ واضح عبارت میں لکھی ہوئی کتاب یا نشان زدہ کتاب، کیونکہ رَقَمَ الثَّوْبَ کے معنی ہوتے ہیں کپڑے پر دھاریاں بنانا اور قیمت کے تعین کے لئے نشان لگانا۔ دَابَّۃٌ مَّرْقُوْمَۃٌ۔ وہ جانور جس کے پاؤں پر داغنے کے نشانات اور دھاریاں موجود ہوں**۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی تحریر اور لکیریں کھینچنے کے ہیں۔ وہ خلیل کے حوالے سے لکھتا ہے کہ اَلرَّقْمُ کے معنی ہیں عبارت کو علامات کے ذریعے واضح کرنا۔ اور کِتٰبٌ مَّرْقُوْمٌ کسی کتاب کو اسوقت کہیں گے جب اس کے حروف پر نقطوں کے ذریعے علامات لگا دی جائیں۔

قرآن کریم میں اَصْحٰبُ الْکَہْفِ وَالرَّقِیْمِ (۱۸/۹) آیا ہے۔ اس کے معنی عام طور پر یہ کئے جاتے ہیں کہ ان غار والوں کے حالات ایک دھات کی تختی پر لکھکر ان کے غار کے باہر لگا دیئے گئے تھے اسلئے انہیں اَصْحٰبُ الرَّقِیْمِ کہنے لگ گئے۔ چنانچہ صاحب کتاب الاشتقاق نے بھی کہا ہے کہ اَلرَّقِیْمُ فَعِیْلٌ کے وزن پر بمعنی مَفْعُوْلٌ یعنی

* تاج و راغب۔ **تاج

مَرْقُوْمٌ آیا ہے ۔ یعنی لکھی ہوئی ۔ لیکن حال کی تحقیقات کا رخ اس طرف گیا ہے کہ یہ لفظ وہی ہے جسے تورات میں رَاقِیْمْ کہا گیا ہے ۔ یہ ایک شہر کا نام تھا جو آگے چل کر پیٹرا کے نام سے مشہور ہوا اور عرب اسے بطرہ کہنے لگے ۔ یہ جزیرہ نمائے سینا اور خلیج عقبہ کے شمال کی طرف سطح مرتفع پر واقع تھا ۔ جب دوسری صدی عیسوی میں رومیوں نے شام اور فلسطین کا الحاق کیا ہے تو اس شہر نے رومی نوآبادی کی حیثیت سے بڑی شہرت اختیار کرلی ۔ پہلی جنگ عظیم کے بعد اس علاقہ کے اثری انکشافات کا سلسلہ شروع ہوا تو وہاں بڑے بڑے وسیع غار ملے ، جن کے اندر اور باہر عمارات کے نشان ملتے ہیں ۔ خیال غالب یہی ہے کہ اَصْحَابُ الْکَہْفِ وَالرَّقِیْمِ (۱۸/۹) انہی غاروں میں سے ایک غار میں جا کر پناہ گزیں ہوئے تھے جہاں بعد میں انکی یادگار کے طور پر معبد بنایا گیا تھا ۔ (نیز دیکھئے عنوان اصحاب الکہف والرقیم) ۔

ر ق و

اَلرَّقْوُ ۔ ریت کا چھوٹا سا ٹیلہ ۔ اَلتَّرْقُوَۃُ ۔ حلق کے نیچے سینے کا بالائی حصہ جہاں سانس پھولتا دکھائی دیتا ہے ۔ ہنسلی (کی ہڈی) ۔ اسکی جمع تَرَاقٍ اور اَلتَّرَاقِیْ آتی ہے * ۔ اِذَا بَلَغَتِ التَّرَاقِیَ (۲۶/۷۵) قرآن کریم میں آیا ہے ۔ یعنی " جب جان سینے کے اوپر کے حصے تک آ پہنچے گی " ۔ آخری وقت آپہنچے گا ۔ اصل مفہوم اس میں اوپر چڑھنے کا ہے ۔ چنانچہ رَقَا الطَّائِرُ کے معنے ہیں پرندہ اپنی اڑان میں بلند ہو گیا ۔ (اس کے لئے عنوان ر ۔ ق ۔ ی بھی دیکھئے) ۔

ر ق ی

رَقِیَ ۔ یَرْقٰی ۔ رَقْیاً ۔ رُقِیًّا اوپر چڑھنا ۔ نیز اِرْتَقٰی و تَرَقّٰی ۔ اوپر چڑھنا * ۔ قرآن کریم میں ہے اَوْتَرْقٰی فِی السَّمَآءِ (۹۳/۱۷) " یا تو آسمان پر چڑھ جائے " ۔ اَلتَّرْقُوَۃُ ۔ ہنسلی ، نیز سینے کے اوپر حلق کے آگے کا حصہ جہاں سانس چڑھتا ہے ۔ جمع تَرَاقٍ اور اَلتَّرَاقِیْ ** ۔ قرآن کریم میں ہے اِذَا بَلَغَتِ التَّرَاقِیَ (۲۶/۷۵) ۔ نیز دیکھئے عنوان (ر ۔ ق ۔ و ۔) اَلرُّقْیَۃُ ۔ جھاڑ پھونک ۔ رَقَاہُ رَقْیاً ۔ وَرُقِیًّا ۔ وَرُقْیَۃً ۔ اسنے اس پر جھاڑ پھونک کی ۔ رَاقٍ ۔ جھاڑ پھونک کرنے والا ۔ * قرآن کریم میں ہے مَنْ رَّاقٍ (۲۷/۷۵) ۔

* تاج و محیط ۔ ** بعض اہل لغت نے لفظ التراقی کی ت کو اصلی مانا ہے لیکن ہمارا راجح خیال یہ ہے کہ اس میں ت زائد ہے اور اس کا مادہ ر ۔ ق ۔ و ہے ۔

کون ہے جو جھاڑ پھونک سے اسکی جان بچا لے ؟ ابن فارس نے کہا ہے کہ رَقْیٌ کے بنیادی معنی میں (۱) چڑھنا اور (۲) تعویذ منتر وغیرہ شامل ہیں۔ اَلْمِرْقَاۃُ والْمَرْقَاۃُ۔ سیڑھی کو کہتے ہیں *۔ اَلتَّرَقَّاءُ۔ پہاڑوں پر چڑھنے والا *۔

ر ک ب

رَکِبَہٗ یَرْکَبُہٗ۔ رُکُوْبًا۔ کسی چیز پر چڑھنا ، بلند ہونا ، سوار ہوا *۔ خواہ جانور پر ہو یا کشتی وغیرہ پر۔ اِذَا رَکِبَا فِی السَّفِیْنَۃِ (۱۸/۷۱)۔ '' جب وہ دونوں کشتی پر سوار ہوئے ''۔ رَاکِبٌ۔ سوار۔ اسکی جمع ہے اَلرَّکْبُ (۸/۴۲) اور رُکْبَانٌ (۲/۲۳۹) بمقابلہ رِجَالاً۔ یعنی پیدل۔ اَلرِّکَابُ۔ وہ اونٹ جن پر سواری کی جائے (۵۹/۶) (اسکا واحد رَاحِلَۃٌ ہے جو اس مادہ سے نہیں ہے)۔ اَلْمَرْکَبُ (جمع اَلْمَرَاکِبُ)۔ جس پر سواری کی جائے۔ رَکُوْبٌ۔ سواری کا جانور (۳۶/۷۲)۔

رَکَّبَ۔ ایک چیز کو دوسری چیز کے اوپر رکھنا۔ جمانا *۔ چڑھانا **۔ ترکیب دینا۔ (۸۲/۸) مُتَرَاکِبًا۔ ایک کے اوپر دوسرا چڑھا ہوا (۶/۱۰۰)۔

انسان کے متعلق قرآن کریم میں ہے کہ وہ مختلف ارتقائی منازل طے کرتا ہوا اس مقام تک پہنچا ہے اور اب اسکے بعد مزید ارتقائی منازل طے کرتا ہوا آگے بڑھتا اور اوپر کو اٹھتا جائیگا۔ اسکے لئے سورۃ انشقاق میں ہے لَتَرْکَبُنَّ طَبَقًا عَنْ طَبَقٍ (۸۴/۱۹)۔ '' تم ایک حالت سے دوسری حالت پر چڑھتے ہوئے درجہ بدرجہ اوپر کو اٹھتے جاؤ گے ''۔ انسانی زندگی کا موجودہ مقام اسکا منتہٰی نہیں۔ اسے ابھی بہت آگے بڑھنا اور بلند ہونا ہے۔ اس لئے موت سے سلسلہ حیات ختم نہیں ہو جاتا۔ خاک کے ذرے حیاتیاتی طور پر (Biologically) ارتقائی منازل طے کرتے پیکر انسانی تک پہنچے ہیں۔ لیکن اس پیکر میں انسانی ذات طبعی ارتقاء کا نتیجہ نہیں۔ اس کے بعد اس سلسلہ ارتقاء (Evolution) کی اگلی منزل شروع ہوتی ہے۔ یعنی انسانی جسم کے بجائے انسانی ذات (Human Personality) کا ارتقاء۔ یہ ارتقاء اسی زندگی میں شروع ہو کر موت کے بعد بھی جاری رہتا ہے۔ یعنی اس کے راستے میں طبیعی موت (Physical Death) کوئی رکاوٹ نہیں۔

اس آیت کا یہ مفہوم بھی ہو سکتا ہے کہ خود انسانیت (Humanity) تہ بہ تہ اوپر کو اٹھتی چلی آرہی ہے۔ تاریخ انہی تہوں کا ریکارڈ ہے۔

* تاج۔ ** محیط۔

ر ک د

اَلرُّکُوْدُ۔ ساکن ہونا۔ اَلرَّاکِدُ۔ ٹھہری ہوئی ساکن چیز جو چلتی نہ ہو*۔ رَکَدَتِ السَّفِیْنَۃُ۔ کشتی لنگر انداز ہو گئی**۔

اَلرَّوَاکِدُ۔ چولھے کے تین پتھر جو خانہ بدوش عرب استعمال کرتے ہیں (کیونکہ وہ اپنی جگہ پر قائم رہتے ہیں)**۔

قرآن کریم میں کشتیوں کے متعلق ہے رَوَاکِدَ عَلٰی ظَھْرِہٖ (۴۲/۳۳)۔ "سمندر کی پشت پر کھڑی کی کھڑی رہ جائیں" ۔ چل نہ سکیں۔ یعنی اگر خدا کے قانون مشیت کے مطابق ہوائیں ساکن ہو جائیں تو بادبانوں سے چلنے والی کشتیاں ساکن رہ جائیں۔

ر ک ز

اَلرِّکْزُ۔ دھیمی سی آواز، آہٹ، یا آواز جو زور دار نہ ہو۔ یا انسان کی وہ آواز جو دور سے سنائی دے، جیسے شکاری کی اپنے کتوں کے لئے آواز**۔ سورۂ مریم میں ہے اَوْ تَسْمَعُ لَھُمْ رِکْزًا (۱۹/۹۸)۔ "یا ان کی دھیمی سی آواز (بھنک) بھی تمہیں سنائی دیتی ہے؟"۔ "خفی" کے اعتبار سے رَکَزْتُ کَذَا کے معنی ہوتے ہیں میں نے اسے مخفی طور پر دفن کر دیا۔ اور اَلرِّکَازُ مال مدفون کو کہتے ہیں۔ اور معدنیات کو بھی جنہیں خدا نے زمین میں مدفون رکھا ہے***۔ چونکہ جس چیز کو دبایا اور گاڑ دیا جاتا ہے وہ اپنی جگہ بالکل قائم اور ثابت رہتی ہے اسلئے اِرْتَکَزَ کے معنے ہیں وہ اپنی جگہ قائم اور ثابت ہو گیا**۔ اسی سے رَکَزَ الرُّمْحَ کے معنے ہیں اسنے نیزہ کھڑا کرکے زمین میں گاڑ دیا۔ اور اَلْمَرْکَزُ۔ نیزہ گاڑنے کی جگہ کو کہتے ہیں**۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی ہیں (۱) کسی چیز کو دوسری چیز میں اسطرح اتار دینا (گاڑ دینا) کہ وہ اس میں مستحکم ہوجائے۔ (۲) آواز۔ آہٹ۔

ر ک س

اَلرَّکْسُ۔ کسی چیز کو اسطرح پلٹانا یا موڑنا کہ اسکا اگلا سرا مڑ کر پچھلے سرے کے ساتھ جا ملے۔ کسی چیز کا اوپر کا حصہ نیچے اور نیچے کا اوپر کر دینا****۔ رِکَاسٌ۔ اس رسّی کو کہتے ہیں جس کا ایک سرا

---

*تاج و محیط و راغب۔ **تاج۔ ***راغب۔ ****محیط۔

اونٹ کی نکیل میں باندھ دیا جاتا ہے اور دوسرا سرا اس کے پاؤں سے اور اسے اتنا تنگ رکھا جاتا ہے کہ اونٹ کا سر بری طرح جھکا رہے اور وہ اسطرح سخت تکلیف میں رہے۔ یہ کچھ اسے سدھانے کیلئے کرتے ہیں۔ اِرْتَکَسَ۔ اس کا سر جھک گیا۔ وہ الٹ گیا*۔

قرآن کریم میں منافقین کے متعلق ہے وَاللّٰہُ اَرْکَسَھُمْ بِمَا کَسَبُوْا (۴/۸۸)۔ "اللہ نے انکے اعمال کی وجہ سے انکا سر جھکا دیا"۔ انہیں ذلیل و خوار کر دیا۔ انہیں سخت مصیبت میں ڈال دیا۔ یا انہیں پھر کفر میں پلٹا دیا۔ یہی معنے (۴/۹۱) میں بھی ہیں۔

ر ک ض

اَلرَّکْضُ۔ گھوڑے کو تیز دوڑانے کیلئے ایڑھ لگانا۔ پرندے کا اڑنے کیلئے پروں کو متحرک کرنا۔ اَلرَّکْضُ۔ تیز دوڑنا۔ قرآن کریم میں ہے مِنْھَا یَرْکُضُوْنَ۔ لَاتَرْکُضُوْا (۲۱/۱۲-۱۳)۔ اسکے معنے تیزی سے بھاگنے کے ہیں۔ اَلْمِرْکَضُ۔ وہ چیز جس سے آگ کو حرکت دیکر بھڑکایا جائے**۔ سورۃ ص میں حضرت ایوب ؑ کے قصہ میں ہے اُرْکُضْ بِرِجْلِکَ (۳۸/۴۲)۔ اس کے معنے چلنے کے ہیں۔ اپنے پاؤں کو تیزی سے آگے بڑھا۔ اس کے یہ معنی بھی ہو سکتے ہیں کہ اپنی ٹانگ کو (پانی میں ڈال کر اسے) حرکت دے۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ رکض کے بنیادی معنی آگے کی طرف متحرک ہونا یا متحرک کرنا ہیں۔

سورۃ انبیاء کی آیت (لَاتَرْکُضُوْا۔ ۲۱/۱۳) ایک عظیم حقیقت کی ترجمان ہے۔ ماسبق آیت میں ہے کہ جو قومیں اپنے معاشی نظام کو قوانین خداوندی کے تابع رکھنے کی بجائے اپنی تدابیر کے تابع رکھتی ہیں وہ معاشرے میں فساد پیدا کر دیتی ہیں۔ اس سے دولت کی تقسیم سخت ناھموار ہو جاتی ہے جس کا آخر الامر نتیجہ تباھی ہوتا ہے۔ لیکن وہ دولت کے نشے میں بدمست اس کا احساس نہیں کرتیں کہ وہ کس تباھی کی طرف کشاں کشاں چلی جا رہی ہیں۔ تاآنکہ جب وہ تباھی محسوس طور پر ان لوگوں کے سامنے آکھڑی ہوتی ہے تو وہ اس سے بچنے کے لئے تیزی سے بھاگنے کی کوشش کرتے ہیں۔ لیکن اس وقت خدا کا قانون مکافات انہیں آواز دیتا ہے کہ لَاتَرْکُضُوْا۔ مت بھاگنے کی کوشش کرو۔ تم اب بھاگ کر کہیں نہیں جاسکتے۔ وَارْجِعُوْا اِلٰی مَا اُتْرِفْتُمْ فِیْہِ وَمَسٰکِنِکُمْ۔ چلو واپس اپنے عظیم الشان محلوں میں اور آسائش کے مقامات میں جنہیں تم نے غریبوں کے

---

*تاج۔ ** تاج و محیط و راغب۔

خون کی رنگینی سے مزین بنا رکھا تھا۔ وہیں واپس چلو۔ لَعَلَّكُمْ تُسْئَلُوْنَ (۲۱/۱۳) تاکہ تم سے وہاں جا کر پوچھا جائے کہ یہ دولت کہاں سے آئی تھی اور ان عیش سامانیوں پر تمہارا کیا حق تھا ؟ ۔

قرآن کریم نے نظام سرمایہ داری کے انجام کا نقشہ کسقدر بین انداز میں آنکھوں کے سامنے کھینچدیا ہے ؟

ر ک ع

رَکَعَ کے معنے ہوتے ہیں منہ کے بل جھکنا یا گر جانا ۔ خواہ اس میں گھٹنے زمین پر لگیں یا نہ لگیں ۔ البتہ سر ضرور جھک جائے ۔ راغب نے کہا ہے کہ رُکُوْعٌ کے معنے جھکنے کے ہیں ۔ یہ لفظ کبھی بالخصوص جسمانی شکل میں جھکنے کے لئے اور کبھی محض عاجزی اور انکساری کے لئے بولا جاتا ہے، خواہ وہ عبادتًا ہو یا بغیر عبادت ۔ یعنے کسی کے حکم کے آگے سر جھکا دینے کے ۔ ویسے بھی بوڑھے شخص کے لئے جو کمزور و نحیف ہو جائے رَکَعَ الشَّیْخُ کہتے ہیں ، کیونکہ ایسی کمزوری میں انسان ذرا جھک جاتا ہے ۔ یا جس شخص کی حالت سقیم و خستہ ہو جائے اس کے لئے بھی رَکَعَ فُلَانٌ بولا جاتا ہے ۔ ابن فارس نے بھی اس کے بنیادی معنی جھکنے کے لکھے ہیں صاحب تاج العروس نے لکھا ہے کہ جاہلیت کے زمانہ میں عرب ، حنیف شخص کو رَاکِعٌ کہا کرتے تھے جبکہ وہ بتوں کی پرستش نہ کرتا ہو اور کہا کرتے تھے رَاکِعٌ اِلَی اللّٰہِ ۔ زمخشری نے لکھا ہے کہ اس کے معنے تھے وہ اللہ کی طرف متوجہ ہو کر مطمئن ہو گیا* ۔ رَاکِعٌ کی جمع رُکَّعٌ آتی ہے ۔

رُکُوْعٌ وَسُجُوْدٌ (دیکھئے عنوان س ۔ ج ۔ د) در حقیقت قوانین خداوندی کے سامنے سر تسلیم خم کرنے کا نام ہے ۔ سجدہ میں رکوع کی نسبت زیادہ شدت پائی جاتی ہے ۔ یعنے کامل اطاعت ۔ سورۃ بقرہ میں یہودیوں سے کہا گیا ہے وَ اَقِیْمُوا الصَّلٰوۃَ وَ اٰتُوا الزَّکٰوۃَ وَ ارْکَعُوْا مَعَ الرّٰکِعِیْنَ (۲/۴۳) ۔ یعنے جو جماعت مومنین ، قوانین خداوندی کے سامنے اپنا سر جھکائے ہوئے ہے ، تم بھی ان میں شامل ہو کر اسی طرح ان قوانین کی اطاعت کرو ۔

چونکہ انسان کے جسم کی حرکات اس کے دل کے جذبات کی ترجمان ہوتی ہیں ۔ (مثال کے طور پر جب ہم "نہیں" کہتے ہیں تو اس کے ساتھ ہی ہمارا سر خود بخود

*تاج ۔

دائیں بائیں هل جاتا هے اور جب ''هاں،، کہتے هیں تو اس کی حرکت خود بخود اوپر نیچے هو جاتی هے)۔ اس لئے قوانین خداوندی کے سامنے سرتسلیم خم کرنے کی محسوس ترجمانی اجتماعاتِ صلٰوۃ میں رُکُوْعٌ اور سَجْدَۃٌ کی شکل میں هوتی هے۔ تَرَاهُمْ رُكَّعًا سُجَّدًا ۔ ۔ ۔ سِيْمَاهُمْ فِيْ وُجُوْهِهِمْ مِنْ أَثَرِ السُّجُوْدِ (۴۸/۲۹) ۔ ''تو انہیں رکوع و سجود کرتے هوئے دیکھتا هے ۔ ۔ ۔ اطاعت کے اثر سے ان کی قلبی کیفیات ان کے چہروں پر (ظاهر) هیں''۔ ظاهر هے کہ اگر کوئی شخص نماز میں رکوع اور سجدہ تو کرے لیکن اپنی زندگی غیر خدائی قوانین کے تابع بسر کرے، تو اس کے یہ رکوع و سجود منشائے خداوندی کے مطابق نہیں هونگے۔ یعنی وہ چند منٹ کے لئے (اور وہ بھی بظاهر) خدا کے سامنے جھکتا هے لیکن اپنی پوری زندگی میں عملاً غیر اللہ کے سامنے جھکتا رهتا هے۔ اس لئے اس کے یہ رکوع اور سجود خدا کی اطاعت کی علامات نہیں هیں۔ سچا رکوع اور سجدہ یہ هے کہ انسان کا دل قوانین خداوندی کے سامنے جھک جائے، اور دل کے جھکنے کے ساتھ اس کا سر بھی تعظیماً جھک جائے۔ اجتماعات صلٰوۃ کی محسوس حرکات سے بھی مقصود هے۔

ر ک م

اَلرَّكْمُ ۔ کسی چیز کو اوپر تلے رکھنا اور جمع کرنا، حتکہ وہ تہ بہ تہ ڈھیر کی شکل اختیار کر جائے*۔ فَيَرْكُمَهٗ (۸/۳۷) ۔ ''وہ ان سب کو اوپر تلے ڈھیر بنا دیگا''۔ رُكَامٌ ۔ اوپر تلے رکھی هوئی چیزوں کا ڈھیر*۔ ثُمَّ يَجْعَلُهٗ رُكَامًا (۲۴/۴۳) ۔ پھر انہیں اوپر تلے رکھ کر دبیز بادل کی شکل دیدیتا هے۔ سورۃ طور میں هے سَحَابٌ مَرْكُوْمٌ (۵۲/۴۴) ۔ تہ بہ تہ بادل۔ نَاقَةٌ مَرْكُوْمَةٌ اس اونٹنی کو کہتے هیں جو بہت فربہ هو۔ جس پر چربی کی تہیں چڑھی هوئی هوں*۔

ر ک ن

رَكِنَ ۔ يَرْكَنُ (اِلَيْهِ) ۔ کسی کی طرف مائل هونا اور سکون پانا*۔ سورۃ هود میں هے وَلَا تَرْكَنُوْا اِلَى الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا (۱۱/۱۱۳) ۔ جو لوگ سرکش هیں ان کی طرف مت جھکو۔ ان کی طرف مائل مت هو۔

---

*تاج و محیط و راغب۔

سورۃ بنی اسرائیل میں ہے وَ لَوْلَا اَنْ ثَبَّتْنٰکَ لَقَدْ کِدْتَّ تَرْکَنُ اِلَیْهِمْ شَیْئًا قَلِیْلًا (۱۷/۷۴) ۔ ''اگر ہم نے تجھے ثابت قدم نہ رکھا ہوتا تو تو تھوڑا سا ان کی طرف جھک جاتا''۔ رسول کا مقام یہ ہوتا ہے کہ جہاں عام انسان (اپنے مشن کی خاطر ہی سہی) کچھ نہ کچھ دوسروں کی خاطر جھک جاتے ہیں ، رسول ایسا کبھی نہیں کرتا ۔ (دیکھئے ۶۸/۹ و ۱۰/۱۵)

اَلرُّکْنُ ۔ وہ چیز جس سے کسی کو تقویت پہنچتی ہو۔ سہارا ۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی قوت کے ہیں ۔ رُکْنٌ کسی چیز کے قوی ترین پہلو کو کہتے ہیں ۔ سورۃ ہود میں ہے اٰوِیْ اِلٰی رُکْنٍ شَدِیْدٍ (۱۱/۸۰) میں ایک محکم سہارے کی پناہ لے لوں ۔ ابن فارس نے رُکْنٌ شَدِیْدٌ کے معنی عزت و غلبہ بتائے ہیں جس کی وجہ سے کسی کو تاب مخالفت نہ ہوسکے۔ اَرْکَانُ الشَّیْءِ ۔ چیز کے اطراف و جوانب ۔ وہ سہارے جن پر وہ چیز قائم ہو* ۔

ر م ح

اَلرُّمْحُ ۔ (جمع رِمَاحٌ) ۔ نیزہ* ۔ قرآن کریم میں ہے تَنَالُهٗ اَیْدِیْکُمْ وَ رِمَاحُکُمْ (۵/۹۴) ۔ ''جس تک تمہارے ہاتھ اور تمہارے نیزے پہنچ سکتے ہیں'' ۔

(مجازاً عربوں میں فقر و فاقہ کو بھی اَلرُّمْحُ کہتے ہیں** ۔ تاج میں اس معنے کے لئے بجائے رُمْحٌ کے رَمَّاحٌ لکھا ہے)۔

ر م د

اَلرَّمَادُ ۔ راکھ کو کہتے ہیں ۔ خاکستر* ۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اَلرَّمَدُ ہر اس چیز کو کہتے ہیں جس کا رنگ غبارآلود اور گدلا ہو، یعنی خاکستری رنگ۔ رَمَادَۃٌ ۔ ہلاکت ۔ تباہی ۔ اَرْمَدَ الْقَوْمُ ۔ لوگ خشک سالی میں مبتلا ہوئے اور ان کے مویشی تباہ ہوگئے* ۔

قرآن کریم میں غلط روشِ زندگی پر چلنے والوں کے اعمال کو ایسی رَمَادٌ سے تشبیہ دی گئی ہے جس پر سخت تیز ہوا چلے (۱۴/۱۸) ۔ ظاہر ہے کہ ایسے جھکڑ میں اس خاکستر کا نام و نشان تک باقی نہیں رہ سکتا ۔ غلط نظام اور غلط عمل ، زمانے کے تند و تیز تقاضوں اور شدید حوادث کے سامنے ٹھہر ہی نہیں سکتے ، اگرچہ (راکھ کے ڈھیر کی طرح) وہ بہت بڑے اور زیادہ نظر آتے ہیں۔

*تاج و راغب و محیط ۔ ** محیط ۔

ر م ز

اَلرَّمْزُ کے معنے جنبش و حرکت کے ہیں*۔ ابن فارس نے اس کے بنیادی معنے حرکت و اضطراب بتائے ہیں۔ اَلرَّمِیْزُ۔ کثیر الحرکت کو کہتے ہیں۔** اسی سے اس کے معنے اشارے کے ہیں خواہ وہ ہونٹوں سے کیا جائے یا آنکھوں سے یا ابروؤں سے یا منہ، ہاتھ اور زبان سے۔ اور اس کے ساتھ آواز نہ ہو۔ اور اگر آواز ہو تو ہلکی سی، جیسے کانا پھوسی میں ہوتی ہے۔**

سورۃ آل عمران میں حضرت زکریا[ؑ] کے متعلق ہے........ اَلَّا تُكَلِّمَ النَّاسَ ثَلٰثَةَ اَيَّامٍ اِلَّا رَمْزًا (۳/۴۱)۔ "تو تین دن تک لوگوں سے اشارے کے سوا بات نہ کرے گا"۔ شریعت یہود میں، روزے میں بات کرنا بھی منع تھا۔ یا ایسے روزے بھی رکھے جاتے تھے جن میں چپ رہنے کی نیت کی ہو (دیکھئے، ۱۹/۲۶)۔

ر م ض

اَلرَّمَضُ۔ ریت وغیرہ کا سخت دھوپ سے تپ جانا۔ اَلرَّمَضُ۔ اَلرَّمْضَاءُ۔ سخت گرمی اور تپش**۔ شَهْرُ رَمَضَانَ۔ (رمضان کا مہینہ) قدیم عربی میں اس مہینے کو نَاتِق* کہتے تھے۔ جب مہینوں کے نام بدلے گئے (یہ بھی زمانہ قبل از اسلام کی بات ہے) تو چونکہ یہ مہینہ (اس تبدیلی نام کے وقت) سخت گرمی میں پڑتا تھا اسلئے اسکا نام رَمَضَانُ ہو گیا**۔ اس مہینے میں نزولِ قرآن کا آغاز ہوا تھا (۲/۱۸۵)۔

قمری مہینوں کے لحاظ سے کوئی مہینہ ہمیشہ اُسی موسم میں نہیں آ سکتا۔ اسلئے اب رمضان کا مہینہ سخت سردی میں بھی آجاتا ہے۔ لیکن بایں ہمہ یہ کہلاتا رمضان ہی ہے۔ (مہینوں کی تبدیلی کے سلسلہ میں دیکھئے عنوان ن۔ س۔ أ)۔

ر م م

رَمَّ الْعَظْمُ: ہڈی گل سڑ گئی اور بوسیدہ ہو گئی۔ رَمَّ الشَّيْءَ رَمًّا و ارْتَمَّهُ۔ اس نے اس چیز کو مکمل طور پر کھا لیا۔ اَلرِّمَّةُ۔ بوسیدہ ہڈیاں۔ اَلرُّمَّةُ۔ بوسیدہ رسی۔ اَلرَّمِيْمُ۔ گذشتہ سال کے پودوں میں سے جو کچھ بچ جائے۔ نیز ہر پرانی اور بوسیدہ چیز کو بھی کہتے ہیں۔ اَلرَّمُّ

*محیط۔ **تاج۔

خشک گھاس کا چورا۔ بھوسہ ۔ پانی کے اوپر بہ جانے والا کچرا ۔اَلْاِرْمَامُ ۔ خاموش ہو جانا ۔ سکوت ۔ اَلرَّمُّ ۔ بوسیدہ چیز کو درست کر دینا* ۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی چار ہوتے ہیں ۔ (۱) چیز کو درست کرنا ۔ (۲) چیز کا بوسیدہ ہو جانا ۔ (۳) خاموش رھنا ۔ اور (۴) باتیں کرنا (اضداد میں سے ہے) ۔

قرآن کریم میں ہے مَنْ یُّحْیِ الْعِظَامَ وَھِیَ رَمِیْمٌ (۳۶/۷۸) ۔ "ھڈیاں جب بوسیدہ ہوجائیں تو انہیں کون زندہ کر سکتا ہے"۔ سورۃ ذاریات میں اُس تباہ کن آندھی کے متعلق ہے جو قوم عاد پر چلی تھی کہ مَا تَذَرُ مِنْ شَیْءٍ اَتَتْ عَلَیْہِ اِلَّا جَعَلَتْہُ کَالرَّمِیْمِ (۵۱/۴۲) ۔ "وہ کسی شے کو نہیں چھوڑتی تھی جس پر آتی تھی بجز اس کے کہ اسے چورا کر کے رکھ دیتی تھی" ۔

ر م ن

اَلرُّمَّانُ ۔ انار ۔ (درخت ہوں یا پھل ، واحد رُمَّانَۃٌ) ۔ غالباً انار کی تاثیر کی وجہ سے (جو دل کو قرار دیتی ہے) رَمَنَ بِالْمَکَانِ کے معنی ہیں وہ اس جگہ مقیم ہو گیا**۔ قرآن کریم نے انگور ۔ زیتون ۔ اور اناروں کے باغات کا ذکر کیا ہے ۔ وَجَنّٰتٍ مِّنْ اَعْنَابٍ وَّ الزَّیْتُوْنَ وَ الرُّمَّانَ (۶/۱۰۰) ۔

ر م ی

رَمَی الشَّیْءَ ۔ رَمٰی بِہٖ ۔ کسی چیز کو پھینک دینا یا ڈال دینا ۔ یعنی گرا دینا ۔رَمَی السَّھْمَ عَنِ الْقَوْسِ ۔ کمان سے تیر پھینکا ۔اَلْمِرْمَاۃُ چھوٹا تیر ۔ خَرَجَ یَتَرَمّٰی ۔ وہ تیر سے شکار کرنے کے لئے نکلا ۔ اَلْمَرْمٰی ۔ وہ نشان (ھَدَفْ) جسکی طرف تیر پھینکے جاتے ہیں*** ۔

سورۃ مرسلٰت میں ہے اِنَّھَا تَرْمِیْ بِشَرَرٍ (۷۷/۳۲) ۔ "وہ چنگاریاں پھینکتی ہے" ۔ سورۃ فیل میں ہے تَرْمِیْھِمْ بِحِجَارَۃٍ (۱۰۵/۴) "تو ان پر پتھر پھینکتا تھا"۔ سورۃ انفال میں ہے وَمَا رَمَیْتَ اِذْ رَمَیْتَ وَلٰکِنَّ اللّٰہَ رَمٰی (۸/۱۷) ۔ جنگ بدر میں جو تیر اندازی تیری طرف سے ہو رہی تھی وہ تیری طرف سے نہیں بلکہ در حقیقت اللہ کی طرف سے تھی ۔ اس لئے کہ یہ تمام

*تاج و محیط و راغب ۔ ** تاج و محیط ۔ ***تاج ۔

لڑائیاں خدا کے حکم کے ماتحت اس کے نظام کو بلند کرنے کے لئے لڑی گئی تھیں ۔ کمانڈر جب حکومت کے حکم سے فوج کشی کرتا ہے تو وہ جنگ اس حکومت کی طرف سے سمجھی جاتی ہے ۔ یا جب فوج کمانڈر کے حکم سے حملہ کرتی ہے تو وہ حملہ کمانڈر کی طرف سے متصور ہوتا ہے ۔

اس آیت میں رَمَیْتَ کا کوئی مفعول بہ مذکور نہیں اور یہ بھی واقعہ ہے کہ رَمٰی کے بعد مختلف مفعول بہ آنے سے ان کے مطابق ہر جگہ الگ معنی ہوتے ہیں ۔ لیکن اس آیت میں میدان جنگ کا ذکر ہے اور پہلے فَلَمْ تَقْتُلُوْهُمْ کہکر یہ واضح کر دیا ہے کہ یہاں دشمنوں کے قتل کا تذکرہ ہے ۔ اس لئے رَمَیْتَ سے تیر اندازی ہی مراد لیا جاسکتا ہے ۔ ویسے بھی (لین نے مختلف اسناد سے لکھا ہے کہ) جب تنہا رَامَیْتُہٗ یا مُرَامَاۃٌ* کہا جائے تو اس کے معنی تیراندازی یا سنگ باری کے ہوتے ہیں ۔

رَمَاہُ بِقَبِیْحٍ ۔ اس نے اسے برائی کے ساتھ متہم کیا* ۔ قرآن کریم میں ہے اِنَّ الَّذِیْنَ یَرْمُوْنَ الْمُحْصَنٰتِ (۲۴/۲۳) ۔ "جو لوگ پاک دامن عورتوں پر تہمت لگاتے ہیں" ۔ کسی پاکدامن کے خلاف تہمت لگانا ، "تیر اندازی" یا "سنگ باری" کی بد ترین شکل ہوتی ہے ۔ اسی لئے قرآن کریم نے اس کی سزا بھی سخت تجویز کی ہے (۲۴/۴) ۔

ر و ح

رَاحَ* ۔ رُوْحٌ* ۔ رَوْحٌ ۔ رِیْحٌ* ۔ سب ایک ہی مادہ کے الفاظ ہیں ۔ اور انہی سے رَاحَۃٌ* ۔ رَوْحَۃٌ* ۔ اِسْتِرَاحَۃٌ* ۔ تَرْوِیْحَۃٌ* ۔ رَیْحَانٌ* ۔ وغیرہ الفاظ آتے ہیں ۔ رَاحَ کے بنیادی معنے ہیں ہوا کا چلنا، ہوا کا آنا ، ہوا کا محسوس کرنا* ۔ چونکہ ہوا انبساطِ زندگی ، حرکت اور قوت پیدا کرنے کا ذریعہ ہے اس لئے اس مادہ سے بننے والی مختلف شکلوں میں یہ تمام مفہوم مضمر ہو گئے ۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی وسعت اور فراخی کے ہیں ۔

اَلرَّوْحُ ۔ راحت ۔ سرور ۔ خوشی ۔ رحمت ۔ وسعت ۔ مَکَانٌ* رَوْحَانِیٌّ* ۔ عمدہ اور پاکیزہ مکان* ۔ اَلرِّیْحُ ۔ ہوا ۔ اَلرِّیْحَۃُ ۔ ہوا کا کچھ حصہ ۔ رِیَاحٌ* ۔ اس کی جمع ہے ۔ راغب نے کہا ہے کہ قرآن کریم میں اِرسالِ رِیَاح بیشتر مقامات میں رحمت وشادمانی کے لئے استعمال ہوا ہے اور اِرسال

---

* تاج ۔

رِیْح عذاب کے لئے* - صاحب لطائف اللغۃ نے لکھا ہے کہ جب ہوا (اَلرِّیْحُ) تند و تیز ہو تو اسے اَلْعَاصِفُ کہا جاتا ہے - جو ہوائیں بادل لاتی ہیں وہ مُبَشِّرَاتٌ* کہلاتی ہیں - جو بارش لاتی ہیں انہیں اَلْمُعْصِرَاتُ کہا جاتا ہے - میدانوں اور صحراؤں میں ہلاکت انگیز ہوا کو بھی عَاصِفٌ کہا جاتا ہے - لیکن سمندر میں طوفان لانے والی ہواؤں کو اَلْقَوَاصِفُ کہتے ہیں -

اَلرِّیْحُ - نصرت - غلبہ و قوت - گردش - انقلاب - اور باری* - وَتَذْهَبَ رِیْحُكُمْ (۸/۴۶)- تمہاری ہوا اُکھڑ جائیگی- تمہاری قوت چلی جائے گی - تَرْوِیْحَۃٌ* - در اصل بہ بیٹھنے اور آرام کرنے کو کہتے ہیں یعنی سستانے کو - پھر نماز تراویح کی ہر چار رکعت کو کہتے ہیں کیونکہ چار رکعتوں کے بعد تھوڑا سا راحت کا وقفہ ہوتا ہے - اَلتَّرْوِیْحَۃُ - تنگی کے بعد فراخی مل جانا - رَاحَۃٌ* - شام کے وقت مویشیوں کا گھروں کو واپس آنا - چنانچہ اَلرَّوَاحُ - شام یا زوال آفتاب کے بعد سے رات تک کا وقت* - سورۃ سبا میں رَوَاحٌ* (شام کا سفر) بمقابلہ غُدُوٌّ (صبح کا سفر) آیا ہے - (۳۴/۱۲) -

صاحب محیط نے اَلرُّوْحُ کے معنے فرحت و مسرت ، راحت و رحمت کے علاوہ ، بادِ نسیم ، مدد - انصاف و عدل جس سے فریادی کو راحت و سکون نصیب ہو جائے ، بھی لکھے ہیں - اور اَلرُّوْحُ کے معنے(عام انسانی روح کے علاوہ) رحمت ، خدا کی طرف سے وحی اور خود قرآن کریم** - مثلاً قرآن کریم میں ہے یُنَزِّلُ الْمَلٰٓئِكَةَ بِالرُّوْحِ مِنْ اَمْرِهٖ عَلٰی مَنْ یَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖ (۱۶/۲) - یہاں اَلرُّوْحُ سے مراد وحی ہے - اور سورۃ شوریٰ میں ہے وَكَذٰلِكَ اَوْحَیْنَآ اِلَیْكَ رُوْحًا مِّنْ اَمْرِنَا (۴۲/۵۲) - یہاں رُوْحًا سے مراد خود قرآن کریم ہے - اس سے ظاہر ہے کہ سورۃ بنی اسرائیل میں جہاں کہا گیا ہے وَیَسْئَلُوْنَكَ عَنِ الرُّوْحِ قُلِ الرُّوْحُ مِنْ اَمْرِ رَبِّیْ (۱۷/۸۵) - ’’تجھ سے اَلرُّوْحُ کے متعلق پوچھتے ہیں - کہدے کہ اَلرُّوْحُ میرے رب کے امر سے ہے‘‘ - تو وہاں روح سے مراد انسانی روح (Soul) نہیں بلکہ وحی ہے - اس کی وضاحت اس سے اگلی آیت نے کر دی ہے جہاں اَوْحَیْنَآ اِلَیْكَ کہا گیا ہے - (۱۷/۸۶) - مطلب یہ ہے کہ یہ لوگ وحی کی ماہیت سمجھنا چاہتے ہیں- ان سے کہدو کہ اس کا تعلق عالم امر سے ہے - دنیائے محسوسات سے نہیں - اس لئے تم اس کی ماہیت کو نہیں سمجھ

*تاج - **محیط -

سکتے۔ اس پر ایمان لانا ہوگا۔ البتہ اس کی تعلیم کو سمجھ سکتے ہو۔ ''ماہیت'' کے معنی یہ ہیں کہ وحی کیسے ہوتی ہے۔ خدا اور نبی کا تعلق کیا ہوتا ہے۔ وغیرہ وغیرہ۔ یہ چیزیں غیر از نبی کی سمجھ میں نہیں آسکتیں۔ اسی بنا پر صاحب المنار نے لکھا ہے کہ رُوْحُ الْقُدُسِ (۲/۸۷)۔ جسکی تقویت حضرت عیسیٰؑ کو حاصل تھی، تورات اور انجیل کے احکام تھے جو انہیں بذریعہ وحی عطا کئے گئے تھے اور جو نفوس انسانیہ کو مقدس بنا دینے کا موجب تھے۔ بعض نے رُوْحُ الْقُدُسِ سے مراد جبریل لی ہے اور یہی مفہوم سورۃ الشعراء میں اَلرُّوْحُ الْاَمِیْنُ (۲۶/۱۹۳) کا لیا ہے * جہاں قرآنِ کریم کے متعلق کہا گیا ہے کہ نَزَلَ بِهِ الرُّوْحُ الْاَمِیْنُ عَلٰی قَلْبِکَ (۲۶/۱۹۲-۱۹۳)۔ اور اسکی تائید سورۃ بقرہ کی اس آیت سے ہوتی ہے جس میں جبریل کے متعلق ہے فَاِنَّهٗ نَزَّلَهٗ عَلٰی قَلْبِکَ بِاِذْنِ اللّٰهِ (۲/۹۷) اس سے ظاہر ہے کہ الروح الامین جبریل ہی کا لقب ہے۔ سورۃ نحل میں ہے قُلْ نَزَّلَهٗ رُوْحُ الْقُدُسِ (۱۶/۱۰۲)۔ لہذا روح القدس بھی جبریل ہی کو کہا گیا ہے۔ ہم چونکہ وحی کی کنہ و ماہیت کو نہیں جان سکتے اسلئے جبریل کی حقیقت سے بھی آشنا نہیں ہو سکتے۔ رُوْحٌ کے لفظ سے اس طرف اشارا ملتا ہے کہ وہ الوہیاتی توانائی ہے جو نبیؐ کے قلب پر انکشاف حقائق کرتی ہے۔ اور ملائکہ وہ کائناتی قوتیں ہیں جو قانون خداوندی کو مشہود بناتی ہیں۔ اسی لئے قرآن کریم میں مَلٰٓئِکَۃٌ اور رُوْحٌ کا الگ الگ بھی ذکر آیا ہے (۹۷/۴ ؛ ۷۸/۳۸ ؛ ۷۰/۴)۔

قرآن کریم میں انسانی تخلیق کے سلسلہ میں ابتدائی کڑیاں تو وہی ہیں جو عام حیوانات کی تخلیق سے متعلق ہیں۔ لیکن اسکے بعد انسان کو دوسرے حیوانات سے یہ کہہکر ممتاز کر دیا گیا ہے کہ وَنَفَخَ فِیْهِ مِنْ رُّوْحِهٖ (۳۲/۹)۔ اس میں خدا نے اپنی ''روح'' پھونکی۔ اور اسکا نتیجہ یہ بتایا ہے کہ وَجَعَلَ لَکُمُ السَّمْعَ وَالْاَبْصَارَ وَالْاَفْئِدَۃَ (۳۲/۹)۔ انسان کو سمع و بصر یعنے ذرائع علم اور قلب عطا کیا۔ ظاہر ہے کہ اس میں ''روح خداوندی'' سے مراد وہ الوہیاتی توانائی ہے جسے انسانی ذات (Personality) یا نفس (Self) کہتے ہیں اور جس سے انسانی خصوصیات وابستہ ہیں۔ یہ (انسانی خودی) ہر انسان کو یکساں طور پر ملی ہے۔ اسکے بعد دیکھنا یہ ہوگا کہ انسان اسے کس حد تک نشوونما دیتا ہے۔ اسکی کتنی

*تفسیر المنار ــــ تاج۔

(Deyelopment) کرتا ہے۔ روحانیت سے یہی مراد ہے اور یہ نشوونما قرآنی معاشرہ کے اندر ہوتی ہے۔

اس مقام پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس "توانائی" یعنی "رُوْحٌ"، کو "روحنا" (ہماری روح) کیوں کہا ہے؟ کیا یہ چیز "ذاتِ خداوندی" کا جزو ہے؟ اس سوال کا سمجھ لینا ضروری ہے۔ کائنات میں ہر جگہ توانائی پائی جاتی ہے۔ جانداروں میں اس کا اظہار زیادہ نمایاں اور محسوس طریق پر ہوتا ہے۔ یہ توانائی مادی اسباب و علل کا نتیجہ ہوتی ہے (یا یوں کہیئے کہ طبیعی قوانین کے مطابق سامنے آتی ہے) اس لئے اسے "مادی توانائی" کہتے ہیں۔ انسانی جسم کی توانائی بھی اسی زمرہ میں آتی ہے۔ لیکن انسان کے اندر ایک اور توانائی بھی ہے جس کا مظاہرہ اس کے اختیار اور ارادے کی شکل میں ہوتا ہے۔ یہ توانائی جسم انسانی کی طبیعی توانائی سے زیادہ قوی ہوتی ہے، اس لئے کہ طبعی توانائی، اس خاص توانائی کے تابع کام کرتی ہے۔ اس "توانائی" کو خدا نے اپنی طرف منسوب کیا ہے (اسے اس نے "روحنا" کہہ کر پکارا ہے۔ یعنی خدا کی روح یا توانائی) اس سے یہ بتانا مقصود ہے کہ یہ توانائی، مادی قوانین سے متعلق نہیں۔ خدا کی طرف سے براہ راست ملی ہے۔ یہ "انسانی ذات" ہے۔ اسی کو "الوھیاتی توانائی" سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ "الوھیاتی" ہمارے ہاں کی ایک قدیم اصطلاح ہے اور اس کے معنی ہیں "اللہ (خدا) کی طرف منسوب۔ لہذا "الوھیاتی توانائی" سے مراد ہے ایسی توانائی جو مادہ کی پیداوار نہیں بلکہ براہ راست خدا کی طرف منسوب ہے۔ واضح رہے کہ خود مادی توانائی بھی "غیر از خدا" کی پیدا کردہ نہیں ہوتی۔ وہ اُن قوانین کے ماتحت پیدا ہوتی ہے جو خدا نے مادہ سے متعلق متعین کر رکھے ہیں۔ "انسانی توانائی"، کو اس نے خاص طور پر اپنی طرف اس لئے منسوب کیا ہے کہ یہ حقیقت واضح ہو جائے کہ یہ "مادی توانائی" سے الگ اور ممتاز ہے۔

یہ توانائی، خدا کی ذات کا حصہ نہیں۔ "ذات" کے حصے بخرے ہو نہیں سکتے۔ اسے ذات خداوندی سے جدا شدہ حصہ سمجھنا، ہندوؤں کے فلسفہ ویدانت کا پیدا کردہ تصور ہے۔ انسانی ذات، اللہ تعالیٰ کی عطا کردہ "توانائی" ہے جو نہ اس کی ذات کا حصہ ہے۔ نہ اس کا منتہیٰ اس کی ذات سے جا کر مل جانا ہے۔ جیسا کہ اوپر کہا جا چکا ہے، یہ توانائی، غیر نشوونما یافتہ شکل (Un- Developed Form) میں ملتی ہے۔ اور اسے نشوونما

دینا ، انسانی زندگی کا مقصود ہے۔ اسی کے لئے قرآنی معاشرہ قائم کیا جاتا ہے۔ انسان کے ہر عمل کا اثر اسکی ذات پر مرتب ہوتا ہے۔ اور اس کی ذات اس کے طبیعی جسم کی موت کے ساتھ ختم نہیں ہو جاتی۔

مادی تصور حیات (Materialistic Concept Of Life) اور قرآنی تصور حیات میں فرق ہی یہ ہے کہ اول الذکر کی رو سے ، انسان عبارت ہے صرف اس کے طبعی جسم سے۔ اس جسم کی مشینری ، طبعی قوانین کے تابع سرگرم عمل رہتی ہے اور جب انہی قوانین کے مطابق وہ چلنے سے رک جاتی ہے تو اسے موت کہتے ہیں جس سے اس فرد کا خاتمہ ہو جاتا ہے۔ قرآنی تصور حیات کی رو سے ، انسان عبارت ہے اس کے طبعی جسم اور اسکی ذات سے۔ اسکی ذات ، طبعی قوانین کے تابع نہیں ہوتی اس لئے جب طبعی قوانین کے مطابق انسانی جسم کی مشینری حرکت کرنے سے رک جاتی ہے تو اس سے اس کی ذات کا کچھ نہیں بگڑتا۔ وہ اس کے بعد بھی زندہ رہتی ہے۔

جسطرح انسانی جسم کی نشوو نما کے لئے قوانین مقرر ہیں اسی طرح انسانی ذات کی نشوو نما کے لئے بھی اصول متعین ہیں۔ ان اصولوں کو مستقل اقدار کہا جاتا ہے ، جو عقل انسانی کی پیداوار نہیں۔ یہ خدا کی طرف سے بذریعہ وحی ملتے ہیں اور اب قرآن کریم کے اندر محفوظ ہیں۔ جسم اور ذات کی نشوونما کے قوانین میں بنیادی فرق یہ ہے کہ انسانی جسم کی پرورش ہر اس شے سے ہوتی ہے جسے انسان خود کھائے یا استعمال کرے۔ اس کے برعکس ، انسانی ذات کی نشو و نما ان چیزوں سے ہوتی ہے جسے انسان دوسروں کی پرورش کے لئے دے۔ قرآن کریم کے نظام ربوبیت کی عمارت اسی بنیاد پر استوار ہوتی ہے۔ انسانی ذات جوں جوں نشوونما پاتی جاتی ہے اس میں صفات خداوندی (حدود بشریت کے اندر) منعکس ہوتی جاتی ہیں۔ (مزید تفصیل ن۔ف۔س کے عنوان میں ملیگی)۔

واضح رہے کہ قرآن کریم نے کسی جگہ بھی " انسانی روح " کا ذکر نہیں کیا۔ " روح خداوندی " ہی کا ذکر کیا ہے۔ جب یہ " روح خداوندی " (الوھیاتی توانائی) انسان کو عطا کر دی جاتی ہے تو اسے ، قرآن کریم کی اصطلاح میں ، نفس کہا جاتا ہے۔ ($\frac{۹۱}{۹}$)۔

اسی کو انسانی ذات (Human personality) یا خودی (Self) یا انا (I) کہتے ہیں۔

یہ سمجھ لینا بھی ضروری ہے کہ جب ہم نے یہ کہا ہے کہ انسانی زندگی کا مقصود ، انسانی ذات کی نشوونما ہے تو اس سے یہ نہ سمجھ لیا جائے کہ قرآن کریم کی رو سے انسانی جسم اور اسکی نشوونما کچھ قیمت نہیں رکھتے۔ قرآن کریم کی رو سے انسانی جسم کی پرورش بھی نہایت ضروری ہے کیونکہ زندگی کی موجودہ سطح پر، انسانی ذات کی نشوونما، انسانی جسم کی وساطت سے ہوتی ہے۔ لہذا انسانی ذات کی نشوونما کے لئے جسم کا توانا ہونا اسی طرح ضروری ہے جسطرح انڈے کے اندر جیتا جاگتا چوزہ بننے کے لئے، انڈے کے خول کا صحیح و سلامت رہنا ضروری ہے۔ البتہ جب کبھی ایسا ہو کہ جسم کے کسی تقاضے اور انسانی ذات کے تقاضے (مستقل اقدار) میں تصادم ہو۔ ان میں (Tie) پڑ جائے، تو اسوقت، جسم کے تقاضے کو ذات کے تقاضے پر قربان کر دینا، شرط انسانیت (ایمان کا تقاضا) ہو جاتا ہے۔ جسطرح، جب انڈے کے اندر چوزے کا ''دم گھٹنے لگے''، تو وہ انڈے کے خول کو چونچیں مار مار کر توڑ دیتا ہے۔ قرآنی تعلیم کا نچوڑ ہی یہی ہے۔ یعنی جب طبعی تقاضوں میں اور مستقل اقدار میں(Tie) پڑے تو مستقل اقدار کے تحفظ کے لئے طبعی تقاضوں کو قربان کر دینا۔ اسی کو کیریکٹر کہتے ہیں۔

قرآن کریم میں اَلرَّیْحَانُ بھی آیا ہے۔ مثلاً سورۃ رحمٰن میں ہے وَالْحَبُّ ذُوالْعَصْفِ وَالرَّیْحَانُ (۵۵/۱۲)۔ اَلرَّیْحَانُ ۔ ایک خوشبودار گھاس ہوتی ہے۔ یا ہر خوشبودار گھاس — نیز سبزی، کے تختے بشرطیکہ ان میں سے خوشبو آرہی ہو اور ان پر ابتدائی پھول آرہے ہوں۔ فراء نے کہا ہے کہ کھیتی کے تنہ کو عَصْفٌ کہتے ہیں اور اسکے پتوں کو رَیْحَانٌ ۔ اَلرَّیْحَانُ اولاد کو بھی کہتے ہیں اور رزق کو بھی۔

اَرَاحَ ۔ اس نے آرام کیا ۔ مویشیوں کو شام کے وقت باڑے میں آرام کرنے کے لئے چھوڑا (۱۶/۶) ۔

ر و د

رَوْدٌ ۔ کسی چیز کی طلب میں بار بار آمد و رفت کو کہتے ہیں ۔ یعنی کسی چیز کی طلب میں چلتے رہنا ۔ پیہم حرکت میں رہنا* ۔ اَلرَّائِدُ ۔ چکی کے دستہ کو کہتے ہیں ۔ رَائِدُ الْعَیْنِ ۔ آنکھ میں پڑ جانے والا تنکا یا کچرا جو ادھر سے اُدھر اور اُدھر سے ادھر جاتا رہے ۔

* تاج و محیط ۔

اَلمَرَادُ ۔ وہ جگہ یا راستہ جہاں اونٹوں کی آمد و رفت ہوتی رہے، اونٹوں کی اس آمد و رفت کو رِیَادُ الاِبِلِ کہتے ہیں ۔ اَلرَّائِدُ ۔ وہ شخص جسے پانی یا چارہ کی تلاش میں قافلہ سے آگے بھیجدیا جائے* ۔ چونکہ رَوْدٌ کے بنیادی معنوں میں کسی کام کے لئے حرکت اور تگ و دو کا تصور نمایاں طور پر رہتا ہے لہٰذا اِرَادَةٌ کے معنے کسی چیز کی خواہش یا طلب کے ہوگئے ، لیکن پھر اِرَادَةٌ اور طَلَبٌ میں فرق یہ ہوگیا کہ طَلَبٌ تو انسان کی کسی بات یا عمل سے ظاہر ہوجاتی ہے اور اِرَادَةٌ کبھی پوشیدہ ہوتا ہے اور کبھی ظاہر** ۔ اِرادَةٌ در حقیقت دل کے کسی طرف کھنچنے اور رجحانِ درون کی وجہ سے کسی چیز کی طرف جھکنے کا نام ہے ۔ یا یہ ایسے میلان کو کہتے ہیں جس کے نتیجہ میں نفع کی توقع ہو*** ۔ راغب نے لکھا ہے کہ ارادہ ایسی قوت کو کہتے ہیں جس میں خواہش، ضرورت اور آرزو کے جذبات ملے جلے ہوں ۔ پھر اس سے مراد دل کا کسی چیز کی طرف کھنچنا ہے ، اس فیصلہ کے ساتھ کہ اسے کرنا چاہئیے یا نہیں کرنا چاہئیے ۔ ازاں بعد یہ کبھی صرف دل کے کسی طرف کھنچنے کے لئے اور کبھی محض فیصلہ کے لئے بولدیا جاتا ہے**** ۔ اس سے رَاوَدَہ کے معنے ہوئے اسے چاہا، بار بار کسی سے کسی چیز کو طلب کیا۔اس کے بعد عَنْ آنے سے یہ کسی کی مرضی کے خلاف اس سے کوئی چیز طلب کرنے کے معنوں میں بھی آتا ہے مثلاً (۱۲/۶۱) میں جہاں حضرت یوسفؑ کے بھائیوں کی یہ بات بیان کی گئی ہے کہ انہوں نے کہا کہ سَنُرَاوِدُ عَنْهُ اَبَاهُ ۔ ''ہم اسے ، اس کے باپ سے اس کی مرضی کے خلاف طلب کرینگے'' ۔ یعنی ہمارا باپ تو نہیں چاہتا کہ یوسفؑ کے بھائی کو ہمارے ساتھ جانے دے لیکن ہم اس کی مرضی کے خلاف اسے اس سے مانگیں گے۔ اَرَادَ ۔ اس نے ارادہ کیا ، چاہا ۔ یُرِیْدُ ۔ وہ ارادہ کرتا ہے ۔ ان معنوں میں یہ (۳۶/۲۳) میں آیا ہے۔ یعنی اِنْ یُرِدْنِ الرَّحْمٰنُ بِضُرٍّ ... ''اگر رحمٰن مجھے کوئی تکلیف پہنچانے کا ارادہ کرے'' ۔

رَاوَدَہٗ عَنْ نَفْسِهٖ وَعَلَيْهَا ۔ کے معنے ہیں فریب دینا ۔ دھوکا دینا ۔ پھسلانا* ۔ نیز اس کے معنے ہمبستری کی خواہش کے بھی ہوتے ہیں* ۔ اس سے قرآن کریم کی آیات (مثلاً ۱۲/۲۳ و ۵۴/۳۷) کا مفہوم واضح ہوجاتا ہے ۔ پہلی آیت میں قصہ حضرت یوسفؑ کے ضمن میں عزیز کی بیوی کے غلط ارادے کی طرف اشارہ ہے ۔ اور دوسری میں قوم لوط کی غلط روش کی طرف ۔

اَرْوَدَ فِی السَّیْرِ ۔ کے معنی ہیں وہ سفر میں پر سکون رفتار سے چلا* ۔

*تاج و محیط ۔ **تاج ۔ ***محیط ۔ ****راغب

یہیں سے رُوَیْدًا کے معنے مہلت دینے کے ہوگئے۔ قرآن کریم میں رُوَیْدًا مہلت کے معنوں میں استعمال ہوا ہے۔ فَمَهِّلِ الْكَافِرِينَ أَمْهِلْهُمْ رُوَيْدًا (۸۶/۱۷)۔ ''پس تو کافروں کو مہلت دے۔ تھوڑی سی مہلت''۔

قرآن کریم میں جہاں ''خدا کے ارادوں'' کا ذکر آیا ہے، انہیں انسانی ارادوں کی طرح نہیں سمجھنا چاہئے۔ انسانی ارادے بندھتے بھی ہیں، ٹوٹتے بھی ہیں۔ صحیح بھی ہوتے ہیں، غلط بھی۔ قابل عمل بھی ہوتے ہیں اور محض ''شاعرانہ'' بھی۔ لیکن خدا کے ارادے درحقیقت اس کے وہ فیصلے ہیں جو عالم امر سے، اس کے قوانینِ مشیت کے مطابق سرزد ہوتے ہیں اور جن کے مطابق کائنات سرگرم عمل ہے۔

ر و ع

اَلرَّوْعُ۔ حیرت و دہشت جو کسی چیز کی کثرت یا جمال کو دیکھ کر پیدا ہو۔ اَلرَّوْعَةُ۔ دہشت، نیز حسن اور جمال کا اثر۔ اَلرُّوْعُ۔ دل۔ خوف اور گھبراہٹ کا مقام*۔

قرآن کریم میں ہے فَلَمَّا ذَهَبَ عَنْ إِبْرَاهِيمَ الرَّوْعُ (۱۱/۷۴)۔ جب ابراہیم کے دل سے حیرانی اور گھبراہٹ جاتی رہی۔

ر و م

اَلرُّوْمُ۔ سلطنت روسۃ الکبریٰ (Roman Empire)۔ سورۃ روم (۳۰/۲) میں ہے کہ رومی مغلوب ہوگئے۔ یہ اس شکست کا ذکر ہے جو ایران کے بادشاہ، خسرو پرویز، کے ہاتھوں رومیوں کو پہنچی تھی۔ جس میں رومیوں کا صوبے پر صوبہ فتح ہوتا چلا گیا تھا اور جس کا سلسلہ سنہ ۶۱۰ء تک جاری رہا تھا۔ قرآن کریم نے عین اس وقت جب رومی انتہائی کمزوری میں تھے، کہا کہ چند ہی سال کے عرصہ میں وہ پھر ایرانیوں پر غالب آجائیں گے۔ چنانچہ سنہ ۶۲۴ء میں ہرقل نے نہ صرف اپنے مفتوحہ علاقے واپس لے لئے بلکہ ایران کے اندر داخل ہوکر ان کے بڑے آتشکدے کو تباہ کر دیا۔ یہ اس سال (سنہ ۲ھ میں) ہوا جب مسلمانوں کو مخالفین عرب پر، بدر کے میدان میں، پہلی فتح حاصل ہوئی تھی۔ عربوں کا قریب ترین حریف ایران تھا۔ ایران کا اتنی قوت حاصل کرلینا کہ رومن ایمپائر بھی اس کے سامنے نہ ٹھہر

*تاج و راغب۔

سکے ، عربوں کے لئے بڑی پریشانی کا موجب تھا ۔ لیکن تھوڑے ہی عرصہ میں ، انہی عربوں کو، قرآنی نظام کی بدولت اتنی قوت حاصل ہو گئی کہ ان کے سامنے نہ ایرانی سلطنت ٹھہر سکی ، نہ رومن ایمپائر — یہ سب ''نکتۂ ایمان کی تفسیر'' تھا ۔

ر ھ ب

رَھْبٌ ۔ رُھْبٌ ۔ رَھَبٌ ۔ رُھْبَۃٌ ۔ رَھْبَۃٌ وَرُھْبَانٌ ۔ کے معنے ھیں ایسا خوف جس میں احتیاط بھی شامل ھو ۔ (جیسے ھم جلنے کے خوف سے آگ سے محتاط رہتے ھیں) ۔ اَلسَّمَرُ ھَوْبٌ ۔ اَلرَّاھِبُ ۔ شیر کو کہتے ھیں * ۔ نیز اسکے معنے کمزور ھو جانے کے بھی آتے ھیں ۔ چنانچہ اَلرَّھْبُ وَالرَّھْبٰی ۔ اس اونٹنی کو کہتے ھیں جو سفر میں تھک کر لاغر ھو گئی ھو ۔ رَھِبَ الْجَمَلُ کے معنے ھیں اونٹ اٹھا لیکن کمر کے کمزور ھونے کی وجہ سے پھر بیٹھ گیا ۔ * اَلرَّھْبَانِیَّۃُ ۔ (مسلک خانقاھیت) میں خوف، احتیاط، کمزوری ، کے تمام پہلو آجاتے ھیں ۔ یعنے (بزعم خویش) خوفِ خدا کی وجہ سے لذائذ دنیوی کو ترک کر دینا (اَلاَ رْھَابُ ۔ اُن پرندوں کو کہتے ھیں جو شکار نہیں کرتے) * اور اسطرح کمزور اور لاغر ھو جانا ۔ اس قسم کے زاھد کو اَلرَّاھِبُ ۔ کہتے ھیں ۔ رُھْبَانٌ اسکی جمع آتی ھے (۹/۳۱) ۔ بعض لوگوں کا خیال ھے کہ رُھْبَانٌ فارسی کا لفظ ھے ۔ اور یہ مرکب ھے رَہْ اور بَان سے ، جسکے معنے ھیں صاحبِ زھد * ۔ ھو سکتا ھے کہ یہ فارسی لفظ ھو کیونکہ مجوسیوں کے ھاں بھی مسلک خانقاھیت رائج تھا ۔

قرآن کریم میں ھے وَاسْتَرْھَبُوْھُمْ (۷/۱۱۶) ۔ '' انہوں نے لوگوں کو خوف زدہ کرنا چاھا ''

سورۃ حشر میں ھے لَاَنْتُمْ اَشَدُّ رَھْبَۃً فِیْ صُدُوْرِھِمْ (۵۹/۱۳) ۔ '' تمہارا ڈر ان کے سینوں میں بہت زیادہ ھے '' ۔ یہاں بھی رَھْبَۃٌ کے معنے ڈر کے ھیں ۔

بنی اسرائیل سے کہا گیا تھا کہ اِیَّایَ فَارْھَبُوْنِ (۲/۴۱) تم صرف مجھ سے ڈرنا ۔ خدا سے ڈرنے کے معنے یہی ھیں کہ اسکے قوانین کی خلاف ورزی کے تباہ کن نتائج سے ڈر کر ان کی نگہداشت کی جائے اور ان سے سرکشی اختیار کرنے سے احتیاط کی جائے (رھب کے بنیادی معنے ڈرنے اور احتیاط

* تاج ۔

کرنے کے ہیں) - چنانچہ سورة انبیا میں ہے کہ حضرات انبیاء کرامؑ کا مسلک یہ ہوتا تھا کہ یَدْعُوْنَنَا رَغَبًا وَّرَھَبًا (۲۱/۹۰) - وہ زندگی کی خوشگواریوں کو حاصل کرنے (رَغَبًا) اور اسکی ناخوشگواریوں سے بچنے (رَھَبًا) کیلئے خدا کو پکارا کرتے تھے - دونوں صورتوں میں اُسی کے قانون کی طرف رجوع کیا کرتے تھے - یہ ظاہر ہے انسان کے لئے دفع مضرت اور جلب منفعت ہی وہ بنیادی جذبات ہیں جو عمل کیلئے محرک (Incentive) بنتے ہیں - حضرات انبیاء کرام ان دونوں حالتوں میں قانون خداوندی ہی کا اتباع کرتے تھے - یہی مسلک مومنین کا ہونا چاہیئے - باقی رہا رَھْبَانِیَّت کا مسلک - یعنے ترک دنیا کا مسلک - سو قرآن کریم کہتا ہے کہ اسے عیسائیوں نے خود ہی وضع کر لیا تھا - ہم نے اسے ان کے لئے تجویز نہیں کیا تھا (۵۷/۲۷) - اس کے ساتھ ہی قرآن کریم نے یہ بھی کہہ دیا ہے کہ فَمَا رَعَوْھَا حَقَّ رِعَایَتِھَا (۵۷/۲۷) - پھر وہ (اپنے اس خود ساختہ مسلک) کو بھی پوری طرح نباہ نہ سکے - یہ ہے قرآن کریم کا فیصلہ مسلک خانقاہیت کے متعلق جو تصوف کی بنیاد ہے اور جسے (بدقسمتی سے) ہمارے ہاں "مغز دین" قرار دیا جاتا ہے - جب مسلمان کے ہاتھ سے قرآن کریم کا دامن چھوٹا تو وہ تمام غیر قرآنی عناصر جنہیں قرآن کریم مٹانے کے لئے آیا تھا، ایک ایک کرکے اسلام کا جزو بنتے گئے - روما کی ملوکیت - ایران کی نسل پرستی - یہودیوں کی پیشوائیت اور روایت پرستی - اور عیسائیوں اور مجوسیوں کا مسلک خانقاہیت - سب اسلام کے اجزا بن گئے - اور اب اسلام انہی کے مجموعہ کا نام قرار پا چکا ہے - یاللعجب! لیکن اس میں مایوسی کی کوئی بات نہیں - خدا کی طرف سے عطا شدہ دین، قرآن کریم کے اندر محفوظ ہے - اور قرآن کریم کا ایک ایک لفظ، بغیر کسی آمیزش کے، ہمارے پاس موجود ہے - لہذا ہم دین خالص کو ان آمیزشوں سے بآسانی الگ کر سکتے ہیں، بشرطیکہ ایسا کرنے کی نیت ہو -

ر ھ ط

اَلرَّھْطُ - کسی آدمی کی قوم - قبیلہ - بعض نے کہا ہے کہ رَھْطٌ اس جماعت کو کہتے ہیں جس میں تین سے دس تک یا سات سے دس تک کی تعداد ہو - دوسروں نے کہا ہے اس سے کم پر بھی بولا جاتا ہے اور زیادہ پر بھی، لیکن اس میں مرد ہی ہوں، عورتیں شامل نہ ہوں* - ابن فارس نے اس کے بنیادی معنی انسانوں وغیرہ کے اجتماع کے لکھے ہیں - سورة ہود میں رَھْطٌ (۱۱/۹۱) - برادری یا قبیلہ کے لئے آیا ہے -

* تاج و راغب -

سورۃ نحل میں قوم ثمود کے سلسلہ میں آیا ہے۔ وَكَانَ فِي الْمَدِينَةِ تِسْعَةُ رَهْطٍ يُفْسِدُونَ فِي الْأَرْضِ (۲۷/۴۸) "اور شہر میں نو افراد تھے جو ملک میں فساد کرتے تھے"۔ ظاہر ہے کہ اس سے ان اکابرین قوم کی طرف اشارہ ہے جن کے ہاتھ میں زمام اقتدار تھی۔ ہر قوم۔ ملک۔ حکومت یا مملکت میں چند افراد ایسے ہوتے ہیں جو ملک میں ناہمواریاں پیدا کرنے کے موجب ہوتے ہیں۔ باقی ملک انہی کے ہاتھوں تباہ ہوتا ہے۔

ر ھ ق

رَهِقَهُ۔ يَرْهَقُهُ۔ رَهَقاً۔ اسے ڈھانپ لینا اور اس پرچھا جانا (راغب نے اس میں بزوروجبر چھاجانے کا اضافہ کیا ہے)۔ کسی چیز سے مل جانا۔ اسے آلینا اور اس سے لاحق ہو جانا *۔ وَلَا يَرْهَقُ وُجُوهَهُمْ قَتَرٌ (۱۰/۲۶)۔ ان کے چہروں پر ذلت اور سیاہی نہیں چھا جاتی۔ أَرْهَقَهُ۔ اسے اسکی طاقت سے بالاتر کسی کام کی تکلیف دی اور اس پر مجبور کیا، مشکل میں ڈالا**۔ سورۃ کہف میں ہے يُرْهِقَهُمَا طُغْيَاناً (۱۸/۸۰)۔ ان پر سرکشی کو چھا دے۔ یا انہیں سرکشی میں مبتلا کر دے۔

رَهَقٌ۔ بیوقوفی۔ حماقت۔ بد خلقی۔ تندی و طراری۔ شرکا ارتکاب*۔ ابن فارس نے اس کے معنے دھاندلی، جلد بازی اورظلم بتائے ہیں۔ فَزَادُوهُمْ رَهَقاً (۷۲/۶)۔ سو انہوں نے انہیں جہالت میں بڑھایا۔ ازھری نے کہا ہے کہ یہ دراصل إِرْهَاقٌ سے اسم ہے، جسکے معنے ہیں انسان کو کسی ایسے کام کے لئے مجبور کرنا جسکی اس میں طاقت نہ ہو*۔ سَأُرْهِقُهُ صَعُوداً (۷۴/۱۷)۔ میں اسے سخت مشقت میں مبتلا کرونگا۔

ر ھ ن

اَلرَّهْنُ۔ (جمع رِهَانٌ) وہ چیز جو بطور ضمانت تمہارے پاس، اس چیز کے بدلے میں رکھ دی جائے جسے تم سے عاریتاً لے لیا گیا ہو۔ رَهْنٌ لغت میں ثبوت اور استقرار (ٹھہرنے اور جم جانے) کےمعنوں میں آتا ہے،لیکن راغب کے نزدیک رَهْنٌ و رِهَانٌ وہ چیز ہے جو قرض میں بطور ضمانت رکھ لی جائے۔ لیکن اَلرِّهَانُ خاص طور پر اس چیز کو کہتے ہیں جو کسی مقابلہ میں شرط کے طور پر رکھ لی جائے۔ یہ زیادہ تر گھوڑ دوڑ کے لئے مستعمل ہے۔

* تاج و راغب۔ ** محیط۔

اَلرَّاهِنُ ۔ ثابت اور تیار۔ موجود اور دائم ۔ رَهَنَ الشَّيْئُ ۔ چیز دائم اور ثابت رہی* ۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنے ہیں کسی چیز کا ایک حالت پر رہنا،خواہ وہ حق کے عوض ہو یا نا حق ۔

رِجْلُهُ رَهِيْنَةٌ ۔ اس کا پاؤں مقید ہے* ۔ اَنَا رَهِيْنٌ بِكَذَا ۔ میں فلاں بات میں ماخوذ ہوں** ۔ قرآن کریم میں ہے كُلُّ امْرِئٍۢ بِمَا كَسَبَ رَهِيْنٌ (۵۲/۲۱) ۔ ہر شخص اپنے اعمال کے عوض گرو ہے ، یعنی اس کی زندگی کا فیصلہ اس کے اعمال کے نتائج پر ہے ۔ سورۃ بقرہ میں قرضہ کے سلسلہ میں جو ہدایات دی گئی ہیں ان کے ضمن میں کہا ہے کہ اگر تم سفر میں ہو اور وہاں کاتب نہ ملے تو فَرِهٰنٌ مَّقْبُوْضَةٌ (۲/۲۸۳) مستعاردی ہوئی چیزوں کے عوض کچھ چیزیں بطور ضمانت اپنے قبضےمیں رکھ لینی چاہئیں۔ اس سے ہمارے ہاں کے ''رہن بالقبضہ'' کا جواز نکالنا (جو سود ہی کی دوسری شکل ہے) بڑی زیادتی ہے ۔ ''رہن بالقبضہ'' کے معنے یہ ہوتے ہیں کہ (مثلاً) ایک کسان نے کسی سے کچھ روپیہ بطور قرض لیا اور قرض دینے والے نے اس کی کچھ زمین بطور رہن لے لی ۔ اس کے بعد اس زمین پر قرض دینے والے کا قبضہ ہوگا اور جب تک قرض ادا نہیں ہو جائے گا وہ اس کی پیداوار کھاتا جائے گا ۔ (اور اس پیداوار کو قرض میں محسوب نہیں کرے گا) ۔ اگر یہ ربوٰ نہیں تو اور کیا ہے؟

ر ہ و

اَلرَّهْوُ ۔ دونوں ٹانگوں کے درمیان کی کشادگی ۔ پانی کے جمع ہونے کی جگہ ، نیز سکون ، جس میں جوش و خروش نہ ہو ۔ اَلرَّهَاءُ ۔ ہموار اور کشادہ زمین ۔ عَيْشٌ رَاهٍ ۔ آسودہ و پرسکون زندگی ۔ اَلرَّهْوَانُ ۔ نشیبی زمین ۔ وہ گھوڑا جس کی پشت دوڑتے وقت نرم ہو*** ۔ صاحب کتاب الاشتقاق نے لکھا ہے کہ یہ لفظ اضداد میں سے ہے اور ہبوط (نیچے آنا) اور ارتفاع (اوپر جانا) دونوں کے لئے آتا ہے ۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی دو ہیں (۱) اطمینان اور سکون اور (۲) وہ جگہ جو کبھی بلند ہو جاتی ہو اور کبھی پست ۔ قرآن کریم میں ہے کہ حضرت موسیٰؑ جب بنی اسرائیل کو لیکر چلے تو ان سے کہا گیا کہ وَاتْرُكِ الْبَحْرَ رَهْوًا (۴۴/۲۴) ۔ اس کے ایک معنے تو یہ ہیں کہ تو سمندر کو پر سکون حالت میں چھوڑ دے ۔ یعنے جب حضرت

*تاج ۔ **محیط ۔ ***تاج و راغب ۔

موسیٰؑ وہاں پہنچے ہیں تو سمندر سکون کی حالت میں تھا ۔ اس میں جوش و خروش نہیں تھا ۔ وہ اترا ہوا تھا اور اس طرح اس نے خشک راستہ چھوڑ دیا تھا ۔ چنانچہ سورۃ طٰہٰ میں ہے فَاضْرِبْ لَهُمْ طَرِيقًا فِي الْبَحْرِ يَبَسًا (۲۰/۷۷)۔ ''ان کے لئے سمندر میں خشک راستہ اختیار کر'' ۔ اور اگر رَهْوًا کے معنے کشادگی کے لئے جائیں تو بھی یہی مفہوم ہوگا کہ سمندر نے (پیچھے ہٹ کر) جو راستہ کشادہ کر دیا ہے انہیں وہاں سے لے چل ۔ جس جگہ پہلے سمندر ہو وہ پست (نشیب) ہوگی اور جب وہاں سے سمندر ہٹ جائیگا تو وہ، دوسری زمین کے مقابلہ میں (جو ہنوز زیرآب ہے) بلند ہو جائیگی۔

ر و ض

رَوْضَةٌ ۔ وہ زمین جہاں خوشنما پھول ، درخت اور پانی ہو۔ خوشنما باغ جس میں نہر ہو۔ ہر سبز و شاداب جگہ جس میں، یا جس سے متصل پانی ہو۔ اس کی جمع رَوْضٌ و رِيَاضٌ و رَوْضَاتٌ ہے ۔ اگر پانی،نہ ہو تو اسے رَوْضَةٌ نہیں کہتے ۔ نیز پانی جمع ہو جانے کی جگہ ۔ أَرَاضَ الْقَوْمَ ۔ اس نے لوگوں کو سیراب کر دیا ۔ اَلرِّيَاضَةُ ۔ کسی سے بکثرت کوئی کام لیکر اسے اس کام میں ماہر ومشاق بنانا اور سدھانا*۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس مادہ کے بنیادی معنوں میں (۱) وسعت اور فراخی (۲) کسی چیز کو نرم یا کسی کام کو آسان کرنا ہیں ۔

قرآن کریم میں ہے ۔ فَهُمْ فِي رَوْضَةٍ يُحْبَرُونَ (۳۰/۱۵) ۔ ''وہ سرسبز مقام میں محفل موسیقی سے لطف اندوز ہونگے'' اس کی جمع رَوْضَاتٌ (۴۲/۲۲) میں آئی ہے ۔

ر و غ

رَاغَ الرَّجُلُ رَوْغًا ۔ کسی تدبیر کی خاطر چپکے سے ایک طرف ہٹنا یا مائل ہونا اور کترانا** ۔ پھر بقول ابن فارس ، جھکنے اور ایک حالت پر نہ رہنے کے لئے بولا جاتا ہے ۔ رَاغَ فُلَانٌ اِلٰی فُلَانٍ ۔ فلاں آدمی فلاں کی طرف چھپ کر مائل ہوا ۔ فراء نے کہا ہے رَاغَ اِلٰی أَهْلِهٖ کے معنے ہیں وہ اپنے اھل کی طرف اس طرح لوٹا کہ (سامنے والوں سے) اپنی واپسی یا اس کی غرض کو پوشیدہ رکھا ۔ أَرَاغَ ۔ اِرَاغَةً ۔ وَارْتَاغَ ۔ اس نے ارادہ کیا اور طلب کیا ۔ رِوَاغَةٌ ۔ رِيَاغَةٌ ۔ اکھاڑہ** ۔

*تاج و راغب ۔ **تاج و محیط و راغب

قرآن کریم میں قصۂ حضرت ابراھیمؑ میں ہے فَرَاغَ اِلَیٰ اٰلِهَتِهِمْ (۳۷/۹۱) ۔ اور فَرَاغَ عَلَیْهِمْ (۳۷/۹۳) ۔ رَاغَ اِلَیٰ کے معنی ھیں اپنے ارادے کو دل میں رکھ کر کسی کی طرف متوجہ ھونا ۔ اور رَاغَ عَلٰی کے معنی ھیں غلبہ کے ساتھ کسی پر ٹوٹ پڑنا* ۔ لہٰذا حضرت ابراھیمؑ کی تدبیر ایسی تھی جس میں ارادے کی پوشیدگی کا پہلو بھی تھا اور قوت و غلبہ کا بھی ۔

ر ی ب

رَیْبٌ ۔ یہ اصل میں نفسیاتی الجھن اور اضطرابِ نفس کے معنوں میں آتا ہے** ۔ نیز شک و شبہ اور بے چینی کو بھی رَیْبٌ کہدیتے ھیں*** ۔ نیز گمان اور تہمت کو بھی*** ۔ اسکے علاوہ حوادثِ روزگار گردش زمانہ اور ضرورت و حوائج کے لئے بھی اس کا استعمال ھوتا ہے*** ۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی شک کے ھیں یا شک اور خوف کے ۔ اَلرِّیْبُ ۔ جو چیز شک و اضطراب پیدا کردے ۔ نیز حاجت اور ضرورت کو بھی کہتے ھیں ۔ رَابَنِیْ الْاَمْرُ رَیْبًا کے معنے ھیں مجھے فلاں معاملہ نے شک و شبہ میں ڈالا*** ۔

سورۃ توبہ میں (مسجد ضرار کے ضمن میں) رِیْبَۃً فِیْ قُلُوْبِهِمْ (۹/۱۱۰) آیا ہے ۔ اس کے معنے اضطراب اور بے چینی کے ھیں ۔ سورۃ ابراھیم (۱۴/۹) اور سورۃ السبا (۳۴/۵۴) نیز دیگر مقامات میں مُرِیْبٌ ، شَكٌّ کی صفت بن کر آیا ہے ۔ شَكٌّ مُرِیْبٌ ۔ یعنے اضطراب اور بے چینی پیدا کر دینے والا شک ۔ (۵۰/۲۵) میں مُرْتَابٌ آیا ہے ۔ یعنی شک کرنے والا ۔ اور (۲۹/۴۸) میں اِرْتَابَ بمعنی شک کیا ۔ سورۃ الطور میں رَیْبَ الْمَنُوْنِ (۵۲/۳۰) کے معنے ھیں حوادثِ روزگار یا زمانہ کی اضطراب انگیزیاں جن کا مقابلہ حقائق تو کرسکتے ھیں ، شاعرانہ جذبات پرستی نہیں کرسکتی ۔

لہٰذا رَیْبٌ کے بنیادی معنے شک و شبہ کی وجہ سے اضطراب نفس کے ھونگے ۔ قرآن کریم نے اپنے متعلق شروع ھی میں کہدیا ہے کہ ذٰلِكَ الْكِتَابُ لَا رَیْبَ فِیْهِ (۲/۲) ۔ یہ وہ ضابطۂ حیات ہے جس میں کوئی بات ایسی نہیں جو شک و شبہ والی ھو اور اس کی وجہ سے انسان کے دل میں کسی قسم کا اضطراب اور کشمکش باقی رہے ۔ اس میں کامل سکون و اطمینان دینے والی تعلیم ہے ۔ اضطراب اور بے چینی کے لئے اس میں کوئی

*تاج و محیط و راغب **محیط ۔ لیکن اقرب الموارد میں یہ معنی الریبۃ کے دئے ھوئے ھیں ۔ ***تاج ۔

گنجائش نہیں - اس لئے کہ یہ یکسر علم و بصیرت پر مبنی اور دلائل و براهین پر قائم ہے - اور یہ ظاہر ہے کہ صحیح اطمینان علم و براهین هی سے حاصل هوسکتا ہے - اندھی عقیدت مندیوں اور توهم پرستیوں سے نہیں -

ر ی ش

اَلرِّيْشُ - اَلرِّيَاشُ - پرندے کے پر جن سے خدا ان کے جسم کو چھپاتا ہے * - انسانوں کے لباس فاخرہ اور زینت کو بھی اَلرِّيْشُ کہتے هیں - نیز خوشحالی اور معاش کی فراخی کو - چنانچہ رَاشَ فُلَانًا کے معنے هیں معاش کے سلسلہ میں اسکی مدد کی اور اسے تقویت پہنچائی - اسکی حالت کو درست کر دیا اور اسے نفع پہنچایا - رَاشَ الرَّجُلُ - آدمی آسودہ و مالدار هو گیا * - ابن فارس نے کہا ہے کہ اس مادہ کے بنیادی معنی خوش حالی کے هیں - نیز وہ عمدہ چیزیں جنہیں انسان حاصل کرتا ہے -

قرآن کریم میں لباس کے متعلق ہے کہ وہ تمہارا ستر بھی ڈھانپتا ہے اور رِيْشًا ($\frac{٧}{٢٦}$) باعث زینت بھی ہے - قرآن کریم اشیائے کائنات کے صرف افادی پہلو (Utilitarian Aspect) هی کی اهمیت پیش نہیں کرتا ، ان کے جمالیاتی گوشوں (Aesthetic Aspects) کو بھی برابر کی اهمیت دیتا ہے - حسن فطرت کی تمام رعنائیاں اور دل ربائیاں ، خالق فطرت کے اسی انداز تخلیق کی مظہر هیں - یعنی هر شے میں افادی اور جمالیاتی پہلو - مومن کی زندگی بھی ان دونوں گوشوں کی مظہر هونی چاهیئے -

ر ی ع

رَيْعٌ - هر چیز کا بڑھا هوا اور زائد حصہ - نیز هر چیز کا اول اور افضل حصہ - رَاعَ الطَّعَامُ وَغَيْرُهُ - غلہ وغیرہ زیادہ هوا ، بڑھا ، بکثرت هوا - رِيْعٌ - رَيْعٌ - بلند زمین یا بلند جگہ - كَمْ رِيْعُ اَرْضِكَ - تمہاری زمین کی بلندی کسقدر ہے - هر راستہ یا دو پہاڑوں کے درمیان کا راستہ ، نیز پہاڑ - اَلرِّيْعُ - بلند ٹیلہ - وادی کی بلند جگہ جہاں سے پانی بہ کر نیچے آتا هو - گرجا - رَيْعَانُ الشَّبَابِ - جوانی کا ابتدائی حصہ - نَاقَةٌ رِيْعَالَةٌ - بہت دودھ دینے والی اونٹنی * -

قرآن کریم میں ہے اَتَبْنُوْنَ بِكُلِّ رِيْعٍ اٰيَةً تَعْبَثُوْنَ ($\frac{٢٦}{١٢٨}$) "کیا تم هر بلند مقام پر (اپنی عظمت کی یادگار کے طور پر) کوئی نہ کوئی نشان

---

* تاج -

بنا لیتے ہو؟ اور وہ بھی بلا ضرورت"۔ اس سے مراد بلند عمارتیں ہیں جنہیں بطور یادگار (Memorials) بنایا جاتا ہے۔ اور جن کا مصرف کچھ نہیں ہوتا۔ یادگار وہی بہتر ہو سکتی ہے جو آنے والوں کے لئے نفع بخش ہو۔

ر ی ن

رَیْنٌ۔ وہ زنگ جو کسی صاف چیز پر لگ جائے*۔ میل کچیل کو بھی کہتے ہیں**۔ رَانَ ھَوَاہُ عَلَیٰ قَلْبِہٖ یَرِیْنُ۔ اسکی خواہشات اسکے دل پر غالب آگئیں۔ رِیْنَ بِالرَّجُلِ۔ آدمی ایسے مخمصہ میں گرفتار ہو گیا جس سے نکلنا اسکے بس میں نہیں رہا۔ اَلرَّیْنَۃُ۔ شراب کو بھی کہتے ہیں کیونکہ وہ عقل پر غالب آجاتی ہے***۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی ڈھانکنے کے ہوتے ہیں۔

قرآن کریم میں ہے رَانَ عَلَیٰ قُلُوْبِھِمْ مَا کَانُوْا یَکْسِبُوْنَ (۸۳/۱۵)۔ "اُن کے اعمال اُن کے دل پر زنگ بن کر چھا گئے"۔ غور کیجئے۔ دلوں پر مہریں کہیں باہر سے نہیں لگتیں۔ انسان کے اپنے اعمال ہی زنگ اور مہریں بن جاتے ہیں۔ اسی کو خَتَمَ اللہُ عَلَیٰ قُلُوْبِھِمْ (۲/۷) کہا گیا ہے۔ اس لئے کہ یہ سب کچھ خدا کے قانون مکافات عمل کے مطابق ہوتا ہے۔ یعنی انسانوں کے اعمال، جن کا نتیجہ خدا کے قانون مکافات عمل کی رو سے یہ ہوتا ہے کہ انسان میں سمجھنے سوچنے کی صلاحیت ہی باقی نہیں رہتی۔ وہ سطحی جذبات میں ایسا ڈوبتا ہے کہ غور و فکر کے راستے اس پر مسدود ہو جاتے ہیں۔

---

* راغب۔ ** تاج۔ *** محیط۔

ز

ز ب د

اَلزَّبَدُ ۔ پانی وغیرہ کے اوپر آجانے والے جھاگ *۔قرآن کریم میں ہے زَبَدًا رَّابِیًا (۱۳/۱۷)۔ اوپر آئے ہوئے جھاگ ۔ اَلزُّبْدُ ۔ مسکہ جس سے گھی بنایا جاتا ہے ۔ تَزَبَّدَہٗ ۔ اس نے اس کا خلاصہ لے لیا* ۔

ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنے ایک چیز سے دوسری چیز پیدا ہونے کے ہیں ۔راغب نے لکھا ہے کہ بطور استعارہ زَبَدٌ کثیر شے کے لئے بولا جاتا ہے ۔

ز ب ر

اَلزَّبْرُ ۔ لکھنا ۔ اَلتِّزْبِرَۃُ ۔ لکھائی یا تحریر۔مِزْبَرٌ ۔ قلم ۔ اَلزَّبُوْرُ ۔ بمعنے مَزْبُوْرٌ۔یعنی لکھی ہوئی چیز ۔ کتاب *۔اسکی جمع زُبُرٌ ہے ۔

سورۃ نحل میں ہے کہ رسولوں کو اَلْبَیِّنٰتِ وَالزُّبُرِ دیکر بھیجا گیا (۱۶/۴۴) نیز (۲۶/۱۹۶)۔ یہاں زُبُرٌ کے معنے کتابیں ہیں ۔ دوسرے مقامات پر بِالْبَیِّنٰتِ وَالزُّبُرِ وَالْکِتٰبِ الْمُنِیْرِ (۳/۱۸۳؛ ۳۵/۲۵) آیا ہے ۔ یہاں زُبُرٌ کی تفسیر کتاب منیر سے کی گئی ہے ۔ سورۃ انبیاء میں ہے وَلَقَدْ کَتَبْنَا فِی الزَّبُوْرِ مِنْۢ بَعْدِ الذِّکْرِ (۲۱/۱۰۵) ۔ بعض نے کہا ہے کہ یہاں زَبُوْرٌ سے مراد حضرت داؤدؑ کی کتاب ہے اور ذِکْرٌ سے مراد تورات ہے ۔ لیکن سعید بن جبیر کا قول ہے کہ زَبُوْرٌ ، تورات ۔ انجیل ۔ قرآن کریم ۔ ہر ایک کتاب الٰہی کو کہتے ہیں *۔ اسکی تائید اس سے بھی ہوتی ہے کہ سورۃ نساء میں ہے وَاٰتَیْنَا دَاوٗدَ زَبُوْرًا (۴/۱۶۳) اگر زبور سے مراد وہ خاص کتاب ہوتی جو حضرت داؤدؑ کو دی گئی تھی تو

* تاج ۔

زَبُوْرًا (ایک کتاب) نکرہ نہ ہوتا بلکہ القرآن اور الانجیل کی طرح الزبور ہوتا۔ راغب نے لکھا ہے کہ ہر وہ کتاب جس کی کتابت بڑی موٹی ہو زَبُوْرٌ کہلاتی ہے**۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی (۱) لکھنا پڑھنا اور (۲) کسی چیز کو محکم اور مضبوط کرنا ہیں۔ اَلزُّبْرَۃُ۔ لوہے کا بڑا ٹکڑا*۔ اسکی جمع زُبَرٌ اور زُبُرٌ آتی ہے۔ (۱۸/۹۶)۔ اسی سے اسکے معنے فرقے۔ الگ الگ گروہ، کے آتے ہیں۔ (۲۳/۵۳)۔

(چونکہ زُبُرٌ۔ زَبُوْرٌ کی بھی جمع ہے اس لئے (۲۳/۵۳) میں اس کے معنی الگ الگ کتابیں بھی ہو سکتے ہیں)۔

ز ب ن

اَلزَّبْنُ۔ دھکا دینا۔ دفع کرنا۔ کسی چیز کو کسی چیز سے دور کر دینا اور ہٹا دینا۔ اَلزَّبُنُّ۔ سخت دھکا دینے والا۔ نَاقَۃٌ زَبُوْنٌ۔ وہ اونٹنی جو دودھ دوہنے والے کو لات مار دے اور دھکا دیدے۔ حَرْبٌ زَبُونٌ۔ شدید جنگ جس میں سخت ٹکراؤ ہو*۔ لڑائی کو اسکی صعوبتوں کی وجہ سے زَبُوْنٌ کہتے ہیں***۔ اَلزِّبْنِیَۃُ۔ ہر متمرد آدمی۔ سخت آدمی۔ سپاہی۔ اسکی جمع زَبَانِیَۃٌ آتی ہے*۔ (۹۶/۱۸)۔ وہ مجاہدین جو حق کی مدافعت کے لئے میدان میں نکلیں۔

ز ج ج

اَلزُّجُّ۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی کسی چیز کے باریک ہونے کے ہیں۔ نیزہ کی پچھلی طرف لگا ہوا لوہا۔ نیز کہنی کا نوکیلا سرا۔ اَلزُّجَاجُ۔ کانچ اور شیشے اور ان سے بنی ہوئی چیزوں کو کہتے ہیں۔ واحد زُجَاجَۃٌ ہے****۔ قرآن کریم میں چراغ کے متعلق ہے فِیْ زُجَاجَۃٍ (۲۴/۳۵)۔ اس سے مراد ہے شیشے کی چمنی یا فانوس۔

جب پیالہ بھرا ہوا ہو تو اسے کَاْسٌ کہتے ہیں اور جب خالی ہو تو زُجَاجَۃٌ کہلاتا ہے*****۔

ز ج ر

زَجَرَہٗ۔ یَزْجُرُہٗ۔ زَجْرًا نیز اِزْدَجَرَہٗ۔ اسنے اسکو روکا اور منع کیا اور جھڑکا۔ دراصل اسکے معنے آواز کے ساتھ کسی کو ہانک دینا اور

---

* تاج۔ ** راغب۔ *** کتاب الاشتقاق۔ **** تاج و راغب۔
***** لطائف اللغۃ۔ نیز فقہ اللغۃ۔ (للثعالبی)۔

دھتکارنا ھیں۔ زَجَرَ الْبَعِیْرَ ۔ اسنے اونٹ کو ڈانٹ کر ھانکا۔ اَلزَّجُوْرُ ۔ وہ اونٹنی جو بلا ڈانٹ کھائے دودھ نہ دیتی ھو* ۔ اس لئے اس لفظ میں ڈانٹنے اور جھڑکنے کا پہلو ھوتا ھے ۔

قرآن کریم میں ھے فَالزّٰجِرٰتِ زَجْرًا (۳۷/۲) ۔ اس سے مراد وہ جماعت مجاھدین ھے جو سرکش اور مستبد قوتوں کو ان کی دست درازیوں سے ڈانٹ کر روکتی ھے ۔ اسی سورۃ میں ذرا آگے چل کر ھے فَاِنَّمَا ھِیَ زَجْرَۃٌ وَّاحِدَۃٌ (۳۷/۱۹) "وہ صرف ایک ھی ڈانٹ ھوگی" ۔ سورۃ القمر میں ھے مَافِیْہِ مُزْدَجَرٌ (۵۴/۴) ۔ جس میں ایسی باتیں ھیں جو مفاسد سے روکتی ھیں ۔ اس سے ذرا آگے ھے مَجْنُوْنٌ وَّازْدُجِرَ (۵۴/۹)۔ انہوں نے اسے مجنوں قرار دیا اور ڈانٹ کر نکال دیا ۔ مفاد پرست گروہ اپنی قوت اور اقتدار کے نشہ میں ھر داعی الی الحق کے ساتھ اسی قسم کا برتاؤ کرتے ھیں ۔

ز ج و

زَجَاہُ ۔ یَزْجُوْہُ ۔ زَجْوًا ۔ وَاَزْجٰی اِزْجَاءٌ ۔ کسی چیز کو نرمی اور آھستگی سے ھانکنا۔ نرمی سے چلانا** ۔ قرآن کریم میں ھے اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللہَ یُزْجِیْ سَحَابًا (۲۴/۴۳) ۔ کیا تم اس پر غور نہیں کرتے کہ اللہ بادلوں کو آھستگی اور سہولت سے چلاتا ھے ۔ زَجَا الْاَمْرُ ۔ معاملہ آسان اور سیدھا ھو گیا۔ اَلْمُزْجٰی ۔ قلیل چیز** ۔

بِضَاعَۃٌ مُّزْجٰۃٌ (۱۲/۸۸) ۔ قلیل سرمایہ ۔ تھوڑی سی پونجی** ۔ ابن فارس نے کہا ھے کہ اس مادہ کے بنیادی معنی کسی چیز کو بغیر کسی روک ٹوک کے پھینکنا اور چلا دینا ھیں ۔ یعنی جسے آسانی سے نکالا اور روانہ کر دیا جائے ۔ بِضَاعَۃٌ مُّزْجٰۃٌ سے مراد ھوگی ایسی پونجی جسے آسانی سے نکال کر دیا جاسکے ۔

ز ح ز ح

زَحْزَحَہٗ عَنْہُ کے معنی ھیں اسے اس سے دور کر دیا ، ھٹا دیا ، ایک طرف کر دیا ۔ ھُوَ بِزَحْزَحٍ مِنْہُ ۔ وہ اس سے دوری پر ھے ۔ اَلزَّحْزَاحُ دور ۔ بعید ۔*** ابن فارس نے کہا ھے کہ یہ اس کے بنیادی معنی ھیں ۔

---

*تاج و راغب و محیط ۔ **تاج و راغب ۔***تاج

قرآن کریم میں ہے وَمَا هُوَ بِمُزَحْزِحِهِ مِنَ الْعَذَابِ (۲/۹۶) وہ (طولِ عمر) اس کو عذاب سے دور نہیں رکھ سکتا ۔ سورۃ آل عمران میں ہے فَمَنْ زُحْزِحَ عَنِ النَّارِ (۳/۱۸۴) ۔ جو تباہیوں سے دور رکھا گیا ۔

ز ح ف

زَحَفَ اِلَیْهِ زَحْفًا ۔ اس کی طرف آگے بڑھا* ۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی آگے کی طرف بڑھتے چلے آنا ہیں ۔ اصل میں زَحْفٌ بچے کے کولھے کے بل گھسٹ گھسٹ کر چلنے کو کہتے ہیں* ۔ گھٹنوں کے بل چلنے کے لئے بھی یہ لفظ بولا جاتا ہے** ۔ زَحَفَ الْبَعِیْرُ ۔ اونٹ تھکن کی وجہ سے اپنے پاؤں کو گھسیٹ گھسیٹ کر چلنے لگا* ۔ اَلزَّحَّافَةُ ۔ وہ حیوانات جو زمین پر گھسٹ کر چلتے ہوں ۔ جیسے کچھوا وغیرہ** ۔ پھر زَحَفَ فوجوں کے چلنے کے لئے بولا جانے لگا کیونکہ وہ کثرت و گرانباری کی وجہ سے آہستہ گھسٹ گھسٹ کر آگے بڑھتی ہیں ۔ چنانچہ اَزْحَفَ لَنَا بَنُوْ فُلَانٍ کے معنے ہیں ، فلاں قبیلہ ہم سے لڑنے کے لئے مذکورہ بالا کیفیت سے آیا ۔ تَزَاحَفُوْا فِی الْقِتَالِ ۔ وہ جنگ میں ایک دوسرے کے قریب اور بالمقابل ہوگئے ۔ مَزَاحِفُ الْقَوْمِ ۔ قوم کی لڑائیوں کے مقامات* ۔ الزَّحْفُ ۔ جرار لشکر کو بھی کہتے ہیں جو دشمن کی طرف بڑھ رہا ہو ۔ سورۃ انفال میں ہے اِذَا لَقِیْتُمُ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا زَحْفًا (۸/۱۵) ۔ جب تمہارا کفار کے ساتھ آمنا سامنا ہو درآنحالیکہ وہ تمہاری طرف بڑھ رہے ہوں ۔

ز خ ر ف

اَلزُّخْرُفُ ۔ سونا (جسکے زیورات بنتے ہیں) ۔ یہ اس کے اصلی معنے ہیں ۔ اس کے بعد زیبائش ، زینت و آرائش کو بھی زُخْرُفٌ کہنے لگ گئے ۔ اور پھر بطور تشبیہ ہر ملمع کی ہوئی جھوٹی بات کو*** ۔ محیط نے سونا یا زینت دونوں میں سے ایک کے اصلی معنی ہونے میں شک کیا ہے** ۔ زُخْرُفٌ کے معنے کسی چیز کے حسن کا کمال بھی ہیں ۔ چنانچہ قرآن کریم میں زُخْرُفَ الْقَوْلِ (۶/۱۱۳) آیا ہے ، جس کے معنے ملمع کی ہوئی باتیں ہیں ۔ اور حَتّٰی اِذَا اَخَذَتِ الْاَرْضُ زُخْرُفَهَا (۱۰/۲۴) میں اس کے معنے سنگھار اور آرائش کے ہیں ۔ سورۃ زخرف میں زُخْرُفًا (۴۳/۳۵) کے معنے سامانِ آرائش ہیں یا خود آرائش و نقش و نگار ۔ راغب نے زُخْرُفٌ کے معنے مصنوعی زینت کئے ہیں**** ۔

---

*تاج ۔ **محیط ۔ ***تاج و محیط ۔ ****راغب ۔

ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی زینت کے ہیں اور سونے کو بھی کہا جاتا ہے۔ راغب نے بھی اس کی تائید کی ہے۔

ز ر ب

اَلزَّرْبُ۔ داخل ہونے کا راستہ۔ بکریوں وغیرہ کے لئے لکڑیوں کا باڑہ۔ اَلزَّرَابِیُّ۔ (واحد زُرْبِیٌّ یا زَرْبِیَّۃٌ ہے) گدے۔ بچھونے۔ ہر وہ چیز جس پر ٹیک لگائی جائے۔ فراء نے کہا ہے کہ زَرَابِیُّ۔ روئیں دار غالیچوں کو کہتے ہیں۔ ممکن ہے کہ یہ معنے اَلزَّرَابِیُّ مِنَ النَّبْتِ۔ سے تشبیہ کے باعث پیدا ہوگئے ہوں جو ایسے زرد سرخ پودوں کو کہتے ہیں جن میں سبزی ہو*۔ اَلزُّرْبِیَّۃُ۔ عمدہ بچھونا یا قالین**۔ قرآن کریم میں زَرَابِیُّ مَبْثُوْثَۃٌ آیا ہے (۸۸/۱۶)۔ اعلیٰ درجے کے بچھائے ہوئے فروش۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ زَرْبٌ کے بنیادی معنوں میں راحت کدہ یا آرامگاہ کا تصور مضمر ہے۔

ز ر ع

زَرَعَ۔ یَزْرَعُ۔ زَرْعًا وَ زِرَاعَۃً۔ زمین میں بیج ڈالنا۔ اَلزَّرْعُ اُگانا*۔ ابن فارس نے خلیل کے حوالہ سے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی نشو و نما دینے اور بڑھانے کے ہیں۔ لہذا، جیسا کہ ذرا آگے چل کر معلوم ہوگا، اس کے معنے بیج ڈالنے کے نہیں بلکہ کھیتی اُگانے کے ہونگے۔ انسان زمین کو تیار کرکے اس میں تخم ریزی کرتا ہے اور مناسب احتیاطیں برتتا ہے لیکن دانے میں سے کونپل پھوٹنا اور اس کا پودا اور پیڑ بن جانا، یہ سب کچھ خدا کے قانونِ ربوبیت کے ماتحت ہوتا ہے جس میں انسان کے کسب و ہنر کو کوئی دخل نہیں۔ اس لئے اللہ تعالیٰ نے کہا ہے ءَاَنْتُمْ تَزْرَعُوْنَہٗ اَمْ نَحْنُ الزّٰرِعُوْنَ (۵۶/۶۴)۔ ''کیا کھیتی کو تم اُگاتے ہو یا ہم اُگاتے ہیں!'' تم صرف حَرْثٌ کرتے ہو (۵۶/۶۳)۔ یعنے تم صرف کھیتی بوتے ہو۔ اُگاتے ہم ہیں۔ لہذا تم ساری کی ساری فصل کے مالک کیسے بن سکتے ہو! تم اپنی محنت کا حصہ لے لو اور ہمارا حصہ ہمیں دے دو۔ یعنے اُن لوگوں کو دے دو جنہیں اس کی ضرورت ہے (۵۶/۶۳)۔

اَلزُّرَّاعُ (۴۸/۲۹)۔ کھیتی کرنے والے۔ باغبان۔ (واحد زَارِعٌ)

زَرْعٌ۔ کھیتی۔ بونے سے جو کچھ اُگ آئے*۔ (۱۳/۴ و ۶/۱۴۲)۔

*تاج۔ **محیط۔

ز ر ق

اَلزُّرْقَةُ ۔ نیلا رنگ ۔ اَلزُّرْقَةُ : نیلاھٹ ۔ سفیدی ۔ آنکھ کی سیاھی میں سبزی ۔ آنکھ کی سیاھی پر سفیدی کا چھا جانا ۔ زَرِقَ ۔ اس کی آنکھوں کی سیاھی پر سفیدی چڑھی۔ ایسا شخص آزْرَقُ کہلائیگا۔اس کی جمع زُرْقٌ ھے ۔ الزُّرْقُ ۔ اندھے پن کو کہتے ھیں ۔ زَرِقَتْ عَيْنُهُ تَزْرَقُ ۔ آنکھوں کا نیلا ھو جانا* ۔ قرآن کریم میں ھے نَحْشُرُ الْمُجْرِمِيْنَ يَوْمَئِذٍ زُرْقًا (۲۰/۱۰۲) ۔ (زُرْقٌ جمع ھے۔ اس کا واحد آزْرَقُ ھے) ۔ حشر میں ھم مجرمین کو اندھا اٹھائینگے ، ان کی آنکھوں کی سیاھی پر سفیدی چھائی ھوگی ۔ راغب نے بھی لکھا ھے کہ زُرْقًا کے معنے ھیں اندھے ۔ جن کی آنکھوں میں نور نہ رھے** ۔ اس سے آیت کا مفھوم واضح ھو جاتا ھے ۔ بعض اھل لغت کا خیال ھے کہ عربوں کی رومیوں سے قدیم دشمنی تھی اور انکی آنکھیں نیلی تھیں اس لئے ھر مبغوض اور دشمن کو آزْرَقُ الْعَيْنِ کہا جانے لگا،خواہ اس کی آنکھ نیلی نہ ھو** لیکن ھم اول الذکر توجیہ کو بہتر تصور کرتے ھیں،اس لئے کہ اسے قرآنی تائید بھی حاصل ھے۔ چنانچہ اسی سورت میں کچھ آیات کے بعد نَحْشُرُهُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ اَعْمٰى (۲۰/۱۲۴) ھے ۔ یعنی ''ھم اسے قیامت کے دن اندھا اٹھائینگے'' ۔

ز ر ی

زَرٰى عَلَيْهِ عَمَلَهُ ۔ اس کے کسی کام پر اسے ملامت کرنا ، برا بھلا کہنا ۔ عتاب کرنا ۔ حقیر جاننا اور اس پر عیب لگانا۔ اِزْدَرَاهُ ۔ اسے حقیر و بے وقعت گردانا ۔ اَلْمُزْدَرِيْ ۔ حقیر جاننے والا**** ۔

قرآن کریم میں ھے تَزْدَرِيْ اَعْيُنُكُمْ (۱۱/۳۱)۔ وہ لوگ جو تمھاری نگاھوں میں حقیر ھیں ۔ (باب اِفتعال ھے ۔ تاء ، دال سے بدل گئی ھے)

ز ع م

اَلزَّعْمُ ۔ اَلزُّعْمُ ۔ اَلزِّعْمُ ۔ بات ۔ قول۔ جو حق بھی ھو سکتی ھے اور باطل بھی ۔ لیکن اکثر ان باتوں کو کہا جاتا ھے جن کے بارے میں شک کیا جاتا ھو اور وہ متحقق نہ ھوں ۔ لیث نے کہا ھے کہ جب عرب کہتے ھیں ذَكَرَ فُلَانٌ تو یہ ایسے معاملات کے متعلق بات ھوتی ھے جس کی بابت یقین

*تاج ۔ **راغب ۔ ***محیط و کشاف ۔ ****تاج و محیط و راغب ۔

ہو کہ وہ حق ہے ۔ لیکن اگر شک ہو اور اس کا یقین نہ ہو کہ کہنے والے نے سچ کہا ہے یا جھوٹ ، تو ایسی جگہ زَعَمَ فُلاَنٌ* کہتے ہیں ۔ اس لحاظ سے بعض نے تو یہاں تک کہدیا ہے کہ زَعْمٌ کے معنے ہی جھوٹ ہیں ۔ اَلتَّزَعُّمُ ۔ جھوٹ گھڑنا ۔ علمائے لغت نے کہا ہے کہ زَعَمُوْا ایسی باتوں کو کہتے ہیں جن کی نہ کوئی سند ہو نہ ثبوت ، بلکہ یونہی زبانی نقل ہوتی چلی آرہی ہوں ، کہ اس نے اس سے کہا اور اس نے اس سے* ۔ اصل میں اس کے معنوں میں ظن اور توقع کا پہلو شامل ہوتا ہے ۔

صاحب محیط نے کہا ہے کہ اَلزَّعْمُ ۔ اکثر ان باتوں کو کہا جاتا ہے جن میں شک ہو یا جن کے جھوٹا ہونے کا عقیدہ دل میں ہو ۔ بعض لوگوں نے قول بلا دلیل کو زَعْمٌ کہا ہے ۔ بعض نے ادعائے علم (یعنی کسی بات کے جاننے کا دعویٰ کرنے) کو کہا ہے ۔ بعض کے نزدیک زعم کا تعلق اعتقاد سے ہے ، خواہ صحیح ہو یا غلط** ۔ راغب نے کہا ہے کہ قرآن کریم میں یہ لفظ ہمیشہ اس موقع پر آیا ہے جہاں کہنے والے کی مذمت مقصود ہو*** ۔

قرآن کریم میں ہے زَعَمَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا اَنْ لَنْ يُّبْعَثُوْا (۶۴/۷) ۔ "حقیقت سے انکار کرنے والے خیال کرتے ہیں کہ وہ اٹھائے نہیں جائیں گے" ۔ سورۃ انعام میں ہے بِزَعْمِهِمْ (۶/۱۳۷) ۔ اس کے معنے گمانِ باطل کے ہیں ۔ زَعَمَ بِهٖ : اس کی ذمہ داری لی ، ضامن ہوا ۔ اسی سے اَلزَّعِيْمُ ۔ ذمہ دار اور کفیل کو کہتے ہیں (۱۲/۷۲ و ۶۸/۴۰) ۔

ابن فارس نے کہا ہے کہ اس مادہ کے بنیادی معنی ہیں (۱) بغیر صحت اور یقین کے کوئی بات کہدینا ۔ اور (۲) کسی چیز کا ذمہ دار اور کفیل بن جانا ۔

ز ف ر

زَفَرَ ۔ يَزْفِرُ ۔ زَفِيْرًا ۔ سانس کو کھینچ کر نکالنا* ۔ راغب نے کہا ہے کہ اس کے معنے ہیں سانس کا بار بار پلٹنا تاآنکہ اس کی وجہ سے سینہ پھول جائے*** ۔ (جیسے سسکیاں بھرنے میں ہوتا ہے) اس کا بیشتر استعمال گدھے کے رینکنے کی ابتدائی آواز پر ہوتا ہے اور اس کے برعکس شہیق اس کی آواز کے آخری حصہ کو کہتے ہیں ، اس لئے کہ زفیر سانس اندر کی طرف

*تاج ۔ **محیط ۔ ***راغب ۔

کھینچنے کو کہتے ھیں اور شَہِیْق سانس کے باھر نکالنے کو*۔ قرآن کریم میں زَفِیْرٌ وَ شَہِیْق* (۱۱/۱۰۶) اکٹھا آیا ہے ۔ اس کے معنے (آھیں بھرنے ، سسکنے اور واویلا کرنے ہوئے) جھخنے چلانے کے ھیں (۲۱/۱۰۰) ۔ اَلزَّفِیْرُ ۔ آگ کے بھڑکنے کی آواز کو بھی کہتے ھیں* ۔ (۲۵/۱۳) ''اور اس کا اطلاق نا گہانی مصیبت کے لئے بھی ھوتا ھے* ۔ اَلزِّفْرُ ۔ جو بوجھ کمر پر لدا ھو اسے کہتے ھیں ۔ مسافر کا سامانِ سفر ۔ مشکیزہ جس میں چرواھا اپنے لئے پانی لے جاتا ھے۔ ابن فارس نے اس کے بنیادی معنی بوجھ اور آواز دونوں لکھے ھیں ۔

ز ف ف

اَلزَّفِیْفُ ۔ کے اصلی معنے ھوا کے تیز چلنے کے ھیں ۔ نیز شتر مرغ کی وہ تیز رفتار جس میں وہ چلنے کے ساتھ اڑنے کو بھی ملا دیتا ھے** ۔ زَفَّ الْبَعِیْرُ ۔ اونٹ نے چلنے میں تیزی کی ۔ اَلزَّوْزَفُ ۔ تیز رفتار شتر مرغ ، نیز خوش رفتار اونٹنی ۔ اَلزَّفِیْفُ ۔ بجلی کی چمک کو بھی کہتے ھیں ۔ زَفَّ الْعَرُوْسَ اِلٰی زَوْجِھَا زَفًّا وَ زِفَافًا ۔ اس نے دلھن کو شوھر کے پاس پیش کیا* ۔ (اس میں پیش کرنے والوں کے شدتِ شوق کا پہلو نمایاں ھے)۔ ابن فارس نے کہا ھے کہ اس کے بنیادی معنی ھر چیز میں پھرتیلا پن اور تیز خرامی کے ھیں ۔

قرآن کریم میں ھے فَاَقْبَلُوْٓا اِلَیْہِ یَزِفُّوْنَ (۳۷/۹۴) ۔ ''وہ اس کی طرف تیزی سے آئے'' ۔ (اس میں جذبات کی شدت کا پہلو نمایاں ھے)۔

ز ق م

اَلزَّقْمُ ۔ لقمہ بنانا ۔ نگل لینا ۔ اَزْقَمَہٗ اَلشَّیْیَٔ ۔ اس نے اسے کوئی چیز بطور لقمہ دی اور اسے نگلوائی* ۔ راغب نے لکھا ھے کہ زَقَمَ اور تَزَقَّمَ سے مراد کسی ناپسندیدہ چیز کو نگلنا ھے** اَلزَّقُّوْمُ ۔ ایک جنگلی پودہ کا نام ھے جس میں کڑوی سی تیز بو ھوتی ھے اور اس کے چھوٹے گول پتوں کے کنارے بہت بدھیئت ھوتے ھیں اور تنے میں موٹی موٹی گانٹھیں ھوتی ھیں ۔ قرآن کریم نے کہا ھے طَلْعُھَا کَاَنَّہٗ رُءُوْسُ الشَّیٰطِیْنِ (۳۷/۶۵) ۔ اس کے خوشہ کا خول ایسا ھے جیسے سانپ کا پھن ھو ۔ اس سے مترشح ھوتا ھے کہ یہ پودا ناگ پھنی تھوھر کا ھوگا ۔ لیکن پودا کوئی بھی ھو ، قرآن کریم نے جس کیفیت کے لئے تشبیھاً اس لفظ کا استعمال کیا ھے وہ ظاھر ھے ۔ ثعلب نے کہا کہ اَلزَّقُّوْمُ ھر اس کھانے کو کہتے ھیں جو زھریلا اور قاتل ھو* ۔ اور

*تاج ۔ **راغب ۔

صاحب محیط نے لکھا ہے* - کہ عوام میں اسے بطور ضرب المثل اس وقت بولا جاتا ہے جب کوئی شخص ایسی چیز کھا لے یا کوئی ایسا کام کرے جو اس کے لئے وبال جان بن جائے - قرآن کریم نے کہا ہے کہ اِنَّهَا شَجَرَةٌ تَخْرُجُ فِیْ اَصْلِ الْجَحِیْمِ (۳۷/۶۴) - وہ ایک ایسا درخت ہے جو جہنم (جحیم) کی جڑوں میں اگتا ہے - اس سے ظاہر ہے کہ اس سے مراد کوئی سچ مچ کا درخت نہیں، کیونکہ جہنم کی جڑ میں کونسا درخت اُگ سکتا ہے؟ ظاہر ہے کہ اس سے مراد اس قسم کا رزق ہے جس سے انسانیت جل کر راکھ ہو جائے - اس کے خوشے بڑے بڑے سرکش و مستبد لوگوں (شیاطین) کے سروں جیسے ہونگے - یعنی ظلم و استبداد سے حاصل کردہ رزق - اسی کو شَجَرَةٌ مَلْعُوْنَةٌ بھی کہا گیا ہے (۱۷/۶۰) اور طَعَامُ الْاَثِیْمِ بھی (۴۴/۴۴) - یعنی ایسا رزق جس سے انسان کی قوتیں مضمحل اور صلاحیتیں افسردہ ہوجائیں اور وہ زندگی کی صحیح خوشگواریوں سے محروم رہ جائے - یہ ان لوگوں کا رزق ہے جو اپنے آپ کو (بزعم خویش) بڑا صاحبِ عزت و تکریم سمجھتے ہیں (۴۴/۴۹) - یعنی مُتْرَفِیْنَ کا طبقہ (۵۶/۴۵) جو دوسروں کی کمائی پر عیش و عشرت اور حکومت کرنے کے خوگر ہوں - اس رزق سے پیٹ تو ضرور بھر جاتا ہے (۳۷/۶۶) لیکن انسانیت نشو و نما نہیں پاسکتی (۳۷/۶۸) -

سورۃ بنی اسرائیل میں جو اَلشَّجَرَةَ الْمَلْعُوْنَةَ (۱۷/۶۰) آیا ہے اور جس کا حوالہ ہم نے اوپر دیا، ہوسکتا ہے کہ اس سے مراد وہ شَجَرَةٍ خَبِیْثَةٍ ہو جس کا ذکر (۱۴/۲۶) میں آیا ہے - یعنی باطل نظریۂ حیات - بہر حال یہ تمام بیانات تشبیہی ہیں -

زکریا علیہ السلام

قرآن کریم نے انبیائے بنی اسرائیل کے ضمن میں حضرت زکریا[4] کا نام بھی لیا ہے (۶/۸۵) - ان کے متعلق سورۃ آلِ عمران (۳/۳۷-۴۰) - سورۃ مریم (۱۹/۲-۱۵) اور سورۃ انبیاء (۲۱/۸۹-۹۰) میں مذکور ہے کہ وہ خود عمر رسیدہ تھے اور ان کی بیوی عقیم - لیکن ان کی بیوی میں اولاد پیدا کرنے کی صلاحیت بیدار کر دی گئی (۲۱/۹۰) اور ان کے ہاں حضرت یحیٰ[4] پیدا ہوئے - حضرت مریم[4] کو انہی کی کفالت میں دیا گیا تھا (۳/۳۷) -

لوقا کی انجیل میں ہے کہ "یہودیہ کے بادشاہ ہیرودیس کے زمانہ میں ابیّاہ کے قبیلہ میں زکریا نام ایک کاہن تھا اور اس کی بیوی ہارون کی اولاد میں

*محیط -

سے تھی اور اس کا نام الیشبع تھا ۔ ان کے ہاں اولاد نہیں تھی کیونکہ الیشبع بانجھ تھی" ۔

تورات (عہد نامہ قدیم) میں ذکرباہ نام کے ایک نبی کا ذکر آیا ہے ۔ اسرائیلیوں کے ہاں ہیکل کے ایک بہت بڑے منصب دار کو نبی کہتے تھے جس کا ترجمہ کاھن کیا جاتا ہے ۔ لیکن قرآن کریم کی رو سے نبی کا تصور اس سے بالکل مختلف ہے ۔ حضرت زکریاؑ کو قرآن کریم نے زمرۂ انبیاء کرام میں شمار کیا ہے ۔

ز ک و

زَكَا الْمَالُ وَالزَّرْعُ ۔ يَزْكُوْ ۔ زُكُوًّا وَأَزْكَىٰ ۔ جانوروں کا اور کھیتی کا پھلنا ۔ پھولنا ۔ بڑھنا ۔ نشو و نما پانا ۔ أَزْكَى اللّٰهُ الْمَالَ وَ زَكَّاهُ ۔ خدا نے مال کو نشو و نما دی ۔ بڑھایا ۔ زَكَا الرَّجُلُ يَزْكُوْ ۔ آدمی آسودہ اور خوش حال ہو گیا ۔ اسکی صلاحیتوں میں نشو و نما آگئی ۔ اسکی زندگی سرسبز و شاداب ہو گئی *۔

لہذا زَكَا کے بنیادی معنے نشو و نما پانا ۔ بڑھنا ۔ پھولنا ۔ پھلنا ہیں ۔ راغب نے اس کے یہ معنے لکھکر اسکی مثال میں قرآن کریم کی یہ آیت درج کی ہے ۔ فَلْيَنْظُرْ أَيُّهَا أَزْكَىٰ طَعَامًا (۱۸/۱۹) یہ دیکھو کہ کونسا کھانا ایسا ہے جو حلال اور خوش انجام ہے ، یعنی جس میں نشو و نما دینے کی زیادہ صلاحیت ہے،جو زیادہ (Nutritious) ہے ۔

اَلزَّكٰوةُ کے معنے ہیں نشوو نما ۔ بالیدگی ۔ پھولنا ۔ پھلنا *۔ اسکے معنے پاکیزگی کے بھی آتے ہیں ۔ غالباً اسلئے کہ درختوں کی نشو و نما کے لئے ان کی شاخ تراشی کی ضرورت ہوتی ہے ۔ لیکن یہ اسکے بنیادی معنی نہیں ۔ خود قرآن کریم میں (ایک ہی آیت میں) أَزْكَىٰ اور أَطْهَرُ کے الفاظ الگ الگ آئے ہیں ۔ أَزْكَىٰ لَكُمْ وَأَطْهَرُ (۲/۲۳۲)۔اس میں أَطْهَرُ تو پاکیزگی کے لئے ہے اور أَزْكَىٰ نشو و نما کے لئے ۔ پاکیزگی (طہارت) ایک سلبی صفت (Negative Virtue) ہے ۔ یعنے نقائص اور خرابیوں سے دور رہنا ۔ لیکن زَکٰوۃ* ایجابی صفت (Positive Virtue) ہے ۔ یعنے بڑھنا ۔ پھولنا پھلنا ۔ نشو و نما اور بالیدگی حاصل کرنا ۔ صاحب محیط نے بیضاوی کے حوالہ سے اَلزَّكِيُّ کے معنے لکھے ہیں خیرو خوبی کے ساتھ بڑھنے والا ۔ عمدہ

* تاج نیز ابن قتیبہ (القرطین ج/۱ صفحہ ۶۲)

صلاحیتوں کے ساتھ ایک عمر سے دوسری عمر تک ترقی کرنے والا ۔ یعنے اس میں بالیدگی اور ارتقا کا پہلو مضمر ہوتا ہے ۔ اَرْضٌ زَکِیَّۃٌ کے معنے ہیں سرسبز زمین جس میں خوب نشوونما ہو ۔ اَزْکیٰ کے معنے ہیں اَنْفَعُ ۔ زیادہ منفعت بخش **۔ اسی اعتبار سے زَکًا اس عدد کو کہتے ہیں جو زوج (جوڑا) ہو **۔

سورۃ کہف میں ہے کہ خدا انہیں ایسا بیٹا دیگا جو انکے پہلے بیٹے کے مقابلہ میں زیادہ صلاحیتوں کا حامل ہوگا ۔ خَیْرًا مِّنْہُ زَکٰوۃً (۱۸/۸۱) ۔ نَفْسًا زَکِیَّۃً (۱۸/۷۴) کے معنے ہیں اچھا، عمدہ، جوان، نشوونما یافتہ لڑکا ۔ دوسری جگہ غُلٰمًا زَکِیًّا (۱۹/۱۹) آیا ہے ۔ سورۃ الشمس میں زَکّٰھَا کے مقابلہ میں دَسّٰھَا کا لفظ آیا ہے (۹۱/۹-۱۰)۔ تَدْسِیَۃٌ کے معنے ہوتے ہیں دبا دینا ۔ کسی کو زندہ دفن کر دینا (۱۶/۵۹) ۔ اُسکی نشوونما کو روک دینا ۔ لہذا تَزْکِیَۃٌ کے معنے ہونگے ان تمام موانع کو دور کرکے جو کسی کی راہ میں حائل ہوں، اسکی نشوونما کیلئے حالات کو مساعد کرنا ۔

قرآن کریم میں اَقِیْمُوا الصَّلٰوۃَ وَاٰتُوا الزَّکٰوۃَ کے الفاظ بار بار آئے ہیں ۔ حقیقت یہ ہے کہ قرآنی نظام کے یہی دو ستون ہیں ۔ اقامت صلٰوۃ کے مفہوم کے لئے (ص ۔ ل ۔ و کے عنوان میں) " صلٰوۃ " کا لفظ دیکھئے ۔ اس سے آپ کو معلوم ہو جائیگا کہ اس سے مراد ہے ایک ایسا معاشرہ قائم کرنا جس میں افراد معاشرہ، قوانین خداوندی کا اتباع کرتے، اپنی منزل مقصود تک جا پہنچیں ۔ اس سے یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس قسم کا معاشرہ قائم کرنے سے مقصود کیا ہے؟ مقصود ہے " ایتائے زکٰوۃ " ۔ ایتاء کے معنی ہیں دینا ۔ اور (جیسا کہ آپ اوپر دیکھ چکے ہیں) زکٰوۃ کے معنی ہیں نشوونما ۔ یعنی نوع انسان کی نشوونما (Growth) یا (Development) کا سامان بہم پہنچانا ۔ اس " نشوونما " میں انسان کی طبعی زندگی کی پرورش اور اس کی ذات کی نشوونما، دونوں شامل ہیں ۔ سورۃ حج میں ہے کہ اَلَّذِیْنَ اِنْ مَّکَّنّٰھُمْ فِی الْاَرْضِ اَقَامُوا الصَّلٰوۃَ وَاٰتَوُا الزَّکٰوۃَ (۲۲/۴۱)۔ " یہ (جماعت مومنین) وہ لوگ ہیں کہ جب انہیں زمین میں اقتدار حاصل ہوگا تو یہ اقامت صلٰوۃ اور ایتائے زکٰوۃ کرینگے " ۔ یعنی اسلامی مملکت کا فریضہ " ایتائے زکٰوۃ " ہوگا ۔ یعنی دوسروں کو نشوونما دینا ۔ اپنے افراد معاشرہ اور دیگر نوع انسان کی نشوونما کا سامان بہم پہنچانا ۔ اسی کے

** محیط ۔ نیز ابن فارس ۔

متعلق دوسرے مقام پر ہے کہ مومن وہ ہیں هُمْ لِلزَّکٰوۃِ فَاعِلُوْنَ (۲۳/۴)
جو زکٰوۃ (یعنی نوع انسان کی نشوونما) کے لئے جدوجہد کرتے ہیں۔

اب سوال یہ ہے کہ مملکت اسلامی (یا نظام خداوندی) اپنے اس عظیم فریضہ (نوعِ انسان کو سامان نشوونما بہم پہنچانے کے فریضہ) کو سرانجام کسطرح سے دیگی؟ ظاہر ہے کہ اس مقصد کے لئے (اولاً) ذرائع پیداوار مملکت کی تحویل میں رہینگے تاکہ وہ رزق کی تقسیم لوگوں کی ضرورت کے مطابق کر سکے۔ اور (دوسرے یہ کہ) افراد معاشرہ جو کچھ کمائیں وہ اسے اسطرح کھلا رکھیں کہ مملکت اس میں سے جسقدر ضرورت سمجھے، "ایتائے زکٰوۃ"، (دوسروں کی نشوونما) کے لئے لے لے۔ اس مقصد کے لئے قرآن کریم نے نہ کوئی شرح مقرر کی ہے نہ نصاب۔ اس میں سوال ضرورت پوری کرنے کا ہے۔ حتکہ اس ضمن میں یہ بھی کہدیا کہ جو کچھ افراد کی ضروریات پورا ہونے کے بعد بچ جائے، عندالضرورت وہ سب کا سب مملکت کی تحویل میں لیا جا سکتا ہے۔ (دیکھئے ۲/۲۱۹)۔ اس نقطۂ نگاہ سے دیکھئے تو مملکت اسلامی کی تمام آمدنی "ایتائے زکٰوۃ"، کے مقصد کو پورا کرنے کا ذریعہ ہوگی۔

لیکن اس قسم کا اسلامی نظام، بتدریج قائم ہوگا۔ جس عرصہ میں یہ ہنوز زیر تشکیل ہوگا، اس میں جماعت کے افراد سے (آج کی اصطلاح میں) چندے اور عطیے لئے جائینگے۔ یا ہنگامی ٹیکس عائد کئے جائینگے۔ ان کے لئے قرآن کریم نے "صدقات"، کی اصطلاح استعمال کی ہے۔ ہمارے ہاں عام طور پر "صدقات"، اور "زکٰوۃ" کو مرادف المعنی سمجھا جاتا ہے۔ حتکہ قرآن کریم نے "صدقات" کے خرچ کی جو مدات بتائی ہیں (۹/۶۰) انہیں بھی زکٰوۃ کے مصرف کی مدات سمجھا جاتا ہے۔ لیکن قرآن کریم نے ان اصطلاحات کو الگ الگ مفہوم کے لئے استعمال کیا ہے۔

ان تصریحات سے یہ بھی ظاہر ہے کہ یہ سب چیزیں اسلامی نظام مملکت کے شعبے ہیں۔ انفرادی چیزیں نہیں ہیں۔ انفرادی طور پر انسان جو کچھ ضرورت مندوں کو دیگا وہ خیرات ہوگی۔ اسلامی نظام میں خیرات لینے یا دینے کی ضرورت ہی نہیں پڑتی کیونکہ تمام ضرورت مندوں کی ضروریات زندگی کا پورا کرنا مملکت کا فریضہ قرار پا جاتا ہے۔ نیز یہ خیال بھی صحیح نہیں کہ جو کچھ حکومت لیتی ہے وہ مملکت کا ٹیکس ہوتا ہے، اور زکوٰۃ خدا کا ٹیکس ہے۔ "قیصر اور خدا" کی یہ تقسیم، عیسائیت کی ثنویت

(Dualism) کی پیدا کردہ ہے۔ اسلام میں اسکی قطعاً گنجائش نہیں۔ اسلام میں، جو مملکت قوانین خداوندی کو نافذ کرنے کے لئے قائم ہوتی ہے، اسے جو کچھ دیا جاتا ہے وہ خدا ہی کو دیا جاتا ہے۔ (ان امور کی وضاحت کے لئے عنوانات "ر۔ ب۔ ب"۔ "ن۔ ف۔ ق" اور "ص۔ د۔ ق" بھی دیکھئے)۔

سورۃ النجم میں ہے فَلَا تُزَكُّوا أَنفُسَكُمْ ۔ هُوَ أَعْلَمُ بِمَنِ اتَّقَىٰ (۵۳/۳۲)۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ تم خود ہی اپنے متعلق فیصلہ نہ کر لو کہ تمہارا تزکیہ نفس (ذات کی نشوونما) ہو رہا ہے۔ اس کے لئے معیار، خدا کا مقرر کردہ قانون ہے۔ اور وہ قانون یہ ہے کہ اَلَّذِي يُؤْتِي مَالَهُ يَتَزَكَّىٰ (۹۲/۱۸)۔ تزکیہ اس کا ہوتا ہے جو اپنے مال کو (نوع انسان کی پرورش کے لئے) دیتا ہے۔ یعنی مَنْ أَعْطَىٰ وَاتَّقَىٰ (۹۲/۵)۔ "جو دیتا ہے اور تقویٰ شعار بنتا ہے .... اس کے لئے راستے آسان ہو جاتے ہیں (۹۲/۷)۔

ز ل ف

اَلزُّلَفُ والزُّلْفیٰ والزُّلْفَةُ ۔ قرب۔ درجہ و مرتبہ۔ اَلزُّلْفَةُ ۔ شروع رات یا مطلقاً رات کا ایک حصہ (چھوٹا ہو یا بڑا)۔ جمع زُلَفٌ ہے۔ اَلْمَزَالِفُ ۔ سیڑھیاں، جن سے انسان بلند بھی ہو جاتا ہے اور اپنی منزل سے قریب بھی۔ اس میں قرب اور مدارج دونوں آجاتے ہیں (دَرَجَةٌ ۔ بھی سیڑھی کو کہتے ہیں جو اوپر کی طرف لیجائے)۔ زَلَفَ اِلَيْهِ ۔ وہ اس کی طرف قریب ہوا۔ اَزْلَفَهُ اسے قریب کیا، اکٹھا کیا۔ ابن فارس نے اس مادہ کے بنیادی معنے کسی چیز سے قریب ہونے کے لئے آگے بڑھتے جانا بتائے ہیں*۔ راغب نے کہا ہے زُلَفٌ رات کی منزلوں کو کہتے ہیں**۔ صاحب کتاب الاشتقاق کے نزدیک اَلزُّلْفَةُ ۔ منزل کو کہتے ہیں۔

قرآن کریم میں ہے فَلَمَّا رَأَوْهُ زُلْفَةً (۶۷/۲۷)۔ "جب وہ اسے قریب دیکھینگے"۔ سورۃ سبا میں ہے تُقَرِّبُكُمْ عِندَنَا زُلْفَىٰ (۳۴/۳۷) "جو مرتبہ میں تمہیں ہم سے قریب تر کر دے"۔ سورۃ شعراء میں ہے وَأَزْلَفْنَا ثَمَّ الْآخَرِينَ (۲۶/۶۴) "اور ہم وہیں دوسروں کو قریب لے آئے"۔ سورۃ ہود میں ہے أَقِمِ الصَّلَاةَ طَرَفَيِ النَّهَارِ وَزُلَفًا مِّنَ اللَّيْلِ (۱۱/۱۱۴) یعنی دن کے دونوں سرے اور رات کے کچھ حصے۔ (نیز دیکھئے عنوان د۔ل۔ک نیز ط۔ ر۔ ف)

*تاج۔ **راغب۔

ز ل ق

زَلِقَ - یَزْلَقُ - زَلَقَ - یَزْلُقُ - زَلَقًا - پھسل جانا - لغزش کھا جانا - اپنی جگہ سے ہٹ جانا - اَلزَّلَقُ - سپاٹ زمین جس پر قدم پھسل جائیں - جس پر کوئی پودا نہ ہو - اَلزَّلَقَةُ - چکنی چٹان - آئینہ* - سورۃ کہف میں ہے فَتُصْبِحَ صَعِیْدًا زَلَقًا (۱۸/۴۰) - ''وہ صاف اور چکنا میدان رہ جائے جس میں کوئی سبزی وغیرہ نہ ہو'' - آئینہ کی طرح صاف اور چٹیل ہو جائے - اَزْلَقَ فُلَانًا بِبَصَرِہٖ - اس کی طرف بہت تیز (ناراضگی کی) نگاہ سے دیکھا - اس طرح گھور کر دیکھا گویا وہ آنکھوں آنکھوں ہی میں اسے اس کے مقام سے ہٹا دیگا* - سورۃ القلم میں کفار کے متعلق ہے لَیُزْلِقُوْنَکَ بِاَبْصَارِھِمْ (۶۸/۵۱) - ''وہ تمہیں اس طرح گھور کر دیکھتے ہیں گویا اپنی نگاہوں سے تجھے اپنے مقام سے پھسلا دینگے'' -

ز ل ل (زلزل)

زَلَّ - زَلِیْلٌ - مَزِلَّةٌ - پھسل جانا - لغزش کھا جانا - اَلْمَزِلَّةُ والمَزَلَّةُ - جس جگہ انسان پھسل جائے - اَزَلَّهٗ : اسے پھسلایا (۲/۳۶) - اَلزَّلَّةُ - لغزش کو کہتے ہیں - یعنی اپنی جگہ سے ہل جانا - چنانچہ قرآن کریم میں یہ لفظ ثَبَتَ کے مقابل میں آیا ہے (۱۶/۹۴) - ابن فارس نے کہا ہے کہ ہر وہ لفظ جس میں زاء کے بعد لام آتا ہو ، اُس کے بنیادی معنی ہٹنے کے ہوتے ہیں - گفتگو میں لغزش کر جانے یا اپنی رائے سے ہٹ جانے نیز غلطی کرنے کے لئے بھی یہ لفظ استعمال ہوتا ہے - راغب نے کہا ہے کہ زَلَّةٌ - اُس لغزش کو کہتے ہیں جو بلا ارادہ سرزد ہو - اِسْتَزَلَّهٗ کے معنے ہیں کسی کو اس کے مقام سے ہٹا دینے اور پھسلا دینے کا قصد و ارادہ کرنا (۳/۱۵۴) - زَلِیْلٌ کے معنے ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل ہو جانے کے بھی آتے ہیں - قَوْسٌ زَلَّاءُ - وہ کمان جس سے تیر بڑی تیزی کے ساتھ نکل جائے -

زَلْزَلَةٌ کے معنے ہیں کسی چیز کو تیزی کے ساتھ حرکت دیکر ہلا دینا یا اس کی جگہ سے ہٹا دینا** - زَلْزَلَ - یُزَلْزِلُ - زَلْزَلَةٌ وَزِلْزَالًا - اسے ہلایا** - اِذَا زُلْزِلَتِ الْاَرْضُ زِلْزَالَهَا (۹۹/۱) - ''جب زمین ہلا دی جائیگی جیسا کہ اس کا ہلانا (ہوگا)''

*تاج و محیط و راغب - **تاج -

ز ل م

اَلزَّلَمُ - اَلزُّلَمُ - تیر کی لکڑی جس کے پچھلے سرے میں پر نہ لگائے گئے ہوں - (جمع اَزْلَامٌ) - ابن فارس نے کہا ہے کہ اس مادہ کے بنیادی معنی دبلا پتلا اور سپاٹ یعنی ہموار اور چکنا ہونے کے ہیں - پھر اَزْلَامٌ سے مراد وہ تیر تھے جن سے قریش زمانہ جاہلیت میں فال نکالتے تھے - تفصیل یہ ہے کہ تین مذکورہ بالا قسم کے تیر تھیلے میں ڈال دئے جاتے - ان میں سے ایک پر اِفْعَلْ (کر) دوسرے پر لَا تَفْعَلْ (نہ کر) لکھ دیتے اور تیسرا خالی رہنے دیتے - جب کوئی شخص کسی معاملہ کا ارادہ کرتا تو وہ کعبہ کے پجاریوں کے پاس آتا اور ان سے کہتا کہ میرے لئے یہ کام کرنے یا نہ کرنے کے بارے میں فال نکالو - چنانچہ وہ اپنے قاعدے کے مطابق تیر نکالتے اور تیر کی تحریر کے مطابق فال دیکھ کر اسے بتا دیتے - اگر خالی تیر آتا تو دوبارہ فال نکالتے - بعض لوگ خود بھی اپنے پاس اس قسم کے تیر رکھتے اور جہاں ضرورت پڑتی ان سے فال نکال لیتے* - اسی قسم کے تیروں سے قرعہ اندازی بھی ہوتی - اور (جوئے کے) جانوروں کا گوشت تقسیم کیا جاتا ($\frac{5}{3}$) - (قرعہ اندازی کے لئے عنوان ق - ل - م بھی دیکھئے) - قرآن کریم نے ان سب باتوں سے منع کر دیا - اس لئے کہ اس سے انسان اپنے اختیار کو چھوڑ کر جبر کا راستہ اختیار کر لیتا ہے اور بجائے اس کے کہ اپنی فہم و بصیرت سے کسی بات کا فیصلہ کرے اپنے آپ کو اتفاقات (Chances) کے رحم و کرم پر چھوڑ دیتا ہے - اس سے وہ مقام انسانیت سے گر جاتا ہے - قرآن کریم انسان کی عقل و بصیرت کی تربیت کرتا اور اسے حریت و آزادی کی تعلیم دیتا ہے - اس لئے اس نے ان تمام باتوں سے منع کر دیا ہے جس سے اس کی عقل و خرد دب جائے اور حریت فکر و نظر سلب ہو جائے - وہ انسان کو پوری آزادی دیتا ہے کہ وہ حدود اللہ (قوانین خداوندی - قرآن کریم کے ضوابط) کے اندر رہتے ہوئے اپنے (انفرادی اور اجتماعی) امور کے فیصلے اپنی عقل و فکر سے کرے - یہ تھی قرآن کریم کی تعلیم - لیکن اب ہماری یہ حالت ہے کہ ہمارے ہاں فال لینا - قرعے ڈالنا "استخارے کرنا" (یعنی کسی کام کے کرنے یا نہ کرنے کا فیصلہ تسبیح کے دانوں کے سپرد کر دینا) عام روش زندگی ہو گیا ہے - گری ہوئی قومیں اپنی قوت بازو ہی کو ترک نہیں کرتیں ، عقل و فکر کو بھی ساتھ ہی چھوڑ دیتی ہیں - اور اس کا خمیازہ بھگتتی ہیں - ایک مرد مومن اچھی طرح جانتا ہے

*تاج و محیط -

کہ خاکِ زندہ ہوں میں تابع ستارہ نہیں - وہ اپنے آپ کو اتفاقات اور حوادث کے حوالے نہیں کرتا بلکہ اتفاقات اور حوادث کو اپنے پروگرام کے تابع لاتا ہے -

ز م ر

زَمْرٌ - آواز - اَلزَّمَّارَةُ و اَلْمِزْمَارُ - بانسری - زَمَرَ يَزْمُرُ و يَزْمِرُ زَمْرًا - بانسری بجانا -

اَلزُّمْرَةُ (جس کی جمع زُمَرٌ ہے) منتشر فوج اور جماعت - کیونکہ کوئی جماعت شور سے خالی نہیں ہوتی* - یا انہیں یک جا کرنے کے لئے عموماً بگل (یا صور) سے کام لیا جاتا ہے - راغب نے اس کے معنے تھوڑی سی جماعت کئے ہیں** -

قرآن کریم میں ہے وَ سِيْقَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اِلٰى جَهَنَّمَ زُمَرًا (۳۹/۷۱) - جنہوں نے انکار کی روش اختیار کر رکھی ہے انہیں جہنم کی طرف گروہ در گروہ لے جایا جائیگا - (زُمَرٌ کے لفظ سے چھوٹی چھوٹی ٹولیوں کا مفہوم ظاہر ہوتا ہے)** - ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی دو ہوتے ہیں (۱) چیز کی کمی - اور (۲) آواز -

ز م ل

اَلزَّمِيْلُ - اونٹ پر بیٹھنے والا آدمی - نیز تمہارا رفیق سفر جو معاملات میں تمہاری مدد کرتا ہے - زَمَلَهٗ - يَزْمِلُهٗ - زَمْلاً - اس نے اسے اپنے پیچھے سوار کر لیا یا کجاوے میں اپنے ساتھ برابر کی جھولی میں بٹھا لیا - اَلزِّمْلُ - بوجھ - اس سے اِزْدَمَلَ الْحِمْلَ کے معنے ہیں اس نے ایک بار میں سارا بوجھ اٹھا لیا - اَلْمُزَامَلَةُ - اونٹ پر دونوں طرف ہموزن سواریوں کا بیٹھنا یا ہموزن بوجھ لادنا -

ایک اونٹ پر بالعموم دو سواریاں بیٹھتی ہیں - ایسے سفر میں سب سے اہم اور پہلا کام یہ دیکھنا ہوتا ہے کہ ایک اونٹ پر ایسی دو سواریاں بٹھائی جائیں جو ہم وزن بھی ہوں اور ہم خیال بھی تا کہ ان دونوں میں طبعی اور ذہنی، دونوں انداز سے ہم آہنگی ہو - اگر ان کا وزن برابر نہ ہو تو سفر میں اونٹ کو اور خود سواریوں کو بھی تکلیف ہوگی - اور اگر وہ ہم خیال نہ ہوں تو یہ سفر، سَقَرٌ (دوزخ) بن جائیگا - سب سے اچھا سالارِ کارواں وہ ہوتا ہے جو زَمِيْلٌ چننے میں ماہر ہو -

*محیط و تاج - **راغب -

رسول اللہؐ کو جب وحی کے ذریعہ قرآنی نظام کا نقشہ سمجھا دیا گیا تو اس کے بعد ان کا سب سے اہم فریضہ یہ قرار پایا کہ وہ رفقائے کار کی تلاش کریں اور ان کے انتخاب میں زَمِیْلَانَہ انداز اختیار کریں۔ اس لئے کہ ایسے عظیم پروگرام کی کامیابی کا راز رفقائے سفر کے صحیح انتخاب میں تھا۔ یہ تھا وہ فریضہ جس کی طرف آپ کی توجہ یٰاَیُّھَا الْمُزَّمِّلُ (۷۳/۱) کہہ کر دلائی گئی۔ اس کے بعد جس قسم کی تَزْمِیْل رسول اللہؐ نے کی، دنیا کی تاریخ اس کی نظیر پیش نہیں کر سکتی۔

اِزْدَمَلَ۔ تَزَمَّلَ و اِزَّمَّلَ فِیْ ثِیَابِہٖ۔ کے معنے یہ بھی ہوتے ہیں کہ وہ اپنے کپڑوں میں لپٹ گیا۔ اس اعتبار سے اَلْمُزَّمِّلُ اسے کہتے ہیں جو معاملات میں لا پرواہی برتے اور کاموں میں کوتاہی کرے**۔ ظاہر ہے کہ یٰاَیُّھَا الْمُزَّمِّلُ میں اَلْمُزَّمِّلُ کے یہ معنے نہیں لئے جا سکتے، اگرچہ حیرت ہے کہ راغب جیسے بالغ نظر نے بھی لکھ دیا ہے کہ یہ لفظ استعارہ کے طور پر استعمال ہوا ہے اور کنایہ ہے کوتاہی کرنے والے اور معاملات میں لا پرواہی برتنے والے سے**۔ ابن فارس نے اس مادہ کے بنیادی معنی بوجھ اٹھا لینے کے لکھے ہیں۔ اس کے ساتھ یہ بھی کہا ہے کہ اَلزِّمِّیْلُ اس آدمی کو کہتے ہیں کہ جب کوئی مشکل معاملہ پیش آئے تو وہ اپنے بدن پر مزید کپڑے ڈال لے اور اس طرح کپڑوں کی گٹھڑی سی بن جائے اور اَلْمُزَامَلَۃُ کے معنی ہیں اونٹ کے دونوں طرف ہم وزن بوجھ لادنا۔ اس اعتبار سے اَلْمُزَّمِّلُ کا صحیح مفہوم یہی ہوگا کہ جو فریضہ تَزْمِیْل میں بہت زیادہ احتیاط برتے اور سرگرمی دکھائے۔ اَلزِّمْلُ بوجھ کو بھی کہتے ہیں اور اِزْدَمَلَ الْحِمْلَ کے معنے ہوتے ہیں اس نے سارے بوجھ کو ایک دم لاد دیا*۔ اس اعتبار سے مُزَّمِّلٌ وہ ہوگا جو بارِ رسالت کو نہایت حسن و خوبی سے اٹھائے۔ کشاف میں عکرمہ کے حوالہ سے ہے کہ یاَیُّھَا الْمُزَّمِّلُ کے معنے ہیں اے اس عظیم اٹھا لینے والے۔ تفسیر روح المعانی میں لکھا ہے کہ اس کا مطلب ہے نبوت اور اس کی ذمہ داریوں کا بار اٹھانے والے۔ تفسیر خازن نے بھی اسکی تائید کی ہے۔ تستری نے اپنی تفسیر میں کہا ہے کہ اَلْمُزَّمِّلُ کے معنے ہیں وہ شخص جس نے اپنے آپ کو خدا کا ہم رنگ کر لیا ہو۔ یہ رفاقت کی انتہائی شکل ہے۔ تفسیر فتح القدیر (شوکانی) میں ہے کہ اس کے معنی مُزَّمِّلٌ بِالْقُرْاٰنِ ہیں۔ یعنی قرآن کا بار اٹھانے والا۔ حامل قرآن۔ یہ معنی قرطبی نے بھی دئے ہیں اور کہا ہے کہ اسے حضرت ابن عباسؓ نے روایت

*تاج۔ **راغب۔

کیا ہے۔ بہر حال، نبی اکرمؐ کو جو یٰاَیُّھَا الْمُزَّمِّلُ کہکر پکارا گیا ہے تو اس میں حضورؐ کے عظیم القدر فرائض رسالت کی طرف اشارہ ہے جن کا مقصد جماعتِ مومنین کو ساتھ لیکر دنیا میں انقلاب عظیم برپا کرنا تھا۔

عام خیال یہ ہے کہ لفظ مُزَّمِّلٌ باب تَفَعَّلَ سے ہے۔ اصل اس کی مُتَزَمِّلٌ تھی۔

ز م ھ ر

اَلزَّمْھَرِیْرُ۔ سردی کی شدت۔ نیز چاند کو بھی کہتے ہیں*۔ اِزْمَھَرَّ الْیَوْمُ۔ دن سخت سرد ہو گیا۔ اِزْمَھَرَّ الْوَجْہُ۔ چہرہ بری طرح بگڑ گیا اور دانت دکھائی دینے لگے۔

قرآن کریم میں جنت کے متعلق ہے کہ لَا یَرَوْنَ فِیْھَا شَمْسًا وَّلَا زَمْھَرِیْرًا (۷۶/۱۳)۔ اس میں نہ تو سخت گرمی ہوگی نہ سخت سردی۔ ویسے اَلْمُزْمَھِرُّ کے معنے ہیں ہنستے ہوئے دانتوں والا*۔ غالباً سردی سے دانت بجنے سے طنزاً لیا گیا ہے۔ لیکن ابن فارس نے کہا ہے "ہو سکتا ہے کہ یہ لفظ زَھْرٌ سے ہو جس میں میم زیادہ کر لی گئی ہو۔ زَھْرٌ کے معنی چمکنے کے ہوتے ہیں۔ اِزْمَھَرَّتِ الْکَوَاکِبُ۔ ستارے چمکے"۔ جب سردی زیادہ ہو تو ستارے زیادہ روشن اور چمکدار ہوجاتے ہیں۔

زنجبیل

اَلزَّنْجَبِیْلُ۔ ادرک یا سونٹھ کو کہتے ہیں۔ عربوں کے ہاں یہ اعلیٰ درجہ کی خوشبودار چیز شمار ہوتی تھی**۔ صاحب محیط کا خیال ہے کہ یہ فارسی لفظ شَنْکَبِیْلُ کا معرب ہے***۔ (یہ لفظ شَنْکَبِیْلُ نہیں بلکہ شَنْگِویِر ہے)۔

قرآن کریم میں ہے کَانَ مِزَاجُھَا زَنْجَبِیْلًا (۷۶/۱۷) "اسکی ملونی سونٹھ کی ہوگی"۔ اسکے مفہوم کے لئے عنوان (م۔ز۔ج) دیکھئے۔

ز ن م

ابن فارس نے کہا ہے کہ زَنَمٌ کے بنیادی معنی کسی چیز کو کسی دوسری چیز کے ساتھ لٹکا دینے کے ہیں۔

---

* تاج و محیط۔ ** تاج۔ ***محیط۔

اَلزَّنِیْمُ۔ وہ شخص جو کسی قبیلہ سے نسبی تعلق تو نہ رکھتا ہو لیکن اسکے ساتھ یونہی ملحق ہو*۔ جیسے بکری کے گلے میں جونک کی طرح دو تھن سے لٹک رہے ہوتے ہیں جنہیں زَنَمَتَا الْعَنْزِ کہتے ہیں۔ عربوں میں نسب کو بڑی اہمیت حاصل تھی۔ ظاہر ہے کہ ایسا شخص جس کا نسب کچھ اور ہو (یا معلوم ہی نہ ہو) اور وہ یونہی کسی قبیلہ کے ساتھ متمسک ہو جائے، وہ ذلیل اور کمینہ شمار ہوتا تھا۔ اسی لئے اَلزَّنِیْمُ کمینے آدمی کو کہتے تھے جو اپنی کمینگی اور شرارت میں بدنام ہو*۔ اَلزَّنَمَۃُ۔ ایک درخت جس پر پتے نہیں ہوتے*۔ قرآن کریم میں زَنِیْمٌ کا لفظ (۶۸/۱۳) میں آیا ہے۔

ز ن ی

زَنیٰ۔ یَزْنِیْ۔ زِنیً و زِنَاءً۔ اس نے بدکاری کی**۔ بلا عقد معروف کسی سے جنسی اختلاط کیا۔ قرآن کریم میں ہے وَلَا تَقْرَبُوا الزِّنیٰ (۱۷/۳۲)۔ "زنا کے قریب تک بھی نہ جاؤ"۔ یعنے یہی نہیں کہ زنا نہ کرو بلکہ مبادیات زنا تک کے بھی پاس نہ جاؤ۔ سورۃ فرقان میں ہے وَلَا یَزْنُوْنَ (۲۵/۶۸)۔ "زنا نہیں کرتے"۔ اَلزَّانِیُ۔ زنا کرنے والا مرد۔ اَلزَّانِیَۃُ (۲۴/۲) زنا کرنے والی عورت۔ ان میں سے ہر ایک کی سزا سو سو کوڑے ہیں۔ (۲۴/۲)۔ البتہ اگر یہ جرم ایسی شادی شدہ عورت سے سرزد ہو جو پہلے لونڈی رہ چکی ہو (زمانہ جاہلیت کے دستور کے مطابق***) تو اس کی سزا اس سے نصف ہے (۴/۲۵)۔ اس لئے کہ لونڈیوں کی پرورش اور ترتیب جس پست ماحول میں ہوتی تھی اس سے ان میں اس بلندیٔ کردار کی توقع رکھنا جو بلند، شریف اور پاکیزہ ماحول میں پیدا ہوتا ہے، زیادتی تھی۔ اس سے اندازہ لگائیے کہ قرآن کریم انسان کی اضطراری کمزوریوں پر کسقدر نگاہ رکھتا ہے۔

سنگساری (رجم) کی سزا قرآن کریم میں نہیں۔

ہمارے زمانے میں اس مسئلہ پر بڑی تحقیق ہوئی ہے کہ جنسی تعلقات کا قوموں کے عروج و زوال پر کسقدر گہرا اثر پڑتا ہے اور جو قومیں مردوں اور عورتوں کی عفت کی پرواہ نہیں کرتیں وہ تہذیب و تمدن کی کس پست سطح پر آجاتی ہیں۔ (اس مسئلہ سے دلچسپی رکھنے والے احباب میری کتاب سلیم کے نام خطوط، جلد سوم میں متعلقہ خط ملاحظہ فرمائیں)۔

*تاج **تاج و راغب۔ *** قرآن کریم نے غلام اور لونڈیوں کے وجود (Institution) ہی کو ختم کر دیا۔ تفصیل م۔ ل۔ ک کے عنوان میں ملیگی۔

ز ھ د

زَھَدَ (فِیْ وعَنْ) یَزْھَدُ - زُھْدًا - بے رغبت ھونا * - کسی چیز سے اعراض برتنا اور اسے چھوڑ دینا*- اس سے فاعل زَاھِدٌ ہے - سورۃ یوسف میں ہے کہ اہل قافلہ نے حضرت یوسفؑ کو تھوڑی سی قیمت پر بیچ دیا - اس لئے کہ وَکَانُوْا فِیْہِ مِنَ الزَّاھِدِیْنَ (۱۲/۲۰) - وہ حضرت یوسفؑ میں کچھ زیادہ رغبت نہیں رکھتے تھے - اَلزَّھِیْدُ - قلیل اور حقیر* - ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی کسی چیز کی کمی کے ہیں - اَلزَّاھِدُ وَالزَّھِیْدُ - تنگ اخلاق آدمی - کم خور آدمی* - صاحب محیط نے لکھا ہے کہ زُھْدٌ دراصل کسی چیز کی طرف میلان چھوڑ دینے کو کہتے ہیں ** -

زُھْدٌ یا زاھد کا لفظ جن معنوں میں ہمارے ہاں استعمال ہوتا ہے قرآن کریم میں کہیں نہیں آیا- یہ تصوف کی اصطلاح ہے جس میں دنیا سے بے رغبتی کو بڑی فضیلت قرار دیا گیا ہے - یہ تصور قرآنی تعلیم کے خلاف ہے - (خود تصوف ہی اسلام کی سرزمین میں ایک اجنبی پودا ہے) قرآن کریم کی رو سے مومن کا فریضہ دنیا کی تسخیر ہے اور اسکی خوش گواریوں سے متمتع ہونا اس کا حق - قرآن کریم واضح الفاظ میں کہتا ہے کہ ’’ ان سے کہو کہ وہ کون ہے جو ان زینت کی چیزوں کو حرام قرار دے سکتا ہے جنہیں خدا نے اپنے بندوں کیلئے پیدا کیا ہے ‘‘ (۷/۳۲) - مومن صرف ان چیزوں سے اجتناب کرتا ہے جن سے خدا نے روکا ہے - ان کے علاوہ، وہ دنیا کی ہر چیز سے فائدہ اٹھاتا اور انہیں اپنے کام میں لاتا ہے -

ز ھ ر

اَلزَّھْرَۃُ - اَلزَّھَرَۃُ - پودا - پودے کا پھول - بعض نے کہا ہے کہ زَھْرَۃٌ صرف کھلے ہوئے پھول کو کہا جاتا ہے - اَلزَّھْرَۃُ مِنَ الدُّنْیَا - دنیا کی سرسبزی و تازگی - حسن و زیبائش - شگفتگی و شادابی - حاسان زیب و زینت - (۲۰/۱۳۱) - اَلزُّھْرَۃُ - سفیدی * - حسن - درخشندگی - اَلزَّھْرِیَّاتُ مِنَ الْاَیَّامِ - بہار کے دن ** -

ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی حسن - روشنی - اور صفائی پر دلالت کرتے ہیں -

* تاج - ** محیط -

ز ھ ق

زُھُوْقٌ۔ صاحب محیط نے کہا ہے کہ اس کے اصل معنے دشواری کے ساتھ نکلنے کے ہوتے ہیں۔ چنانچہ زَھَقَتِ النَّفْسُ کا مطلب یہ ہے کہ جان بمشکل نکلی*۔ اَلزَّاھِقُ۔ موٹے جانور کو کہتے ہیں جس میں گودا ہو**۔ نیز اس جانور کو بھی جو بہت لاغر ہو۔ اس طرح یہ لفظ اضداد میں سے ہے۔ اَلزَّھُوْقُ۔ گہرے کنوئیں کو بھی کہتے ہیں اور بلند پہاڑوں کے درمیانی راستے کو بھی**۔ لیکن تیزی سے ہو یا دشواری اور سستی سے، اسکے معنے کسی چیز کے نکل جانے کے ہوتے ہیں**۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی آگے بڑھنے، گزر جانے اور تجاوز کر جانے کے ہوتے ہیں۔ زَھَقَتِ الرَّاحِلَةُ زُھُوْقًا۔ اونٹنی گھوڑوں سے آگے نکل گئی۔ زَھَقَ السَّھْمُ زُھُوْقًا۔ تیر نشانے سے آگے نکل گیا۔ زَھَقَتْ نَفْسُہٗ۔ اسکی جان نکل گئی**۔ تَزْھَقَ اَنْفُسُھُمْ ($\frac{9}{85}$)۔ ''ان کی جانیں نکلیں''۔ اَلزَّاھِقُ۔ شکست خوردہ آدمی کو کہتے ہیں**۔ اَلْمُزْھَقُ مقتول کو کہتے ہیں۔ زَھَقَ الشَّیْءُ۔ کوئی چیز تباہ و برباد ہوئی، مضمحل ہوئی**۔

قرآن کریم میں باطل کے متعلق ہے فَاِذَا ھُوَ زَاھِقٌ ($\frac{21}{18}$)۔ ہر وہ نظریہ یا پروگرام جو حق کے خلاف، تخریبی نتائج کا حامل ہو، ناکام و نامراد رہتا ہے۔ مٹ جاتا ہے۔ شکست کھا جاتا ہے۔ وَقُلْ جَآءَ الْحَقُّ وَزَھَقَ الْبَاطِلُ۔ اِنَّ الْبَاطِلَ کَانَ زَھُوْقًا ($\frac{17}{81}$) ''اور کہو کہ حق آگیا اور باطل مٹ گیا۔ حقیقت یہ ہے کہ باطل ہوتا ہی مٹنے والا ہے''۔ یہاں زَھُوْقٌ کے معنے زَاھِقٌ ہی ہیں، لیکن مبالغہ کے ساتھ۔ باطل اسوقت تک رہتا ہے جب تک حق (خدا کا تعمیری نتائج پیدا کرنے والا پروگرام) نہیں آتا۔ اس کے آنے سے باطل شکست کھا کر مٹ جاتا ہے۔ اس کے اندر حق کے سامنے ٹھہرنے کی صلاحیت ہی نہیں ہوتی۔ مزید تفصیل (ح۔ ق۔ ق) اور (ب۔ ط۔ ل) کے عنوانات میں دیکھئے۔

اَزْھَقْتُ الْاِنَاءَ کے معنے ہیں، میں نے برتن کو الٹ دیا**۔ اس سے بھی اس کے معنے واضح ہیں۔ راغب نے لکھا ہے کہ زَھَقَتْ نَفْسُہٗ کے معنی ہیں رنج و غم سے اسکی جان نکل گئی***۔

ز و ج

زَوْجٌ۔ دو چیزیں جو ایک دوسرے کے مطابق ہوں (جیسے جوتے کے دونوں پاؤں)۔ یا ایک دوسرے کے مقابل ہوں (جیسے دن اور رات) وہ زَوْجَانِ

* محیط۔ ** تاج۔ *** راغب۔

کہلاتی ہیں ۔ اور ان میں سے ہر ایک ، دوسرے کی زَوْجٌ ہوتی ہے ۔ زَوْجٌ کے اصلی معنے جوڑ کے ہیں ۔ فَرْدٌ (اکیلا) کے خلاف ۔ لہذا زَوْجٌ اس فرد کو کہتے ہیں جس کا کوئی جوڑ (یا ساتھی) ہو ۔ خواہ اس کی مثل یا اسکے مقابل ۔ زَوَّجَ الشَّيْئَ بِالشَّيْئِ کے معنے ہیں اس نے ایک چیز کو اس جیسی چیز کے ساتھ ملا دیا (باندھ دیا) ۔ وَ اِذَا النُّفُوْسُ زُوِّجَتْ (۸۱/۷) کے معنے ہیں جب ہر انسان اپنے ہمجماعت یا ہم مذاق کے ساتھ ملجائیگا ۔ اور زَوَّجْنَاهُمْ بِحُوْرٍ عِيْنٍ (۴۴/۵۴) کے معنے ہیں انہیں حور عین کے ساتھ ہم آہنگ کردیا جائیگا ۔ ساتھی بنا دیا جائیگا ۔ (حُوْرٌ کے معنے (ح - و - ر) کے عنوان کے تحت دیکھئے) ۔ اسی اعتبار سے ہر شے کے امثال و نظائر (یعنے ایک ہی قسم کی چیزوں کو) اَزْوَاجٌ کہتے ہیں* ۔ اُحْشُرُوا الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا وَ اَزْوَاجَهُمْ (۳۷/۲۲) کے معنے ہیں ظلم کرنے والوں کو اور ان کی ہم کار پارٹیوں کو اکٹھا کرو ۔ (یعنے ان کے مثل و نظیر اور لوگوں کو جو ان جیسے ہیں) ۔ اسی طرح قرآن کریم میں اہل جنت کے متعلق مختلف مقامات میں آیا ہے کہ لَهُمْ فِيْهَا اَزْوَاجٌ مُّطَهَّرَةٌ (۴/۵۷) تو اس کے معنے نیک بیویاں ہی نہیں بلکہ اس کے معنے ہیں پاکیزہ خیالات رکھنے والے ہم مشرب ساتھی ۔ جنتی معاشرہ میں قلب ونگاہ کی پاکیزگی اور ہم آہنگی ہوتی ہے ۔ چونکہ اس معاشرہ میں مرد بھی ہونگے اور عورتیں بھی، اس لئے اَزْوَاجٌ میں میاں بیوی بھی شامل ہونگے ۔ واضح رہے کہ جو جنتی معاشرہ دنیا میں قائم ہوگا اس میں میاں بیوی کے تعلقات میں افزائش نسل کا مقصد بھی شامل ہوگا ۔ لیکن جنتِ آخرت میں میاں بیوی کی مواصلت یا افزائش نسل کا تصور قرآن کریم سے نہیں ملتا ۔ لہذا وہاں کی (مردوں اور عورتوں کی) زوجیت ، باہمی رفاقت (Companionship) کی ہوگی ۔ حقیقت یہ ہے کہ جنت آخرت کے متعلق جو کچھ قرآن کریم میں آیا ہے وہاں کی نعمتوں کا تمثیلی بیان ہے ۔ اسے یہاں کے اندازِ زیست پر قیاس نہیں کرنا چاہئے ۔ وہاں کی حقیقت کو ہم اپنے شعور کی موجودہ سطح پر سمجھ ہی نہیں سکتے ۔

انہی معانی کی بنا پر زَوْجٌ ۔ ہر شے کی قسم اور نوع و صنف (Species) کو کہتے ہیں* ۔ اَزْوَاجًا مِّنْهُمْ (۲۰/۱۳۱) کے معنے ہیں قسم قسم کے ایک دوسرے سے ملتے جلتے لوگ ۔ یا طرح طرح کی چیزیں جو ایک دوسرے سے مشابہ ہوں ۔ كَمْ اَنْۢبَتْنَا فِيْهَا مِنْ كُلِّ زَوْجٍ كَرِيْمٍ (۲۶/۷) کے معنے ہیں ہم نے زمین میں ہر عمدہ نوع کی کتنی چیزیں پیدا کی ہیں ۔ (ویسے

*تاج و محیط ۔ **راغب و لسان العرب ۔

نباتات میں نر و مادہ کا ہونا ثابت ہے اور بعض جمادات کے متعلق بھی ایسا خیال کیا جاتا ہے)۔ دوسری جگہ ہے۔ وَ آخَرُ مِنْ شَكْلِهٖٓ اَزْوَاجٌ (۳۸/۵۸) اس کے معنے ہیں اس کے علاوہ اسی قسم کی اور رنگا رنگ سزائیں۔ وَ مِنْ كُلِّ شَيْءٍ خَلَقْنَا زَوْجَيْنِ (۵۱/۴۹) کے معنے بھی یہی ہیں کہ ہم نے ہر نوع کی ایسی چیزیں تخلیق کی ہیں جو ایک دوسرے سے وابستہ اور ملتی جلتی ہیں۔ خواہ ایک دوسرے کے ہم رنگ ہوں اور خواہ ایک دوسرے کی ضد۔ مثلاً آسمان زَوْجٌ ہے زمین کا۔ سردی زَوْجٌ ہے گرمی کی۔ اور جوتے کا ایک پاؤں بھی زَوْجٌ ہے دوسرے پاؤں کا۔ زَوْجٌ کے معنے ایسے فرد کے بھی ہیں جس کا ساتھی یا نظیر و مثیل ہو۔ یعنی یہ لفظ دو ساتھیوں میں سے ہر ایک فرد کے لئے بھی اسی طرح مستعمل ہے جس طرح ان دونوں کے لئے۔ کبھی دونوں کے لئے زَوْجَانِ بھی بولتے ہیں*۔

اِزْدَوَجَ۔ اور تَزَاوَجَ۔ وزن یا سجع بندی کے لئے کسی فقرے کے دو ٹکڑوں کو ایک دوسرے سے مشابہ کرنا، یا دو قضیوں کا ایک دوسرے سے متعلق ہونا*۔ زَوْجٌ (جمع اَزْوَاجٌ)۔ رفیق۔ ایک دوسرے کے ساتھی*۔ زَوْجٌ (جمع اَزْوَاجٌ) کے معنے شوہر یا بیوی دونوں کے ہیں۔ شوہر بیوی کا زَوْجٌ ہوتا ہے اور بیوی شوہر کی زَوْجٌ** ان میں سے ایک دوسرے کی تکمیل کرتا ہے۔ اس کا نام ہے ازدواجی زندگی۔ قرآن کریم میں میاں بیوی کو ایک دوسرے کا لباس کہا گیا ہے۔ دیکھئے عنوان (ل۔ب۔س) (۱۳/۳۸) میں اَزْوَاجًا کے معنے بیویاں ہیں۔ تَزَوَّجْتُ اِمْرَاَةً کے معنے ہیں ''میں نے ایک عورت سے شادی کی''۔

اگر یہ دیکھنا ہو کہ قرآن کریم کی رو سے ازدواجی زندگی کس قسم کی زندگی ہوتی ہے تو اسکے لئے صرف اتنا سمجھ لینا کافی ہوگا کہ تَزَوَّجَهُ النَّوْمُ کے معنے ہیں نیند آنکھوں میں گھل مل گئی***۔ لہٰذا میاں بیوی کی زندگی کی مثال ایسی ہے جیسے آنکھوں میں نیند گھل جائے۔ (نیز دیکھئے عنوان، ن۔ک۔ح)۔ اس دنیا کے جنتی معاشرہ میں مردوں کے ساتھ عورتیں (بیویاں) بھی ہونگی لیکن وہ بھی قلب و نگاہ کی پاکیزگی کو لئے ہوئے ہونگی اور سفرِ زندگی میں ایک رفیق کی طرح ساتھ چلنے والیاں۔ قرآن کریم نے ان رفقائے حیات کی خصوصیات کا متعدد مقامات پر ذکر کیا ہے۔ باقی رہی مرنے کے بعد کی جنت، سو (جیسا کہ اجمالاً اوپر کہا گیا ہے اور تفصیلاً ج۔ن۔ن کے عنوان میں لکھا جا چکا ہے) ہم اپنے ادراک کی موجودہ سطح پر

*لین۔ ** لطائف اللغۃ *** تاج و محیط

اسکی کیفیات کا کچھ اندازہ نہیں لگا سکتے - اسی لئے نہیں کہہ سکتے کہ وھاں کے ساتھیوں کی کیسی کیفیت ھوگی - لیکن اس حقیقت سے تو کسی کو بھی انکار نہیں ھو سکتا کہ ھم رنگ اور ھم آھنگ ساتھی کا مل جانا ، جنت ھے -

ز و د

اَلزَّادُ - موجودہ ضرورت سے زائد چیز کو کہتے ھیں جسے دوسرے وقت کے لئے سنبھال کر رکھ لیا جائے* - نیز اس کے معنے کھانے کے ھیں خواہ سفر کا ھو یا حضر کا** - بالخصوص وہ کھانا جو سفر کے لئے تیار کیا جائے ، توشہ***- اَلْمِزْوَدُ - توشہ دان کو کہتے ھیں** - زَوَّدْتُہٗ تَزْوِیْدًا - میں نے اسے زاد راہ دیا - تَزَوَّدَ : اس نے توشہ ساتھ لیا** -

قرآن کریم میں حج کے سلسلہ میں ھے وَ تَزَوَّدُوْا (۲/۱۹۷) - جانے سے پہلے اپنے زاد سفر کا انتظام کرلیا کرو - (یونہی اٹھکر نہ چل دیا کرو) اس لئے کہ فَاِنَّ خَیْرَ الزَّادِ التَّقْوٰی (۲/۱۹۷) - جب تم زاد سفر لے کر چلوگے تو اس سے تم دوسروں کے دست نگر ھونے سے بچ جاؤگے - ابن فارس نے خلیل کے حوالہ سے لکھا ھے کہ تَزَوَّدَ کے معنی کسی اچھی چیز کو ادھر سے ادھر لے جانا ھیں -

ز و ر

اَلزَّوْرُ - سینے کا بالائی حصہ جہاں سینے کی تمام ھڈیاں آ کر مل جاتی ھیں - جو شخص کسی کو ملنے کے لئے آتا ھو اسے بھی اَلزَّوْرُ کہتے ھیں - زُرْتُہٗ - میں نے اپنا سینہ اس کے سامنے کیا ، توجہ سے اس کا قصد کیا ، اس سے ملا - اَلزَّوْرُ - اَلزِّیَارَۃُ - اَلْمَزَارُ - ملاقات کرنا - زیارت کرنا - اَلزَّوَرُ - سینے کا ٹیڑھا پن اور ایک طرف کو جھکا ھونا - اَلْاَزْوَرُ - وہ جس کے سینے میں ٹیڑھا پن ھو - جو چلنے میں سینہ کو ایک طرف زیادہ جھکا کر چلتا ھو - نیز کنکھیوں سے دیکھنے والے کو بھی کہتے ھیں - اسی سے اس لفظ کے معنے ایک طرف جھک جانے کے آتے ھیں - نیز سیدھے راستے سے ھٹ کر ایک طرف ھو جانے کے - ابن فارس نے کہا ھے کہ اس کے بنیادی معنی کسی طرف جھک جانے اور ایک طرف کو ھٹ جانے کے ھیں - سورۃ کہف میں ھے تَزَاوَرُ عَنْ کَہْفِہِمْ (۱۸/۱۷) - ''سورج ان کے غار سے ایک

---

*راغب - **تاج - ***ابن فارس -

طرف کو ہٹ کر نکل جاتا ہے''۔ زَوَّرَ عَنْہُ ۔ وہ اس سے ہٹ گیا ۔ اسی سے اَلزُّوْرُ جھوٹ کو کہتے ہیں ۔ حَبْلٌ لَہٗ زُوْرٌ ۔ رسی جس میں بٹ ہو* ۔ سورۃ حج میں ہے وَاجْتَنِبُوْا قَوْلَ الزُّوْرِ (۲۲/۳۰) ۔ اس کے عام معنے تو یہی ہیں کہ جھوٹی اور بناوٹی بات سے بچو ۔ لیکن اصل کے اعتبار سے اس کے معنے ہیں سیدھے راستے سے ہٹی ہوئی حرکت ۔ انسان کا ہر وہ قدم جو صراط مستقیم سے ہٹ کر کسی دوسری طرف جا پڑے، زُوْرٌ میں آجائیگا ۔ اسلام ، حرکت کا نام ہے ۔ یہ ایک تحریک ہے ۔ لیکن یہ حرکت بلاتعین منزل نہیں کہ جس طرف جی چاہا قدم اٹھا دیا ۔ یہ حرکت ہے ایک متعین منزل کی طرف ۔ اسلئے اس میں زُوْرٌ کا کوئی کام نہیں ۔ اس کی تشریح اگلی آیت نے کر دی جہاں فرمایا حُنَفَآءَ لِلّٰهِ (۲۲/۳۱) ۔ ہر طرف سے منہ موڑ کر اُس نصب العین کی طرف چلنا جو اللہ نے مقرر کیا ہے ۔ غَيْرَ مُشْرِكِيْنَ بِہٖ (۲۲/۳۱) ۔ اس میں کسی اور خیال ، جذبہ اور میلان کی آمیزش نہ کرنا ۔ اسی کو سورۃ فرقان میں ظُلْمًا وَّ زُوْرًا (۲۵/۴) کہا ہے ۔

كَلَامٌ مُّزَوَّرٌ ۔ بنائی ہوئی اور جھوٹ کا ملمع کی ہوئی بات ۔ زَوَّرَ الشَّيْءَ کے معنے ہیں کسی بات میں جھوٹ ملا کر اسے مزین بنا دیا ۔ باب تفعیل کا ایک خاصہ سلب ماخذ بھی ہے ۔ اس لئے تَزْوِيْرٌ کے معنی زُوْرٌ کو دور کرنے کے بھی ہیں اس کو اصلاح کہتے ہیں ۔ ابن الاعرابی نے کہا ہے کہ کسی چیز کو سدھارنا ، خواہ وہ خیر ہو یا شر ، تَزْوِيْرٌ کہلائیگا** ۔ ملنے کے معنے میں یہ مادہ قرآن کریم میں (۱۰۲/۲) میں آیا ہے ۔ جہاں کہا ہے حَتّٰى زُرْتُمُ الْمَقَابِرَ ۔ یہاں تک کہ تم قبروں سے جا ملو ۔

ز و ل (ز ی ل)

زَالَ ۔ يَزُوْلُ وَ يَزَالُ ۔ زَوَالًا ۔ کسی چیز کا جاتے رہنا ۔ تبدیل ہو جانا ۔ مضمحل ہو جانا ۔ ایک طرف ہٹ جانا ۔ دور ہو جانا ۔ جدا ہو جانا ۔ باز آ جانا ۔ قرآن کریم میں یہ لفظ اَمْسَكَ کے مقابلہ میں آیا ہے (۳۵/۴۱) جس کے معنے روکنے کے ہیں ۔ اِنَّ اللّٰهَ يُمْسِكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ اَنْ تَزُوْلَا ۔ ''یقیناً اللہ (کا قانون) آسمانوں کو اور زمین کو روکے ہوئے ہے کہ وہ اپنی جگہ سے ہٹ نہ جائیں ۔ الگ الگ نہ ہو جائیں'' ۔ زَيَّلَ ۔ الگ الگ کر دینا* ۔

*تاج و محیط و راغب ۔ **تاج ۔

لاَ یَزَالُوْنَ (۲/۲۱۷) - وہ ہمیشہ اس حالت میں رہینگے - کبھی باز نہیں آئینگے- فَزَیَّلْنَا بَیْنَھُمْ (۱۰/۲۸) - ہم ان میں جدائی ڈال دینگے - لَوْ تَزَیَّلُوْا (۴۸/۲۵) - اگر وہ الگ الگ ہو جاتے -

راغب کا کہنا ہے کہ زَوَالٌ اس چیز کی حرکت کے لئے بولا جاتا ہے جو پہلے ثابت ہو اور بعد میں ثابت نہ رہی ہو*- (اپنی جگہ سے ہٹ گئی ہو)-

ز ی ت

زَیْتٌ (۲۴/۳۵)- زیتون کا تیل - زَیْتُوْنَۃٌ (۲۴/۳۵)- زیتون کا ایک درخت - یا اس کا ایک پھل **- (۶/۹۹) - اسے بڑا نفع بخش اور مفید درخت سمجھا جاتا ہے ***-

قرآن کریم میں ہے وَالتِّیْنِ وَالزَّیْتُوْنِ وَطُوْرِ سِیْنِیْنَ وَھٰذَا الْبَلَدِ الْاَمِیْنِ (۹۵/۱-۳)- اس میں اَلزَّیْتُوْنُ- زیتا نام پہاڑی ہے جو فلسطین میں واقع ہے ****- وہاں حضرت عیسیٰؑ مبعوث ہوئے تھے- اور اَلتِّیْنُ - حضرت نوحؑ کی بعثت کا مقام ہے- اللہ نے کہا ہے کہ حضرت نوحؑ اور حضرت عیسیٰؑ کی دعوت - اور حضرت موسیٰؑ اور محمد عربیؐ کی دعوت - یہ سب آسمانی دعوتیں اس حقیقت کبریٰ کی شاہد ہیں کہ لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ ..... الخ (۹۵/۴-۶)-

ز ی د

زَیْدٌ کے معنے ہیں نشوو نما پانا - بڑھنا اور پھولنا پھلنا- یعنے زیادہ ہونا - نیز یہ متعدی بھی آتا ہے- زَادَ اللّٰہُ خَیْرًا - اور زَیَّدَہٗ کے معنی زیادہ دینا اور زیادہ کرنا ہیں **- اِزْدَادَ اِزْدِیَادًا - زیادہ ہونا یا زیادہ کرنا (لازم و متعدی) ***-

سورۃ رعد میں اِزْدِیَادٌ کے مقابل غَیْضٌ کا لفظ آیا ہے (۱۳/۸) - غَیْضٌ کے معنے کم ہوجانے یا اندر چلے جانے اور جذب ہو جانے کے ہیں - سورۃ یونس میں زِیَادَۃٌ کا لفظ آیا ہے (۱۰/۲۶)- اور (۵۰/۳۵) میں مَزِیْدٌ ہے - یعنی وہ اضافہ اور زائد چیز جو کسی چیز کے پورا ہونے کے بعد اس میں بڑھائی جائے - سورۃ آل عمران میں ہے ثُمَّ ازْدَادُوْا کُفْرًا (۳/۸۹)- اس کے معنے زیادہ ہونے ، بڑھ جانے کے ہیں -

---

* راغب - ** تاج - *** محیط - **** لطائف اللغۃ نے اسے جبل الشام لکھا ہے -

سورۂ احزاب میں (حضرت) زَیْدٌ کا نام آیا ہے (۳۳/۳۷)۔ یہی ایک صحابیؓ ہیں جن کا نام قرآن میں آیا ہے۔ یہ حارثہ کے فرزند اور نبی اکرمؐ کے خادم اور محبوب متبنّیٰ تھے جن سے آپؐ نے اپنی پھوپھی زاد بہن حضرت زینبؓ کا نکاح کر دیا تھا۔

التَّزاد کے لئے عنوان "ز۔و۔د" دیکھئے۔

ز ی غ

زَاغَ۔ یَزِیْغُ۔ زَیْغاً۔ ایک طرف کو جھک جانا۔ زَاغَتِ الشَّمْسُ۔ سورج مائل بزوال ہوا*۔ راغب نے کہا ہے کہ اگرچہ زَالَ۔ مَالَ اور زَاغَ قریب قریب ایک ہی مفہوم کو ادا کرتے ہیں لیکن زَاغَ صرف اس ہٹ جانے اور جھک جانے کو کہتے ہیں جو حق سے باطل کی طرف ہو*۔ صاحب محیط نے کلیات کے حوالے سے لکھا ہے کہ قرآن کریم میں جہاں زَیْغٌ کا لفظ آیا ہے اسکے معنے ایک طرف جھک جانے کے ہیں سوائے زَاغَتِ الْاَبْصَارُ کے کہ اسمیں نگاہوں کے اوپر اٹھے یا کھلے رہ جانے کے معنے ہیں**۔

قرآن کریم میں ہے فَلَمَّا زَاغُوْٓا اَزَاغَ اللّٰہُ قُلُوْبَھُمْ (۶۱/۵)۔ جب وہ صحیح راستے سے ہٹ گئے تو خدا کے قانون مکافات نے ان کے دلوں کو اُسی طرف جھکا دیا۔

یہ آیت قرآنی تعلیم کی ایک عظیم حقیقت کی پردہ کشائی کرتی ہے۔ عام طور پر سمجھا اور کہا جاتا ہے کہ ہدایت اور ضلالت خدا کے ہاتھ میں ہے۔ وہ جسے چاہے ہدایت دیدے اور جسے چاہے گمراہ کردے۔ اس نے جنہیں گمراہ کرنا ہوتا ہے ان کے دلوں پر مہریں لگا دیتا ہے۔ (وغیرہ وغیرہ)۔ یہ تصور قرآن کریم کی تعلیم اور خدا کے قانون مکافات عمل کے یکسر خلاف ہے۔ قرآن کریم کہتا ہے کہ انسان کو صاحب اختیار و ارادہ پیدا کیا گیا ہے۔ وہ اپنے متعلق خود فیصلہ کرتا ہے کہ اسے سیدھے راستے پر چلنا چاہیئے یا کجروی اختیار کرنی چاہیئے۔ جس قسم کا وہ فیصلہ کرتا ہے اسی قسم کا خدا کا قانون اس پر نافذ ہو جاتا ہے۔ وہ اگر کجروی اختیار کرتا ہے تو اس کی ساری قوتیں اور صلاحیتیں غلط طریق پر چل کر ضائع ہو جاتی ہیں۔ دوسرے مقام پر ہے یُؤْفَکُ عَنْہُ مَنْ اُفِکَ (۵۱/۸) "حق سے اس کو پھرایا جاتا ہے جو خود اس سے پھرنا چاہتا ہے"۔ خدا کا قانون یہ نہیں کہ ایک شخص حق سے پھرنا چاہتا ہے لیکن خدا اسے زبردستی حق پر قائم رکھتا ہے۔ یا

* تاج۔ ** محیط۔

ایک شخص حق پر قائم رہنا چاہتا ہے اور خدا اسے حق سے پھرا دیتا ہے۔ حق سے اسی کو پھرایا جاتا ہے جو خود اس سے پھرنا چاہے۔ دل انہی کے ٹیڑھے ہوتے ہیں جو خود ٹیڑھے راستے پر چلنا چاہتے ہیں۔ یہاں ابتداء کار (Initiative) انسان کے ہاتھ میں ہے۔ خدا کا قانون اس کے پیچھے پیچھے چلتا ہے۔ جیسا انسان کا فیصلہ، ویسا خدا کا قانون۔ اقبال کے الفاظ میں

خاک شو نذر ہوا سازد ترا　　　　سنگ شو برشیشه اندازد ترا

جیسا انسان خود، ویسا خدا کا قانون۔ آنکھیں بند کرلو، اندھیرا ہو جائے گا۔ کھول لو، نظر آنے لگ جائیگا۔

سورۃ النجم میں نبی اکرم ؐ کے متعلق ہے مَازَاغَ الْبَصَرُ وَمَا طَغٰی (۵۳/۱۷) "نہ تو آپکی نگاہ، حقیقت سے کسی اور طرف کو ہٹی اور نہ ہی حد سے تجاوز کر گئی"۔ مَاطَغٰی نے اس حقیقت کو واضح کر دیا ہے کہ اگرچہ دوسرے انسانوں کے مقابلہ میں رسول ؐ کا علم (وحی) بہت وسیع ہوتا ہے لیکن علم خداوندی کے مقابلہ میں اس کا علم بھی محدود ہوتا ہے۔ جو حد خدا نے اس کے لئے مقرر کر دی ہے وہ اس سے آگے نہیں جا سکتا۔ سورۃ سبا ٔ میں ہے وَمَنْ یَّزِغْ مِنْهُمْ عَنْ اَمْرِنَا (۳۴/۱۲)۔ یہاں اسکے معنے حکم سے پھرنے یا حکم عدولی کرنے کے ہیں۔

عذاب کے وقت افراتفری کے سلسلہ میں زَاغَتِ الْاَبْصَارُ کے الفاظ آئے ہیں (۳۳/۱۰)۔ اس کے یا تو یہ معنے ہیں کہ خوف کے وقت نگاہیں ایک مقام پر جمی نہیں رہتیں بلکہ ادھر ادھر ہٹ جاتی ہیں۔ اور یا (جیسا کہ صاحب محیط نے لکھا ہے) اسکے معنے یہ ہیں کہ نگاہیں اوپر کو اٹھی کی اٹھی رہ گئیں۔ بہرحال مقصد خوف و ہراس کی کیفیت بیان کرنا ہے۔

کسی کی طرف سے نگاہیں پھر جانے کیلئے یہ الفاظ (۳۸/۶۳) میں آئے ہیں۔ اور زَیْغٌ بمعنی کجی، باطل کی طرف جھکاؤ، کجروی، (۳/۹) میں۔ یعنی قرآنی تعلیم کے نقطۂ ماسکہ پر مرتکز رہنے کے بجائے، ادھر ادھر ہٹ جانا۔ کسی اور طرف نکل جانا۔ اپنے میلانات اور رجحانات کے پیچھے چلے جانا۔ یہ روش زندگی بڑی تباہ کن ہے۔ صحیح روش یہ ہے کہ ہمارے قلبی اور ذہنی میلانات و عواطف کا تقاضا کچھ ہی کیوں نہ ہو ہمیں قرآن کریم کے مرکز سے ادھر ادھر کبھی نہیں ہٹنا چاہیئے۔ حق وہی ہے جو قرآن کریم کہتا ہے۔ نہ کہ وہ جو ہمارے جذبات و میلانات چاہتے ہیں۔ جو شخص پہلے سے کچھ خیالات یا عقائد ذہن میں رکھ کر قرآن کریم کی طرف اس مقصد سے جائے کہ قرآن کریم سے ان عقائد کی تائید حاصل کرے (خواہ وہ غلط ہی کیوں نہ ہوں) اسے قرآن کریم سے کبھی صحیح راہ نمائی نہیں مل سکتی۔

قرآن کریم سے صحیح راہ نمائی حاصل کرنے کے لئے ادراک کا بے رنگ ہونا نہایت ضروری ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن کریم نے زَیْغ* کو ہدایت کی ضد قرار دیا ہے (۳/۷)۔ (مزید تشریح ح۔ک۔م کے عنوان میں مُحْکَمٰتٌ* کے تحت دیکھئے)۔

ز ی ل

دیکھئے عنوان "ز۔و۔ل"۔

ز ی ن

اَلزِّیْنَۃُ۔ وہ چیز جس سے آرائش کی جائے۔ بعض نے کہا ہے کہ خود کسی چیز کا نگاہ میں حسین معلوم ہونا بھی زینت کہلاتا ہے۔ زَیَّنَ۔ کسی چیز کو آراستہ کرنا۔ کسی چیز (یا بات) کو خوشنما بنا کر دکھانا*۔ ابلیس نے کہا تھا کہ لَاُزَیِّنَنَّ لَھُمْ فِی الْاَرْضِ (۱۵/۳۹)۔ میں (انسان کو) اسکی طبعی زندگی (حیات ارضی) اسقدر خوشنما بنا کر دکھاؤنگا کہ یہ اسی کو نصب العین حیات بنا کر بیٹھ جائیگا۔ یعنی اسکا تصور حیات بالکل مادہ پرستانہ (Materialistic) ہو جائیگا۔ اِزَّیَّنَ۔ آراستہ پیراستہ ہونا۔ مزین ہونا (۱۰/۲۴)۔ یَوْمُ الزِّیْنَۃِ (۲۰/۵۹) بناؤ سنگھار کا دن۔ تہوار۔ روز جشن۔ قصہ بنی اسرائیل میں ایک جگہ اَوْزَارًا مِّنْ زِیْنَۃِ الْقَوْمِ (۲۰/۸۷) آیا ہے۔ یعنی وہ چیزیں جن سے وہ قوم اپنی آرائش کرتی تھی۔ دوسری جگہ اسی کو حُلِیِّھِمْ (۷/۱۴۸) کہا گیا ہے۔ یعنے ان کے زیورات۔

قرآن کریم، صرف زندگی کا افادی پہلو (Utilitarian Aspect) ہی سامنے نہیں رکھتا بلکہ جمالیاتی پہلو (Aesthetic Aspect) بھی پیش نظر رکھتا ہے۔ اسلئے وہ انسان کو نہ صرف اجازت دیتا ہے کہ وہ زیبائش و آرائش کی چیزوں سے اپنے اور کائنات کے حسن میں اضافہ کرے بلکہ اسکا حکم دیتا ہے کہ خُذُوْا زِیْنَتَکُمْ عِنْدَ کُلِّ مَسْجِدٍ (۷/۳۱)۔ ہماری اطاعت گزاریوں میں حسن و زینت کو اختیار کرو۔ جو لوگ زندگی کے جمالیاتی پہلو کو نفرت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں ان کے متعلق بڑی سختی سے کہتا ہے کہ قُلْ مَنْ حَرَّمَ زِیْنَۃَ اللّٰہِ الَّتِیْٓ اَخْرَجَ لِعِبَادِہٖ (۷/۳۲)۔ ان سے کہو کہ زیبائش و آرائش کی جن چیزوں کو اللہ نے اپنے بندوں کے لئے پیدا کیا ہے وہ کون ہے جو انہیں حرام قرار دے سکتا ہے؟ اس نے زیبائش و آرائش کی چیزوں کو کسی خاص دائرہ کے اندر محدود نہیں کیا، بلکہ فرمایا کہ

* تاج۔

اِنَّا جَعَلْنَا مَا عَلَى الْاَرْضِ زِيْنَةً لَّهَا (۱۸/۷)۔ جو کچھ زمین میں ہے سب اسکے لئے وجہ زینت ہے ۔ اسلئے زمین میں جو کچھ بھی زینت و آرائش کا سامان ہے ، سب انسان کے حسن و زیبائش کے لئے ہے ۔ کسی چیز کی ممانعت نہیں۔ البتہ اس اہم حقیقت کو پیش نظر رکھنا ضروری ہے کہ یہی چیزیں زندگی کا نصب العین نہیں بن جانی چاھئیں (۱۸/۴۶)۔ انہیں اصل نصب العین کے حصول میں مددگار کے طور پر استعمال کرنا چاھیئے ۔ یا یوں سمجھئے کہ دنیوی متاع حیات اور زیب و زینت کی اشیاء سے متمتع ہونے کی ممانعت نہیں لیکن جب کبھی ایسا ہو کہ ان چیزوں میں اور قرآن کی متعین کردہ حدود اور اقدار میں ٹکراؤ ہو، اُسوقت اُن چیزوں کو ، ان اقدار کے تحفظ کی خاطر قربان کر دینا ہوگا۔ یہی دین کا مغز اور قرآنی تعلیم کا ماحصل ہے ۔

قرآن کریم میں (پردے کے احکام کے سلسلہ میں) کہا گیا ہے کہ مرد اور عورتیں جب باہر نکلیں تو اپنی نگاہوں کو بیباک نہ ہونے دیں (۲۴/۳۰) ۔ اور عورتیں لَا يُبْدِيْنَ زِيْنَتَهُنَّ اِلَّا مَا ظَهَرَ مِنْهَا (۲۴/۳۱) اپنی زینت کی چیزوں کو نمایاں نہ کریں ، ہاں جو ان میں سے خود بخود ظاہر ہو جائیں (تو اس کا مضائقہ نہیں) ۔ یہاں زینت سے مراد وہ چیزیں ہیں جن سے عورتیں اپنا بناؤ سنگار کرتی ہیں ۔ مثلاً زیورات وغیرہ ۔ اسکی تائید اگلے الفاظ سے ہوجاتی ہے ،جہاں کہا گیا ہے کہ وَلَا يَضْرِبْنَ بِاَرْجُلِهِنَّ لِيُعْلَمَ مَا يُخْفِيْنَ مِنْ زِيْنَتِهِنَّ (۲۴/۳۱) ۔ وہ اپنے پاؤں کو اسطرح زمین پر نہ ماریں کہ جو کچھ وہ اپنی زینت میں سے چھپائے ہوئے ہیں وہ ظاہر ہو جائے ۔ پاؤں کو زور سے زمین پر مارنے سے ، چھپے ہوئے زیور (جھانجھن یا چھاگل وغیرہ) کی آواز نمایاں ہو جاتی ہے ۔ باقی رھی جسم کے اوپر کے حصہ کی اشیائے زینت ، سو اس کیلئے کہدیا کہ وہ اپنی اوڑھنیاں سینوں پر ڈال لیا کریں (۲۴/۳۱) یا جلباب اوڑھ لیا کریں (۳۳/۵۹) ۔ مطلب یہ ہے کہ وہ اشیائے زینت کی نمائش نہ کرتی پھریں ۔ البتہ افراد خاندان کے سامنے ان کی نمائش کر لیں تو اس میں ہرج کی بات نہیں (۲۴/۳۱) ۔ اس فہرست پر نگاہ ڈالنے سے یہ حقیقت واضح ہوجائیگی کہ قرآن کریم اس باب میں بھی کہاں تک احتیاط برتتا ہے۔

جنسی جذبہ (بھوک اور پیاس کی قسم کا جذبہ) نہیں جو از خود بیدار ہو جائے ۔ یہ جذبہ بیدار کرنے سے بیدار ہوتا ہے ۔ قرآن کریم ان اسباب و ذرائع کی نگرانی کرتا ہے جو اس جذبہ کی بیداری کے محرک بن سکتے ہیں ۔ عورت کیطرف سے غیروں کے سامنے نمود حسن یا اظہار زینت ، سب سے بڑا محرک ہے ۔ قرآن کریم اس پر پابندی عائد کرتا ہے ۔

س

س (حرف)

سَ - یہ حرف مضارع کے شروع میں آتا ہے - عربی میں فعل مضارع حال اور استقبال دونوں زمانے اپنے اندر رکھتا ہے ، جب اس سے پہلے ''س'' آ جائے تو اس میں صرف مستقبل کے معنی باقی رہتے ہیں - جیسے سَیَفْعَلُ وہ کام کریگا - ''سَ'' عموماً مستقبل قریب کے معنی دیتا ہے - لیکن یہ قریب اور بعید محض اضافی چیزیں ہیں - بعض کے نزدیک یہ استمرار (ھمیشگی) کا مفہوم بھی پیدا کردیتا ہے - مثلاً - سَیَقُوْلُ السُّفَھَاءُ (۲/۱۴۲) یہ بیوقوف کہتے رہینگے کہ . . . - بعض کا یہ بھی کہنا ہے کہ جب یہ کسی ایسے فعل کے ساتھ آئے جس میں وعدہ یا وعید پایا جائے تو اس سے تاکید کا مفہوم پیدا ہو جاتا ہے - مثلاً فَسَیَکْفِیْکَھُمُ اللّٰہُ (۲/۱۳۷) - اللہ یقیناً ان کے مقابلہ میں تیرے لئے کافی ہوگا -

س أ ل

سَاَلْتُہٗ الشَّیْءَ - کے معنے ھیں میں نے اس سے وہ چیز مانگی - اور سَاَلْتُہٗ عَنِ الشَّیْءِ و بِہٖ کے معنے ھیں میں نے اس سے اس چیز کے متعلق دریافت کیا - اَسْاَلَہٗ سُؤْلَہٗ - اس کی ضرورت کو پورا کردیا - اَلسَّائِلُ - سوال کرنے والا - ضرورت مند* - اَلْمَسْاَلَۃُ - ضرورت - حاجت** -

قرآن کریم میں ہے اَمَّا السَّآئِلَ فَلَا تَنْھَرْ (۹۳/۱۰) - ضرورت مند ، صاحب احتیاج کو (ذلیل و حقیر سمجھ کر) مت ڈانٹو -

سورۃ الرحمٰن میں ہے یَسْئَلُہٗ مَنْ فِی السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ (۵۵/۲۹) - کائنات میں ھر شے اپنی ضروریات کے لئے خدا کے سامنے جھولی پھیلائے ہے - ھر شے اپنی نشو و نما کے لئے اس کے نظام ربوبیت کی محتاج ہے - سورۃ

---

*تاج - **محیط -

سجدہ میں زمین اور اس کی پیداوار کے متعلق کہا ہے کہ یہ سَوَآءً لِّلسَّآئِلِيْنَ (۴۱/۱۰) ہے - یعنی اسے تمام ضرورت مندوں کے لئے یکساں طور پر کھلا رہنا چاہئے - یہ انسانی رزق کا سر چشمہ ہے اس لئے اس سے ہر شخص کی ضروریات پوری ہونی چاہئیں - یہی اس کی تخلیق کا مقصد ہے - نہ یہ کہ مختلف لوگ اس پر حدبندی کرکے اسے اپنی اپنی ملکیت تصور کر لیں - خدا نے ان تمام چیزوں کو، جن کی انسان کو اپنی زندگی برقرار رکھنے کے لئے ضرورت ہے، خود مہیا کر دیا ہے - وَ آتٰكُمْ مِّنْ كُلِّ مَا سَاَلْتُمُوْهُ (۱۴/۳۴) - یہ اس کا نظامِ ربوبیت ہے - لہذا اس کی ربوبیت عامہ کو افراد کی ملکیت سمجھ لینا بہت بڑا جرم ہے -

باہم ایک دوسرے سے دریافت کرنے کے معنوں میں سورۃ النبأ میں ہے عَمَّ يَتَسَآءَلُوْنَ (۷۸/۱) - مَسْئُوْلُوْنَ (۳۷/۲۴) جن سے پوچھ گچھ کی جائے - سورۃ طٰہٰ میں ہے قَدْ اُوْتِيْتَ سُؤْلَكَ يٰمُوْسٰى (۲۰/۳۶) - اس میں سُؤْلَ بمعنی مسؤل ہے - یعنی جس چیز کی تجھے احتیاج ہے - تیری مانگ - طلب - تیری مانگی ہوئی چیز -

تصریحات بالا سے ظاہر ہے کہ "سوال" کے بنیادی معنی ضرورت اور احتیاج کے ہیں - جب ہم کسی سے کچھ دریافت کرتے ہیں تو اس وقت بھی ہمیں ان باتوں کے معلوم کرنے کی احتیاج ہوتی ہے جن کی بابت ہم دریافت کرتے (پوچھتے) ہیں - قرآن کریم کے مختلف مقامات میں یہ دیکھنا ضروری ہوگا کہ کس جگہ اس کا ترجمہ دریافت کرنا ٹھیک ہوگا اور کس جگہ طلب کرنا -

س أ م

سَئِمَ - يَسْاَمُ - اکتا جانا - اَسْاَمَهٗ - اس نے اسے اکتا دیا* - بعض نے کہا ہے کہ سَاٰمٌ - کنایۃً کسل کو بھی کہتے ہیں اور بعض نے کہا ہے کہ یہ کسل (سستی) سے اوپر کی چیز ہے** - لَا يَسْئَمُ الْاِنْسَانُ مِنْ دُعَآءِ الْخَيْرِ (۴۱/۴۹) - انسان مال اور دولت کی طلب سے اُکتاتا ہی نہیں - اس کی یہ طلب، اپنی ضروریات پوری کرنے کے لئے نہیں ہوتی بلکہ جذبۂ منافست کی وجہ سے ہوتی ہے - یعنی ایک دوسرے سے بڑھ جانے کے جذبہ کی بنا پر - اور اس طلب کا سلسلہ ختم ہی نہیں ہوتا حَتّٰى زُرْتُمُ الْمَقَابِرَ (۱۰۲/۲) تاآنکہ یہ قبر تک پہنچ جاتا ہے - سورۃ بقرہ میں ہے وَ لَا تَسْئَمُوْا اَنْ تَكْتُبُوْهُ (۲/۲۸۲) - قرض کے لکھنے میں سستی نہ کرو - اکتا نہ جاؤ - دل برداشتہ نہ ہو جاؤ -

*تاج - **محیط -

سبأ

سَبَاؑ - یمن کی ایک قدیم سلطنت کے دارالخلافہ کا نام تھا جس پر عہد حضرتِ سلیمانؑ میں ایک ملکہ حکمران تھی - قرآن کریم میں اس قوم، اس کے ملک اور ملکہٗ سبأ کا ذکر آیا ہے - (دیکھئے $\frac{27}{22}$ و $\frac{34}{15}$)-اس میں اس ملک کی سرسبزی اور زرخیزی کا خاص طور پر ذکر ہے اور پھر سیلاب کی وجہ سے اس کی عبرت انگیز تباہی کا - اُنہوں نے ایک بہت بڑا بند تعمیر کرکے پانی کو روکا تھا جس سے ان کا علاقہ سیراب ہوتا تھا - یہ سیلاب اسی بند کے ٹوٹنے سے آیا تھا - ۱۹۵۰ء میں ایک امریکن ماہر حفریات (Archaeologist) نے ان آثار قدیمہ کا ذکر کیا تھا جو اس نے جنوبی عرب، بالخصوص یمن کے علاقہ میں دریافت کئے تھے - اس کی کتاب کا نام (Qataban and Sheba) ہے اور مصنف کا نام (Wendell Phillips) - ان تفاصیل سے ان امور پر روشنی پڑتی ہے جن کا ذکر قرآن کریم نے کیا ہے - بالخصوص ان کے تعمیر کردہ بند اور اس کے بعد اس تباہی پر جس سے اس قوم کی صرف داستانیں دنیا میں باقی رہ گئیں - ($\frac{34}{19}$) -

اَلسَّبَّاءُ - شراب کے کاروبار کرنے والے کو کہتے ہیں اور سَبَأَ الْخَمْرَ کے معنی ہیں اس نے شراب خریدی* - اگر سبأ کے شہر کا نام اسی نسبت سے تھا تو اس سے ذہن ان تاکستانوں کی طرف منتقل ہوتا ہے جن کی وہاں افراط تھی- لیکن اَلسَّبْأَةُ کے معنے لمبے سفر کے بھی ہیں* - قرآن کریم میں ہے کہ وہ لوگ چاہتے تھے کہ رَبَّنَا بٰعِدْ بَيْنَ اَسْفَارِنَا ($\frac{34}{19}$) - اے ہمارے پروردگار! ہمارے سفروں کو لمبا کر دے تاکہ ہمارا تجارتی کاروبار وسیع سے وسیع تر ہو جائے - ممکن ہے اسی نسبت سے ان کے دارالسلطنت کا یہ نام ہو- ملکہٗ سبأ اور حضرت سلیمانؑ کے روابط کے متعلق عنوان ''سلیمانؑ'' دیکھئے-

س ب ب

سَبَّهٗ سَبًّا - اسکو قطع کر دیا - کاٹ دیا - اَلسِّبُّ - گالی دینا - (کیونکہ اس سے ایک دوسرے کی کاٹ ہوتی ہے یا تعلقات منقطع ہوتے ہیں)**-

اَلسِّبُّ اور اَلسَّبَبُ - رسی - مضبوط اور لمبی رسی جس سے درخت وغیرہ پر اترا اور چڑھا جائے - یا جس سے پانی تک پہنچا جائے- اسی سے اسکے

*تاج و محیط - ** تاج -

معنے ہر اس ذریعہ کے ہو گئے جس سے کسی تک پہنچا جائے * ۔ اس جہت سے راستے کو بھی سَبَبٌ کہدیا جاتا ہے** کیونکہ وہ ایک منزل کو دوسری منزل کے ساتھ ملاتا ہے ۔ نیز قرابت کا تعلق ۔ رشتہ داری * ۔

قرآن کریم میں ہے وَتَقَطَّعَتْ بِہِمُ الْاَسْبَابُ (۲/۱۶۶) ۔ ''ان کے باہمی تعلقات منقطع ہو جائینگے'' ۔ وہ مفاد اور ذرائع جن سے وہ ایک دوسرے کے ساتھ وابستہ ہیں ختم ہو جائینگے ۔ سورۃ کہف میں ہے ثُمَّ اَتْبَعَ سَبَبًا (۱۸/۸۹) ۔ '' پھر اس نے ایک اور راستہ اختیار کیا'' ۔

سورۃ الحج میں ہے فَلْیَمْدُدْ بِسَبَبٍ اِلَی السَّمَآءِ (۲۲/۱۵)۔ یہاں اسکے معنے ذریعہ ، سبب ، یا سیڑھی کے ہیں* ۔ سورۃ المومن میں اَسْبَابَ السَّمٰوٰتِ (۴۰/۳۷) آیا ہے ۔ صاحب تاج کے نزدیک اسکے معنے آسمان کی سیڑھیاں یا دروازے ہیں ۔ ابو زید نے کہا ہے کہ اسکے معنے منازل کے ہیں *۔ اور صاحب محیط نے اسکے معنے سیڑھیاں ، راستے ، اطراف و جوانب یا دروازے لکھے ہیں ** ۔ لیکن ذرائع کا لفظ بڑا جامع ہے ۔ ہمارے ہاں بھی اسباب و ذرائع کہتے ہیں ۔ اور اس مقام پر یہی معنی زیادہ موزوں بھی نظر آتے ہیں ۔

سورۃ کہف میں ہے وَآتَیْنٰہُ مِنْ کُلِّ شَیْءٍ سَبَبًا (۱۸/۸۴) اس کے معنے سامان و ذرائع ہی کے ہیں ۔ گالی دینے کے معنوں میں یہ مادہ (۶/۱۰۹) میں آیا ہے جہاں کہا گیا ہے کہ کفار کے معبودانِ باطل کو گالی مت دو ، ایسا نہ ہو کہ وہ زیادتی کر کے ، جہالت کی بناء پر خدا کو گالی دیدیں ۔ اس قسم کے مظاعرے، مذہبی مناظروں کے میدانوں میں اکثر ہوتے رہتے ہیں ۔

س ب ت

اَلسُّبَاتُ ۔ نیند ۔ اس کے اصلی معنے راحت و سکون کے ہیں ۔ (ابن فارس نے کہا ہے کہ یہی اس کے بنیادی معنی ہیں) ۔ اور چونکہ راحت و سکون کا مطلب یہ تھا کہ انسان حرکت و عمل کو چھوڑ کر آرام کرے اس لئے اس کے معنے ترک عمل اور قطع کرنے کے ہو گئے * ۔

چنانچہ سَبَتَ ۔ یَسْبِتُ ۔ و یَسْبُتُ سَبْتًا ۔ کے معنے ہیں اس نے راحت و آرام کیا* ۔ راغب نے لکھا ہے کہ سَبْتٌ کے معنے کاروبار چھوڑنا

* تاج ** محیط و راغب

بھی ھیں اور سنیچر کے دن میں ھونا ' سنیچر کا دن گذارنا ' سنیچر کے دن میں داخل ھونا' بھی** ۔ سَبَتَ الشَّیْیَٔ کے معنے ھیں اس چیز کو قطع کر دیا ۔ اَلسَّبْتُ ۔ بال مونڈنے اور سر منڈانے کو بھی کہتے ھیں ۔ اَلْمَسْبُوْتُ ۔ میت کو یا بیہوش آدمی کو کہتے ھیں ۔ نیز اس بیمار کو بھی جو آنکھیں بند کئے پڑا رھے* ۔

یَوْمُ السَّبْتِ ۔ ھفتے کا وہ دن جسے سنیچر کہتے ھیں۔خیال ھے کہ یہ نام اس لئے پڑا کہ اس میں یہودی کاروبار نہیں کرتے* ۔ اس معنے میں یہ لفظ (۲/۶۵) ۔ میں آیا ھے۔ اور راحت وآرام کے معنوں میں سُبَاتٌ* (۷۸/۱۰) میں ، جہاں کہا ھے وَ جَعَلْنَا نَوْمَکُمْ سُبَاتًا ۔ نیند کو موجب استراحت بنایا ۔ سورۃ فرقان میں بھی یہی کہا ھے اور اس کے مقابلہ میں نُشُوْرًا (۲۵/۴۷) کا لفظ آیا ھے ، جس کے معنی چلنا پھرنا ۔ منتشر ھونا ۔ اٹھ کھڑے ھونا ھیں ۔

یہودیوں کے متعلق قرآن کریم میں ھے کہ ان میں سے ایک جماعت نے اپنے سَبْتْ کی پابندیوں کو توڑا (۲/۶۵ و ۴/۱۵۴) ۔ سورۃ اعراف میں ھے کہ یہ اس دن مچھلیاں پکڑ لیا کرتے تھے (۷/۱۶۳) ۔ اس حکم کی خلاف ورزی کی بنا پر ان پر لعنت کی گئی (۴/۴۷) ۔ اور یہ وبال اس لئے آیا کہ وہ سب ایک مسلک پر چلنے کے بجائے باھمی اختلاف کرنے لگ گئے تھے (۱۶/۱۲۴) ۔ اس سے ظاھر ھے کہ جب زندگی ایک نظام کے ماتحت بسر کی جائے تو اس نظام کی طرف سے عائد کردہ چھوٹی سے چھوٹی پابندیوں پر قائم رھنا بھی ضروری ھوتا ھے ۔ ھفتے میں ایک دن کا کاروباری ناغہ بڑی معمولی سی پابندی ھے لیکن اس سے سیرت وکردار کا امتحان ھو جاتا ھے ۔ جو لوگ اتنی سی طمع (Temptation) کا مقابلہ نہ کر سکیں اور چور دروازوں سے اس پابندی کی خلاف ورزی کرنے لگ جائیں وہ بھلا زندگی کی بڑی بڑی آزمائشوں میں کیا پورے اترینگے؟ کیریکٹر نام ھی ضبط خویش (Self Discipline) اور ترغیبات کے مقابلہ کا ھے۔واقعہ سبت کے بیان کرنے سے قرآن کریم کا مقصود یہی ھے ۔ (اس ضمن میں بنی اسرائیل پر جو عذاب آیا تھا اس کی تفصیل ق ۔ ر ۔ د کے عنوان میں دیکھئے) ھیسٹنگز نے اپنے انسائیکلو پیڈیا*** میں، عہد نامہ عتیق اورمشنا اورتالمود کے حوالوں سے لکھا ھے کہ سبت،جمعہ کی شام سے شروع ھو جاتا تھا اور سینچر کا پورادن رھتا۔ اس میں کاروبار کے علاوہ ، قریب ۳۸ اور امور بھی تھے جن کا کرنا منع تھا ۔

*تاج۔ ** راغب ***Encyclopaedia of Religions and Ethics (By Hastings)

س ب ح

سَبْحٌ کے معنے ہیں تیرنا۔ سَبَحَ بِالنَّھْرِ وَ فِی النَّھْرِ سَبْحًا وَ سِبَاحَۃً کے معنے ہیں نہر میں تیرا۔ اَسْبَحَہٗ فِی الْمَاءِ۔ اسے پانی میں تیرا دیا۔ اَلسَّابِحَاتُ۔ کشتیوں کو کہتے ہیں۔ اَلسَّوَابِحُ۔ وہ گھوڑے جو دوڑنے وقت تیرنے والے کی طرح اپنے ہاتھ پاؤں آگے بڑھاتے ہیں۔ اَلسَّبَّاحُ۔ اچھے پیراک کو کہتے ہیں۔ نیز اس سے مشابہت کی بناء پر تیز رفتار گھوڑے اور اونٹ کو بھی کہتے ہیں*۔

تلاش معاش کے لئے تگ و دو کرنے اور دوڑنے یا چلنے میں دور تک نکل جانے کو بھی سَبْحٌ کہتے ہیں*۔ زمین میں چلنے پھرنے اور گھومنے کو بھی اَلتَّسَبُّحُ کہتے ہیں***۔ چنانچہ ابن فارس نے اس کے بنیادی معنی دوڑ کی ایک قسم بھی لکھے ہیں۔ لہذا سَبْحٌ کے معنے ہوئے کسی کام کی تکمیل کے لئے پوری پوری تگ و تاز کرنا۔ امکان بھر جد و جہد کرنا۔ ہر وقت سرگرم عمل رہنا۔ تاج میں ابن شمیل کا خواب مذکور ہے جس میں انہوں نے دیکھا کہ کوئی شخص ان کے لئے سُبْحَانَ اللّٰہِ کی تفسیر بیان کر رہا ہے اور کہہ رہا ہے کہ تم نے گھوڑے کو نہیں دیکھا کہ وہ کسطرح اپنی تیز رفتاری میں تیر رہا ہوتا ہے۔ یعنی سُبْحَانَ اللّٰہِ کے معنے ہیں خدا کی طرف تیز رفتاری سے جانا اور اس کی اطاعت میں مستعد رہنا*۔ راغب نے بھی کہا ہے کہ سَبْحٌ اصل میں ''پانی یا ہوا میں تیزی سے گذرنا'' ہے۔ پھر استعارۃ فلک میں تاروں کی تیز خرامی کے لئے بولا گیا ہے۔ التسبیح خدا کی اطاعت میں تیزی کرنے کو کہتے ہیں۔ ازاں بعد اس کا استعمال وسعت اختیار کر گیا اور اسے قولی یا عملی یا اعتقادی عبادات کے لئے بولنے لگ گئے**۔ حتّٰکہ اب سُبْحَۃٌ اُن دانوں کو کہتے ہیں جو تسبیح میں پرو لئے جاتے ہیں حالانکہ یہ چیز عربوں میں غیر معروف ہے۔ (تسبیح عیسائی راہبوں کے ہاں ہوتی تھی جنہوں نے اسے غالباً بدھ مت والوں سے لیا تھا)۔

قرآن کریم میں اجرام سماوی کے متعلق ہے کُلٌّ فِیْ فَلَکٍ یَّسْبَحُوْنَ (۳۶/۴۰)۔ ''وہ تمام اپنے اپنے دوائر (Orbits) میں تیزی کے ساتھ تیر رہے ہیں''۔ رسول اللہ ؐ کے متعلق ارشاد ہے اِنَّ لَکَ فِی النَّھَارِ سَبْحًا طَوِیْلًا (۷۳/۷)۔ تیرے لئے دن میں بڑا لمبا پروگرام ہوتا ہے۔ تجھے بڑی جد و جہد کرنی ہوتی ہے۔ پرندوں کے متعلق ہے کُلٌّ قَدْ عَلِمَ صَلَاتَہٗ وَ تَسْبِیْحَہٗ (۲۴/۴۱)۔ ان میں سے ہر ایک، فضا کی پہنائیوں میں، اپنے اپنے راستے**** سے بھی واقف

*تاج۔ **راغب۔ ***لطائف اللغۃ۔ ****صلاۃ کے لئے دیکھئے عنوان ص۔ ل۔ و۔

ہے ۔ (حالانکہ وہاں کوئی نشانِ راہ نہیں لگا ہوتا) یا اپنے اپنے مقاصد کے پیچھے جانے سے واقف ہے ، اور اپنی اپنی جد و جہد کے دوائر اور حصولِ معاش کے طور طریق سے بھی ۔ سَبَّحَ لِلّٰہِ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ (۵۷/۱) کے معنے ہیں کائنات کی پستیوں اور بلندیوں میں جو کچھ ہے وہ سب اس پروگرام کی تکمیل میں جو قانونِ خداوندی کی رو سے ان کے لئے متعین کیا گیا ہے پوری شدت اور تیزی سے مصروفِ عمل ہیں ۔ اس مقصد کی تکمیل کے لئے ہر وقت سرگرم عمل رہتے ہیں ۔ خارجی کائنات کی چیزیں اس پروگرام کی تکمیل کے لئے ازخود (Instinctively) سرگرمِ عمل رہتی ہیں (اسی کو قصہ آدم میں فرشتوں کی تسبیح کہا گیا ہے ۲/۳۰ ۔ یا مثلاً رعد کی تسبیح ۔ ۱۳/۱۳) ۔ لیکن انسان کو اس کیلئے اپنے اختیار و ارادہ سے سرگرم عمل رہنا ہے ۔ اس لئے جماعت مومنین سے کہا گیا ہے کہ سَبِّحُوْهُ بُكْرَةً وَّ اَصِيْلًا (۳۳/۴۲) ۔ تم صبح شام (ہمیشہ) اس پروگرام کی تکمیل کے لئے مصروفِ سعی و عمل رہو ۔ یہ پروگرام کیا ہے؟ اس کے متعلق فرمایا فَسَبِّحْ بِاسْمِ رَبِّكَ الْعَظِيْمِ (۵۶/۹۶) اپنے نشو و نما دینے والے کی صفتِ ربوبیت عظمیٰ کو، جس پر ساری کائنات کی عمارت استوار ہے ، انسانی معاشرہ میں عملاً متشکل کرنے کے لئے سرگرم عمل رہنا ۔ اس کے راستے میں جو قوتیں مزاحم ہوں ان کے خلاف جد و جہد کو بھی ”ذکر و تسبیح“ کہا گیا ہے ۔ چنانچہ جب حضرت موسیٰ[۴] فرعون کی طرف جانے لگے ہیں تو انہوں نے اپنی اس مہم کے لئے بھی کہا تھا کَیْ نُسَبِّحَكَ كَثِيْرًا وَّ نَذْكُرَكَ كَثِيْرًا (۲۰/۳۳) ۔

قرآن کریم جو نظام زندگی جماعت مومنین کے لئے تجویز کرتا ہے اس میں صلوٰۃ کے اجتماعات کو خاص اہمیت حاصل ہے ۔ یہ اس جماعت کے جذبہ اطاعت خداوندی کے عملی مظاہر ہوتے ہیں ۔ اور اس کا اظہار رکوع و سجود کی شکل میں سامنے آتا ہے ۔ رکوع و سجود میں ایک عبد مومن اپنے خدا سے اس امر کا اقرار کرتا ہے کہ وہ اپنی زندگی اُس کے قوانین کی اطاعت اور اُس کے بتائے ہوئے فرائض کی سر انجام دہی کے لئے جد و جہد میں صرف کریگا ۔ یہ اقرار جن الفاظ میں کیا جاتا ہے عام اصطلاح میں انہیں بھی خدا کی تسبیح کہا جاتا ہے ۔ لیکن یہ ظاہر ہے کہ اگر کوئی شخص زبان سے اس قسم کے اقرار کرتا رہے اور عملاً ایسا کرکے نہ دکھائے ، تو یہ زبانی قول و اقرار ایک بے نتیجہ رسم سے زیادہ کچھ حیثیت نہیں رکھتے ۔ صلوٰۃ میں حرکات و سکنات اور الفاظ ، انسان کے جذبہ عمل کے بیتابانہ اظہار کی شکلیں ہیں ۔ اگر عمل نہ رہے اور انسان ان شکلوں ہی کو مقصود و منتہیٰ سمجھ لے تو اس کا نتیجہ

ظاہر ہے ۔ بہر حال ، یہ تو ظاہر ہے کہ تسبیح کے دانوں پر خدا کا نام گننا ، قرآنی تعلیم کا مقصود نہیں ۔ قرآن کریم کی رو سے تسبیح سے مفہوم ، قوانین خداوندی کی اطاعت میں پوری پوری جد و جہد اور سرگرمیٔ عمل ہے۔

لسان العرب میں ہے کہ تَسْبِیْح کے معنے تنزیہ کے ہیں ۔ نیز یہ لفظ ''سبحان اللہ'' کہنے ، یا صلٰوۃ اور ذکر اللہ ، حمد و مجد و ثنا ، کے لئے استعمال ہوتا ہے ۔ چونکہ اس میں شدت کا پہلو غالب ہوتا ہے اس لئے تنزیہ کے معنے ہونگے ، خدا کو بڑی شدت اور قوت کے ساتھ تمام نقائص سے دور سمجھنا ۔

اس مادہ میں تیزی ۔ مضبوطی ۔ شدت کا پہلو ہوتا ہے ۔ اسی لئے کِسَاءٌ مُسَبَّحٌ کے معنی ہیں بہت مضبوط اور سخت بُنا ہوا کمبل ۔ اس اعتبار سے فَسَبِّحْ بِاسْمِ رَبِّكَ الْعَظِيْمِ کے معنی ہونگے ، صفاتِ خداوندی کو نہایت تیزی ، شدت اور مضبوطی کے ساتھ اپنانا اور عام کرنا ۔ مطلب وہی ہے جو پہلے بیان کیا جاچکا ہے ۔

سورۃ صٰفّٰت میں حضرت یونس کے متعلق ہے کہ انہیں بڑی مچھلی نے لقمہ بنا لیا۔ فَلَوْلَا اَنَّهٗ كَانَ مِنَ الْمُسَبِّحِيْنَ لَلَبِثَ فِيْ بَطْنِهٖۤ اِلٰى يَوْمِ يُبْعَثُوْنَ ($\frac{۳۷}{۱۴۳}$) اگر یہ لفظ (مُسَبِّحِيْنَ) سَبْحٌ سے ہوتا تو اس کے معنی تیراک ہوتے ۔ لیکن سَبَّحَ کے اعتبار سے اس کے معنے ہونگے پوری قوت اور شدت سے جد و جہد کرنے والا ۔ اس میں مچھلی کے منہ سے نکلنے کے لئے پوری جد و جہد کرنے کے بعد ساحل تک پہنچ جانے میں تیرنے کا مفہوم خود بخود آ جاتا ہے ۔

اسی سورۃ میں ذرا آگے چل کر ہے وَاِنَّا لَنَحْنُ الْمُسَبِّحُوْنَ ($\frac{۳۷}{۱۶۶}$)۔ ہم یقیناً (اسی راہ میں) انتہائی قوت کے ساتھ جد و جہد کرنے والے ہیں۔

ان مقامات سے بھی تَسْبِيْح کے معنی سمجھ میں آسکتے ہیں ۔ شدت ، مضبوطی ، تیزی کے ساتھ خدا کے پروگرام کی تکمیل میں مصروفِ جد وجہد رہنا ۔

سُبْحَانَ مِنْ كَذَا ۔ تعجب کے موقعہ پر بولتے ہیں* ۔ دوری کے اعتبار سے سُبْحَانَ اللّٰهِ عَمَّا يَصِفُوْنَ ($\frac{۳۷}{۱۵۹}$) کے معنے ہیں ، خدا ان تمام غلط تصورات سے بہت دور ہے جو یہ لوگ اس کے متعلق اپنے ذہن میں قائم کرتے ہیں ۔ نیز سُبْحَانٌ (مصدر) کے معنے ہیں ، سرگرم عمل رہنا* ۔

*تاج ۔

فَسُبْحٰنَ اللّٰهِ حِيْنَ تُمْسُوْنَ وَحِيْنَ تُصْبِحُوْنَ (۳۰/۱۷) - شام و پگاہ تمہارے لئے ان فرائض کی سر انجام دہی میں مصروف رہنا ہے جو تمہارے لئے اللہ نے مقرر کئے ہیں -

س ب ط

اس مادہ کے اصلی معنی کسی چیز میں زیادتی اور کثرت کے ہیں* - ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی کسی چیز کے دراز ہونے کے ہیں - اسی سے اَلسَّبَطُ - ایک درخت یا جھاڑی کو کہتے ہیں جس کی جڑ تو ایک ہوتی ہے لیکن شاخیں بہت پھیلی ہوئی ہوتی ہیں - یہیں سے اس کے معنے نسل اور خاندان کے ہو گئے - یعنی باپ بمنزلہ جڑ کے ہے اور اولاد بمنزلہ شاخوں کے - اَلسِّبْطُ - پوتے اور نواسے دونوں کو کہتے ہیں - یہی لفظ یہود کے قبیلہ کے لئے بولا جاتا ہے - اَسْبَاطٌ کا لفظ بنو اسحٰق (حضرت اسحٰق کی اولاد) کے لئے خاص تھا اور قَبَائِلُ کا لفظ بنو اسمٰعیل کے لئے - عربوں نے یہ تخصیص اس لئے رکھی تھی کہ محض ایک لفظ سے اولادِ حضرت ابراھیم کی دونوں شاخوں میں امتیاز ہوجائے** - قرآن کریم میں بھی قوم حضرت موسیٰ کے لئے اَسْبَاطٌ - کا لفظ آیا ہے (۷/۱۶۰) - نیز عرب السَّبِطُ - عجمی آدمی کو کہتے تھے - جس طرح جَعْدٌ عربوں کو کہتے تھے** -

قرآن کریم میں اولادِ حضرت یعقوب کے لئے اَسْبَاطٌ کا لفظ آیا ہے (۲/۱۳۶) -

س ب ع

سَبْعٌ - سات کے عدد کو کہتے ہیں - بعض کا خیال ہے کہ اسکی اصل سَبُعَةٌ ہے جسکے معنے شیرنی کے ہیں - یہ اسلئے کہ وہ شیر سے بھی زیادہ تیز حملہ کرتی ہے اور عربوں کے ہاں سات کا عدد تامہ (Perfect Number) ہوتا ہے -

اَلسَّبُعُ - یا اَلسَّبْعُ یا اَلسَّبِعُ - درندہ کو کہتے ہیں (۵/۳) - بعض کا خیال ہے کہ یہ اسلئے کہ اتفاق سے عرب میں سات جانور درندے ہوتے تھے - لیکن راغب کا خیال ہے کہ انہیں سَبُعٌ اسلئے کہتے ہیں کہ ان کی قوت مکمل ہوتی ہے اور سات کا عدد بھی مکمل ہے** - لین نے (بیضاوی کے حوالہ سے) لکھا ہے کہ عربوں میں سَبْعَةٌ سات ہی کو نہیں کہتے بلکہ وہ اسے ان معنوں میں بھی استعمال کرتے ہیں جن معنوں میں ہم کہتے ہیں "کئی

*محیط - **تاج - ثعالبی نے فقہ اللغۃ میں بھی اس کی تصریح کی ہے -

ایک " (Several) یا " متعدد " (Many) - اسی طرح سَبْعُوْنَ (ستر) سَبْعُمِائَةٍ - (سات سو) بھی اسی مفہوم میں استعمال ہوتا ہے **- جیسے ہماری زبان میں بیسیوں - پچاسوں - سینکڑوں - کے الفاظ بولے جاتے ہیں - اس سے مراد کوئی معین عدد نہیں ہوتا - یا جیسے ہم کہتے ہیں کہ تمہیں سو بار سمجھا چکے ہیں - اس سے مراد ٹھیک سو کی تعداد نہیں ہوتی - چنانچہ جہاں قرآن کریم میں ہے اِنْ تَسْتَغْفِرْ لَهُمْ سَبْعِيْنَ مَرَّةً (۹/۸۰) تو اسکے یہ معنے نہیں کہ اگر تو ان کے لئے ستر بار مغفرت مانگے تو ہم مغفرت نہیں دینگے اور اگر ستر سے زیادہ مرتبہ مغفرت مانگے تو مغفرت دیدی جائیگی - اسکے یہ معنے ہیں کہ تو ان کے لئے چاہے کتنی مرتبہ مغفرت مانگے انہیں مغفرت نہیں مل سکے گی - ان معانی کے پیش نظر سَبْعَ سَمٰوٰتٍ (۲/۲۹) کا مفہوم واضح ہو جاتا ہے - یعنے متعدد اجرام فلکی - ہمارے ہاں بھی کہتے ہیں " سات سمندر پار " - (۲/۲۶۱) میں متعدد کے معنی واضح ہیں جہاں کہا گیا ہے کہ مَثَلُ الَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمْ فِیْ سَبِيْلِ اللّٰهِ كَمَثَلِ حَبَّةٍ اَنْۢبَتَتْ سَبْعَ سَنَابِلَ فِیْ كُلِّ سُنْۢبُلَةٍ مِّائَةُ حَبَّةٍ ...... "ان لوگوں کی مثال جو اللہ کی راہ میں خرچ کرنے کے لئے اپنی دولت کو کھلا رکھتے ہیں ایسی ہے جیسے ایک دانہ سات بالیں اگائے اور ایک بال میں سو سو دانے ہوں " - ظاہر ہے کہ یہاں سَبْعَ سَنَابِلَ سے مراد متعدد (کئی) بالیں ہے -

قرآن کریم میں ہے وَلَقَدْ آتَيْنٰكَ سَبْعًا مِّنَ الْمَثَانِیْ وَالْقُرْاٰنَ الْعَظِيْمَ (۱۵/۸۷) - اسکے لئے دیکھئے - عنوان (ث - ن - ی -) میں لفظ مثانی -

س ب غ

اَلسَّبْغَةُ - وسعت - فراخی - کشادگی - سَبَغَ الشَّيْءُ سُبُوْغًا - کسی چیز (کپڑے - زرہ وغیرہ) کا لمبا اور لٹکتا ہوا ہونا - اَلسَّابِغَةُ - وہ زرہ جو ٹخنوں تک آجائے یا لمبائی کی وجہ سے زمین پر گھسٹنے لگے - (سَابِغَاتٌ اس کی جمع ہے - ۳۴/۱۱) - اَسْبَغَ شَعْرَهُ - اس نے اپنے بالوں کو لمبا کیا اور خوب بڑھایا - شَيْءٌ سَابِغٌ - بھرپور چیز *** - ابن فارس نے کہا ہے کہ یہ اس کے بنیادی معنی ہیں - سَبَغَتِ النِّعْمَةُ - نعمت کا وسیع اور بھرپور ہونا ***- قرآن کریم میں ہے وَاَسْبَغَ عَلَيْكُمْ نِعَمَهٗ (۳۱/۲۰) - خدا نے تمہیں اپنی نعمتوں کو بھرپور، کثرت اور فراوانی سے دیا -

* تاج - ** لین - *** تاج - راغب - محیط -

س ب ق

سَبْقٌ کے بنیادی معنی ہیں دوڑنے میں آگے بڑھ جانا۔ اسکے بعد ہر شے میں آگے بڑھ جانے کیلئے اس کا استعمال ہونے لگا*۔ سَابِقَۃٌ۔ وہ اس سے آگے بڑھ گیا، بازی لے گیا۔ سَبَقَ رَسُوْلُ اللّٰہِ وَصَلَّی اَبُوْبَکْرٍ۔ سب سے پہلے رسول اللہؐ (دنیا سے) تشریف لے گئے اور انکے پیچھے پیچھے (حضرت) ابوبکرؓ چلے گئے۔ اَلسَّبَقُ۔ اس شرط یا انعام کو کہتے ہیں جو گھوڑ دوڑ وغیرہ میں اول آنے والے کیلئے مقرر کر دیا جاتا ہے**۔

اِسْتَبَقَا الْبَابَ (۱۲/۲۵)) وہ دونوں دروازہ کی طرف لپکے اور ہر ایک نے کوشش کی کہ وہ آگے بڑھ جائے**۔

محیط میں ہے کہ جب اسکے بعد عَلٰی آتا ہے تو آگے بڑھنے اور پہلے آنے والی چیز نقصان دہ ہوتی ہے اور جب اسکا صلہ لام آتا ہے تو اس میں پہلے آنے والی چیز فائدہ بخش ہوتی ہے***۔ سَبَقَتْ لَهُمْ مِنَّا الْحُسْنٰی (۲۱/۱۰۱) ۔ ہماری طرف سے خوشگواریوں نے آگے بڑھکر ان کا استقبال کیا۔

سورۃ بقرہ میں ہے فَاسْتَبِقُوا الْخَیْرَاتِ (۲/۱۴۸) خوشگواریاں پیدا کرنے والے کاموں میں ایک دوسرے سے آگے بڑھ جانے کی کوشش کرو۔ نفسیاتی طور پر کہا جاتا ہے کہ انسان کے لئے عمل اور جد و جہد کا جذبہ محرکہ یہ ہے کہ وہ دوسروں سے آگے بڑھنا چاہتا ہے۔ مقابلہ (Competition) اور مسابقت (دوسروں سے آگے بڑھنے کا جذبہ) ہی وہ مہمیز ہے جس سے انسان دیوانہ وار مصروفِ سعی و عمل رہتا ہے۔ قرآن کریم بھی انسان کے اس جذبہ کی رعایت کرتا ہے اور اسکی پرورش چاہتا ہے۔ لیکن وہ اسکا رخ بدل دیتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ بجائے اس کے کہ تم ذاتی مفاد میں ایک دوسرے سے آگے بڑھنے کی کوشش کرو، نوع انسانی کے لئے خوشگواریاں پیدا کرنے والے امور میں سبقت کرو۔ اس سے تمہارے جذبۂ مسابقت کی بھی تسکین ہو جائیگی اور معاشرہ میں وہ فساد بھی برپا نہیں ہوگا جو اپنے اپنے مفاد کی خاطر دوسروں سے آگے بڑھنے کی صورت میں ہوتا ہے۔

سورۃ حجر میں ایک جگہ یہ لفظ (تَسْبِقُ) یَسْتَاْخِرُ (پیچھے رہ جانے) کے مقابلہ میں آیا ہے (۱۵/۵) اور دوسری جگہ مُسْتَاْخِرِیْنَ کے مقابلہ میں مُسْتَقْدِمِیْنَ آیا ہے (۱۵/۲۴)۔ لہذا سَبْقٌ۔ اِسْتِئْخَارٌ (پیچھے رہ

* راغب۔ ** تاج۔ *** محیط۔

جائے) کی ضد اور اِسْتِقْدَامٌ (آگے بڑھنے) کے مرادف ہے۔ سورۃ واقعہ میں مَسْبُوْقِیْنَ (۵۶/۶۰) بمعنے مَغْلُوْبٌ آیا ہے۔ یعنی جس سے کوئی آگے بڑھ جائے۔

سورۃ انبیاء میں ہے اِنَّ الَّذِیْنَ سَبَقَتْ لَهُمْ مِنَّا الْحُسْنٰی (۲۱/۱۰۱)۔ اسکے معنے کئے جاتے ہیں جن لوگوں کے لئے ہماری طرف سے پہلے ہی بھلائی آچکی ہے۔ اور اس کا مطلب یہ لیا جاتا ہے کہ اللہ تعالٰے نے پہلے ہی مقرر کر دیا ہے کہ فلاں آدمی اچھے کام کرے گا اور فلاں برے کام۔ یہ تصور قرآن کریم کی تعلیم کے خلاف ہے۔ اللہ تعالے نے یہ قانون پہلے سے بنا رکھا ہے کہ فلاں کام کا نتیجہ اچھا ہوگا اور فلاں کا نتیجہ برا۔ اور اس کے بعد انسان کو اختیار دیا ہے کہ وہ جس قسم کا کام جی چاہے کرے۔ وہ جس قسم کا کام کریگا اس کے مطابق نتیجہ اس کے سامنے آجائیگا۔ سورۃ انبیاء کی مندرجہ بالا آیت کا مطلب یہ ہے کہ جو لوگ صحیح روش پر چلیں ان کیلئے خوشگواریاں ہیں۔ اور یہ چیز (کہ اُس روش کا نتیجہ یہ ہوگا) پہلے سے متعین ہو چکی ہے۔ ہم نے محض ان کی خاطر یہ اصول نہیں اختیار کیا۔

سورۃ حدید میں ہے سَابِقُوْا اِلٰی مَغْفِرَةٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ .... (۵۷/۲۱) اپنے رب کی مغفرت کیطرف ایک دوسرے سے آگے بڑھنے کی کوشش کرو۔

س ب ل

اَسْبَلَ ۔ لٹکانا ۔ چھوڑ دینا ۔ اَسْبَلَ الْاِزَارَ ۔ ازار کو لٹکا دیا ۔ اَسْبَلَ دَمْعَهٗ ۔ اپنے آنسوؤں کو جاری کر دیا ، چھوڑ دیا تاکہ وہ آنکھوں سے بہ نکلیں ۔ اَسْبَلَتِ السَّمَآءُ ۔ آسمان سے موسلا دھار بارش برسنے لگی ۔ اَلسَّبَلُ ۔ بارش ۔ لیکن وہ بارش جو آسمان سے لٹک کر زمین کی طرف آرہی ہو اور ہنوز زمین پر نہ گری ہو ۔ اَلسَّبَلَةُ ۔ وسیع پیمانے پر ہونے والی بارش ۔ اَسْبَلَ الزَّرْعُ ۔ کھیتی میں خوشے لٹکنے لگ گئے * ۔ لہذا اس لفظ کے بنیادی معنی لٹکانے ۔ چھوڑنے اور لمبا کرنے کے ہیں (ابن فارس) ۔ اس سے اَلسَّبِیْلُ و اَلسَّبِیْلَةُ کے معنے ہیں راستہ ۔ نرم راستہ جس میں سختی نہ ہو ، راستہ کا واضح حصہ ۔ سَبِیْلٌ ۔ مذکر اور مونث دونوں طرح استعمال ہوتا ہے لیکن مونث زیادہ مستعمل ہے ۔ اس کی جمع سُبُلٌ آتی ہے * ۔ ابن

* تاج ۔

فارس نے لکھا ہے کہ لمبائی اور دور تک چلے جانے کی وجہ سے راستہ کو سَبِیْل* کہتے ہیں ۔ اَلسَّابِلَۃُ مِنَ الطُّرُقِ ۔ وہ راستہ جس پر لوگ عام طور پر چلتے رہیں یا وہ لوگ جو اپنی ضروریات کے لئے راستے پر آتے جاتے رہیں ۔ راہرو ۔ مسافر* ۔

قرآن کریم میں فِی سَبِیْلِ اللّٰہِ (۲/۱۹۰) کی اصطلاح متعدد بار آئی ہے ۔ اس کے مقابلہ میں فِیْ سَبِیْلِ الطَّاغُوْتِ (۴/۷۶) آیا ہے ۔ ''مومنین کی جماعت فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ جنگ کرتی ہے اور کفار فِیْ سَبِیْلِ الطَّاغُوْتِ جنگ کرتے ہیں'' (۴/۷۶) ۔ اس سے فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ کا مفہوم واضح ہو جاتا ہے۔ طاغوت وہ مستبد قوتیں ہیں جو دوسروں کو اپنے احکام کے تابع چلائیں اور دنیا میں باطل کا نظام قائم کریں ۔ لہذا سَبِیْلِ اللّٰہِ کے معنے ہوئے قوانین خداوندی کی اطاعت کے لئے ، نظام خداوندی کے قیام کی خاطر ، اس راستہ پر چلنے اور دوسروں کو چلانے کے لئے جو خدا نے مقرر کیا ہے ، ذاتی مفاد پرستیوں کے بجائے نوع انسانی کی فلاح و بہبود (رب العالمینی) کے لئے ، انسانی بھلائی کے کاموں کے لئے ، مخالفت کی قوتوں کا مقابلہ کرنا۔ مومنین اسی مقصد کے لئے جیتے اور اسی کے لئے اپنی جان دیتے ہیں ۔ اسی سے انفاق فی سبیل اللہ کا مفہوم واضح ہو جاتا ہے ۔ یعنی حق کے اثبات اور نوع انسانی کی بہبود کی خاطر اپنا مال کھلا رکھنا ، کہ جتنا ضروری ہو اس میں سے لے لیا جائے ۔

اِبْنُ السَّبِیْلِ ۔ مسافر جو بہت سفر کرے ۔ بعض کے نزدیک اس سے ایسا مسافر مراد ہوتا ہے جس کا زادِ راہ ختم ہو چکا ہو* ۔ قرآن کریم نے اسلامی معاشرہ کے فرائض میں یہ بھی شامل کیا ہے کہ وہ ''اِبْنُ السَّبِیْلِ'' کی مدد کرے ۔ حتی کہ صدقات کا ایک مصرف یہ بھی بتایا ہے ۔ (۹/۶۰) ۔ اس میں ہر اس شخص کے لئے جو اسلامی مملکت میں سفر کرے سفر کی سہولتیں بھی آ جاتی ہیں اور جو لوگ سفر میں کسی وجہ سے نادار ہوجائیں انہیں ان کی منزل مقصود تک پہنچانا بھی ۔ محیط نے اس کے معنے مہمان کے بھی دئے ہیں ۔ دور حاضر کی سیاسی اصطلاح میں ''ابن السبیل'' وہ لوگ ہونگے جو اسلامی مملکت میں عارضی طور پر آئیں جائیں اور رہیں سہیں (Non-Citizens) ۔

سورۃ آل عمران میں اہل کتاب کے متعلق ہے کہ وہ کہتے تھے کہ لَیْسَ عَلَیْنَا فِی الْاُمِّیّٖنَ سَبِیْلٌ* (۳/۷۴) ۔ یعنی ہم ان غیر اہلِ کتاب

---

* تاج ۔

غیروں کے خلاف جو جی میں آئے کرلیں ہم پر کوئی گرفت نہیں ہوگی۔ یہ وہی ذہنیت ہے جو قبائلی عصبیت کی پیدا کردہ ہوتی ہے۔ اس کے مطابق جو جرم اپنے قبیلہ کے اندر کیا جائے وہ جرم ہوتا ہے لیکن جو جرم قبیلہ سے باہر کیا جائے وہ جرم نہیں کہلاتا۔ قبائلی زندگی تو ایک طرف، خود اہل روما کے ہاں قانون موجود تھا کہ اپنی قوم کے فرد کی چوری جرم ہے اور غیر قوم والوں کے ہاں چوری، جرم نہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ گروہ سازی کہیں بھی ہو (خواہ وہ مذہبی فرقہ بندی ہو یا سیاسی قومیت کی گروہ بندی) اس سے یہی ذہنیت پیدا ہوتی ہے کہ ہمدردیاں اور نفع رسانیاں صرف اپنے فرقہ اور اپنی پارٹی کے افراد تک محدود رہنی چاہئیں۔ اس سے باہر جتنے افراد انسانیہ ہیں ان سے نفرت کی جائے۔ آج بھی یہی ہو رہا ہے اور آج سے چار ہزار سال پہلے بھی یہی ہوتا تھا۔ عصر حاضر کی نیشنلزم اسی جذبہ کی پیداوار ہے۔ اور اسی نے دنیا کو جہنم بنا رکھا ہے۔ قرآن کریم نے اس ذہنیت کے خلاف آواز بلند کی اور کہا کہ جرم بہر نوع جرم ہے خواہ اپنوں کے خلاف کیا جائے یا دوسروں کے خلاف۔ اس میں انسان اور انسان، اور قوم اور قوم میں کوئی فرق نہیں۔ اسی لئے اس کے نزدیک اچھا کام وہی ہے جو فی سبیل اللہ کیا جائے۔ یعنی اجر و معاوضہ کے خیال سے بلند ہو کر، نوع انسانی کی بہبود کی خاطر۔

قرآن کریم میں جنتی زندگی کے سلسلہ میں ہے عَيْنًا فِيهَا تُسَمّٰى سَلْسَبِيلًا (۷۶/۱۸)۔ "اس میں ایک چشمہ ہے جسے سَلْسَبِيل* کہتے ہیں"۔ محیط نے اس کی اصل سَل° سَبِيلًا بتائی ہے جس کے معنی ہونگے راستہ دریافت کرنا**۔ (پوچھتے ہوئے آگے چلتے جاؤ)۔ اسی کو دوسری جگہ فِيهَا عَيْنٌ جَارِيَةٌ (۸۸/۱۲) سے تعبیر کیا گیا ہے۔ جاری چشمہ۔ ہر وقت بہتا رہنے والا چشمہ۔ یعنی خود زندگی کی جوئے رواں جو مسلسل آگے بڑھتی جاتی ہے۔ حیاتِ جاوداں جو ایمان و اعمال صالحہ کا فطری نتیجہ ہے۔ جو حرکتِ مسلسل سے عبارت ہے اور جس میں کہیں انقطاع اور حد بندی نہیں۔ کوئی روک اور رکاوٹ نہیں۔ اپنے زورِ دروں سے انسانی ذات کا مختلف مراحل طے کرتے ہوئے آگے بڑھتے جانا۔ "سَبِيْلُ اللّٰهِ" بھی یہی راہ ہے۔ وہ راستہ جس میں انسان "مَا يَنْفَعُ النَّاسَ" (۱۳/۱۷) پر عمل پیرا ہوتا اور خدائی صفات کو اپنے اندر منعکس کرتا ہوا آگے بڑھتا چلا جائے۔ یہی وہ راہ تھی جس کی طرف رسول اللہ علی وجہ البصیرت دعوت دیتے تھے (۱۲/۱۰۸)۔ یہ قرآن

*تاج۔ **محیط۔

کریم کی بتائی ہوئی صراطِ مستقیم ہے۔ اس سے انسانی صلاحیتیں بھرپور طور پر نشو و نما حاصل کر سکتی ہیں اس لئے کہ مَسْبَلٌ اَلسَّبَلُ مِنَ اِلَی اَسْبَالِهَا : پیانے کو لبالب بھر دینے کو کہتے ہیں*۔

سورۃ نحل میں شہد کی مکھی سے کہا گیا ہے فَاسْلُکِیْ سُبُلَ رَبِّکِ ذُلُلاً ($\frac{16}{69}$) ۔ اپنے نشو و نما دینے والے کے راستوں پر فرماں پذیری سے چلی جا ۔ اس سے واضح ہے کہ قوانینِ فطرت بھی '' اللہ کے راستے '' ہیں جن پر اشیائے کائنات چلی جا رہی ہیں ۔ اور انسانوں کی راہنمائی کے لئے حضرات انبیاء کرام کی وساطت سے ملی ہوئی وحی صحیح راستے ہیں ($\frac{12}{14}$) ۔

سورۃ عنکبوت میں ہے وَ الَّذِیْنَ جَاهَدُوْا فِیْنَا لَنَهْدِیَنَّهُمْ سُبُلَنَا ۔ وَ اِنَّ اللّٰهَ لَمَعَ الْمُحْسِنِیْنَ ($\frac{29}{69}$)۔ اس کا سادہ ترجمہ یہ ہے کہ ''جو لوگ ہمارے لئے جد و جہد کرتے ہیں انہیں ہم اپنے راستے دکھا دیتے ہیں'' ۔ یوں تو خدا کی طرف جانے والا ایک ہی راستہ ہے جسے اس نے ''الصراط المستقیم'' کہکر پکارا ہے ($\frac{1}{5}$) لیکن انسان کے سامنے ، نت نئے دن، زندگی کے نئے نئے مسائل آتے رہتے ہیں جن کا حل اسے تلاش کرنا ہوتا ہے ۔ قرآن کریم نے انسانی زندگی کے لئے اصول دئے ہیں۔ ان اصولوں کی روشنی میں ، زندگی کے ہر پیش آنے والے معاملہ کا حل دریافت کرنا ، جماعتِ مومنین کا فریضہ ہے ۔ ظاہر ہے کہ اس کے لئے خارجی کائنات کے احوال و کوائف ، اقوام عالم کی تمدنی زندگی ، اپنے زمانے کے مقتضیات اور قرآن کریم کے غیر متبدل اصولوں پر گہرے غور و خوض اور فکر و تدبر کی ضرورت ہوگی ۔ اس طریق کار سے ، معاملات پیش نظر کے متعلق قرآنی راہ نمائی کے لئے جد و جہد کرنا ، (اصطلاح میں) اجتہاد کہلاتا ہے ۔ خدا کا وعدہ یہ ہے کہ جو لوگ اس طرح اجتہاد کرینگے، ہم ان کے سامنے زندگی کی صحیح راہیں کشادہ کرتے چلے جائینگے ۔ انہی راہوں کو قرآن کریم نے دوسری جگہ ''سبل السلام'' یعنی امن و سلامتی کی راہیں قرار دیا ہے اور ان کا مقصد یہ بتایا ہے کہ یُخْرِجُهُمْ مِنَ الظُّلُمٰتِ اِلَی النُّوْرِ بِاِذْنِهٖ ۔ اسطرح کاروانِ انسانیت ، تاریکیوں سے روشنی کی طرف آ جاتا ہے ۔ اور آخر میں ہے وَ یَهْدِیْهِمْ اِلٰی صِرَاطٍ مُّسْتَقِیْمٍ ($\frac{5}{16}$) ۔ اور یوں انہیں ''صراط مستقیم'' کی طرف راہنمائی مل جاتی ہے ۔ یعنی یہ تمام راستے اسی صراط مستقیم میں جا کر مل جاتے ہیں ۔ یہ تمام جزئیات و تفاصیل جنہیں جماعت مومنین، اپنے زمانے کے تقاضوں کے مطابق مرتب کرتی ہے ، قرآنی اصل کی شاخیں ہوتی ہیں اس لئے یہ تمام پگڈنڈیاں اسی شاہراہِ مقصود میں جا کر مل جاتی ہیں ۔

* تاج ۔

س ت ت

اَلسِّتُّ - اَلسِّتَّةُ - چھ - اصل میں سِدْسٌ تھا * - قرآن کریم میں ہے خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ فِیْ سِتَّةِ اَیَّامٍ (۷/۵۴) - " زمین اور آسمانی کُرّوں کو چھ ادوار میں پیدا کیا "۔ اس میں ان ارتقائی ادوار کی طرف اشارہ ہے جن سے گزر کر ہماری زمین اور دیگر اجرام اپنی موجودہ ہیئت تک پہنچے ہیں - (یَوْمٌ کے صحیح مفہوم کیلئے دیکھئے عنوان ی - و - م) - سِتُّوْنَ اور سِتِّیْنَ - ساٹھ - (۵۸/۴) -

س ت ر

سِتْرٌ - اوٹ - آڑ - پردہ جس سے کوئی چیز چھپائی جائے ** - سورۂ کہف میں ہے لَمْ نَجْعَلْ لَّهُمْ مِّنْ دُوْنِهَا سِتْرًا (۱۸/۹۰) - وہ قوم (کھلے میدان میں رہتی تھی اسطرح کہ) ان کے اور سورج کے درمیان کوئی اوٹ یا آڑ نہیں تھی - اَلسِّتَارُ - پردہ - سَتَرَ الشَّیْءَ - اسنے اس چیز کو چھپا دیا - اِسْتَتَرَ - چھپ جانا ** - قرآن کریم میں ہے وَمَا كُنْتُمْ تَسْتَتِرُوْنَ (۴۱/۲۲) - تم نہیں چھپتے تھے - سورۂ بنی اسرائیل میں ہے کہ جب تو قرآن کریم پڑھتا ہے تو تجھ میں اوران لوگوں میں جو حیات مستقبل پر ایمان نہیں رکھتے حِجَابًا مَّسْتُوْرًا (۱۷/۴۵) حائل ہوجاتا ہے - یعنے ایک ایسا پردہ حائل ہوجاتا ہے جو نگاہوں سے پوشیدہ ہوتا ہے - ان کے قلب و دماغ پر ایسا پردہ چھا جاتا ہے جو آنکھوں سے تو دیکھا نہیں جا سکتا لیکن اُسے سمجھا جا سکتا ہے کہ وہ کیا ہے - ان کی نفسیاتی کیفیت کو حِجَابٌ مَّسْتُوْرٌ سے تعبیر کیا گیا ہے - یعنی غیر مرئی پردہ - نیز مَسْتُوْرٌ بمعنی سَاتِرٌ بھی ہے (چھپانے والا) جیسے مَسْحُوْرٌ بمعنی سَاحِرٌ - خدا کا ایک نام اَلسَّتَّارُ - بھی مشہور ہے - لیکن یہ لفظ قرآن کریم میں نہیں آیا -

س ج د

اَلسُّجُوْدُ کے معنی ہیں ، سر کو جھکا دینا - ابن فارس نے اس کے بنیادی معنی ، پست ہونا اور جھک جانا لکھے ہیں - نَخْلَةٌ سَاجِدَةٌ - جھکا ہوا کھجور کا درخت ، بالخصوص وہ جو پھلوں کے بوجھ سے جھک جائے * - سَجَدَ الْبَعِیْرُ - اونٹ نے اپنا سر جھکا دیا تاکہ سوار اس پر بیٹھ جائے ** -

---

*تاج - ** تاج و راغب و محیط -

لہذا اس مادہ کے معنی طبعی طور پر (Physically) انسان کے سر (یا کسی اور چیز) کے جھک جانے کے ہیں۔ لیکن انسانی جسم کی حرکات و سکنات کے پیچھے ایک فلسفہ کار فرما ہے جسے دور حاضر کی علمی اصطلاح میں متوازیت یا (Parallelism) کہتے ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ انسان کے نفس (Mind) کے ارادے اور اس کے جسم (Body) کی حرکت میں گہرا تعلق ہوتا ہے اور یہ دونوں متوازی چلتے ہیں۔ مثلاً جب آپ لیٹے لیٹے کسی کام کا ارادہ کرتے ہیں تو اس خیال کے ساتھ ہی اٹھ بیٹھتے ہیں۔ جب آپ آرام کرنے کا ارادہ کرتے ہیں تو بیٹھ یا لیٹ جاتے ہیں۔ یا جب آپ کسی بات پر ہاں کہتے ہیں تو ساتھ ہی سر ہلا دیتے ہیں (بلکہ یوں کہئیے کہ آپ کا سر خود بخود غیر شعوری طور پر ہل جاتا ہے) جب آپ کسی کا احترام کرتے ہیں تو آپ کا ہاتھ اٹھ جاتا ہے، اور اس سے آگے بڑھتے ہیں تو آپ کا سر جھک جاتا ہے۔ اس حقیقت کا اثر زبان پر بھی پڑتا ہے اور ان الفاظ سے جن کا بدیہی مفہوم جسم کی طبعی حرکت ہوتا ہے، اس جذبہ کا اظہار مقصود ہوتا ہے جو اس حرکت کا سبب ہوتا ہے۔ مثلاً جب ہم کہتے ہیں کہ اس نے میرے حکم کے سامنے ''سر جھکا دیا،، تو اس سے مراد یہ ہوتی ہے کہ اس نے اس حکم کو تسلیم کر لیا اور اس کی تعمیل کر دی۔ اور جب ہم کہتے ہیں کہ اس نے حکومت کے قانون سے ''سرکشی،، اختیار کی تو اس سے مراد یہ ہوتی ہے کہ اس نے اس قانون کے ماننے سے انکار کر دیا اور حکومت کے خلاف بغاوت اختیار کر لی۔ قرآن کریم بھی چونکہ ایک خاص زبان (عربی) میں بات کرتا ہے اس لئے اس کے ہاں بھی اظہار مطالب کا یہی انداز ہے۔ اس اعتبار سے اس نے سجدہ کا لفظ، اطاعت اور فرماں پذیری کے معنوں میں بھی استعمال کیا ہے۔ مثلاً سورۂ نحل میں ہے وَلِلّٰهِ يَسْجُدُ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ مِنْ دَآبَّةٍ وَالْمَلٰٓئِكَةُ وَهُمْ لَا يَسْتَكْبِرُوْنَ (۱۶/۴۹) ''اور جو جاندار کائنات کی پستیوں اور بلندیوں میں ہیں اور ملائکہ، سب خدا کے سامنے سر بسجود ہیں اور وہ سرکشی اختیار نہیں کرتے،،۔ یہاں يَسْجُدُ کا مفہوم لَا يَسْتَكْبِرُوْنَ نے واضح کر دیا ہے۔ یعنی وہ احکام خداوندی سے سرکشی اختیار نہیں کرتے بلکہ اس کی اطاعت کرتے ہیں۔ اس کی مزید وضاحت اس سے اگلی آیت نے کر دی جہاں کہا کہ وَيَفْعَلُوْنَ مَا يُؤْمَرُوْنَ (۱۶/۵۰) ''انہیں جو کچھ حکم دیا جاتا ہے وہ اسے کرتے ہیں،،۔ اس لئے قرآن کریم میں جہاں جہاں اس مادہ (س۔ ج۔ د) کی مختلف شکلیں آئیں وہاں اس حقیقت کو سامنے رکھنا چاہئیے کہ یہ لفظ حقیقی معنوں میں استعمال ہوا ہے یا مجازی (فرماں پذیری کے) معنوں میں۔

اس کے ساتھ ھی ایک بات اور بھی غور طلب ہے ۔ جب ذہنِ انسانی اپنے عہد طفولیت میں تھا تو وہ (بچے کی طرح) محسوس اشیاء ھی کو سمجھتا تھا اور اپنے خیالات کا اظہار بھی (بیشتر) محسوس طور پر کرتا تھا ۔ آج کل کی علمی اصطلاح میں یوں کہئیے کہ اس کا علم (Sense-Perceptions) '' حواس '' کے دائرہ میں محدود تھا ۔ وہ ھنوز تصورات (Concepts) کے ذریعے حصولِ علم یا اظہار خیالات کی منزل تک نہیں پہنچا تھا ۔ یہ وجہ تھی کہ اس کا اُس زمانے کا مذھب*، محسوسات کے دائرے میں گھرا ھوا تھا ۔ یعنی وہ (Formalism) کی منزل میں تھا ۔ اس نے '' خدا '' کے لئے محسوس پیکر تراش رکھے تھے ۔ پوجا پاٹ کے طریق اور دیگر مذھبی رسوم و تقاریب میں بھی سارا زور شکل (Form) پر دیا جاتا تھا ۔ بلکہ (Form) ھی کو مقصود بالذات سمجھا جاتا تھا ۔

قرآن کریم نے اپنی تعلیم میں انسان کو بالغ تصور کیا ہے ۔ یا یوں کہئیے کہ وہ اسے عہد طفولیت سے نکال کر سن شعور و بلوغت میں لانا چاھتا ہے ۔ وہ علم بالحواس (Perceptual Knowledge) کے ساتھ تصوراتی علم (Conceptual Knowledge) پر بھی زور دیتا ہے ۔ اور دین کے معاملہ میں بھی شکل (Form) کی بجائے معنویت (مقصود و مفہوم) کی اھمیت کو نمایاں کرتا ہے ۔ لیکن وہ شکل (Form) کو بالکل ترک نہیں کرتا ۔ اس کا تھوڑا سا حصہ ضرور باقی رکھتا ہے ۔ یہ اسلئے کہ (جیسا کہ ھمارا مشاھدہ ہے) انسان کو تصورات(Ideas) کی تعبیر کے لئے (Form) کے بغیر نہ چارہ ھوتا ہے ، نہ تسکین ۔ بڑے سے بڑا تصوراتی مفکر (Idealist) بھی جب بات کرتا ہے تو اس کے لئے ھاتھ ، پاؤں ، سر ، آنکھ کی حرکات ناگزیر ھوتی ھیں ۔ وہ ان محسوس اشارات کے بغیر اپنے خیالات اور جذبات کا اظہار کر ھی نہیں سکتا ۔ (وہ اسیطرح مجرد حقائق(Abstract Truths) کو بھی محسوس مثالوں سے سمجھاتا ہے) ۔ یہ وجہ ہے کہ قرآن کریم نے (Form) سے اسقدر بلند ھو جانے کے باوجود ، بعض مقامات میں اسے باقی بھی رکھا ہے ۔ صلوٰۃ (نماز) میں قیام و رکوع وسجود کی طبعی حرکات اسی حقیقت کی مظہر ھیں ۔ مثلاً (سورۃ نساء میں جہاں جنگ کی حالت میں صلوٰۃ کی ادائیگی کا ذکر آیا ہے وھاں کہا ہے) کہ ایک گروہ رسول اللہؑ کی اقتداء میں کھڑا ھو جائے ۔ فَاِذَا سَجَدُوْا ($\frac{4}{102}$) ۔ '' پھر جب وہ سجدہ کر چکیں '' تو وہ پیچھے ھو جائیں اور دوسرا گروہ نماز میں کھڑا ھو جائے ۔

---

* مذھب اور دین کے فرق کے لئے (ذ ۔ ھ ۔ ب) اور (د ۔ ی ۔ ن) کے عنوانات دیکھئیے ۔

ظاہر ہے کہ یہاں "سجدہ" سے مراد نماز کا وہ سجدہ ہے جس میں انسان سچ مچ اپنا سر خدا کے سامنے جھکاتا ہے، اور یہ شکل زمانہ نزول قرآن میں، نبی اکرم اور جماعت مومنین میں رائج تھی۔ قرآن کریم میں، صلوٰۃ اور حج ھی وہ "تقاریب" ہیں جن میں محسوس ارکان (Form) کی تھوڑی سی شکل باقی رکھی گئی ہے۔ یہ دونوں چیزیں (صلوٰۃ اور حج) اجتماعی عمل ہیں اور اجتماعی عمل کے لئے ویسے بھی ضروری ہوتا ہے کہ ان کی محسوس شکل میں یک جہتی اور ہم شکلی ہو۔ اجتماعی عمل میں اگر ہر فرد اپنے اپنے طور پر جسطرح جی چاہے، حرکات و سکنات کرے تو اس سے جسقدر انتشار پیدا ہوتا ہے اس کی وضاحت کی ضرورت نہیں۔ ان امور کی مزید تفصیل صلوٰۃ کے عنوان (باب ص۔ ل۔ و) میں ملیگی۔

لیکن یہ بھی ظاہر ہے کہ انسان کا اسطرح خدا کے سامنے سر جھکا دینا، اس کے اس جذبہ اور ارادہ کا محسوس مظاہرہ ہوگا کہ وہ قوانین خداوندی کے سامنے سرتسلیم خم کرتا ہے۔ یعنی وہ خدا کی کامل اطاعت کا عہد کرتا ہے۔ اگر اس کا محسوس سجدہ اس کے اس پر خلوص جذبہ کا بیساختہ مظہر نہیں اور محض (Form) ھی (Form) ہے، تو اس سجدے کے کوئی معنی نہیں۔ یہی وہ حقیقت ہے جس کے لئے قرآن کریم نے واضح طور پر کہدیا کہ لَيْسَ الْبِرَّ أَنْ تُوَلُّوا وُجُوهَكُمْ قِبَلَ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ وَلَٰكِنَّ الْبِرَّ .... (۲/۱۷۷)۔ "نیکی اور کشاد کی راہ یہ نہیں کہ تم اپنے منہ مشرق کی طرف کرتے ہو یا مغرب کی طرف۔ بلکہ نیکی اور کشاد کی راہ اسکی ہے جو خدا، آخرت، ملائکہ، کتب اور انبیاء پر ایمان رکھتا ہے۔ اور مال و دولت کو اس کی محبت کے باوجود، قرابتداروں، یتیموں، مساکین، ابن السبیل اور محتاجوں اور محکوموں کو دیتا ہے ....."۔ یعنی صلوٰۃ درحقیقت انسان کے جذبہ فرمان پذیری اور اطاعت کی محسوس مظہر ہے۔ اگر انسان خدا کی اطاعت تو نہ کرے اور صرف اس محسوس شکل کو مقصود بالذات سمجھ لے، تو خدا کی میزان میں اس کا کوئی وزن نہیں۔ بلکہ اس کے برعکس، قرآن کریم کہتا ہے کہ فَوَيْلٌ لِلْمُصَلِّينَ الَّذِينَ هُمْ عَنْ صَلَاتِهِمْ سَاهُونَ الَّذِينَ هُمْ يُرَاءُونَ وَيَمْنَعُونَ الْمَاعُونَ (۱۰۷/۴-۵)۔ "ان نمازیوں کے لئے تباہی ہے جو اپنی نماز کی حقیقت کو نظرانداز کر دیتے ہیں اور نماز کے ظاہرہ ارکان کو لوگوں کے دکھاوے کے لئے ادا کرتے ہیں (اور سمجھ لیتے ہیں کہ صلوٰۃ کا فریضہ ادا ہو گیا۔ عملاً ان کی حالت یہ ہوتی ہے کہ) رزق کے ان سرچشموں کو جنہیں بہتے پانی کی طرح ہر ایک تک پہنچنا چاہئے،

(بند لگا کر) روک رکھتے ھیں ،، ۔ اس سے ظاھر ھے کہ قرآن کریم کی رو سے سجدہ سے کیا مفہوم ھے ۔

اَلْمَسْجَدُ ۔ پیشانی کو کہتے ھیں جو زمین پر رکھی جاتی ھے ۔ اور اَلْمَسْجِدُ اس جگہ کو جہاں سجدہ کیا جائے* ۔ یہ اسم ظرف ھے جس کے معنی سجدہ کرنے کی جگہ اور سجدہ کرنے کا وقت ، دونوں ھو سکتے ھیں ۔ سورۃ کہف میں ھے کہ لوگوں نے ان نوجوانوں کے غار کے مقام پر مسجد بنا دی (۱۸/۲۱) ۔ یعنی وہ مجاھدین تھے ۔ لیکن بعد میں لوگوں کی نگاھوں سے یہ تصور تو اوجھل ھوگیا اور (جیسا کہ اکثر ھوتا ھے) ان کی یادگار میں ایک خانقاہ یا مقبرہ تعمیر کر دیا جو سجدہ گاہ انام بن گیا ۔ سورۂ بنی اسرائیل میں یہودیوں کے ھیکل کو مسجد کہکر پکارا گیا ھے (۱۷/۱) ۔ سورۃ التوبہ میں نبی اکرمؐ کے عہد مبارک کی اس مسجد کا بھی ذکر ھے جس کی بنیاد تقویٰ پر رکھی گئی تھی (۹/۱۰۸) اور اسکا بھی جس کا مقصد مسلمانوں میں فرقہ پیدا کرنا تھا اور جسے قرآن کریم نے کفر سے تعبیر کیا ھے اور خدا اور رسول کے خلاف جنگ کرنے والوں کے لئے پناہ گاہ کہکر پکارا ھے (۹/۱۰۷) ۔ قرآن کریم نے فرقہ بندی کو شرک قرار دیا ھے (۳۰/۳۱) اور واضح طور پر کہدیا ھے کہ مشرکین کو اس کا حق حاصل نہیں کہ وہ ''اللہ کی مسجدوں'' کو آباد کریں ۔ اس نے اعلان کردیا کہ اَنَّ الْمَسٰجِدَ لِلّٰهِ فَلَا تَدْعُوْا مَعَ اللّٰهِ اَحَدًا (۷۲/۱۸) ''مسجدیں صرف اللہ کے لئے ھیں ۔ سو اللہ کے ساتھ کسی اور کو نہ پکارو'' ۔ فرقہ بندی شرک اس لئے ھے کہ اس میں خالص خدا کی اطاعت نہیں ھوتی ۔ خالص قوانین خداوندی کی اطاعت کرنے سے امت میں اختلاف اور تفرقہ پیدا ھو ھی نہیں سکتا کیونکہ قرآن کریم نے اپنے منجانب اللہ ھونے کی دلیل یہ دی ھے کہ اس میں کوئی اختلافی بات نہیں ۔

جسطرح سجدہ سے مراد صرف سر کو زمین پر رکھنا نہیں بلکہ اس سے مفہوم قوانین خداوندی کے سامنے سر جھکا دینا بھی ھے ، اسی طرح مسجد سے مراد بھی بالخصوص وہ عمارت نہیں جس میں نماز ادا کی جاتی ھے ۔ اس سے مراد وہ مقام ھے جو اس نظام کا مرکز ھو جس کی رو سے قوانین خداوندی کی اطاعت کی یا کرائی جائے ۔ کعبے کو جو مسجدالحرام کہا گیا ھے (۲۸/۲۲) تو اس جہت سے نہیں کہ وہ ایسی عمارت ھے جس میں سجدہ کیا جاتا ھے بلکہ اس لئے کہ وہ خدا کے نظام توحید کا مرکز ھے ۔ وہ اس اُمت کا مرکز محسوس ھے

* تاج ۔

جسکی خصوصیت مُسْلِمَةً لَکَ (۲/۱۲۸) بتائی گئی ہے۔ یعنی قوانین خداوندی کے سامنے جھکنے والی۔ چونکہ نبی اکرم ؐ کی مکہ سے مدینہ کیطرف ہجرت کے بعد، مدینہ کو حکومت خداوندی کا مرکز قرار پانا تھا اس لئے قرآن کریم میں (شب ہجرت کے تذکرہ کے سلسلہ میں) مدینہ کو مسجداقصٰی (دور کی مسجد) کہکر پکارا گیا ہے۔ سُبْحٰنَ الَّذِیْ اَسْرٰی بِعَبْدِہٖ لَیْلًا مِّنَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ اِلَی الْمَسْجِدِ الْاَقْصَا الَّذِیْ بٰرَکْنَا حَوْلَہٗ لِنُرِیَہٗ مِنْ اٰیٰتِنَا (۱۷/۱) ”وہ ذات نقائص سے بہت دور ہے جو اپنے بندے کو ایک رات، مسجدالحرام (مکہ) سے اس مسجد کی طرف لے گیا جو (مکہ سے) بہت دور تھی۔ جس کے ماحول کو ہم نے با برکت بنایا تھا۔ تاکہ ہم اسے اپنی آیات (نشانیاں) دکھائیں“۔ اس کے بعد حضرت موسٰے ؑ کا ذکر ہے۔ سورۃ 'طٰہٰ' میں جہاں حضرت موسٰے ؑ کو فرعون کیطرف جانے کا حکم دیا گیا ہے وہاں بھی یہی کہا گیا ہے کہ لِنُرِیَکَ مِنْ اٰیٰتِنَا الْکُبْرٰی (۲۰/۲۳)۔ ”تاکہ ہم تمہیں اپنی بڑی بڑی نشانیاں دکھائیں“۔ یہ آیات، آویزش حضرت موسٰے ؑ اور فرعون میں حضرت موسٰے ؑ کی کامیابی تھی۔ یہی وہ آیات خداوندی تھیں جن کا مظہر، ہجرت کے بعد، مدینہ کو بننا تھا۔ یعنی جماعت مومنین کا باطل کی قوتوں پر غلبہ اور کامرانی۔

اس سے یہ حقیقت بھی ہمارے سامنے آجاتی ہے کہ مسجد کی عمارت بھی صرف نماز پڑھنے کے کام کے لئے مخصوص نہیں۔ اس میں اسلامی مملکت کے مختلف امور سرانجام دئے جا سکتے ہیں۔ اصل یہ ہے کہ قرآن کریم کی رو سے ”عبادت“ اور عام دنیاوی امور میں فرق ھی نہیں کیا جاسکتا۔ عبادت کے معنی اطاعت کے ھیں (دیکھئے عنوان ع۔ب۔د) اور دنیا کا کوئی کام جو قوانین خداوندی کے مطابق کیا جائے عبادت ہو جاتا ہے۔ اجتماع صلٰوۃ بھی چونکہ قانون خداوندی کی اطاعت ہے اس لئے وہ بھی عبادت ہے۔ ”عبادت“ کےلئے کسی ایسے الگ مکان کی ضرورت نہیں جس میں اور کچھ نہ کیا جا سکے۔

سورۃ اعراف میں ہے یٰبَنِیْٓ اٰدَمَ خُذُوْا زِیْنَتَکُمْ عِنْدَ کُلِّ مَسْجِدٍ (۷/۳۱) اس میں ”مسجد“ (ظرف) کو مصدری معنوں میں استعمال کیا گیا ہے *۔ یعنی اطاعت کرنا۔ اس آیت میں ایک عظیم حقیقت کیطرف اشارہ کیا گیا ہے۔ عیسائیت (اور اسی قسم کے دیگر مذاہب) میں رہبانیت

* لسان العرب سے اسکی تائید ہوتی ہے۔

کو اطاعت و عبادت کا منتھٰی قرار دیا گیا تھا ۔ یعنی ترک دنیا ۔ ترک لذت ۔ ترک زیبائش و آرائش ۔ قرآن کریم نے اس غلط تصور کا بطلان کیا اور کہا کہ دنیاوی زیبائش و آرائش ، خدا کی اطاعت کے راستے میں حائل نہیں ہوتی اس لئے اسے ترک کرنا ، اطاعت نہیں ۔ ان چیزوں سے ضرور متمتع ہونا چاہیئے ۔ صرف ان حدود کا خیال رکھنا چاہئے جو خدا نے مقرر کر دی ہیں ۔ اس آیت کے اگلے حصے ، اور اس سے ملحقہ آیت نے اس مفہوم کی وضاحت کر دی ہے ۔ آیت کا باقی حصہ یہ ہے ۔ وَّ کُلُوْا و اشْرَبُوْا وَلَا تُسْرِفُوْا ۔ اِنَّ اللّٰہَ لَا یُحِبُّ الْمُسْرِفِیْنَ (۷/۳۱) ۔ ” تم کھاؤ پیؤ ۔ لیکن حد سے تجاوز نہ کرو ۔ خدا حد سے تجاوز کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا ،، ۔ اس سے اگلی آیت میں ہے قُلْ مَنْ حَرَّمَ زِیْنَۃَ اللّٰہِ الَّتِیْٓ اَخْرَجَ لِعِبَادِہٖ وَالطَّیِّبٰتِ مِنَ الرِّزْقِ ۔ ۔ ۔ (۷/۳۲) ۔ ” ان سے کہو کہ اللہ کی زینت کی چیزوں کو جنہیں اس نے اپنے بندوں کے لئے پیدا کیا ہے ۔ اور رزق طیب کو کس نے حرام قرار دیا ہے ،، ؟ ۔ دو آیتیں پہلے ہے قُلْ اَمَرَ رَبِّیْ بِالْقِسْطِ وَاَقِیْمُوْا وُجُوْہَکُمْ عِنْدَ کُلِّ مَسْجِدٍ وَّادْعُوْہُ مُخْلِصِیْنَ لَہُ الدِّیْنَ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ (۷/۲۹) ” ان سے کہدو کہ اللہ نے تمہیں اعتدال پر رہنے کا حکم دیا ہے ۔ اور تم اطاعت گزاری میں اپنی تمام توجہات کو توازن کے ساتھ (اس کی طرف) مرکوز رکھو ۔ اور اطاعت کو خالص اسی کے لئے مختص کرتے ہوئے اسے پکارو ،، ۔ ان مقامات سے ظاہر ہے کہ قرآن کریم کا اس باب میں صحیح مقصود کیا ہے ۔

سورۃ الفتح میں محمد رسول اللہ ؐ والذین معہٗ کے متعلق ہے تَرٰھُمْ رُکَّعًا سُجَّدًا (۴۸/۲۹) ۔ ” تو انہیں رکوع کرتے ہوئے ۔ سجدے کرتے ہوئے دیکھیگا ،، ۔ یہاں رکوع اور سجود کے حقیقی معنی لئے جائیں تو مطلب اجتماع صلٰوۃ کے رکوع و سجود ہونگے ۔ اور اگر مجازی معنی لئے جائیں تو ، ذمہ داریوں کے بوجھ سے جھکے ہوئے اور اطاعت شعاری میں سرتسلیم خم کئے ہونگے ۔ اس کے بعد ہے سِیْمَاھُمْ فِیْ وُجُوْھِھِمْ مِّنْ اَثَرِ السُّجُوْدِ (۴۸/۲۹) ۔ اس کے عام معنی ہیں ” ان کی نشانیاں ان کے چہروں پر سجدوں کے اثرات سے ظاہر ہیں “ ۔ مطلب یہ ہے کہ قوانین خداوندی کی کامل اطاعت سے ان کے قلب میں جو اطمینان و سکون کی کیفیت پیدا ہوتی ہے اس کے اثرات ان کے چہروں سے نمایاں ہیں ۔ یہ نفسیات کا مسئلہ ہے کہ انسان کی داخلی کیفیات و جذبات کا اثر ، اس کے چہرے سے نمایاں ہو جاتا ہے ۔ قرآن کریم میں ہے یُعْرَفُ الْمُجْرِمُوْنَ بِسِیْمٰھُمْ (۵۵/۴۱) مجرم اپنی

علامات سے پہچانے جائیں گے - اس میں اسی نفسیاتی کیفیت کی طرف اشارہ ہے - اطاعت خداوندی سے قلبی سکون کی کیفیت مینانے رخ سے جھلک کر باہر آجاتی ہے -

س ج ر

سَجَرَ التَّنُّوْرَ - یَسْجُرُہٗ - سَجْرًا - اس نے تنور جلا دیا - اُسے گرم کرنے کے لئے اس میں پورا پورا ایندھن ڈال دیا - اسے ایندھن سے بھر دیا - اسی لئے سَجَرَ النَّھْرَ کے معنے ہوتے ہیں - اس نے نہر کو بھر دیا - اَلسَّجُوْرُ - وہ چیز جس سے تنور کو جھونکا جائے - اَلْمِسْجَرُ اس لکڑی کو کہتے ہیں جس سے تنور میں ایندھن کو الٹا پلٹا جائے تاکہ وہ جلدی گرم ہو جائے - اَلسَّاجِرُ - اَلْمَسْجُوْرُ - ساکن اور بھری ہوئی چیز - (نیز اس کے معنے خالی چیز کے بھی آتے ہیں - اس اعتبار سے یہ اضداد میں سے ہے**)- وہ دریا جس کا پانی اُس کے ظرف سے زیادہ ہو - سَجَرْتُ الْاِنَاءَ - میں نے برتن کو بھر دیا - اَلسَّاجِرُ - وہ مقام جہاں سے سیلاب گزرے اور اسے پُر کرتا ہوا چلا جائے - بِئْرٌ سَجِیْرٌ - پُر کنواں* -

سَجَرَ الْمَاءُ - پانی کا جدھر جی چاہے راستہ پھاڑ کر نکل جانا* - لہذا اس لفظ کے معنے آگ بھڑکانے کے بھی ہونگے اور بھر دینے اور لبریز ہو جانے کے بھی - ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے معنی (۱) بھرنا - (۲) ایک دوسرے کے ساتھ مل جانا اور (۳) بھڑکانا ، ہیں -

قرآن کریم میں ہے ثُمَّ فِی النَّارِ یُسْجَرُوْنَ (۷۲/۴۰) - پھر وہ آگ میں جھونکے جائینگے - سورۃ طور میں اَلْبَحْرِ الْمَسْجُوْرِ (۵۲/۶) آیا ہے - یعنی بھرا ہوا سمندر - یا ایک سے دوسرا ملا ہوا سمندر - سورۃ تکویر میں ہے اِذَا الْبِحَارُ سُجِّرَتْ (۸۱/۶) - سمندر (آمد و رفت کی کثرت سے) ہر وقت بھرے بھرے نظر آئینگے - (اور اگر بِحَارٌ کے معنے کناروں کی بستیاں لیا جائے - تو اس کے معنے یہ ہونگے کہ بندرگاہیں آباد ہو جائینگی - مقصد بہر حال دونوں کا ایک ہی ہے) -

س ج ل

اَلسَّجْلُ - پانی سے بھرا ہوا بڑا ڈول - سخی آدمی* - اَلسِّجِلُّ - کتاب - صحیفہ - نیز کاتب* -

---

*تاج - **لطائف اللغۃ -

اَلسِّجِّیْلُ - یہ لفظ معرب ہے فارسی لفظ سَنْگِ گِل سے - یعنی وہ مٹی جو آگ میں پک کر پتھر بن جائے - زمانہ قدیم میں (جب لکھنے کی ابتدا ہوئی ہے تو) مٹی کی تختیوں کو آگ میں تپا کر پختہ کرلیا کرتے تھے اور انہی پر لکھا جاتا ہے - اسی کو السِّجِّلُ کہتے تھے - بعد میں ہر اس چیز کو جس پر لکھا جائے اَلسِّجِلُّ کہنے لگے** -

قرآن کریم میں ہے کہ قوم لوط پر حِجَارَۃً مِنْ سِجِّیْلٍ (۱۱/۸۲) برسائے گئے - انہی کو سورۃ ذاریٰت میں حِجَارَۃً مِنْ طِیْنٍ (۵۱/۳۳) کہا گیا ہے - اس سے ظاہر ہے کہ یہ سنگ گل متحجر تھی - لیکن اس کے ساتھ ہی دونوں مقامات پر انہیں مُسَوَّمَۃً عِنْدَ رَبِّکَ (۱۱/۸۳ و ۵۱/۳۴) کہا گیا ہے - یعنی جو خدا کی طرف سے اس مقصد کے لئے نشان زدہ تھے*** - لیکن اَلسِّجِلُّ میں لکھنے کا جو عنصر شامل ہے ، اُس اعتبار سے بھی مُسَوَّمَۃً کا مفہوم واضح ہو جاتا ہے - [ہو سکتا ہے کہ یہ تہ بہ تہ (مَنْضُوْدٍ ۱۱/۸۲) تختیاں ہی ہوں جو پہاڑ پر کسی لائبریری میں رکھی ہوں اور اس کی آتش فشانی سے سب سے پہلے یہی اڑ کر ان کی بستی پر گری ہوں] -

سورۃ انبیاء میں ہے یَوْمَ نَطْوِی السَّمَآءَ کَطَیِّ السِّجِلِّ لِلْکُتُبِ (۲۱/۱۰۴) - یہ وہ دور ہوگا جس میں بلندیوں (یا بلند طبقے کے لوگوں) کو کاغذ کے فائل کی طرح لپیٹ کر رکھدیا جائیگا کہ ان کا زمانہ ختم ہو گیا - اس دور میں معاشرتی ہمواریاں پیدا ہو جائینگی - (۳۹/۱۶) -

اگر ان آیات میں کسی کائناتی حادثہ کی طرف اشارہ ہے تو اس سے مقصود آسمانی کُرّوں کا لپیٹے جانا ہوگا - ابن فارس نے کہا ہے کہ اس مادہ کے بنیادی معنی کسی چیز کا بھر کر الٹ جانا یا گر جانا ہیں - اس سے مفہوم اور بھی واضح ہوجاتا ہے -

س ج ن

سَجَنَ - یَسْجُنُ سَجْنًا - کسی کو قید کر دینا* (۱۲/۲۵ و ۱۲/۳۵) - اَلسِّجْنُ - قید خانہ (۱۲/۳۳) -

*تاج - **راغب - ***اقوام سابقہ پر جو عذاب طبعی حوادث (سیلاب ، آندھی زلزلہ ، آتش فشاں مادہ) کے ذریعے آتا تھا ، اسے اس قوم کے اعمال زندگی سے کیا تعلق تھا ، اس کے لئے مصنف کی کتاب ''جوئے نور'' دیکھئے -

سِجِّيْنٌ - یہ لفظ سورۃ تطفیف میں آیا ہے - مَآ اَدْرٰكَ مَا سِجِّيْنٌ (۸۳/۸) - بعض نے اس کے معنے قید خانہ کئے ہیں - لیکن قرآن کریم نے كِتٰبٌ مَّرْقُوْمٌ (۸۳/۹) کہہکر خود ہی اس کی تفسیر کر دی ہے - یعنے نامۂ اعمال - لکھی ہوئی چیز* -

س ج و

سَجَا اللَّيْلُ يَسْجُوْ - سَجْوًا - رات کا ساکن ہو جانا - ٹھہرجانا - تاریک ہوجانا - ابن فارس نے اس کے بنیادی معنوں میں سکون اور بند کرنے، ڈھانکنے کا مفہوم بتایا ہے - سَجَا اللَّيْلُ کے معنے ہیں رات کا شدید تاریک اور پرسکون ہونا - اَلْبَحْرُ السَّاجِي - پرسکون سمندر - اَلطَّرْفُ السَّاجِي - خاموش نگاہ - ابن الاعرابی نے کہا ہے کہ سَجَى اللَّيْلُ کے معنے ہیں رات کی تاریکی بڑھ گئی* -

قرآن کریم میں ہے وَ اللَّيْلِ اِذَا سَجٰى (۹۳/۲) - رات کی تاریکی اور اس میں فضا کا سکوت، اور نمودِ صبح سے پہلے اس کی شدید ظلمت، اس حقیقت پر شاہد ہے کہ (نظامِ خداوندی کے) اس پروگرام کو کامیابی تک پہنچنے میں وقت لگیگا اور وہ اپنے مدارج طے کرتا ہوا مقصود تک پہنچیگا - لہذا اس وقت جو تم دیکھ رہے ہو کہ تمہاری اس قدر محنت اور مشقت کے باوجود معاشرہ کی تاریکیاں چھٹ نہیں رہیں تو اس سے اس نتیجہ پر نہ پہنچ جاؤ کہ قوانین خداوندی نے تمہارا ساتھ چھوڑ دیا ہے - مَا وَدَّعَكَ رَبُّكَ وَمَا قَلٰى (۹۳/۳) "نہ تو تیرے نشوو نما دینے والے نے تجھے چھوڑ دیا ہے اور نہ ہی (یونہی، خواہ مخواہ) مشقت میں ڈال دیا ہے"- وَالضُّحٰى کے ساتھ آنے سے یہ بھی مفہوم ہو سکتا ہے کہ دن اور رات کے تغیرات اس پر شاہد ہیں کہ ان مخالفین کی یہ حالت ہمیشہ ایسی ہی نہیں رہیگی - اس میں انقلاب آئیگا -

س ح ب

سَحَبَ - اس نے کھینچا - گھسیٹا - اَلْمَرْاَةُ تَسْحَبُ ذَيْلَهَا - عورت اپنا دامن زمین پر گھسیٹتی (ہوئی چلتی) ہے - اِنْسَحَبَ - وہ زمین پر گھسٹ گیا - اسی سے اَلسَّحَابَةُ ہے جس کے معنے میں بدلی، بادل کا ٹکڑا، کیونکہ وہ پانی کو کھینچ کر لاتا ہے - یا ہوائیں اسے کھینچتی ہیں، یا وہ دامن

*تاج و راغب -

گھسیٹتا ہوا چلتا ہے* ۔ (اس کی جمع سُحُبٌ ہے) قرآن کریم میں لفظ سَحَابٌ مفرد اور جمع دونوں طرح استعمال کیا گیا ہے۔مثلاً اَلسَّحَابِ الْمُسَخَّرِ (۲/۱۶۴) "بادل جو مسخر کیا گیا ہے" اور اَلسَّحَابَ الثِّقَالَ (۱۳/۱۲) "بھاری بھاری بادل" ۔

کھینچنے کے معنوں میں سورۃ المومن میں ہے يُسْحَبُوْنَ فِى الْحَمِيْمِ۔ (۴۰/۷۱) ۔ وہ "حمیم" میں گھسیٹ کر یا کھینچکر ڈالے جائینگے ۔ سورۃ قمر میں ہے يَوْمَ يُسْحَبُوْنَ فِى النَّارِ (۵۴/۴۸)۔ جس دن انہیں آگ میں گھسیٹا جائیگا۔

س ح ت

اَلسَّحْتُ ۔ کسی چیز کو جڑ سے اکھیڑ دینا ۔ کسی چیز کو آہستہ آہستہ چھیل کر الگ کر دینا ۔ سَحَتَ الشَّحْمَ عَنِ اللَّحْمِ ۔ گوشت کے اوپر سے چربی کو چھیل کر الگ کر دیا* ۔ قرآن کریم میں ہے فَيُسْحِتَكُمْ بِعَذَابٍ (۲۰/۶۱) ۔ وہ ایسی سزا دے گا کہ تمہاری جڑ کٹ جائیگی ۔ یا وہ تمہیں آہستہ آہستہ مٹا دیگا ۔

اَلسُّحْتُ ۔ ہر حرام چیز جس کا تذکرہ معیوب ہو، حرام اور گندہ پیشہ جو باعث عار ہو، ہر نا پسندیدہ اور حرام کی کمائی ۔ اس لئے کہ وہ برکت و سعادت کو جڑ سے کاٹ دیتی ہے* ۔ یہود کے متعلق ہے اَكّٰلُوْنَ لِلسُّحْتِ (۵/۴۲) ۔ ان کا ذریعۂ معاش بہت برا ہے ۔ عام یہودی سود خوار اور بددیانت تھے اور ان کے مذہبی راہنما دین فروشی کرتے تھے۔ اس سے بڑھکر قابل نفرت ذریعۂ معاش اور کیا ہوسکتا ہے ۔ اور ایک یہودیوں پر ہی کیا موقوف ہے ۔ سرمایہ پرستی اور پیشوائیت جہاں بھی ہو وہاں یہی حالت ہوتی ہے ۔ حَرَامٌ سُحْتٌ ۔ سخت حرام کو کہتے ہیں ۔ صاحب محیط نے کلیات کے حوالہ سے لکھا ہے کہ سُحْتٌ اس حرام کو کہتے ہیں جس کی حرمت میں کوئی اشتباہ نہ ہو بلکہ وہ کھلم کھلا حرام ہو** ۔ اَرْضٌ سَحْتَاءُ ۔ اس زمین کو کہتے ہیں جس میں کچھ پیدا نہ ہو* ۔ عَامٌ اَسْحَتُ ۔ قحط کا سال جس میں چارہ بالکل نہ پیدا ہو* ۔

س ح ر

اَلسِّحْرُ ۔ صاحب محیط نے لکھا ہے کہ اسکے بنیادی معنے موڑنے اور پھیرنے کے ہیں ۔ اور اس سے مطلب ہوتا ہے باطل کو حق کی صورت میں

*تاج ۔ **محیط ۔

پیش کرنا *- تہذیب میں ہے کہ اسکے اصلی معنے کسی چیز کو اصل حقیقت سے غیر حقیقت کی طرف پھیر دینے کے ہیں - صاحب تاج العروس نے کہا ہے کہ اس سے مراد ہر وہ چیز ہے جس کا ماخذ لطیف اور دقیق ہو - یعنی ایسا دھوکا جس میں پتہ نہ چلے کہ دھوکا کسطرح دیا گیا ہے - پھر یہ لفظ عام دھوکے کے معنوں میں بھی استعمال ہونے لگا ***- سَحَرَہٗ وسَحَّرَہٗ کے معنے ہیں اس کو دھوکا دیدیا - اِنَّمَآ اَنْتَ مِنَ الْمُسَحَّرِیْنَ (۲۶/۱۸۵-۱۵۳) کے معنے ہیں تم ان لوگوں میں سے ہو جنہیں دھوکا لگ گیا ہے - اور بار بار مبتلائے فریب ہو جاتے ہو - عَنْزٌ مَسْحُوْرَۃٌ اس بکری کو کہتے ہیں جس کے تھن تو بڑے بڑے ہوں لیکن وہ دودھ بہت کم دے - اَلْمَسْحُوْرُ اسے کہتے ہیں جس کی عقل میں خرابی ہو گئی ہو *-

مخالفین ، رسول اللہ ؐ کو رَجُلًا مَسْحُوْرًا (۱۷/۴۷) کہتے تھے - یعنے جسے دھوکا لگ گیا ہو - فریب خوردہ انسان - یا جس پر کسی نے جادو کر دیا ہو - یا جسکی عقل ماری گئی ہو - نیز اس کے معنے سَاحِرٌ کے بھی کئے گئے ہیں - جیسے (۱۷/۱۰۱) میں - سورۃ مومنون میں ہے قُلْ فَاَنّٰی تُسْحَرُوْنَ (۲۳/۸۹) - ان سے پوچھو کہ تمہیں کہاں (یا کس وجہ سے) دھوکا لگتا ہے ؟ وہ کونسی بات ہے جس کی وجہ سے تمہارا رخ حقیقت کی طرف سے مڑ کر دوسری طرف پھر جاتا ہے ؟ دھوکے کے علاوہ اس کے معنے جھوٹ کے بھی ہیں - چنانچہ قرآن کریم میں ہے وَلَئِنْ قُلْتَ اِنَّکُمْ مَبْعُوْثُوْنَ مِنْ بَعْدِ الْمَوْتِ لَیَقُوْلَنَّ الَّذِیْنَ کَفَرُوْٓا اِنْ ھٰذَآ اِلَّا سِحْرٌ مُّبِیْنٌ (۱۱/۷) - اگر تو ان سے کہے کہ تم موت کے بعد اٹھائے جاؤ گے تو جو لوگ اس کے منکر ہیں وہ کہدینگے کہ یہ بالکل جھوٹی بات ہے -

اَلسَّحَرُ - سینہ کے اوپر کا حصہ - (پھیپھڑا - دل ، کلیجی وغیرہ) - ہر چیز کا کنارہ - اس اعتبار سے رات کے آخری حصہ کو سَحَرٌ کہتے ہیں - یا صبح (فجر) سے ذرا پہلے - راغب نے آخر شب کی تاریکی کو دن کی ابتدائی روشنی میں خلط ملط ہونے کو ، نیز ایسے وقت کو سَحَرٌ بتایا ہے (۵۴/۳۴) - اَسْحَارٌ اسکی جمع ہے ** (۵۱/۱۸) - دن کا آغاز - ابتدائے کاروبار کا وقت *** -

تاریخ بتاتی ہے کہ انسان کی عمرانی زندگی میں ایک دور گزرا ہے جسے عہد سحر (Magic Age) کہا جاتا ہے - مغربی محققین نے اس دور کے متعلق بڑی کثیر معلومات فراہم کی ہیں - سحر (یا Magic) کے معنے یہ تھے کہ انسان مختلف طریقوں (جھاڑ-

* تاج و محیط **تاج - ***ابن قتیبہ (القرطین ج/۱ صفحہ ۲۵۷)

پھونک ـ تعویذ گنڈا ـ اوراد و وظائف) سے کائنات کی مؤثر قوتوں کو مجبور کرے کہ وہ اس کی منشاء کے مطابق کام کریں ـ اسی کو جادو کہتے ھیں ـ یعنی انسان کا پہلا دور پرستش کا تھا جس میں وہ کائناتی قوتوں سے عاجزی سے گڑگڑا کر مدد مانگتا تھا ـ لیکن اس کے بعد یہ دوسرا دور آیا جس میں اس نے ان قوتوں کو مجبور کرنے کا طریق اختیار کیا ـ ان ساحرین کا (پروھتوں کیطرح) معاشرہ میں بہت اونچا مقام تھا ـ لیکن اگر بغور دیکھا جائے تو انسان کا ”دور پرستش“ سے ”عہد سحر“ کیطرف آنا ، فکر معقول (Rational Thought) کی طرف آنے کی پہلی اور دھندلی سی کوشش تھی ـ ”فکر معقول“ سے مراد یہ ھے کہ ھر حادثہ کا سبب معلوم کیا جائے ـ قانونِ علت و معلول (Cause And Effect) کے مطابق حوادث و واقعات کی وجہ معلوم کی جائے ـ ”دور پرستش“ میں انسان سمجھتا تھا کہ (مثلاً) بخار اس لئے آتا ھے کہ کوئی دیوتا ناراض ھو جاتا ھے ـ اسے رفع کرنے کی صورت یہ ھے کہ اس دیوتا کی بھگتی سے اسے خوش کر دیا جائے ـ اس میں علت اور معلول کا کوئی تصور نہیں تھا ـ وہ اس سے ”عہد سحر“ کیطرف آیا ـ یعنی اس نے یہ سوچا کہ (مثلاً) اگر فلاں منتر کو اتنی بار ، اس طریق سے دھرا لیا جائے تو اسکا لازمی نتیجہ فلاں ھوگا ـ بالفاظ دیگر اسکے ذھن میں عمل اور اس کے نتیجہ میں خاص ربط ھونے کی ذرا سی کرن نمودار ھوئی ـ خدا کی طرف سے عطا کردہ دین نے یہ بتایا کہ کائنات میں سب کچھ خدا کے بنائے ھوئے قوانین کے مطابق عمل میں آتا ھے ـ ھر کام کا ایک متعین نتیجہ مرتب ھوتا ھے اور یہ نتیجہ مرتب ھوتا ھے ایک خاص قانون کے مطابق ـ اگر انسان ان قوانین کا علم حاصل کرلے تو جب جی چاھے اس قسم کا نتیجہ پیدا کر سکتا ھے ـ یہ وہ تصور ھے جس پر علوم سائنس کی ساری عمارت استوار ھے ، اور جس محور کے گرد انسان کی زندگی اور اس کا مستقبل گردش کرتا ھے ـ سحر اس لئے باطل ھے کہ اس میں نتیجہ کسی خاص قانون کے مطابق مرتب ھونے کا تصور نہیں ھوتا بلکہ ایک خاص طریق کچھ پڑھنے اور کرنے کا نتیجہ سمجھا جاتا ھے ـ انسان کو فکر معقول قرآن کریم نے دیا ھے ـ

قرآن کریم میں داستان حضرت موسیٰؑ کے ضمن میں ساحرین قوم فرعون اور ان کی سحرکاریوں کا ذکر تفصیل سے آتا ھے ـ انہیں سے حضرت موسیٰؑ کا مقابلہ ھؤا تھا ـ اگر ان مقامات میں سِحْرٌ سے مراد جادو ھے تو ان تمام واقعات (رسیوں کا چلنا وغیرہ) کو انھی معانی میں سمجھا جائے گا ـ لیکن اگر اس کے معنی ”باطل پرستی“ ھے تو پھر ان آیات کے مجازی معانی لئے جائینگے ـ (تفصیل میری کتاب برق طور میں ملیگی) ـ

سِحْر (جادو) کا مفہوم لینے سے ایک اہم چیز سامنے آتی ہے۔ قرآن کریم نے کہا ہے کہ ان جادوگروں نے سَحَرُوْٓا اَعْيُنَ النَّاسِ (۷/۱۱۶)۔ لوگوں کی آنکھوں کو دھوکا دیا۔ یعنی وہ رسیاں سچ مچ چلنے نہیں لگ گئی تھیں۔ انہوں نے (ہاتھوں کے کرتب یا نفسیاتی قوت سے) ایسا کیا کہ لوگوں کو ایسا محسوس ہوا گویا وہ رسیاں چل رہی ہیں۔ يُخَيَّلُ اِلَيْهِ مِنْ سِحْرِهِمْ اَنَّهَا تَسْعٰى (۲۰/۶۶)۔ "موسیٰ ؑ کو ایسا خیال ہوا گویا وہ دوڑ رہی ہیں"۔ یعنی سحر سے صرف دیکھنے والے کی قوت متخیلہ اثر پذیر ہوتی ہے۔ وہ چیزیں فی الواقعہ ایسی نہیں بن جاتیں۔ ساحر دیکھنے، والے کی قوت متخیلہ کو متاثر کر دیتا ہے، اور بس ہمارے زمانے میں نفسیات (Psychology) کی تحقیقات نے اس حقیقت کو بے نقاب کر دیا ہے کہ یہ سب انسان کی قوت متخیلہ کی کرشمہ سازیاں ہیں۔ اس سے زیادہ کچھ نہیں۔ غور کیجئے کہ قرآن کریم نے آج سے کتنا عرصہ پہلے اس حقیقت کو واشگاف کیا تھا۔ (نیز دیکھئے عنوان خ ۔ ی ۔ ل)

یہودیوں کا سارا مذہب سحر و ساحری کا مرقع اور ان کے معبد اس قسم کی کرشمہ سازیوں کی آماجگاہیں تھے۔ وہ ان باتوں کو حضرت سلیمان ؑ کی طرف منسوب کرتے تھے۔ "اسم اعظم اور نقوش سلیمانی" ان کی خاص چیزیں تھیں۔ قرآن کریم نے ان سب کی تردید کی اور واضح الفاظ میں بتایا کہ خدا کے نبی ان توہم پرستیوں اور فریب سازیوں سے بہت دور ہوتے ہیں۔ (۲/۱۰۲)۔

قرآن کریم نے تو یہ کہا، لیکن قرآن کریم کی حامل قوم (مسلمانوں) نے گنڈے۔ تعویذ۔ ورد۔ وظائف، غرضیکہ ان تمام توہم پرستیوں کو ایک ایک کرکے اپنے ہاں جمع کر لیا اور اسے "روحانیت" قرار دیکر باطل کو حق کا لباس پہنا دیا۔ یا للعجب!

اوپر بتایا گیا ہے کہ کفار، نبی اکرم ؐ کے متعلق کہتے تھے کہ وہ رجل مسحور ہے (۱۷/۴۷)۔ یعنی اس پر کسی نے جادو کر دیا ہے۔ قرآن کریم نے اس کی تردید کی ہے (۹/۲۵)۔ نبی کی ذات اسقدر نشو و نما یافتہ اور مستحکم ہوتی ہے اور اسکی قوت ایمانی اسقدر مضبوط کہ اس کے مقابلہ میں ساحرین کی نفسیاتی قوت ایک ثانیہ کے لئے بھی نہیں ٹھہر سکتی، چہ جائیکہ وہ نبی کو متاثر کر دے اور وہ ان کے فریب سحر میں آجائے۔ یہ ناممکن ہے۔ حضرت موسیٰ ؑ کے قصے میں (جس کا ذکر اوپر کیا گیا ہے) اتنا ہی کہا

ہے کہ انھوں نے خیال کیا کہ گویا وہ رسیاں چل رہی ہیں ۔ لیکن یہ چیز اور ہے اور کسی کا جادو کے اثر سے مسحور ہو کر بہکی بہکی باتیں کرنے لگ جانا اور بات ۔ نبی پر اس قسم کا اثر کبھی نہیں ہو سکتا ۔

(قصۂ حضرت موسیٰؑ میں اگر سحر کے معنی باطل پرستی لئے جائیں تو پھر بات اور بھی صاف ہو جاتی ہے)۔

س ح ق

سَحَقَہٗ ۔ یَسْحَقُہٗ ۔ سَحْقاً ۔ اسنے اسے کوٹ کر، پیس کر، باریک کر دیا ۔ اِنْسَحَقَ ۔ وہ پس گیا ۔ سَحَقَتِ الرِّیْحُ الْاَرْضَ ۔ ہوا نے زمین کے نشانات مٹا دئے ۔ وہ اس تیزی سے چلی جیسے زمین کی مٹی کو پیس رہی ہو ۔ سَحَقَتِ الدَّابَّۃُ ۔ جانور تیز دوڑا ۔ اسی سے اَلسُّحْقُ ۔ اَلسُّحُقُ کے معنے ہیں دور ہونا ۔ اَسْحَقَ فُلَاناً ۔ اس نے اسے دور کر دیا ۔ ہلاک کر دیا *۔ ابن فارس نے اسکے بنیادی معنے (۱) بُعد اور دوری (۲) کسی چیز کو اسقدر کمزور کر دینا کہ وہ خستہ ہو جائے، بتائے ہیں ۔ اَسْحَقَ الضَّرْعُ : تھن دودھ سے خشک ہوئے اور مرجھا گئے ۔ راغب نے سَحْقٌ کے معنے کسی چیز کو ریزہ ریزہ کرنا کئے ہیں ۔

قرآن کریم میں ہے فَسُحْقاً لِاَصْحٰبِ السَّعِیْرِ (۶۷/۱۱) ۔ اہل جہنم کے لئے (زندگی کی خوشگواریوں سے) بُعد اور محرومی ہے ۔ مَکَانٌ سَحِیْقٌ (۲۲/۳۱) ۔ دور دراز جگہ ۔

س ح ل

سَحَلَہٗ یَسْحَلُہٗ ۔ سَحْلاً ۔ اسنے اسے چھیل دیا اور کھرچ دیا، ریتا ۔ اَلرِّیَاحُ تَسْحَلُ الْاَرْضَ ۔ ہوائیں زمین (کی سطح) کو کھرچ دیتی ہیں ۔ اَلسَّاحِلُ ۔ دریا یا سمندر کا کنارا جسے پانی چھیلتا اور کھرچتا رہتا ہے**۔

قرآن کریم میں ہے فَلْیُلْقِہِ الْیَمُّ بِالسَّاحِلِ (۲۰/۳۹) ۔ دریا اسے کنارے پر ڈال دے گا ۔

س خ ر

سَخِرَ ۔ یَسْخَرُ سَخْرًا وَ سَخَرًا و سُخْرًا و سُخْرًا کے معنے مذاق کرنا اور بیوقوف سمجھتے ہوئے ہنسی اڑانا ہیں ۔ رَجُلٌ سُخَرَۃٌ

* تاج و محیط ۔ **تاج و راغب

وہ آدمی جو بہت زیادہ لوگوں سے مذاق کرے اور انکی ہنسی اڑائے ۔ اس سے اسم السُّخْرِیَّۃ و السُّخْرِیٌّ وَ السِّخْرِیٌّ آتا ہے* ۔ بمعنی ٹھٹھول ، مذاق ۔ سَخَّرَہٗ ۔ یَسْخَرُہٗ سِخْرِیًّا و سُخْرِیًّا ۔ و سَخَّرَہٗ تَسْخِیْرًا ۔ کسی کو کسی خاص مقصد کی طرف زبردستی لے جانا ۔ کسی کو مجبور کرکے کسی کام پر لگا دینا ۔ کسی سے کوئی کام بلا معاوضہ (بیگار کے طور پر) کرالینا ۔ کسی کو تابع فرمان کرنا ۔ اپنے حکم کے مطابق چلانا* ۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی حقیر سمجھنے اور ذلیل کرنے کے ہیں ۔

محیط نے (کلیات کے حوالہ سے) لکھا ہے کہ قرآن کریم میں جہاں یہ مادہ مجرد ثلاثی سے آیا ہے اس سے مراد استہزاء ہے سوائے سورۃ زخرف کے کہ وہاں لِیَتَّخِذَ بَعْضُهُمْ بَعْضًا سُخْرِیًّا ($\frac{۴۳}{۳۲}$) ۔ میں سُخْرِیًّا کا لفظ تسخیر کے معنوں میں ہے** ۔

سورۃ زخرف کی یہ آیت ایک اہم حقیقت کی طرف اشارہ کرتی ہے ۔ اس میں بتایا گیا ہے کہ مختلف افراد میں کسب و ہنر کی استعداد میں جو فرق ہے وہ اس لئے ہے کہ معاشرہ کے مختلف کام مختلف افراد کرسکیں ۔ اگر تمام افراد کی استعداد ایک جیسی ہوتو کوئی شخص کسی دوسرے کے تجویز کردہ پروگرام کے مطابق کام ہی نہ کرے ۔ یا تمام افراد ایک ہی قسم کا کام کرنے لگ جائیں ۔ اس طرح معاشرہ کا نظام قائم ہی نہیں رہ سکتا ۔ لیکن اختلاف استعداد کا مطلب یہ نہیں کہ زیادہ استعداد والے لوگوں کو اجازت دے دی جائے کہ وہ کم استعداد والے لوگوں کو اپنا محکوم اور تابع فرمان بنا کر انہیں اپنی اغراض کے حصول کا آلہ کار بنا لیں ۔ اختلافِ استعداد صرف تقسیم کار کے لئے ہے ورنہ قرآن کریم کی رو سے ہر ابن آدم واجب التکریم ہے ۔ (تفصیل اس کی میری کتاب ''نظام ربوبیت'' میں ملیگی) ۔

قرآن کریم میں ہے سَخَّرَ لَكُمْ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ جَمِيعًا مِّنْهُ ($\frac{۴۵}{۱۳}$) ۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ خدا نے کائنات کی پستیوں اور بلندیوں کی ہر چیز کو ایک لگے بندھے قانون کے مطابق چلنے کے لئے پیدا کر رکھا ہے اور وہ اسی کے مطابق چل رہی ہے ۔ یہ اس لئے ہے تاکہ انسان اس قانون کا علم حاصل کر کے (جسے قانون فطرت کہتے ہیں) ان اشیائے کائنات سے اپنے فائدے کے کام لے سکے ۔ لہذا جو قوم ، قوانین فطرت کا زیادہ سے زیادہ علم حاصل کرکے اشیائے فطرت کو اپنے کام میں لائیگی وہی ان کی

*تاج ۔ **محیط ۔

تخلیق و تسخیر کے منشا کو پورا کریگی - آپ غور کیجئے کہ قرآن کریم نے اس اعلان سے انسانی دنیا میں کس قدر انقلاب عظیم برپا کر دیا - انسان ، کائنات کی قوتوں سے ڈرتا تھا - انہیں اپنا معبود بناتا تھا - ان کے حضور گڑگڑاتا تھا - اپنے آپ کو ان سب کے سامنے کمزور و ناتوان سمجھتا تھا - قرآن کریم نے بتایا کہ یہ تصور یکسر باطل ہے - خدا نے کائنات کی تمام قوتوں کو انسان کے لئے تابع تسخیر کر رکھا ہے - یہ قوتیں اس کی معبود نہیں ، اسکی خادم ہیں - ''ملائکہ'' آدم کے سامنے سجدہ ریز ہیں - اس سے انسان کا مقام کائنات کی ہر چیز سے بلند ہو گیا اور اس کے سامنے اشیائے فطرت کی تسخیر کے دروازے کھل گئے - دنیا میں جو قوم بھی قوانین فطرت کا علم حاصل کریگی یہ قوتیں اس کے تابع فرمان ہو جائینگی - اس میں مومن اور کافر کا بھی کچھ فرق نہیں - البتہ مومن ان قوتوں کو قوانینِ خداوندی کے مطابق انسانیت کی نشو و نما کے لئے صرف کریگا اور کافر انہیں اپنی مفاد پرستیوں کے کام میں لائیگا - اس سے ظاہر ہے کہ

(۱) مقام آدم (آدمی کا مقام) یہ ہے کہ وہ کائناتی قوتوں کو مسخر کرکے اپنی مرضی کے مطابق ان کا استعمال کرے -

(۲) مقام مومن یہ ہے کہ وہ ان قوتوں کو مسخر کرکے منشائے خداوندی کے مطابق ان کا استعمال کرے -

(۳) جو ان قوتوں کو مسخر ہی نہ کرے ، اسے مقام مومن تو ایک طرف مقام آدم بھی نصیب نہیں -

آج کا مسلمان خود سمجھ لے کہ قرآن کریم کی رو سے اس کا مقام کیا ہے؟

سَخِرَ (مذاق اور استہزاء کے معنوں میں) قرآن کریم کے متعدد مقامات پر آیا ہے (مثلاً ۹/۷۹ و ۳۷/۱۲ و ۴۹/۱۱) - سورۃ مومنون میں لفظ سِخْرِیًّا (۲۳/۱۱۰) انہی معانی میں آیا ہے -

س خ ط

اَلسُّخْطُ - اَلسَّخَطُ - ناپسندیدگی ، کراھت ، نارضامندی ، غضب ، غصہ - سَخِطَ عَلَیْہِ - وہ اس پر ناراض ھوا - سَخِطَ - اس نے ناپسند کیا ، کراھت کی - اَسْخَطَہٗ - اس نے اسے ناراض کر دیا - غصہ دلادیا - اَلْمَسْخُوْطُ - مکروہ - ناپسندیدہ* - راغب نے کہا ہے کہ سَخَطٌ اس شدید غصے کو کہتے ہیں جو سزا کا مقتضی ہو** -

*تاج - **راغب -

لیکن جب یہ لفظ خدا کی طرف منسوب ہوگا تو اس کے معنے غصے یا ناراضگی کے نہیں ہونگے۔ اللہ تعالیٰ ان انسانی جذبات سے بہت بلند ہے۔ اس کے معنے سورۃ محمدؐ کی اس آیت سے واضح ہو جاتے ہیں جہاں کہا گیا ہے ذَالِکَ بِاَنَّھُمْ اتَّبَعُوْا مَآ اَسْخَطَ اللّٰہَ وَکَرِھُوْا رِضْوَانَہٗ فَاَحْبَطَ اَعْمَالَھُمْ (۴۷/۲۸)۔ ان کی ہلاکت اور تباہی اس لئے ہے کہ یہ لوگ ان باتوں کی پیروی کرتے ہیں جو احکام خداوندی کے مطابق نہیں ہیں۔ جو باتیں ان احکام کے مطابق ہیں یہ انہیں ناپسند کرتے ہیں (کَرِھُوْا رِضْوَانَہٗ) یعنے کَرِھُوْا مَا نَزَّلَ اللّٰہُ (۴۷/۲۶)۔ وحی خداوندی کو نا پسند کرتے ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ان کے اعمال بلا نتیجہ رہ جاتے ہیں۔ یعنی وہ خوشگوار نتائج مرتب نہیں کرتے جن کی یہ توقع لگائے رہتے ہیں۔ لہذا مَا اَسْخَطَ اللّٰہَ کے معنے ہوئے وہ امور جو قوانین خداوندی کے مطابق نہیں اور جن کا نتیجہ حبطِ اعمال ہے۔ اس میں غصے اور ناراضگی کا کوئی سوال نہیں۔ (۳/۱۶۱) میں بھی سَخَطٌ بمقابلہ رِضْوَانٌ آیا ہے۔ سورۃ مائدہ میں اَنْ سَخِطَ اللّٰہُ کی تفسیر مَا قَدَّمَتْ لَھُمْ اَنْفُسُھُمْ (۵/۸۰) نے کر دی۔ یعنے مکافات عمل۔ (مزید تفصیل کے لئے عنوان ر۔ض۔ی اور غ۔ض۔ب دیکھئے)۔

س د د

اَلسَّدُّ۔ روک۔ ہر حائل ہونے والی چیز۔ پہاڑ۔ بعض نے کہا ہے کہ اَلسَّدُّ (س پر زبر سے) وہ روک ہے جو انسانوں کی بنائی ہوئی ہو اور اَلسُّدُّ (س پر پیش سے) وہ پہاڑ یا روک ہے جو قدرتی طور پر بنی ہوئی ہو*۔ لیکن بعض اس فرق کو نہیں مانتے۔ خود قرآن کریم میں پہاڑ کے لئے بھی اَلسَّدُّ آیا ہے (۱۸/۹۳) اور انسانوں کی بنائی ہوئی روک کے لئے بھی (۱۸/۹۴)۔ سورۃ یٰسٓ میں یہ لفظ ایسے اسباب اور عناصر کے لئے آیا ہے جو انسان کی عقل و بصیرت کے راستے میں حائل ہو جائیں۔ (۳۶/۹)۔

ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی ہیں کسی چیز کے شگاف کو بھر دینا اور اسے ہموار کر دینا۔ سَدَّدَ الرُّمْحَ۔ نیزے کو سیدھا کر دیا۔ درست کر دیا۔ سَدَّدَ الثُّلْمَ۔ شگاف بھر دیا*۔ رَجُلٌ سَدِیْدٌ۔ سیدھی راہ پر چلنے والا آدمی۔ اَمْرٌ سَدِیْدٌ۔ ایسی بات جو ہر اس خلا کو بھر دے جو حقیقت کے بارے میں رہ گیا ہو۔ متوازن اور درمیانہ بات جس میں

*تاج۔

نہ افراط ہو نہ تفریط* - قرآن کریم میں قَوْلاً سَدِیْداً آیا ہے (۹/۴ و ۳۳/۷۰) نہایت متوازن ، سیدھی ، صاف بات - جس بات سے کوئی خلا باقی نہ رہے - قرآن کریم کی تعلیم یہ ہے کہ کبھی مبہم ، پُر پیچ و خم ، ذو معنے ، ٹیڑھی میڑھی بات نہ کرو - ہمیشہ سیدھی ، صاف ، واضح ، محکم ، متوازن اور ٹھیک ٹھیک معنے بتا دینے والی بات کرو - ایسی بات جس کا تعلق براہ راست صحیح مقصد سے ہو - لایعنی اور بے فائدہ نہ ہو - سَہْمٌ سَدِیْدٌ اس تیر کو کہتے ہیں جو ٹھیک نشانے پر جا کر لگے* - ڈپلومیسی کی باتیں قرآن کریم کی سیدھی اور واضح تعلیم کے خلاف ہیں -

(سَدٌّ اور رَدْمٌ کے فرق کے لئے دیکھئے عنوان ردم)

س د ر

اَلسِّدْرُ - بیری کے درختوں کو کہتے ہیں - (واحد سِدْرَۃٌ) - جب بیری کا درخت بہت گھنا ہو جائے تو اس کا سایہ بہت عمدہ ہوتا ہے اور ہرب، صحرا کی سخت گرمی کے ستائے ہوئے اس کے سایہ میں آرام کرتے ہیں - اس اعتبار سے جنت کے آرام اور نعماء کے لئے اسے بطور مثال بیان کیا گیا ہے* - فِیْ سِدْرٍ مَّخْضُوْدٍ (۵۶/۲۸) - ایسے درخت جو پھل سے لدے ہوئے ہوں اور جن کے سایے نہایت گھنے ہوں - یا ایسے درخت جن کا سایہ تو ہو لیکن کانٹے نہ ہوں - بلا خلش آرام و راحت - سایہ کے اعتبار سے دوسری جگہ ہے - وَّ نُدْخِلُهُمْ ظِلاًّ ظَلِیْلاً (۴/۵۷) - اس میں آرام اور خوشحالی ، دونوں پہلو مضمر ہیں - بیری کا درخت ریگستانی اور سخت گرمی کے خشک علاقہ میں بھی سرسبز رہتا ہے لیکن بقول راغب، اس کا پھل زیادہ مفید غذائیت نہیں رکھتا - قرآن کریم میں ہے کہ جب سبا کا علاقہ سیلاب کے بعد بنجر ہو گیا تو وہاں سر سبز و شاداب باغات کی جگہ کچھ بیر کے درخت اُگ آئے - وَّ شَیْءٍ مِّنْ سِدْرٍ قَلِیْلٍ (۳۴/۱۶) - سَدِیْرُ النَّخْلِ کھجوروں کے جھنڈ کو کہتے ہیں** -

سَدِرَ - وہ متحیر ہوا - سخت گرمی کی وجہ سے اسے دکھائی نہ دیا - اَلسَّادِرُ - اُس شخص کو کہتے ہیں جو شدت گرمی کی وجہ سے متحیر ہو جائے - سَدِرَ بَصَرُہٗ سَدَرًا - شدت گرمی کی وجہ سے اس کی نگاہیں حیران و ششدر رہ گئیں** - ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی حیرت اور اضطراب رائے کے ہیں - اَلسَّادِرُ - متحیر کو کہتے ہیں -

---

*راغب - **تاج -

سورۃ النجم میں مقام نبوت کی کیفیات کو مثالی انداز میں بیان کیا گیا ہے ۔ (واضح رہے کہ وحی کی کیفیت صرف مثالاً اور تشبیہاً ہی بیان کی جاسکتی ہے ، کیونکہ کوئی غیر نبی ، وحی کی کیفیت اور ماہیت کو جان اور پہچان نہیں سکتا ۔ وہ صرف اس کے پیغام کو سمجھ سکتا ہے) ۔ اس سلسلہ میں کہا گیا ہے کہ نبی کو جس مقام سے وحی ملتی ہے وہاں انسانی عقل و فکر کے لئے سوائے انتہائی حیرت کے اور کچھ نہیں ہوتا ۔ عقل انسانی اُس مقام کی ماہیت کو قطعاً نہیں سمجھ سکتی ۔ ایسے وہاں حیرت ہی حیرت ہوتی ہے ۔ اس کے لئے قرآن کریم نے عِنْدَ سِدْرَةِ الْمُنْتَهٰى (۵۳/۱۴) کے الفاظ استعمال کئے ہیں ۔ یعنی وہ مقام جہاں تحیر اپنی انتہا تک پہنچ جائے ۔ اس کی تشریح ان الفاظ سے کردی کہ اِذْ يَغْشَى السِّدْرَةَ مَا يَغْشٰى (۵۳/۱۶) ۔ جب سدرہ پر چھا رہا تھا جو کچھ چھا رہا تھا ۔ یعنی یہ تمہارے (غیر از نبی انسانوں کے) لئے ممکن نہیں کہ تم جان سکو کہ وہ کیا کیفیت تھی ۔ تمہاری نگاہ کے لئے وہ تحیر کی فراوانی تھی جس نے ساری فضا کو ڈھانپ رکھا تھا ۔ لیکن اس کے باوجود مَا زَاغَ الْبَصَرُ وَمَا طَغٰى (۵۳/۱۷) ۔ نبی کی آنکھ کسی قسم کا دھوکا نہیں کھاتی ۔ وہ حقائق کو بالکل واضح اور غیر مبہم طور پر دیکھتی ہے ۔ لیکن صرف انہی حقائق کو جو اسے دکھائے جاتے ہیں ۔ وہ ان کی حد سے آگے نہیں بڑھتی ۔ بڑھ سکتی ہی نہیں ۔ کیونکہ اسے یہ چیزیں اس کے ذاتی کسب و ہنر سے نہیں ملتیں کہ وہ جس قدر زیادہ محنت کرتا جائے آگے بڑھتا جائے ۔ اس پر حقائق منکشف کئے جاتے ہیں، جس قدر منکشف کئے جانے مقصود ہوں ۔ انسانوں کے مقابلہ میں تو علم نبوت (وحی) لاانتہا ہوتا ہے لیکن علم خداوندی کے مقابلہ میں اس کی ایک حد ہوتی ہے جس سے آگے وہ نہیں بڑھ سکتا ۔ راغب نے اِذْ يَغْشَى السِّدْرَةَ مَا يَغْشٰى (۵۳/۱۶) کی تشریح میں لکھا ہے کہ اس میں اس مکان کی طرف اشارہ ہے جہاں رسول اللہؐ کو افاضۂ الٰہیہ سے نوازا گیا تھا ۔ اور بعض لوگوں کا خیال ہے کہ یہ وہی درخت ہے جس کے نیچے رسول اللہؐ نے بیعت لی تھی (۴۸/۱۸) ۔ لیکن ظاہر ہے کہ اس میں مکان کے مقابلہ میں کیفیت کا مفہوم زیادہ موزوں ہے ۔ ویسے اَلسَّدِيْرُ پانی کے منبع ، نہر اور دریا کو بھی کہتے ہیں* ۔ السَّدَرُ ۔ سمندر کو کہتے ہیں* ۔ اس اعتبار سے بھی اس کا مفہوم علم الٰہی کا سرچشمہ (وحی) زیادہ مناسب معلوم ہوتا ہے ۔ لہذا سِدْرَةُ الْمُنْتَهٰى وحی کا سرچشمہ ہے جہاں عقل انسانی کے لئے تحیر ہی تحیر ہوتا ہے لیکن چشم نبوت اسے صاف طور پر دیکھتی ہے ۔

*تاج ۔

س د س

آلسُّدْسُ ۔ السُّدُسُ ۔ چھٹا حصہ (۱/۶) ۔ آلسِّتُّ ۔ اصل میں سِدْسٌ تھا۔ آخری سین کو تاءُ سے بدل کر سِدْتٌ* کر لیا ۔ پھر درمیانی دال کو تاء سے بدل کر ادغام کرکے سِتٌّ بنا لیا ۔ یعنی چھ ۔ سِتُّوْنَ ۔ سِتِّیْنَ ۔ ساٹھ*۔ (۵۵/۳) سَادِسٌ چھٹا (۱۸/۲۲)۔ (نیز دیکھئے عنوان س۔ت۔ت)

س د ی

آلسُّدَیٰ ۔ کپڑے کے تانے کو کہتے ہیں ۔ قَدْ آسْدَیٰ الثَّوْبَ وَسَدَّاہُ ۔ اس نے کپڑے کا تانا سیدھا کر دیا ۔ آلسُّدَیٰ ۔ وہ اونٹ جنہیں بغیر چرواہے کے چھوڑ دیا جائے کہ وہ جدھر جی چاہے خود ہی منہ اٹھائے چرتے پھریں*۔ ذَھَبَ کَلَامُہُ سُدًی ۔ اسکی بات بیکار چلی گئی**۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ سدی کے معنی کسی چیز کو بے قید چھوڑ دینا اور جدھر اس کا منہ اٹھے ادھر چلے جانا ہیں ۔ خلیل نے کہا ہے کہ سَدْوٌ ۔ بچوں کے گولیوں اور اخروٹوں سے کھیلنے پر بولا جاتا ہے جس میں وہ ان چیزوں کو اپنے ہاتھوں سے پھینکتے اور چھوڑ دیتے ہیں ۔

قرآن کریم میں ہے آیَحْسَبُ الْاِنْسَانُ آنْ یُتْرَکَ سُدًی (۷۵/۳۶) ۔ اس مادے کے بنیادی معنوں پر غور کیجئے ۔ کپڑا بُننے کے لئے تانے اور بانے دونوں کی ضرورت ہوتی ہے ۔ تنہا تانا سو گز لمبا بھی کیوں نہ ہو وہ بیکار ہوتا ہے ۔ جب تک اس میں بانا نہ بُنا جائے وہ کپڑا نہیں بن سکتا ۔ تاریخ عالم پر نگاہ ڈالئے ۔ انسان نے جو نظام بھی بنایا وہ یا تنہا تانا تھا یا تنہا بانا ۔ وہ کبھی ''روحانیت،، حاصل کرنے کیلئے خانقاہوں ، تجرد گاہوں ، اور سمادھیوں کی طرف چلا گیا ۔ اور کبھی خالص دنیا دار بن کر حکومت وسلطنت کی طرف آ گیا ۔ اس نے روح اور مادہ ۔ آتما اور پراکرتی ۔ دین اور دنیا ۔ مذہب اور سیاست کو ہمیشہ الگ الگ رکھا ۔ نتیجہ اس کا یہ کہ اسکی کوششیں کبھی کامیاب نہ ہو سکیں ۔ یا وہ تانا رہیں اور یا بانا ۔ وہ ثَوْبٌ (کپڑا) کبھی نہ بن سکیں ۔ قرآن کریم نے آ کر کہا کہ یہ غلط ہے کہ انسان کی زندگی تانا ہی تانا ہے ۔ اس میں بانے کی بھی ضرورت ہے ۔ تانے اور بانے کے امتزاج سے ثَوْبٌ بنیگا ۔ (ثَوَابٌ اور ثَوْبٌ کا مادہ ایک ہی ہے ۔ دیکھئے ث ۔ و ۔ ب) لیکن اس کیلئے ضروری ہے کہ وہ سمجھے کہ اس کے سامنے زندگی کا کوئی عظیم مقصد ہے ۔ وہ یونہی شتر بے مہار نہیں

* تاج ۔ ** محیط

کہ اس پر کسی کی گرفت ہی نہ ہو۔ اس پر خدا کے قانون مکافات کی کڑی گرفت ہے ۔ وہ اسکے احاطے سے باہر نہیں جا سکتا ۔

لہذا صحیح زندگی دین اور دنیا کے تانے اور بانے سے خدا کے مقرر کردہ ڈیزائن کے مطابق کپڑا بننے میں ہے ۔ یہی ثواب کا کام ہے ۔ تنہا عقل انسانی کبھی کامیابی تک نہیں پہنچا سکتی ۔ یہ صرف تانا تانا ہی رہتی ہے ۔ جب اس سے وحی الٰہی کی روشنی میں کام لیا جائے تو پھر اس سے صحیح تعمیری نتائج مرتب ہوتے ہیں ۔

اب دوسرے معنوں پر غور کیجئے ۔ یعنی اونٹوں کو بغیر چرواہے کے چھوڑ دینا ۔ خدا نے انسان کو اسطرح شتر بے مہار نہیں چھوڑ دیا ۔ اسکی راہ نمائی کے لئے اپنی طرف سے وحی کا ضابطہ بھیجا ہے ۔ لہذا ، اسکی زندگی کی صحیح روش یہ ہے کہ اُس ضابطہ کے مطابق چلے ۔ اگر یہ اس کے مطابق نہیں چلے گا تو اسکی کوششیں بیکار چلی جائینگی ۔ کائنات میں ، انسان کے علاوہ دیگر تمام مخلوق کی یہ حالت ہے کہ ان کے لئے جو قوانین خدا نے بنائے ہیں ، وہ ان پر چلنے کے لئے مجبور ہیں ۔ اسی کو ان اشیاء کی فطرت (یا جبلت) کہتے ہیں ۔ خدا نے انسان کے لئے بھی قوانین بنائے ہیں لیکن اسے اس کا اختیار دیا گیا ہے کہ وہ چاہے تو ان قوانین کے مطابق زندگی بسر کرے اور چاہے ان کے خلاف چلا جائے ۔ لیکن اس کے یہ معنی نہیں کہ وہ ان قوانین کے خلاف جا کر اپنے اعمال کا نتیجہ اپنی مرضی کے مطابق مرتب کرے ۔ وہ ان قوانین کی پرواہ کرے یا نہ کرے ، اس کے اعمال کے نتائج بہرحال ان قوانین کے مطابق مرتب ہونگے ۔ وہ اس باب میں آزاد نہیں چھوڑ دیا گیا ۔ اس پر خدا کے قانون مکافات کی گرفت بڑی سخت ہے ۔

س ر ب

اَلسَّرْبُ ۔ چرنے والا اونٹ ۔ مویشی اور چوپائے ۔ اَلسَّرَبُ ۔ بہتا پانی ۔ اَلسَّرْبَۃُ ۔ راستہ ۔ جانے کی جگہ ۔ اَلسَّارِبُ ۔ زمین میں آزادی سے اپنی مرضی پر چلا جانے والا * ۔ سورۃ رعد میں ہے سَارِبٌ بِالنَّھَارِ (۱۳/۱۰) دن میں چلنے والا * ۔ سورۃ کہف میں ہے فَاتَّخَذَ سَبِیْلَہٗ فِی الْبَحْرِ سَرَبًا (۱۸/٦۱) ۔ اس (مچھلی) نے دریا میں اپنا راستہ بنا لیا ۔ اس نے دریا کی راہ لی ۔ اس لفظ میں کھلم کھلا آزادی سے چلنے کا تصور ہوتا ہے ۔ چنانچہ ازہری نے کہا ہے سَرَبَتِ الْاِبِلُ کے معنے ہیں اونٹوں کا کھلم کھلا جدھر

---

* تاج و راغب ۔

چاہے آزادی سے چلے جانا *۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس مادہ میں وسعت وکشادگی اور زمین پر چلنے کا مفہوم ہے۔ السَّرَبُ اور السَّرِبُ اس پانی کو کہتے ہیں جو مشکوں وغیرہ سے بہ نکلے۔ راغب نے کہا ہے کہ اس کے معنی ہیں ٹپکنے والا پانی۔

سَرَابٌ۔ وہ چمکتی ہوئی ریت جو صحرا میں بہتے پانی کی طرح دکھائی دیتی ہے اور جوں جوں پیاسا اسکی طرف بڑھتا ہے وہ آگے آگے سرکتی چلی جاتی ہے۔ پیاسا چلتے چلتے تھک جاتا ہے لیکن اسے پانی کا گھونٹ تک نہیں ملتا*۔ قرآن کریم نے غلط روش زندگی پر چلنے والوں کے اعمال کو سَرَابٌ سے تشبیہ دی ہے۔ (۲۴/۳۹) ۔ وہ دور سے، بہتے ہوئے پانی کی طرح دکھائی دیتے ہیں (بڑے دلفریب اور خوشنما نظر آتے ہیں)۔ لیکن جب پیاسا ان کے پاس آتا ہے تو وہ اسکی تسکین کا سامان بننے کی بجائے الٹا ہلاکت کا موجب بن جاتے ہیں۔ راغب نے کہا ہے کہ السَّرَبُ نشیب کی طرف جانے کے لئے بولا جاتا ہے۔ نیز نشیبی جگہ کے لئے بھی **۔ اس میں بھی آزادی سے چلنے کا پہلو موجود ہے، کیونکہ نشیب کی طرف پانی بلا رکاوٹ بہے جاتا ہے۔

س ر ب ل

سَرَابِيْلُ (جمع ۔ اس کا واحد سِرْبَالٌ ہے)۔ کرتہ ۔ یا زرہ یا ہر وہ لباس جو (بدن کے بالائی حصہ میں) پہنا جائے۔ مثلاً قمیص***۔ چنانچہ قرآن کریم میں یہ لفظ دونوں معنی میں آیا ہے۔ وَجَعَلَ لَكُمْ سَرَابِيْلَ تَقِيْكُمُ الْحَرَّ وَسَرَابِيْلَ تَقِيْكُمْ بَأْسَكُمْ (۱۶/۸۱) "اس نے تمہارے لئے پوشاک بنائی جو تمہیں گرمی سے محفوظ رکھتی ہے اور زرہیں بنائیں جو جنگ میں تمہاری حفاظت کرتی ہیں"۔ سورۃ ابراہیم میں سرکش مخالفین اسلام کے متعلق آیا ہے کہ جب ان کی قوتیں ٹوٹ جائینگی تو سَرَابِيْلُهُمْ مِنْ قَطِرَانٍ (۱۴/۵۰) ۔ ان کی زرہیں تارکول کی بن جائینگی۔ یعنی وہ زرہیں جو انہیں دشمن کے حملے سے محفوظ رکھنے کے لئے تھیں تارکول کی طرح ان کے جسم سے چمٹ کر وبال جان بن جائینگی۔

س ر ج

اَلسِّرَاجُ۔ چراغ کو کہتے ہیں اور ہر اس چیز کو جو روشنی دے*۔ (بعض کے نزدیک یہ درحقیقت فارسی لفظ چراغ کا معرب ہے)۔ اَلسِّرَاجُ۔

*تاج و راغب ۔ **راغب ۔ ***تاج و محیط۔

آفتاب کو بھی کہتے ہیں *۔ قرآن کریم میں ہے جَعَلَ فِیْہَا سِرَاجاً (۲۵/۶۱) ۔ بمعنے سورج ۔ اور سورة نوح میں ہے وَجَعَلَ الشَّمْسَ سِرَاجاً (۷۱/۱۶) ۔ سورج کو چراغ بنایا ۔ خود نبی اکرم ؐ کو بھی سِرَاجاً مُنِیْراً (۳۳/۴۶) کہا گیا ہے ۔ اَلسَّرْجُ ۔ زین ۔ اَلسَّرَّاجُ ۔ زین ساز ۔ نیز بہت جھوٹ بولنے والا * ۔

ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی حسن ، زینت اور جمال کے ہوتے ہیں ۔ چراغ کو اَلسِّرَاجُ اسکی روشنی اور خوبصورتی کی وجہ سے کہتے ہیں ۔ زین کو بھی اَلسَّرْجُ اس لئے کہتے ہیں کہ اس سے جانور کی زینت ہوتی ہے ۔ سَرَّجَ وَجْہَہٗ ۔ اس نے اپنے چہرے کو حسین بنایا ۔

س ر ح

اَلسَّرْحُ ۔ اَلتَّسْرِیْحُ ۔ جانوروں کو صبح کے وقت چراگاہ میں چرنے کیلئے کھلا چھوڑ دینا ** ۔ (حِیْنَ تَسْرَحُوْنَ (۱۶/۶)) ۔ سَرَاحٌ اور تَسْرِیْحٌ کے معنے ہیں قیدِ نکاح سے آزاد کر دینا ۔ طلاق دے کر رخصت کر دینا ** ۔ وَاُسَرِّحْکُنَّ سَرَاحاً جَمِیْلاً (۳۳/۲۸) ۔ " اور تمہیں حسن کا رانہ انداز سے رخصت کردوں "۔ سورة بقرہ میں یہ لفظ اِمْسَاکٌ (روک رکھنے) کے مقابلہ میں آیا ہے ۔ فَاِمْسَاکٌ بِمَعْرُوْفٍ اَوْتَسْرِیْحٌ بِاِحْسَانٍ (۲/۲۲۹، ۲۳۱) ۔ یعنے قاعدے کے مطابق (نکاح کے ذریعے) روک رکھنا یا قیدِ نکاح سے آزاد کر دینا ۔ طلاق دیکر رخصت کر دینا ۔

ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی کھل جانے اور چل پڑنے کے ہوتے ہیں ۔

س ر د

اَلسَّرْدُ ۔ چیزوں کو ایک دوسرے کے ساتھ مسلسل جوڑتے چلے جانا (ابن فارس) ۔ جیسے زرہ کے حلقوں کو ایک دوسرے میں داخل کرتے ہیں ۔ چنانچہ زرہ بنانے اور جوتے یا دوسرے چمڑے کے سینے کیلئے بھی یہ لفظ آتا ہے ۔ اَلسَّرْدُ ۔ سوراخ ۔ اَلْمِسْرَدُ ۔ سوراخ کرنے کا اوزار ۔ اَلسَّرِیْدَۃُ ۔ چمڑے کا تسمہ جس سے جوتے وغیرہ کو سیا جائے ** ۔

قرآن کریم میں زرہ بنانے کیلئے وَقَدِّرْ فِی السَّرْدِ (۳۴/۱۱) آیا ہے ۔ یعنے اسکا اندازہ رکھو کہ سوراخ بالکل ٹھیک ہوں اور ان میں زرہ کی کڑیاں درست آتی جائیں ۔

---

* تاج و راغب ۔ ** تاج ۔

س ر د ق

اَلسُّرَادِقُ ۔ وہ شامیانہ یا سائبان جو گھر کے صحن کے اوپر کھینچ دیا جائے ۔ یا ہر وہ دیوار ، قنات یا اور ایسی ہی چیز جو کسی چیز کے گردا گرد کھینچدی جائے اور وہ اسے اپنے احاطہ میں لے لے ۔ اسی بنا پر ، اس دھوئیں کو بھی کہتے ہیں جو بلند ہو کر کسی جگہ چھا جائے اور اسطرح اسے گھیر لے * ۔ ابن فارس نے اَلسُّرَادِقُ کے معنے غبار بتائے ہیں ۔ راغب نے لکھا ہے کہ یہ فارسی لفظ ہے جو معرب بنا لیا گیا ہے ** ۔

قرآن کریم میں ہے نَارًا اَحَاطَ بِهِمْ سُرَادِقُهَا (۱۸/۲۹) ۔ جہنم کی آگ جسکے سائبان انہیں چاروں طرف سے گھیر لینگے ۔ جہنم ان پر چاروں طرف سے محیط ہو جائیگی ۔

س ر ر

اَلسِّرُّ ۔ جو بات دل میں چھپائی جائے* ۔ اس مادہ کے بنیادی معنی چھپانے کے ہیں لیکن کبھی اس کے معنے اس کی ضد (یعنی ظاہر کرنے) کے بھی ہوتے ہیں*** ۔ السُّرُوْرُ وَ الحُبُوْرُ وَ الْفَرَحُ ۔ ملتے جلتے الفاظ ہیں لیکن اَلسُّرُوْرُ اس خوشی کو کہتے ہیں جو دل ہی دل میں پوشیدہ رہے اور الحُبُوْرُ اس خوشی کے لئے آتا ہے جس کے اثرات چہرے پر نمایاں ہو جائیں ۔ یہ دونوں قابل تعریف صفات ہیں ، مگر فَرَحٌ اس خوشی کو کہتے ہیں جس سے انسان میں اکڑفوں پیدا ہو جائے۔ اس لئے یہ مذموم ہوتی ہے**** ۔ سَرَّهُ ۔ اسے خوش کیا (۹/۲۰) مَسْرُوْرٌ ۔ خوش (۸۴/۹-۱۳) ۔

اَلسِّرُّ ۔ ہر چیز کی اصل و بنیاد ۔ نیز اس کا خالص حصہ ، اندرونی مغز ۔ اس لئے عمدہ زمین کے لئے بھی یہ لفظ آتا ہے ۔ سَرَارَةُ الوَادِیْ ۔ وادی کا بہترین حصہ ۔ اَلْمَسَرَّةُ ۔ پھولوں کا تختہ ۔ اَلسَّرَّاءُ ۔ آسودگی و خوش حالی ۔ عیش و عشرت کی فراوانی* ۔ بمقابلہ اَلضَّرَّاءُ (۷/۹۵) ۔ اَلسُّرِّیَّةُ ۔ وہ لونڈی جس سے جنسی تعلقات قائم کئے جائیں ۔ اَلسَّرِیْرُ ۔ حکومت و سلطنت ۔ تخت ۔ پلنگ* ۔ کیونکہ یہ آسودہ حال لوگوں ہی کے پاس ہوتا ہے ۔

سورۃ انعام میں سِرٌّ بمقابلہ جَهْرٌ آیا ہے (۶/۳) ۔ لہذا وہاں سِرٌّ کے معنے محض راز ہیں ۔ سورۃ بقرۃ میں مَا يُسِرُّوْنَ وَمَا يُعْلِنُوْنَ (۲/۷۷) آیا ہے ۔ وہاں بھی اس کے معنے پوشیدہ طور پر باتیں کرنے کے ہیں ۔

---

* تاج ۔ ** راغب ۔ ***لطائف اللغۃ نیز ابن فارس ۔ ****محیط ۔

سورۃ ابراھیم میں ھے وَيُنْفِقُوا مِمَّا رَزَقْنٰهُمْ سِرًّا وَّعَلَانِيَةً (۱۴/۳۱) ۔ خدا نے انہیں جو کچھ دے رکھا ھے ، خواہ وہ ان کی غیر مرئی صلاحیتیں ھوں اور خواہ وہ سامان زندگی جو سامنے نظر آ جاتا ھے ، وہ ان سب کو نوع انسان کی ربوبیت کے لئے کھلا رکھتے ھیں ۔ (یا اس کا مطلب ھوگا) اعلان کرتے ھوئے اور خاموشی سے ۔ سورۃ طٰہٰ میں ھے يَعْلَمُ السِّرَّ وَأَخْفٰى (۲۰/۷) ۔ وہ راز کو بھی جانتا ھے اور اس سے بھی زیادہ چھپی ھوئی چیز کو بھی ۔

سورۃ یونس میں ھے وَأَسَرُّوا النَّدَامَةَ (۱۰/۵۴) ۔ وہ (عذاب کو دیکھ کر) ندامت کو چھپائینگے ۔ بعض اھل لغت نے کہا ھے کہ یہ اضداد میں سے ھے اور اس کے معنی ظاھر کرنے کے بھی آتے ھیں ۔ لیکن ھمارے نزدیک اس مقام پر چھپانے کے معنی زیادہ موزوں ھیں ۔

سُرُرٌ کا لفظ تختوں کے لئے آیا ھے جن پر بیٹھتے ھیں (۱۵/۴۷)۔ اس کا واحد سَرِيْرٌ ھوتا ھے ۔ اور سَرَائِرُ کے معنے ھوتے ھیں راز کی باتیں ۔ (۸٦/۹) اس کا واحد سَرِيْرَةٌ ھوتا ھے ۔ اِسْرَارٌ ۔ راز کی بات کرنا ۔ دوسروں سے چھپا کر خفیہ بات کرنا (۴۳/۳٦) ۔

س ر ع

اَلسَّرَعُ ۔ اَلسِّرْعُ ۔ اَلسُّرْعَةُ ۔ تیز ھونا ۔ جلد واقع ھونا۔ تیزی ، جلدی ۔ سَرُعَ ۔ وہ تیز ھوا ۔ اس نے جلدی کی ۔اَلسَّرَعَانُ مِنَ الْخَيْلِ ۔ آگے نکل جانے والے گھوڑے* ۔ ابن فارس نے کہا ھے کہ اس کے بنیادی معنی جلدی کرنے کے ھوتے ھیں ۔

قرآن کریم میں اکثر مقامات پر آتا ھے اللّٰہُ سَرِيْعُ الْحِسَابِ (۲/۲۰۲) ''اللّٰہ جلد حساب لینے والا ھے''۔ خدا کے قانون مکافات کی رو سے انسان کا ھر عمل اسی وقت اپنا اثر پیدا کرنا شروع کر دیتا ھے لیکن اس کے اس اثر اور نتیجہ کا ظہور ایک خاص وقت پر جا کر ھوتا ھے ۔ جیسے بیج میں نشو و نما تو اسی وقت شروع ھو جاتی ھے لیکن وہ درخت ایک وقت کے بعد جا کر بنتا ھے اور اس میں پھل بھی ایک وقت کے بعد جا کر لگتا ھے ۔ عمل کا فوراً اثر مرتب کرنے لگنا ، قانون مکافات کے سَرِيْعُ الْحِسَابِ ھونے کا نتیجہ ھے ۔ اس سے انسان کی ذات اُسی وقت متاثر ھونا شروع ھو جاتی ھے ۔ اس میں قطعاً دیر نہیں لگتی ۔

---

*تاج ۔

سورۃ قؔ میں سِرَاعًا (۵۰/۴۴) آیا ہے - جس کے معنی تیزی سے (واقع ہو جانے کے) ہیں - سَارَعَ - مُسَارَعَۃٌ و سِرَاعًا - جلدی کرنا - ایک دوسرے سے سبقت کرنا - وَسَارِعُوْٓا اِلٰی مَغْفِرَۃٍ (۳/۱۳۲) - ''حفاظت کی طرف (جانے میں) جلدی کرو'' -

س ر ف

اَلسَّرَفُ - جو حد مقرر کی گئی ہو اس سے آگے بڑھ جانا - زیادتی کرنا* - نادانی کرنا (ابن فارس) - سورۃ بنی اسرائیل میں ہے - فَلَا یُسْرِفْ فِّی الْقَتْلِ (۱۷/۳۳) - وہ قتل میں حد سے تجاوز نہ کرے - یعنی قانون نے جو حدود مقرر کی ہیں ان کے اندر رہے - یا وہ نادانی سے از خود ہی قاتل کو قتل نہ کر دے - بلکہ معاملہ عدالت کے سپرد کرے - اِنَّہٗ کَانَ مَنْصُوْرًا سے یہ واضح ہو جاتا ہے - سورۃ الفرقان میں انفاق کے ضمن میں یہ لفظ قَتَرَ کے مقابلہ میں آیا ہے (۲۵/۶۷) - قَتْرٌ - بخل اور خرچ میں تنگی کو کہتے ہیں - لہذا اسراف ، تفریط کے مقابلہ میں افراط ہوگی - یعنی جس مقام پر جسقدر ضرورت ہو وہاں اس سے زیادہ خرچ کر دینا - اس لئے کہتے ہیں سَرِفَتِ الْاُمُّ وَلَدَھَا - ماں نے اپنے بچے کو بہت زیادہ دودھ پلا پلا کر اس کی صحت خراب کر دی* - اس سے اس کے معنے ہوئے ہیں کسی چیز کا اس طرح ضائع ہو جانا کہ جو فائدہ اس سے حاصل ہونا تھا وہ حاصل نہ ہو - چنانچہ سَرَفُ الْمَاءِ - اُس پانی کو کہتے ہیں جو زمین پر اس طرح بہ جائے کہ اس کا کوئی فائدہ نہ ہو اور وہ بیکار چلا جائے* - اسی لئے کسی چیز کو اس مقام میں نہ رکھنا جس کے لئے وہ بنی ہے اِسْرَافٌ کہلاتا ہے - اور ایسا کرنے والے کو مُسْرِفٌ کہا جاتا ہے - قوم لوط کو اسی لئے قَوْمٌ مُّسْرِفُوْنَ (۷/۸۱) کہا گیا ہے ، کیونکہ وہ افزائشِ نسل کے مادہ کو اسجگہ (لواطت میں) صرف کرتے تھے جس کے لئے وہ بنا نہیں اور اس طرح سے اس کا مقصد حاصل نہیں ہوتا تھا - وہ پانی کھیتوں (حَرْثٌ) کو سیراب کرنے کے بجائے دوسری جگہ ضائع ہو جاتا تھا - زمین میں فساد برپا کرنے والوں کو بھی مُسْرِفِیْنَ کہا ہے (۲۶/۱۵۱) -

تصریحات بالا سے ظاہر ہے کہ اسراف ، صرف بیجا (فضول خرچی) ہی کو نہیں کہتے - اس سے مطلب یہ ہے کہ انسانی توانائی ، وقت ، دولت یا کسی اور صلاحیت کا ایسے مقصد کے لئے نہ خرچ کرنا جس سے تعمیری نتیجہ مرتب ہو ، بلکہ اسے تخریبی مقصد کے لئے یا بے فائدہ ضائع کر دینا -

(اِسْرَافٌ اور تَبْذِیْرٌ کے فرق کے لئے ب - ذ - ر کا عنوان بھی دیکھئے) -

*تاج -

س ر ق

سَرِقَۃٌ ۔ کسی دوسرے آدمی کی محفوظ چیز کو خفیہ طریقہ سے لے لینا ۔ اگر اسے کھلے بندوں لے لیا جائے تو یہ عمل اِخْتِلَاسٌ ۔ اِسْتِلَابٌ اِنْتِھَابٌ کہلائیگا ۔ اور اگر مالک اپنی چیز کی حفاظت کے لئے مدافعت کرے لیکن پھر بھی وہ چیز اس سے بزور لے لی جائے تو اسے غَصْبٌ کہینگے* ۔ سَرِقَ الشَّیْءُ ۔ چیز مخفی ہوگئی ۔ هُوَ یَسْتَارِقُ النَّظَرَ اِلَیْهِ ۔ وہ اس کی طرف دزدیدہ نگاھوں سے دیکھ رہا ھے ۔ اِنْسَرَقَ عَنْهُمْ ۔ چپکے سے کھسک جانا* ۔

سورۃ یوسف میں ھے اِنَّ ابْنَکَ سَرَقَ ($\frac{12}{81}$) ۔ ''تیرے بیٹے نے چوری کی ھے'' ۔ اَلسَّارِقُ ۔ ($\frac{5}{38}$) چوری کرنے والا ۔ اِسْتَرَقَ السَّمْعَ ۔ چوری چھپے سننے کی کوشش کرلنا* ($\frac{15}{18}$) ۔ اسی کو ($\frac{37}{10}$) میں خَطِفَ الْخَطْفَۃَ کہا گیا ھے ۔ یعنی اڑتی ہوئی بات کو اچک لینا ۔ (ذرا سی بات کہیں سن پانا اور اس پر قیاس آرائیوں کی عمارت تعمیر کر دینا) ۔

(سَارِقٌ کی سزا قَطْعِ یَد ($\frac{5}{38}$) کے لئے دیکھئے عنوان ق ۔ ط ۔ ع) ۔

س ر م د

اَلسَّرْمَدُ ۔ دائم ۔ وہ ھمیشہ رھنے والی چیز جس کا سلسلہ منقطع نہ ہو ۔ لَیْلٌ سَرْمَدٌ ۔ طویل رات ۔ رازی نے کہا ھے کہ سَرْمَدٌ کا اشتقاق سَرْدٌ سے ہوا ھے جسکے معنی پے در پے اور لگاتار کے ھیں ۔ اس پر میم داخل کرکے مبالغہ کا فائدہ حاصل کر لیا گیا ھے ۔ اس اعتبار سے اسکے معنی مسلسل اور لگاتار رھنے والی مدت کے ہونگے** ۔ ابن فارس نے بھی یہی کہا ھے ۔ صاحب محیط کے نزدیک اَلسَّرْمَدِیُّ اس چیز کو کہتے ھیں جس کا نہ اول ہو نہ آخر*** ۔

قرآن کریم میں ھے ۔ اِنْ جَعَلَ اللّٰهُ عَلَیْکُمُ اللَّیْلَ سَرْمَدًا ($\frac{28}{71}$) ۔ زجاج نے کہا ھے کہ اس کے معنے یہی ھیں کہ اگر اللہ تم پر رات کو بہت طویل کر دے** ۔ یا رات ھی رات رھے اور دن نہ آئے ۔

س ر ی (و)

اَلسُّرَی ۔ رات کے بیشتر حصے میں چلنا ۔ سَرَی ۔ یَسْرِیْ ۔ سُرًی ۔ رات کو چلنا ۔ اَسْرَی ۔ اِسْرَاءٌ ۔ رات کو چلنا ۔ اَلسَّرِیَّۃُ ۔

*تاج و محیط ۔ ** تاج و راغب ۔ *** محیط ۔

فوج کا دستہ، کیونکہ وہ رات کو چلتا ہے تاکہ دشمن کو خبر نہ ہونے پائے*۔ اَلسَّرِیُّ۔ چھوٹی نہر جو نخلستان کی طرف جاتی ہو**۔ سورۃ مریم میں ہے تَحْتَکِ سَرِیًّا (۱۹/۲۴)۔ تیرے نشیب کی طرف ایک پانی کی نہر ہے۔ سَرَاۃٌ۔ ہر چیز کا بلند حصہ۔ وسیع زمین۔

راغب نیز صاحب محیط نے لکھا ہے کہ سُبْحٰنَ الَّذِیْ اَسْرٰی بِعَبْدِہٖ (۱۷/۱) میں اَسْرٰی کا لفظ سَرٰی یَسْرِیْ (رات کے وقت چلنا) سے نہیں بلکہ سَرَاۃٌ سے ہے۔ یعنی خدا اپنے بندے کو سَرَاۃٌ (کشادہ زمین کی طرف لے گیا) جیسے اَجْبَلَ کے معنے ہوتے ہیں وہ پہاڑ پر چلا گیا۔ اور اَتْھَمَ کے معنے، وہ تہامہ میں چلا گیا***۔ مکہ کی سرزمین حضورؐ (اور آپ کی جماعت) پر تنگ ہو چکی تھی اس لئے آپ نے مدینہ کی طرف ہجرت فرمائی جہاں کی فضا آپ کے مشن کے لئے وسیع اور کشادہ تھی۔ لیکن ہمارا خیال ہے کہ یہ سَرٰی۔ یَسْرِیْ ہی سے ہے اور لَیْلاً تاکید مزید کے لئے ہے۔ تاریخ بتاتی ہے کہ حضورؐ نے ہجرت رات کے وقت فرمائی تھی۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ یہ مردانگی وسخاوت کے معنوں میں (س۔ ر۔ ی) اور (س۔ ر۔ و) دونوں سے آتا ہے۔ نیز اَلسَّرْوُ کے معنی ہیں کسی چیز کو کھولنا۔ سَرَاۃُ النَّھَارِ۔ دن کی بلندی کو کہتے ہیں۔

س ط ح

اَلسَّطْحُ۔ گھر کی چھت جو ہموار ہو۔ ہر چیز کا اوپر کا حصہ۔ سَطَحَ۔ یَسْطَحُ۔ اسنے بچھا دیا۔ پھیلا دیا نیز ہموار کیا، لٹا دیا۔ پچھاڑ دیا۔ اَلْمَسْطَحُ۔ ہموار جگہ جس پر کھجوریں خشک کی جاتی ہیں****۔

قرآن کریم میں ہے وَاِلَی الْاَرْضِ کَیْفَ سُطِحَتْ (۸۸/۲۰)۔ زمین، کہ وہ کسطرح بچھائی گئی ہے۔ اس کی اوپر کی سطح کسطرح ہموار بنائی گئی ہے۔

س ط ر

سَطَرَ۔ یَسْطُرُ۔ سَطْرًا (سیدھی لائنوں میں) لکھنا* ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی کسی شے کے صف بند ہونے کے ہیں۔ جیسے کتاب کی سطور اور درختوں کی لائن۔ اسی سے اس کے معنی لکھنے کے آتے ہیں۔ نٓ۔ وَالْقَلَمِ وَمَا یَسْطُرُوْنَ (۶۸/۱)۔ نٓ (جسے عام طور پر

---

* تاج۔ ** محیط *** راغب و محیط **** تاج و راغب۔

دوات سمجھا جاتا ہے) اور قلم اور جو کچھ لکھنے والے لکھتے ہیں (یعنے قرآن کریم اور وہ تمام سرمایہ علم جسے انسان لکھ کر محفوظ کر لیتا ہے) اس حقیقت پر شاہد ہیں ۔ سورۃ بنی اسرائیل میں ہے کَانَ ذَالِکَ فِی الْکِتَابِ مَسْطُوْرًا (۱۷/۵۸) ۔ یعنی لکھا ہوا ۔ یہی معنے مُسْتَطَرٌ کے ہیں (۵۴/۵۳) ۔ اَلْاَسَاطِیْرُ (اُسْطُوْرَۃٌ کی جمع ہے) قصے کہانیاں * ۔ (بعض نے کہا ہے کہ یہ لغت روم ہے بعنے، Story) ۔ قرآن کریم میں ہے کہ جب ان لوگوں سے کہا جائے کہ تاریخی شواہد پر غور کرو اور سوچو کہ جس قسم کے کام تم کرتے ہو ، جن قوموں نے اس قسم کے کام کئے تھے ان کا انجام کیا ہوا ؟ تو یہ کہدیتے ہیں کہ اِنْ ھٰذَا اِلَّآ اَسَاطِیْرُ الْاَوَّلِیْنَ (۶/۲۵) ۔ یہ پچھلے لوگوں کی کہانیاں ہیں ۔ ہم سے ان کا کوئی تعلق نہیں ۔ حالانکہ ان سے کہا یہ جارہا تھا کہ یہ خدا کا قانون ہے جو تم پر بھی اسی طرح صادق آئیگا جسطرح اقوام سابقہ پر صادق آیا تھا ۔ یہی حال مسلمانوں کا ہے ۔ قرآن کریم نے قانون مکافات عمل کے ضمن میں جو کچھ اپنے اولین مخاطبین کے متعلق کہا ہے، جب ان سے اُس کا ذکر کرو تو یہ کہدیتے ہیں کہ یہ بات یہودیوں کے متعلق ہے ۔ یہ عیسائیوں کے متعلق ہے ۔ یہ مشرکین مکہ کے متعلق ہے ۔ یہ منافقین مدینہ کے متعلق ۔ یعنی ان کے نزدیک سارے کا سارا قرآن انہی لوگوں سے متعلق تھا جو اُسوقت اسکے مخاطب تھے ۔ اب ہم سے اس کا کوئی تعلق نہیں ۔ ہم سے اگر اسکا کوئی حصہ متعلق ہے تو صرف وہ جس میں جنت کا وعدہ کیا گیا ہے ۔ (یعنے وہ جنت جو ان کے خیال میں محض مسلمان کہلانے سے مل جائیگی !) ۔

چونکہ قصے کہانیاں عام طور پر جھوٹی ہوتی ہیں اسلئے سَطَّرَ ۔ تَسْطِیْرًا کے معنے ہیں جھوٹی باتیں جمع کرنا * ۔ نیز چونکہ سَطْرٌ سیدھی لکیر کو کہتے ہیں اسلئے اَلسَّطْرُ کے معنے تلوار سے سیدھی کاٹ کاٹنے کے بھی آتے ہیں ۔ اَلسَّاطُوْرُ ۔ چھری کو کہتے ہیں * ۔

سَیْطَرَ عَلَیْہِ کے معنے ہیں کسی کے سر پر سطر کی طرح سیدھے کھڑے رہنا ۔ اسی سے اَلْمُسَیْطِرُ ہے جسکے معنے نگران ۔ محافظ ۔ متسلط ۔ داروغہ کے آتے ہیں ** ۔ قرآن کریم میں ہے لَسْتَ عَلَیْھِمْ بِمُصَیْطِرٍ (۸۸/۲۲) یا ۔ اَمْ ھُمُ الْمُصَیْطِرُوْنَ (۵۲/۳۷) ۔ اسکے معنے مُتَسَلِّطُوْنَ کے ہیں ۔ یعنی جو کسی پر مسلط ہوں ۔

قرآن کریم میں اسے صاد سے لکھتے لیکن سین سے پڑھتے ہیں ۔ جو سین، طاء سے پہلے آئے اسے س اور صاد دونوں سے لکھنا جائز ہے * ۔

* تاج ۔ ** راغب ۔

س ط و

سَطَا عَلَیْہِ وَبِہٖ ۔ سَطْوًا وَسَطْوَۃً ۔ کسی پر حملہ کرنا یا سخت گرفت کے ساتھ غلبہ حاصل کرنا ۔ راغب نے کہا ہے کہ کسی پر ہاتھ اٹھا کر حملہ کرنے کو سَطْوَۃٌ کہتے ہیں ۔ دراصل یہ سَطَا الْفَرَسُ سے ماخوذ ہے جسکے معنے ہیں گھوڑے کا اپنی اگلی ٹانگیں اٹھا کر پچھلی ٹانگوں پر کھڑے ہونا *۔ قرآن کریم میں ہے یَکَادُوْنَ یَسْطُوْنَ (۲۲/۷۲) ۔ قریب ہے کہ وہ ان پر حملہ کر دیں ۔ ان پر دست درازی کریں ۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی قہر و غلبہ اور بلندی کے ہوتے ہیں ۔ سَطَا الْمَاءُ کے معنی ہیں پانی بہت بڑھ گیا ۔

س ع د

سَعَدَہُ اللّٰہُ ۔ یَسْعَدُہٗ ۔ سَعْدًا ۔ اللہ نے اس کی مدد کی اور اسے توفیق دی ۔ سَعِدَ ۔ یَسْعَدُ ۔ سَعْدًا ۔ سَعَادَۃً ۔ وہ مبارک اور با برکت ہوا ۔ اَلْاِسْعَادُ ۔ اَلْمُسَاعَدَۃُ ۔ معاونت کرنا ۔ مدد دینا ۔ فراء نے اس کے معنے بندہ کا اپنے رب کے حکم اور مرضی کی متابعت کرنا بتائے ہیں ۔ اَلسَّاعِدُ ۔ کہنی سے پہنچے تک ہاتھ کا حصہ ۔ (ساری قوت اور برکت اسی میں ہوتی ہے) ۔ اسی سے اَلْمُسَاعَدَۃُ کے معنے ایک دوسرے کی مدد کرنا ہیں ۔ یہ اس لئے کہ جب لوگ کسی کام میں ایک دوسرے کی مدد کے لئے جاتے ہیں تو وہ ایک دوسرے کی کلائی پر ہاتھ رکھ کر چلتے ہیں *۔

قرآن کریم میں سَعِیْدٌ، شَقِیٌّ کے مقابلہ میں آیا ہے ۔ وَمِنْھُمْ شَقِیٌّ وَّسَعِیْدٌ (۱۱/۱۰۵) نیز شَقِیَ، سَعِدَ کے مقابلہ میں (۱۱/۱۰۶-۱۰۸) ۔ یعنی سعید وہ ہے جسے قانون خداوندی کی رفاقت نصیب ہو جائے اور وہ اس کی کلائی پکڑ کر چلے ۔ اور شَقِیٌّ وہ ہے جو اس سے محروم ہو ۔ اس سے بڑا بدقسمت اور کون ہو سکتا ہے جسے قانون خداوندی کی تائید نصیب نہ ہو ۔

راغب نے اَلسَّعْدُ والسَّعَادَۃُ کے معنے امور الٰہی کا، بھلائی اور خیر تک پہنچنے میں، انسان کی مدد کرنا لکھے ہیں ۔ ہمارے ہاں عام طور پر کہا جاتا ہے کہ فلاں چیز سعد ہے اور فلاں نحس، فلاں دن سعد ہے اور فلاں نحس ۔ یہ محض توہم پرستی ہے جسے مٹانے کے لئے قرآن کریم آیا تھا ۔ کوئی

* تاج و راغب ۔

چیز یا کوئی دن نہ سعد ہے نہ نحس - جس کام کا نتیجہ (قانون خداوندی کے مطابق) اچھا ہے، وہ عمل سعد ہے - اور جس دن اس کام کا اچھا نتیجہ سامنے آئے وہ دن مسعود ہے - اسی طرح جس کام کا نتیجہ (قانون مکافات کی رو سے) مضر ہو وہ عمل منحوس ہے، اور جس دن وہ نتیجہ سامنے آئے وہ دن نحس۔ دنوں (ھفتہ - اتوار - سوموار وغیرہ) کی اپنی حقیقت ہی کچھ نہیں۔ یہ تو ہم نے اپنی سہولت کی خاطر، وقت (Time) کے گز پر گرہیں لگا رکھی ہیں تاکہ حساب میں آسانی رہے - نہ ہی ستاروں میں کوئی سعد یا نحس ہے - ستارے، قوانینِ خداوندی کے مطابق گردش کرتے ہیں - ان کی گردش کا انسان کی ''قسمت'' سے کیا تعلق؟ اقبال کے الفاظ میں

تیرے مقام کو انجم شناس کیا سمجھے
کہ خاکِ زندہ ہے تو تابعِ ستارہ نہیں

(مزید تفصیل ن - ح - س کے عنوان میں ملیگی) -

س ع ر

اَلسَّعْرُ - آگ کی حرارت - تپش - نیز بھوک - ابن عرفہ نے کہا ہے کہ سُعْرٌ ایسی بات کو کہتے ہیں جو کسی کو پھونک ڈالے - فراء نے اسکے معنے کوفت، مشقت اور سخت تکلیف کے کئے ہیں - سَعَرْنَاهُمْ بِالنَّبْلِ - ہم نے انہیں تیر مار مار کر بھون کر رکھ دیا*۔ مَسْعُوْرٌ اس آدمی کو کہتے ہیں جسے سخت بھوک اور پیاس لگی ہو*۔ نیز جو پیٹ بھرا ہونے کے باوجود کھانے کا حریص ہو - جس کی نیت نہ بھرے** - اَلسُّعَارُ - آگ کی حرارت اور سخت بھوک کو بھی کہتے ہیں - السَّعِیْرُ - آگ - بھڑکتی ہوئی آگ* -

سورۃ نساء میں ہے اِنَّ الَّذِیْنَ یَاْکُلُوْنَ اَمْوَالَ الْیَتٰمٰی ظُلْمًا اِنَّمَا یَاْکُلُوْنَ فِیْ بُطُوْنِهِمْ نَارًا ۔ وَسَیَصْلَوْنَ سَعِیْرًا ($\frac{4}{10}$) - ''جو لوگ یتیموں کا مال ظلم سے کھاتے ہیں وہ اپنے پیٹ میں آگ کھاتے ہیں - اور وہ بھڑکانی ہوئی آگ میں داخل ہونگے'' - موت کے بعد ان کا کیا حشر ہوگا، یہ وہاں کی بات ہے - اس دنیا میں ایسے لوگوں کی کیفیت یہ ہوجاتی ہے کہ شدتِ حرص سے ان کی نیت ہی نہیں بھرتی اور وہ مفت کے مال کے پیچھے دیوانوں کی طرح پھرتے ہیں - چنانچہ سُعْرٌ اور سُعُرٌ کے معنے دیوانگی کے بھی آتے ہیں* -

*تاج - **محیط -

ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی کسی چیز کے مشتعل ہونے ، بھڑک جانے اور بلند ہو جانے کے ہوتے ہیں ۔ اس اعتبار سے سَعَّرَ اور سَعَّرَ النَّارَ وَ الْحَرْبَ ۔ کے معنے ہیں آگ اور جنگ کو بھڑکا دینا*۔ وَ اِذَا الْجَحِیْمُ سُعِّرَتْ (۸۱/۱۲) ۔ ''اور جب دوزخ بھڑکائی جائیگی''۔ اس میں عذاب کی شدت کی طرف اشارہ ہے ۔ یعنی جس قدر کسی کے جرائم زیادہ سنگین اسی قدر ان کے نتائج زیادہ تباہ کن ۔

س ع ی

سَعْیٌ کے معنے قصد و ارادہ کرنے ، تیز چلنے ، کے ہیں ۔ کسی کام کے لئے اہتمام ، دوڑ دھوپ اور کوشش کرنے کے لئے بھی استعمال ہوتا ہے ۔ صاحب محیط نے کہا ہے کہ جب یہ لفظ جانے یا دوڑنے کے معنوں میں استعمال ہوتا ہے تو اس کے بعد اِلٰی آتا ہے ۔ جیسے فَاسْعَوْا اِلٰی ذِکْرِ اللّٰہِ ۔ اور جب یہ کام کرنے کے معنوں میں استعمال ہوتا ہے تو اس کے بعد لام آتا ہے ۔ جیسے سَعٰی لَھَا** ۔ اَلسَّاعِیْ کوشش کرنے والا ۔ نیز صدقات وصول کرنے والے کو بھی کہتے ہیں ۔

قرآن کریم میں یہ لفظ دوڑنے کے معنوں میں (۲/۲۶۰) میں آیا ہے نیز (۲۰/۲۰) میں ۔ کوشش اور محنت کرنے کے معنوں میں (۱۹/۱۲) میں ۔ یعنی دوڑ دھوپ ۔ جد و جہد ۔ تگ و تاز ۔ سعی و عمل وغیرہ ۔

قرآن کریم میں ایک آیت ہے لَیْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَا سَعٰی (۵۳/۳۹) ''انسان کے لئے وہی ہے جس کے لئے وہ سعی و کاوش کرے'' ۔ یہ آیت ایک عظیم اصول کی طرف راہ نمائی کرتی ہے ۔ معاشیات (Economics) کی دنیا ہمیں یہ بتاتی ہے کہ انسان کو صرف محنت (Labour) کا معاوضہ لینا چاہئے۔ سرمایہ (Capital) کا معاوضہ ، یا یونہی بغیر محنت ۔ کچھ لے لینا ، جائز نہیں۔ اس اصول پر معاشیات کا جو نظام تعمیر ہوتا ہے اس کا اندازہ اہل بصیرت لگا سکتے ہیں ۔

معاشرت اور تمدن کی دنیا میں اس اصول نے یہ بتا دیا کہ معاشرہ میں فرد کا مقام اس کی محنت کے اعتبار سے متعین کرنا چاہئے ، نہ کہ خاندانی یا اسی قسم کی دیگر اضافی نسبتوں سے ۔

''مذہب'' کی دنیا میں اس اصول نے یہ بتا دیا کہ نجات و سعادت ، صرف انسان کی اپنی کوشش کا نتیجہ ہے ۔ یہ کسی کی سفارش سے نہیں مل

* تاج ۔ ** تاج و محیط و راغب ۔

سکتی - نیز اس نے یہ بھی بتا دیا کہ یہ عقیدہ کہ ہر بچہ اپنے اولین ماں باپ کے گناہ کا بوجھ لیکر پیدا ہوتا ہے- یا پچھلے جنم کے جرائم کی پاداش میں مبتلا ہوتا ہے ، باطل ہے - انسان سفید لوح(Clean Slate) لے کر پیدا ہوتا ہے اور جس قدر وہ سعی و عمل کرے اسی قدر وہ زندگی کی خوشگواریوں کا اهل بن جاتا ہے -

نیز اس اصول نے سیاست کی دنیا میں یہ کہدیا کہ ہر انسانی بچے کو سعی و عمل کا یکساں میدان ملنا چاهئے - اس باب میں نہ کسی کو رعایات ملنی چاهئیں اور نہ هی کسی کے راستے میں رکاوٹیں پیدا کرنی چاهئیں -

آپ نے دیکھا کہ یہ اصول کسقدر عظیم انقلاب کا منشور ہے؟

س غ ب

سَغَبَ - یَسْغُبُ - وسَغِبَ یَسْغَبُ - سَغْبًا - ومَسْغَبَۃً - تھکن کے ساتھ بھوکا ہونا - (راغب نے پیاس کا اضافہ بھی کیا ہے) ابن فارس نے اس مادہ کے بنیادی معنی بھوک بتائے ہیں اور المَسْغَبَۃُ کے معنے قحط - قرآن کریم نے کہا ہے اِطْعَامٌ فِیْ یَوْمٍ ذِیْ مَسْغَبَۃٍ (۹۰/۱۴) "ایسے وقت میں انسانوں کی خوراک کا انتظام کرنا جب بھوک اور مشقت عام ہورہی ہو" - قرآن کریم نے اس پروگرام (نظام) کو پہاڑی پر چڑھنے سے تعبیر کیا ہے (۹۰/۱۱-۱۴) - فی الحقیقت یہ چیز کہ انسان محنت اور مشقت سے کمائے اور اپنی محنت کے ماحصل میں سے فقط اپنی ضروریات کے مطابق لے کر باقی ماندہ ضرورت مندوں کی ضرورت پوری کرنے کے لئے عام کر دے ، بالخصوص ایسے زمانے میں جب چاروں طرف بھوک هی بھوک نظر آ رهی ہو ، مِنْ عَزْمِ الْاُمُوْرِ ہے - اسی سے انسانی ذات کی نشو و نما ہوتی ہے اور یہی اسلام کا مقصود ہے -اسی کو نظامِ ربوبیت کا قیام کہتے ہیں - (سورة البلد کی یہ آیات -(۹۰/۱۱-۱۶) -نظام ربوبیت کےسلسلہ میں عظیم حقائق کی مظہر ہیں - ان کا گہری نظر سے مطالعہ کرنا چاهئے - (تفصیل میری کتاب "نظام ربوبیت" میں ملے گی) -

س ف ح

سَفَحَ الدَّمَ - اس نے خون بہایا - خون گرایا - سَفَحَ الدَّمْعَ - اس نے آنسو بہائے - سَفَحَ الدَّمْعُ - آنسو بہ پڑے (لازم و متعدی) - اس سے

*تاج و راغب -

اَلْمُسَافَحَةُ کے معنے زنا کرنے کے آتے ھیں ،کیونکہ اس میں مادہ منویہ کو یونہی ضائع کرکے بہادیا جاتا ھے ۔ چنانچہ جاھلیت میں جب لوگ کسی عورت کو شادی کا پیغام دیتے تھے تو اَنْکِحِیْنِیْ کہتے تھے اورجب زنا کے لئے پیغام دیتے تھے تو سَافِحِیْنِیْ کہتے تھے۔ اَلسَّفِیْحُ ۔ جوئے کے تیروں میں سے چوتھا تیر جس پر کوئی نشان نہیں ھوتا تھا اور نہ ھی اس کا کوئی حصہ ھوتا تھا ۔ نہ ھی اس پر کوئی تاوان دینا پڑتا تھا ۔ یہ بلا نتیجہ رھتا تھا* ۔

قرآن کریم نے مرد اور عورت کے جنسی اختلاط کے سلسلہ میں پہلے ان عورتوں کی فہرست دی ھے جن سے نکاح حرام ھے ۔ اس کے بعد کہا ھے کہ ان کے علاوہ دیگر عورتیں تمہارے لئے حلال ھیں بشرطیکہ اس تعلق کی شکل مُحْصِنِیْنَ غَیْرَ مُسَافِحِیْنَ (۴/۲۴) ھو۔ مُحْصِنِیْنَ کا مفہوم (ح ۔ ص ۔ ن) کے عنوان میں بیان ھو چکا ھے ۔ پہلے اسے ایک نظر دیکھ لیجئے ۔مُسَافِحِیْنَ کے معنی ھونگے ، مادہ منویہ کو بہا دینے کے لئے۔ اس سے قرآن کریم ایک عجیب حقیقت کی طرف راھنمائی کرتا ھے ۔ پہلے آپ یہ دیکھئے کہ نکاح اور زنا کے جنسی تعلق میں فرق کیا ھے ۔ شہوانی لذت تو دونوں میں ھوتی ھے لیکن اول الذکر صورت میں یہ لذت مقصود بالذات نہیں ھوتی ۔ مقصود افزائش نسل ھوتا ھے ۔ لیکن زنا میں لذت مقصود بالذات ھوتی ھے اور زنا کار (مرد اور عورت دونوں) کی خواھش یہ ھوتی ھے کہ استقرار حمل نہ ھو۔ یہ معنی ھیں ''مادہ منویہ کو بہا دینے کی خاطر'' ۔ لہذا جنسی اختلاط کی وہ شکل جس میں انسان نکاح کی ذمہ داریوں سے پہلو تہی کرے ۔ انہیں (Avoid) کرے۔ اور مقصود محض جذبہ شہوانی کی تسکین ھو ، قرآن کریم کی رو سے جائز نہیں قرار پاسکتی ۔

اسی سورۃ میں اگلی آیت میں قرآن کریم نے مُحْصَنٰتٍ غَیْرَ مُسٰفِحٰتٍ وَّ لَا مُتَّخِذٰتِ اَخْدَانٍ (۴/۲۵) کہا ھے ۔ اخدان کے لئے دیکھئے عنوان (خ ۔ د ۔ ن) ۔ مطلب اس سے چھپی آشنائی ھے ۔ (اگرچہ یہ لفظ اس زمانے کی لونڈیوں کے سلسلہ میں آیا ھے لیکن اطلاق اس کا عام ھے) ۔ ان تین اصطلاحات کا مفہوم حسب ذیل ھوگا ۔

(i) مُحْصِنِیْنَ ۔ جنسی اختلاط کی وہ شکل جس میں نکاح کی تمام حدود و قیود ، حقوق و فرائض، غرض و غایت کو ملحوظ رکھا جائے ۔

*تاج ۔

(ii) اَلسِّفَاحُ ۔ وہ جنسی اختلاط جس میں مُحْصِنِیْنَ کی شکل نہ ہو ، خواہ کوئی معاشرہ اسے اپنے ہاں معروف (Recognised) ہی قرار کیوں نہ دے لے ۔ اور

(iii) اِتِّخَاذِ اَخْدَانٍ ۔ اختلاط کی وہ شکل جو اس معاشرہ میں بھی معروف نہ ہو۔

قرآن کریم کی رو سے صرف شکل (i) جائز ہے ۔

س ف ر

اَلسَّفْرُ ۔ کے بنیادی معنے ہیں کسی چیز سے پردہ اٹھا کر اسے واضح اور بے نقاب کر دینا ۔ صاحب محیط نے لکھا ہے کہ اَلسَّفْرُ کسی چیز کے ظاہری حصہ کے واضح کر دینے کو کہتے ہیں اور اَلْفَسْرُ (جس سے تفسیر ہے) کے معنے ہیں کسی چیز کے اندورنی حصہ کو کھول کر واضح کر دینا * ۔ بہرحال اس کے بنیادی معنی بے نقاب کرنا ، واضح اور روشن کرنا ہیں ۔ سَفَرَتِ الْمَرْاَۃُ ۔ عورت نے اپنے چہرے سے نقاب الٹ دی ** ۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی کھل جانے ۔ چھٹ جانے اور صاف ہو جانے کے ہیں ۔

اسی جہت سے اَلسَّفْرُ کے معنے عوۃ ہیں جھاڑو دینا ۔ اَلْمِسْفَرَۃُ ۔ جھاڑو کو کہتے ہیں ۔ نیز سَفَرَ کے معنے پراگندہ کر دینا ہیں ، جیسے سَفَرَتِ الرِّیْحُ الْغَیْمَ ۔ ہوا نے بادلوں کو منتشر کر دیا ۔ اسی سے اَلسَّافِرُ ۔ سفر کرنے والے (مسافر) کو کہتے ہیں ۔ اَلسُّفْرَۃُ ۔ مسافر کا کھانا جو سفر کیلئے تیار کیا جائے ۔ اس کے بعد اسکا اطلاق توشہ دان پر ہونے لگا ۔ اور پھر دسترخوان کو بھی سُفْرَۃٌ کہنے لگے ** ۔

سَفِیْرٌ ۔ قوم کے درمیان صلح کرانے والا ** ۔ اس اعتبار سے کہ وہ دونوں فریقوں کے دل کی بات کو باہر نکال کر معاملہ کو صاف کرا دیتا ہے ۔ اَلسِّفَارَۃُ وَالسَّفَارَۃُ ۔ قوم کے درمیان اصلاح یا صلح کی کوشش کرنا ** ۔ اَلسِّفْرُ ۔ بڑی کتاب یا وہ کتاب جو حقائق کو روشن کرتی ہے ۔ اسکی جمع اَسْفَارٌ ہے (۶۲/۵) سَفَرَ الْکِتَابَ سَفْرًا ۔ کتاب کو لکھا ** ۔ سَافِرٌ ۔ لکھنے والا (اسکی جمع ہے اَلسَّفَرَۃُ)۔ اَسْفَرَ الصُّبْحُ ۔ صبح روشن ہوئی ۔

* محیط ۔ ** تاج ۔

قرآن کریم میں ہے وَالصُّبْحِ اِذَا اَسْفَرَ (۳۴/۷۴)۔ ”جب صبح اچھی طرح روشن ہو جائے“۔ دوسری جگہ ہے وُجُوْہٌ یَوْمَئِذٍ مُّسْفِرَۃٌ (۳۸/۸۰)۔ ”کچھ چہرے اس دن تابناک ہونگے“۔ اسی سورۃ میں ذرا پہلے ہے بِاَیْدِیْ سَفَرَۃٍ (۱۵/۸۰)۔ ”لکھنے والوں کے ہاتھوں میں“۔ سورۃ بقرۃ میں عَلٰی سَفَرٍ (۱۸۴/۲) آیا ہے۔ یعنی حالت سفر میں۔

س ف ع

سَفْعٌ - کے معنی ہیں پکڑ کر کھینچنا۔ جھلسا دینا۔ داغ لگانا۔ نشان لگانا۔ نیز تھپڑ مارنے کو بھی کہتے ہیں۔ سَفَعَ بِنَاصِیَتِہٖ وَبِرِجْلِہٖ۔ اسے پیشانی کے بال یا ٹانگ پکڑ کر کھینچا *۔ قرآن کریم میں ہے لَنَسْفَعًا بِالنَّاصِیَۃِ (۱۵/۹۶)۔ ہم بالضرور اسے پیشانی کے بالوں سے پکڑ کر کھینچ لیں گے۔ سختی سے گھسیٹینگے۔ یعنی یہ بڑے بڑے مخالفین آخرالامر ذلیل و خوار ہو کر مغلوب ہو جائینگے اور شکست کھا جائینگے۔ ذلت کے لحاظ سے اَلسُّفْعَۃُ اس کوڑے کرکٹ کے ڈھیر کو کہتے ہیں جو کھنڈروں میں پڑا رہتا ہے۔ اصل میں یہ لفظ سیاہی مائل رنگ کے لئے استعمال ہوتا ہے *۔ راغب نے سَفْعٌ کے معنے گھوڑے کی پیشانی کے سیاہ بال پکڑنے کے لکھے ہیں۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی دو ہیں (۱) رنگ (سیاہی مائل) اور (۲) ہاتھ سے کسی چیز کو پکڑ لینا۔

س ف ک

سَفْکٌ - بہانا، عموماً خون بہانے کے لئے استعمال ہوتا ہے **۔ اَلسَّفَّاکُ - بہت زیادہ خون بہانے والا۔ نیز قادرالکلام آدمی کو بھی کہتے ہیں *۔ قرآن کریم میں یَسْفِکُ الدِّمَآءَ (۳۰/۲) آیا ہے۔ یعنی خونریزی کریگا۔

س ف ل

اَلسُّفْلُ - (س کی زیر اور پیش سے) پستی۔ یہ عِلْوٌ اور عُلْوٌ (بلندی) کی ضد ہے۔ اَلْاَسْفَلُ - بہت نیچے۔ یہ اَعْلٰی کی نقیض ہے۔ سِفْلَۃُ النَّاسِ - کمینے لوگ۔ نیچے درجے کے لوگ *۔ نیز عرب السَّفِلَۃُ خاص طور پر اُس آدمی کو بھی کہتے تھے جسے کھانے کی دعوت دی جائے اور وہ میزبان کے ہاں سے کچھ چرا کر لیجائے ***۔

قرآن کریم میں قوم لوط کے عذاب کے متعلق کہا ہے جَعَلْنَا عَالِیَہَا سَافِلَہَا (۸۲/۱۱)۔ اسکے اوپر کے طبقے کو نیچے کا طبقہ بنا دیا۔ تہہ وبالا

* تاج۔ ** تاج و محیط۔ *** محیط۔

کردیا منافقین کے متعلق ہے کہ وہ فِی الدَّرْکِ الْاَسْفَلِ مِنَ النَّارِ (۴/۱۴۵)۔ ”جہنم کے سب سے نچلے حصہ“ میں رہتے ہیں۔ قلبی اضطراب کی بدترین حالت میں دن گزارتے ہیں۔ اس دنیا میں بھی ان کی یہ حالت ہے اور مرنے کے بعد بھی وہ بدترین عذاب میں ہونگے۔ فَوْقٌ کے مقابلہ میں اَسْفَلُ (۸/۴۲) میں آیا ہے۔ اَسْفَلَ سَافِلِیْنَ (۹۵/۵)۔ پست سے پست تر۔ ذلیل ترین۔

س ف ن

سَفَنَ الشَّیْءَ۔ یَسْفِنُہٗ سَفْنًا۔ کسی چیز کو چھیلنا یا اوپر سے گھس دینا۔ سَفِیْنَۃٌ اسی سے مشتق ہے۔ اسکے معنے کشتی کے ہیں۔ (شاید اس لئے کہ شروع میں کشتیاں اس طرح بنائی جاتی تھیں کہ درخت کے بہت بڑے تنے کو چھیل چھیل کر اسمیں بیٹھنے کی جگہ بنا لیتے تھے۔ یا پھر اس لئے کہ جب وہ چلتی ہے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ پانی کو چھیلتی پھاڑتی جا رہی ہے۔ سَفَائِنُ الْبَرِّ۔ اونٹوں کو کہتے ہیں۔ (ریگستانی کشتیاں) *۔

قرآن کریم میں ہے رَکِبَا فِی السَّفِیْنَۃِ (۱۸/۷۱)۔ وہ دونوں کشتی میں سوار ہوئے۔ اَمَّا السَّفِیْنَۃُ (۱۸/۷۹)۔ باقی رہا اس کشتی (کا معاملہ)....

س ف ہ

سَفَہٌ کے معنے ہیں عقل کا ہلکا پن، نادانی، جہالت۔ سَفَّہَہٗ کسی کو بیوقوفی اور جہالت پر آمادہ کرنا۔ کسی کو ہلاک کر دینا۔ سَفِہَ الشَّرَابَ سَفَھًا۔ اسوقت کہتے ہیں جب کوئی آدمی پانی تو بہت پئے لیکن اسکی پیاس نہ بجھے۔ ثَوْبٌ سَفِیْہٌ۔ جھرے اور خراب بنے ہوئے کپڑے کو کہتے ہیں۔ لیکن اس مادہ کے بنیادی معنے حرکت اور اضطراب کے بھی ہیں۔ (جو کم عقلی کی علامت ہوتی ہے)۔ اس لئے زِمَامٌ سَفِیْہٌ اس مہار کو کہتے ہیں جو اونٹنی کے ہلتے رہنے کی وجہ سے مضطرب رہے۔ حرکت و اضطراب اور تلون کی بنا پر ناپختگیٔ عقل و رائے کو سَفَاھَۃٌ کہتے ہیں **۔

حرکت و اضطراب، نیز ناپختگی عقل کی بنا پر قرآن کریم نے ان لوگوں کو سُفَھَاءُ کہا ہے جن کے دل نفسیاتی کشمکش کی آماجگاہ بنے رہتے ہیں۔ جو معاشرہ میں ناہمواریاں پیدا کرتے رہتے ہیں۔ جو ہمیشہ منافقانہ انداز سے دورخی چالیں چلتے ہیں (۲/۱۰-۱۴)۔ یہ لوگ اپنے آپ کو بڑا عقلمند سمجھتے ہیں لیکن قرآن کریم کہتا ہے کہ ان جیسا بے عقل ہی کوئی نہیں کیونکہ یہ اپنی غلط روش کے تباہ کن نتائج کا شعور و احساس نہیں رکھتے (۲/۱۲)۔

*تاج و محیط و راغب۔ **محیط۔

دوسری جگہ سَفِیْہٌ کا لفظ عام کم عقل لوگوں کیلئے استعمال ہوا ہے (۲/۲۸۲) اور (۶/۱۴۱) میں سَفَہاً کے ساتھ بِغَیْرِ عِلْمٍ کے اضافہ نے بتا دیا کہ سَفَاہَۃٌ یہ ہے کہ انسان علم و عقل سے کام نہ لے۔ قرآن کریم کی رو سے سَفَاہَۃٌ (علم و عقل سے کام نہ لینا) بہت بڑا جرم اور سخت مذموم حرکت ہے۔ مومن وہ ہے جو وحی خداوندی کی روشنی میں علم و عقل سے کام لے۔

سَفَاہَۃٍ (۷/۶۶)۔ حماقت۔ بیوقوفی۔ جہالت۔

سورۃ بقرہ میں ہے وَمَنْ یَّرْغَبُ عَنْ مِّلَّۃِ اِبْرَاھِیْمَ اِلَّا مَنْ سَفِہَ نَفْسَہٗ (۲/۱۳۰)۔ ملت ابراھیمی سے اس شخص کے سوا کون بے اعتنائی برت سکتا ہے جس نے اپنی ذات کے بارے میں کبھی غور و فکر سے کام نہ نہ لیا ہو۔ جس نے یہ سوچا ہی نہ ہو کہ ذات کی نشو و نما کیسے ہو سکتی ہے اور یہ کیوں ضروری ہے؟ محیط نے اسکے معنے اپنے نفس کو ذلیل کرنا اور حقیر و بے وقعت سمجھنا کئے ہیں۔ یعنی اپنے نفس کو درخور اعتنا نہ سمجھنا۔ قرآنی تعلیم کا نقطہ ماسکہ، انسانی ذات پر یقین اور اس کے بلند ترین قدر ہونے پر ایمان ہے۔ اگر اس حقیقت کو نظرانداز کر دیا جائے، یا اسے (Seriously) نہ لیا جائے تو پھر خدا پر ایمان بھی کچھ فائدہ نہیں دیتا۔ (تفصیل اسی اجمال کی (ن۔ف۔س) کے عنوان میں ملیگی)

س ق ر

اَلسَّقْرُ۔ آفتاب کی گرمی اور اسکی اذیت۔ سَقَرَتْہُ الشَّمْسُ۔ دھوپ نے اسے پگھلا دیا۔ جھلسا دیا اور اس کے دماغ کو تکلیف پہنچائی۔ اَلسَّاقُوْرُ اس لوہے کو کہتے ہیں جسے تپا کر اس سے جانوروں کو داغ دیتے ہیں۔ نیز اَلسَّتَرُ کے معنے بُعد اور دور ہونے کے بھی ہیں*۔

قرآن کریم میں یہ لفظ جہنم کیلئے آیا ہے۔ ذُوْقُوْا مَسَّ سَقَرَ (۵۴/۴۸)۔ سقر کے ان تھپیڑوں کا مزہ چکھو جو تمہیں زندگی کی خوشگواریوں سے دور (محروم) کر دیتے ہیں۔

س ق ط

سَقَطَ الشَّیْءُ۔ کسی چیز کا گر جانا۔ خواہ (مثلاً) کوئی چھت سے زمین پر آگرے یا کھڑے کھڑے زمین پر گر جائے**۔ سَاقِطَۃٌ چیز کو

* تاج۔ محیط۔ راغب۔ **تاج

لگاتار گرانا *۔ قرآن کریم میں ہے وَمَا تَسْقُطُ مِنْ وَرَقَةٍ (۶/۵۹)۔ کوئی پتہ نہیں گرتا۔ سورۃ مریم میں ہے تُسَاقِطْ عَلَيْكِ رُطَبًا جَنِيًّا (۱۹/۲۵)۔ وہ درخت تجھ پر تازہ کھجوریں لگاتار جھاڑ دیگا۔ سورۃ شعراء میں ہے فَاَسْقِطْ عَلَيْنَا (۲۶/۱۸۷)۔ ہم پر گرا دے۔ سَاقِطًا۔ گرنے والا (۵۲/۴۴)۔

سورۃ اعراف میں بنی اسرائیل کے متعلق ہے وَلَمَّا سُقِطَ فِیْٓ اَیْدِیْهِمْ (۷/۱۴۹)۔ صاحب تاج نے اسکے معنے لکھے ہیں شرمندہ اور متحیر ہونا۔ زجاج نے لکھا ہے کہ اسکے معنے ہیں اپنے کئے پر حسرت اور شرمندگی کے احساس کا پیدا ہونا۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اسکے معنے ندامت سے ہاتھ ملنے کے ہیں *۔ صاحب محیط نے بھی اسکے معنے ندامت ہی کے لکھے ہیں۔ اور یہی معنے قرآن کریم میں بھی واضح ہوتے ہیں۔ یعنے اپنی غلطی اور حماقت کے احساس سے ندامت اور پشیمانی۔ آیت کے معنی ہونگے ''جب وہ پشیمان ہوئے''۔

س ق ف

اَلسَّقْفُ۔ چھت (جمع سُقُفٌ ۴۳/۳۳)۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنوں میں بلند ہونے اور جھکا ہوا ہونے کا مفہوم پایا جاتا ہے۔ اَلسَّقِیْفَةُ۔ ہر وہ جگہ جس پر چھت ہو۔ بالعموم باہر نکلے ہوئے چھپر کو کہتے ہیں۔ عرب آسمان کو بھی سَقْفٌ کہتے ہیں اس لئے کہ ان کے خیال میں وہ زمین کی چھت ہے **۔ سورۃ انبیاء میں ہے وَجَعَلْنَا السَّمَآءَ سَقْفًا مَّحْفُوْظًا (۲۱/۳۲)۔ ''ہم نے آسمان کو محفوظ چھت بنایا''۔ یعنی فضائے کائنات خود محفوظ ہے اور اس کا سلسلہ کچھ اسطرح رکھا گیا ہے کہ اجرام فلکی میں جو ٹوٹ پھوٹ ہوتی ہے وہ بالعموم فضا کے چکر میں آکر پس جاتی ہے اور اسطرح ہم اس کی تباہ کاریوں سے محفوظ رہ جاتے ہیں۔ گویا یہ فضا ہمارے ارضی مکان کے لئے چھت کا کام دیتی ہے۔ ویسے، آسمان کو سقف کہنے میں عربی محاورہ کی بھی رعایت ہے۔ یعنی عرب اسے چھت سے تعبیر کرتے تھے، اس لئے قرآن کریم نے بھی ان کے محاورہ کی رعایت سے اس کے لئے وہی لفظ استعمال کیا۔ معنی اس کے اسطرح کی چھت نہیں جسطرح مکان کی چھت ہوتی ہے۔ اس کا مفہوم اوپر واضح کر دیا گیا ہے۔ سماء کے معنی بھی یہ نیلگوں ''چھت'' نہیں جو ہمیں اپنے سر پر نظر آتی ہے۔ اس سے مراد بلند فضا یا اجرام فلکی ہیں۔ تفصیل (س۔م۔و) کے عنوان میں ملیگی۔

* تاج۔ ** تاج و راغب۔

س ق م

اَلسَّقَامُ - اَلسُّقْمُ - مرض - بیماری - هُوَ سَقِيْمُ الصَّدْرِ عَلَيْهِ - وہ اسکے خلاف دل میں کینہ رکھتا ہے - قَلْبٌ سَقِيْمٌ - ناخوش اور بیزار دل کو کہتے ھیں *-

حضرت ابراهیمؑ کی قوم بت پرست اور ستارہ پرست تھی - حضرت ابراھیمؑ انکے اس شرک کے خلاف انھیں دعوت توحید دیتے تھے - چنانچہ اس ضمن میں قرآن کریم نے کہا ہے کہ فَنَظَرَ نَظْرَةً فِي النُّجُوْمِ - فَقَالَ اِنِّيْ سَقِيْمٌ ($\frac{۳۷}{۸۸}$) - انہوں نے ستاروں کے معبود ہونے پر غور و فکر کیا - اس کا صحیح صحیح اندازہ کیا اور اس کے بعد کہا کہ میں تمہارے ان معبودانِ باطل سے سخت بیزار ہوں - یہ وھی بات ہے جسے دوسری جگہ ان الفاظ میں بیان کیا گیا ہے کہ اِنَّا بُرَءٰٓؤُا مِنْكُمْ وَمِمَّا تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ ($\frac{۶۰}{۴}$)- میں تم سے اور جن کی تم خدا کو چھوڑ کر پرستش کرتے ھو ان سے بیزار ھوں *- اسی کو دوسرے مقام پر لَآ اُحِبُّ الْاٰفِلِيْنَ ($\frac{۶}{۷۶}$) سے تعبیر کیا گیا ہے - یعنی میں ایسے معبودوں کو پسند نہیں کرتا جو ہرآن تغیّر پذیر ہوں -

س ق ی

اَلسَّقْيُ - پلانا - اَلسُّقْيَا - اس سے اسم ہے جس کے معنے ھیں ''پلائی''- اَلسَّقْيُ والْاِسْقَاءُ - تقریباً ایک ھی معنے ہیں - بعض کا خیال ہے کہ سَقْيٌ منہ کے ذریعے پلانے کو اور اِسْقَاءٌ پانی دے دینے یا پانی بتانے کے لئے بولا جاتا ہے - راغب کے نزدیک سَقْيٌ تو یہ ہے کہ کسی کو پینے کی چیز دے دینا اور پلا دینا ، اور اِسْقَاءٌ یہ ہے کہ تم کسی کو پینے کی چیز دیدو خواہ وہ اسے پئے یا نہ پئے - اس لئے اِسْقَاءٌ میں سَقْيٌ سے زیادہ جامعیت ہے - اَلسِّقَايَةُ - پانی پلانے کی جگہ - یا پانی پلانے کا برتن ($\frac{۱۲}{۷۰}$) - یا پانی پلانے کا بندوبست - جیسے ($\frac{۹}{۱۹}$) میں - اَلْاِسْتِسْقَاءُ پینے کے لئے پانی مانگنا یا بارش طلب کرنا - اَلسَّقِيُّ - موسلا دھار برسنے والا بادل** -

سورۃ بقرۃ میں اِسْتَسْقٰى آیا ہے ($\frac{۲}{۶۰}$) جس کے معنے پانی یا بارش طلب کرنے کے ھیں - سورۃ شعراء میں ہے وَالَّذِيْ هُوَ يُطْعِمُنِيْ وَيَسْقِيْنِ ($\frac{۲۶}{۷۹}$) - خدا وہ ہے جو مجھے کھلاتا اور پلاتا ہے - سورۃ نحل میں ہے

* تاج - **تاج و محیط -

نُسْقِيْكُمْ مِمَّا فِيْ بُطُوْنِهٖ (۱۶/۶۶)۔ ”ہم تمہیں اس چیز سے جو ان کے پیٹ میں ہے (دودھ) پلاتے ہیں“۔ سورۃ شمس میں ناقہؑ حضرت صالحؑ کے متعلق ہے نَاقَةَ اللّٰهِ وَ سُقْيٰهَا (۹۱/۱۳)۔ یعنی اللہ کی اونٹنی کا خیال رکھو اور اس کے پانی پلانے کا۔ قصہ حضرت یوسفؑ میں سِقَايَةٌ (۱۲/۷۰) کا لفظ ایسے برتن کے لئے آیا ہے جسے صُوَاعٌ بھی کہا گیا ہے (۱۲/۷۲)۔

س ک ب

سَكَبَ الْمَاءَ وَ الدَّمْعَ۔ اس نے پانی اور آنسوؤں کو بہایا۔ سَكَبَ الْمَاءُ۔ پانی بہا (لازم و متعدی)۔ مَاءٌ سَاكِبٌ وَ مَسْكُوْبٌ۔ وہ پانی جو زمین کے اوپر بہ رہا ہو۔ جسے زمین کھود کر نہ نکالنا پڑے*۔ ارباب لغت نے اس کے معنی اوپر سے گرانے اور بہانے کے بھی کئے ہیں، اس لئے مَاءٌ مَسْكُوْبٌ میں وہ پانی بھی آجاتا ہے جو آبشار کی طرح اوپر سے گرتا ہے۔ قرآن کریم میں مَاءٍ مَسْكُوْبٍ (۵۶/۳۱) میں آیا ہے جہاں کہا گیا ہے کہ جنتی معاشرہ میں سامان زیست، جگر پاش مشقتوں کے بغیر ملیگا (وہاں پانی پینے کے لئے کنواں نہیں کھودنا پڑے گا)۔ لیکن غیر جنتی معاشرہ میں ان چیزوں کے لئے جگر پاش مشقتوں سے گزرنا پڑتا ہے (۲۰/۱۱۷)۔

رَجُلٌ سَكْبٌ۔ سبک روح اور پرنشاط انسان کو کہتے ہیں**۔ فَرَسٌ سَكْبٌ تیز رفتار گھوڑے کو کہتے ہیں۔

س ک ت

اَلسَّكْتُ۔ اَلسُّكُوْتُ۔ خاموش ہونا۔ نہ بولنا۔ سُكُوْتٌ اور صَمْتٌ میں فرق یہ ہے کہ سُكُوْتٌ ان چیزوں کے خاموش ہونے پر بولا جاتا ہے جن میں بولنے کی قدرت ہوتی ہے اور صَمْتٌ میں موخر الذکر شرط نہیں ہے۔ یعنی وہ ہر چیز کی خاموشی پر بولا جاسکتا ہے خواہ وہ بولنے کی طاقت رکھتی ہو یا نہ رکھتی ہو۔ سَكَتَ الْغَضَبُ۔ غصہ ٹھنڈا پڑ گیا*۔

قرآن کریم میں ہے۔ وَ لَمَّا سَكَتَ عَنْ مُّوْسَى الْغَضَبُ (۷/۱۵۴)۔ جب موسیٰ کا غصہ ٹھنڈا ہو گیا۔ راغب نے کہا ہے کہ سُكُوْتٌ میں ایک گونہ سُكُوْنٌ پایا جاتا ہے۔ اس لحاظ سے یہاں غصے کے فرو ہو جانے کے لئے سَكَتَ کا لفظ استعمال کیا گیا ہے***۔

---

*تاج۔ **محیط۔ ***راغب۔

س ک ر

سُکْرٌ - نشہ میں ہونا - راغب نے کہا ہے کہ یہ ایسی حالت ہے جو انسان اور اس کی عقل کے درمیان حائل ہو جاتی ہے - بیشتر یہ اس قسم کی کیفیت کے لئے بولا جاتا ہے جو نشہ آور شراب سے پیدا ہوتی ہے اگرچہ کبھی کبھی ایسی کیفیت غصہ اور عشق سے بھی پیدا ہوجاتی ہے*- ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی حیرت کے ہوتے ہیں - سَکَرٌ - شراب - نشہ آور مشروب (۱۶/۶۷) - سَکْرَۃٌ - غنودگی - بے ہوشی - یہ بھی ایک نشے کی سی کیفیت ہوتی ہے - قرآن کریم میں سَکْرَۃُ الْمَوْتِ آیا ہے (۵۰/۱۹) - یعنی موت کی بے ہوشی - سورۃ نساء میں ہے لَا تَقْرَبُوا الصَّلٰوۃَ وَ اَنْتُمْ سُکَارٰی (۴/۴۳) - "صلوٰۃ کے قریب مت جاؤ جب کہ تم سکر کی حالت میں ہو" - یہاں سُکَارٰی کے عام معنے حالت نشہ کے کئے جاتے ہیں - لیکن لسان العرب میں ہے کہ اس سے مراد سُکْرُ النَّوْمِ یعنے نیند کا غلبہ ہے - سورۃ حج میں سُکٰرٰی کا لفظ ایسے مدہوش لوگوں کے لئے آیا ہے جو خوف اور گھبراہٹ کی وجہ سے اپنے اوسان کھوچکے ہوں - (۲۲/۲) - اور (۱۵/۷۲) میں وفور جذبات سے پیدا ہونے والی بدمستی کے لئے سَکْرَۃٌ آیا ہے - السَّکْرُ - نہر کو بند کر دینا - سَکَرَتِ الرِّیْحُ - ہوا ساکن ہو گئی - اَلْمَاءُ السَّاکِرُ - ٹھہرا ہوا پانی - سَکَرَ الْبَابَ - دروازہ بند کردیا* -

سَکَّرَہٗ - اس کا گلا گھونٹ دیا - سورۃ حجر میں ہے سُکِّرَتْ اَبْصَارُنَا (۱۵/۱۵) - ہماری آنکھوں پر پردہ ڈال دیا گیا ہے - ہماری نظربندی کر دی گئی ہے -

سورۃ نساء کی مذکورہ صدر آیت کو پھر سامنے لائیے جس میں کہا گیا ہے کہ لَا تَقْرَبُوا الصَّلٰوۃَ وَ اَنْتُمْ سُکَارٰی - (سُکَارٰی جمع ہے سَکْرَانٌ اور سَکْرَانَۃٌ کی - جب تم پر نیند کا غلبہ ہو تو صلوٰۃ کے قریب نہ جاؤ - اس سے آگے ہے حَتّٰی تَعْلَمُوْا مَا تَقُوْلُوْنَ (۴/۴۳) - تا آنکہ تمہیں معلوم ہو کہ تم کیا کہہ رہے ہو - یعنے جس حالت میں تمہیں معلوم ہی نہ ہو کہ تم کیا کہہ رہے ہو، اس میں صلوٰۃ کا کچھ فائدہ نہیں - اس سے ظاہر ہے کہ اگر انسان صلوٰۃ کے الفاظ کا مطلب نہ سمجھتا ہو تو اس صلوٰۃ سے کوئی فائدہ نہیں ہوتا - صلوٰۃ کے لئے اولین شرط یہ ہے کہ تم جو کچھ زبان سے کہہ رہے ہو اس کا مطلب بھی سمجھتے ہو - لہذا قرآن کریم کو بلا

---

*تاج و راغب -

سمجھے پڑھنا (خواہ وہ صلٰوۃ میں ہو یا ویسے ہی) کوئی فائدہ نہیں دیتا۔ قرآن کریم پڑھا اس لئے جاتا ہے کہ سمجھا جائے اور سمجھا اس لئے جاتا ہے کہ اس پر عمل کیا جائے۔ بلا مطلب سمجھے، بعض الفاظ کو دہرانے سے یہ سمجھنا کہ اس سے کچھ فائدہ ہوتا ہے، عہد سحر (Magic Age) کی توہم پرستی ہے جسے مٹانے کے لئے قرآن کریم آیا تھا۔

س ک ن

سُکُوْنٌ کے معنے ہیں، حرکت نہ رہنا۔ ٹھہر جانا*۔ سَکَنَ سَکَنًا و سُکْنٰی۔ بود و باش اختیار کرنے، رہائش کرنے کے لئے استعمال ہوتا ہے**۔ راغب نے کہا ہے کہ سُکُوْنٌ کسی چیز کا حرکت کے بعد ساکن ہو جانا ہے۔ اسی لئے یہ لفظ کسی مقام کو وطن بنالینے یا کسی جگہ کو گھر بنا لینے کے معنوں میں بھی استعمال ہوتا ہے۔ اَلسُّکَّانُ کشتی کے پتوار کو کہتے ہیں جس سے اس کا توازن برقرار رہتا ہے۔ اَلسِّکِّیْنُ ($\frac{12}{31}$)۔ چھری کو کہتے ہیں اس لئے کہ (راغب کے الفاظ میں) اس سے مذبوح کی حرکت، سکون سے بدل دی جاتی ہے۔ مِسْکِیْنٌ اُسے کہتے ہیں جس کی حرکت کو فقر اور محتاجی نے کم کر دیا ہو۔ یہ فَقِیْرٌ سے زیادہ محتاج ہوتا ہے۔ نیز ذلیل اور کمزور کو بھی مِسْکِیْنٌ کہتے ہیں۔ جیسا کہ سورۃ کہف میں کشتی والوں کو مَسَاکِیْن کہا گیا ہے ($\frac{18}{79}$) کیونکہ وہ بادشاہ کے استبداد کے مقابلہ میں کچھ نہیں کرسکتے تھے*۔ اَلْمَسْکَنَۃُ۔ سختی اور مشقت کو کہتے ہیں جو انسان کو بے بس کر دیتی ہے***۔ نیز فقر و ذلت اور کمزوری اور مسکینی کی حالت کو*۔

سَکَّنَتْہُ تَسْکِیْنًا۔ کے معنے ہیں میں نے اس کے اضطراب کو رفع کرکے اس کے دل کو سکون دیدیا۔ یا اسے ثابت و ساکن کر دیا۔ جَعَلَ الَّیْلَ سَکَنًا ($\frac{6}{97}$) کے معنے ہیں خدا نے رات کو ایسا بنایا جس میں تمہیں سکون حاصل ہو جاتا ہے۔ اسی طرح اِنَّ صَلٰوتَکَ سَکَنٌ لَّھُمْ ($\frac{9}{103}$) کے معنے ہیں تمہاری دعا ان کے لئے وجہ تسکین ہو جاتی ہے۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اَلسَّکَنُ ہر محبوب چیز کو کہتے ہیں جس سے سکون و قرار حاصل ہو جائے۔ اَلسَّکِیْنَۃُ۔ اطمینان و سکون اور وقار کو بھی کہتے ہیں۔ الرمانی نے اسے اَلتَّثَبُّتُ کا مرادف لکھا ہے***۔ یعنی جمعیت خاطر۔ اِسْتَکَانَ کے معنے ذلیل و کمزور ہو جانا ہیں*۔ (یہ در اصل (ک۔و۔ن) سے ہے۔ (س۔ک۔ن) سے نہیں)۔

*تاج۔ **محیط۔ ***الالفاظ المترادفۃ۔

قرآنِ کریم میں یہ مادہ، کسی جگہ بسنے کے معنے میں آیا ہے ۔ جیسے (۲/۳۵) میں (۳/۱۲۵) میں وَهَنَ ۔ ضَعُفَ اور اسْتِكَانَۃ ۔ ہم معنے استعمال ہوئے ہیں لیکن جس ترتیب سے یہ الفاظ آئے ہیں (یعنی فَمَا وَهَنُوا ۔ ۔ ۔ وَمَا ضَعُفُوا وَمَا اسْتَكَانُوا) اس سے مترشح ہوتا ہے کہ اِسْتِكَانَۃ انتہائی کمزوری کے لئے آتا ہے ۔ (چونکہ اِسْتِكَانَت ۔ ک ۔ و ۔ ن سے ہے ۔ اس لئے ہم نے اسے اس عنوان میں بھی لکھا ہے) ۔ مَسْكَنَۃ کو خدا کا غضب قرار دیا گیا ہے (۲/۶۱) ۔ اس لئے کہ یہ اس جمود و تعطل کا نام ہے جس سے قوم، زندگی اور حرکت سے محروم ہو جاتی ہے ۔ سورۃ توبہ میں فُقَرَاء اور مَسَاكِين کے الفاظ اکٹھے آئے ہیں (۹/۶۰) ۔ مسکین وہ ہے جس کا چلتا ہوا کاروبار رک جائے ۔ یا کسی حادثہ کی وجہ سے وہ زندگی کی کشمکش میں حصہ لینے کے قابل نہ رہے ۔ قرآنی نظام میں کوئی مسکین اپنی ضروریاتِ زندگی سے محروم نہیں رہ سکتا ۔ وہ ان چیزوں کو (بطور خیرات نہیں بلکہ) اپنے حق کے طور پر حاصل کرتا ہے ۔ سورۃ البلد میں يَتِيمًا ذَا مَقْرَبَۃٍ ۔ أَوْ مِسْكِينًا ذَا مَتْرَبَۃٍ آیا ہے (۹۰/۱۵-۱۶) ۔ یعنی وہ جو لوگوں کے قریب ہونے کے باوجود اپنے آپ کو تنہا پائے ۔ اور جو ذرا کمزور ہو جانے پر، معاشرہ کے ہاتھوں مٹی میں مل جائے ۔ غلط معاشرہ میں ہوتا یہ ہے کہ جو ذرا نیچے گرا، معاشرہ کا ریلا اسے روندتا ہوا آگے بڑھ گیا ۔ قرآنی معاشرہ گرتوں کو اٹھانے کے لئے قائم ہوتا ہے ۔

س ل ب

اَلسَّلْبُ ۔ کسی سے کوئی چیز زبردستی چھین لینا ۔ بعض نے کہا ہے کہ یہ کسی کو غافل پا کر اسکی چیز تیزی سے جھپٹا مار کر لینے کو کہتے ہیں *۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اسکے بنیادی معنی کسی چیز کو پھرتی سے لینے یا اچک لینے کے ہوتے ہیں ۔ اَلسَّلُوْبُ اس اونٹنی کو کہتے ہیں جس کا بچہ اس سے چھین لیا گیا ہو ۔ شَجَرَۃٌ سَلِيْبٌ ۔ درخت جس کے پتے اور شاخیں سب جھڑ گئے ہوں ۔ اَلسَّلِيْبُ ۔ وہ عورت جس کا بچہ مر گیا ہو ۔ اَلسَّلْبَۃُ ۔ ننگا ہونا ۔ بدن پر کپڑے کا نہ ہونا **۔

سورۃ حج میں ہے وَاِنْ يَسْلُبْهُمُ الذُّبَابُ شَيْئًا (۲۲/۷۳) ۔ اگر ان سے مکھی کوئی چیز جھپٹ کر لے جائے ۔

* محیط ۔ ** تاج و راغب ۔

س ل ح

اَلسِّلَاحُ - اَلسِّلْحُ - آلۂ جنگ - یعنی ہر وہ چیز جس سے جنگ کی جائے یا وار کیا جائے - ہتھیار - نیز ہتھیار کا آہنی حصہ - تلوار یا تلوار کی دھار - کمان جس میں تانت نہ ہو - لاٹھی* - (جمع اَسْلِحَۃٌ) - وَلْیَاْخُذُوْا اَسْلِحَتَھُمْ (۴/۱۰۲) - " چاہئے کہ وہ اپنے ہتھیار لے لیں " -

(سَلَحَ - یَسْلَحُ - پرندوں کے بیٹ کرنے کو بھی کہتے ہیں* - لیکن قرآن کریم میں یہ لفظ ان معنوں میں نہیں آیا) -

س ل خ

سَلَخَ - یَسْلُخُ وَیَسْلَخُ - کسی جانور کی کھال کھینچ لینا - سَلَخَتِ الْحَیَّۃُ - سانپ نے اپنی کینچلی اتار دی - اَلسِّلْخُ - سانپ کی کینچلی - سَلَخَتِ الْمَرْاَۃُ دِرْعَھَا - عورت نے اپنی قمیض اتار دی** - لہذا اسکے معنے ہیں کسی چیز کو اسطرح الگ کر دینا کہ اس پر دوسری چیز کا نشان تک نہ رہے - چنانچہ قرآن کریم میں ہے .... اَللَّیْلُ نَسْلَخُ مِنْہُ النَّھَارَ (۳۶/۳۷) - ہم دن کو رات میں سے اسطرح کھینچ لیتے ہیں (کہ رات میں دن کی روشنی کا ذرا سا نشان بھی نہیں رہتا) - اس لئے سَلَخَ الشَّھْرُ وَانْسَلَخَ کے معنے ہوتے ہیں مہینہ گزر گیا** - (۹/۵) اِنْسَلَخَ مِنْہُ - وہ کسی چیز کو چھوڑ کر، اتار کر اس سے خالی اور ننگا ہو گیا - سورۃ اعراف میں ایک شخص کی حالت کو مثال کے طور پر بیان کیا گیا ہے کہ 'اٰتَیْنٰہُ اٰیٰتِنَا فَانْسَلَخَ مِنْھَا (۷/۱۷۵) - ہم نے اسے اپنے قوانین دیے اور وہ انہیں الگ چھوڑ کر اسطرح صاف نکل گیا جیسے سانپ کینچلی میں سے نکل جاتا ہے - یہ درحقیقت مسلمانوں ہی کی مثال ہے جنہیں اللہ نے قرآن کریم جیسا ضابطۂ حیات دیا لیکن انہوں نے اسے اسطرح چھوڑ دیا کہ اسکا کوئی نشان تک بھی انکی ملّی زندگی میں باقی نہ رہا - یہ اس میں سے صاف نکل گئے - انہوں نے اُسے کینچلی کیطرح اتار کر پھینک دیا - لیکن للہ الحمد کہ وہ (قرآن) اپنی اسی حالت میں صحیح وسلامت موجود ہے - اسلئے اُسے جب جی چاہے پھر اسی طرح اوڑھا جا سکتا ہے -

س ل س ل

اَلسَّلْسَلَۃُ - ایک چیز کو دوسری چیز کے ساتھ متصل کرنا - اَلسِّلْسِلَۃُ - زنجیر - تَسَلْسَلَ الْمَاءُ - پانی حلق میں روانی سے اترتا

*تاج و راغب - **تاج -

چلا گیا*۔ (سَلّ کے معنے کسی چیز کو کھینچنے کے ہوتے ہیں۔ دیکھئے عنوان (س ۔ ل ۔ ل)۔

قرآن کریم میں سِلْسِلَۃٍ (۶۹/۳۲)۔ زنجیر کے لئے آیا ہے جس کی جمع سَلَاسِلُ ہے (۷۶/۴)۔ زنجیر کا ایک حلقہ دوسرے حلقہ کے ساتھ متصل چلا جاتا ہے اور اسی تسلسل سے وہ زنجیر بن جاتی ہے۔

س ل ط

اَلسَّلْطُ۔ اَلسَّلِیْطُ۔ سخت اور مضبوط۔ اَلتَّسْلِیْطُ۔ غالب کر دینا۔ غلبہ اور اقتدار دیدینا۔ سَلَّطَہُ اللّٰہُ عَلَیْہِ۔ خدا نے اسے اس پر غلبہ و تسلط عطا کر دیا۔ (۴/۹۰)۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی غلبہ اور قوت کے ہوتے ہیں۔

سَلْطَانُ النَّارِ۔ آگ کا بھڑکنا**۔ اَلسُّلْطَانُ۔ حجت، برہان**۔ دلیل، ثبوت، سند۔ محمد بن یزید نے کہا ہے کہ یہ سَلِیْطٌ سے ماخوذ ہے جسکے معنے زیتون کے تیل کے ہوتے ہیں جو روشن ہوتا ہے۔ اس اعتبار سے وہی حجت و برہان سُلْطَانٌ کہلائیگا جو خود بھی روشن ہو اور بات کو بھی روشن کر دے**۔ چنانچہ قرآن کریم میں ہے۔ اَمْ لَکُمْ سُلْطٰنٌ مُّبِیْنٌ (۳۷/۱۵۶)۔ ”یا تمہارے پاس کوئی کھلی دلیل ہے“۔ لیکن اَلسَّلْطُ کے اعتبار سے اسکے معنے غلبہ و اقتدار۔ قوت اور طاقت کے بھی ہیں۔ ان معانی میں یہ لفظ قرآن کریم میں متعدد مقامات پر آیا ہے۔ مثلاً سورۃ ابراہیم میں ہے کہ ہم نے رسولوں کو بَیِّنٰتٌ، یعنے واضح دلائل، دیکر بھیجا (۱۴/۱۰)۔ لیکن ان کے مخالفین نے یہ کہکر ان سے انکار کر دیا کہ جب تک تم ہم پر غالب نہ آجاؤ ہم تمہاری بات نہیں مانینگے۔ اسکے لئے سُلْطَانٌ مُّبِیْنٌ (۱۴/۱۱) آیا ہے۔ یا مثلاً سورۃ حجر میں ہے کہ اللہ نے ابلیس سے کہدیا کہ اِنَّ عِبَادِیْ لَیْسَ لَکَ عَلَیْھِمْ سُلْطٰنٌ (۱۵/۴۲)۔ میرے بندوں پر تجھے غلبہ حاصل نہیں ہوگا۔ سورۃ بنی اسرائیل میں یہ لفظ ”مجاز قرار دینے“ کے معنوں میں بھی آیا ہے (۱۷/۳۳) جس میں غلبہ کا مفہوم شامل ہے۔ سورۃ نساء میں ہے وَاٰتَیْنَا مُوْسٰی سُلْطَانًا مُّبِیْنًا (۴/۱۵۳)۔ یہاں بھی اسکے معنے غلبہ و اقتدار کے ہیں۔ سورۃ الحاقۃ میں بھی سُلْطَانِیَہْ اسی معنی میں آیا ہے (۶۹/۲۹)۔ یعنے سلطانی (میرا سلطان) + ہ (وقف کی ھاء)۔

سورۃ رحمٰن میں ایک آیت ہے جو ایک عظیم الشان حقیقت پر دلالت کرتی ہے۔ یٰمَعْشَرَ الْجِنِّ وَالْاِنْسِ اِنِ اسْتَطَعْتُمْ اَنْ تَنْفُذُوْا مِنْ اَقْطَارِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ فَانْفُذُوْا۔ اے گروہ جن و انس!

* تاج۔ راغب۔ ** تاج۔

اگر تم اسکی طاقت رکھتے ہو کہ ''اقطار السمٰوٰت والارض'' سے آگے نکل جاؤ۔ تو جاؤ۔ ان سے آگے نکل جاؤ۔ (جن و انس کے معنے ہیں وحشی اور مہذب آبادیاں)۔ یہاں انسان سے کہا گیا ہے کہ اگر تم میں یہ طاقت ہے کہ اس مادی کائنات کے حدود سے آگے نکل سکو تو جاؤ۔ اس سے آگے نکل جاؤ۔ اس سے آگے ہے۔ لَاتَنْفُذُوْنَ اِلَّا بِسُلْطٰنٍ (۵۵/۳۳)۔ تم سُلْطَانٌ کے بغیر ان سے آگے نہیں نکل سکتے۔ اس سے ظاہر ہے کہ انسان زندگی کی ارتقائی منازل طے کرتا مادی کائنات کے حدود سے آگے نکل سکتا ہے بشرطیکہ اسے وہ قوت حاصل ہوجائے جسے سُلْطَانٌ سے تعبیر کیا گیا ہے۔ سُلْطَانٌ اس قوت کا نام ہے جو قوانین خداوندی کے اتباع سے حاصل ہوتی ہے۔ [رسول اللہ ؐ کی زبان مبارک سے کہا گیا ہے وَاجْعَلْ لِّیْ مِنْ لَّدُنْکَ سُلْطَانًا نَّصِیْرًا (۱۷/۸۰) ''اور مجھے اپنے ہاں سے مدد دینے والی قوت عطا فرما دے''] ۔ اس سے معلوم ہوا کہ قوانین خداوندی کے اتباع سے جہاں اس دنیا کی خوشگواریاں حاصل ہو جاتی ہیں وہاں اس سے انسان کی ذات میں ایسی قوت اور استحکام پیدا ہو جاتا ہے جس سے یہ مادی کائنات کے حدود سے آگے نکل کر زندگی کی مزید ارتقائی منازل طے کرتا چلا جاتا ہے۔ یہ قوت کسی اور طریق سے حاصل نہیں ہو سکتی۔ صرف قرآن کریم کے اتباع سے ہو سکتی ہے۔ لیکن اس سے خانقاہیت والی '' روحانی ترقی '' نہیں سمجھ لینی چاہیئے جو انسان کو ارض وسما سے آگے لے جانا تو ایک طرف، اسے خود اس دنیا میں سربزیری اور زیر دستی سکھاتی ہے۔ اس سُلْطَانٌ سے وہ قوت اور غلبہ مقصود ہے جو اس دنیا میں تمام طاغوتی قوتوں کا سر کچل دیتا ہے اور انسانی معاشرہ میں خدا کا قانون عملاً غالب کر دیتا ہے۔ اور اس کے ساتھ ہی انسانی ذات میں اس قسم کا استحکام پیدا کر دیتا ہے کہ وہ حیات جاوید حاصل کر لیتی ہے۔ اسی کا نام اقطار السمٰوٰت والارض سے آگے نکل جانا ہے۔ طبعی قوتوں (Physical Forces) سے انسان خواہ چاند تک بھی کیوں نہ جا پہنچے۔ یا اس سے بھی آگے کیوں نہ نکل جائے، وہ اقطارالسمٰوٰت والارض کے اندر ہی رہیگا۔ ان حدود سے باہر، انسانی ذات ہی جا سکتی ہے بشرطیکہ اس میں وہ سلطان پیدا ہو جائے جس کی طرف قرآن کریم نے اشارہ کیا ہے۔

س ل ف

سَلَفَ الْاَرْضَ وَ اَسْلَفَهَا ۔ زمین میں ہل چلانا یا اسے ہموار کرنا۔ سَلَفَ الشَّيْءُ ۔ چیز گزر گئی۔ آگے بڑھ گئی۔ سَلَفَ فُلَانٌ ۔ وہ آدمی پہلے گزر گیا۔ اَسْلَفَ اس نے آگے بھیجا، پیش کیا، اَلسَّالِفُ ۔

پہلے گزر جانے والا - پیشرو*- اَلسَّالِفَةُ - جنگ یا سفر میں آگے رہنے والے** - ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی آگے بڑھنے اور سبقت کرنے کے ہوتے ہیں -

سورۃ بقرہ میں ہے فَلَهُ مَا سَلَفَ (۲/۲۷۵) - جو پہلے لیا جا چکا ہے وہ اس کا ہے - سورۃ زخرف میں ہلاک شدہ قوموں کے متعلق فرمایا وَجَعَلْنٰهُمْ سَلَفًا وَمَثَلًا (۴۳/۵۶) - ہم نے انہیں پیشرو (یعنی پہلے گزر جانے والے) بنادیا (جن کی داستانیں اب عبرت کے لئے باقی ہیں) - سورۃ الحاقہ میں ہے بِمَآ اَسْلَفْتُمْ (۶۹/۲۴) - جو کچھ تم نے پہلے کیا -

س ل ق

اَلسَّلْقُ - اس مادہ کے بنیادی معنے بلند ہونے اور اوپر چڑھنے کے ہیں***- تَسَلَّقَ الْجِدَارَ - وہ دیوار پر چڑھ گیا - تَسَلَّقَ عَلٰی فِرَاشِهٖ وہ درد و غم کی وجہ سے اپنے بستر پر کروٹیں بدلتا رہا اور اطمینان سے لیٹ نہ سکا - سَلَقَ فُلَانًا بِالسَّوْطِ - اس نے فلاں آدمی کی کوڑوں سے کھال ادھیڑ دی - اَلسَّلِيْقَةُ - راستہ میں قدموں اور کھروں کے نشانات - پتلی اور باریک کی ہوئی روٹی - نیز طبیعت* - راغب نے لکھا ہے کہ اَلسَّلْقُ کے معنی ہوتے ہیں کسی چیز کو زبردستی بچھا دینا - خواہ ہاتھ سے ہو خواہ زبان سے**- اور سَلَقَ فُلَانًا کے معنے ہوتے ہیں اس نے فلاں آدمی کے نیزہ مار دیا*- اسی نہج سے قرآن کریم میں ہے سَلَقُوْكُمْ بِاَلْسِنَةٍ (۳۳/۱۹) یہ لوگ تمہیں اپنی زبانوں کے طعن سے ایذا پہنچاتے ہیں - طعنوں کے تیر و نشتر مارتے ہیں - ان طعن آمیز باتوں سے تمہارے اوپر چڑھ دوڑنا چاہتے ہیں (یہی اسکے بنیادی معنے ہیں اگرچہ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے اس قدر مختلف معنی آتے ہیں کہ ان میں قدر مشترک متعین کرنا مشکل ہے) - لیکن ہمارے نزدیک اس مادہ میں تکلیف پہنچانے کا مفہوم غالب ہے -

س ل ک

سَلَكَ - اس مادہ کے اصل معنے ہوتے ہیں ایک چیز کا دوسری چیز کے اندر چلے جانا یا ڈال دینا - سَلَكَ يَدَهٗ فِي الْجَيْبِ - اس نے اپنا ہاتھ گریبان میں داخل کر لیا* - صاحب محیط نے خَيْطٌ ، سِلْكٌ اور سِمْطٌ* کا فرق بتاتے ہوئے لکھا ہے کہ ہر ڈورا خواہ سینے کے کام آئے یا

*تاج - **راغب - ***محیط -

ھار بنانے کے خَیۡطٌ کہلاتا ھے ، لیکن وہ ڈورا جس میں موتی وغیرہ پروئے جاتے ھیں سِلۡکٌ کہلاتا ھے ، اور جس ڈورے میں موتی وغیرہ پروئے ھوئے موجود ھوں وہ سِمۡطٌ کہلاتا ھے** ۔اَلسُّلُوۡکُ ۔ راستہ میں گھس جانا***۔ سَلَکَ ۔ چلنا یا چلانا ۔ داخل ھونا یا داخل کرنا ۔ (لازم اور متعدی دونوں معنے آتے ھیں) ۔ اَسۡلَکَ ۔ چلانا ۔ داخل کرنا* ۔

سورۃ حجر میں ھے کَذٰلِکَ نَسۡلُکُہٗ فِیۡ قُلُوۡبِ الۡمُجۡرِمِیۡنَ (۱۵/۱۲) ۔ اسی طرح ھم اسے مجرمین کے دلوں میں داخل کرتے ھیں ۔ سورۃ طٰہٰ میں ھے وَ سَلَکَ لَکُمۡ فِیۡھَا سُبُلًا (۲۰/۵۳) ۔ اور تمہارے لئے اس (زمین) میں راستے چلائے ۔ اور سورۃ نوح میں ھے لِتَسۡلُکُوۡا مِنۡھَا (۷۱/۲۰) ۔ تا کہ تم اس میں چلو ۔

س ل ل

اَلسَّلُّ ۔ کسی چیز کو نرمی اور سہولت کے ساتھ نکال لینا ۔ ابن فارس نے نرمی اور سہولت کے ساتھ چپکے سے خفیہ طور پر نکال لینے کا اضافہ کیا ھے ۔ سَیۡفٌ سَلِیۡلٌ ۔ نیام سے کھینچی ھوئی تلوار ۔ اَلسُّلَالَۃُ ۔ وہ حصہ جو کسی چیز سے نکالا جائے* ۔ اَلۡمَسۡلُوۡلُ ۔ نکالا ھوا ۔ نیز وہ آدمی یا جانور جسے آختہ کردیا گیا ھو**۔ قرآن کریم میں انسانی تخلیق کے سلسلہ میں ھے کہ اسے سُلٰلَۃٍ مِنۡ طِیۡنٍ (۲۳/۱۲) سے پیدا کیا ۔ یعنے وہ شے جو مٹی (جمادات ۔ Inorganic Matter) سے بطور خلاصہ نکالی گئی ھو ۔ اگر انسانی جسم کا تجزیہ کیا جائے تو وہ انہی جامد عناصر (مثل لوھا ۔ چونا ۔ فاسفورس وغیرہ) کا مرکب نظر آئے گا ۔

اِنۡسَلَّ وَ تَسَلَّلَ ۔ وہ چھپ کر چلا گیا ۔ آھستہ سے کھسک گیا ۔ اَلسَّلَّۃُ ۔ خفیہ طور پر چرانا ۔ چوری ۔ اَلسَّالُّ ۔ اَلسَّلَّالُ ۔ اَلۡاَسَلُّ ۔ چور کو کہتے ھیں* ۔

سورۃ نور میں ھے اَلَّذِیۡنَ یَتَسَلَّلُوۡنَ مِنۡکُمۡ (۲۴/۶۳) ۔ جو تم میں سے چپکے سے کھسک جاتے ھیں ۔

س ل م

سَلۡمٌ****۔ چونکہ یہی وہ مادہ ھے جس سے اِسۡلَامٌ کا لفظ آیا ھے اس لئے اس کے بنیادی معانی کو غور سے سمجھ لینا چاھئے کیونکہ انہی معانی سے

*تاج ۔ **محیط ۔ ***راغب ۔ ****اس عنوان کے تمام معانی تاج ۔ محیط اور لین سے ماخوذ ھیں ۔

اسْلاَمٌ کے مختلف گوشے واضح ہو جائینگے -

(۱) سَلِمَ کے بنیادی معنی ہیں وہ ہر قسم کے عیوب و نقائص سے پاک اور صاف ہوگیا - اس کی ہر ایک کمی پوری ہوگئی - سَلَّمَ الدَّلْوَ - اس نے ڈول کو پختگی کے ساتھ تیار کر دیا - سورۃ بقرۃ میں بنی اسرائیل کی گائے کے متعلق ہے مُسَلَّمَةٌ لاَشِيَةَ فِيْهَا (۲/۷۱) - وہ جسمانی نقائص سے منزہ اور بالکل بے داغ ہے - لہذا سَلِمَ کے بنیادی معنے ہیں اس طرح مکمل ہو جانا کہ پھر کوئی نقص اور کمی باقی نہ رہے - یعنے انسانی صلاحیتوں کی پوری پوری نشو و نما اور تکمیل -

(۲) اس مادہ کے دوسرے بنیادی معنے ہیں، ہر قسم کے آفات - خطرات اور حوادث سے محفوظ رہنا - ابن فارس نے کہا ہے کہ اس مادہ میں زیادہ معنی صحت اور عافیت سے متعلق ہیں - سَلِمَ مِنَ الْاٰفَةِ سَلاَمَةً - وہ آفت سے محفوظ رہا - سَلَّمَهُ اللهُ تَسْلِيْمًا - خدا نے اسے آفت سے محفوظ رکھا - قرآن کریم میں خدا کا ایک نام اَلسَّلاَمُ بھی آیا ہے (۵۹/۲۳) جس کا عام طور پر مفہوم لیا جاتا ہے "تمام عیوب و نقائص سے پاک" - لیکن صاحب تاج العروس نے لکھا ہے کہ جن لوگوں نے اس کے یہ معنے کئے ہیں انہوں نے بہت بڑی غلطی کی ہے - کیونکہ سَلاَمٌ اُسے کہتے ہیں جس سے دوسری چیزیں سلامتی حاصل کریں اور سَالِمٌ وہ ہوتا ہے جو دوسرے سے سلامتی حاصل کرے - یعنے وہ جس پر کوئی آفت آ سکتی ہو اور وہ اسکا متوقع بھی ہو لیکن اس سے محفوظ رہنا چاہے - لہذا خدا کا نام سَلاَمٌ اس لئے ہے کہ اس نے تمام مخلوق کو اختلال و انتشار سے محفوظ رکھا ہے اور اس کا نظام نہایت حفاظت و صیانت سے چل رہا ہے -

لہذا سَلاَمٌ کے معنے ہیں آفتوں اور مصیبتوں سے محفوظ رہنا - یہ اس مادہ کے دوسرے معنی ہوئے -

(۳) اَلسُّلَّمُ - سیڑھی کو کہتے ہیں - یعنے کسی بلندی تک پہنچنے کا قابل اعتماد اور محفوظ ذریعہ - لہذا اس مادہ کے تیسرے معنے ہیں وہ ذرائع جن سے کوئی شخص نہایت اعتماد اور حفاظت سے بلندیوں تک پہنچ جائے -

(۴) اَلسِّلْمُ کے معنے ہیں صلح اور صفائی کے ساتھ رہنے والا - اَلسِّلْمُ کہتے ہی صلح کو ہیں - لہذا اس مادہ کے چوتھے معنے ہیں - خود بھی امن و سلامتی سے رہنا اور دنیا میں بھی امن و سلامتی قائم رکھنا - تَسَالَمَتِ الْخَيْلُ کے معنے ہوتے ہیں گھوڑوں کا ایک ساتھ چلنا (پاؤں ملا کر اس طرح چلنا کہ ان میں کامل ہم آہنگی ہو) اور کسی گھوڑے کا ایسی حرکت

نہ کرنا جس سے دوسرے گھوڑے بدک جائیں یا مشتعل ہوجائیں ۔ اس سے اسلامی معاشرہ کا صحیح صحیح تصور سامنے آجاتا ہے ۔

(۵) اَلسَّلَمُ وَالسَّلَامُ کے معنے ہیں اطاعت ۔ انقیاد ۔ سپردگی ۔ جھک جانا ۔ لہذا اس مادہ کے پانچویں بنیادی معنے ہوئے قوانین خداوندی کی پوری پوری اطاعت کرنا ۔ نواب صدیق حسن خان نے لکھا ہے کہ س ۔ ل ۔ م میں بنیادی طور پر نرمی اور انکسار کا پہلو مضمر ہوتا ہے *۔

(۶) اِسْتَسْلَمَ تَكَمَ الطَّرِيْقِ کے معنے ہیں وہ راستہ کے درمیان میں چلا اور اس سے ادھر اُدھر نہ ہؤا ۔ قَالُوْا سَلَامًا کے معنے ہیں وہ میانہ روی اختیار کرتے ہیں اور کوئی لغو بات نہیں کرتے ۔ لہذا اس مادہ کے چھٹے معنے ہوئے اعتدال اور توازن کی راہ اختیار کرنا اور لغویت اور بیہودگیوں سے بچنا ۔

(۷) اِسْتَلَمَ الزَّرْعُ کے معنے ہیں کھیتی کی بالیں نکل آئیں ۔ لہذا اس مادہ کے ساتویں معنے ہیں کوششوں کا نتیجہ خیز ہونا ۔

(۸) اور اَلسَّلِمَةُ اس عورت کو کہتے ہیں جسکے اعضاء نہایت نرم و نازک اور خوشنما ہوں ۔ لہذا اس مادہ کے آٹھویں معنے ہوئے حسن و خوشنمائی ۔

ان معانی سے ظاہر ہے کہ اَلْاِسْلَامُ اس نظام حیات کا نام ہے جس سے (۱) انسان کی تمام کمیاں پوری ہو جائیں اور اسکی صلاحیتیں پوری پوری نشو و نما پالیں (۲) جس میں وہ زندگی کی تمام تباہیوں اور بربادیوں سے محفوظ رہے ۔ اور (۳) اپنی ارتقائی منازل طے کرتا ہوا بلندیوں کی طرف بڑھتا چلا جائے ۔ (۴) وہ خود اپنی ذات میں بھی امن و سلامتی اور صلح و آشتی سے رہے اور ساری دنیا میں امن و سلامتی قائم کرنے کا موجب ہو ۔ وہ سفر زندگی میں دوسرے افراد معاشرہ کے ساتھ پوری ہم آہنگی سے چلے اور کوئی حرکت ایسی نہ کرے جس سے کوئی دوسرا مشتعل ہو اور اسطرح معاشرہ کا نظام خراب کر دے ۔ یہ اسی صورت میں ممکن ہے کہ (۵) انسان قوانین خداوندی کی پوری پوری اطاعت کرے اور انکے سامنے اپنا سر ہی نہیں بلکہ دل بھی جھکا دے ۔ اور یہ کچھ (۶) پورے پورے اعتدال اور توازن سے کرے ۔ افراط و تفریط سے کام نہ لے ۔ (۷) اسطرح اسکی کوششیں ثمربار ہو جائینگی اور اسکا کوئی عمل رائیگاں نہیں جائیگا اور (۸) اسکی اپنی ذات میں بھی حسن (توازن) پیدا ہو جائیگا اور پورے معاشرے میں بھی ۔

* العلم الخفاق ۔

یہ ہے وہ روش زندگی جسکے متعلق کہدیا کہ جو شخص اس روش کے خلاف کوئی اور روش اختیار کریگا ، تو وہ اس قسم کے نتائج قطعاً پیدا نہیں کرسکے گی اور وہ آخر الامر نقصان اٹھائیگا (۳/۸۴)۔ یہ روش قرآن کریم کے اتباع کا دوسرا نام ہے ۔ وَالسَّلَامُ عَلٰی مَنِ اتَّبَعَ الْهُدٰی (۲۰/۴۷)

قرآن کریم میں مُسْلِمٌ اور اسکے مشتقات اس کثرت سے آئے ہیں کہ اس مقام پر ان تمام کا درج کرنا مشکل ہے ۔ لہذا ان میں سے جستہ جستہ مثالوں پر اکتفا کیا جاتا ہے ۔ مُسَلَّمَةٌ لَا شِيَةَ فِيهَا (۲/۷۱) ”وہ ہر قسم کے نقائص سے منزہ اور بالکل بےداغ ہے “۔ (۲/۲۳۳) میں اِذَا سَلَّمْتُمْ کے معنے ہیں جبکہ تم دے دو ۔ سونپ دو ۔ حوالہ کر دو ۔

سورۃ انفال میں ہے کہ تم آپس میں جھگڑنے لگ گئے تھے وَلٰكِنَّ اللّٰهَ سَلَّمَ (۸/۴۳) ۔ اللہ نے تمہیں اس کے تباہ کن نتائج سے محفوظ رکھا ۔ سورۃ الطور میں سُلَّمٌ (۵۲/۳۸) کا لفظ بلند مقامات تک پہنچنے کے ذرائع کیلئے استعمال ہوا ہے ۔

سورۃ انفال میں ہے وَاِنْ جَنَحُوْا لِلسَّلْمِ (۸/۶۱) ۔ اسکے معنے صلح کے ہیں ۔ اطاعت وفرمانبرداری کیلئے یہ مادہ (مثلاً ۲/۱۱۲) میں آیا ہے ۔

سورۃ روم میں ایمان اور اسلام کو الگ الگ بیان کیا ہے (۳۰/۵۳)۔ یعنی اِیْمَانٌ کے معنے ہیں کسی نصب العین کو صحیح مان لینا اور اِسْلَامٌ کا مطلب ہے اس پر پورے پورے طور پر کاربند ہو جانا ۔ اس کے مقابلہ میں ، وہ لوگ جو محض مطیع ہو کر اسلام لائے ہوں اور ایمان ان کے دل کی گہرائیوں میں جاگزیں نہ ہوا ہو، ان کے متعلق کہا ہے کہ وہ مُسْلِمٌ ہیں ، ابھی مُؤْمِنٌ نہیں ہوئے (۴۹/۱۴) ۔ سورۃ النمل میں مسلمین کا لفظ اَلَّا تَعْلُوْا عَلَیَّ (۲۷/۳۱) کے معنوں میں آیا ہے ۔ یعنی سرکشی اور حدود شکنی اختیار نہ کرنا ۔ فرماں پزیر ہو جانا ۔ سورۃ مریم میں لفظ (سَلَامٌ) اَللَّغْوُ کے مقابلہ میں آیا ہے ۔ (۱۹/۶۲) ۔

ان خصوصیات کے حامل انسان کو صاحب قلب سلیم کہا گیا ہے (۲۶/۸۹) ۔ اور ان صفات کی حامل قوم کو اُمَّةً مُّسْلِمَةً لَّكَ (۲/۱۲۸) یعنی ایسی قوم جو احکامات الٰہی کا اتباع کرتی رہے ۔ اس قوم کے ہر فرد کا فریضہ حیات یہ ہوگا کہ جس فرد سے اسکا معاملہ پڑے وہ اسے کہے سَلَامٌ عَلَيْكُمْ (۶/۵۴) ۔ میں تمہارے لئے سَلَامٌ کی آرزو کرتا ہوں ۔ یعنی

ان تمام سعادتوں اور خوشگواریوں کی جن کا ذکر اوپر کیا گیا ہے ۔ اور وہ بھی اس کے جواب میں اس آرزو کا اظہار کرے اور یوں ان کا سارا معاشرہ سَلَامًا سَلَامًا (۵۶/۲۶) کی حیات بخش صداؤں سے گونج اٹھے ۔ حضرت ابراهیمؑ کے متعلق ہے کہ وہ یہودی یا نصرانی نہیں تھے ۔ حَنِيْفًا مُّسْلِمًا تھے (۳/۶۶) یہی وہ نام ہے جو دین خداوندی کے متبعین کے لئے اللہ نے تجویز کیا تھا ۔ قرآن کریم سے پہلے بھی اور قرآن کریم کے بعد بھی (۲۲/۷۸) ۔ اپنے آپ کو فرقوں سے منسوب کرنا غیر اسلامی شعار ہے ۔ اس لئے کہ فرقہ بندی شرک ہے (۳۰/۳۲) ۔ اور مسلم اور مشرک ایک دوسرے کی ضد هیں (۳/۶۶) اور کفر اور اسلام بھی ایک دوسرے کی ضد (۹/۷۴) ۔ اسے بھی اچھی طرح سمجھ لینا چاہئے کہ مسلم کبھی مجرم نہیں ہو سکتا ۔ اسی لئے قرآن کریم میں ہے کہ اَفَنَجْعَلُ الْمُسْلِمِيْنَ كَالْمُجْرِمِيْنَ (۶۸/۳۵) ۔ "کیا هم مسلمین کو مجرمین جیسا بنا دینگے ؟" ۔ لہذا مسلم وهی ہے جو قوانین خداوندی کی اطاعت کرے ۔

الاسلام ، وہ ضابطۂ حیات ہے جسے اللہ تعالیٰ نے انسانوں کے لئے تجویز کیا ہے ۔ اس کے سوا کوئی ضابطۂ حیات خدا کے نزدیک قابل قبول نہیں ۔ سورۃ آل عمران میں ہے اَفَغَيْرَ دِيْنِ اللّٰهِ يَبْغُوْنَ ۔ کیا یہ لوگ ، اللہ کے (متعین فرمودہ) ضابطہ حیات کے سوا کوئی اور دین چاهتے هیں ۔ حالانکہ تمام اشیائے کائنات کی کیفیت یہ ہے کہ وَلَهٗ اَسْلَمَ مَنْ فِى السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ طَوْعًا وَّكَرْهًا وَّاِلَيْهِ يُرْجَعُوْنَ (۳/۸۲) کائنات کی پستیوں اور بلندیوں میں جو کچھ ہے سب اس کے قانون کے سامنے ، طوعاً و کرهاً سر بسجود هیں اور وہ هر هر قدم پر اس قانون کیطرف لوٹائے جاتے هیں ۔ اس کے بعد ہے وَمَنْ يَّبْتَغِ غَيْرَ الْاِسْلَامِ دِيْنًا فَلَنْ يُّقْبَلَ مِنْهُ (۳/۸۴) جو کوئی اسلام کے سوا کوئی اور ضابطہ حیات اختیار کریگا اس سے وہ کبھی قبول نہیں کیا جائیگا ۔ وَهُوَ فِى الْاٰخِرَةِ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ (۳/۸۴) ۔ اور اس کا جی چاہے تو تجربہ کرکے دیکھ لے کہ وہ آخرکار ضرور نقصان اٹھائیگا ۔ یہی وہ ضابطہ حیات ہے جو انبیائے سابقہ کو ملتا رہا اور جو آخرالامر قرآن کریم میں آکر مکمل ہوا ۔ اسی کو خدا نے تمام نوع انسان کے لئے منتخب کیا ہے (۵/۳) ۔ لہذا اب ، اس آسمان کے نیچے ، خدا کا تجویز کردہ ضابطہ حیات جسے اس نے الاسلام کہہ کر پکارا ہے ، قرآن کریم سے باهر کہیں نہیں ۔ اسی دین کے ماننے والوں کو مسلمین کہتے هیں ۔ مسلم وہ ہے جو قرآن کریم کو خدا کیطرف سے عطا کردہ واحد ، مکمل اور آخری ضابطہ حیات سمجھے ۔

س ل و

سَلْوٰی - ہر اس چیز کو کہتے ہیں جو تسلی دے - چنانچہ شہد کو بھی اَلسَّلْوٰی کہتے ہیں* - اور گوشت کو بھی** - سَلْوَۃٌ مِنَ العَیْشِ - سہولت اور آرام کی زندگی کو کہتے ہیں جس میں غم و فکر نہ ہو** - سَلَاہٗ عَنْہُ تَسْلِیَۃً - اس نے اسکے غم کو بھلا دیا* - اَلسَّالِیْ - غم و فکر کو بھول جانے والا** - سَلَاہٗ - وہ اس کی یاد کو بھول گیا - اس نے اس کے غم کو غلط کر لیا* - ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی سہولت کی زندگی اور فراخیٔ عیش کے ہوتے ہیں -

اَلسَّلْوٰی - (۲/۵۷) - سفید رنگ کا ایک پرندہ (بٹیر کے مشابہ) جو سینا کی وادیوں میں بنی اسرائیل کو کھانے کو ملتا تھا* - راغب نے کہا ہے کہ اس سے مراد ہر وہ شے ہے جو وجہ تسلی ہو*** - (نیز دیکھئے عنوان - م - ن - ن)

سلیمان علیہ السلام

انبیائے بنی اسرائیل میں حضرت سلیمانؑ خاص شوکت و حشمت کے مالک تھے - آپ حضرت داؤدؑ کے بیٹے (۳۸/۳۰) اور وارث (جانشین) تھے (۲۷/۱۶) - آپ کو علم اور قوتِ فیصلہ کی فراوانی عطا ہوئی تھی (۲۷/۱۵) - اس لئے انہیں سطوتِ داؤدی کی وراثت محض ان کا بیٹا ہونے کی وجہ سے نہیں مل گئی تھی، اگرچہ بنی اسرائیل میں بادشاہت وراثت میں مل جاتی تھی - شہروں کی مہذب آبادیاں اور وحشی قبائل (جن و انس) آپ کے لشکروں میں جمع رہتے تھے اور گھوڑوں کے رسالے ان پر مستزاد تھے (۲۷/۱۷) - حضرت سلیمانؑ کا بحری بیڑہ بھی بڑا مشہور تھا - قرآن کریم نے بتایا ہے کہ ہوائیں ان کے تابع فرمان تھیں - (۲۱/۸۱) - یعنی وہ ان سے بادبانی کشتیوں کو چلاتے تھے - پہاڑی قبائل کے سرکش افراد مختلف کاموں پر مامور تھے (۲۱/۸۲) - وہ آپ کے لئے بڑی بڑی عمارتیں تعمیر کرتے - مجسمے تراشتے اور تصویریں بناتے تھے (۳۴/۱۲-۱۳) - اس زمانے میں یمن کے مشرق علاقہ پر قوم سبا کی حکومت تھی جو ستارہ پرست تھی - ایک ملکہ ان پر حکمران تھی - آپ نے اس کے خلاف لشکر کشی کی اور وہ بالآخر مطیع و فرمانبردار ہوگئی (۲۷/۲۰-۴۴) - یہی لشکر وادی نمل میں سے گزرا تھا (۲۷/۱۸-۱۹) - ھُدھُد اسی لشکر میں ایک افسر تھا (۲۷/۲۰-۲۹) -

آپ اس شوکت و عظمت کے مالک تھے لیکن آپ کا جانشین کمزور ثابت ہوا (۳۴/۱۴) - تورات (سلاطین) میں اس کی تفصیل ملتی ہے -

*تاج - **محیط - ***راغب -

یہودیوں نے سحر و کہانت کے بہت سے لغو افسانے تراش کر آپ کی طرف منسوب کر رکھے تھے - خود تورات میں بھی اس قسم کی خرافات ملتی ہیں - قرآن کریم نے ان سب کی تردید کی ہے ($\frac{۲}{۱۰۲}$) -

س م د

سَمَدَ - سُمُوْدًا - تکبر سے سر کو اٹھائے رکھنا* - ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی رکے بغیر آگے بڑھتے چلے جانے کے ہیں - چنانچہ سَمَدَتِ الْاِبِلُ فِیْ سَیْرِھَا کے معنی ہیں اونٹ تیز رفتاری سے ناک کی سیدھ آگے بڑھتے گئے - اس سے اس کے معنی تکبر اور سرکشی کئے جاتے ہیں - نیز من مانی کرنے کے بھی - سَمَدَ - یَسْمُدُ کے معنے ہیں ، بلند ہونا - سَامِدٌ - حیرانی میں کھڑا رہ جانے والے کو بھی کہتے ہیں (شاید اس لئے کہ وہ بھی سر اٹھائے کھڑا رہتا ہے)- ابن الاعرابی نے کہا ہے کہ اس کے معنے لہو و لعب میں مشغول آدمی کے ہیں جو اپنے فرائض سے غافل ہو جائے* - صاحب محیط نے کہا ہے کہ کبھی فکر و حزن سے چہرے کے بگڑ جانے کو بھی اَلسُّمُوْدُ کہتے ہیں** - قرآن کریم میں مخالفین کے متعلق ہے وَتَضْحَکُوْنَ وَلَا تَبْکُوْنَ وَاَنْتُمْ سَامِدُوْنَ - فَاسْجُدُوْا لِلّٰہِ وَاعْبُدُوْا ($\frac{۵۳}{۶۰-۶۲}$)- تم ہنستے ہو - روتے نہیں ہو - یہ اس لئے ہے کہ تم اس سے بالکل بےخبر ہو کہ تمہارے اعمال کے نتائج کیا سامنے آنے والے ہیں - اس اعتبار سے سَامِدُوْنَ کے معنے غافل اور بے خبر کے آئینگے - لیکن اس کے بعد ہے فَاسْجُدُوْا لِلّٰہِ وَاعْبُدُوْا - اگر اس اعتبار سے دیکھا جائے تو سَامِدُوْنَ کے معنے یہ ہونگے کہ تم بہت متکبر اور سرکش ہو - من مانی کاروائیاں کرتے ہو - تم اس روش کو چھوڑو اور احکام خداوندی کے سامنے جھکو اور اس کی محکومیت اختیار کرو -

س م ر

اَلسُّمْرَۃُ - گندمی رنگ - اَلسَّمْرَاءُ - گیہوں - اَلسَّمَرُ - رات - رات کی باتیں - رات میں قصے کہانیاں کہنا - اَلسَّامِرُ - شب میں قصہ گوئی کی محفل - نیز قصہ گو - (یہ جمع کے لئے بھی آجاتا ہے) ($\frac{۲۳}{۶۷}$) - اَلسَّمِیْرُ - قصہ گو - داستان زن - اَلْمُسَامِرُ - رات کی قصہ گوئی کی محفل میں تمہارا شریک - سَمَارَۃُ اللَّیْلِ - رات کو باتیں کرنا - سَمِیْرٌ کے معنے زمانے کے بھی ہیں*** -

---

*تاج - **محیط - ***تاج و راغب

اَلسَّامِرَۃُ ۔ اَلسَّمَرَۃُ ۔ یہودیوں کی ایک قوم جو اسرائیلی قبائل میں سے ہے ۔ یہ لوگ بعض مسائل میں یہودیوں سے اختلاف رکھتے ہیں ۔ مثلاً ان کا عقیدہ ہے کہ حضرت موسیٰؑ کے بعد کوئی نبی نہیں آئیگا ۔ نیز یہ چھوت چھات کے بھی قائل ہیں ۔ ان کا خیال ہے کہ نابلس کا شہر ہی (جس میں یہ رہتے ہیں) بیت المقدس ہے ۔ ان کے دو فرقے ہیں ۔ کوشان اور دوشان ۔ انہی لوگوں کی طرف وہ سامری منسوب ہے جس نے بنی اسرائیل کو گوسالہ پرستی کی تعلیم دی تھی* ۔ صاحب محیط نے کہا ہے کہ اَلسَّامِرَۃُ فلسطین میں ایک مقام بھی ہے اور ایک قبیلہ بھی جو نابلس میں رہتا ہے ۔ ان کی تعداد بہت تھوڑی ہے ۔ ان کا عقیدہ ہے کہ دوسرے لوگوں سے چھوجانے سے یہ ناپاک ہو جاتے ہیں**۔ (۲۰/۹۶) میں اس سامری کے متعلق جس نے بنی اسرائیل کو بہکایا تھا ، ایسا ہی کچھ آیا ہے ۔

لیکن عصر حاضر کی اثری تحقیقات کی روشنی میں قیاس کا رخ اس طرف جاتا ہے کہ یہ شخص سمیری قوم کا فرد تھا (بنی اسرائیل میں سے نہیں تھا) ۔ حضرت مسیحؑ سے قریب ساڑھے تین ہزار سال قبل عراق میں دو قومیں آباد تھیں ۔ ایک قوم جو جنوب سے آئی تھی عرب تھی اور دوسری جو غالباً شمال سے آئی تھی سمیری کہلاتی تھی ۔ اس کا وطن اگرچہ عراق تھا لیکن یہ دور دور تک پھیل گئی تھی ۔ مصر کے ساتھ ان کے تعلقات تاریخ کی روشنی میں واضح ہو چکے ہیں ۔ معلوم ہوتا ہے کہ یہ شخص (جسے قرآن کریم نے سَامِرِی کہہ کر پکارا ہے ۔ ۲۰/۸۵) مصر میں حضرت موسیٰؑ کا معتقد ہو گیا تھا اور بنی اسرائیل کے ساتھ ہی وہاں سے نکل آیا تھا ۔ لیکن حضرت موسیٰؑ کی تعلیم اس کے دل کی گہرائیوں میں نہیں اتری تھی (۲۰/۹۶) ۔

لیکن اگر اَلسَّامِرِیُّ کی اصل سَمَرٌ ہے تو اس کے معنے داستان گو ، یعنے قصے کہانیاں کہنے والے کے ہیں ۔ ''کہانیاں کہنے والے'' جس طرح قوموں کو گمراہ اور برباد کرتے ہیں اس کی تشریح کی ضرورت نہیں ۔ خود ہماری تاریخ اس کی زندہ شہادت ہے ۔ جب ہم قرآن کریم کے حقائق کو چھوڑ کر، قصوں اور کہانیوں میں الجھ گئے تو قعر مذلت میں گرتے چلے گئے ۔ رفتہ رفتہ اب ہماری حالت یہ ہو گئی ہے کہ ہمارے ہاں دین نام ہی چند قصوں اور کہانیوں کا رہ گیا ہے اور قرآنی حقائق ہمارے لئے نامانوس شے قرار پا چکے ہیں ۔

---

*تاج و راغب ۔ **محیط ۔

س م ع

اَلسَّمْعُ - کان کی اس قوت کا نام ہے جس سے انسان آوازوں کو محسوس کرتا ہے - سننے کو بھی ، اور کبھی کبھی خود کان کو بھی کہدیتے ہیں - نیز جو چیز سنی جائے اسے بھی سَمْعٌ کہدیتے ہیں - سَمِیْعٌ کے معنے سننے والا اور سنانے والا دونوں آتے ہیں (اگرچہ بعض علمائے لغت نے دوسرے معنوں کی تردید کی ہے) - اِسْتَمَعَ اِلَیْہِ کے معنے ہیں کسی کیطرف متوجہ ہونا - کان لگانا اور بغور سننا - لیکن قرآن کریم میں یَسْتَمِعُوْنَ اِلَیْکَ (۱۰/۴۲) سے مراد وہ لوگ ہیں جو بظاہر ایسے دکھائی دیں کہ وہ بڑی توجہ سے سن رہے ہیں لیکن درحقیقت سن نہ رہے ہوں - انہیں وہ بہرا کہتا ہے - یعنی عقل سے کام نہ لینے والے - (۱۰/۴۲) -

اِسْمَعْ غَیْرَ مُسْمَعٍ - (۴/۴۶) اس کے یہ معنی ہیں کہ تو ہماری بات سن ، اگرچہ تیری بات سنی نہیں جائیگی - راغب نے کہا ہے کہ یہ قول طنزاً بہرا ہو جانے کی بددعا کے لئے ، اور بصورت دیگر دعا کے لئے بولا جاتا ہے - کبھی کبھی سَمْعٌ کا اطلاق خود فہم و تدبر پر بھی ہوتا ہے - یعنے اَسْمَعَ کے معنے اَفْہَمَ (کسی کو سمجھا دینا) بھی آتے ہیں - نیز اس لفظ کا اطلاق اطاعت پر بھی کر دیا جاتا ہے - یعنے اِسْمَعُوْنِ کے معنے اَطِیْعُوْنِ ہوتے ہیں * - (۳/۹۳) - سَمِعَ لَہٗ کے معنی ہیں اس کی بات کو قبول کیا * -

قرآن کریم نے حصول علم کے لئے سمع ، بصر اور قلب کا ذکر کیا ہے - سماعت و بصارت ان حواس (Senses) کی ترجمان ہیں جنکے ذریعہ محسوس اشیاء کے متعلق معلومات ذہن انسانی تک پہنچتی ہیں - یعنے یہ علم محسوسات (Perceptual knowledge) کے ذرائع ہیں - ان ذرائع سے جو معلومات (Sense Data) قلب (Mind) تک پہنچتا ہے وہ اس سے تصورات (Concepts) متعین کرتا ہے - اسطرح سمع ، بصر و قلب سے (Conceptual knowledge) حاصل ہوتا ہے - قرآن کریم علم محسوسات اور علم تصورات پر بڑا زور دیتا ہے اور جو لوگ سمع و بصر و قلب ** سے کام نہیں لیتے انہیں جہنمی قرار دیتا ہے (۷/۱۷۹) - لیکن وہ اسکے ساتھ یہ بھی کہتا ہے کہ جب انسان پر جذبات غالب آجائیں تو پھراسکے ذرائع علم اسے صحیح نتیجہ تک کبھی نہیں پہنچاتے (۴۵/۲۳ ، ۲/۱۷) - آپ نے دیکھا ہوگا کہ (مثلاً) غصہ میں انسان کسطرح اندھا اور بہرا ہو جاتا ہے - یہی حال دوسرے جذبات کا ہے -

* تاج - ** نیز دیکھئے عنوانات ق - ل - ب اور ب - ص - ر

لالچ میں انسان وہ کچھ کر بیٹھتا ہے جس پر ہر ہوشمند ھنستا ہے ۔ اور تعصب میں انسان دوسرے کے نقطہ نگاہ کو کبھی سمجھ ہی نہیں سکتا ۔ جس طرح نشے کی حالت میں حواس صحیح کام نہیں دے سکتے اسی طرح جذبات سے مغلوب ہونے کی حالت میں عقل بیکار ہو جاتی ہے ۔ اسے قرآن کریم خَتَمَ اللّٰهُ عَلٰی قُلُوْبِهِمْ وَعَلٰی سَمْعِهِمْ وَعَلٰی اَبْصَارِهِمْ غِشَاوَةٌ (۲/۷) سے تعبیر کرتا ہے ۔ آنکھوں پر پردے پڑجانا ۔ کانوں میں ڈاٹ لگ جانا ۔ اور دلوں پر مہریں لگ جانا * ۔ علم اُسی وقت صحیح نتائج تک پہنچا سکتا ہے جب اس سے وحی کی روشنی میں کام لیا جائے ۔ کیونکہ وحی کے ذریعہ وہ اصولِ زندگی ملتے ہیں جن میں انسانی جذبات کی آمیزش نہیں ہوتی ۔ انسان اپنے عقل و فہم سے جو اصول حیات بھی وضع کریگا وہ اسکے جذبات کی آمیزش سے خالی نہیں رہ سکتے ۔

سَمَّاعٌ ۔ جاسوس کو بھی کہتے ہیں ** (۹/۴۷) ۔

سورۃ کہف میں ہے اَبْصِرْ بِهٖ وَاَسْمِعْ (۱۸/۲۶) کیا خوب اسکا دیکھنا اور کیا خوب اسکا سننا ہے ۔

مُسْمِعٍ ۔ سنانے والا (۳۵/۲۲) ۔ مُسْتَمِعٌ ۔ سننے والا (۵۲/۳۸) ۔

اِسْتَمَعَ ۔ (چھپ کر) سننا (۷۲/۱) ۔ کان لگا کر غور سے سننا (۲۰/۱۳) ۔

ابن فارس نے کہا ہے کہ اَلسَّمْعُ اور اَلسِّمْعُ ۔ ذکر جمیل اور شہرت کو بھی کہتے ہیں ۔

س م ک

اَلسَّمْکُ ۔ گھر کی بلندی یا چھت ۔ قَدْ سَمَکَهٗ ۔ اس نے اسکو بلند کر دیا *** ۔ اَلسِّمَاکُ ۔ وہ چیز جس سے کسی چیز کو بلند کیا جائے ۔ اَلْمِسْمَاکُ ۔ لکڑی جو خیمہ میں لگائی جاتی ہے تا کہ وہ اونچا رہے ۔ اَلسَّمَکُ ۔ مچھلی کو کہتے ہیں ** ۔ (کیونکہ وہ درمیان سے موٹی اور اونچی ہوتی ہے) ۔

قرآن کریم میں ہے رَفَعَ سَمْکَهَا (۷۹/۲۸) خدا نے (آسمان کی) بلندی یا چھت کو اونچا کر دیا ۔ فضائے سماوی کو بہت بلندی تک لے گیا ۔ [(Space) کی بلندی یا وسعت لامحدود ہے ۔]

* دیکھئے عنوان غ ۔ ت ۔ م ۔ **تاج ***راغب ۔

س م م

اَلسَّمُّ - تنگ سوراخ - جیسے سوئی کا ناکہ - (۷/۴۰) - یا کان اور ناک کا سوراخ - نیز زہر کو بھی کہتے ہیں - مَسَامٌّ - جلد کے باریک سوراخ - اَلسَّمَامُ - ہر ہلکی پھلکی اور تیز چیز - اَلسَّمُوْمُ - تیز گرم ہوا (لُو) جو اکثر گرمی کے دنوں میں چلتی ہے * - قرآن کریم میں ہے فِیْ سَمُوْمٍ وَّحَمِیْمٍ (۵۶/۴۲) - سورۃ حجر میں نَارِ السَّمُوْمِ (۱۵/۲۷) آیا ہے -

ابن فارس نے اس کے بنیادی معنی بتائے ہیں؛ کسی چیز میں داخل ہونے کی جگہ - وہ لکھتا ہے کہ زہر کو سَمٌّ اسی لئے کہتے ہیں کہ وہ بدن میں گھس جاتا ہے ، اور سَمُوْمٌ گرم ہوا کو کہتے ہیں ، اس لئے کہ وہ تیزی کی وجہ سے بدن میں گھس جاتی ہے - راغب نے لکھا ہے کہ سَمَّہٗ کے معنے ہیں اس میں گھس گیا ، نیز سَمُوْمٌ اس گرم ہوا کو کہتے ہیں جو زہر کا سا اثر کرتی ہے ** -

س م ن

سَمِنَ - سَمَانَۃً - وہ فربہ ہوا - موٹا تازہ ہوا - سَامِنٌ - سَمِیْنٌ - (جمع سِمَانٌ) فربہ * - قرآن کریم میں ہے بَقَرٰتٍ سِمَانٍ (۱۲/۴۳) - موٹی گائیں - یا بِعِجْلٍ سَمِیْنٍ (۵۱/۲۶) - موٹا بچھڑا اَسْمَنَ الرَّجُلُ - آدمی موٹا تازہ ہو گیا - سَمَّنَہٗ - وَاَسْمَنَہٗ - اسے موٹا کر دیا * - سورۃ غاشیہ میں جہنم کے کھانے کے متعلق ہے لَا یُسْمِنُ (۸۸/۷) - وہ موٹا نہیں کرتا - بدن کو بڑھاتا نہیں - ذلت و رسوائی کی روٹی سے فربہی کیسے حاصل ہو سکتی ہے ؟ اَلسَّمْنُ - گھی کو کہتے ہیں جس کے کھانے سے انسان موٹا ہو جاتا ہے -

س م و

سَمَآءٌ (جمع سَمٰوٰتٌ) آسمان کو کہتے ہیں کیونکہ وہ زمین پر بلند اور سایہ فگن ہوتا ہے - نیز ہر اس چیز کو جو تمہارے اوپر چھائی ہوئی اور سایہ فگن ہو ، سَمَآءٌ کہینگے - چنانچہ گھر کی ہر چھت بھی سَمَآءٌ کہلاتی ہے - فقہ اللغۃ میں بھی سَمَآءٌ کی یہی تعریف کی گئی ہے - راغب نے کہا ہے کہ ہر چیز اپنے سے نچلی چیز کی نسبت سے سَمَآءٌ کہلاتی ہے اور اپنے سے اوپر کی چیز کی نسبت سے اَرْضٌ - نیز بادل اور بارش کو بھی سَمَآءٌ کہتے ہیں - پودے اور سبزے کو بھی سَمَآءٌ کہتے ہیں کیونکہ وہ زمین سے اونچا ہوتا ہے *** -

---

* تاج - ** راغب - ***تاج نیز ابن قتیبہ - القرطین ج/۲ صفحہ ۲۸ -

اِسْمٌ* کے معنے ہیں کسی چیز کی علامت جس سے اسے پہچانا جائے۔ پھر نام کو بھی اِسْمٌ* کہتے ہیں ، اس کی جمع اَسْمَاءٌ* ہے۔ اس کا مادہ بھی س۔ م۔ و ہے۔ اس جہت سے کہ اسم سے مسمی پہچانا جاتا ہے اوراسی سے اسے بلندی و عزت حاصل ہوتی ہے۔ سَمِیٌّ کے معنے ہمنام اور نظیرو ہم پلہ کے آتے ہیں۔ مُسَامَاۃٌ* کے معنے باھمی مفاخرت کے آتے ہیں* ۔ سَمّٰی تَسْمِیَۃً ۔ نام رکھنا ۔ اَلْمُسَمّٰی کے معنے نام رکھا ہوا ، بتایا ہوا ، نامزد کیا ہوا ۔ نیز معین ، مقرر اور معلوم* ۔

صاحب مفردات نے عَلَّمَ اٰدَمَ الْاَسْمَاءَ پر بحث کرتے ہوئے لکھا ہے کہ مَعْرِفَۃُ الْاَسْمَاءِ لَا تَحْصُلُ اِلَّا بِمَعْرِفَۃِ الْمُسَمّٰی ۔ جب تک مسمّٰی کا علم نہ ہو اس کے اَسْمَاء کا تعارف کچھ فائدہ نہیں دیتا*** ۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ آدم کو علم اشیاء کی ایسی صلاحیت دی گئی ہے کہ وہ ہر چیز کو اس کی شکل اور اس کے خواص سے معلوم کرکے اس کو پہچاننے کے لئے نام رکھتا ہے ۔

قرآن کریم میں اَرْضٌ* وَ سَمَاءٌ* بے شمار مقامات میں آتا ہے ۔ اس میں شبہ نہیں کہ ہماری اس زمین کو بھی ، جس پر ہم رہتے ہیں ، اَرْضٌ* کہتے ہیں ۔ لیکن چونکہ ہر بلندی کو (پستی کی نسبت سے) سَمَاءٌ* اور ہر پستی کو (اس کی بلندی کی نسبت سے) اَرْضٌ* کہتے ہیں ، اس لئے اَرْضٌ* وَ سَمَاءٌ* کے معنے کائنات کی پستیاں اور بلندیاں ہونگے ۔ اور جب اَرْضٌ* کو سَمَاءٌ* کے مقابل میں لایا جائیگا تو سَمَاءٌ* سے مفہوم کائناتی زندگی اور اس کا نظام بھی ہوگا ، اور اَرْضٌ* سے مراد انسان کی معاشرتی ، معاشی اور تمدنی زندگی ۔ نیز سَمَاءٌ* یا سَمٰوٰتٌ* سے مراد محض اجرامِ فلکی ہی نہیں ہونگے بلکہ فضا کی بلندیوں میں پھیلی ہوئی تمام توانائیاں مثل ایتھر اور ایٹم وغیرہ بھی ہونگے ۔ یعنی فضا مع اپنے مشمولات کے ۔

قرآن کریم میں جہاں جہاں اَرْضٌ* وَ سَمَاءٌ* کے الفاظ آئے ہیں سیاق وسباق پر غور کرنے سے بآسانی سمجھ میں آ جائیگا کہ اُس جگہ سَمَاءٌ* میں بلندی کا پہلو ہے اور اَرْضٌ* میں پستی کا ۔ خواہ وہ محسوس اشیاء میں ہو ۔ خواہ منصب اور مرتبہ کے لحاظ سے اور خواہ کائناتی قوانین کے مقابلہ میں انسان کی معاشرتی زندگی ہو جسے اس نے اپنی مفاد پرستیوں کے سانچے میں ڈھال رکھا ہے ۔ (مزید بحث ارض کے عنوان کے تحت آچکی ہے) ۔

---

* تاج ۔ **محیط ۔ ***راغب ۔

قرآن کریم میں ہے کہ وَ عَلَّمَ آدَمَ الۡاَسۡمَآءَ کُلَّهَا (۲/۳۱)۔ آدم کو تمام اشیاء کے اسماء سکھا دئیے گئے۔ آدم سے مراد خود آدمی ہے۔ یعنی انسان (دیکھئے عنوان ا۔ د۔ م) جیسا کہ اوپر لکھا جاچکا ہے، اسماء کا جاننا کچھ فائدہ نہیں دے سکتا جب تک آپ کو مسمّٰی (جس چیز کا وہ نام ہے) اس کا علم نہ ہو۔ لہذا آدم کو جو علم الاسماء دیا گیا تو اس کے معنے یہ ہیں کہ انسان میں اشیائے کائنات کے متعلق معلومات حاصل کرنے کی استعداد رکھ دی گئی ہے، اس کا نتیجہ یہ ہے کہ ملائکہ (کائنات میں کام کرنے والی قوتیں) اس کے سامنے سر بسجود ہیں۔ جب انسان اس قانون سے واقف ہو جاتا ہے جو کائنات میں کارفرما ہے تو جو جو قوتیں اس قانون کے مطابق کام کر رہی ہیں وہ سب اس کے تابع فرمان ہو جاتی ہیں۔ لہذا جس قدر کوئی قوم اشیائے فطرت کے متعلق معلومات بہم پہنچاکر انہیں اپنے تابع فرمان کرلے گی اسی قدر وہ مسجود ملائکہ بنتی جائے گی۔ اس سے اگلا مرحلہ یہ ہے کہ ان قوتوں کا استعمال کس طرح کیا جائے۔ سو اس کے متعلق فرمادیا کہ فَمَنۡ تَبِعَ هُدَایَ فَلَا خَوۡفٌ عَلَیۡهِمۡ وَ لَا هُمۡ یَحۡزَنُوۡنَ (۲/۳۸)۔ جو قوم وحی خداوندی کا اتباع کریگی اسے کوئی خوف و حزن نہیں ہوگا۔ اور جو قوم انہیں اپنی مرضی کے مطابق (اپنی مفاد پرستیوں کے لئے) صرف کرے گی وہ خود بھی ہلاکتوں میں پڑیگی اور دوسروں کے لئے بھی باعث مصیبت بن جائے گی۔ اُولٰٓئِکَ اَصۡحٰبُ النَّارِ هُمۡ فِیۡهَا خٰلِدُوۡنَ (۲/۳۹)۔ اگر تسخیر فطرت کرنے والی قوم کو "آدم" (محض آدمی) کہا جائے تو اشیائے فطرت کو قوانین خداوندی کے مطابق صرف کرنے والی قوم کو "مومن" کہا جائے گا۔ اور جو قوم نہ تسخیرِ فطرت کرے اور نہ ہی اتباعِ قوانین خداوندی تو اسے—؟ کہتے ہوئے جھجک محسوس ہوتی ہے لیکن بہر حال کہنا ہی پڑتا ہے، کہ اسے دور حاضر کے مسلمان کہا جائے گا! یا للعجب۔

"آدم" کے علم الاسماء کے ضمن میں ایک مغربی ڈاکٹر نے اپنے نقطہ نگاہ سے بڑی دلچسپ بات لکھی ہے۔ وہ کہتا ہے کہ

> آدم پر تمام زندہ اشیاء کا نام رکھنے کی ذمہ داری عائد کی گئی۔ یہ بہت بڑی ذمہ داری اور مشکل کام تھا۔ اس لئے کہ جن چیزوں کا نام نہیں رکھا جاتا ان کے خواص بھی غیر متعین رہ جاتے ہیں۔ اور جن چیزوں کے غلط نام رکھے جاتے ہیں، ان سے بڑے نقصان پہنچتے ہیں*۔

*Dr. M. L. Tyler in "Homeo. Drug Pictures" (Preface).

اس سے بھی مراد، کائنات کے علوم طبعی کی تحصیل ہے جو ''آدمیت'' کی علامت ہے۔ ''غلط نام'' رکھنے کے ضمن میں قرآن کریم نے کہا ہے کہ جنہیں تم (خدا کے علاوہ) اپنا معبود سمجھتے ہو وہ بجز این نیست کہ اَسْمَاءٌ سَمَّيْتُمُوْهَا اَنْتُمْ وَ اٰبَاؤُكُمْ (۱۲/۴۰) - ''یونہی کچھ نام ہیں جو تم نے اور تمہارے آباء و اجداد نے رکھ لئے ہیں''۔ مَا اَنْزَلَ اللّٰهُ بِهَا مِنْ سُلْطَانٍ (۱۲/۴۰) - ''اللہ نے ان کے لئے کوئی سند نازل نہیں کی''۔ یہ جو ہمارے ہاں بھی بڑے بڑے آستانے اور درگاہیں سجدہ گاہِ انام بن رہی ہیں، ان کی وجہ صرف یہ ہے کہ ان کے بڑے بڑے نام رکھ دئے گئے ہیں اور ان ناموں کو شہرت دے دی گئی ہے۔ اگر ان کے ایسے نام نہ رکھے جائیں تو وہ مٹی اور پتھر کی عمارتوں سے زیادہ کچھ حیثیت نہ رکھیں۔ حقیقت یہ ہے کہ کائنات میں ہر شے کا صحیح مقام وہی ہے جو اسے خدا کا قانون عطا کرے۔ کائناتی دنیا میں اس کا قانونِ کائنات، اور انسانی دنیا میں ضابطۂ وحی (قرآن عظیم) - باقی سب بتانِ آزری ہیں۔

س ن ب ل

اَلسُّنْبُلُ - بالوں اور خوشوں کو کہتے ہیں۔ اس کا واحد اَلسُّنْبُلَةُ ہے (جمع سَنَابِلُ وسُنْبُلَاتٌ) بال۔ خوشہ (۲/۲۶۱)۔ قَدْ سَنْبَلَ الزَّرْعُ۔ کھیتی میں بالیں پڑ گئیں *۔ (یہ لفظ غلے کے لئے آتا ہے۔ پھلوں کے لئے نہیں)۔

س ن د

اَلسَّنَدُ - وہ چیز جسکے ذریعہ کوئی آدمی سہارا لیے۔ سَنَدَ اِلَيْهِ يَسْنُدُ - اسنے ٹیک لگائی * سَنَّدَ الشَّيْءَ - اسنے اس چیز کو سہارا دیکر مضبوط کر دیا - اَلسَّنَدُ - بلند پہاڑ جو تمہارے سامنے ہو - اَلسَّنْدَانُ - لوہار کا اہرن جس پر لوہے کو گرم کر کے کوٹا جاتا ہے **۔

اَلسَّنَدُ - چادر کی ایک قسم جو یمن میں بنتی تھی - سَنَّدَ الرَّجُلُ - آدمی نے چادر اوڑھ لی * - قرآن کریم میں منافقین کو خُشُبٌ مُّسَنَّدَةٌ (۶۳/۴) سے تشبیہ دی گئی ہے - اسکے یہ معنے بھی ہیں کہ وہ ایسی لکڑیاں ہیں جو دیوار کے سہارے کھڑی کر دی گئی ہوں - اور یہ بھی کہ وہ انسان نہیں، لکڑیاں ہیں جنہیں کپڑے پہنا دئے گئے ہوں - پہلے معنے زیادہ مناسب نظر آتے ہیں کیونکہ منافق میں خود اعتمادی نہیں ہوتی اور وہ ہمیشہ آسرے

---

* تاج - ** محیط -

ڈھونڈتا رهتا ھے ۔ دوسرے معنی اس جہت سے درست ھیں کہ منافق کے اندر کچھ اور ھوتا ھے اور باھر کچھ اور ۔ اور جو کچھ باھر ھوتا ھے اسے وہ خوشنما بنا کر دکھاتا ھے ۔ نیز اس کے یہ معنے بھی ھیں کہ منافق لکڑیوں کی طرح ایک دوسرے کے سہارے ھی کھڑے رہ سکتے ھیں ۔ اور اندر سے وہ کندہ نا تراش ھوتے ھیں لیکن ان کا ظاھر بڑا مزین اور خوشنما ھوتا ھے ۔

س ن د س

سُنْدُسٌ ۔ باریک اور اعلیٰ قسم کے ریشم کو کہتے ھیں ۔ یہ لفظ معرب ھے * ۔

قرآن کریم میں ھے ثِیَاباً خُضْراً مِنْ سُنْدُسٍ (۱۸/۳۱) ۔ "سبز ریشمی کپڑے" ۔

س ن م

اَلسَّنَامُ ۔ اونٹ کا کوھان ۔ اَلسَّنِمُ مِنَ النَّبْتِ ۔ بلند پودہ جسکے پھول (یا بالیں) نکل آئے ھوں ۔ سَنَّمَ الْاِنَاءَ تَسْنِیْماً ۔ اسنے برتن کو اس طرح بھر دیا کہ جو چیز اس میں ڈالی گئی تھی (مثلاً غلہ وغیرہ) وہ اس کے کناروں سے بھی اونچی ھوگئی ۔ تَسَنَّمَ الْحَائِطَ ۔ وہ دیوار پر چڑھ گیا ۔ اَسْنَمَتِ النَّارُ ۔ آگ کے شعلے بلند ھو گئے ۔ سَنَامُ کُلِّ شَیْءٍ ۔ ھر شے کا بلند حصہ یا بہترین حصہ ** ۔ ابن فارس نے کہا ھے کہ اس کے بنیادی معنی رفعت اور بلندی کے ھیں ۔

قرآن کریم میں تَسْنِیْمٌ آیا ھے جس کی تشریح ان الفاظ سے کر دی گئی ھے کہ عَیْناً یَشْرَبُ بِهَا الْمُقَرَّبُوْنَ (۸۳/۲۸) ۔ "ایسا چشمہ جس سے مقربین پیتے ھیں" ۔ اس میں بلندیوں کا تصور ھے ۔ یعنی زندگی کے ارتقائی مدارج ۔ انسانیت کی رفعتیں ۔ صلاحیتوں کی بھرپور نشو و نما ۔

س ن ن

اَلسِّنُّ ۔ دانت * ۔ (۵/۴۵) ۔ چونکہ جانوروں کی عمر دانت دیکھکر بتائی جاتی ھے اس لئے اس کے معنے عمر کے بھی آتے ھیں ۔ اَسَنَّ الرَّجُلُ ۔ آدمی بڑی عمر کا ھوگیا ۔ اَلسُّنَّةُ ۔ چہرہ ۔ صورت ۔ نیز چہرے کا کھلا اور نمایاں حصہ ۔ نیز راستہ ، طریقہ ، دستور ، اور قانون ۔ اس کی جمع سُنَنٌ ھے ۔ اسی

---

* تاج و محیط ۔ ** تاج و راغب ۔

ہے سَنَنُ الطَّرِیْقِ ۔ (سین کے زبر ۔ زیر اور پیش کے ساتھ ۔ یہ سُنَّةٌ کی جمع نہیں ۔ ایک الگ لفظ ہے ۔) راستے کے کھلے واضح اور نمایاں حصہ کو کہتے ہیں* ۔ یہیں سے اس کے معنے طریقہ ، مسلک ، معمول اور قانون کے ہوگئے۔ وَلَا تَجِدُ لِسُنَّتِنَا تَحْوِیْلًا (۱۷/۷۷) ۔ ''تم ہمارے طریقہ (قاعدہ۔ قانون) میں کوئی تبدیلی نہیں پاؤ گے'' ۔ سورۃ فاطر میں ہے ۔ فَهَلْ يَنْظُرُوْنَ اِلَّا سُنَّتَ الْاَوَّلِيْنَ (۳۵/۴۳) ۔ اب لوگوں کو صرف اس کا انتظار ہے کہ جو کچھ ان جیسی پہلی اقوام کے ساتھ ہوا ہے وہی کچھ ان کے ساتھ ہو جائے ۔ سورۃ آل عمران میں ہے ۔ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِكُمْ سُنَنٌ (۳/۱۳۶) ۔ تم سے پہلے بہت سے مسلک و مشرب طور طریقے ، نظام ہائے حیات گذر چکے ہیں ۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی ہیں کسی چیز کا جاری رہنا ۔ اور سہولت کے ساتھ اس کا یکے بعد دیگرے آتے رہنا ۔ سَنَّ الشَّیْءَ کے معنے کسی چیز کو سہل اور آسان کر دینا ہیں** ۔ اور سَنَّ التُّرَابَ عَلٰی وَجْهِ الْاَرْضِ کے معنی ہیں زمین پر مٹی کو آہستہ اور نرمی سے ڈالا حتیٰکہ وہ بند کی طرح بن گئی** ۔

قرآن کریم میں انسانی تخلیق کے سلسلہ میں مِنْ حَمَاٍ مَّسْنُوْنٍ (۱۵/۲۶) آیا ہے ۔ اس کے معنے عام طور پر سڑے ہوئے گارے کے کئے جاتے ہیں ۔ لین نے (مختلف اسناد کے ساتھ) لکھا ہے کہ سَنَنْتُ الْحَجَرَ عَلَی الْحَجَرِ کے معنے ہیں ''میں نے پتھر پر پتھر رکھکر گھسا'' ۔ اس طرح پتھر پر پتھر رکھ کر (اور پانی ڈال کر) گھسنے سے جو سڑا ہوا مرکب نکلتا ہے اسے سَنِیْنٌ کہتے ہیں ۔ جب وہ کچھ عرصہ تک پڑا رہے تو سخت ہو جاتا ہے**** ۔ بعض نے کہا ہے کہ مَسْنُوْنٌ کے معنے تر اور نم کے ہیں ۔ ابو الہیثم نے کہا ہے کہ سَنَّ الْمَاءُ کے معنے ہیں پانی متغیر ہوگیا* ۔

قرآن کریم نے کہا ہے کہ انسان کی تخلیق کی ابتدا مٹی سے ہوئی تھی ۔ وہ مٹی جس کے ساتھ پانی ملا تھا ۔ یعنی زندگی کی ابتداء جماد (Inorganic Matter) کے ساتھ پانی کی آمیزش سے ہوئی ۔ جب ان دونوں کی آمیزش کے بعد قرن ہا قرن گزر گئے اور اس میں کافی تغیر و تبدل ہوتا گیا تو اس سے زندگی کی نمود ہو گئی ۔ اس کو حَمَاٍ مَّسْنُوْنٍ سے تعبیر کیا گیا ہے ۔ یاد رہے کہ اس سے اُس طریق کا بتانا مقصود ہے جس سے زندگی محسوس شکل میں ہمارے سامنے آگئی ۔ یہ مطلب نہیں کہ زندگی سادہ (Matter) کی پیداوار ہے ۔

*تاج ۔ **محیط ۔ ***راغب ۔ ****لین ۔

قرآن کریم کا یہ اعلان کہ فَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّتِ اللّٰہِ تَبْدِیْلًا (۳۵/۴۳)۔ ایک عظیم حقیقت کا اظہار ہے جس پر تمام سائنٹیفک تحقیقات کی عمارت استوار ہے اور جو قانونِ مکافاتِ عمل کی روح ہے ۔ آج سے ڈیڑھ ہزار سال قبل یہ کہنا کہ "خدا کے قانون میں کبھی تبدیلی نہیں ہوتی" کسی انسان کا کام نہیں تھا ۔ انسان تو ابھی کل تک قانون (Law) کے تصور سے نا آشنا تھا ۔ دنیا میں جس قدر سائنٹیفک ایجادات ہوئی ہیں ، اور ہوتی چلی جا رہی ہیں وہ سب اس محکم اصول کی رہینِ منت ہیں کہ قوانین خداوندی میں کسی قسم کی تبدیلی نہیں ہوتی ۔ یہ اصول اس قدر محکم ہے کہ انسان اس پر کامل اعتماد کر سکتا ہے اور یہی وہ اعتماد ہے جس کے سہارے وہ آسمانی کروں تک جست لگانے سے بھی نہیں جھجکتا ۔ وہ جب ایک دفعہ قانونِ خداوندی کو سمجھ لیتا ہے تو پھر وہ اس یقین کے ماتحت کہ اس قانون میں کبھی تبدیلی نہیں ہوگی ، وہ کچھ ، بلا خوف و خطر ، کرتا چلا جاتا ہے جس کے تصور سے بھی ان لوگوں کی روح کانپتی ہے جو اس حقیقت سے آشنا نہیں ہوتے ۔

جس طرح اس کا یہ اصول خارجی کائنات میں کارفرما ہے اسی طرح انسانی دنیا میں بھی نافذ العمل ہے ۔ اس نے قوموں کے عروج و زوال کے لئے قوانین متعین کر دئے ہیں اور اس کے بعد کہہ دیا ہے کہ ان قوانین میں کبھی تبدیلی نہیں ہوگی ۔ جو قوم ان کے مطابق زندگی بسر کریگی وہ عروج حاصل کرے گی ۔ جو ان کے خلاف جائیگی ، تباہ ہو جائیگی ۔ وَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّتِ اللّٰہِ تَبْدِیْلًا ۔

اس قانون نے خود خدا کے تصور میں بھی ایسا عظیم انقلاب پیدا کیا ہے جس سے انسانی دنیا بدل گئی ہے ۔ انسان اپنے عہد طفولیت میں خدا کو ایک مطلق العنان بادشاہ کی طرح سمجھتا تھا جو کسی قاعدے اور قانون کا پابند نہیں ہوتا ۔ وہ کبھی یونہی بیٹھے بیٹھے ناراض ہو جاتا ہے تو گاؤں کا گاؤں تباہ کر دیتا ہے ۔ خوش ہو جاتا ہے تو مجرموں کو جاگیریں بخش دیتا ہے ۔ ایسے خدا سے انسان ہر وقت ڈرتا اور کانپتا رہتا تھا کہ نہ جانے وہ کس وقت کیا کر دے ۔ اس لئے اس کی انتہائی کوشش یہ ہوتی تھی کہ وہ کسی نہ کسی طرح خدا کو خوش رکھے ۔

قرآن کریم نے آکر یہ انقلاب آفریں اعلان کیا کہ بیشک خدا قادرِ مطلق اور حاکم اعلیٰ ہے لیکن اس نے کائنات اور انسانوں کے لئے قوانین مرتب کر دئے ہیں ۔ اور ، بے انتہا اور لامحدود قدرتوں اور قوتوں کا مالک

ہونے کے باوجود ، اس نے یہ کہدیا ہے کہ وہ اپنے ان قوانین میں تبدیلی نہیں کریگا - لہذا ، انسانی زندگی کے فیصلے خدا کے قوانین کے مطابق ہونگے - یعنی انسان کے ہر عمل کا نتیجہ خدا کے قانون کے مطابق مرتب ہوگا - وَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّتِ اللّٰهِ تَبْدِیْلاً - اور اس کے قانون میں کبھی تبدیلی نہیں ہوگی-

"قانون کے مطابق سب کچھ کرنے والا خدا" —اور قانون غیر متبدل - سوچئے کہ خدا کے اس تصور نے انسان کو کہاں سے کہاں پہنچا دیا ہے - یہ قرآن ہی کا صدقہ ہے -

س ن ہ

سَنِہَ الطَّعَامُ وَ الشَّرَابُ سَنْہًا وَ تَسَنَّہَ - کھانے اور پینے کی چیز خراب ہوگئی - بگڑ گئی - اَلتَّسَنُّہُ بھس جانا - سڑ جانا - زمانہ گزرنے سے کسی چیز میں تغیر واقع ہو جانا - یہ لفظ روٹی کے بُھس جانے اور پینے کی چیزوں کے سڑ جانے پر بولا جاتا ہے - طَعَامٌ سَنِہٌ سڑا ہوا کھانا - خُبْزٌ مُتَسَنِّہٌ بھسی ہوئی روٹی - قرآن کریم میں ہے لَمْ یَتَسَنَّہْ ($\frac{2}{259}$) وہ خراب نہیں ہوا - بگڑا نہیں - یعنی اتنی طویل مدت گزرنے کے باوجود وہ متغیر وسالخوردہ نہیں ہوا* -

ابن فارس نے کہا ہے کہ سَنَہٌ کے بنیادی معنے زمانہ پر دلالت کرتے ہیں - سَنَہَتِ النَّخْلَۃُ - کھجور پر کئی سال گزر گئے -

بیشتر علمائے لغت کا خیال ہے کہ سَنَۃٌ (بمعنی سال) اسی مادہ سے ہے - لیکن ہم نے سَنَۃٌ اور اس کے بعض مشتقات (س - ن - و) کے تحت لکھے ہیں - لہذا اس مادہ کی تکمیل کے لئے اس عنوان (س - ن - و) کو بھی دیکھ لیجئے -

س ن و

اَلسَّنَۃُ کے معنے ہیں سال (اس کی جمع سَنَوَاتٌ ، سِنُوْنَ اور سِنِیْنَ ہے) - اس کے مادہ کے متعلق اختلاف ہے - ایک رائے تو یہ ہے کہ سَنَۃٌ کی اصل (س - ن - ہ) ہے ، کیونکہ اہل عرب کہتے ہیں سَانَہْتُ فُلَانًا - میں نے فلاں سے سالانہ اجرت پر معاملہ کرلیا - ابن فارس نے کہا ہے کہ سَنَہٌ کے بنیادی معنی زمانہ پر دلالت کرتے ہیں - سَنَہَتِ النَّخْلَۃُ - کھجور پر کئی سال گزر گئے - دوسری رائے یہ ہے کہ اس کی

*تاج و محیط -

اصل سَنَوٌ ھے جس سے سَنَا ۔ یَسْنُوْ کے معنے ھیں کنویں کے گردا گرد گھومنا ۔ چنانچہ اَلسَّانِیَۃُ ۔ اس جانور کو کہتے ھیں جو پانی نکالنے کیلئے کنویں کے ارد گرد گھمایا جاتا ھے ۔ اسی سے سورج کے ایک دورے کو اَلسَّنَۃُ کہتے ھیں ۔ (اسے دَارٌ بھی کہتے ھیں) ۔ اور چونکہ یہ دورہ ایک سال میں پورا ھوتا ھے اس لئے اَلسَّنَۃُ کے معنے ھیں ایک سال ۔ اَلسَّنَۃُ شمسی سال ھوتا ھے، اور اَلْعَامُ ، قمری سال ۔ نیز اَلسَّنَۃُ ایسے سال کو کہتے ھیں جس میں قحط اور شدت ھو ۔ اور اَلْعَامُ اس سال کو کہتے ھیں جس میں سرسبزی اور خوشحالی ھو ۔ اسی بناء پر کہتے ھیں کہ حضرت نوح کے متعلق جو کہا گیا ھے کہ فَلَبِثَ فِیْھِمْ اَلْفَ سَنَۃٍ اِلَّا خَمْسِیْنَ عَامًا (۲۹/۱۴) ۔ تو اس میں عَامًا وہ مدت ھے جس میں مشکلات سامنے نہیں آئی تھیں اور سَنَۃٌ وہ مدت جو سختیوں کی تھی۔ لین نے لکھا ھے کہ سَنَۃٌ کا اطلاق فصل پر بھی ھوتا ھے جو سال میں چار ھوتی ھیں ۔ اس لحاظ سے اَلْفَ سَنَۃٍ کے معنی ھونگے اڑھائی سو سال ۔ اور عَامٌ پورے سال کو کہتے ھیں ۔ تو اس میں سے خَمْسِیْنَ عَامًا نکال دینے سے باقی دو سو سال رہ جاتے ھیں جو ایک انسان کی عمر ھو سکتی ھے ۔ لیکن یہ بہر حال ان لوگوں کے قیاسات ھیں ۔ جب تاریخ کے مزید شواھد سامنے آئیں گے تو اس وقت یقینی طور پر کہا جاسکے گا کہ قرآن کریم کے اس بیان کا صحیح مفہوم کیا ھے کہ ''حضرت نوح اپنے لوگوں میں پچاس کم ایک ھزار سال رھے'' (۲۹/۱۴) ۔ بعض لوگوں کا خیال ھے کہ یہ مدت ان کے زمانہ تعلیم پر دلالت کرتی ھے ۔ یعنی ان کا زمانۂ نبوت اتنا عرصہ رھا ۔ اس کے بعد دوسرے نبی کا زمانہ شروع ھوا ۔

سَنَّاہُ ۔ تَسْنِیَۃً کے معنے ھیں اس کو کھول دیا ۔ سہل کردیا* ۔

س ن ی

اَلسَّنٰی ۔ روشنی ۔ اَلسَّنَاءُ والسَّنٰی ۔ بلندی اور رفعت * ۔

قرآن کریم میں ھے یَکَادُ سَنَا بَرْقِہٖ یَذْھَبُ بِالْاَبْصَارِ (۲۴/۴۳) ۔ ''قریب ھے کہ اس کی بجلی کی چمک آنکھوں میں خیرگی پیدا کر دے'' اس میں سَنَا کے معنے چمک اور خیرگی پیدا کر دینے والی روشنی کے ھیں ۔ ابن فارس نے کہا ھے کہ اس کے بنیادی معنی بلندی اور ارتفاع کے ھیں ۔

س ھ ر

سَھِرَ ۔ یَسْھَرُ ۔ سَھَرًا ۔ (رات کو) جاگنا ۔ سَاھِرٌ ۔ (رات کو) جاگنے والا * ۔ اَلسَّاھِرَۃُ ۔ زمین کا بالائی حصہ، روئے زمین۔ دراصل یہ ایسی

* تاج ۔ محیط ۔ راغب ۔

زمین کے لئے بولا جائیگا جس پر لوگ بکثرت چلتے پھرتے رہیں ۔ گویا وہ انکی وجہ سے بیدار ہے **۔

قرآن کریم میں ہے فَاِذَا هُمْ بِالسَّاهِرَةِ (۷۹/۱۴) اُس (نشاۃ ثانیہ) کے بعد زندگی ہی زندگی ہوگی۔ اور بیداری ہی بیداری ۔ یا نشوونما میں تیزی ۔ کیونکہ اَرْضٌ سَاهِرَةٌ اس زمین کو بھی کہتے ہیں جو بہت جلد پودے اگانے والی ہو*۔ چونکہ حیات اُخروی کی کیفیات ، انسانی شعور کی موجودہ سطح پر سمجھ میں نہیں آسکتیں اس لئے قرآن کریم انہیں تشبیہات اور استعارات کے انداز میں بیان کرتا ہے ۔ نگہ بصیرت ان تشبیہات و استعارات کے پردوں میں حقیقت کا خفیف سا پر تو دیکھ لیتی ہے ۔ اس سے زیادہ اس زندگی میں ممکن ہی نہیں ۔

سریانی زبان میں اَلسَّاهُوْرُ چاند (اَلْقَمَرُ) کو کہتے ہیں ***۔ اور عربی میں چاند گہن کو بھی ۔ (لین) ۔

س ھ ل

اَلسَّهْلُ ۔ اَلسَّهِلُ ۔ نرم چیز ۔ اَلسَّهْلُ مِنَ الْاَرْضِ ۔ نرم زمین ۔ اسکی جمع سُهُوْلٌ آتی ہے *۔ قرآن کریم میں ہے تَتَّخِذُوْنَ مِنْ سُهُوْلِهَا قُصُوْرًا (۷/۷۴) ۔ " تم ہموار اور نرم زمینوں میں محلات تعمیر کرتے ہو " ۔

س ھ م

سَهْمٌ ۔ حصہ ۔ دراصل سَهْمٌ اس تیر کو کہتے ہیں جس سے قرعہ ڈال کر حصے تقسیم کئے جاتے ہیں ۔ نیز گھر کا گزرنے کا راستہ اَلسُّهَامُ ۔ لاغر ہونا اور رنگ کا متغیر ہو جانا ۔ اصل میں یہ اونٹوں کی ایک بیماری ہوتی ہے جس میں انہیں گرمی اور پیاس کی شدت محسوس ہوتی ہے ۔ اَلسُّهُوْمُ ۔ کسی غم یا فکر کی وجہ سے ترشرو ہونا ۔ سَاهَمَ الْقَوْمَ ۔ اسنے قوم کے ساتھ قرعہ اندازی کی ****۔ تیر اندازی میں مقابلہ کیا نیز باہم ایک دوسرے پر غالب آنے کی کوشش کی ۔

قرآن کریم میں قصہ حضرت یونس ؑ میں ہے فَسَاهَمَ (۳۷/۱۴۱) ۔ عام طور پر اس کے معنی کئے جاتے ہیں ۔ اس نے باقیوں کے ساتھ قرعہ ڈالا ۔ لیکن ہمارا خیال ہے کہ فَسَاهَمَ میں کشتی والوں کے ساتھ کوئی تعلق نہیں ۔

* تاج ۔ ** راغب ۔ *** (کتاب الاشتقاق) نیز ابن فارس ۔ **** تاج و محیط و راغب

اللہ تعالےٰ نے کہا ہے کہ (حضرت) یونسؑ نے ہمارے قانون کا مقابلہ کیا۔ فَکَانَ مِنَ الْمُدْحَضِیْنَ۔ (۳۷/۱۴۱)۔ وہ لغزش کہا گیا۔ اس کا پاؤں پھسل گیا۔ حضرت یونسؑ سے ہجرت کا وقت متعین کرنے میں اجتہادی غلطی ہو گئی تھی۔

س ھ و

سَھَا فِی الْاَمْرِ۔ کسی چیز کو بھول جانا۔ اہل لغت نے تصریح کی ہے کہ سَھْوٌ، غَفْلَۃٌ اور نِسْیَانٌ، تینوں لفظ ہم معنے ہیں۔ لیکن بعض نے تخصیص یہ کی ہے کہ سَھْوٌ ان باتوں سے معمولی سی غفلت کو کہتے ہیں جو حافظہ میں موجود ہوتی ہیں۔ اور نِسْیَانٌ کسی چیز کا حافظہ سے بالکل محو ہو جانا ہے۔ ابن الاثیر نے کہا ہے کہ سَھَافِی الشَّیْءِ کے معنے ہیں لاعلمی کی وجہ سے کسی چیز کو چھوڑ دینا۔ اور سَھَاعَنْہُ کے معنے ہیں جان بوجھ کر کسی چیز کو چھوڑ دینا *۔ اَلسَّھْوُ کے معنے ہیں ساکن اور نرم ہونا۔ اَلسَّھْوَۃُ۔ آسانی سے کھنچنے والی نرم کمان کو کہتے ہیں *۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس مادہ کے بیشتر معانی کا تعلق غفلت اور سکون سے ہے۔ جَاءَ سَھْوًا رَھْوًا وہ بڑے سکون کے ساتھ آیا۔

قرآن کریم میں ہے ھُمْ فِیْ غَمْرَۃٍ سَاھُوْنَ (۵۱/۱۱)۔ ” وہ اپنے اشغال میں منہمک، حقیقت سے بے خبر ہیں “۔ دوسری جگہ ہے اَلَّذِیْنَ ھُمْ عَنْ صَلَاتِهِمْ سَاھُوْنَ (۱۰۷/۵)۔ وہ اپنی صلوٰۃ (فرائض منصبی) کیطرف سے یکسر غافل ہیں۔ یا انکی تکمیل میں بہت سست اور ڈھیلے ڈھالے رہتے ہیں (۴/۱۴۲)۔ یا، وہ صلوٰۃ کی حقیقت سے بیخبر ہیں اور صرف اس کے محسوس و مرئی حصہ (تعدیلِ ارکان۔ قیام، رکوع۔ سجود وغیرہ) ہی کو اصل صلوٰۃ سمجھتے ہیں (۱۰۷/۶) کیونکہ یہ بڑی آسانی سے ادا ہو جاتے ہیں اور دیکھنے والوں میں عزت بھی ہو جاتی ہے۔

س و أ

سَاءَہُ۔ یَسُوْءُہُ۔ کسی سے ایسی بات کرنا جو اسے ناگوار ہو۔ سَاءَ الشَّیْءُ۔ کوئی چیز بری ہوتی۔ اَسَاءَ یُسِیْءُ۔ برا کرنا، ناہمواری پیدا کرنا۔ بگاڑ اور ابتری رونما کرنا (یہ اَحْسَنَ کا ضد ہے) اَلسَّیِّئَۃُ۔ زندگی کی ناخوشگواریاں **۔ یہ حَسَنَۃٌ کی ضد ہے۔ اسکا مفہوم سمجھنے کیلئے (ح۔س۔ن)

* تاج۔ راغب و محیط۔ **تاج۔

کا عنوان دیکھئے ۔ چونکہ حسن نام ہوتا ہے کسی چیز کے پورے پورے توازن قائم کردینے کا اس لئے سَیِّئَۃٌ توازن کے بگاڑ کو کہتے ہیں ۔ چنانچہ سَوْءٌ کے معنے فساد ، ہلاکت اور ضرر کے ہوتے ہیں*۔ نیز حَسَنَۃٌ درمیانہ روی کو کہتے ہیں ۔ اس لئے سَیِّئَۃٌ کے معنے ہیں افراط و تفریط**۔ مَسَاوِیءُ ۔ ناخوشگوار امور ، عیوب ، نقائص **۔

اَلسَّوْءَۃُ ۔ بری خصلت ، معیوب بات یا کام ۔ ہر وہ قول و فعل جسکے ظاہر ہونے پر شرم محسوس ہو ۔ بنابریں مرد اور عورت کی شرمگاہ کو بھی کہتے ہیں** ۔ اسکی جمع سَوْآتٌ ہے ($\frac{۷}{۲۰}$ ؛ $\frac{۷}{۲۶}$)۔

قرآن کریم میں سَیِّئَۃٌ بمقابلہ حَسَنَۃٌ ۔ متعدد مقامات پر آیا ہے ۔ (مثلاً $\frac{۳}{۱۱۹}$ ؛ $\frac{۷}{۱۳۱}$)۔ نیز اِقْتِصَادٌ (میانہ روی) کے مقابلہ میں سَاءَ ($\frac{۵}{۶۶}$) ۔

مغموم یا متردد ہونے کے معنے میں ($\frac{۱۱}{۷۷}$) میں سِیْٓءَ بِھِمْ آیا ہے ۔

صحیح روش زندگی کا نتیجہ انسان کی ذات اور معاشرہ میں حسن کی افزائش ہے ۔ یعنی اس سے انسان کی اپنی ذات اور معاشرہ دونوں میں صحیح صحیح توازن قائم ہو جاتا ہے اور زندگی کی ساری خوشگواریاں نصیب ہو جاتی ہیں ۔ اسکے خلاف زندگی بسر کرنے سے توازن بگڑ جاتا ہے اور ناخوشگواریاں پیدا ہو جاتی ہیں ۔ اس لئے قرآن کریم نے کہا ہے کہ اس قسم کی متضاد زندگیاں بسر کرنے والے کبھی ایک دوسرے کے برابر نہیں ہوسکتے($\frac{۴۰}{۵۸}$) ۔ اب سوال یہ ہے کہ اگر کسی معاشرہ کا توازن بگڑا ہوا ہو تو اسکی اصلاح کی صورت کیا ہے ؟ قرآن کریم کہتا ہے کہ تم حسن پیدا کرنے والے کام کرتے جاؤ۔ بگاڑ خود بخود رفع ہو جائیگا۔ اِدْفَعْ بِالَّتِیْ ھِیَ اَحْسَنُ السَّیِّئَۃَ ($\frac{۲۳}{۹۶}$)۔ اگر تم بہت زیادہ ہمواریاں پیدا کرو گے تو ناہمواریاں خود بخود مٹ جائینگی ۔ اِنَّ الْحَسَنٰتِ یُذْھِبْنَ السَّیِّئَاتِ ($\frac{۱۱}{۱۱۴}$) ۔ سورۂ رعد میں مومنین کی صفت یہ بتائی گئی ہے کہ وہ یَدْرَءُوْنَ بِالْحَسَنَۃِ السَّیِّئَۃَ ($\frac{۱۳}{۲۲}$) ۔ نیز ($\frac{۲۸}{۵۴}$)۔ وہ سیئات کو حسنات کے ذریعے دور کر دیتے ہیں ۔ واضح رہے کہ ان آیات سے یہ مفہوم نہیں کہ قرآن کریم '' ایک گال پر طمانچہ مارنے والے کے سامنے دوسرا گال کر دینے '' ۔ یا '' جو کوٹ اتار لے اسے کرتا خود اتار کر دینے '' کی تعلیم دیتا ہے ۔ اس قسم کی تعلیم مجرمین کے حوصلوں کو بڑھا دیتی ہے ۔ اس کے لئے اُس نے قانونِ عدل کی تلقین کی ہے ۔ یعنی جرم

* تاج و لطائف اللغۃ۔ **تاج

کی سزا دینا تاکہ مجرمین کی جرأتیں بے باک نہ ہونے پائیں - لیکن اس کے لئے بھی اس نے اصول یہ دیا ہے کہ جَزٰٓؤُا سَيِّئَةٍ سَيِّئَةٌ مِّثْلُهَا (۴۲/۴۰ - نیز ۱۰/۲۷)- سزا ہمیشہ جرم کی نوعیت اور مقدار کے مناسب اور مطابق ہونی چاہئے- یہ نہیں کہ ذرا سے جرم کی سنگین ترین سزا دیدی جائے - (نیز جہاں اصلاح کا امکان نظر آئے وہاں معاف بھی کر دینا چاہئیے - (۴۲/۴۰) اس سے آپ نے دیکھ لیا ہوگا کہ اس آیت کا یہ مطلب صحیح نہیں کہ جو تم سے برائی کرے تم بھی اس سے اسی طرح کی برائی کرو- اس میں جرم اور اس کی پاداش (تعزیر) کا اصول بیان کیا گیا ہے جو خدا کے قانون مکافات پر مبنی ہے - یعنی سزا ، جرم کی مناسبت سے - وَلَنَجْزِيَنَّهُمْ أَسْوَأَ الَّذِي كَانُوا يَعْمَلُونَ (۴۱/۲۷) ,, یقیناً ہم انہیں ان کے اس قسم کے اعمال پر جو وہ کرتے رہے ہیں بدترین سزا دینگے،،-

تصریحات بالا سے آپ نے دیکھ لیا کہ قرآن کریم انسان کو ایسی زندگی بسر کرنا سکھاتا ہے جس سے اسکی اپنی ذات میں بھی حسن (ہمواری اور خوشگواری) پیدا ہو اور معاشرہ میں بھی - یہ نتیجہ ہوتا ہے قرآنی پروگرام کے مطابق زندگی بسر کرنے کا - اس کے خلاف زندگی بسر کرنے کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ انسان کی اپنی ذات میں بھی ناہمواریاں اور ناخوشگواریاں پیدا ہو جاتی ہیں اور معاشرہ میں بھی - نیکی یا بدی ، بھلائی یا برائی کا قرآنی تصور یہی ہے -

سُوَاعٌ

قوم نوح کا بت تھا (۷۱/۲۳) - عرب کے لوگ اس بت کے نام سے اچھی طرح متعارف تھے - چنانچہ قبیلہ - بنوھذیل کے لوگ اسی نام کے ایک بت کی پرستش کیا کرتے تھے -

س و د

اَلْاَسْوَدُ - اَبْيَضُ کی ضد ہے - یعنے سیاہ - اسکی جمع سُوْدٌ ہے - (۳۵/۲۷) اِسْوَدَّ يَسْوَدُّ - سیاہ ہوا - اَلسَّوَادُ - سیاھی - تاریکی - مال کثیر - شہر کے ارد گرد کے دیہات - بہت بڑی تعداد - عام لوگ - قوم کا بڑا حصہ - اَلسَّائِدُ - سردار یا سَیِّد سے نیچے کا سردار * - اَلسَّيِّدُ - رئیس * - (صاحب سواد - جسکے ساتھ بہت سی جماعت ہو) - بادشاہ - آقا - شوھر -

* تاج -

اَلسِّيَادَةُ ۔ سرداری ۔ اَلْاَسْوَدُ مِنَ الْقَوْمِ ۔ قوم کا سب سے بڑا اور جلیل المرتبہ آدمی ۔ بزرگِ قوم*۔ اَلْاَیَّامُ الْمُسْوَدَّةُ ۔ بدحالی اور تکلیف کے دن**۔ راغب نے لکھا ہے کہ اِبْیِضَاضُ الْوُجُوْہِ سے مراد مسرت وشادمانی ہوتی ہے اور اِسْوِدَادُ الْوُجُوْہِ سے مراد تکلیف اور غم و حزن***۔ (نیز دیکھئے عنوان ب ۔ ی ۔ ض)۔

سَیِّدًا ۔ بمعنے سردار (۳/۳۸) میں آیا ہے ۔ مراد اس سے صاحب عزت و تکریم ہے ۔ اور شوہر کے معنوں میں (۱۲/۲۵) میں ۔ لیکن وہاں یہ لفظ عزیز مصر کے لئے آیا ہے جو اپنی بیوی کے شوہر ہونے کے ساتھ وہاں کا سردار بھی تھا ۔ عام شوہر کے لئے قرآن کریم میں یہ لفظ نہیں آیا ۔ سورۃ نحل میں ہے وَجْهُهٗ مُسْوَدًّا ۔ (۱۶/۵۸) کالا ، سیاہ ۔ یعنے مغموم ۔ سورۃ آل عمران میں ہے تَسْوَدُّ وُجُوْہٌ (۳/۱۰۵) ۔ چہروں کا کالا ہونا یعنی ذلیل ہونا ۔ گھبراہٹ اور پریشانی کی وجہ سے چہروں کا رنگ سیاہ پڑ جانا ۔ (بمقابلہ تَبْیَضُّ ۔ سفید ہونا ۔ باعزت ہونا)۔

س و ر

سَارَ ۔ یَسُوْرُ ۔ سَوْرَةً کے معنے ہیں کسی پر چڑھ جانا ۔ حملہ کرنا ۔ سُرْتُ الْحَائِطَ و تَسَوَّرْتُهٗ کے معنے ہیں میں دیوار پر چڑھ گیا ۔ اَلسُّوْرُ ۔ شہر پناہ کو کہتے ہیں ۔ اسی سے اس کے معنے بلندی ہیں ۔ رفعت ۔ شرف و فضیلت ۔ بلندی و برتری ۔ سَوْرَةُ السُّلْطَانِ ۔ بادشاہ کی سطوت و شوکت ، جاہ وجلال ، اور زور و دبدبہ کے لئے آتا ہے ۔ اَلسِّوَارُ ۔ کنگن کو کہتے ہیں جو سرداری اور مدارج کی بلندی کا نشان ہوتا تھا ۔ (اَسَاوِرُ اسکی جمع ہے) ۔ اَلْاُسْوَارُ یا اَلْاِسْوَارُ ۔ سوار فوج کے کمانڈر کو کہتے ہیں ۔ نیز بہترین تیر انداز اور عمدہ شہسوار کو*۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اَلْاِسْوَارُ عربی لفظ نہیں ہے ۔ اَلسُّوْرَةُ ۔ درجہ و مرتبہ ، قدر و منزلت ، بلندی ۔ نیز اس عمارت کو کہتے ہیں جو خوبصورتی کے ساتھ آسمان کی طرف بلند ہوتی ہوئی اٹھ گئی ہو**۔

قرآن کریم کی سُوْرَةٌ کو سُوْرَةٌ کہنے کی بہت سی توجیہات بیان کی گئی ہیں ۔ بعض کا خیال ہے کہ ان کی بلند مرتبگی کی وجہ سے انہیں سُوْرَةٌ کہا جاتا ہے ۔ بعض نے کہا ہے کہ چونکہ پہلی سورۃ بعد میں آنے والی سورۃ کے لئے سیڑھی کا کام دیتی ہے اس لئے اسے سُوْرَةٌ کہتے ہیں ۔ بعض کہتے ہیں کہ چونکہ یہ منزل بمنزل آتی ہیں اور ان سب کے مجموعہ

*تاج ۔ **محیط ۔ ***راغب ۔

سے قرآن کریم کی عمارت کی تکمیل ہوتی ہے اس لئے انہیں سُوْرَۃٌ کہتے ہیں - بعض نے کہا ہے کہ چونکہ ان میں قرآن کریم کے احکام محفوظ ہوتے ہیں ، جس طرح شہر پناہ سے شہر کی حفاظت ہوتی ہے ، اس لئے انہیں سُوْرَۃٌ کہا جاتا ہے* - نیز علامت کو بھی سُوْرَۃٌ کہتے ہیں** -

سُوْرٌ - مضبوط قوی اور شریف النسل اونٹوں کو بھی کہتے ہیں* -

قرآن کریم میں یہ مادہ قرآنی سورۃ کے لئے (٢/٢٣) میں آیا ہے - اور (٢٣/١) میں بھی - دیوار کے معنوں میں (٥٧/١٣) میں - اور سرداری (کی علامت یعنی کنگن) کے لئے (١٨/٣١ و ٣٥/٣٣ و ٧٦/٢١) میں - سورۃ صؔ میں ہے اِذْ تَسَوَّرُوا الْمِحْرَابَ (٣٨/٢١) - جب وہ دیوار پھاند کر محراب کے اندر آگئے -

جنت میں سونے کے کنگنوں کا جو ذکر آیا ہے (١٨/٣١) تو اس کا مطلب وہ قوت و حشمت اور سرفرازی و سربلندی ہے جو جماعت مومنین کو اس دنیا کی جنتی زندگی میں حاصل ہوتی ہے - باقی رہیں اسکے بعد کی زندگی کی سرداریاں اورسرفرازیاں ، تو اس کے متعلق قرآن کریم نے کہا ہے کہ یہ حقیقت کا تمثیلی بیان ہے - ہم اپنے شعور کی موجودہ سطح کی رو سے ان چیزوں کی کنہ و حقیقت کو نہیں پا سکتے - (دیکھئے عنوان ج - ن - ن) -

س و ط

اَلسَّوْطُ - بعض چیزوں کو دوسری چیزوں کے ساتھ ملانا - خلط ملط کر دینا - ابن فارس نے بھی اس مادہ کے بنیادی معنی یہی بتائے ہیں - اَلسَّوْطُ - چابک (کوڑا) کیونکہ وہ گوشت کو خون کے ساتھ مخلوط کر دیتا ہے - یا بقول ابن فارس کھال میں گھس جاتا ہے - یا پھر اس لئے کہ وہ خود مختلف تسموں کو ملا کر بنا جاتا ہے - جمع اَسْوَاطٌ - اگرچہ اس کے معنے کوڑوں سے مارنے کے ہیں لیکن عربوں کے ہاں ہر شدید اور درد انگیز سزا کو سَوْطَ عَذَابٍ کہدیتے تھے - یعنی سزا کا کوڑا - لیکن صاحب محیط اور راغب کا خیال ہے کہ قرآن کریم میں جو سَوْطَ عَذَابٍ (٨٩/١٢) آیا ہے تو اس سے مفہوم انواع و اقسام (طرح طرح) کے عذاب ہیں*** - ابن فارس نے کہا ہے کہ سَوْطَ عَذَابٍ سے مراد ہے عذاب کا ایک حصہ و مقدار -

س و ع (س ی ع)

سَاعَ - یَسُوْعُ - صاحب محیط نے لکھا ہے کہ اس مادہ میں اصلی معنے ہلاکت اور زوال کے ہوتے ہیں* - چنانچہ کہتے ہیں سَاعَ الشَّیْءُ -

*تاج- **محیط - ***تاج راغب و محیط -

چیز ضائع ہوئی*۔ ھُوَ ضَائِعٌ سَائِعٌ۔ وہ ضائع اور ھلاک ہونے والا ھے۔ نَاقَةٌ مِیسْیَاعٌ اس اونٹنی کو کہتے ھیں جو اپنے بچے کو جنگل میں چھوڑ دے کہ اسے درندے ھلاک کر دیں۔ اَسَاعَہٗ۔ اسے بیکار چھوڑ دیا اور ضائع کر دیا۔ رَجُلٌ مُسِیْعٌ وَمِیسْیَاعٌ لِلْمَالِ۔ مال کو ضائع کر دینے والا آدمی۔ اَلسَّیْعُ۔ زمین کے اوپر بہنے والا پانی۔ سَاعَ الْمَاءُ وَالشَّرَابُ۔ پانی اور شراب زمین پر گر کر بہنے لگی۔ تَسَیَّعَ الْبَقْلُ۔ سبزیاں خشک ہونے لگیں*۔

اَسْوَعَ۔ وہ ایک گھڑی سے دوسری گھڑی میں منتقل ھوا۔ یا ایک گھڑی پیچھے ھوا*۔ سَوْعٌ مِنَ اللَّیْلِ۔ رات کا ایک (پرسکون) حصہ۔ اَلسَّاعَةُ۔ (واوی ھے، یائی نہیں) وقت کے ایک حصہ کو کہتے ھیں (چونکہ وہ گزر جاتا ھے اور وقت میں ھر لمحہ کمی ھوتی جاتی ھے)۔ ابن فارس نے کہا ھے کہ اس کے بنیادی معنی مسلسل گزرتے رھنے کے ھیں۔ نیز مشقت، بُعد اور دوری کو بھی اَلسَّاعَةُ کہتے ھیں۔ اَلسَّاعَةُ۔ ھلاک ھوجانے والوں کو کہتے ھیں*۔

قرآن کریم میں اَلسَّاعَةُ کا لفظ کثرت سے آیا ھے۔ قرآن کریم غلط روش پر چلنے والوں کو بار بار متنبہ کرتا ھے کہ اس روش کا نتیجہ ھلاکت و بربادی کے سوا کچھ نہیں۔ تم نے اس روش کو نہ چھوڑا تو تم پر تباھی آجائے گی۔ تمہارے سعی و عمل ضائع ھوجائیں گے۔ تم ھلاک اور برباد ھو جاؤ گے (اسی کو اِنْذَارٌ کہتے ھیں)۔ وہ اس انذار پر کان نہیں دھرتے اور اپنی روش پر جمے رھتے ھیں۔ ان کے غلط اعمال اپنے تباہ کن اثرات مرتب کرتے چلے جاتے ھیں حتیٰ کہ وہ وقت آجاتا ھے جب یہ اندر ھی اندر مرتب ھونے والے اثرات ابھر کر سامنے آجاتے ھیں اور وہ لوگ تباہ اور برباد ھو جاتے ھیں۔ اسے اَلسَّاعَةُ، یا انقلاب کی گھڑی کہا جاتا ھے۔ یہ ظاھر ھے کہ یہ انقلاب دفعۃً واقع نہیں ھو جاتا بلکہ آھستہ آھستہ ترتیب پا رھا ھوتا ھے۔ البتہ اس کا ظہور اس طرح ھوتا ھے کہ جنہیں حقیقت کا علم نہ ھو وہ یہ سمجھتے ھیں کہ یہ دفعۃً نمودار ھوگیا ھے۔ چونکہ اکثر اوقات یہ انقلاب اُس جماعت کے ھاتھوں نمودار ھوتا ھے جو حق کی حمایت کے لئے اٹھتی ھے، اس لئے اَلسَّاعَةُ سے مراد حق اور باطل کی وہ آخری جنگ ھوتی ھے جس میں باطل کی قوتیں شکست کھا کر برباد ھو جاتی ھیں۔ مختصراً یہ کہ اَلسَّاعَةُ۔ ظہور نتائج کا نام ھے، جیسے ھلاکت انگیز انقلاب کی گھڑی کہا جاتا ھے۔

*تاج۔

یا حق و باطل کا فیصلہ کن تصادم ۔ چنانچہ سورۃ طٰہٰ میں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰؑ کو تفصیل سے بتایا کہ فرعون کی سرکشی کس حد تک بڑھ چکی ہے ، اور اس کے بعد ان سے کہا کہ اس کے لئے تمہیں کیا کچھ کرنا ہے ۔ اس کے بعد فرمایا اِنَّ السَّاعَۃَ اٰتِیَۃٌ (۲۰/۱۵) ۔ اس کا یقین رکھو کہ حق و باطل کی آخری کشمکش کا وقت اب آیا ہی چاھتا ہے ۔ یہ آ کر ہی رہے گا ۔ فرعون کو اس طرح کھلا نہیں چھوڑا جاسکتا ۔ اب یہ انقلاب ضرور آئے گا ۔ اسی طرح مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰہِ وَ الَّذِیْنَ مَعَہٗ سے بھی بار بار کہا گیا کہ تم اپنی جماعت کی پوری تیاری کرو ۔ اِنَّ السَّاعَۃَ لَاٰتِیَۃٌ (۱۵/۸۵) ۔ آخری انقلاب کا وقت آنے والا ہے ۔ وہ ضرور آ کر رہے گا ۔ یہ مخالفین ضرور تباہ ہوکر رہیں گے ۔

حق و باطل کی کشمکش چھوٹے چھوٹے پیمانوں پر تاریخ کے مختلف ادوار میں ہوتی رہی ہے اور اب بھی ہوتی چلی آ رہی ہے ۔ لیکن قرآن کریم سے مترشح ہوتا ہے کہ رفتہ رفتہ جب زمانہ آگے بڑھتا جائے گا اور حقائق بے نقاب ہوتے جائیں گے ، تو نوعِ انسانی کی ربوبیتِ عامہ کے تصور اور مفاد پرستیوں میں ایک عالمگیر ٹکراؤ ہوگا جسکے بعد زمین اپنے نشو و نما دینے والے کے نور سے جگمگا اٹھے گی ۔ یہ وہ عظیم اَلسَّاعَۃُ ہے جس کا ذکر بڑے ہیبت انگیز انداز سے قرآن کریم میں آتا ہے ۔

چونکہ نہ تو انسانی زندگی موت سے ختم ہو جاتی ہے اور نہ ہی اعمال کے نتائج کا سلسلہ یہیں منقطع ہوجاتا ہے ، اس لئے اس زندگی کے بعد ظہورِ نتائج کو بھی اَلسَّاعَۃُ سے تعبیر کیا گیا ہے ۔ قرآن کریم کے مختلف مقامات میں ، سیاق و سباق سے یہ معلوم ہوسکتا ہے کہ وہاں کونسا انقلاب مراد ہے ۔ یعنی اسی دنیا میں ظہورِ نتائج کا وقت (حق و باطل کی کشمکش کا انقلاب) یا آخرت کی زندگی میں ظہورِ نتائج کا وقت ۔

اوپر بتایا جا چکا ہے کہ قوموں کی غلط روشِ زندگی کے تباہ کن اثرات ساتھ کے ساتھ مرتب ہوتے رہتے ہیں لیکن ان کا مجموعی نتیجہ (Accomula-tive Effect) ایک وقت پر جاکر ظاہر ہوتا ہے یہ ان کے لئے انقلاب کی گھڑی (الساعۃ) ہوتی ہے ۔ ظاہر ہے کہ اس کا علم کسی کو نہیں ہوسکتا کہ یہ گھڑی کب آئے گی ۔ سورۃ اعراف میں ہے یَسْئَلُوْنَکَ عَنِ السَّاعَۃِ اَیَّانَ مُرْسٰھَا ۔ قُلْ اِنَّمَا عِلْمُھَا عِنْدَ رَبِّیْ ۔ لَا یُجَلِّیْھَا لِوَقْتِھَا اِلَّا ھُوَ (۷/۱۸۷) ۔ ”یہ لوگ تجھ سے پوچھتے ہیں کہ وہ انقلاب کی

گھڑی (جس سے تم ہمیں اس طرح ڈراتے ہو) کب آئے گی - کہو کہ اس کا علم صرف میرے رب کو ہے - اُسے اس کے وقت پر خدا کے سوا کوئی اور ظاہر نہیں کرے گا" (نیز ۷۹/۴۲-۴۴) - دوسری جگہ ہے یَسْئَلُکَ النَّاسُ عَنِ السَّاعَةِ - قُلْ اِنَّمَا عِلْمُهَا عِنْدَ اللّٰهِ - وَمَا یُدْرِیْکَ لَعَلَّ السَّاعَةَ تَکُوْنُ قَرِیْبًا (۳۳/۶۳) - "لوگ تجھ سے الساعۃ کی بابت پوچھتے ہیں - ان سے کہو کہ اس کا علم صرف اللہ کو ہے - اور تجھے کیا معلوم کہ شاید وہ گھڑی قریب ہی ہو" - (نیز ۴۲/۱۷) - دیگر مقامات پر بھی یہی کہا ہے کہ اس کا علم خدا ہی کو ہے - (دیکھئے ۳۱/۳۴ و ۴۳/۸۵ و ۴۱/۴۷) -

بنی اسرائیل کے گھرانے میں نبوت اور حکومت قریب ڈیڑھ ہزار سال تک رہی - شروع شروع میں تو وہ قوانین خداوندی کے پابند رہے لیکن بعد میں انہوں نے ہر قسم کی سرکشی اور فساد انگیزی شروع کر دی - انہیں بار بار سمجھایا گیا کہ اس روشِ زندگی کا نتیجہ یہ ہوگا کہ تم ذلت و مسکنت کے عذاب میں مبتلا ہو جاؤ گے اور یہ برکات تمہارے گھرانے سے چھن کر دوسری شاخ کی طرف چلی جائینگی - لیکن انہوں نے کسی کی نہ سانی - آخری مرتبہ حضرت عیسیٰؑ نے انہیں خاص طور پر تنبیہ کی اور ان سے برملا کہہ دیا کہ یاد رکھو -

> خدا کی بادشاہت تم سے لے لی جائے گی اور اس قوم کو جو اس کے پھل لائیگی دے دی جائے گی - (متی باب ۲۱ - آیات ۳۵ - ۴۳)

لیکن انہوں نے حضرت عیسیٰؑ کو اس کا جو جواب دیا وہ تاریخ کے اوراق سے ظاہر ہے - چنانچہ اس کے بعد وہ آخری انقلاب کی گھڑی آ گئی اور اس قوم کی شوکت و حشمت سب چھن گئی - اسی لئے حضرت عیسیٰؑ کے متعلق قرآن کریم نے کہا ہے کہ وَ اِنَّهٗ لَعِلْمٌ لِلسَّاعَةِ (۴۳/۶۱) - "اس کی آمد اس انقلاب عظیم کا علم (دینے کے لئے) تھی -" (نیز دیکھئے ۴۳/۶۳-۶۶ و ۳/۵۵، ۶۲) اور اگر اِنَّهٗ کی ضمیر سے مراد قرآن کریم لیا جائے تو مطلب یہ ہوگا کہ یہ قرآن کریم اس انقلاب کا علم دیتا ہے جو آب آنے والا ہے -

س و غ

سَاغَ الشَّرَابُ - یَسُوْغُ - سَوْغًا - پینے کی چیز کا آسانی سے حلق کے نیچے اتر جانا - سَاغَ الطَّعَامُ کھانا آسانی سے حلق سے نیچے اتر گیا -

اَلسَّوَاغُ ۔ جس چیز سے گلے میں اٹکی ہوئی چیز کو نیچے اتارا جائے ۔ شَرَابٌ سَائِغٌ ۔ خوشگوار مشروب جو آسانی سے حلق سے نیچے اتر جائے ۔ طَعَامٌ سَيِّغٌ ۔ خوشگوار کھانا ۔ اسی سے مجازاً سَاغَ النَّهَارُ بولتے ھیں یعنی دن آسانی سے گزر گیا * ۔

قرآن کریم میں اھل جھنم کے متعلق ھے يَتَجَرَّعُهُ وَ لاَ يَكَادُ يُسِيْغُهُ (۱۴/۱۷) ۔ وہ اسے گلے سے اتار تو لے گا لیکن بڑی ھی ناخوشگواری سے ۔ (تفصیل کے لئے دیکھئے عنوان ج ۔ ر ۔ ع) ۔ سورۃ نحل میں دودھ کے متعلق ھے سَائِغًا لِلشّٰرِبِيْنَ (۱۶/۶۶) ۔ وہ پینے والوں کے لئے بڑا خوشگوار ھے ۔ یا بآسانی حلق سے اترجاتا ھے ۔

سَوْفَ (حرف)

سَوْفَ ۔ یہ بھی سَ کی طرح مضارع پر آتا ھے اور سَ ھی کے معنے پیدا کرتا ھے ۔ بعض کے نزدیک سَ مستقبل قریب کے لئے آتا ھے (یعنی وہ عنقریب یا جلدی ھی ایسا کریگا) اور سَوْفَ مستقبل بعید کے لئے ۔ لیکن یہ کوئی کلّیہ نہیں ۔ سَوْفَ سے پہلے تاکید کے لئے بعض اوقات لَ بھی آ جاتا ھے جیسے وَلَسَوْفَ يُعْطِيْكَ رَبُّكَ فَتَرْضٰى (۹۳/۵) ۔ اور تیرا رب تجھے (اتنا) دے گا کہ تو راضی ھو جائے گا ۔ (وہ تیری آرزو کے عین مطابق ھوگا)

س و ق

اَلسَّاقُ ۔ پنڈلی ۔ اسکی جمع سُوْقٌ ھے ۔ (۳۸/۳۳) ۔ اَلسَّاقُ کے معنی درخت کا تنا بھی ھیں ۔ اسکی جمع بھی سُوْقٌ آتی ھے (۴۸/۲۹) ۔ لیکن عرب جب کسی معاملہ کی شدت کو بیان کرتے تو اسے سَاقٌ سے تشبیہ دیتے * ۔ (اسے ک ۔ ش ۔ ف کے عنوان میں تفصیل سے بیان کیا گیا ھے ۔ وھاں دیکھئے) ۔ قرآن کریم میں يَوْمَ يُكْشَفُ عَنْ سَاقٍ (۶۸/۴۲) ۔ اور وَالْتَفَّتِ السَّاقُ بِالسَّاقِ (۷۵/۲۹) ۔ اور كَشَفَتْ عَنْ سَاقَيْهَا (۲۷/۴۴) میں شدت ھی کا مفہوم ھے ۔

سَاقَ ۔ مویشیوں کو پیچھے سے ھانکنا * ۔ (۷/۵۷) ۔ (جسطرح قَادَ کے معنے جانوروں کو آگے سے کھینچکر چلانا ھوتا ھے) ۔ سَائِقٌ ھانکنے والا *

* تاج ۔ محیط ۔ راغب ۔

- (۷۵/۳۰) - مَسَاق ٌ - هانکنا (۳۹/۷۱) - اَلسُّوق ُ - (جمع اَسْوَاق ٌ - (۲۵/۷) - بازار - کیونکه لوگ اس جگه اپنے مویشی وغیرہ هانک کر بیچنے کیلئے لاتے هیں * - نواب صدیق حسن خان نے لکها هے که س - و - ق شدت اور اجتماع کو ظاهر کرتے هیں ** -

ابن فارس نے کہا هے که اس کے بنیادی معنی هانکنے کے هوتے هیں - پنڈلی کو بهی اَلسَّاق ُ اس لئے کہتے هیں که چلنے والا اس پر چلتا هے -

س و ل

تَسْوِیْل ٌ کے معنے هیں کسی چیز کو حسین اور خوشنما بنا کر دکهانا تاکه انسان اسکے کرنے کی طرف راغب هو جائے - کسی ایسی چیز کو جسے نفس چاهے، یا کسی بری شے کو خوبصورت بنا کر پیش کرنا *** - سورۃ یوسف میں هے بَلْ سَوَّلَتْ لَکُمْ اَنْفُسُکُمْ اَمْرًا (۱۲/۱۸) - "یه ایک ایسی بات هے جسے تمهاری اپنی خواهشات نے تمهارے سامنے خوشنما بنا کر پیش کر دیا هے" - بعض نے کہا هے که یه سُوْل ٌ سے هے جسکے معنے تمنا کے هوتے هیں جو انسان کو باطل اور پر فریب چیزیں بهی پسندیدہ بنا کر بتاتی هے *** - سورۃ محمد میں هے اَلشَّیْطٰنُ سَوَّلَ لَهُمْ (۴۷/۲۵) - "شیطان نے ایسے ان لوگوں کے سامنے مزین کرکے پیش کیا" اور اسطرح انهیں گمراہ کر دیا - سورۃ طٰهٰ میں سامری کا یه قول هے که وَکَذٰلِکَ سَوَّلَتْ لِیْ نَفْسِیْ (۲۰/۹۶) - "اسی طرح میرے دل نے یه بات مجهے اچهی بنا کر دکهائی" -

س و م

سَوْم ٌ کے معنے هیں کسی چیز کی تلاش و جستجو میں جانا - یعنے یه معنے مرکب هیں - جانا اور تلاش و جستجو کرنا - لهذا کهیں صرف پهلے معنے مراد لئے جاتے هیں - جیسے سَامَ الْاِبِلُ کے معنے هیں اونٹ چرنے کے لئے گئے - یا انهیں چرنے کے لئے آزاد چهوڑ دیا گیا - اور کهیں دوسرے معنے جیسے یَسُوْمُوْنَکُمْ سُوْٓءَ الْعَذَابِ (۲/۴۹) - وہ تمهارے لئے بدترین عذاب کی تلاش میں رهتے تهے - طرح طرح کی مصیبتیں ڈهونڈه ڈهونڈه کر لایا کرتے تهے - کسی کو مشکل اور دوبهر کام کی تکلیف دینا ، اس سے ظلم و زیادتی اور برائی کا سلوک کرنا - سَامَتِ الطَّیْرُ عَلَی الشَّیْ ءِ -

---

* تاج و محیط - ** العلم الخفاق *** تاج و راغب

پرندے اس چیز پر منڈلاتے رہے* ۔ سَامَ فُلَانًا الْاَمْرَ : اسے کسی بات کی تکلیف دی ، اور کوئی بات اس پر لازم کی*۔ اَسَامَ الاِبِلَ ۔ اونٹوں کو چرنے کے لئے چھوڑا۔

تلاش کے اعتبار سے اَلسُّوْمَۃُ ۔ اَلسِّیْمَۃُ ۔ اَلسِّیْمَاءُ ۔ کے معنے ہیں علامت ۔ نشان ۔ سَوَّمَ الْفَرَسَ تَسْوِیْمًا ۔ گھوڑے پر نشان لگا دیا ۔ لیکن سَوَّمَ فُلَانًا کے معنے ہیں فلاں کو آزاد چھوڑ دیا ۔ اس لئے سورۃ الذّٰریٰت میں جہاں ہے لِنُرْسِلَ عَلَیْہِمْ حِجَارَۃً مِّنْ طِیْنٍ مُّسَوَّمَۃً ۔ (۵۱ ۳۴-۳۳) ۔ تو اس کے معنے یہ بھی ہیں کہ وہ پتھر خدا کے قانون مکافات کی رو سے اس مقصد کے لئے نشان زدہ (Earmarked) کر دئے گئے تھے ۔ یا یہ کہ انہیں آزاد چھوڑ دیا گیا تھا ۔ (انہیں چلایا گیا تھا) ۔

سورۃ آل عمران میں عذاب دینے والے ملائکہ کو مُسَوِّمِیْنَ (۳ ۱۲۴) کہا گیا ہے ۔ اسی سورۃ میں اَلْخَیْلِ الْمُسَوَّمَۃِ (۳ ۱۳) آیا ہے ۔ اس کے معنے بھی نشان زدہ گھوڑے یا ایسے گھوڑے ہیں جنہیں چرنے کے لئے آزاد چھوڑ دیا گیا ہو ۔ سورۃ نحل میں فِیْہِ تُسِیْمُوْنَ (۱۶ ۱۰) آیا ہے ۔ یعنی جن میں تم اپنے مویشی چراتے ہو ۔ سِیْمَا (۴۸ ۲۹) کے معنے نشان اور علامت کے ہیں ۔

س و ی

اِسْتِوَاءٌ کے معنے ہیں کسی چیز کا اپنی ذات میں پورے پورے اعتدال پر ہونا ۔ ہر قوت کا صحیح صحیح تناسب کے ساتھ موجود ہونا اور اس طرح اس چیز کا اپنی انتہائی نشو و نما تک پہنچے ہوئے ہونا* ۔ ابن فارس نے اس مادہ کے بنیادی معنوں میں استقامت اور دو چیزوں کے درمیان اعتدال لکھے ہیں ۔ اِسْتَوَی الرَّجُلُ کے معنے ہیں وہ شخص اپنی پوری طاقت پر پہنچ گیا ۔ اس کا شباب انتہا پر پہنچ گیا ۔ قرآن کریم نے اِسْتَوٰی کی تشریح بَلَغَ اَشُدَّہٗ سے کی ہے (۲۸ ۱۴) ۔ اسی طرح اِسْتَوٰی عَلٰی سُوْقِہٖ (۴۸ ۲۹) میں اِسْتَوٰی کے معنے واضح ہیں ۔ یعنے پودوں کا مضبوط ہو کر اپنے تنوں پر سیدھا کھڑا ہو جانا ۔ اَلسَّوِیُّ ۔ اس چیز کو کہا جاتا ہے جو ہر اعتبار سے افراط و تفریط سے محفوظ ہو اور ٹھیک ٹھیک تناسب رکھتی ہو ۔ اسی سے اَلصِّرَاطُ السَّوِیُّ ہے (۲۰ ۱۳۵) ۔ یعنی اعتدال کی راہ ۔ رَجُلٌ سَوِیٌّ اس شخص کو کہتے ہیں جس کی خلقت اور اخلاق و اطوار ، افراط و تفریط سے پاک ہوں ۔

*تاج ۔ **محیط ۔

یعنے وہ متناسب الاعضاء بھی ہو اور سیرت کے اعتبار سے بھی اعتدال پر* - سورۃ مریم میں فَتَمَثَّلَ لَهَا بَشَرًا سَوِيًّا (۱۹/۱۷) کے یہی معنے ہیں۔ سَوِيًّا عَلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ بمقابلہ مُكِبًّا عَلٰى وَجْهِهٖ (۶۷/۲۲) میں آیا ہے -

سَوَّاهُ تَسْوِيَةً اور اَسْوَاهُ کے معنے ہیں اس کو معتدل کر دیا ، ہموار برابر اور یکساں کر دیا* - فَسَوّٰىهُنَّ سَبْعَ سَمٰوٰتٍ (۲/۲۹) کے معنے ہیں ان میں ٹھیک ٹھیک اعتدال پیدا کر دیا - راغب نے کہا ہے کہ اس کے معنے ''حکمت کے تقاضوں کے مطابق بنانا'' بھی ہیں - چنانچہ اَلَّذِىْ خَلَقَكَ فَسَوّٰىكَ فَعَدَلَكَ (۸۲/۷) کے معنے ہیں خدا وہ ہے جس نے تجھے (مختلف عناصر کی ترکیب نو سے) پیدا کیا اور ایسا بنا دیا جیسا کہ تناسب و توازن اور حکمت و اعتدال کا تقاضہ ہے* -

اِسْتَوٰى اِلَى الشَّيْءِ کے معنے ہیں کسی چیز تک ذاتی طور پر یا تدبیر کے ذریعہ پہنچ جانا* - یا کسی چیز کا قصد و ارادہ کرنا - یا اس کی طرف متوجہ ہونا** - اور اِسْتَوٰى عَلٰى میں غلبہ و تسلط کا مفہوم ہوتا ہے***- قرآن کریم میں ہے لِتَسْتَوٗا عَلٰى ظُهُوْرِهٖ (۴۳/۱۳)- نیز اِسْتَوَيْتَ . . . عَلَى الْفُلْكِ (۲۳/۲۸) - (سواری کے جانور یا) کشتی پر جم کر بیٹھ جانا- غالب اور مسلط ہو جانا - (خدا کے عرش پر اِسْتَوٰى کے لئے ع - ر- ش کا عنوان دیکھئے) -

سَوَاءٌ کے معنے ہیں دو چیزوں کا باہم دگر برابر ہونا - جیسے سَوَاءٌ زَيْدٌ وَ عَمْرٌو - زید اور عمرو ہم مرتبہ ہیں - ایک دوسرے کے برابر ہیں- اِسْتَوَيَا اور تَسَاوَيَا - دو چیزیں ایک دوسرے کے مانند یا مثل اور نظیر ہوئیں - سَاوَيْتُ بَيْنَهُمَا مُسَاوَاةً - میں نے ایک کو دوسرے کے برابر کر دیا - اس لئے سَوَاءٌ کے معنے عدل کے آتے ہیں - سَوَّيْتُهُ بِهٖ - یا سَوَّيْتُ بَيْنَهُمَا کے معنے ہیں میں نے ان دونوں میں عدل کیا - فَانْبِذْ اِلَيْهِمْ عَلٰى سَوَاءٍ - (۸/۵۸) کے معنے ہیں انصاف کو سامنے رکھتے ہوئے (یا برابری کی حالت میں) ان کا معاہدہ ان کی طرف واپس پھینک دو- سورۃ انبیاء میں ہے فَقُلْ اٰذَنْتُكُمْ عَلٰى سَوَاءٍ (۲۱/۱۰۹)- میں نے تم سب کو ساری بات یکساں طور پر کہہ دی ہے - زمین کے متعلق قرآن کریم میں ہے سَوَاءً لِّلسَّآئِلِيْنَ (۴۱/۱۰) - یعنی زمین تمام ضرورت مندوں کے لئے یکساں طور پر کھلی رہنی چاہئے - سورۃ طٰہٰ میں ہے مَكَانًا سُوًى (۲۰/۵۸) - جس

*تاج - **تاج و محیط - ***راغب -

کے معنے یہ ہیں کہ یہ شرائط ہم پر اور تم پر یکساں طور پر عائد ہوں گی۔ یعنی ہم اور تم یکساں پوزیشن میں ہونگے۔ راغب نے کہا ہے کہ مَکَانٌ سُوًی اس مقام کو کہتے ہیں جس سے دونوں طرف کے فاصلے برابر ہوں۔ لیکن ابن سیدہ نے لکھا ہے کہ سُوًی اُس مقام کو کہتے ہیں جس پر نشانات لگے ہوں کہ لوگ ان سے اس مقام کا راستہ معلوم کرلیں*۔ نیز اَلسَّوَاءُ کسی چیز کے وسط اور درمیان کو بھی کہتے ہیں۔ سَوَاءَ السَّبِیْلِ کے معنے ہیں راستہ کا درمیانی حصہ۔ اور سَوَاءِ الْجَحِیْمِ (۳۷/۵۵) کے معنے ہیں جہنم کے عین وسط میں*۔ فَسَوّٰهَا (۹۱/۱۴) کے معنے ہیں خدا نے ان کے شہروں کو زمین کے ساتھ ہموار کر دیا۔ یعنی وہ سب بستیاں تباہ ہوگئیں*۔ سورۃ نساء میں ہے لَوْ تُسَوّٰى بِهِمُ الْاَرْضُ (۴/۴۲)۔ اے کاش ان پر زمین ہموار کردی جاتی۔ یعنی وہ اس سے قبل ہی ہلاک و برباد ہو چکے ہوتے۔ سورۃ کہف میں سَاوٰى کے معنے ہموار کر دینے کے ہیں۔ (۱۸/۹۶)۔

سِوًی اور اَلسِّوَاءُ کے معنے غیر کے بھی آتے ہیں۔ مَرَرْتُ بِرَجُلٍ سِوَاكَ وَ سِوَاءَكَ کے معنے ہیں میں تیرے سوا کسی اور آدمی کے ساتھ گزرا۔ یعنی تیرے ساتھ نہیں بلکہ ایک اور شخص کے ساتھ*۔

سورۃ النجم میں نبی اکرمؐ کے متعلق ہے فَاسْتَوٰى (۵۳/۶)۔ اس ایک لفظ میں شرف انسانیت کا انتہائی کمال، معجزانہ طور پر سمٹ کر آگیا ہے۔ یعنی حضورؐ سیرت و کردار اور علم و بصیرت کے اعتبار سے انتہائی اعتدال لئے ہوئے تھے اور آپکی ذات میں یہ خصوصیتیں کمال تک پہنچ چکی تھیں۔ اس کے بعد آپؐ مقامِ نبوت پر فائز ہونے کے اہل قرار پائے تھے۔ نبوت ہر کس و ناکس کو نہیں مل جایا کرتی تھی۔ اللہ تعالیٰ جسے اس موہبتِ کبریٰ کے لئے منتخب کرتا تھا اس کی تربیت خدا کی نگرانی میں ہوتی تھی اور اس کی ذات معراجِ انسانیت کی مظہر بن جاتی تھی۔

س ی ب

سَابَ۔ یَسِیْبُ۔ وہ تیز چلا*۔ سَابَ الْمَاءُ۔ پانی بہا اور ہر طرف گیا۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی دوام اور تسلسل کے ساتھ چلتے رہنے کے ہیں۔ جیسے سَیْبُ الْمَاءِ۔ پانی کے جاری ہونے کو کہتے ہیں۔ سَیَّبْتُ۔ میں نے اس چیز کو آزاد چھوڑ دیا کہ وہ جہاں چاہے جائے۔ اسی مادہ سے اَلسَّائِبَةُ ہے۔ ایام جاہلیت میں عرب بعض جانوروں

*تاج۔

کو (مقررہ بچے دے چکنے کے بعد یا کسی کٹھن مرحلہ سے بخیر و خوبی گزار دینے کی وجہ سے یا بطور نذر) دیوتاؤں کے نام پر آزاد چھوڑ دیا کرتے تھے اور ان سے کوئی کام نہیں لیتے تھے۔ وہ جہاں سے چاہے کھاتے پیتے۔ کوئی انہیں روکتا نہیں تھا۔ (جیسے ہندوستان میں سانڈ چھوڑ دیتے ہیں) *۔ قرآن کریم نے کہا ہے کہ اس قسم کی توہم پرستیوں اور مشرکانہ رسوم کی سند خدا نے کہیں نازل نہیں کی۔ یہ سب تمہارے اسلاف کی خود ساختہ رسوم ہیں۔ اسلئے انہیں چھوڑ دو۔ ($\frac{۵}{۱۰۳}$)۔

س ی ح

سَاحَ الْمَاءُ ۔ زمین کے اوپر پانی کا بہنا۔ اَلسَّیْحُ ۔ سطح زمین پر بہتا پانی *۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی بھی مسلسل چلتے رہنے کے ہیں۔ اَلسِّیَاحَةُ ۔ زمین میں چلنا پھرنا۔ سیاحت کرنا ($\frac{۹}{۲}$)۔ بعض کا خیال ہے کہ اَلْمَسِیْحُ اسی سے ہے۔ لیکن دوسروں نے اسکی تصریح کی ہے کہ یہ عربی لفظ نہیں۔ (نیز دیکھئے عنوان م۔س۔ح) اَلسَّائِحُ ۔ سیر وسیاحت کرنے والا *۔ قرآن کریم میں مومنین کی صفات میں اَلسَّائِحُوْنَ ($\frac{۹}{۱۱۲}$) اور مومن عورتوں کے لئے سٰئِحٰتٌ ($\frac{۶۶}{۵}$) آیا ہے۔ (اگرچہ بعض کے نزدیک اس سے مراد " روزہ رکھنے والے " ہیں لیکن) راغب نے لکھا ہے کہ بعض کے نزدیک اس سے مراد وہ لوگ ہیں جو باقتضائے فرمان خداوندی اَفَلَمْ یَسِیْرُوْا فِی الْاَرْضِ فَتَکُوْنَ لَهُمْ قُلُوْبٌ یَّعْقِلُوْنَ بِهَآ اَوْ اٰذَانٌ یَّسْمَعُوْنَ بِهَا ($\frac{۲۲}{۴۶}$) عقل و فہم اور عبرت حاصل کرنے کے لئے سفر کرتے ہیں **۔ یہی مفہوم زیادہ قرین قیاس ہے۔ اَلسَّاحَةُ ۔ کھلی جگہ۔ میدان۔ گھروں کے درمیان کی کھلی اور خالی جگہ۔ نیز گھر کے صحن کو سَاحَةُ الدَّارِ کہتے ہیں *۔ ($\frac{۳۷}{۱۷۷}$)۔

مومن عورتوں کی صفت سٰئِحٰتٌ (سیاحت کرنے والیاں) کو سامنے رکھئے اور پھر دیکھئے کہ یہ نظریہ کہ عورتوں کو گھر کی چار دیواری میں محبوس رکھنا چاہیئے کسقدر غیر قرآنی ہے۔

س ی ر

اَلسَّیْرُ ۔ چلنا۔ جانا۔ دن کو ہو یا رات کو۔ [لیکن سَرَی رات کے چلنے کو کہتے ہیں ($\frac{۱۵}{۶۵}$; $\frac{۱۷}{۱}$)۔ اس کے لئے عنوان س۔ر۔ی دیکھئے]۔

* تاج۔ ** راغب۔

سَارَ الرَّجُلُ ۔ آدمی چلا ۔ سَيَّرَهٗ ۔ اس نے اسے چلایا ، ایک جگہ سے دوسری جگہ لے گیا ۔ سِيْرَةٌ ۔ روش ۔ رفتار ۔ چال ۔ طور طریق ۔ هیئت ۔ حالت *۔ سَنُعِيْدُهَا سِيْرَتَهَا الْاُوْلٰى (۲۰/۲۱) " هم اسے اسکی پہلی حالت پر لوٹا دینگے " ۔ راغب نے کہا ہے کہ سِيْرَةٌ ایسی حالت کو کہتے ہیں جو کسی میں طبیعی یا اکتسابی طور پر ہو ۔ اَلسَّيَّارَةُ ۔ ساتھ چلنے والوں کی جماعت ۔ قافلہ (۱۲/۱۹) ۔

قرآن کریم اپنے قوانین کی صداقت کی دلیل میں تاریخی شواهد کو بار بار پیش کرتا ہے ۔ اسکے لئے وہ کہتا ہے کہ سِيْرُوْا فِي الْاَرْضِ ثُمَّ انْظُرُوْا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُكَذِّبِيْنَ (۶/۱۱) ۔ زمین میں چلو پھرو اور دیکھو کہ ان قوموں کا انجام کیا ہوا جنہوں نے ہمارے قوانین کو سچا نہیں سمجھا تھا ۔ اس میں تاریخی استقراء اور حفارت (Archaeology) دونوں آجاتے ہیں ۔ یعنی اگر وہ قومیں (طبعی طور پر) زندہ ہیں تو ان کے احوال و کوائف کے مطالعہ سے ، اور اگر وہ باقی نہیں رہیں تو ان کے آثار قدیمہ پر غور و فکر سے ۔

س ی ل

سَالَ الْمَاءُ ۔ پانی بہہ گیا ۔ اَسَالَهٗ کسی نے اسے بہا دیا ۔ مَاءٌ سَيْلٌ ۔ بہنے والا پانی ۔ اَلسَّيْلُ ۔ بہت زیادہ بہتا ہوا پانی ۔ سیلاب ۔ اَلسَّيْلَةُ ۔ پانی کے بہنے کا انداز ۔

سورۃ رعد میں ہے فَسَالَتْ اَوْدِيَةٌ (۱۳/۱۷) ۔ وادیاں بہ نکلتی ہیں ۔ فَاحْتَمَلَ السَّيْلُ زَبَدًا (۱۳/۱۷) ۔ پس سیلاب جھاگ کو بہا لے جاتا ہے ۔

سورۃ سبا میں سَيْلَ الْعَرِمِ (۳۴/۱۶) آیا ہے ۔ زور کا سیلاب ۔ اسی سورۃ میں ہے وَاَسَلْنَا لَهٗ عَيْنَ الْقِطْرِ (۳۴/۱۲) ۔ ہم نے اس کے لئے تانبے کا چشمہ بہا دیا ۔

سین

اَلسِّيْنُ ۔ ویسے تو ایک حرف (س) ہے جس کے لئے (س) دیکھئے ۔ لیکن يٰسٓ (۳۶/۱) کے معنے " اے انسان " ۔ یا " اے سردار " کے ہوتے ہیں ۔ لغت طے میں يٰسٓ ۔ يَا اِنْسَانُ ! کو کہتے ہیں ۔ یہ دراصل انسان ہی کی مخفف شکل ہے اور عربی زبان میں الفاظ کو اسطرح مخفف کرلینے کا عام

* تاج و محیط و راغب ۔

رواج تھا۔ مثلا ایک حدیث میں آتا ہے کَفٰی بِالسَّیْفِ شَا۔ یعنی کَفَا بِالسَّیْفِ شَاهِدًا۔ یا کسی شاعر کا ایک مصرعہ ہے۔ قُلْنَا لَهَا قِفِي لَنَا قَالَتْ قَافْ۔ یہاں وَقَفْتُ کی جگہ اس نے صرف "قَافْ" کہا ہے*۔

اَلسِّیْنُ۔ ستون اور سہارے کو کہتے ہیں۔ (مثلاً چھت کی کوئی کڑی کمزور ہو گئی ہے تو جو دوسری لکڑی اسے سہارا دینے کے لئے لگادی جائے اُسے سِیْنُ کہا جاتا ہے) کیونکہ فینقی زبان میں اسکی شکل بھی ستون کے مشابہ ہوتی تھی**۔

سِیْنَاءُ۔ ایک قسم کے پتھر کو کہتے ہیں۔ وَطُوْرِ سِیْنِیْنَ (۹۵/۲)۔ ومِن طُوْرِ سَیْنَاءَ۔ (۲۳/۲۰) سینا (پتھروں کا) پہاڑ۔ شام میں ایک پہاڑ کا نام ہے۔ اَلسَّیْنِیْنَةُ۔ ایک قسم کے درخت کو کہتے ہیں۔

سَیْنَاء

طُوْرِ سَیْنَاءَ (۲۳/۲۰) یا طُوْرِ سِیْنِیْنَ (۹۵/۲) شام میں ایک پہاڑی ہے جس پر حضرت موسٰی ؑ پکارے گئے تھے (دیکھئے عنوان سین)۔

سِیْنِیْن

طُوْرِ سِیْنِیْنَ (۹۵/۲)۔ یا طُوْرِ سَیْنَاءَ (۲۳/۲۰)۔ شام میں ایک پہاڑی ہے جس پر حضرت موسٰی ؑ پکارے گئے تھے (دیکھئے عنوان سِیْن)۔

---

* تاج۔ ** محیط۔

ش

ش أ م

اَلْيَدُ الشُّؤْمٰى ۔ بایاں ہاتھ ۔ یہ اَلْيُمْنٰى (دایاں ہاتھ) کی ضد ہے ۔ اسی اعتبار سے اَلشُّؤْمُ (يُمْنٌ کی ضد ہے)۔ یعنی نحوست ۔ صاحب تاج العروس نے شُؤْمٌ کی تفسیر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ یہ وہ امور ہیں جن کے انجام کو ناپسند کیا جائے اور اس سے ڈرا جائے ۔ قَدْ شَاَمَهُمْ ۔ اس نے ان پر نحوست مسلط کردی ۔ رَجُلٌ مَشْئُوْمٌ ۔ منحوس آدمی* ۔ (نحوست کے قرآنی مفہوم کے لئے عنوان ن ۔ ح ۔ س دیکھئے)۔

قرآن کریم میں اَصْحٰبُ الْمَيْمَنَةِ کے مقابلہ میں اَصْحٰبُ الْمَشْئَمَةِ (۹/۵۶) آیا ہے ۔ بائیں ہاتھ والے ۔ یعنی بدبختی والے ۔ جن کی شَاْمَةِ اعمال ان کے لئے عذاب بن کر آجائے ۔

ملک شام کو شَاْم** اس لئے کہتے ہیں کہ وہ قبلہ سے بائیں جانب واقع ہے*** ۔

ش أ ن

اَلشَّاْنُ ۔ (جمع اَلشُّئُوْنُ) ۔ امر ۔ معاملہ (بالخصوص اہم اور قابل لحاظ) حالت*** ۔ راغب نے کہا ہے کہ یہ لفظ ایسے معاملہ اور حالت کے لئے بولا جاتا ہے جو گرانقدر عظمت کا حامل ہو**** ۔ شَاَنَ شَاْنَهُ ۔ اس نے اس کا قصد کیا ،) اسی سے اہم معاملہ کو شَاْن* کہا جاتا ہے کیونکہ اس کا قصد کیا جاتا ہے) نیز اس نے وہ کام کیا جسے وہ اچھی طرح انجام دے سکتا تھا ۔ شَاْنُ الرَّاْسِ ۔ کھوپڑی کی چھوٹی چھوٹی ہڈیوں کے ملنے کی جگہ ۔

*تاج نیز ابن فارس ۔ **بعض اسے غیر مہموز بھی بتاتے ہیں ۔ ***تاج ۔ ****راغب ۔

الشَّاْنُ - ایک رگ کا نام ہے جس سے آنکھ تک خون پہنچتا ہے - نیز وہ راستہ جسکے ذریعہ آنکھوں سے آنسو آتا ہے - شُئُوْنُ الْخَمْرِ - شراب کا وہ حصہ جو جسم کے رگ و پے میں سرایت کر جائے* - ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی تلاش ، طلب اور ارادہ کے ہیں -

سورۃ رحمٰن میں ہے یَسْئَلُهٗ مَنْ فِی السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ - كُلَّ يَوْمٍ هُوَ فِیْ شَاْنٍ (۵۵/۲۹) - کائنات کی پستیوں اور بلندیوں میں جو کچھ ہے (انسانوں سمیت) وہ سب اپنی نشو و نما کے لئے ربوبیت خداوندی کے محتاج ہیں - یہ اس آیت کے پہلے حصہ کا ترجمہ ہے - دوسرے حصے میں هُوَ سے مراد اللّٰہ لیا جاتا ہے اور اس کا ترجمہ یہ کیا جاتا ہے کہ خدا ہر آن ایک جداگانہ شان میں ہوتا ہے - ہمارے خیال میں خدا کے متعلق یہ تصور صحیح نہیں کہ وہ ہر آن ایک جداگانہ شان میں ہوتا ہے - خدا ایک مستقل بالذات ہستی ہے جو ہمیشہ ایک ہی شان میں رہتی ہے اگرچہ اس کے امر (قدرتوں) کی نمود مختلف مظاہر میں ہوتی رہتی ہے - اس لئے آیت مذکورہ بالا کے دوسرے حصہ میں هُوَ سے مراد مَنْ فِی السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ لیا جائے تو بہتر ہے - اس اعتبار سے پوری آیت کا مفہوم یہ ہوگا کہ کائنات کی ہر شے اپنی نشو و نما کے لئے ربوبیت خداوندی کی محتاج ہے، اور ان اشیاء کی نشو و نما کے تقاضے ہر دور میں بدلتے رہتے ہیں - ان کی مختلف حالتوں میں نشو و نما کے مختلف تقاضے ہوتے ہیں اور ربوبیت خداوندی ان کی ہر ایک حالت کے مطابق ان کی نشو و نما کے سامان فراہم کرتی رہتی ہے - (۵۴/۴۹) - اور اس طرح اشیائے کائنات کی (Development) کا سلسلہ ، قانونِ ارتقاء کے مطابق جاری رہتا ہے -

سورۃ یونس میں ہے وَ مَا تَكُوْنُ فِیْ شَاْنٍ (۱۰/۶۱) - تو جس حال میں بھی ہو -

ش ب ہ

تَشَابَهَ کے معنے ہیں دو یا دو سے زیادہ چیزوں کا ایک دوسرے سے اسطرح ملتا جلتا اور مانند اور مشابہ ہونا کہ ان میں التباس ہونے لگے اور امتیاز مشکل ہو جائے - شَبَّهَهٗ اِیَّاهُ کے معنے ہیں اسنے فلاں چیز کو فلاں چیز کی مثل بنا دیا - دونوں کو ایک دوسری سے ملتا جلتا ہوا بنا دیا - اَلشِّبْهُ وَ الشَّبَهُ وَ الشَّبِيْهُ کے معنے ہیں مثل اور مانند - اور شُبِّهَ عَلَيْهِ الْاَمْرُ کے معنے ہیں بات اس پر مشتبہ ، غیر واضح (ملتبس) ہو

*تاج

گئی *۔ تَشْبِیْہٌ کے معنے ہیں کسی چیز کو اس سے ملتی جلتی ہوئی چیز سے مثال دے کر بیان کرنا۔ مُشَابَھَۃٌ کے معنے ہیں ایک دوسرے سے ملتے جلتے ہونا *۔

قرآن کریم میں مُتَشَابِہًا (۲/۲۵) کے معنے ہیں باہم ملتا جلتا۔ اور اِنَّ الْبَقَرَ تَشَابَہَ عَلَیْنَا (۲/۷۰) کے معنے یہ ہیں کہ ہم سمجھ نہیں سکے کہ وہ گائے کس قسم کی ہونی چاہیئے کیونکہ ہمارے لئے سب گائیں ملتی جلتی ہیں اسلئے التباس (شبہ) واقع ہو رہا ہے۔ تَشَابَھَتْ قُلُوْبُھُمْ (۲/۱۱۸) کے معنے ہیں ان کے دل ایک دوسرے سے ملتے جلتے ہیں۔ باہمی مشابہت اور موافقت رکھتے ہیں۔ اسی طرح مُشْتَبِہًا وَّغَیْرَ مُتَشَابِہٍ (۶/۱۰۰) کے معنے ہیں آپس میں ملتے جلتے، اور ایسے جو ملتے جلتے نہیں۔ انہی کو دوسری جگہ مُتَشَابِہًا وَّغَیْرَ مُتَشَابِہٍ (۶/۱۴۲) کہا گیا ہے۔

قرآن کریم کی آیات کو مُحْکَمٰتٌ اور مُتَشَابِہٰتٌ کہا گیا ہے (۳/۶)۔ اس کے متعلق تفصیلی بحث مُحْکَمٰتٌ کے ضمن میں (ح۔ک۔م) کے عنوان کے تحت کی گئی ہے۔ [نیز ث۔ن۔ی کے عنوان میں مُتَشَابِہًا مَّثَانِیَ بھی دیکھئے ۳۹/۲۳]

سورۃ النساء میں حضرت عیسیٰؑ کے تذکرہ میں ہے کہ یہودیوں نے نہ تو مسیحؑ کو قتل کیا اور نہ ہی صلیب دیا وَلٰکِنْ شُبِّہَ لَھُمْ (۴/۱۵۷) ان پر حقیقت مشتبہ ہو گئی۔ (بات کیا ہوئی تھی؟ اس کی تفصیل میری کتاب "شعلہ مستور" میں حضرت عیسیٰؑ سے متعلق حصہ میں دیکھئے)۔

ش ت ت

شَتَّہٗ۔ یَشُتُّہٗ۔ شَتًّا۔ شَتَاتًا۔ اس نے اسے الگ الگ اور متفرق کر دیا۔ دور کر دیا۔ شَتَّ۔ وہ متفرق اور جدا جدا ہو گیا (لازم و متعدی)۔ اَمْرٌ شَتٌّ۔ متفرق معاملہ *۔ (اسکی جمع اَشْتَاتٌ ہے)۔ کہتے ہیں جَآءُوْا اَشْتَاتًا۔ وہ الگ الگ متفرق طور پر آئے۔ سورۃ النور میں ہے جَمِیْعًا اَوْ اَشْتَاتًا (۲۴/۶۱)۔ اکٹھے یا الگ الگ۔ سورۃ اللیل میں ہے اِنَّ سَعْیَکُمْ لَشَتّٰی (۹۲/۴)۔ تمہاری جد و جہد مختلف اور ایک دوسرے سے جداگانہ (سمتوں میں ہوتی) ہے۔ یعنی ہر فرد کے سامنے زندگی کا ایک مقصد ہوتا ہے اور اس کی کوششیں اس مقصد کے حصول کے لئے ہوتی ہیں۔ نیز، ایک فرد کی

* تاج و محیط۔

زندگی میں بھی مختلف مقاصد ہو سکتے ہیں جن کے حصول کے لئے وہ جدوجہد کرتا ہے۔ اس کے بعد قرآن کریم کہتا ہے کہ ہر چند یہ مقاصد مختلف اور متنوّع ہوتے ہیں لیکن اگر بہ ہیئت مجموعی ان کی تقسیم کی جائے تو یہ دو بنیادی شقوں میں بٹ جاتے ہیں۔ ایک اَعْطٰی کی شق (۹۲/۵) اور دوسری بَخِلَ کی شق (۹۲/۸)۔ اَعْطٰی سے مفہوم یہ ہے کہ انسان اپنی محنت کے ماحصل کو دوسروں کی نشو و نما کے لئے بھی دے۔ اور بَخِلَ سے مراد یہ ہے کہ وہ اسے صرف اپنے مفاد تک محدود رکھے۔ پہلی شق وجہ بالیدگی شرف انسانیت ہے اور دوسری شق، باعث تذلیل انسانیت۔

سورۃ طٰہٰ میں ہے نَبَاتٍ شَتّٰی (۲۰/۵۳)۔ انواع و اقسام کی بوٹیاں اور پودے۔ (شَتّٰی جمع ہے شَتِیْتٌ کی جس کے معنے ہیں جدا کیا ہوا، جداگانہ، الگ۔)

ش ت و

اَلشِّتَاءُ۔ سردی کا موسم۔ عرب والے سال کو دو حصوں میں تقسیم کرتے تھے۔ ایک شتاء، دوسرا صیف۔ پھر شتاء کے دو حصے، جن میں سے آخری تین مہینے رَبِیْعٌ کے ہوتے۔ اسی طرح صَیْفٌ میں قَیْظٌ کے تین مہینے ہوتے۔ یوں سال چار موسموں میں بٹ جاتا تھا۔ چونکہ بالعموم سردی کے موسم میں عرب سفر کے لئے کم نکلتے تھے اور روزی تلاش کرنے کے بجائے گھروں ہی میں رہتے تھے لہذا اس زمانہ میں غلہ اور چارہ کی دقت ہوتی تھی۔ اس لئے اَلشِّتَاءُ قحط کو بھی کہتے تھے۔ اور صَاحِبُ الشَّتْوَۃِ وہ شخص جس کی طرف لوگ سردی اور خشک سالی کے مصائب سے گھبرا کر رجوع کریں**۔

قرآن کریم میں قریش کے قافلوں کے لئے رِحْلَۃَ الشِّتَاءِ وَالصَّیْفِ (۱۰۶/۲) آیا ہے۔ یعنے ان کے سردی اور گرمی کے موسم کے سفر۔ اس سے در حقیقت مراد سارا سال ہے۔

ش ج ر

شَجَرٌ۔ ہر وہ چیز جو مجتمع ہو کر پھر کسی وجہ سے متفرق ہو جائے اسے شَجَرٌ کہتے ہیں*۔ اسی سے شَجَرَ بَیْنَھُمْ کے معنے ہیں باھمی اختلاف کی وجہ سے آپس میں جھگڑنا۔ (قرآن کریم میں فِیْمَا شَجَرَ بَیْنَھُمْ (۴/۶۵) باھمی اختلافات کے معنوں میں آیا ہے)۔

---

*تاج۔ **تاج و محیط۔

شَاجَرَ فُلَانٌ فُلَانًا ۔ فلاں نے فلاں سے منازعت و مخاصمت کی ۔
اَلشَّجَرُ ۔ کے معنے درخت ہیں* ۔ (یہ جمع ہے ۔ ایک درخت کو شَجَرَۃٌ کہینگے) ۔ غالباً اس لئے کہ اس کے تنہ کے ایک ہونے کے باوجود اس کی شاخیں منتشر اور بکھری ہوئی ہوتی ہیں ۔ یہی شَجَرَ کے بنیادی معنی ہیں ۔ اگرچہ تاج العروس میں ہے کہ تَشَاجَرَ کے معنے میدان جنگ میں فوجوں کا باہمی گتھم گتھا ہو جانا ہے اور چونکہ درخت کی شاخیں بھی ایک دوسرے میں گتھم گتھا ہوتی ہیں اس لئے اسے شَجَرٌ کہتے ہیں ۔ لیکن اس لفظ کے بنیادی مفہوم کے اعتبار سے پہلی توجیہ زیادہ قرین قیاس نظر آتی ہے ۔ یعنے ایک تنے کے بعد شاخوں کا منتشر ہونا ۔ ابن فارس نے اس کے بنیادی معنوں میں کسی چیز کا بلند ہونا اور اس کے اجزاء کا ایک دوسرے میں گھسے رہنا بتائے ہیں ۔

قرآن کریم میں قصۂ آدم میں ہے کہ آدم سے کہا گیا تھا کہ وَلَا تَقْرَبَا هٰذِهِ الشَّجَرَةَ (۲/۳۵) ۔ اس شجر کے قریب نہ جانا ۔ جیسا کہ آدَمْ کے عنوان (دیکھئے ا ۔ د ۔ م) میں لکھا جاچکا ہے ، قصۂ آدم در حقیقت نوع انسانی کی تمثیلی سرگزشت ہے ۔ انسان اپنی تمدنی زندگی سے پہلے ایسی حالت میں رہتا تھا کہ اس کی ضروریات بہت قلیل تھیں اور سامانِ خور و نوش بافراط تھا ۔ اس لئے ان میں باہمی افتراق و اختلاف نہ تھا ۔ اس کے بعد جب انسانی شعور نے ذرا ترقی کی تو اس نے تمدنی اور معاشرتی زندگی شروع کی ۔ اس سے مختلف افراد (اور اس کے بعد مختلف قبائل) کے مفاد میں تصادم (Clash of Interests) شروع ہوا اور اس تصادم سے باہمی اختلاف و افتراق پیدا ہوا ۔ وَمَا كَانَ النَّاسُ اِلَّآ اُمَّةً وَّاحِدَةً فَاخْتَلَفُوْا (۱۰/۱۹) ۔ ”نوع انسانی پہلے ایک ہی جماعت تھی لیکن بعد میں انہوں نے آپس میں اختلافات شروع کر دئے“** ۔ یہ مطلب ہے وَلَا تَقْرَبَا هٰذِهِ الشَّجَرَةَ (۲/۳۵) سے ۔ یعنے ان سے کہدیا گیا تھا کہ دیکھنا ! تم سب کی اصل ایک ہی ہے ۔ اس لئے تم نے باہمی اختلاف و افتراق پیدا نہ کر لینا ۔ لیکن عقلِ خود بیں (ابلیس) نے ، جو ہر فرد کو اس کے ذاتی مفاد کا تحفظ سکھاتی ہے (برعکس عقلِ جہاں بیں کے جو پوری نوع انسانی کے تحفظ کی فکر کرتی ہے) انہیں انفرادی مفاد پرستیوں کی طرف مائل کر دیا ، اور اس طرح یہ آپس میں ایک دوسرے کے دشمن ہوگئے (۲/۳۶) ۔ لہذا اس مقام پر شَجَرٌ سے مفہوم انسانوں کے وہ باہمی اختلافات ہیں جو ان میں انفرادی مفاد پرستی کی وجہ سے پیدا ہوتے ہیں

* تاج- **(نوع انسانی کو پھر سے ایک ہی جماعت بنکر رہنا ہے لیکن یہ وحدت انسانیہ وحی کے ضابطہ کے بغیر ممکن نہیں - (۲/۲۱۳) -

اور جن کا حل صرف یہ ہے کہ انسانؑ وحی کے نظامؑ کے مطابق زندگی بسر کرے (۲/۳۸) - اسی کو ربوبیت عالمینی کہتے ہیں -

ش ح ح

الشُّحّ - اس کا صحیح مفہوم سمجھنے کے لئے اس نقشے کو سامنے لائیے کہ سخت گرمی کا موسم ہو، کسی جگہ تھوڑا سا پانی ہو اور بہت سے پیاسے - ایسی حالت میں دو آدمی جس طرح ایک دوسرے کو دھکیل کر پیچھے ہٹانے اور آگے بڑھ کر اپنی پیاس بجھانے کے لئے کوشش کرتے ہیں اسے تَشَاحَحَا الْمَاءَ یا تَشَاحَّاهُ کہتے ہیں* - قرآن کریم کا نظام ربوبیت یہ ہے کہ ہر فرد دوسروں کی نشو و نما کی فکر کرے اور ان کی ضروریات کو اپنی ضروریات پر ترجیح دے - لہذا شُحِّ نَفْس اس خصوصیت کی ضد ہوا - یہ مفہوم سورۃ حشر کی اس آیت سے بالکل واضح ہو جاتا ہے جس میں کہا ہے کہ مومنین کی صفت یہ ہے کہ يُؤْثِرُوْنَ عَلٰى اَنْفُسِهِمْ وَلَوْ كَانَ بِهِمْ خَصَاصَةٌ (۵۹/۹) - وہ خود تنگی ہی میں کیوں نہ ہوں دوسروں کی ضروریات کو اپنے پر ترجیح دیتے ہیں - اس کے بعد ہے وَمَنْ يُّوْقَ شُحَّ نَفْسِهٖ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ (۵۹/۹) - یاد رکھو! جو شخص (یا قوم) شُحِّ نَفْس سے اپنے آپ کو بچائے انہی کی کھیتیاں پروان چڑھتی ہیں - یعنے دنیا کے عام قاعدے کی رو سے، اُسی کسان کی کھیتی میں فصل اگتی ہے جو اسے سیراب کرلے - لیکن نظام ربوبیت میں اسکی کھیتی پروان چڑھتی ہے جو دوسرے کے کھیت کی سیرابی کو اپنے اوپر ترجیح دے - تَشَاحَّ الْقَوْمُ کے معنے ہیں، لوگوں نے ایک دوسرے سے بڑھنے کی کوشش کی کہ کہیں ان کے ہاتھ سے چیز نہ جاتی رہے - تَشَاحَّا عَلَى الْاَمْرِ - وہ دونوں اس معاملہ میں جھگڑے اور ان میں سے کوئی بھی اس پر راضی نہ تھا کہ وہ چیز اس کے ہاتھ سے جاتی رہے** - ابن فارس نے کہا ہے کہ اس مادہ کے بنیادی معنی روکنے کے ہوتے ہیں - اس اعتبار سے تَشَاحَّ الْقَوْمُ وغیرہ کے یہی معنی نہیں ہونگے کہ اس قوم نے ایک دوسرے سے بڑھنے میں کوشش کی بلکہ یہ بھی کہ خود آگے بڑھنے کے لئے دوسروں کو روکنے کی کوشش کی - اس سے شُحّ کے معنے بھی واضح ہو جاتے ہیں - یعنی یہ نفسیاتی کیفیت کہ آگے بڑھ کر ہر چیز کو اپنے لئے مختص کر لینا اور دوسروں کو روکنا کہ اس چیز تک پہنچ نہ جائیں -

*تاج - جشع کے عنوان کے تحت - **تاج - ***محیط -

اس بنیادی معنے کے اعتبار سے اَلشُّحّ - بدترین قسم کی خود غرضی کو کہتے ہیں جس میں بخل اور حرص دونوں شامل ہوتے ہیں - بعض نے کہا ہے کہ بخل صرف مال میں ہوتا ہے لیکن شُحّ مال اور دیگر ہر قسم کی بھلائیوں کو اپنے لئے مخصوص کرنے کے لئے آتا ہے* - اپنے لئے مخصوص کرنے اور دوسروں کو ان تک پہنچنے سے روکنے کے لئے - راغب نے کہا ہے کہ شُحّ اس وقت کہتے ہیں جب انسان میں یہ کیفیت عادۃً پائی جائے -

اِبِلٌ شَحَائِحُ بہت کم دودھ دینے والی اونٹنیوں کو کہتے ہیں - اور زَنْدٌ شَحَّاحٌ اس چقماق کو جس سے آگ نہ نکلے - مَاءٌ شَحَاحٌ - بہت تھوڑا سا پانی** - سورۃ احزاب میں اَشِحَّۃً کا لفظ آیا ہے (۳۳/۱۹) - (اس کا واحد شَحِیْحٌ ہے) - یعنے سخت بخیل و حریص -

ش ح م

اَلشَّحْمُ - چربی (جمع شُحُوْمٌ) - اَلشَّحْمَۃُ - چربی کا ٹکڑا - عرب اونٹ کے کوہان کو بھی الشَّحْمُ کہہ دیتے ہیں*** -

قرآن کریم میں یہودیوں کے متعلق ہے حَرَّمْنَا عَلَیْھِمْ شُحُوْمَھُمَا (۶/۱۴۷) - ان پر (گائے اور بکری کی) چربی حرام کر دی گئی تھی -

ش خ ص

شَخَصٌ - ہر دور سے نظر آنے والے جسم کو کہتے ہیں جو بلند ہو - بلندی کے اعتبار سے کہتے ہیں شَخَصَ الْجُرْحُ - زخم اونچا یعنے متورم ہو گیا - شَخَصَ شُخُوْصًا - وہ بلند ہو گیا - شَخَصَ السَّھْمُ - تیر نشانے سے اونچا ہو گیا** - ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنوں میں بلندی پائی جاتی ہے -

شَخَصَ بَصَرَہٗ کے معنے ہیں اس نے بغیر جھپکائے اپنی آنکھوں کو کھلا رکھا - دہشت کے مارے جب کسی کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ جائیں تو اسوقت بولتے ہیں*** - چنانچہ قرآن کریم میں ہے تَشْخَصُ فِیْهِ الْاَبْصَارُ - (۱۴/۴۲) - اس انقلاب عظیم کے وقت آنکھیں کھلی کی کھلی رہ جائینگی - سورۃ انبیاء میں ہے فَاِذَا ھِیَ شَاخِصَۃٌ اَبْصَارُ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا (۲۱/۹۷) - اس نظام سے انکار کرنے والوں کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ جائینگی -

---

* تاج ** محیط *** تاج و محیط و راغب -

ش ح ن

شَحَنَ السَّفِيْنَةَ يَشْحَنُهَا - کشتی کو بھر دیا اور جو سامان اس میں لادنا تھا لاد دیا *- قرآن کریم میں اَلْفُلْکِ الْمَشْحُوْنِ (۲۶/۱۱۹) آیا ہے - یعنی بھری اور لدی ہوئی کشتی - اَلشِّحْنَۃُ - وہ مال و اسباب وغیرہ جس سے کشتی کو بھرا جائے - اَلشِّحْنَۃُ - وہ چارہ جو جانوروں کے لئے اکٹھا کرکے رکھ لیا جائے اور ایک رات دن کے لئے کافی ہو- شَحَنَ - شَحْنًا کے معنے جھڑک دینے ، دور کر دینے کے بھی آتے ہیں - (غالباً) اسی سے اَلشِّحْنَۃُ - بادشاہ کی طرف سے کسی علاقہ کے ناظم کو کہتے ہیں - اَلْمُشَاحِنُ - بغض و کینہ دل میں بھرا رکھنے والا **-

ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنوں میں بھر دینا اور دور کر دینا دونوں آتے ہیں، لیکن یہ دونوں الگ الگ ہیں - یعنی ان میں وجہ جامعیت کوئی نظر نہیں آتی -

ش د د

اَلشِّدَّۃُ - سختی اور صلابت کو کہتے ہیں - شَدَّ - اس نے مضبوط اور محکم کیا - شَیْئٌ شَدِیْدٌ مُشْتَدٌّ - بہت مضبوط چیز - اَلشَّدُّ - کسی کو مضبوطی سے باندھ دینا - اَلشِّدَّۃُ - بہادری اور ثبات قلب - اَلشَّدِیْدُ شجاع - بہادر - قوی - نیز بخیل کو بھی کہتے ہیں - چنانچہ اِنَّہٗ لِحُبِّ الْخَیْرِ لَشَدِیْدٌ (۱۰۰/۸) میں شَدِیْدٌ کے معنے بخیل ہیں - اَلْاَشُدُّ - سن بلوغ - سن رشد - وَاشْدُدْ عَلٰی قُلُوْبِهِمْ (۱۰/۸۸) کے معنے ہیں ان کے دلوں پر مہر کر دے ***-

قرآن کریم میں سن بلوغ و سن رشد کے لئے لفظ اَشُدَّ اکثر مقامات پر آیا ہے - (مثلاً ۱۲/۲۲ ؛ ۶/۱۵۳ ؛ ۴۶/۱۵) - سورۃ نساء میں (۴/۶) میں یتیموں کے متعلق کہا گیا ہے کہ جب تک وہ '' نکاح کی عمر '' کو نہ پہنچیں ان کے مال کی نگرانی کرو- اور دوسرے مقامات (۶/۱۵۳ ؛ ۱۷/۳۴) میں کہا گیا ہے کہ ان کے مال کی حفاظت کرو جب تک وہ جوانی کو نہ پہنچ جائیں - اس سے ظاہر ہے کہ قرآن کریم کی رو سے نکاح کی عمر ، جوانی ہے ، صغرسنی نہیں -

(۱۸/۸۲) میں ان یتیموں کے متعلق جن کی دیوار گر رہی تھی اور جسے حضرت موسیٰؑ اور انکے رفیق سفر نے کھڑا کر دیا تھا یہی کہا گیا ہے -

* تاج و راغب - ** محیط - *** تاج و محیط

(۵/۲۲) میں عام انسانوں کی جوانی کی حالت کے لئے یہ لفظ آیا ہے ۔ (۱۴/۲۸) میں حضرت موسیٰ ؑ کے متعلق بھی یہی کہا گیا ہے۔

سورۃ یوسف میں شِدَادٌ کا لفظ کٹھن سالوں کے لئے آیا ہے (۴۸/۱۲) ۔ یہ شَدِیْدٌ کی جمع ہے ۔ نیز اسکی جمع اَشِدَّاءُ بھی آتی ہے ۔ سورۃ الفتح میں مومنین کی صفت بتائی گئی ہے اَشِدَّاءُ عَلَی الْکُفَّارِ (۲۹/۴۸) ۔ اسکے معنے یہ ہیں کہ وہ مخالفین کے مقابلہ میں بہت قوی اور مضبوط ہوتے ہیں ۔ اَشَدُّ ۔ زیادہ سخت اور مضبوط (۴۴/۳) ۔ اِشْتَدَّ ۔ سختی سے حملہ کرنا ، یا تیزی سے چلنا ۔ (۱۸/۱۴) ۔

ش ر ب

شَرِبَ ۔ یَشْرَبُ ۔ پینا ۔ سیراب ہونا ۔ اَلشَّرَابُ ۔ ہر وہ پینے کی چیز جسے چبانا نہ پڑے (۲۵۹/۲) ۔ اَلْمَشْرَبُ ۔ پانی ۔ پانی پینا ۔ پانی پینے کا گھاٹ ۔ پینے کا وقت یا پینے کی جگہ ۔ وہ طریقہ جس سے پانی پیا جائے * ۔ طَعَامٌ ذُوْ مَشْرَبَۃٍ وہ کھانا جسکے بعد بہت پیاس لگے ** ۔

قرآن کریم میں مَشْرَبَہُمْ (۶۰/۲) میں آیا ہے ، جسکے معنے پانی پینے کی جگہ ، یا خود پانی کے ہیں ۔ شِرْبٌ (۱۵۵/۲۶) ۔ پانی پینے کا حصہ یا باری ۔ یا پانی پینے کا وقت ۔ پینا ۔ شُرْبٌ (۵۵/۵۶) پینا ۔ شَارِبٌ ۔ (۱۵/۴۷) پینے والا ۔ (اسکی جمع شَارِبُوْنَ اور شارِبِیْنَ ہے)

سورۃ بقرہ میں شَرِبَ کے بعد یَطْعَمْہُ آیا ہے (۲۴۹/۲) ۔ یہاں شَرِبَ کے معنے ہیں سیر ہو کر پینا اور طَعِمَ کے معنی پانی کا چکھنا ۔

قصہ بنی اسرائیل میں آیا ہے وَاُشْرِبُوْا فِیْ قُلُوْبِہِمُ الْعِجْلَ (۹۳/۲) ۔ اس کے لفظی معنی تو یہ ہیں کہ بچھڑا ان کے دلوں میں پلا دیا گیا ۔ لیکن استعارۃً مفہوم یہ ہے کہ بچھڑے کی عقیدت ان کے رگ و پے میں سرایت کر گئی ۔ اس کی محبت ان کے دلوں کی گہرائیوں میں اتر گئی ۔

ش ر ح

شَرْحٌ ۔ کھولنا ۔ واضح کرنا * ۔ راغب نے کہا ہے کہ اسکے معنے گوشت کو پھیلا دینے کے ہیں *** ۔ کشادہ اور وسیع کرنے کے معنوں میں بھی آتا ہے ۔ نیز اسکے معنے ہیں سمجھ میں آجانا ۔ شَرَحَ الْبَابَ ۔ دروازہ کھول دیا ۔ شَرَحَ الْکَلَامَ ۔ بات کو سمجھ لیا **** ۔

* تاج و محیط ۔ ** اقرب الموارد ۔ *** راغب ۔ **** محیط ۔

قرآن کریم میں ہے کہ اللہ جسے ہدایت دینا چاہتا ہے، یَشْرَحْ صَدْرَهٗ لِلْاِسْلَامِ (۶/۱۲۶) - اسلام کیلئے اسکے سینے میں کشادگی پیدا کر دیتا ہے - اس لفظ میں بات کے سمجھنے کی صلاحیت، صحیح بات کو قبول کرنے کی استعداد، اور حق کو اختیار کر لینے کی جرأت، سب خصوصیات آجاتی ہیں - اس کے برعکس غلط راستے پر چلنے والوں کے متعلق فرمایا کہ یَجْعَلْ صَدْرَهٗ ضَیِّقًا حَرَجًا (۶/۱۲۶) - وہ اس کا سینہ تنگ، بھنچا ہوا کر دیتا ہے - حقیقت یہ ہے کہ شرح صدر بہت بڑی خصوصیت ہے جسے حاصل ہو جائے - تعصب سے ہٹ کر، بات کو دلائل و بصیرت کی بناء پر سمجھنا (On Merits) - حق و صداقت اور حسن و خوبی جہاں بھی ہو، اُسے (Appreciate) کرنا، اور پھر تمام مخالفتوں کے علی الرغم اسے اختیار کر لینا - نیز اُسے اسی طرح تفصیل و تبیین سے آگے پہنچانا - ہر ایک سے حسن سلوک سے پیش آنا - دشمن تک سے فراخ دلی برتنا - کہیں تنگ نظری کا ثبوت نہ دینا - یہ سب باتیں شرح صدر میں آجاتی ہیں - یہی وجہ ہے کہ اولو العزم انبیائے کرام نے ہمیشہ خدا سے شرح صدر (وسعت قلب و نگاہ اور رفعتِ عزم و ہمت) کی دعائیں مانگی ہیں (۲۰/۲۵) - اور خود نبی اکرمؐ سے کہا گیا کہ یہ شرح صدر کی بدولت ہے کہ ان کی اسقدر سخت سہم یوں آسان ہوگئی اور اسطرح ان سے ذمہ داریوں کا وہ بوجھ ہلکا ہو گیا جس سے ان کی کمر ٹوٹ رہی تھی (۹۴/۱-۲) - ورنہ مخالفین کی کمینہ حرکات ایسی تھیں جن سے انسان کا دم گھٹنے لگ جائے (۱۵/۹۷) -

لہٰذا قرآن کریم کی رو سے معاملات کے آسان ہونے کیلئے شرح صدر نہایت ضروری ہے (۲۰/۲۵-۲۶ ; ۹۴/۱-۲) اور ہر مسلم کا یہی شعار ہونا چاہئے (۶/۱۲۶) - جس شخص میں تنگ نظری اور دوں ہمتی ہو، سمجھ لیجئے کہ اس کا سینہ اسلام کی روشنی کے لئے کشادہ نہیں ہوا - (۳۹/۲۲) میں اسے قساوتِ قلب سے تعبیر کیا گیا ہے - نیز شَرَحَ بِهٖ صَدْرًا کے معنی ہیں کسی چیز کو بطیب خاطر قبول کرنا - اس کے لئے اپنا دل کھول دینا - (۱۶/۱۰۶) -

ش ر د

شَرَدَ الْبَعِیْرُ - اونٹ بدک کر بھاگ نکلا - اَلتَّشْرِیْدُ - جھڑک دینا - نکال دینا - منتشر کر دینا - کسی کو بدکا کر بھگا دینا - راغب نے کہا ہے کہ شَرَّدْتُ بِهٖ کے معنے ہیں، میں نے اس سے ایسا برتاؤ کیا کہ اسے دیکھکر دوسرے لوگ اس جیسا کام کبھی نہ کریں - ویسا کام کرنے سے بدکیں اور

باز رھیں ** ۔ قرآن کریم میں ہے فَشَرِّدْ بِهِمْ مَّنْ خَلْفَهُمْ (۸/۵۷) ۔ یعنی انہیں ایسا مزہ چکھاؤ کہ جو لوگ ایسے ہی مقصد کیلئے ان کے پیچھے آرہے ہیں وہ ان کی اس حالت کو دیکھکر خود بخود بھاگ جائیں ۔ متوحش ہوجائیں (اس لئے کہ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی بدکنا اور دور ہوجانا ہیں) ۔

ش ر ذ م

شِرْذِمَةٌ ۔ تھوڑی سی جماعت ۔ بڑی جماعت سے کٹ کر الگ ہو جانے والی پارٹی ۔ ثِيَابٌ شَرَاذِمُ ۔ پرانے پھٹے ہوئے اور بوسیدہ چیتھڑوں کو کہتے ہیں *** ۔ قرآن کریم میں شِرْذِمَةٌ قَلِيلُونَ (۲۶/۵۴) آیا ہے ۔ یعنی حقیر اور قلیل سی جماعت ۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس لفظ میں ذال زائد ہے ۔ یہ در اصل شَرَمْتُ الشَّيْءَ سے ماخوذ ہے جس کے معنی کسی چیز کو پارہ پارہ کر دینا ہیں ۔ چھوٹی سی جماعت کو اس لئے شِرْذِمَةٌ کہتے ہیں کہ وہ بڑی جماعت سے پھٹ کر الگ ہوتی ہے ۔

ش ر ر

شَرٌّ ۔ خَيْرٌ کی ضد ہے (۹۹/۸) ۔ لسان العرب میں ہے کہ شَرٌّ ۔ برائی (سُوْءٌ) کو کہتے ہیں ۔ اور مصباح میں ہے کہ اس کے معنی فساد اورظلم کے ہیں ۔ اَلشَّرَارُ ۔ وَالشَّرَرُ ۔ آگ کی چنگاریاں (جو آگ میں سے نکل کر اڑتی ہیں) ۔ اس کا واحد شَرَارَةٌ اور شَرَرَةٌ ہے* ۔ (۷۷/۳۲) ۔ شَرَّ السِّقَاءُ مِنَ الْقِرْبَةِ ۔ مشکیزہ سے پانی لگا تار ٹپکتا رہا ۔ نیز اَلشِّرَّةُ کے معنی تیزی ۔ نشاط ۔ غصہ ۔ طیش ۔ حرص ۔ فحش اور سفاھت ہوتے ہیں ۔ نیز اس سے مراد ہر وہ شے ہے جو انسان کی طبیعت کے مطابق نہ ہو ۔ یا وہ اس کی ضروریات کے راستے میں روک بن جائے **** ۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس مادہ کے بنیادی معنی منتشر ہو جانے ، ادھر اُدھر اُڑ جانے اور بکھر جانے کے ہیں ۔

راغب کے نزدیک خَيْرٌ اور شَرٌّ دونوں اضافی الفاظ ہیں ۔ یعنی ہو سکتا ہے کہ ایک ہی چیز ایک آدمی کیلئے خیر ہو اور دوسرے کے لئے شر ***** ۔

چونکہ یہ لفظ خَيْرٌ کی ضد ہے اسلئے اس کے صحیح مفہوم کے لئے عنوان خ ۔ ی ۔ ر بھی دیکھنا چاھئے ۔ ابن فارس نے اس مادہ کے جو بنیادی معنی

* تاج **راغب ۔ *** تاج و راغب ۔ **** محیط ۔ *****راغب ۔ عنوان '' خیر '' میں

بتاۓ ہیں اس اعتبار سے شَرٌّ کے معنے ہوں گے انسان کی صلاحیتوں اور توانائیوں کا اس طرح صرف (یا ضائع) ہونا ، بکھر جانا اور منتشر ہو جانا کہ ان سے کوئی تعمیری نتیجہ مرتب نہ ہو ۔ اس کے برعکس خَیْرٌ کے معنے ہوں گے انسانی توانائیوں کا تعمیری نتائج پیدا کرنا ۔ پانی دریا کے ساحلوں کے اندر مقید ہوکر بہے تو اس کا نتیجہ خیر ہی خیر ہوتا ہے لیکن جب وہ سیلاب کی شکل میں ادھر ادھر بکھر جاۓ تو شر کا موجب ہو جاتا ہے ۔ ہوا نرم روی کے ساتھ ایک سمت میں چلے تو موجب خیر ہے لیکن جب جھکڑ اور آندھی بن جاۓ تو تباہی کا موجب ۔ توانائیوں کا بکھر جانا ، قوتوں کا بد لگام ہو کر منتشر ہوجانا شر ہے ۔ یہی چیز خود انسانی ذات کے متعلق بھی ہے ۔ اگر اس کی قوتیں منتشر (Diffused) ہوں تو اس کی نشو و نما نہیں ہوتی ۔ اگر وہ مرتکز (Crystallised) ہو جائیں تو اس میں استحکام پیدا ہو جاتا ہے ۔

سورۃ الفلق میں مِنْ شَرِّ مَا خَلَقَ (۱۱۳/۲) سے محفوظ رہنے کی دعا سکھائی گئی ہے ۔ یعنی جو کچھ پیدا کیا گیا ہے اس کے شر سے حفاظت ۔ اس سے ظاہر ہے کہ شر (Evil) کوئی مستقل بالذات شے نہیں جسے الگ پیدا کیا گیا ہو(جیسا کہ مجوسیوں کے ہاں عقیدہ تھا)۔ کائنات کی کوئی شے نہ بجائے خویش شر ہے نہ خیر ۔ ہر چیز میں شر کا پہلو بھی ہے اور خیر کا بھی ۔ اس کے شر کے پہلو سے بچنا چاہئے اور خیر کا پہلو اختیار کرنا چاہئے ۔ پانی اگر کشتی کے نیچے رہے تو خیر ہی خیر ہے لیکن اگر وہ کشتی کے اندر آ جائے تو شر ہو جائیگا ۔ کائنات کی ہر قوت کو وحیِ خداوندی کی روشنی میں صرف اور استعمال کرنا ، خیر ہے ۔ اور اسے انسانیت کی تخریب کے لئے استعمال کرنا شر ۔ باقی رہیں ہماری معاشرتی مصیبتیں ، سو وہ معاشرہ کے غلط نظام کا نتیجہ ہوتی ہیں ۔ اگر معاشرہ کے نظام کو صحیح خطوط پر متشکل کردیا جائے تو یہ تمام مصیبتیں ختم ہوجاتی ہیں ۔ یہی صورت اس انفرادی دکھ ، درد (Pain) کی ہے جو طبعی طور پر ہوتا ہے ۔ جوں جوں انسان کا علم بڑھتا جاتا ہے اور وہ اس کے ذریعے تسخیر فطرت کرتا جاتا ہے ان تکلیفوں میں کمی ہوتی جاتی ہے ۔

اب رہیں وہ پریشانیاں جو جذباتی طور پر وجہِ مصیبت بنتی ہیں ۔ سو اگر انسان کی تعلیم و تربیت صحیح خطوط پر ہو جاۓ تو وہ ان پریشانیوں پر بھی غالب آ سکتا ہے ۔ زاویہٴ نگاہ کے بدل جانے سے ان چیزوں کا اثر ہی بدل جاتا ہے ۔ اس لئے ''ابلیس،، سے کہا گیا ہے کہ اِنَّ عِبَادِیْ لَیْسَ لَکَ عَلَیْہِمْ سُلْطٰنٌ (۱۵/۴۲) ۔ یقیناً میرے بندوں پر تیرا غلبہ نہیں ہو سکیگا ۔

خیر اور شر کے ان گوشوں کا ذکر قرآن کریم کے مختلف مقامات میں ملے گا جہاں سے وہ حقائق واضح ہو جائینگے جن کا ذکر اوپر کیا گیا ہے ۔ واضح رہے کہ قرآن کریم نے مسئلہ خیر اور شر (Good and evil) کی بحث فلسفیانہ طور پر نہیں کی۔اس لئے کہ اس کا موضوع فلسفہ نہیں ۔ اس کا مقصود ایسی راہ نمائی دینا ہے جس سے شر ، شر ہی نہ رہے ۔ یعنی توانائیاں بکھر کر تخریبی نتائج (Disintegration) نہ پیدا کریں، بلکہ نظم و ضبط کے ساتھ مجتمع ہو کر تعمیری نتائج پیدا کریں ۔

واضح رہے کہ ہم نے جو اوپر کہا ہے کہ کوئی شے فی نفسہ نہ خیر ہے نہ شر، اور ان کا طریق استعمال ہے جو انہیں خیر یا شر بنا دیتا ہے، تو یہ چیز اشیائے کائنات یا کائنات اور انسان کی قوتوں کے متعلق ہے ۔ جہاں تک ان مستقل اقدار کا تعلق ہے جن پر شرف انسانیت (یا دین) کی عمارت استوار ہے اور جو وحی کے ذریعے عطا ہوئی ہیں، وہ فی نفسہ خیر ہیں ۔ مثلاً عدل و احسان فی نفسہ خیر ہیں ۔ اور ان کی ضد ذاتی طور پر شر ۔ اسی طرح وہ چیزیں جنہیں قرآن کریم نے حرام قرار دیا ہے ، شر پیدا کرنے کا موجب ہیں ۔

ش ر ط

اَلشَّرَطُ ۔ علامت یا نشانی جسے لوگ آپس میں مقرر کرلیں ۔ (جمع اَشْرَاطٌ) ۔ ہر چیز کا پہلا حصہ ۔ اَلشُّرْطَۃُ ۔ فوج کا پہلا دستہ جو جنگ میں شریک ہو اور موت کے لئے بالکل تیار ہو ۔ گورنر کے اعوان و انصار کی جماعت (کیونکہ وہ اپنے اوپر ایسی علامات لگا لیتے ہیں جن سے وہ پہچانے جائیں)* ۔ اس کا واحد شُرْطِیٌّ ہے ۔ قرآن کریم میں اَلسَّاعَۃُ (آنے والے انقلاب) کے متعلق ہے فَقَدْ جَآءَ اَشْرَاطُھَا (۴۷/۱۸) ۔ اس کی ابتدائی علامات تو آچکی ہیں ۔ اب اس کے بعد وہ انقلاب کی گھڑی (وہ فیصلہ کن لڑائیاں جن میں مخالفین (قریش) کو ایسی شکست ہوئی کہ اس کے بعد وہ اٹھ ہی نہ سکے) جلد آ جائیگی ۔

ش ر ع

اَلشَّرِیْعَۃُ ۔ وہ گھاٹ جس پر آدمی اور جانور پانی پینے کے لئے آتے ہیں ۔ لیکن اس کے لئے خصوصیت یہ ہے کہ پانی مسلسل بہنے والے چشمہ سے آ رہا ہو جو بند نہ ہوتا ہو ، کھلا ہوا اور سطح زمین پر جاری ہو ۔ بغیر اسے

*تاج و محیط و راغب ۔

حاصل کرنے کے لئے کسی رسی وغیرہ کی ضرورت نہ پڑے ۔ اگر بارش وغیرہ کا جمع شدہ پانی ہو ، تو وہ شریعۃ نہیں بلکہ کَرَعٌ کہلائیگا ۔ اسی سے اَلشَّارِعُ ۔ عام راستہ کو کہتے ہیں جس پر سب لوگ چل سکتے ہوں ۔ الشَّرْعُ ۔ سیدھے راستہ کو جو واضح اور کھلا ہو ۔ ابن الاعرابی نے کہا ہے کہ شَرَعَ کے معنے ظَہَرَ ہیں ۔ یعنے ظاہر ہوگیا ۔ کھل گیا ۔ شَرِعَتِ الرِّمَاحُ کے معنے ہیں نیزے سیدھے کئے گئے ۔ اَشْرَعَ الشَّيْءَ ۔ اس نے اس چیز کو بہت بلند کر دیا ۔ اَلشِّرَاعُ ۔ کشتی کے بادبان کو کہتے ہیں ۔ اَلشَّرِيْعَةُ ۔ دروازے کی چوکھٹ کو بھی کہتے ہیں ۔ الشَّرِيْعَةُ و الشِّرْعَةُ ۔ سیدھا اور واضح راستہ* ۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی ہیں کسی چیز کو طول کی جانب سے کھول دینا ۔ یعنی اسطرح کھول دینا کہ وہ یہاں سے وہاں تک پوری کی پوری سامنے آ جائے ۔

سورۃ شوریٰ میں ہے شَرَعَ لَكُمْ مِنَ الدِّيْنِ (۴۲/۱۳) ۔ خدا نے تمہارے لئے اس نظام زندگی (اَلدِّيْنُ) یا قانون حیات کو نمایاں اور واضح کیا ہے ۔ سورۃ جاثیۃ میں ہے ثُمَّ جَعَلْنٰكَ عَلٰى شَرِيْعَةٍ مِنَ الْاَمْرِ (۴۵/۱۸) پھر ہم نے تجھے الامر (دین کے معاملہ) میں ایک کھلے اور واضح راستے پر لگا دیا ۔

ان آیات میں (شَرَعَ لَكُمْ مِنَ الدِّيْنِ ۔ یا شَرِيْعَةٍ مِنَ الْاَمْرِ سے) مفہوم خود الدین ہے ۔ یعنی خدا کا متعین کردہ راستہ ۔ سورۃ مائدہ میں پہلے یہ کہا گیا ہے کہ ''ہم نے تیری طرف یہ کتاب حق کے ساتھ نازل کی ہے جو ان حقائق کو سچ کرکے دکھانے والی ہے جو اس سے پہلی آسمانی کتابوں میں آ چکے ہیں ۔ اور یہ ان سب کی تعلیم کی محافظ ہے ۔ سو تو ان کے متنازع فیہ معاملات میں ما انزل اللہ کے مطابق فیصلہ کر ۔ اور جب تمہارے پاس حق آ چکا ہے تو پھر ان کے جذبات و خواہشات کا اتباع مت کرو'' ۔ اس کے بعد ہے لِكُلٍّ جَعَلْنَا مِنْكُمْ شِرْعَةً وَّ مِنْهَاجًا (۵/۴۸) ۔ ''اور ہم نے تم میں سے ہر ایک کے لئے ایک شرعۃ (راستہ) اور منہاج (طریقہ) مقرر کیا (تھا)'' ۔ یہاں شِرْعَةً کے معنی الدین کے وہ غیر متبدل اصول نہیں جو حضرت نوحؑ سے نبی اکرمؐ تک ہر نبی کو یکساں طور پر دئے گئے تھے (۴۲/۱۳) ۔ یہاں اس سے مراد ، الدین کے اصولوں کے تابع وہ جزئی احکام ہیں جو انبیائے سابقہ کو وقتی ضروریات کے لئے دئے جاتے رہے اور جن میں زمانے کی

*تاج و محیط ۔

تبدیلی کے ساتھ تبدیلی ہوتی رہی ۔ قرآن کریم کا کہنا یہ ہے کہ یہ لوگ (یہود و نصاریٰ) جو یہ اعتراض کرتے ہیں کہ اگر قرآن کریم منجانب اللہ ہے تو اس میں ایسے احکام کیوں ہیں جو ہماری شریعت کے خلاف ہیں ، تو اس کی وجہ یہ ہے کہ ایک چیز ہے دین کے اصول ، اور دوسری چیز ہے جزئی احکام ۔ دین کے اصول ہمیشہ ایک رہے لیکن جزئی احکام میں تبدیلیاں ہوتی رہیں ۔ اس لئے اگر قرآن کریم کا کوئی حکم ، سابقہ اقوام کے کسی جزئی حکم سے مختلف ہے تو اس سے یہ نہیں کہا جاسکتا کہ قرآن کریم منجانب اللہ نہیں ۔ اس مفہوم کی تائید ، سورۃ حج کی وہ آیت کرتی ہے جس میں کہا گیا ہے لِكُلِّ أُمَّةٍ جَعَلْنَا مَنْسَكًا هُمْ نَاسِكُوهُ فَلَا يُنَازِعُنَّكَ فِي الْأَمْرِ (۲۲/۶۷) ۔ ''ہم نے ہر قوم کے لئے (دین کو عملاً نافذ کرنے کے لئے) طریقہ تجویز کیا تھا جس پر وہ چلیں ۔ (اس طریق میں اختلاف ہو سکتا ہے لیکن اصل دین میں نہیں) اس لئے یہ تجھ سے الامر (اصل دین) کے بارے میں تو تنازع نہ کریں'' ۔

اس آیت (لِكُلٍّ جَعَلْنَا مِنْكُمْ شِرْعَةً وَّمِنْهَاجًا) کا ایک مفہوم یہ بھی ہوسکتا ہے کہ دین کے اختیار کرنے پر ہم کسی پر جبر نہیں کرتے ۔ جس جس طریق پر کوئی از خود چلتا ہے ، ہم اس کے اس اختیار و ارادہ میں دخل نہیں دیتے ۔ ہمارا کام الدین دیدینا ہے ۔ یہ انسانوں کی اپنی مرضی ہے کہ وہ الدین کو اختیار کریں یا اپنے اپنے طور طریقوں پر چلتے رہیں ۔ اس مفہوم کی تائید اس سے اگلی آیت سے ہوتی ہے جس میں کہا گیا ہے کہ وَلَوْ شَاءَ اللَّهُ لَجَعَلَكُمْ أُمَّةً وَّاحِدَةً (۵/۴۸) ۔ اگر اللہ چاہتا تو تم سب کو ایک اُمت بنا دیتا ۔ لیکن اس طرح تمہارا اختیار و ارادہ سلب ہو جاتا ۔ اور یہ چیز مشیت خداوندی کے خلاف ہوتی ۔

ہمارے ہاں دین اور شریعت الگ الگ معنوں میں استعمال ہوتے ہیں ۔ شریعت سے مراد ، وہ جزئی احکام لئے جاتے ہیں جن پر اُمت کے لئے چلنا ضروری ہے ۔ اسلام کا نظام یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں (بجز چند مستثنیات) دین کے صرف اصول دئے ہیں ۔ یہ اصول (اور وہ چند احکام جو قرآن کریم میں دئے گئے ہیں) ہمیشہ کے لئے غیر متبدل رہینگے لیکن ان اصولوں کی چاردیواری کے اندر رہتے ہوئے ، ہر زمانے کی اُمت اپنے لئے جزئی احکام ، اپنے زمانے کے تقاضوں کے مطابق ، باہمی مشورہ سے خود مرتب کریگی ۔ قرآنی اصول غیر متبدل رہینگے اور یہ جزئی احکام تبدیل ہوتے رہینگے ۔ ان احکام کو اگر شریعت کہا جائیگا تو یہ شریعت بدلتی رہیگی اور اصول شریعت غیر متبدل رہینگے ۔

اَلشَّرِیْعَۃُ کے ان معانی کو سامنے لائیے جو شروع میں بیان ہوئے ہیں اور پھر غور کیجئے کہ شریعت کی خصوصیات کیا ہونی چاہئیں - ان معانی کے لحاظ سے اَلشَّرِیْعَۃُ (یعنی الدین کے غیر متبدل اصولوں کی روشنی میں ، اسلامی معاشرہ کی مرتب کردہ جزئیات) کو واضح ، سیدھا اور نمایاں ہونا چاہئے۔ نیز ایسا راستہ جو ہر ایک کے لئے یکساں ہو - یا ایسا پانی جس سے سب سیراب ہو سکیں - جس تک ہر ایک کی رسائی ہو - جو مسلسل آ رہا ہو - بارش کا ایک جگہ جمع شدہ پانی نہ ہو - لہذا شریعت وہ ہوگی جس میں جمود، تعطل نہ ہو - جس میں تسلسل ہو - جو زمانے کے بہتے ہوئے اور بدلتے ہوئے تقاضوں کا ساتھ دے سکے - اگر وہ جوئے رواں ہونے کی بجائے بند پانی کی طرح ہوگی تو اس میں کچھ عرصہ کے بعد فساد کی بو پیدا ہو جائے گی - وہ زندگی بخش نہیں رہے گی -

سورۂ اعراف میں حِیْتَانُہُمْ .... شُرَّعًا (۷/۱۶۳) آیا ہے - شُرَّعًا جمع ہے شَارِعٌ کی اور اس کے معنے ہیں وہ مچھلیاں جو اپنے سر کو اونچا کئے نمایاں طور پر سطح آب کے اوپر آجائیں** - ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے معنی ہیں وہ مچھلیاں جو سر نیچا کئے جا رہی ہوں - (ابن فارس کی عبارت میں تَشْرَبُ ہے جس کے معنی پانی پینے کے ہیں - لیکن معلوم ہوتا ہے کہ یہ طباعت کی غلطی ہے اور صحیح لفظ تَسْرَبُ ہے) - لیکن جس مقام پر یہ لفظ قرآن کریم میں آیا ہے اس کے اعتبار سے پہلے معانی زیادہ موزوں نظر آتے ہیں - بنی اسرائیل ، سبت کے روز کام کاج سے ناغہ کرتے تھے - اس لئے ان کے ماہی گیر اس دن مچھلیاں نہیں پکڑتے تھے - مچھلیوں میں (اور دیگر جانداروں میں بھی) یہ طبعی ملکہ ہوتا ہے کہ جب انہیں پیہم تجربہ سے معلوم ہوجائے کہ ان کے لئے کوئی خطرہ نہیں تو وہ چھپنے کی بجائے کھلے طور پر ، انسانوں کے قریب پھرتے رہتے ہیں - یہی کچھ وہ مچھلیاں کرتی تھیں - لیکن بنی اسرائیل کے لالچی ، ان کی اس روش سے فائدہ اٹھاتے اور سبت کے علی الرغم انہیں پکڑ لیتے - (تفصیل س - ب - ت میں دیکھئے) -

ش ر ق

اَلشَّرْقُ - شگاف کو کہتے ہیں - شَرَقَ الشَّاۃَ - بکری کا کان چیر دیا - اَلتَّشْرِیْقُ - گوشت کو چیرنا پھاڑنا یا کاٹنا - اَیَّامُ التَّشْرِیْقِ - یہیں سے ہے جس سے مراد عیدالاضحٰی کے تین دن ہیں جن میں قربانی کا

*تاج - **محیط -

گوشت چیر کاٹ کر دھوپ میں رکھا جاتا ہے *۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس مادہ کے بنیادی معنی روشن کر دینے اور کھول دینے کے ہیں۔ شَرَقَتِ الشَّمْسُ۔ سورج نکل آیا۔ وَاَشْرَقَتِ الشَّمْسُ۔ سورج نے روشنی کر دی۔ اس نے یہ بھی کہا ہے کہ اَیَّامُ التَّشْرِیْقِ کی وجہ تسمیہ یہ ہے کہ ان دنوں میں لوگ قربانی کے گوشت کو پارچے بنا کر دھوپ میں سکھانے کے لئے پھیلا دیتے تھے۔ اَلشَّرْقُ کے معنے آفتاب کے بھی ہیں جبکہ وہ طلوع یا روشن ہوگیا ہو۔ چنانچہ طَلَعَتِ الشَّرْقُ آفتاب نکلنے کے لئے بولتے ہیں۔ لیکن غَرَبَتِ الشَّرْقُ کبھی نہیں کہتے۔ اَلشَّرْقُ۔ آفتاب کا روشن ہونا۔ وہ جگہ جہاں سے آفتاب طلوع ہوتا ہے۔ یعنی مشرق۔ اَلشَّارِقُ۔ آفتاب، عین طلوع ہونے کے وقت *۔

شَرِقَ النَّخْلُ وَاَشْرَقَ۔ کھجور کے درخت لمبے ہوئے یا ان میں سفید شگوفے نکلے۔ شَرِقَ الدَّمُ فِیْ عَیْنِہٖ: اس کی آنکھ سرخ ہوگئی*۔

اَلْمَشْرِقَانِ۔ وہ انتہائی دو نقاط جہاں سے سورج سردی اور گرمی میں طلوع ہوتا ہے*۔

قرآن کریم میں مَشْرِق کے مقابلہ میں مَغْرِب آیا ہے (۲/۱۱۵) اور سورۃ صٓ میں بِالْعَشِیِّ وَالْاِشْرَاقِ بھی آیا ہے (۳۸/۱۸)۔ سورۃ رحمٰن میں رَبُّ الْمَشْرِقَیْنِ وَرَبُّ الْمَغْرِبَیْنِ (۵۵/۱۷) آیا ہے۔ یعنی سردی اور گرمی میں طلوع اور غروب کے انتہائی نقاط۔ اس سے مراد تمام روئے زمین ہے۔ اسطرح مشرقی اور مغربی زمینوں کے لئے مشارق اور مغارب بھی آیا ہے (۷۰/۴۰) اور صرف مَشَارِق بھی (۳۷/۵)۔ سورۃ اعراف میں ہے کہ خدا نے بنی اسرائیل کو ارض با برکت کے مشارق و مغارب کا مالک بنا دیا (۷/۱۳۷)۔ یعنی اس با برکت زمین کے ان حصوں کا جو اسکے شرق و غرب میں واقع تھے۔ یا اس پورے کے پورے خطہ کا۔ اسلئے کہ قرآن کریم نے جہاں کہا ہے وَلِلّٰہِ الْمَشْرِقُ وَالْمَغْرِبُ۔ (۲/۱۱۵) تو اس سے مراد کل کائنات ہے۔

سورۃ نور میں، نور خداوندی کے تمثیلی بیان میں لَا شَرْقِیَّۃٍ وَّلَا غَرْبِیَّۃٍ (۲۴/۳۵) آیا ہے۔ یعنی وہ مشرق و مغرب کی نسبتوں سے بلند و بالا ہے۔ اسکی روشنی عالمگیر (Universal) اور تمام کائنات کو محیط ہے۔ جس طرح خدا تمام نوع انسانی کا خدا ہے اسی طرح اس کا ضابطہ قانون (قرآن کریم) بھی تمام نوع انسانی کی آنکھوں کیلئے روشنی ہے اور اسکا نظام

* تاج و محیط۔

ربوبیت تمام انسانوں کی نشوونما کا ذریعہ ۔ یہی وہ نظام ہے جسکی روشنی سے آخرالامر تمام روئے زمین جگمگا اٹھیگی ۔ وَ اَشْرَقَتِ الْاَرْضُ بِنُوْرِ رَبِّهَا (۳۹/۶۹) ۔

اِشْرَاقٌ (۳۸/۱۸) طلوع آفتاب (یا دن چڑھنے) کیلئے آیا ہے ۔ (۱۵/۷۳) میں مُشْرِقِيْنَ آیا ہے ۔ اس کے معنے یہ ہیں کہ عذاب نے انہیں اسوقت گرفت میں لے لیا جب ان پر سورج کی روشنی پڑ رہی تھی ۔ یعنی طلوع آفتاب کے وقت ۔

ش ر ک

اَلشِّرْکُ کے بنیادی معنی ہیں چمٹے رہنا ۔ خلط ملط ہو جانا * ۔ شَارَکْتُ فُلَانًا کے معنے ہیں میں فلاں کا ساتھی ہو گیا ۔ اور اِشْتَرَکَ الْاَمْرُ کے معنے ہیں معاملہ گڈ مڈ ہو گیا ۔ مُشَارَکَۃٌ کے معنے ہیں ایک کا دوسرے کے ساتھ کسی کام میں شریک ہو جانا ۔ فُلَانٌ شَرِیْکُ فُلَانٍ ۔ فلاں شخص کسی دوسرے شخص کا شریک کار یا ساجھی ہے ۔ نیز اس کے معنی ہیں کسی کی بہن یا بیٹی سے شادی کرکے اس کے خاندان سے رشتہ داری پیدا کر لینے والا ۔ اسکی جمع شُرَکَاءُ آتی ہے ۔ اَلشَّرَکُ ۔ شکاری کے جال کو کہتے ہیں ۔ نیز وہ چھوٹے چھوٹے راستے جو بڑے راستے (اُمُّ الطَّرِیْقِ) سے نکلیں اور آگے جاکر ختم ہو جائیں ۔ ان کا واحد شَرَکَۃٌ ہے ** ۔

شِرْکٌ ۔ قرآن کریم کی خاص اصطلاح ہے ۔ اسکے معنے ہیں غیر خدائی قوتوں کو خدا کے ہمسر سمجھنا ۔ جو اختیارات صرف خدا کیلئے مخصوص ہیں ان کا حامل دوسروں کو بھی سمجھنا ۔ انسانوں کے خود ساختہ قوانین کو، قانون خداوندی کے برابر سمجھنا ۔ خدا کے حق ملکیت میں دوسروں کا حق تسلیم کرنا ۔ قرآن کریم کی تعلیم یہ ہے کہ اس کائنات میں ہر شے انسان کیلئے تابع فرمان کر دی گئی ہے اور انسان سب برابر ہیں ۔ کسی کو حق حاصل نہیں کہ کسی دوسرے سے اپنی اطاعت کرائے ۔ لہذا اس کائنات میں، انسان سے برتر کوئی اور قوت نہیں ۔ (انسان سب برابر اور کائنات کی دیگر اشیاء انسان سے فروتر) ۔ بس ایک خدا کی ذات ہے جو انسان سے برتر ہے ۔ لہذا انسان کا خدا کے علاوہ کسی اور کو اپنے سے برتر سمجھنا خود اسکی

* محیط ۔ ** تاج ۔

اپنی تذلیل ہے۔ اسی کو شرک کہتے ہیں۔ شرک سے خدا کی خدائی (خدا ہونے) میں کوئی فرق نہیں آجاتا۔ خود انسان اپنے مقام انسانیت سے گرجاتا ہے۔ اسلئے قرآن کریم کی رو سے شرک سب سے بڑا جرم ہے جو انسان سے اسکا صحیح مقام چھین لیتا ہے (۳۱/۱۳)۔ مشرکین وہی ہیں جو مقام انسانیت سے گر جاتے ہیں اور (خدا کے علاوہ اور) قوتوں کو اپنے سے برتر سمجھنے لگ جاتے ہیں۔بس ایک خدا کے قانون کی اطاعت (جو اسنے وحی کے ذریعہ قرآن کریم میں عطا کر دیا ہے) اور ساری کائنات کی تسخیر۔ یہ ہے توحید۔ اور اس میں ذرا سی بھی خرابی ، شرک۔

اَشْرَکَ ۔ اس نے شرک کیا، اس سے اسم فاعل مُشْرِکٌ ہے یعنی شرک کرنے والا۔ اسکی جمع مُشْرِکُوْنَ اور مُشْرِکِیْنَ ہے۔

نزول قرآن کے وقت ایک گروہ تو ان لوگوں کا تھا جو وحی خداوندی کے اتباع کے مدعی تھے۔ انہیں اہل کتاب کہکر پکارا گیا ہے۔ یعنی یہودی۔ نصرانی وغیرہ۔ دوسرا گروہ ان لوگوں کا تھا جو کسی آسمانی کتاب کے اتباع کے مدعی نہیں تھے۔ وہ اپنے خود ساختہ رسوم و آئین کے متبع تھے۔ وہ اپنے ذہنی تصور کے مطابق خدا کو بھی مانتے تھے لیکن اس کے ساتھ اور قوتوں کو بھی شریک خیال کرتے تھے۔ انہیں مشرکین کہا گیا ہے۔ (چونکہ یہ دونوں گروہ قرآن کریم کی دعوت سے انکار کرتے تھے اسلئے ان سب کو کافِرِیْنَ کہا گیا ہے)۔ یہ اصطلاحی تعبیریں ان گروہوں میں باہمی امتیاز کیلئے تھیں ورنہ جہاں تک حقیقت کا تعلق ہے خود اہل کتاب بھی قانون خداوندی کا اتباع نہیں کرتے تھے بلکہ انسانوں کے خود ساختہ قوانین کا اتباع کرتے تھے۔ یعنے اپنے احبار و رہبان (علماء و مشائخ) کے مسلک و آئین کا اتباع۔ قانون خداوندی اپنی اصلی شکل میں انکے پاس تھا ہی نہیں۔ اور جتنا کچھ تھا ، وہ بھی محض تبرکاً تھا۔ ان کا عمل انکے علماء و مشائخ کی متعین کردہ شریعت پر تھا۔ لہذا عملاً یہ لوگ بھی مشرک تھے۔ اس اعتبار سے قرآن کریم نے انہیں بھی مشرک کہا ہے۔ وَقَالُوْا کُوْنُوْا ھُوْدًا اَوْ نَصٰرٰی تَھْتَدُوْا۔ قُلْ بَلْ مِلَّۃَ اِبْرَاھِیْمَ حَنِیْفًا۔ وَمَا کَانَ مِنَ الْمُشْرِکِیْنَ (۲/۱۳۵)۔

دینِ توحید صراط مستقیم ہے۔ اور مختلف فرقے وہ چھوٹے چھوٹے راستے ہیں جو انسان کو صراط مستقیم سے بھٹکا کر دوسری طرف لیجاتے ہیں اور تھوڑی دور جا کر بند ہو جاتے ہیں۔ اسلئے قرآن کریم نے فرقہ بندی کو

شرک قرار دیا ہے - (۳۰/۳۱-۳۲) - اس لئے کہ فرقوں میں آخری سند انسان ہوتے ہیں - دین میں سند اور حجت صرف خدا کی کتاب ہوتی ہے -

لہذا شرک یہی نہیں کہ انسان بتوں کی یا مردوں کی پرستش کرنے لگ جائے - شرک یہ بھی ہے (اور یہ شرک بہت بڑا ہے) کہ انسانوں کے بنائے ہوئے قانون کو خدا کے قانون کا درجہ دیدیا جائے اور اسطرح دین کو مختلف فرقوں میں بانٹ دیا جائے - ایسا کرنے والوں کے متعلق قرآن کریم کہتا ہے کہ یہ لوگ اپنے آپ کو مومن سمجھتے ہیں لیکن درحقیقت مشرک ہوتے ہیں- وَمَا یُؤْمِنُ اَکْثَرُھُمْ بِاللّٰہِ اِلَّا وَھُمْ مُّشْرِکُوْنَ (۱۲/۱۰۶)- ان میں سے اکثریت انکی ہے جو خدا پر اسطرح ایمان رکھتے ہیں کہ ایمان کے باوجود مشرک ہوتے ہیں -

جسطرح سارے قرآن کریم میں توحید کی تفاصیل کا تذکرہ ہے اسی طرح اس میں شرک اور اسکی جزئیات و تضمنات کا ذکر ہے - قرآن کریم کی بنیادی تعلیم شرک کو مٹانا اور توحید کو قائم کرنا ہے - لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ کے معنے یہی ہیں - ہر غیر خداوندی قانون و آئین کی اطاعت سے انکار اور قانون خداوندی کی اطاعت کا عملی اقرار- مسلم اور مشرک ایک دوسرے کی ضد ہیں (۳/۹۴) - اور غیر خدائی قوتوں پر بھروسہ کرنے والے اور شیطانی اقتدار کو تسلیم کرنے والے مشرک ہیں (۱۶/۹۹-۱۰۰)-

ضمناً ایک نقطہ کی وضاحت ضروری ہے - قرآن کریم میں مشرکین کے خلاف جنگ کرنے کا حکم اکثر مقامات میں نظر آئیگا - اس کے یہ معنی نہیں کہ مسلمان، تمام دنیا کے مشرکین سے ہر حال میں جنگ کرتے رہیں - اُن مقامات میں مشرکین سے مراد زمانہ نزول قرآن کے مشرکین ہیں جنہوں نے جنگ کے حالات پیدا کر دئے تھے - اُس کے بعد جنگ صرف انہی سے کی جائیگی جو اُس قسم کے حالات پیدا کر دیں - بالفاظ دیگر، کسی مشرک سے محض اس کے مشرک ہونے کی بنا پر جنگ نہیں کی جائیگی - جنگ ان قوموں سے کی جائیگی جو جنگ کے حالات پیدا کر دیں - اس کے لئے قرآن کریم نے تفصیلی ھدایات دی ہیں -

لیکن اسلامی معاشرہ میں مشرکین (یا غیرمسلموں) کی جو پوزیشن قرآن کریم نے متعین کر دی ہے اور ان سے جس قسم کے تعلقات رکھنے کا حکم دیا ہے، وہ ہر دور کے مشرکین (یا غیر مسلموں) پر یکساں طور پر منطبق ہوتا ہے -

جو کچھ اوپر لکھا گیا ہے اس کا ملخص یہ ہے کہ

(۱)　جو خصوصیات اور قوتیں خدا کے کے لئے مختص هیں، ان میں کسی دوسرے کو شریک سمجھنا ، شرک هے ۔

(۲)　اپنے آپ کو خدا کے سوا ، کائنات کی کسی قوت یا کسی انسان کا محکوم اور تابع فرمان سمجھنا اور اس کے سامنے جھکنا، شرک هے۔

(۳)　قرآن کریم کے علاوہ ، کسی اور کی محکومی اختیار کرنا شرک هے ۔ اس ضابطه کے علاوہ ، کسی اور ضابطه کو اپنا ۔ حکم ماننا، شرک هے ۔

(۴)　الدین ، ملت میں وحدت پیدا کرتا هے ۔ فرقوں میں بٹ جانا اور گروہ در گروہ هو جانا، شرک هے ۔

(۵)　ایک خدا ۔ اس کا عطا کردہ ایک ضابطه زندگی ۔ اس پر چلنے والی ایک اُمت ۔ اس اُمت کا ایک نظام ۔ یہ هے توحید ۔ اس کے خلاف جو کچھ هے شرک هے ۔

ش ر ی

شَرَیٰ کے معنے بیچنے اور خریدنے دونوں کے آتے هیں۔ (اور یہی مفہوم بَیْعٌ کا بھی هے) ۔ اس کی وجه یه هے که جب خرید و فروخت ، جنس کے عوض جنس سے هوتی تھی جسے (Barter System) کہتے هیں ، تو اس میں هوتا یه تھا که ایک جنس والا جہاں اپنی جنس دوسرے کو دیتا تھا تو اسکے عوض دوسرے سے اسکی جنس خریدتا بھی تھا ۔ اس طرح ان دونوں میں سے هر ایک خریدتا بھی تھا اور بیچتا بھی تھا ۔ لہذا یه لفظ خریدنے اور بیچنے دونوں کے معنوں میں استعمال هوتا تھا* ۔ شَرَیٰ کا اصلی مطلب هے کسی چیز کا اپنے قبضے سے نکال کر اس کے عوض دوسری چیز کو اپنے قبضے میں لے لینا ۔ اس اعتبار سے ایک چیز کو چھوڑ کر اس کی جگه دوسری چیز اختیار کرلینے کو بھی اِشْتِرَاءٌ کہدیتے هیں** ۔ راغب نے لکھا هے که شَرَی بیچنے کے لئے اور اِشْتَرَی خریدنے کے لئے زیادہ مستعمل هوتا هے ۔

قرآن کریم میں (۲/۲۰۸) میں یَشْرِیْ نَفْسَهٗ کے معنے اپنے آپ کو فروخت کر دینے کے هیں ۔ وَ شَرَوْهُ بِثَمَنٍ بَخْسٍ (۱۲/۲۰) میں بھی اس کے معنے فروخت کرنے کے هیں ۔ لیکن اِنَّ اللّٰهَ اشْتَرٰی (۹/۱۱۱) میں اس کے معنے خریدنے کے هیں۔ اُولٰٓئِکَ الَّذِیْنَ اشْتَرَوُا الضَّلٰلَةَ بِالْهُدٰی (۲/۱۶) میں اس کے معنے هدایت چھوڑ کر گمراهی اختیار کرنے کے هیں ۔

*تاج و محیط و راغب ۔　**تاج ۔

نوٹ۔ شَرٌ یَانٌ (ش کو زبر اور زیر سے) ایک درخت کو کہتے ہیں جس کی لکڑی سے کمان بناتے تھے۔ نیز جسم کی وہ رگ جو پھڑکتی اور حرکت کرتی رہتی ہے۔ اس کی جمع شَرَایِیْن ہے۔ شَرَیٰ کے معنے پھیلانا بھی ہیں*۔ ابن فارس نے اس کے بنیادی معنوں میں کسی چیز میں ہیجان پیدا ہو جانا اور اس کا بلند ہونا لکھا ہے۔ نیز شَرِیَ الْبَعِیْرُ فِی سَیْرِہٖ کے معنے ہیں اونٹ تیز چلا**۔

قرآن کریم میں ہے اِنَّ اللّٰہَ اشْتَرٰی مِنَ الْمُؤْمِنِیْنَ اَنْفُسَھُمْ وَاَمْوَالَھُمْ بِاَنَّ لَھُمُ الْجَنَّۃَ (۹/۱۱۱)۔ "بیشک اللہ نے مومنوں سے ان کی جان اور مال بعوض جنت خرید لئے ہیں"۔ یہ محض ذہنی عقیدہ نہیں بلکہ اسلامی نظام مملکت و معاشرت کی اصل و بنیاد ہے۔ اس میں، وہ نظام معاشرہ (مملکت) جو قوانین خداوندی کو عملاً نافذ کرنے کے لئے متشکل ہوتا ہے، افراد مملکت کے ساتھ ایک معاہدہ کرتا ہے۔ اس معاہدہ کی رو سے، افراد اپنی جان اور مال کو حکومتِ خداوندی کے ہاتھوں فروخت کر دیتے ہیں، اور وہ حکومت انہیں اس دنیا میں جنتی زندگی عطا کرنے کی ضمانت دیتی ہے۔ اور ظاہر ہے کہ جس قوم کی یہاں کی زندگی جنتی ہو جائے اسے آخرت میں بھی جنت مل جاتی ہے۔ (تفصیل ان امور کی میری کتاب "نظام ربوبیت" میں ملے گی)۔

ش ط أ

الشَّطْءُ۔ کھجور یا کھیتی کی سوئیاں۔ نئے پھوٹنے والے پودے۔ الشَّطْءُ مِنَ الشَّجَرِ۔ درخت کی جڑ کے آس پاس جو شاخیں پھوٹ نکلیں۔ شَطْاٗ الْوَادِیْ وَ النَّھْرِ۔ وادی یا نہر کا کنارہ۔ ساحل***۔

قرآن کریم میں ہے کَزَرْعٍ اَخْرَجَ شَطْئَہٗ (۴۸/۲۹)۔ کھیتی کی طرح جو اپنی سوئیاں نکالتی ہے۔ مِنْ شَاطِیئِ الْوَادِ الْاَیْمَنِ (۲۸/۳۰)۔ اس با برکت وادی کے ایک کنارے سے۔

ش ط ر

اَلشَّطْرُ۔ اُس حصہ کو کہتے ہیں جو کسی چیز سے الگ ہو جائے۔ پھر اس کے بعد کسی چیز کی ایک جانب کو کہنے لگ گئے خواہ وہ اس کے

* تاج و محیط و راغب ** ابن فارس۔ *** تاج و راغب نیز ابن فارس

ساتھ ہی ملی ہو*۔ اور اس طرح اس کے معنے کنارہ، طرف، سمت اور جانب، نیز کسی چیز کا بعض حصہ ہوگئے۔ الگ ہو جانے کی جہت سے اس میں دور ہوجانے کا مفہوم بھی پیدا ہو گیا۔ چنانچہ اَلشَّطِیْرُ کے معنے ہیں پردیسی، اجنبی۔ نیز دور، بعید۔ مَنْزِلٌ شَطِیْرٌ۔ دور کی منزل۔ اَلشَّاطِرُ۔ ڈاک کا تیز رفتار گھوڑا جو لمبی مسافت کو قلیل عرصہ میں طے کر لے**۔ جہت اور سمت کے لئے کہتے ہیں شَطَرَ شَطْرَہٗ۔ اس نے اس کی طرف جانے کا ارادہ کیا۔ ویسے اَلشَّطْرُ۔ کسی چیز کے آدھے حصے کو بھی کہتے ہیں**۔

قرآن کریم میں یہ لفظ سمت اور جہت کے معنوں میں آیا ہے۔ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ ($\frac{2}{144}$)۔ مسجد الحرام کی سمت۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ سمت کے لئے شَطْرٌ کا لفظ اس وقت بولتے ہیں جب اس میں دوری کا مفہوم بھی شامل ہو۔

ش ط ط

شَطَّ۔ یَشُطُّ۔ شَطًّا۔ دور ہو جانا۔ مقدار یا حد مقررہ سے تجاوز کر جانا۔ حق سے دور نکل جانا۔ بے انصافی کرنا۔ موخر الذکر معنوں میں اَشَطَّ بھی مستعمل ہے***۔ قرآن کریم میں ہے فَاحْکُمْ بَیْنَنَا بِالْحَقِّ وَلَا تُشْطِطْ ($\frac{38}{22}$)۔ ہمارے درمیان حق کے ساتھ فیصلہ کر اور نا انصافی نہ کر۔ یعنی حق سے دور نہ لے جا۔ سورۃ کہف میں ہے لَقَدْ قُلْنَا اِذًا شَطَطًا ($\frac{18}{14}$)۔ ہم ایسی بات کہینگے جو حق سے دور اور ہٹی ہوئی ہوگی۔ راغب نے شَطَطٌ کے معنے حد سے زیادہ دور کے لئے ہیں۔

الرمانی نے شطّ شَطَنَ اور بَعُدَ کو مرادف المعنی لکھا ہے****۔ لہذا اس میں دوری کا مفہوم ہوگا۔ ابن فارس نے اس کے بنیادی معنوں میں دوری اور میلان اور جھکاؤ دونوں لکھے ہیں۔ لہذا وَلَا تُشْطِطْ ($\frac{38}{22}$) کے معنی ہونگے، کسی ایک طرف مت جھک جاؤ۔

ش ط ن

شَطَنٌ مضبوط بٹی ہوئی لمبی رسی کو کہتے ہیں۔ بِئْرٌ شَطُوْنٌ۔ اس کنویں کو کہتے ہیں جس کی گہرائی بہت زیادہ ہو۔ لمبائی کی نسبت سے ہر اس شے کو جو بہت دور ہو، شَطِیْنٌ یا شَاطِنٌ کہتے ہیں۔ الرمانی نے شَطَّ۔ شَطَنَ اور بَعُدَ (دور ہونے) کو مرادف المعنی لکھا ہے****۔ ابن فارس نے بھی

*محیط۔ **تاج۔ ***تاج و محیط و راغب۔ ****الالفاظ المترادفة۔

اس کے بنیادی معنی دور ہونے کے لکھے ہیں ۔ شَطَنَ کے معنی ہیں وہ بہت دور چلا گیا ۔ شَطَنَ صَاحِبَہٗ کے معنی ہیں اس نے اپنے ساتھی کے رخ اور قصد کی مخالفت کی ، اس کی نیت کے خلاف اپنی نیت رکھی ۔ یہیں سے اس کے معنی مخالفت اور سرکشی کے لئے جاتے ہیں* ۔ اسی سے لفظ شَیْطَان بنا ہے ۔ جسکے معنی ہونگے (۱) خدا کی رحمتوں سے دور ۔ زندگی کی خوشگواریوں سے محروم اور (۲) سیدھی راہ چھوڑ کر غلط راستے پر چلنے والا ۔ سرکش ۔

شَیْطٰن ۔ ایک بدصورت سانپ کو بھی کہتے ہیں ۔ اور رُءُوْسُ الشَّیَاطِیْنِ ۔ ناگ پھنی تھوہر کو کہتے ہیں* ۔ (ابن فارس نے بھی اسکے یہی معنی لکھے ہیں) ۔

بعض کا خیال ہے کہ شَیْطَان در اصل شَاطَ ۔ یَشِیْطُ سے مشتق ہے ۔ شَیْط کے معنی ہیں جل جانا ۔ ہلاک ہو جانا ۔ شَاطَ الشَّیْءُ کے معنی ہیں وہ چیز جل گئی ۔ شَاطَ السَّمْنُ وَالزَّیْتُ ۔ گھی یا تیل اس قدر گرم ہوا کہ اس میں آگ سی لگنے لگی ۔ اس سے شَیْطَان کے معنی سرکش ، شعلہ صفت اور تخریبی نتائج پیدا کرنے والے کے ہونگے** ۔

قرآن کریم میں ہے اِنَّ الشَّیْطٰنَ کَانَ لِلرَّحْمٰنِ عَصِیًّا ($\frac{۱۹}{۴۴}$) ۔ شیطان احکام خداوندی سے سرکشی برتنے والا ہے ۔ سورۃ قصص میں ہے کہ جب حضرت موسیٰؑ نے غصہ میں آکر اس قبطی کے مُکّا مارا جس سے وہ مر گیا تو آپ نے کہا کہ ھٰذَا مِنْ عَمَلِ الشَّیْطٰنِ ($\frac{۲۸}{۱۵}$) ۔ یہ تو شیطانی کام ہو گیا ۔ اس سے ظاہر ہے کہ جذبات سے مغلوب ہو کر جو غلط کام کیا جائے اسے شَیْطَنَت سے تعبیر کیا جاتا ہے ۔ (نیز $\frac{۱۲}{۵}$) ۔ جو لوگ نظام خداوندی کی مخالفت کرتے تھے ان کے سرغنوں کو بھی شَیَاطِیْن کہا گیا ہے ۔ وَاِذَا خَلَوْا اِلٰی شَیٰطِیْنِہِمْ ($\frac{۲}{۱۴}$) ۔ کے یہی معنی ہیں کہ جب یہ لوگ اپنی پارٹی کے لیڈروں کے پاس جاتے ہیں ۔

ان وحشی اور سرکش قبائل کے لوگوں کو بھی جنہیں حضرت سلیمانؑ نے مطیع بنا کر کام میں لگا رکھا تھا شَیٰطِیْن کہا گیا ہے ($\frac{۲۱}{۸۲}$ و $\frac{۳۸}{۳۷}$) ۔ سانپ کے لئے یہ لفظ قصہ حضرت ایوبؑ میں آیا ہے ($\frac{۳۸}{۴۱}$) ۔ غریب القرآن (مرزا ابو الفضل) میں قاموس کے حوالہ سے لکھا ہے کہ شَیْطَان کے معنی پیاس کی شدت کے بھی ہیں ۔ اس لئے حضرت ایوبؑ کے قصے میں اَنِّیْ مَسَّنِیَ الشَّیْطَانُ ($\frac{۳۸}{۴۱}$) کے معنی سانپ کا چھو جانا اور پیاس کا غلبہ دونوں ہوسکتے ہیں

*تاج و لین ۔ **عبرانی زبان میں شیطان کے معنی رکاوٹیں پیدا کرنے والے کے ہیں ۔

نیز (۸/۱۱) میں رِجْزَ الشَّیْطَانِ کے معنے پیاس کی وجہ سے پیدا شدہ کوفت اور نقاہت بھی ہو سکتے ہیں۔ قرآن کریم میں شَجَرَۃُ الزَّقُّوْمِ کے متعلق کہا گیا ہے طَلْعُهَا كَاَنَّهُ رُءُوْسُ الشَّيٰطِيْنِ (۳۷/۶۵) یعنی اس میں سے جو پھوٹ کر نکلتا ہے وہ ایسا ہوتا ہے جیسے سانپوں کے سر (پھن) جس طرح ناگ پھنی تھوہر کے چوڑے چوڑے پتے ہوتے ہیں۔

کاہنوں اور نجومیوں کو بھی شَیَاطِیْنُ کہا گیا ہے (۳/۲ و ۶/۵)۔

قرآن کریم کی رو سے ہر وہ قوت جو قانون خداوندی سے سرکشی اختیار کرتی ہے شَیْطَانٌ ہے، خواہ وہ انسان کے اپنے بے باک اور سرکش جذبات ہوں اور خواہ نظام خداوندی کی مخالف جماعتیں اور ان کے سرغنے۔ سرکشی اور تخریب ان سب کی امتیازی خصوصیت ہے، اور صحیح نظام کے قیام میں رکاوٹیں پیدا کرنا ان کا کام۔ شیطان اور طاغوت ایک ہی ہیں۔ اور طاغوت ہر غیر خداوندی قوت کا نام ہے۔ (۴/۶۹ و ۲/۲۵۶)۔

[شَیْطَانٌ کے متعلق مزید بحث اِبْلِیْسُ کے عنوان (ب۔ ل۔ س) اور (ع۔ ب۔ د) میں دیکھئے]۔

ش ع ب

اَلشَّعْبُ۔ جمع کرنا اور متفرق کرنا۔ پھاڑنا اور شگاف ڈالنا۔ (اضداد میں سے ہے)۔ راغب نے لکھا ہے کہ اَلشَّعْبُ کے معنے جمع کرنے اور متفرق کرنے کے اس لئے آتے ہیں کہ الشَّعْبُ مِنَ الْوَادِیْ، وادی کی اس جگہ کو کہتے ہیں جہاں اس کا ایک کنارہ ملتا ہو لیکن دوسرا کنارہ اس سے جدا ہوتا ہو۔ جب تم اس مقام کو دیکھو جہاں سے اس کا ایک سرا جدا ہو رہا ہے تو ایسا معلوم ہو کہ جیسے ایک چیز کے ٹکڑے ہو رہے ہیں، اور جب اس سرے کو دیکھو جہاں دوسرا سرا اس سے ملتا ہے تو یوں نظر آئے جیسے دو سرے باہمدگر مل رہے ہیں۔ اس لئے اس کے معنے اکٹھا کرنے اور جدا کرنے، دونوں کے آتے ہیں*۔ ابن فارس نے بھی یہی کہا ہے۔ یعنی اس میں اجتماع کے ساتھ افتراق اور افتراق کے ساتھ اجتماع پایا جاتا ہے۔

اَلشَّعْبُ۔ بڑا قبیلہ۔ مختلف قبائل کا وہ جدِّ اعلیٰ جسکی طرف وہ سب منسوب ہوتے ہیں، اور وہ انہیں ملا دیتا ہے۔ (جمع شُعُوْبٌ ۴۹/۱۳)۔ قبیلہ، شَعْبٌ سے چھوٹا ہوتا ہے۔ شُعْبَۃٌ کے معنے ہیں شاخ، کسی چیز

*راغب۔

کا الگ ہوجانے والا ٹکڑا، دو سینگوں یا دو شاخوں کے درمیان کا حصہ ۔ اسکی جمع شُعَبٌ ہے (۷۷/۳۰)۔ نیز الشُّعْبَۃُ مِنَ الشَّجَرِ ۔ درخت کی مختلف پھیلی ہوئی شاخیں ۔ اَلشِّعْبُ ۔ پہاڑ کے درمیان راستہ ۔ دو پہاڑوں کے درمیان جو کھلی ہوئی جگہ ہو۔ شَعْبَانُ ۔ رمضان سے پہلا مہینہ ۔ اس مہینے میں عرب پانی کی تلاش اور لوٹ مار کے لئے منتشر ہو جاتے تھے* ۔ (متفرق ہو جانے کے معنوں میں) ۔

شُعَیْبٌ ۔ ایک نبی کا نام ہے جو قوم مدین کی طرف مبعوث ہوئے تھے۔ (بعض نے کہا ہے کہ یہ حضرت موسیٰؑ کے خسر تھے**) ۔ [مزید تفصیل ''شعیب'' کے عنوان میں ملے گی] ۔

قرآن کریم کی بنیادی تعلیم یہ ہے کہ تمام نوع انسان امت واحدہ ، ایک عالمگیر برادری ہے (۲/۲۱۳) لیکن باھمی تعارف کی غرض سے یہ مختلف شعوب و قبائل میں بٹ جاتی ہے ۔ ان شعوب و قبائل کی تقسیم سے مقصد محض تعارف ہے ، جس طرح ہم اپنے بیٹوں کے نام رکھ لیتے ہیں تاکہ ان کے تعارف میں آسانی رہے ۔ اس سے کسی قسم کی برتری یا تفوق مقصود نہیں ہوتا ۔ اس لئے دنیا کی کوئی نسل ، کوئی قبیلہ ، کوئی قوم دوسروں سے افضل نہیں ۔ تمام انسان پیدائش کے لحاظ سے یکساں واجب التکریم ہیں (۱۷/۷۰)۔ مدارج کا معیار اعمال ہیں ۔ اور جو سب سے زیادہ اچھے اعمال و کردار کا حامل ہو وہ سب سے زیادہ واجب الاحترام ہوجاتا ہے ۔ یہ مطلب ہے اس آیت کا جس میں کہا گیا ہے کہ وَجَعَلْنَاکُمْ شُعُوْبًا وَّ قَبَآئِلَ لِتَعَارَفُوْا ۔ اِنَّ اَکْرَمَکُمْ عِنْدَ اللّٰہِ اَتْقٰکُمْ (۴۹/۱۳)۔ جس طرح کسی شہر کو مختلف محلوں میں بانٹ دینے سے غرض محض تعارف کی آسانی ہوتی ہے اسی طرح انسانوں کی قبائلی تقسیم بغرض تعارف تھی ۔ اگر انسانی تمدن ایسی شکل اختیار کر لے جس میں تعارف کا مقصد قبائلی تقسیم کے بجائے کسی اور طرح حاصل ہوجائے تو پھر اس تفریق کا بغرض تعارف باقی رکھنا بھی ضروری نہیں رہے گا۔ باقی رہا معاشرہ میں مدارج کا تعین ، سو اس کا مدار شرفِ انسانیت ہے ۔

ش ع ر

شَعْرٌ، شَعَرٌ ۔ انسان کے جسم پر جو بال پیدا ہوتے ہیں انہیں کہتے ہیں ۔ (اونٹ کے بالوں کو وَبَرٌ اور بھیڑ کے بالوں کو صُوْفٌ کہتے ہیں ۔

*تاج ۔ **محیط ۔

یہ تینوں الفاظ ۱۶ ۸۰ میں آئے ہیں) ۔ اگرچہ زمخشری کے نزدیک شَعَرٌ کا لفظ انسان اور غیر انسان سب کے بالوں کے لئے استعمال ہو سکتا ہے* ۔

اَلشِّعْرُ اور اَلشَّعْرُ ۔ کسی چیز کو سمجھ لینا ، جان لینا ، تاڑ لینا ، معاملات کی باریکیوں کو جان لینا ، حواس کے ذریعہ کسی شے کا ادراک کر لینا۔ اس سے فعل شَعَرَ۔ یَشْعُرُ و شَعُرَ یَشْعُرُ آتے ہیں ۔ اس کے مصادر میں اَلشِّعْرُ والشَّعْرُ و الشُّعُوْرُ و اَلشِّعْرَیٰ بالخصوص قابل ذکر ہیں ۔ اَشْعَرَہٗ ۔ اسے بتایا ، معلوم کرایا ۔ بعض نے کسی شے کا حواس کے ذریعہ ادراک کرلینا ہی اس کے بنیادی معنے قرار دئے ہیں* ۔ (ذہنی فلسفہ اور تجریدی تصورات عربوں کے ہاں شعور نہیں کہلاتے تھے ۔ ان تصورات کو شعور سے تعبیر کرنا عجمی اصطلاح ہے جو یونانی طرز فکر سے پیدا ہوئی ہے) ۔ پھر اَلشِّعْرُ کا عام استعمال کلام منظوم پر ہونے لگا ۔ اس کی وجہ راغب نے یہ بتائی ہے کہ شاعری عربوں کی نازک خیالیوں ، پوشیدہ رازوں اور بذلہ سنجیوں کا مجموعہ ہے ۔ شَاعِرٌ کو شاعر اس لئے کہتے ہیں کہ وہ اپنی فطانت و ذہانت سے ان معانی کا ادراک کر لیتا ہے جن کا ادراک عام لوگ نہیں کر سکتے ۔ کبھی شِعْرٌ سے جھوٹ بھی مراد لیتے ہیں ۔ اور شَاعِرٌ جھوٹ بولنے والے کو کہتے ہیں۔ اور چونکہ بیشتر جھوٹ شاعری میں جگہ پاتا تھا اس لئے یہ مثل بن گئی تھی کہ اَحْسَنُ الشِّعْرِ اَکْذَبُہٗ ۔ یعنی سب سے عمدہ شاعری وہ ہے جو سب سے زیادہ جھوٹ اپنے اندر رکھتی ہو ۔ مخالفین رسول اللہؐ کو شاعر اور قرآن کریم کو شعر اسی مفہوم کے اعتبار سے کہتے تھے* ۔

شِعَارٌ ۔ جنگ میں جو الفاظ بطور علامت (Code Word) استعمال ہوتے ہیں ، یا سفر میں اپنے قافلہ کو پہچاننے کے لئے جو نشان مقرر کیا جاتا ہے، انہیں شِعَارٌ کہتے تھے ۔ اسی طرح حج میں لے جائے جانے والے جانور پر نشان لگانے کو اِشْعَارٌ کہتے تھے اور اس جانور کو شَعِیْرَۃٌ ۔ اس کی جمع شَعَائِرُ ہے ۔

شِعَارُ الْحَجِّ ۔ حج کے مناسک و علامت اور آثار و اعمال کو بھی کہتے ہیں ۔ نیز تمام وہ اعمالِ حج جو خدا کی اطاعت کا اظہار کرنے کے لئے ادا کئے جاتے ہیں ۔ ان اعمال و علامات کے مقام کو مَشْعَرٌ کہتے ہیں ۔ اس کی جمع مَشَاعِرُ ہے ۔ اس معنے میں شَعَائِرُ بھی آتا ہے* ۔

شِعْرَیٰ ۔ ایک ستارہ کا نام ہے جو سخت گرمی کے زمانے میں نکلتا ہے اور بہت روشن ہوتا ہے۔ قرآن کریم میں رَبُّ الشِّعْرَیٰ (۵۳ ۴۹) اسی کے لئے

*تاج ۔

آیا ہے - جاھلیت میں بعض عرب قبائل اس کی پرستش کیا کرتے تھے* - لیکن اگر شِعْرَیٰ کو شَعَرَ سے مصدر مانا جائے تو اس کے معنے عقل و شعور ھوں گے۔

قرآن کریم میں عقل ، شعور ، فکر ، تدبر ، تفقه ، وغیرہ الفاظ مختلف مقامات پر آئے ھیں - ھر مقام پر غور کرنے سے ان کا باریک اور لطیف فرق سمجھ میں آسکتا ھے - لیکن ایک قدر مشترک سب میں ھے - اور وہ یہ کہ جو لوگ عقل و شعور سے کام نہیں لیتے وہ انہیں حیوانات سے بدتر اور جہنم کا ایندھن قرار دیتا ھے -

قرآن کریم نے جہاں شاعری کی مخالفت کی ھے تو اس سے یہ مراد نہیں کہ قرآن کریم کی رو سے نثر میں بیان کردہ مفہوم قابل قبول ھے اور نظم میں بیان کردہ مذموم - قرآن ، اسلوب بیان سے بحث نہیں کرتا - مقصودِ بیان سے بحث کرتا ھے - شاعری سے اس کی مراد ، وہ جذبات پرستی ھے جو حقائق سے بحث نہیں کرتی - چنانچہ سورۃ یس میں جہاں اس نے کہا ھے کہ وَمَا عَلَّمْنٰهُ الشِّعْرَ وَمَا يَنْۢبَغِيْ لَهٗ (۳۶/۶۹) - ھم نے رسول؀ کو شعر کی تعلیم نہیں دی اور نہ ھی شاعری ایک پیغامبر انقلاب کے شایان شان ھوتی ھے '' تو اسکے ساتھ ھی یہ کہدیا کہ اِنْ هُوَ اِلَّا ذِكْرٌ وَّقُرْاٰنٌ مُّبِيْنٌ (۳۶/۶۹) - جو کچھ ھم نے رسول؀ کو دیا ھے وہ تاریخی شواھد اور زندگی کے بنیادی اصول اور واضح قوانین ھیں اور ان کا مقصد یہ ھے کہ لِيُنْذِرَ مَنْ كَانَ حَيًّا (۳۶/۷۰) - جن لوگوں میں زندہ رھنے کی صلاحیت ھے یہ انہیں اسکے ذریعہ زندگی کی غلط روش کے تباہ کن نتائج سے آگاہ کر دے۔ یعنے قرآن کریم ، تاریخی شواھد اور زندگی کے ٹھوس حقائق سے بحث کرتا ھے - اور شاعری اسکے خلاف محض جذبات سے کھیلتی ھے - چنانچہ اس نے شاعروں کے متعلق کہدیا کہ وہ ایک ایسے اونٹ کی طرح ، جسے جھوٹی پیاس (کی بیماری) ادھر سے اُدھر اور اُدھر سے ادھر لئے لئے پھر رھی ھو** ، جذبات کی وادیوں میں مارے مارے پھرتے ھیں اور انکی ساری عمر ان باتوں میں گزر جاتی ھے جنہیں وہ کرکے کبھی نہیں دکھاتے (۲۶/۲۲۵-۲۲۶) - یہ روش زندگی ایک رسول؀ (اور اسکے متبعین) کے شایان شان نہیں - (کولرج کے الفاظ میں ***) شاعری کی ضد (Antithesis) نثر نہیں بلکہ سائنس ھے - قرآن کریم چونکہ سائنٹفک حقائق سے بحث کرتا ھے اسلئے شاعری (جو ان حقائق کی نقیض ھے) اس کی بارگاہ میں قبول نہیں ھو سکتی -

*لسان العرب - ** دیکھو عنوان ھ - ی - م - *** Coleridge: Biographia Literaria

اس مقام پر اس حقیقت کو بھی سمجھ لینا چاہئیے کہ دیگر اقوام عالم (مثلاً اہل یونان وغیرہ) کیطرح ، عربوں کے ہاں بھی یہ عقیدہ تھا کہ (کاہنوں اور نجومیوں کی طرح) شاعروں کو بھی الہام ہوتا ہے ۔ جسطرح آج بھی انگریزی زبان میں جب (Poet) کہا جاتا ہے تو اس سے مراد (Inspired) ہوتے ہیں ۔ یعنی (Poet) وہی ہوتا ہے جسے (Inspiration) ہوتا ہو ۔ قرآن ، وحی اور انسانی ملکات میں نہایت شد و مد سے تمییز کرتا ہے تاکہ یہ حقیقت بالکل واضح ہو جائے کہ خدا کیطرف سے براہ راست علم اور انکشافِ حقیقت صرف وحی کے ذریعے ہو سکتا ہے جو ایک نبی کو ملتی تھی ۔ (اور سلسلۂ نبوت کے ختم ہو جانے کے بعد ، اب کسی کو نہیں مل سکتی) ۔ وہ نہ کشف والہام وغیرہ کی اصطلاحات کو تسلیم کرتا ہے اور نہ ہی انہیں خدا کی طرف سے براہ راست علم قرار دیتا ہے ۔ وہ کہتا ہے کہ یہ سب انسانی جذبات کی پیدا کردہ کرشمہ سازیاں یا نفسیاتی قوت کی افسوں طرازیاں ہیں جنہیں علم و حقیقت سے کوئی واسطہ نہیں ۔ یہ وجہ بھی ہے کہ وہ کہتا ہے کہ رسول شاعر نہیں ہوتا ، جسطرح وہ کاہن ، ساحر اور نجومی نہیں ہوتا ۔ ان کی طرف شیاطین (انسانی سرکش جذبات) " وحی " نازل کرتے ہیں ($\frac{26}{210}$) لیکن رسول کیطرف وحی خدا کیطرف سے ہوتی ہے جس میں اس کے اپنے جذبات و احساسات کی کوئی آمیزش نہیں ہوتی ($\frac{53}{3-4}$)۔ اصل یہ ہے کہ عربوں کے ہاں تصوف کی اصطلاح مروج نہیں تھی لیکن جن عناصر سے تصوف ترتیب پاتا ہے وہ انہیں اپنے ہاں کے شاعروں ، کاہنوں ، ساحروں وغیرہ میں موجود سمجھتے تھے ۔ قرآن کریم نے ان تمام کی تردید سے درحقیقت تصوف کے عناصر کی تردید کی ہے ۔ بالفاظ دیگر اگر عرب ، تصوف کی اصطلاح سے واقف ہوتے تو وہ یہ کہتا کہ تصوف ایک نبی کے شایان شان نہیں ۔ اسکی بجائے اس نے یہ کہا ہے کہ نبی شاعر اور ساحر اور کاہن نہیں ہوتا ۔ وہ خدا کی طرف سے براہ راست علم حاصل کرکے انسانی دنیا میں انقلاب عظیم برپا کر دیتا ہے ۔ تصوف یہ کچھ نہیں کر سکتا ۔

قرآن کریم میں منافقین کے متعلق کہا گیا ہے کہ يُخَادِعُوْنَ اللّٰهَ وَالَّذِيْنَ آمَنُوْا ۔ وَمَا يَخْدَعُوْنَ اِلَّآ اَنْفُسَهُمْ وَمَا يَشْعُرُوْنَ ($\frac{2}{9}$) ۔ "یہ لوگ اللہ اور جماعتِ مومنین کو دھوکا دیتے ہیں ۔ لیکن یہ دھوکا دراصل ان کی اپنی ذات (نفس) کو ہوتا ہے اور یہ اس کا شعور نہیں رکھتے" ۔ اس کے معنے یہ ہیں کہ یہ لوگ دوسروں کو دھوکا دینے کی تدابیر تو شعوری طور پر کرتے ہیں لیکن غیر شعوری طور پر خود اپنی ذات کو دھوکا دیتے ہیں ۔

غور کیجئے شعور اور غیر شعوری نفسیاتی کیفیات کا یہ لطیف فرق کس خوبصورتی سے بیان کیا گیا ہے۔

سورۃ مائدہ میں ہے لَا تُحِلُّوْا شَعَآئِرَ اللّٰهِ (۵/۲)۔ شعائر اللہ کی بے حرمتی مت کرو۔ اسلام ایک دین ہے جو مملکت کی شکل میں متمکن ہوتا ہے۔ ایک مملکت کے کچھ شعائر (یعنی علامات یا Symbols) ہوتے ہیں جن کی تعظیم کے معنی یہ ہیں کہ آپ اس مملکت کا احترام کرتے ہیں۔ مثلاً کسی سلطنت کا جھنڈا۔ جھنڈا ویسے تو کپڑے کے ایک ٹکڑے سے عبارت ہوتا ہے لیکن یہ نشانی ہوتا ہے اس مملکت کی۔ جھنڈے کے احترام کے معنی یہ ہیں کہ آپ اس مملکت کا احترام کرتے ہیں۔ انہی علامات کو شَعَآئِر کہا جاتا ہے۔ لہذا شَعَآئِرُ اللّٰهِ سے مراد، اس مملکت کی محسوس علامات ہونگے جو قوانین خداوندی (قرآنی نظام) کے نفاذ کے لئے دنیا میں قائم ہو۔ ان شعائر کا احترام درحقیقت ان قوانین کا احترام ہوگا۔ واضح رہے کہ ان شعائر کی پرستش نہیں کی جائیگی۔ صرف ان کا احترام کیا جائے گا۔ اور وہ بھی اس حقیقت کو مد نظر رکھتے ہوئے کہ یہ شعائر (علامات) فی ذاتہ کوئی حیثیت نہیں رکھتے ان کا احترام، قوانین خداوندی کے احترام کا محسوس طریق ہے۔ اور بس۔

ش ع ل

اَلشُّعْلَةُ۔ آگ کی لپک۔ لکڑی یا ایندھن جس میں آگ مشتعل ہو۔ اَلشَّعِيْلَةُ۔ جلتی ہوئی بتی۔ اَلْمَشْعَلُ۔ قندیل۔ شَعَلَ النَّارَ فِی الْحَطَبِ۔ اسنے لکڑیوں میں آگ بھڑکا دی۔ اِشْتَعَلَتِ النَّارُ۔ آگ لگ گئی اور بھڑکی *۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی ہیں کسی چیز کے کناروں کا منتشر (بکھرا ہوا) ہو جانا۔ آگ کے بھڑکنے میں بھی کیفیت ہوتی ہے۔

اِشْتَعَلَ الرَّاْسُ شَيْبًا۔ سر میں سفید بالوں کا بکثرت پھیل جانا اور اسطرح سرکا سفیدی سے بھڑک اٹھنا **۔ یا سر میں سفید بالوں کا نمودار ہوجانا۔ سورۃ مریم میں حضرت زکریاؑ کے متعلق بھی الفاظ آئے ہیں (۱۹/۴)۔

شعیب علیہ السلام

حضرت ابراہیمؑ کے ہاں (ان کی تیسری بیوی—قطورا۔ سے) جو اولاد پیدا ہوئی ان میں ایک بیٹے کا نام مدین تھا۔ یہ حجاز کے شمال میں شام سے

* تاج و راغب ** محیط۔

متصل علاقہ میں، سکونت پذیر ہؤا اور اس کی نسل، تاریخ کے اوراق میں قومِ مدین کے نام سے متعارف ہوئی۔ ان کا زمانہ قریب ۲۰۰۰ ق-م سمجھنا چاہئے۔ یہ قوم یہیں بڑھی پھولی۔ قریب چار سو سال تک ان کی یہی حالت رہی۔ تاآنکہ ان میں حضرت شعیب ؑ کی بعثت ہوئی۔ جب حضرت موسیٰ ؑ مصر سے بھاگ کر نکلے ہیں، تو مدین کی بستی کی طرف ہی آئے تھے۔ قرآن کریم میں ہے کہ یہاں انہوں نے ایک مردِ بزرگ کے ہاں رہائش اختیار کرلی اور گلہ بانی کی خدمت سنبھال لی۔ اس مردِ بزرگ نے اپنی بیٹی کا عقد حضرت موسیٰ ؑ سے کردیا۔ (دیکھئے (۲۰/۴۰ و ۲۸/۲۲-۲۸) قرآن کریم نے یہ نہیں بتایا کہ یہ مرد بزرگ کون تھے۔ لیکن بعض محققین کا خیال ہے کہ آپ حضرت شعیب ؑ تھے۔ تورات میں ان کا نام کہیں راعوایل۔ کہیں یثرو اور کہیں حوباب لکھا ہے۔ مورخین کا خیال ہے کہ آپ کا نام حوباب ہی تھا (تورات۔ کتاب گنتی ۱۰/۲۹)۔ اور باقی نام ان کے القاب تھے۔ اور یہی حوباب قرآن کریم میں شعیب ؑ کے نام سے موسوم ہیں۔ اس اعتبار سے حضرت شعیب ؑ اور حضرت موسیٰ ؑ کا زمانہ ایک ہی ہے۔ یعنی قریب ۱۷۰۰/۱۶۰۰ ق-م۔

تورات میں مذکور ہے کہ مدین کا ایک اور بھائی تھا جس کا نام یقشان تھا۔ اس کا بیٹا دوان اپنے چچا مدین کے قریب ہی آباد ہوگیا۔ یہ علاقہ بہت سرسبز و شاداب اور گھنے جنگلوں سے ڈھکا ہؤا تھا۔ قرآن کریم میں ہے کہ حضرت شعیب ؑ قوم مدین کی طرف (۲۹/۳۶) اور اصحاب الایکہ کی طرف (۲۶/۱۷۶ ، ۷۸) مبعوث ہوئے تھے۔ ارباب تحقیق کا خیال ہے کہ اصحاب الایکہ، بنو دوان ہی تھے۔ قرآن کریم نے قومِ مدین اور اصحاب الایکہ کا ذکر اس انداز سے کیا ہے گویا یہ ایک ہی قبیلہ کے لوگ تھے۔

حضرت شعیب ؑ نے انہیں جو تلقین کی اُس سے پتہ چلتا ہے کہ ان میں کس کس قسم کے جرائم پیدا ہوچکے تھے۔ آپ نے ان سے کہا۔ یٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰہَ مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَيْرُهٗ (۷/۸۵)۔ اے میری قوم! اللہ کی محکومی اختیار کرو۔ اس کے سوا تمہارا کوئی اور الٰہ نہیں۔ ... فَاَوْفُوا الْكَيْلَ وَالْمِيْزَانَ وَلَا تَبْخَسُوا النَّاسَ اَشْيَآءَهُمْ وَلَا تُفْسِدُوْا فِي الْاَرْضِ بَعْدَ اِصْلَاحِهَا .... (۷/۸۵)۔ تمہیں چاہئے کہ ماپ تول پورا پورا کرو۔ لوگوں کو ان کی چیزیں کم نہ دو۔ ملک کی اصلاح کے بعد اس میں فساد مت پیدا کرو۔

اس سے واضح ہے کہ اس قوم میں سخت معاشی ناہمواریاں پیدا ہوچکی تھیں جنہیں دور کرنے کے لئے حضرت شعیب ؑ مبعوث ہوئے تھے۔ آپ نے ان

تک اپنی دعوت پہنچائی اور (حسب معمول) قوم کے سرمایہ دار طبقہ (سردارانِ قوم) نے آپ کی سخت مخالفت کی اور دھمکی دی کہ آپ اور آپ کے ساتھی انہی کا مسلک اختیار کرلیں ورنہ وہ ان سب کو بستی سے نکال دینگے (۷/۸۸)۔

سورۃ ہود میں اسی قوم کی طرف سے ایک ایسا اعتراض کیا گیا ہے۔ جو اسلام کی ایک عظیم حقیقت کو اپنے آغوش میں لئے ہے۔ انہوں نے کہا یٰشُعَیْبُ۔ اَصَلٰوتُکَ تَاْمُرُکَ اَنْ نَتْرُکَ مَا یَعْبُدُ اٰبَآؤُنَا اَوْ اَنْ نَفْعَلَ فِیْ اَمْوَالِنَا مَا نَشٰٓؤُا ..... (۱۱/۸۷)۔ "اے شعیب! کیا تیری صلٰوۃ تجھے یہ حکم دیتی ہے کہ (ہمیں کہے کہ) ہم ان معبودوں کو چھوڑ دیں جنہیں ہمارے آباء و اجداد پوجتے رہے ہیں۔ یا ہم اپنے مال و دولت میں جس قسم کا تصرف کرنا چاہیں نہ کریں؟

اس سے ظاہر ہے کہ اسلام میں صلٰوۃ اور معاشیات کا تعلق کس قدر گہرا ہے۔ صلٰوۃ سے مقصود ہے قوانین خداوندی کا اتباع۔ اور قوانین خداوندی معاشیات کو بھی اپنے دائرے کے اندر رکھتے ہیں۔ اس لئے صلٰوۃ اور معاشیات کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔

قوم نے اپنی حالت میں اصلاح نہ کی اور ضد اور سرکشی میں آگے بڑھتی گئی، تاآنکہ وہ تباہ و برباد ہوگئی۔ سورۃ اعراف میں ہے فَاَخَذَتْھُمُ الرَّجْفَۃُ (۷/۹۱)۔ "انہیں لرزا دینے والی ہولناکی نے آ لیا"۔ سورۃ ہود میں اَلصَّیْحَۃُ کا لفظ آیا ہے (۱۱/۹۴)۔ اس کے معنے بھی سخت آواز کے ہیں۔ سورۃ شعراء میں اسے یَوْمِ الظُّلَّۃِ (۲۶/۱۸۹) کہا گیا ہے۔ "یعنی سائے والا دن"۔ معلوم ہوتا ہے کہ سخت آواز کے ساتھ زلزلہ آیا جس سے آتش فشاں پہاڑوں سے دھوئیں کے بادل نکلے۔ اور اس طرح یہ قوم تباہ ہوگئی۔

(طبعی حوادث اور عذاب خداوندی کا باہمی تعلق کیا ہے۔ اس کے لئے میری کتاب "جوئے نور" میں حضرت نوحؑ کا عنوان دیکھئے)۔

ش غ ف

اَلشَّغَافُ۔ دل کے غلاف یا پردہ کو کہتے ہیں۔ نیز دل کا اندرونی حصہ۔ سویدائے قلب۔ شَغَفَہٗ۔ اُس کے غلافِ دل تک پہنچ گیا۔ شَغَفَہُ الْحُبُّ۔ محبت اس کے غلاف دل تک پہنچ گئی۔ محبت نے اس کے غلافِ دل کو شق کر دیا (بیضاوی) اور اندر داخل ہو گئی*۔ اس لئے انتہائے محبت کو اَلشَّغَفُ کہتے ہیں**۔

*تاج۔ **محیط۔

سورۃ یوسف میں ہے قَدْ شَغَفَهَا حُبًّا (۱۲/۳۰) - "محبت کی وجہ سے یوسف اس کے دل کے اندر اتر گیا"۔ یعنی یوسف کی محبت اس کے دل کی گہرائیوں تک اتر گئی۔

ش غ ل

اَلشُّغْلُ - اَلشُّغُلُ - اَلشَّغْلُ - اَلشَّغَلُ - مشغلہ، مصروفیت، ایسا کام جس میں مصروف ہو کر انسان دیگر امور پر توجہ نہ دے سکے۔ اِشْتَغَلَ فِيْهِ السَّمُّ - زہر اس میں سرایت کر گیا۔ مَالٌ مَشْغُوْلٌ - وہ مال جو تجارت میں لگا ہوا ہو*۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ یہ مادہ فَرَاغٌ (یعنی خالی ہونا) کی ضد ہے۔

قرآن کریم میں ہے شَغَلَتْنَا اَمْوَالُنَا (۴۸/۱۱) - ہمارے اموال نے ہمیں اس طرح اپنے آپ میں جذب کر رکھا ہے کہ ہمیں کسی دوسری طرف توجہ دینے کی فرصت ہی نہیں۔

سورۃ یٰسٓ میں اہل جنت کے متعلق ہے فِیْ شُغُلٍ فٰکِهُوْنَ (۳۶/۵۵)۔ وہ (ہر وقت) کسی نہ کسی کام میں مصروف رہینگے اور وہ مصروفیت ان کے لئے کیف آور اور نشاط بخش ہوگی جس میں وہ بطیب خاطر مشغول ہونگے۔

ش ف ع

شَفْعٌ - اس لفظ کے بنیادی معنے ہیں کسی چیز کو کسی دوسری چیز کے ساتھ ملا دینا۔ دو چیزوں کو ایک دوسرے کے ساتھ متصل کر دینا اور اس طرح ایک کو دوسرے کا (زَوْجٌ) جوڑا بنا دینا**۔ وَتْرٌ کے معنے ہیں اکیلا رہنا (طاق ہونا) اور شَفْعٌ کے معنے ہیں زَوْجٌ (جفت) ہونا***۔ راغب نے کہا ہے کہ شَفْعٌ کے معنے کسی چیز کو اُس جیسی دوسری چیز کے ساتھ ملا دینے اور ضم کر دینے کے ہیں۔ اور شَفَاعَةٌ کے معنے دوسرے کے ساتھ اس کی مدد کرنے ہوئے یا اس کی خبر گیری کرتے ہوئے مل جانے کے ہیں***۔ شُفْعَةٌ کے معنے ہوتے ہیں کوشش کر کے مطلوبہ شے کو اپنی چیزوں میں ملا لینا اور اس طرح اپنی چیز کو بڑھا لینا***۔ فقہ کی اصطلاح میں یہ ایک خاص حق ملکیت ہوتا ہے جس کو رکھنے والا وہ قیمت دے کر جائداد کا مالک بنا دیا جاتا ہے جو قیمت دوسرے لوگ اس جائداد کی لگائیں**۔ عَیْنٌ شَافِعَةٌ۔

*تاج و محیط و راغب۔ **محیط۔ ***تاج۔

وہ آنکھ جو کمزوری کی وجہ سے ایک چیز کو دو دیکھے ۔ نَاقَۃٌ شَافِعٌ ۔ وہ اونٹنی جس کا ایک بچہ اس کے پیچھے لگا ہو ۔ اور دوسرا پیٹ میں ہو ۔ نَاقَۃٌ شَفُوْعٌ ۔ وہ اونٹنی جو ایک مرتبہ دودھ دوھنے میں دونوں وقت کا دودھ اکٹھا دے دے* ۔ اَلشَّفَائِعُ ۔ مختلف قسم کے گھاس جو دو دو ہو کر اکٹھے اُگیں* ۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اَلشَّاۃُ الشَّافِعُ اس بکری کو کہتے ہیں جس کے ساتھ اس کا بچہ بھی ہو ۔

ان مثالوں سے واضح ہے کہ شَفْعٌ کے بنیادی معنی ہیں کسی چیز کا کسی دوسری چیز کے ساتھ مل جانا اور اس طرح ایک سے دو ہو جانا ۔ اس کے بعد شَفَاعَۃٌ کے معنے سفارش اس لئے ہو گئے کہ اس میں ایک شخص کسی دوسرے شخص کی معاونت کے لئے اس کے ساتھ کھڑا ہو جاتا ہے اور اس کے حق میں سفارش کرتا ہے* ۔ نیز اس کے معنے دعا کرنے کے بھی آتے ہیں* ۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ شَفَعَ فُلَانٌ لِفُلَانٍ ۔ اس وقت کہتے ہیں جب کوئی آدمی کسی کے ساتھ اس کا مددگار بن کر آئے اور جو کچھ وہ چاہتا ہے اس کے حصول کا طلبگار ہو ۔

قرآن کریم انفرادی زندگی کے بجائے اجتماعی زندگی سکھاتا ہے کیونکہ فرد کی صلاحیتوں کی نشوونما اور اس کی ذات کی بالیدگی اجتماعی نظام ہی میں ممکن ہے ۔ اس اعتبار سے جماعتِ مومنین کا ہر فرد دوسرے کا شَفِیْعٌ ہوتا ہے ۔ یعنے اس کی معاونت کے لئے ہر وقت اس کے ساتھ ۔ اور اس نظام کا مرکز (امیر) ہر ایک کا شَفِیْعٌ ۔ وہ افرادِ کارواں میں سے کسی کو محسوس ہی نہیں ہونے دیتا کہ وہ تنہا ہے ۔ یہی باہمگی (شفاعت) اس کی بنیادی خصوصیت ہے ۔

اس جماعت کی یہ شَفَاعَۃٌ (معاونت) اپنے حلقہ سے باہر بھی جاتی ہے ۔ اس لئے کہ ان کا فریضہ تمام نوعِ انسانی کی ربوبیت ہوتا ہے ۔ اسکےلئے ان سے کہا گیا ہے کہ یہ بِرٌّ و تَقْوٰی (کشادگی اور قوانین خداوندی کے مطابق) کاموں میں دوسروں سے تعاون کریں لیکن ان کے برعکس اِثم وعدْوَان میں تعاون نہ کریں (۵/۲) ۔ اسی کو دوسرے الفاظ میں یوں کہا گیا کہ مَنْ یَّشْفَعْ شَفَاعَۃً حَسَنَۃً یَّکُنْ لَّہٗ نَصِیْبٌ مِّنْھَا وَمَنْ یَّشْفَعْ شَفَاعَۃً سَیِّئَۃً یَّکُنْ لَّہٗ کِفْلٌ مِّنْھَا (۴/۸۵) ۔ جو شخص حسن کارانہ انداز میں (اچھے کام میں) کسی دوسرے کے ساتھ مدد کیلئے اٹھ کھڑا ہوتا ہے اسے اس میں سے حصہ مل جاتا ہے ۔ اور جو شخص تخریبی انداز سے (برے کام میں) کسی کا ساتھ دیتا ہے تو اس کو بھی

*تاج ۔

اس میں سے حصہ مل جاتا ہے۔ واضح رہے کہ تعاون میں ایک دوسرے کی مدد کرنا مقصود ہوتا ہے لیکن شفاعت میں ایک شخص، دوسرے شخص کی مدد کے لئے اس کے ساتھ ہو جاتا ہے۔

اب اس سے آگے بڑھئے۔ ہمارے ہاں مروجہ عقیدہ یہ ہے کہ جب قیامت میں حساب کتاب ہوگا اور مجرمین کو دوزخ کی سزا کا حکم ہو جائیگا تو خدا کے مقرب بندے، بالخصوص حضرات انبیاء کرام[ع] (اور ان میں سے بھی خصوصیت کے ساتھ نبی اکرم[ص]) خدا کے حضور ان مجرمین کی سفارش کرینگے اور ان کی سفارش پر اللہ تعالےٰ انہیں بخش دیگا۔ اور وہ جنت میں چلے جائینگے۔ اسے شفاعت کہتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ شفاعت کا یہ عقیدہ دین کی ساری عمارت منہدم کر دیتا ہے جسکی بنیاد قانون مکافات عمل پر ہے۔ مَنْ يَعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَيْرًا يَرَهُ ۔ وَمَنْ يَعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ شَرًّا يَرَهُ (۹۹/۷-۸)۔ ہر عمل کا ذرہ ذرہ نتیجہ خیز ہوتا ہے اور سامنے آجاتا ہے۔ نظر آتا ہے کہ شفاعت کا یہ عقیدہ ہمارے دور ملوکیت کی پیداوار ہے جب مستبد حکمرانوں کے مقربین ان کے پاس لوگوں کی سفارش کیا کرتے تھے اور انکی سفارش پر مجرمین کو معافی مل جایا کرتی تھی۔ اسکے ساتھ ہی اس عقیدہ کو عیسائیوں کے کفارہ کے عقیدہ نے بھی تقویت دی۔ وہ جب کہتے ہونگے کہ ہمارے رسول (حضرت عیسیٰ[ع]) کو دیکھو کہ جو شخص ان پر ایمان لے آتا ہے وہ اسکے گناہوں کا کفارہ دیکر اسے جہنم سے بچا لیتے ہیں۔ اس کے برعکس تمہارا رسول[ص] گنہگاروں کے لئے کچھ بھی نہیں کر سکتا۔ تو اس اعتراض کے پیش نظر اس قسم کی روایات وجود میں آگئیں کہ قیامت میں جب حساب کتاب ہو چکے گا اور مجرمین دوزخ میں بھیجدئے جائینگے تو نبی اکرم[ص] سجدے میں گر جائینگے اور جب تک اللہ تعالےٰ آپ کی امت کے تمام افراد کو دوزخ سے نکال کر جنت میں نہیں بھیجدیگا حضور[ص] نہ سجدے سے سر اٹھائیں گے نہ خود جنت میں جائینگے۔ اس سے عیسائیوں کے اعتراض کا تو جواب وضع کر لیا گیا لیکن دین کی ساری عمارت بنیاد سے ہل گئی اور قوم تباہیوں کے جہنم میں جا گری۔ قرآن کریم سے اس قسم کی شفاعت کی کوئی سند نہیں ملتی (نہ ہی اس میں اس قسم کے عقیدہ کی گنجائش ہو سکتی تھی)۔ اس میں صاف الفاظ میں کہا گیا ہے کہ قانون مکافات کی رو سے لَا تَجْزِي نَفْسٌ عَنْ نَفْسٍ شَيْئًا وَلَا يُقْبَلُ مِنْهَا شَفَاعَةٌ وَلَا يُؤْخَذُ مِنْهَا عَدْلٌ وَلَا هُمْ يُنْصَرُونَ (۲/۴۸)۔ کوئی شخص کسی دوسرے شخص کے کسی کام نہیں آسکے گا۔ نہ ہی کسی کی شفاعت (سفارش) قبول کی جا

سکے گی نہ ھی کسی سے اسکے گناھوں کا معاوضہ لے کر اسے چھوڑ دیا جائے گا۔ اور نہ ھی مجرمین کی کوئی مدد کرسکیگا۔

شفاعت کے عقیدہ کی تائید میں قرآن کریم کی اس قسم کی آیات پیش کر دی جاتی ھیں جن میں (مثلاً) آیا ھے مَنْ ذَا الَّذِي يَشْفَعُ عِنْدَهُ إِلَّا بِإِذْنِهِ (۲/۲۵۵) ۔ ''وہ کون ھے جو اسکے پاس اسکے اذن کے بغیر شفاعت کرے''۔ اس سے یہ نتیجہ اخذ کیا جاتا ھے کہ خدا کی اجازت سے شفاعت کی جا سکتی ھے اور حضورؐ اپنی امت کی شفاعت خدا کی اجازت ھی سے کرینگے ۔

لیکن ان آیات سے اس قسم کا نتیجہ نکالنا غلط ھے ۔ سب سے پہلے تو اسلئے کہ اس قسم کی شفاعت کا عقیدہ قانون مکافات کے یکسر خلاف ھے جو قرآن کریم میں شروع سے آخر تک مسلسل بیان ہو رہا ھے ۔ لہذا اگر قانونِ مکافات کے ساتھ شفاعت کا عقیدہ بھی اسی قرآن کریم میں موجود ھو تو اسکے یہ معنے ھوں گے کہ قرآن کریم میں (معاذ اللہ) متضاد عقائد دئے گئے ھیں ۔ مثلاً اسی آیت کو دیکھئے جسے اوپر درج کیا گیا ھے ۔ اس سے پہلی آیت یہ ھے ''اے ایمان والو! جو کچھ تمہیں اللہ نے دیا ھے اسے (ربوبیت عامہ کیلئے) کھلا رکھو قبل اس کے کہ وہ وقت آجائے لَا بَيْعٌ فِيهِ وَلَا خُلَّةٌ وَلَا شَفَاعَةٌ (۲/۲۵۴) ۔ جسمیں نہ گناھوں کی قیمت ادا کرکے جنت خریدی جاسکے گی ۔ نہ کسی بزرگ کی دوستی کسی کے کام آئیگی ۔ اور نہ ھی کسی کی شفاعت ۔ اسکے بعد اگلی آیت میں ھے مَنْ ذَا الَّذِي يَشْفَعُ عِنْدَهُ إِلَّا بِإِذْنِهِ (۲/۲۵۵) ۔ اس کا مطلب اگر یہ لیا جائے کہ خدا کی اجازت سے سفارش کی جا سکے گی اور یہ سفارش قبول بھی ھو جائیگی تو ان دونوں آیات میں کھلا ہوا تضاد پایا جائیگا۔

اب سوال یہ ھے کہ اس (دوسری) آیت کا صحیح مطلب کیا ھے؟ قانون مکافات کی رو سے انسان کے ہر عمل کا نتیجہ ساتھ کے ساتھ مرتب ہوتا رہتا ھے ۔ لیکن قرآن کریم نے جزا و سزا کی مجرد حقیقت کو سمجھانے کیلئے تشبیھاً ایسا نقشہ کھینچا ھے جیسے ملزموں کی عدالت میں پیشی ھوتی ھے اور مقدمہ کی سماعت کے بعد حکم سنایا جاتا ھے ۔ مقدمہ میں حاکم کے علاوہ، ملزم ھوتا ھے ۔ مستغیث ہوتا ھے ۔ گواہ ھوتے ھیں ۔ پولیس کے سپاھی ھوتے ھیں ۔ وغیرہ وغیرہ ۔ قرآن کریم نے اسی قسم کے استعاروں میں حقیقت کو بیان کیا ھے ۔ مثلاً ایک جگہ ھے کہ جس شخص کا احتساب ھو رہا ہوگا وہ عدالت کے کٹھرے میں اکیلا کھڑا ہوگا ۔ وَلَقَدْ جِئْتُمُونَا فُرَادَىٰ ..... وَمَا نَرَىٰ مَعَكُمْ شُفَعَاءَكُمْ ... (۶/۹۵) ۔ تم ھمارے حضور تنہا پیش ھوگے .... تمہارے ساتھ

کھڑا ہونے والا کوئی نہیں ہوگا - اور ''پولیس کا سپاہی،، تمہیں پیچھے سے ہانکتا ہوا ہمارے سامنے لائیگا - وَجَاءَتْ كُلُّ نَفْسٍ مَّعَهَا سَائِقٌ . . . . . (۵۰/۲۱) - '' ہر شخص کے ساتھ ایک پیچھے سے ہانکنے والا ہوگا '' - اس کے علاوہ گواہ بھی ہونگے . . . . وَشَهِيدٌ (۵۰/۲۱) - یہ گواہ خود بخود اس شخص کے ساتھ کھڑے نہیں ہوجائیں گے - ان میں سے جسے بلایا جائے گا وہ آجائیگا اور اسے گواہی دینے کی اجازت دی جائیگی - یہ ہیں وہ شَفِيعٌ (ساتھ کھڑے ہونے والے) جن کا ذکر قرآن کریم کی اس قسم کی آیات میں آیا ہے جن میں کہا گیا ہے کہ مَنْ ذَا الَّذِي يَشْفَعُ عِنْدَهُ إِلَّا بِإِذْنِهِ (۲/۲۵۵)- ''وہ کون ہے جو خدا کی اجازت کے بغیر اس کے حضور کسی کے ساتھ کھڑا ہوسکے ،، یہ گواہ رسول بھی ہونگے جن کے متعلق قرآن کریم نے کہا ہے يَوْمَ يَجْمَعُ اللّٰهُ الرُّسُلَ فَيَقُولُ مَاذَا أُجِبْتُمْ (۵/۱۰۹) - جس دن اللہ رسولوں کو جمع کریگا اور ان سے پوچھے گا کہ تمہاری دعوت کا جواب کس طرح دیا گیا تھا؟ اور رسولوں کے علاوہ (ملائکہ) کائناتی قوتیں بھی اس طرح بلائی جائیں گی - يَوْمَ يَقُومُ الرُّوحُ وَالْمَلٰئِكَةُ صَفًّا لَّا يَتَكَلَّمُونَ إِلَّا مَنْ أَذِنَ لَهُ الرَّحْمٰنُ وَقَالَ صَوَابًا (۷۸/۳۸) - جس دن ''اَلرُّوحُ اور ملائکہ ،، صف باندھے کھڑے ہونگے اور کوئی بات نہ کرسکینگے سوائے اس کے جسے رحمان اجازت دے اور وہ درست بات کہے ،، - لہٰذا ان آیات میں شفاعت کے معنی شہادت کے ہیں - اس لئے کہ کسی کے حق میں سچی شہادت دیدینا بھی اس کی بہت بڑی مدد ہوتی ہے - اسکی وضاحت خود قرآن نے کردی ہے جہاں فرمایا وَلَا يَمْلِكُ الَّذِينَ يَدْعُونَ مِنْ دُونِهِ الشَّفَاعَةَ إِلَّا مَنْ شَهِدَ بِالْحَقِّ . . . . . . (۴۳/۸۶) - جنہیں یہ لوگ خدا کے سوا پکارتے ہیں وہ شفاعت کا کوئی اختیار نہیں رکھتے - اس کا اختیار وہ رکھتا ہے جو حق کے ساتھ شہادت دیتا ہے - یعنی شفاعت کے معنی شہادت ہیں - اسی التباس کے رفع کرنے کے لئے قرآن کریم نے رسول اللہ کو شَهِيدٌ کہا ہے - (۱۶/۸۹) - شَفِيعٌ کہیں نہیں کہا - اور دوسرے مذاہب کے لوگ جو شفاعت کا عقیدہ رکھتے ہیں ان کے متعلق متعدد مقامات پر کہہ دیا کہ فَمَا تَنْفَعُهُمْ شَفَاعَةُ الشَّافِعِينَ (۷۴/۴۸) - انہیں ان کے سفارشیوں کی سفارش کچھ کام نہیں دے سکتی - اس لئے کہ خدا کا قانون یہ ہے کہ لَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِزْرَ أُخْرٰى (۶/۱۶۵) - کوئی شخص کسی دوسرے کا بوجھ نہیں اٹھا سکتا - جنت فقط اعمال کے بدلے ملتی ہے - تِلْكُمُ الْجَنَّةُ أُورِثْتُمُوهَا بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُونَ (۴۳/۷۲) سفارشوں سے جنت حاصل کرنے کا عقیدہ اس قوم میں پیدا ہوتا ہے جو قوتِ عمل سے محروم

ہو جاتی ہے ۔ قرآن کریم نے بتایا ہے کہ اس قسم کا عقیدہ یہودیوں میں اس زمانے میں پیدا ہوا تھا جب وہ اپنی پستیوں کی انتہا تک پہنچ چکے تھے ۔ وہ کہتے تھے کہ ہم بجز چند دنوں کے کبھی جہنم میں نہیں رہینگے (٢/٨٠) ۔ اس پر قرآن کریم نے کہا کہ ان سے پوچھو کہ کیا تم نے اللہ سے اس قسم کا کوئی عہد لے رکھا ہے؟ اور پھر خود ہی کہہ دیا کہ ان سے کہدو کہ یہ سب عقائد غلط ہیں ۔ خدا کا قانون یہ ہے کہ جو بھی غلط روش اختیار کریگا وہ تباہ و برباد ہوگا ۔ اور جو ایمان کے ساتھ عمل صالح کرے گا وہ جنت کا وارث ہوگا ۔ (٢/٨١-٨٢) ۔

ان تصریحات سے ظاہر ہے کہ

(١) اس دنیا میں شفاعت کے معنے ہونگے کسی کام میں کسی کی مدد کے لئے اس کے ساتھ ہوجانا ۔ اگر وہ کام اچھا ہے تو اس ساتھ ہونے والے کو بھی اس کا اچھا اجر ملے گا ۔ اگر وہ کام برا ہے تو یہ بھی مجرم کے ساتھ سزا کا کچھ حصہ پائیگا۔

(٢) آخرت میں شفاعت کا تصور اس قسم کا ہے جیسے کوئی گواہ کسی کے حق میں سچی شہادت دینے کے لئے کھڑا ہو جائے ۔ یہ تمثیلی بیان ہے ۔

(٣) مجرموں کا کسی کی سفارش سے چھوٹ جانا ، یا کسی کی سفارش سے کسی کو وہ کچھ مل جانا جس کا وہ حق دار نہیں ، قرآن کریم کی بنیادی تعلیم کے خلاف ہے، اس لئے شفاعت کا یہ مفہوم صحیح نہیں ۔ قرآن کریم میں جہاں جہاں یہ لفظ آئے ، سیاق و سباق سے دیکھ لینا چاہئے کہ وہاں کونسا مفہوم متصور ہے ۔

سورۃ الفجر میں ہے وَالشَّفْعِ وَالْوَتْرِ (٨٩/٣) ۔ اس کے معنے ہیں وہ ستارے جو ملکر رہتے یا چلتے ہیں اور وہ جو الگ الگ رہتے یا چلتے ہیں ۔ یعنی اکٹھے نظر آنے والے اور الگ الگ دکھائی دینے والے ستارے۔

ش ف ق

اَلشَّفَقُ ۔ وہ سرخی جو غروب آفتاب سے شروع ہوکر کچھ دیر بعد تک رہتی ہے ۔ راغب نے لکھا ہے کہ شَفَقٌ* ، غروب آفتاب کے وقت ، دن کی روشنی کے رات کی تاریکی میں ملنے کو کہتے ہیں ۔ نیز کنارہ کو بھی شَفَقٌ* کہتے ہیں* ۔ قرآن کریم میں ہے فَلَاۤ اُقْسِمُ بِالشَّفَقِ (٨٤/١٦) ۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی کسی چیز میں رقت (کمزوری) کے ہونے ہیں ۔

*تاج ۔

اَلشَّفَقُ ۔ اَلشَّفَقَةُ ۔ کسی کے ساتھ بہت زیادہ خیر خواہی کی بناء پر اس قسم کا ڈر کہ اسے کہیں یہ نہ ہو جائے اور وہ نہ ہو جائے ۔ اَشْفَقَ مِنْہُ ۔ اس سے ڈرا ۔ گھبرایا ۔ اَشْفَقَ عَلَیْہِ ۔ محبت کی وجہ سے اسکی دیکھ بھال کی اور اس پر کوئی تکلیف آنے سے ڈرتا رہا * ۔ ایسے خیر خواہ کو مُشْفِقٌ اور شَفِیْقٌ کہتے ہیں ۔ چونکہ خوف ، کمزوری کی علامت ہوتا ہے اس لئے اَلشَّفَقَةُ کمزوری کو بھی کہتے ہیں ۔ ثَوبٌ شَفَقٌ ۔ کمزور کپڑا ** ۔ چونکہ اس میں خوف اور کمزوری کا پہلو ہوتا ہے اسلئے اس صفت کو خدا کی طرف منسوب نہیں کرتے ۔

راغب نے کہا ہے کہ جب اس کے بعد مِنْ آئے تو اس میں خوف کا پہلو زیادہ ہوتا ہے اور فِیْ آئے تو خیر خواہی اور مہربانی کا پہلو نمایاں *** ۔ لیکن تاج نے اسی عبارت میں بجائے فِی کے عَلٰی لکھا ہے اور یہی زیادہ صحیح ہے ۔

سورۃ احزاب میں ہے اَشْفَقْنَ مِنْہَا (۷۲/۳۳) ۔ انہوں نے اس سے خوف کھایا ۔ وہ حملِ امانت (امانت میں خیانت کرنے) سے ڈر گئے ۔ سورۃ انبیاء میں ہے وَهُمْ مِنْ خَشْیَتِہٖ مُشْفِقُوْنَ (۲۸/۲۱) ۔ وہ اس (کے قانون کی خلاف ورزی کے تباہ کن نتائج) سے ڈرتے ہوئے اس سے خوف کھاتے ہیں ۔ یعنے وہ اپنی بہتری اسی میں سمجھتے ہیں کہ اس قانون کا اتباع کرتے رہیں ۔

ش ف ہ

شَفَهَہٗ عَنْہُ شَفْہًا ۔ اس نے اسے کسی کام میں لگا کر اس کی توجہ دوسرے کاموں سے ہٹا دی ۔ شَفَهَہٗ ۔ اس کے ہونٹ پر مارا ۔ شَافَهَہٗ ۔ اس سے بالمشافہہ بات کی ۔ شَفَةٌ ہونٹ ۔ دو ہونٹوں کو شَفَتَانِ اور شَفَتَیْنِ کہینگے ۔ جمع شِفَاہٌ اور شَفَوَاتٌ آتی ہیں * ۔

قرآن کریم میں شَفَتَیْنِ (۹/۹۰) ۔ دو ہونٹوں کے لئے آیا ہے ۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اَلشَّفَةُ کے مادہ میں آخری حرف واو بھی ہو سکتا ہے اور ھاء بھی جو محذوف ہے **** ۔

بعض علمائے لغت نے شَفَةٌ کی اصل شَفَوٌ قرار دی ہے ۔ اس لئے ہم نے اسے ش ۔ ف ۔ و میں بھی لکھا ہے ۔ وہاں بھی دیکھ لیا جائے ۔

* تاج ۔ ** محیط ۔ *** راغب ۔ **** ابن فارس ۔

ش ف و

اَلشَّفَا ۔ چیز کا کنارہ ۔ ہر چیز کی حد ۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ ہو سکتا ہے کہ یہ لفظ شَفَا (ش ۔ ف ۔ و) سے ہو اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اس میں فاء ۔ باء سے بدلی ہوئی ہو ۔ یعنی شبا بدل کر شفا ہو گیا ہو ۔ جب سورج غروب ہو رہا ہو تو کہتے ہیں مَا بَقِیَ مِنْہُ اِلَّا شَفًی ۔ یعنی اس کا بہت تھوڑا حصہ باقی رہ گیا ہے* ۔ اس سے اس کے معنے ہلاکت سے قریب ہونے کے آتے ہیں ۔ شَفَتِ الشَّمْسُ ۔ آفتاب غروب ہونے کے قریب ہو گیا**۔

قرآن کریم میں ہے عَلٰی شَفَا جُرُفٍ (۹/۱۰۹) گرتے ہوئے ساحل کے کنارے پر ۔ نیز شَفَا حُفْرَۃٍ (۳/۱۰۲) ۔ گڑھے کے کنارے پر ۔

اَلشَّفَۃُ ۔ ہونٹ کو کہتے ہیں جس کی جمع شَفَوَاتٌ اور شِفَاہٌ آتی ہے ۔ اس سے مُشَافَہَۃٌ منہ در منہ بات کرنے کو کہتے ہیں**۔ قرآن کریم میں شَفَتَیْنِ (۹۰/۹) ۔ دو ہونٹوں کے لئے آیا ہے ۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ ہو سکتا ہے (الشَّفَۃُ) میں واو محذوف ہو اور یہ بھی کہ ہاء محذوف ہو ۔ (نیز دیکھئے عنوان ش ۔ ف ۔ ہ)

ش ف ی

شَفَاہُ ۔ یَشْفِیْہِ ۔ شِفَاءً ۔ اسے شفاء دی ، بیماری سے ٹھیک کیا ۔ اَلشِّفَاءُ کے معنے بیماری سے اچھا ہونے کے ہیں ۔ پھر اسے دوا اور علاج کے معنوں میں بھی استعمال کرنے لگے**۔ قرآن کریم میں یہ لفظ مرض کے مقابلہ میں آیا ہے ۔ وَاِذَا مَرِضْتُ فَھُوَ یَشْفِیْنِ (۲٦/۸۰)۔ ''جب میں بیمار ہوتا ہوں تو وہ مجھے شفا بخشتا ہے''۔ اور دوا کے معنوں میں بھی۔ فِیْہِ شِفَاءٌ لِلنَّاسِ (۱٦/٦۹) ۔ اس میں لوگوں کے لئے شفا ہے ۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس مادہ کے بنیادی معنی کنارے پر آجانے اور اوپر سے جھانکنے کے ہیں ۔ اس کا خیال ہے کہ شفاء مرض پر غالب آنے کی وجہ سے شفاء کہلاتی ہے ۔

ش ق ق

شَقَّہٗ ۔ یَشُقُّہٗ ۔ شَقًّا ۔ کسی چیز کو پھاڑنا ۔ اس میں شگاف کرنا اِنْشَقَّ ۔ پھٹ گیا ۔ اَلشَّقُّ ۔ صبح**۔ اِنْشَقَّتِ الْعَصَا ۔ شیرازہ بکھر گیا۔

---

*محیط ۔ **تاج ۔

باھمی اختلافات شروع ھو گئے۔ شَقَّ عَصَا الْمُسْلِمِیْنَ ۔ اس نے مسلمانوں کی جماعت اور ان کی وحدت میں افتراق و انتشار پیدا کر دیا ۔ اَلْمُشَاقَّةُ وَ الشِّقَاقُ۔ مخالفت ۔ عداوت ۔ باھمی اختلاف*۔ شِقٌّ ۔ مشقت ۔ صعوبت ۔ کوفت ۔ پوری قوت لگانے اور تگ و دو کرنے سے تھک جانا ۔ تکان ۔ شَقَّ عَلَیْهِ الْاَمْرُ ۔ معاملہ اس پر گراں گزرا ۔ شَقَّ عَلَیْهِ ۔ اسے مشقت میں ڈال دیا*۔

اَلشُّقَّةُ۔ مسافت کا بُعد ۔ سفرِ بعید* (۹/۴۲) ۔ وہ منزل مقصود جس تک بہ مشقت پہنچا جائے ۔

قرآن کریم میں پتھروں کے پھٹنے کے لئے شَقَّ اور چشموں کے پھوٹنے کے لئے فَجَّرَ کے مادے آئے ھیں (۲/۷۴) ۔ سورۃ صؔ میں شِقَاقٍ (۳۸/۲) مخالفت کے معنوں میں آیا ھے ۔ اور (۹/۳) میں شَاقٌّ مخالفت اور اختلاف کے معنوں میں استعمال ھوا ھے ۔ سورۃ عبس میں ھے ثُمَّ شَقَقْنَا الْاَرْضَ شَقًّا (۸۰/۲۶) ۔ ''پھر ھم زمین کو محسوس طور پر پھاڑتے ھیں'' ۔ سورۃ قصص میں ھے وَمَا اُرِیْدُ اَنْ اَشُقَّ عَلَیْکَ (۲۸/۲۷) ۔ میں نہیں چاھتا کہ تم پر کوئی سختی کروں یا کٹھن ذمہ داری ڈالوں ۔ سورۃ نحل میں شِقٌّ کے معنے مشقت کے آئے ھیں (۱۶/۷) ۔

شَاقَّ کے معنے ھیں مخالفت کرنا ۔ عداوت کرنا ۔ جداگانہ روش اختیار کرنا ۔ مَنْ یُشَاقِقِ الرَّسُوْلَ (۴/۱۱۵) ۔ شِقَاقٌ ۔ اختلاف ایک دوسرے سے جدا ھوجانا (۴/۳۵) ۔ قرآن کریم میں ھے اِقْتَرَبَتِ السَّاعَةُ وَانْشَقَّ الْقَمَرُ (۵۴/۱) ۔ انقلاب کی گھڑی قریب آئی اور ''القمر'' شق ھو گیا ۔ اس کے مفہوم کے لئے عنوان (ق ۔ م ۔ ر) دیکھئے ۔

ش ق ی (و)

اَلشَّقَاءُ ۔ شدت اور تنگی ۔ نامرادی اور محرومی ۔ شَقِیَ ۔ یَشْقٰی ۔ شَقَاوَةً ۔ شِقْوَةً ۔ بد بخت اور بد نصیب ھونا ۔ شَقَاوَةٌ ۔ سعادت کی ضد ھے اور چونکہ شقاوت میں کوفت اور تھکن ھوتی ھے اس لئے کوفت اور مشقت کو بھی شَقَاوَةٌ کہدیتے ھیں ۔ ابن فارس نے کہا ھے کہ اس کے بنیادی معنے شدت و مشقت برداشت کرنا ھیں ۔ نیز یہ سہولت ، نرمی اور سعادت و خوش بختی کی ضد ھے ۔ اَلْمُشَاقَاةُ ۔ مصیبت جھیلنا ۔ سختی برداشت کرنا ۔ اَلشَّاقِی مِنَ الْجِبَالِ ۔ ایسا پہاڑ جو اوپر سے باھر کی طرف نکلا اور جھکا ھوا ھو اور جس پر چڑھنا بہت مشکل ھو ۔

---

*تاج ۔

قرآن کریم میں شَقِیٌّ وَ سَعِیْدٌ (۱۱/۱۰۵) آیا ہے ۔ یہاں شقاوت ، سعادت کی ضد ہے ۔ سورۃ مریم میں حضرت زکریا[4] کا قول ہے کہ وَلَمْ اَکُنْ بِدُعَائِکَ رَبِّ شَقِیًّا (۱۹/۴) ۔ یہاں محرومی و نامرادی مراد ہے ۔ سورۃ طٰهٰ میں ہے مَا اَنْزَلْنَا عَلَیْکَ الْقُرْاٰنَ لِتَشْقٰی (۲۰/۲) ہم نے تجھ پر قرآن اس لئے نہیں نازل کیا کہ تو زندگی کی سعادتوں سے محروم رہ کر مشقتوں میں پڑھ جائے ۔ اس ''تَشْقٰی'' کا مفہوم ذرا آگے چل کر بیان ہوا ہے جہاں آدم سے کہا گیا ہے کہ اس جنت میں تیرے لئے سامانِ زیست بڑی فراوانی سے موجود ہے (۲۰/۱۱۸) ۔ لیکن اگر تو ابلیس کی باتوں میں آ گیا تو یہ تجھے اس جنت سے نکال دیگا ۔ فَتَشْقٰی (۲۰/۱۱۷) ۔ جس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ تو اس تمام سامان سے محروم رہ کر جگر پاش مشقتوں میں پڑ جائیگا ۔ سورۃ اللّیل میں ہے کہ جہنم میں وہ جاتا ہے جو اَشْقٰی (۹۲/۱۵) ہوتا ہے ۔ بہت ہی نامرادونا کام، بدنصیب ۔ لیکن اس کے مقابلہ میں اَتْقٰی (۹۲/۱۷) آیا ہے ۔اس لئے اَشْقٰی کے معنے سرکش کے بھی ہو سکتے ہیں سورۃ مریم میں جَبَّارًا شَقِیًّا (۱۹/۳۲) آیا ہے ۔ سورۃ المومنون میں جہنمیوں کے متعلق ہے کہ وہ کہینگے کہ غَلَبَتْ عَلَیْنَا شِقْوَتُنَا (۲۳/۱۰۶) ہماری بد بختی ہم پر غالب آ گئی ۔ یاد رہے کہ یہ محرومی اور بد بختی ، انسان کے اپنے اعمال کے نتیجہ کا نام ہے ۔ خوش بختی یا بد بختی انسان کے لئے ''مقدر'' نہیں ہوتی ۔

ش ک ر

اَلشُّکْرُ ۔ اس مادہ میں اصلی معنے بھر جانا اور اظہار کرنا ہیں** ۔ ابن فارس نے اس کے مختلف بنیادی معنی بتائے ہیں جن میں سے ایک ، کسی چیز کا بھرا ہوا ہونا اور مقدار میں کثیر ہونا بھی ہیں ۔ شَکِرَتِ النَّاقَۃُ ۔ اونٹنی کے تھن دودھ سے بھر گئے ۔ اَلْمِشْکَارُ ۔ اس دودھ دینے والے جانور کو کہتے ہیں جسے اگرچہ چارہ کم ہی ملے لیکن اس کے تھن دودھ سے بھرے رہیں ۔ ضَرَّۃٌ شَکْرٰی ۔ دودھ سے بھرپور تھن ۔ اَلشَّکِرَۃُ ۔ اس اونٹنی کو کہتے ہیں جسکے تھن دودھ سے بھرے ہوں*** ۔

شَکِرَتِ الشَّجَرَۃُ ۔ درخت کے تنہ پر ٹہنیاں نکل آئیں ۔ اِشْتَکَرَتِ السَّمَاءُ ۔ بارش خوب زور سے برسی ۔ اِشْتَکَرَ الْحَرُّ وَالْبَرْدُ ۔ سردی اور گرمی بھر پور ہو گئی ۔ شَکَرَ فُلَانٌ ۔ اس شخص نے دل کھول کر سخاوت کی اور لوگوں کو خوب دیا ۔ صاحب تاج العروس کے نزدیک اس کی

*تاج و راغب ۔ **محیط ۔ ***تاج ۔

طرف سے شُکْرٌ کے معنے اطاعت و ادائے فرائض، نیز احسان مندی کے جذبات کا اظہار، اور خدا کی طرف سے شُکْرٌ کے معنے پورا پورا بدلہ دینا، یا تھوڑے عمل کا بڑھا کر اجر دینا ھیں۔ (مثلاً کوئی شخص اگر اپنے آپ کو تنگی میں رکھ کر دوسرے کی تھوڑی سی مدد بھی کرتا ھے تو اس کی یہ قربانی، اس شخص کے مقابلہ میں زیادہ قیمتی ہوگی جو اپنی ضروریات سے زائد چیز دوسرے کو دیدے۔ یہ مطلب ھے ''تھوڑے عمل کا زیادہ اجر دینے'' کا)

شُکْرٌ کے بنیادی معنوں کو پیش نظر رکھنے سے ''سعی مشکور'' کا مطلب سمجھ میں آجائیگا۔ یعنے ایسی کوشش جسکے بھرپور نتائج سامنے آجائیں۔ ایسے بھرپور جیسے بکری کے تھن دودھ سے بھرے ہوئے ہوں۔ شَاکِرٌ (فَاِنَّ اللّٰہَ شَاکِرٌ عَلِیْمٌ - ۲/۱۵۸)۔ وہ ھے جو کسی کی کوشش میں بھرپور نتائج پیدا کر دے۔ اور وہ بھی جسکی کوششیں اس طرح بھرپور نتائج کی حامل ہو جائیں۔ اسی طرح سورۃ زمر میں شُکْرٌ کا لفظ حبط اعمال (اعمال کے رائیگاں جانے) اور خُسْرٌ کے مقابلہ میں آیا ھے۔ (۳۹/۶۵،۶۶)۔ اس شخص کو شَکُوْرٌ بھی کہا گیا ھے جسکی کوششیں بھرپور نتائج پیدا کر دیں (۱۴/۵)۔ صیغہ کے لحاظ سے شَکُوْرٌ میں شَاکِرٌ سے زیادہ مبالغہ پایا جاتا ھے۔

چونکہ شُکْرٌ کے معنی نمایاں اور ظاہر کرنا ھیں اس لئے اس کے مقابلہ میں کُفْرٌ کا لفظ آیا ھے (۱۴/۷) جسکے معنے ڈھانپ کر رکھنا اور دبا دینا ھیں۔ سورۃ بقرۃ میں ھے وَاشْکُرُوْا لِیْ وَلَا تَکْفُرُوْنِ (۲/۱۵۲)۔ اس کا مطلب یہ ھے کہ خدا کی دی ہوئی نعمتوں کو ہمیشہ بے نقاب رکھو تاکہ اس سے نوع انسانی فائدہ اٹھائے۔ انھیں چھپا کر اور دبا کر نہ رکھو۔

خدا کی دی ہوئی نعمتوں میں سب سے پہلے وہ صلاحیتیں آتی ھیں جو خود انسان کے اندر موجود ہوتی ھیں۔ ان صلاحیتوں کا پورا پورا نشوونما پانا (ور اس طرح ابھر کر سامنے آجانا) ان کا شُکْرٌ ھے۔ اور یہ چیز اعمال صالحہ سے ہوتی ھے۔ اس لئے اعمال صالحہ خدا کی نعمتوں کے شُکْرٌ کا موجب بنتے ھیں۔ سورۃ احقاف میں اسی حقیقت کو بیان کیا گیا ھے جب کہا گیا ھے کہ تم دعا مانگا کرو (اسکی آرزو کیا کرو) کہ رَبِّ اَوْزِعْنِیْٓ اَنْ اَشْکُرَ نِعْمَتَکَ .... وَاَنْ اَعْمَلَ صَالِحًا (۴۶/۱۵)۔ اے میری نشوونما دینے والے مجھے توفیق عطا کر دے کہ میں تیری دی ہوئی نعمتوں کا ''شکر'' کروں۔ یعنے میں ایسے کام کروں جن سے میری صلاحیتوں کی نشو و نما ہو جائے۔ اسی لئے دوسری جگہ کہا ھے کہ

مَنْ يَشْكُرْ فَإِنَّمَا يَشْكُرُ لِنَفْسِهِ وَمَنْ كَفَرَ فَإِنَّ اللّٰهَ غَنِيٌّ حَمِيدٌ (۳۱/۱۲) ۔ جو خدا کی نعمتوں کو بے نقاب رکھتا ھے اس سے خود اسکی ذات کی نشو و نما ھوتی ھے اور جو ان پر پردے ڈالتا ھے تو اس سے خدا کا کچھ نہیں بگڑتا ۔ خود اسکا اپنا ھی نقصان ھوتا ھے ۔ خدا اپنی ذات میں قابل حمد وستائش ھے ۔ تمہارے سہاروں کا محتاج نہیں ھے ۔

خدا کی نعمتوں کو بے نقاب رکھنے کے معنے یہ ھیں کہ انہیں خدا کے قانون کے مطابق صرف میں لایا جائے ۔ یعنے نوع انسانی کی ربوبیت کے لئے کھلا رکھا جائے ۔ اس حقیقت کو سورۃ نحل میں ایک بستی کی مثال سے واضح کیا گیا ھے ۔ اس بستی میں رزق کی بڑی فراوانی تھی لیکن فَكَفَرَتْ بِأَنْعُمِ اللّٰهِ (۱۶/۱۱۲) ۔ انہوں نے خدا کی نعمتوں پر پردے ڈالنے شروع کر دئے تو اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ ان پر بھوک اور خوف کا عذاب آگیا ۔ ان کی طرف خدا کے رسول آئے لیکن انہوں نے ان کی بھی تکذیب کی ۔ اسکے بعد جماعت مومنین سے کہا گیا ھے کہ تم ایسا نہ کرنا ۔ وَاشْكُرُوا نِعْمَتَ اللّٰهِ (۱۶/۱۱۴) ۔ تم خدا کی نعمتوں کو بے نقاب رکھنا ۔ اِنْ كُنْتُمْ اِيَّاهُ تَعْبُدُوْنَ (۱۶/۱۱۴) ۔ اگر تم صرف اسی کے قانون کی اطاعت کرتے ھو تو ۔ اس سے ظاھر ھے کہ شکر نعمت کے معنے ھیں اللہ کی دی ھوئی نعمتوں (سامان رزق وغیرہ) کو خدا کے قانون کے مطابق عام رکھنا ۔ اور کفر نعمت کے معنے ھیں انہیں اپنے خود ساختہ قوانین و نظریات (بِمَا كَانُوْا يَصْنَعُوْنَ ۱۶/۱۱۲) ۔ کے مطابق چھپا چھپا کر رکھنا ۔ اسی کو سورۃ اعراف میں ان الفاظ میں واضح کیا گیا ھے کہ شَاكِرِيْنَ وہ ھیں جو ابلیس کی راھوں پر نہیں چلتے اور اس کے دام فریب میں نہیں آتے (۷/۱۷) ۔

سورۃ بقرۃ میں بنی اسرائیل کے متعلق ھے کہ ثُمَّ بَعَثْنٰكُمْ مِنْ بَعْدِ مَوْتِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ (۲/۵۶) ۔ ھمنے تمہیں موت کے بعد نئی زندگی عطا کی تاکہ تم ''شکر کر سکو'' ۔ اس سے ظاھر ھے کہ قوموں کو ان کی موت کے بعد حیات نو اسلئے ملتی ھے کہ وہ اپنی مضمر صلاحیتوں کی پوری پوری نشو و نما کر سکیں ۔ جو قومیں ایسا نہیں کرتیں وہ زندہ نہیں کہلا سکتیں ۔ نہ ھی زندہ رہ سکتی ھیں ۔

تصریحات بالا سے واضح ھے کہ ۔

(۱) مساعی کے مشکور ھونے سے مراد یہ ھے کہ ان میں بھرپور نتائج پیدا ھو جائیں ۔ وہ پوری طرح ثمر بار اور نتیجہ خیز ھو جائیں ۔

(۲) انسان کی طرف سے شُکْرٌ کے معنے یہ ہیں کہ وہ خدا کی دی ہوئی نعمتوں کو بے نقاب کرے یعنے

(الف) وہ اپنی مضمر صلاحیتوں کی پوری پوری نشو و نما کرے اور

(ب) کائنات میں پھیلے ہوئے سامانِ نشو و نما کو نوع انسانی کی پرورش کیلئے کھلا رکھے ۔ ان پر پردے نہ ڈالے ۔

(۳) یہ اسطرح ہوسکتا ہے کہ انسان قوانین خداوندی کی پوری پوری اطاعت کرے۔ ان کے مطابق زندگی بسر کرے ۔ یہ انسان کی طرف سے شُکْرٌ ہو گا ۔ اور

(۴) خدا کی طرف سے شُکْرٌ کے معنے یہ ہیں کہ وہ انسانی اعمال میں بھرپور نتائج پیدا کر دے ۔ یہ قانون خداوندی کی خصوصیت ہے کہ جو اسکے مطابق چلتا ہے اس کی کوششیں بھرپور نتائج پیدا کرتی ہیں ۔

سورۃ الدھر میں ہے إِنَّا هَدَيْنٰهُ السَّبِيْلَ إِمَّا شَاكِرًا وَّإِمَّا كَفُوْرًا (۷۶/۳)۔ ہم نے انسان کو (وحی کے ذریعے) صحیح راستہ دکھا دیا ہے ۔ اب اسکی اپنی مرضی ہے کہ چاہے اسے اختیار کر لے اور چاہے اس سے انکار کر دے۔ یہاں شُکْرٌ سے مراد کسی بہت بڑی نعمت کی قدر کرتے ہوئے اسے اختیار کر لینا ہیں ۔ سورۃ نساء میں ہے اِنْ شَكَرْتُمْ وَآمَنْتُمْ (۴/۱۴۷) ۔ اگر تم اس ہدایت کی قدر کرو اور اس پر ایمان لے آؤ۔ (۳۴/۱۳) میں شَكُوْرٌ بمعنے شَاكِرٌ استعمال ہوا ہے ۔ صاحبِ غریب القرآن (مرزا ابوالفضل) نے لکھا ہے کہ اسکے معنے حصولِ نعمت کے اسباب سے فائدہ اٹھانا بھی ہیں ۔ مثلاً سورۃ سبا میں ہے اِعْمَلُوْٓا آلَ دَاوٗدَ شُكْرًا (۳۴/۱۳)۔ اے آل داؤد تم حصولِ نعمت کے اسباب سے فائدہ اٹھاتے ہوئے (ہمارے قانون کے مطابق) عمل کرو۔ یعنی کائنات کی قوتوں اور مختلف اسباب و ذرائع سے فائدہ اٹھانا ، ان کا شکر ادا کرنا ہے ۔

ابن فارس نے کہا ہے کہ اس لفظ کے بنیادی معنوں میں تھوڑی چیز پر اکتفا کر لینا بھی ہیں ۔ چنانچہ فَرَسٌ شَكُوْرٌ اس گھوڑے کو کہتے ہیں جسے فربہی کی بنا پر تھوڑا سا چارہ بھی کافی ہو جاتا ہو۔ صلاحیتوں کے نشو و نما پا جانے سے خود بخود یہ کیفیت پیدا ہو جاتی ہے کہ تھوڑے سے خارجی سہارے بھی بھرپور نتائج پیدا کر دیتے ہیں ۔

ش ک س

شَكَاسَةُ الْاَخْلَاقِ ۔ اخلاق کا درشت اور تنگ ہونا ۔ شَاكَسَهٗ ۔ اس نے اس سے تنگی کا برتاؤ کیا ۔ اَللَّيْلُ وَالنَّهَارُ يَتَشَاكَسَانِ ۔ دن

اور رلت ایک دوسرے کی ضد ہوتے ہیں ۔ تَشَاکَسُوْا ۔ انہوں نے ایک دوسرے کی مخالفت کی ۔ یا انہوں نے ایک دوسرے سے لین دین اور خرید و فروخت کے معاملہ میں تنگی کا برتاؤ کیا* ۔

قرآن کریم میں ہے شُرَکَاءُ مُتَشَاکِسُوْنَ (۳۹/۲۹) ۔ کاروبار میں حصے دار جو تند خوئی کی وجہ سے ایک دوسرے سے جھگڑتے رہیں اور معاملات میں تنگ نظری کا ثبوت دیں ۔

ش ک ک

اَلشَّکُّ ۔ یقین کی ضد ہے ۔ راغب نے کہا ہے کہ جب دو متضاد چیزیں کسی شخص کی نگاہ میں ایک جیسی اور یکساں ہو جائیں تو اس کیفیت کو شَکٌّ کہتے ہیں** ۔ صاحب محیط نے کلیات کے حوالہ سے لکھا ہے کہ جس طرح عِلْمٌ سے یقین کی ابتدا ہوتی ہے اسی طرح شَکٌّ سے رَیْبٌ کی ابتدا ہوتی ہے (دیکھئے عنوان ر ۔ ی ۔ ب)۔ یہی وجہ ہے کہ شَکٌّ مُرِیْبٌ تو کہتے ہیں لیکن رَیْبٌ مُشَکِّکٌ نہیں کہتے*** ۔ ابن فارس نے اس کے بنیادی معنی چیزوں کا ایک دوسری میں گھس جانا اور داخل ہو جانا بتائے ہیں، چنانچہ شَکَکْتُہٗ بِالرُّمْحِ کے معنے ہیں میں نے اسکے بدن میں نیزہ گھسا دیا۔ اسی سے شَکٌّ ہے کہ اس میں دو چیزیں ایک دوسری میں گھسی ہوئی معلوم ہوتی ہیں اور ان میں سے یقینی شکل، جداگانہ اور واضح نہیں ہوتی**** ۔ راغب نے لکھا ہے کہ شَکَکْتُ الشَّیْئَ کے معنے ہیں کسی چیز میں آر پار سوراخ کر دیا اور جب کسی چیز میں یہ کیفیت ہوگی تو اس میں قرار و ثبات نہیں ہو سکے گا اور اس پر پختگی سے بھروسہ نہیں کیا جاسکے گا ۔ یہ خیال بھی صحیح ہوسکتا ہے کہ یہ شَکٌّ سے استعارہ ہو جس کے معنے ہیں بازو کا پہلو سے چمٹ جانا ۔ اس طرح اس کا مفہوم یہ ہو جائے گا کہ ایک دوسرے سے مخالف چیزوں کا باہمدگر مل جانا اور اس طرح عقل و فہم کو ان کے درمیان داخل ہو کر ان میں سے ایک چیز کو جداگانہ دیکھنے کا موقع نہ ملنا***** ۔ شَکُّوْا بُیُوْتَہُمْ کے معنے ہیں انہوں نے اپنے تمام مکانات ایک جیسے بنائے* ۔

ان مثالوں سے شَکٌّ کے معنے واضح ہو جاتے ہیں ۔ یعنی دو متضاد باتوں کا یکساں محسوس ہونا اور اس لئے انسان کا کسی صحیح فیصلہ تک نہ پہنچ سکنا ۔

---

*تاج و راغب ۔ **تاج ۔ ***محیط ۔ ****ابن فارس ۔ *****راغب ۔

حضرت عیسیٰؑ کے واقعہ صلیب کے ضمن میں کہا ہے کہ اِنَّ الَّذِیْنَ اخْتَلَفُوْا فِیْهِ لَفِیْ شَكٍّ مِّنْهُ (۴/۱۵۷)۔ اس سے شک کے معنے واضح ہو جاتے ہیں ۔ یعنے وَلٰکِنْ شُبِّهَ لَهُمْ (۴/۱۵۷)۔ حضرت عیسیٰؑ میں، اور جس شخص کو انہوں نے گرفتار کیا، اس میں ایسی باہمی مشابہت تھی کہ ان پر اصل حال مشتبہ ہو گیا ۔ یہ وجہ ہے کہ وہ اس کی بابت شک میں ہیں کہ انہوں نے سمجھا کیا اور در اصل ہوا کیا تھا ۔ (تفصیل میری کتاب ''شعلہ مستور'' ۔ ذکر حضرت عیسیٰؑ میں ملیگی) ۔

ش ک ل

اَلشَّکْلُ ۔ (ش پر زبر اور زبر کے ساتھ) کسی کی مثل ۔ اُس جیسا ۔ فِیْ فُلَانٍ شَکْلٌ مِنْ اَبِیْهِ ۔ فلاں آدمی میں اپنے باپ سے مشابہت ہے*۔ سورۃ ص میں ہے وَّ آخَرُ مِنْ شَکْلِهٖٓ اَزْوَاجٌ (۳۸/۵۸)۔ اُسی قسم کی، اُس سے ملتی جلتی رنگا رنگ کی اور سزائیں ۔ اس کی جمع اَشْکَالٌ آتی ہے جسکے معنے مختلف معاملات اور ضرورتیں ہیں ۔ شَکَلَ الْاَمْرُ ۔ معاملہ گڈ مڈ اور مشتبہ ہو گیا* ۔

اَلشِّکَالُ ۔ اس رسی کو کہتے ہیں جس سے جانور کی اگلی اور پچھلی ٹانگیں باندھی جاتیں تاکہ وہ اس حد تک قدم اٹھا سکے جس تک یہ رسی اجازت دے۔ شَکَلَ الدَّابَّةَ ۔ اس نے جانور کی ٹانگیں (شکال سے) باندھ دیں۔ ابن فارس نے لکھا ہے کہ اس مادہ کے بیشتر الفاظ کے معانی مماثلت اور باھمی مشابہت سے ماخوذ ہیں ۔ وہ کہتا ہے کہ شَکَلْتُ الدَّابَّةَ اس لئے کہتے ہیں کہ اس میں جانور کی ایک ٹانگ کو اس جیسی دوسری ٹانگ سے باندھا جاتا ہے ۔ اَلشِّکَالُ فِی الرَّحْلِ ۔ وہ رسی جس سے کجاوہ کے اگلے اور پچھلے بندھنوں کو ملا کر باندھا جاتا ہے** ۔ یہ اسم آلہ ہے ۔ اسی مادہ سے اسم فاعل شَاکِلٌ ہے جس کی مؤنث شَاکِلَةٌ ہے ۔ اس کے معنے ہوئے باندھنے والی ۔ یہ وہی چیز ہے جسے شِکَالٌ کہتے ہیں ۔ سورۃ بنی اسرائیل میں ہے قُلْ کُلٌّ یَّعْمَلُ عَلٰی شَاکِلَتِهٖ (۱۷/۸۴)۔ اس کا مفہوم سمجھنے کے لئے اس حقیقت پر غور کرنا چاہئیے کہ کائنات میں ہر چیز کے اندر اس کی ممکنات (Potentialities) رکھدی گئی ہیں ۔ آم کی گٹھلی میں یہ امکانی قوت رکھدی گئی ہے کہ وہ مناسب نشو و نما کے بعد آم کا درخت بن جائے جس میں آم جیسا میٹھا، خوشبودار، رنگین پھل آئے ۔ لیکن کیکر (ببول) کا بیج اگرچہ

*تاج ۔ **راغب ۔

درخت بن جاتا ہے لیکن اس میں کانٹے لگتے ہیں ۔ آم کی گٹھلی کا منتہیٰ (Inner-Destiny) آم کا پھل ہے ۔ کیکر کے بیج کا منتہیٰ کانٹے دار درخت ۔ ان میں سے کوئی شے اپنی اس حد سے آگے نہیں بڑھ سکتی جس کا امکان اسکے اندر ہوتا ہے ، جس طرح ایک جانور اس حد سے آگے نہیں بڑھ سکتا جس تک اس کی شَاکِلَۃٌ اسے پہنچنے دیتی ہے ۔ مندرجہ صدر آیت کا مطلب یہ ہے کہ ہرشے اپنی شَاکِلَۃٌ کی حد تک پہنچ سکتی ہے ۔ اس سے آگے نہیں جاسکتی ۔ فطرت نے اس کا جو منتہیٰ معین کر دیا ہے وہ اس سے آگے نہیں بڑھ سکتی ۔

خارجی کائنات میں ہر شے کی شَاکِلَۃٌ متعین ہوتی ہے ۔ جہاں تک انسان کا تعلق ہے ، اس میں شبہ نہیں کہ اسکے ممکنات کی بھی ایک انتہا ضرور ہے لیکن زندگی کی موجودہ اسٹیج اسکی آخری حد نہیں ۔ یہ اَقْطَارُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ (۵۵/۳۳) سے بھی آگے جاسکتا ہے ۔ لیکن موروثی اثرات ، ابتدائی ماحول، تربیت، تعلیم، جذباتی رجحانات وغیرہ وہ رسیاں ہیں جن سے اسکا پاؤں بندھ جاتا ہے ۔ لیکن صحیح معاشرہ ان رسیوں میں وسعتیں پیدا کر سکتا ہے ۔ قرآن کریم ایک ایسے معاشرہ کی تشکیل کرتا ہے جس میں ہر فرد کی مضمر صلاحیتیں کامل نشو و نما پا جائیں ۔ اس معاشرہ میں جو پابندیاں عائد کی جاتی ہیں وہ درحقیقت اس کی ذات کی صلاحیتوں کی وسعت کے لئے ہوتی ہیں ۔ لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا (۲/۲۸۶) کا یہی مفہوم ہے ۔ قرآنی معاشرہ میں ہر فرد پر اس کی شَاکِلَۃٌ کے مطابق ذمہ داری عائد کی جائیگی اگرچہ اس کے ساتھ ہی یہ بھی کوشش کی جائے گی کہ اس کی حدود کا دائرہ وسیع سے وسیع تر ہوتا جائے ۔ حیوان کے بچے کی نشو و نما کی انتہا یہ ہے کہ وہ اپنے باپ جیسا ہوجائے ۔ لیکن انسانی بچہ مناسب نشو و نما سے اپنے اسلاف سے کہیں آگے جا سکتا ہے ۔ انسان کی تاریخ اس پر شاہد ہے کہ موجودہ دور کا انسان بہ ہیئتِ مجموعی اپنی سابقہ نسلوں سے کہیں آگے ہے ۔ اسی طرح آنے والے دور کے انسان موجودہ زمانے کے انسان سے آگے جاسکتے ہیں ، اس طرح ، جہاں ایک دور میں مختلف انسانوں کی مضمر ممکنات مختلف ہوتی ہیں ۔ اسی طرح مختلف ادوار میں نسلِ انسانی کی ممکنات مختلف ہوتی ہیں ۔ اور علم و شعور کی ترقی کے ساتھ ساتھ ان ممکنات کا دائرہ وسیع ہوتا جاتا ہے ۔ اور اس کے ساتھ ہی اسکی ذمہ داریاں بڑھتی جاتی ہیں ۔ (واضح رہے کہ ان ممکنات سے مراد انسانی ذات کی خصوصیات ہیں جو ہر فرد میں ہمیشہ یکساں ہوتی ہیں ۔)

صاحب لطائف اللغہ نے لکھا ہے اَلشَّوَاکِلُ (جو شَاکِلَۃٌ کی جمع ہے) ان راستوں کو کہتے ہیں جو ایک شاہراہ سے پھوٹ نکلیں ۔ (نیز تاج) ۔ اس سے مراد زندگی کی مختلف راہیں اور انسانوں کے مختلف طورطریق ہیں جن پر وہ اپنی صلاحیتوں کے مطابق چلتے ہیں ۔

یاد رہے کہ انسانی اختیارات کی ایک حد ضرور ہے (جس طرح وہ ایک پاؤں اٹھا کر تو کھڑا رہ سکتا ہے لیکن دونوں پاؤں اٹھا کر کھڑا نہیں رہ سکتا) ۔ لیکن جس حد تک اسے اختیار دیا گیا ہے اس میں وہ بالکل آزاد ہے ۔ اس کے اختیار و ارادہ میں کوئی دخل انداز نہیں ہوتا ۔ (مزید تفصیل ق ۔ د ۔ ر کے عنوان میں دیکھئے) ۔

ش ک و (ی)

شَكْوَةٌ ۔ مشک یا چمڑے کا تھیلا جو پانی یا دودھ رکھنے کیلئے استعمال کیا جاتا ہے اور جسکا صرف ایک طرف سے منہ کھلا ہوتا ہے ۔ شَكْوٌ کے معنے ہیں اس مشکیزہ کا منہ کھول دینا تاکہ جو کچھ اس کے اندر ہو وہ باہر آجائے ، یا ظاہر ہو جائے ۔ اس سے شِكَايَةٌ کا مفہوم واضح ہو جاتا ہے ۔ یعنے اپنے دل کی بات کو ظاہر کر دینا *۔ راغب نے کہا ہے کہ اسکے معنے اپنے پراگندہ حال کے اظہار کے ہیں *۔ سورۃ یوسف میں ہے اِنَّمَا اَشْكُوْا بَثِّيْ وَ حُزْنِيْ اِلَى اللّٰهِ (۱۲/۸۶) ۔ میں اپنی پریشان حالی اور رنج و غم کا اظہار اپنے خدا سے کرتا ہوں ۔ دوسری جگہ ہے وَ تَشْتَكِيْ اِلَى اللّٰهِ (۵۸/۱) ۔ '' وہ اللہ سے اپنی حالت کا اظہار کر رہی تھی '' ۔ اسی مادہ سے اَلْمِشْكٰوةُ ہے جسکے معنے ہیں دیوار میں ایسا موخلہ جو آرپار نہ ہو ۔ طاق*۔ بعض نے اسکے معنے چراغدان کئے ہیں ۔ (۲۴/۳۵) ۔ اَلشَّكْوٰی ۔ شکایت **۔

ش م ت

شَمِتَ الْعَدُوُّ وَشَمَاتَةً ۔ کسی کے دشمن کا اسکی مصیبت پر خوش ہونا ۔ اَشْمَتَهٗ بِعَدُوِّهٖ ۔ اسکے دشمن کو تکلیف پہنچا کر اسے خوش کیا ، ***۔ جب حضرت موسیٰؑ فرط غضب میں حضرت ہارونؑ کا سر پکڑ کر انہیں اپنی طرف کھینچنے لگے تو حضرت ہارونؑ نے ان سے کہا تھا فَلَا تُشْمِتْ بِيَ الْاَعْدَآءَ (۷/۱۵۰) ۔ تو دشمنوں کو مجھ پر ہنسنے اور خوش ہونے کا موقع نہ دے ۔ ویسے اَلتَّشْمِيْتُ ۔ چھینکنے والے کو دعا دینے کو کہتے ہیں ۔ گویا اس دعا سے شماتت کو اس سے دور کرنا مراد ہوتا ہے ۔ جیسے تَمْرِيْضٌ کے معنے مرض کو دور کرنا ہوتے ہیں ****۔

ش م خ

شَمَخَ الْجَبَلُ ۔ پہاڑ کا بہت بلند اور لمبا ہونا ۔ اَلْجِبَالُ الشَّوَامِخُ ۔ بہت بلند اور لمبے پہاڑ ۔ شَمَخَ الرَّجُلُ بِاَنْفِهٖ ۔ اس

*تاج و راغب ۔ **محیط ۔ ***تاج ۔ ****راغب ۔

آدمی نے اپنی ناک چڑھائی - تکبر کیا * - ابن فارس نے اس مادہ کے بنیادی معنے بڑا اور بلند ہونا بتائے ہیں - قرآن کریم میں رَوَاسِیَ شٰمِخٰتٍ (۲۷/۲۷) آیا ہے - اپنی جگہ مضبوطی سے جمے ہوئے اونچے اور بڑے بڑے پہاڑ -

ش م ز

اَلشَّمْزُ - نفس انسانی کا ناخوش آئند چیزوں سے متنفر ہونا - تَشَمَّزَ وَجْهُهٗ - اس کا چہرہ بگڑا، متغیر اور منقبض ہو گیا - اِشْمَأَزَّ - ڈرنا اور گھبرانا - رونگٹے کھڑے ہو جانا، منقبض ہونا، گھٹ جانا، تنگی محسوس کرنا - اِشْمَأَزَّ الشَّيْءَ - اسنے اس چیز کو ناپسند کیا - اَلْمُشْمَئِزُّ - متنفر - ناپسند کرنے والا - دہشت زدہ * -

سورۃ زمر میں ہے اِذَا ذُكِرَ اللّٰهُ وَحْدَهٗ اشْمَأَزَّتْ قُلُوْبُ الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ (۳۹/۴۵) - جب ان لوگوں کے سامنے جو آخرت پر یقین نہیں رکھتے اکیلے خدا کا ذکر کیا جاتا ہے تو ان کے دل منقبض ہو جاتے ہیں - وَاِذَا ذُكِرَ الَّذِيْنَ مِنْ دُوْنِهٖ اِذَا هُمْ يَسْتَبْشِرُوْنَ (۳۹/۴۵) اور جب اس کے سوا اوروں کا ذکر کیا جاتا ہے تو وہ خوش ہوتے ہیں - انسان شخصیت پرستی سے خوش ہوتا ہے اور خالص قانون کی اطاعت اس پر شاق گزرتی ہے - اس لئے کہ انسانوں کو جذبات کی رو سے خوش کر لینا آسان ہوتا ہے اور قانون کسی کی رعایت نہیں کرتا - قرآن کریم نے جو دین نوع انسانی کیلئے تجویز کیا ہے اس میں خالص قانون خداوندی کی اطاعت مقصود تھی - شخصیت پرستی کا اس میں کوئی دخل نہیں - لیکن انسانی آمیزشوں نے اس دین کی حالت یہ کردی ہے کہ کوئی بات لیجئے، اسکی آخری سند کسی نہ کسی انسان تک جا کر رک جاتی ہے - خدا کا قانون (قرآن کریم) بحیثیت آخری سند (Final Authority) کے کہیں نہیں آتا - حتکہ اگر کسی کو ان ارباب من دون اللہ سے الگ کرکے خالص اطاعت خداوندی کی دعوت دی جائے تو وہ اس داعی کا سخت مخالف ہو جاتا ہے - یہی وہ عظیم حقیقت ہے جس کی طرف قرآن کریم نے (مندرجہ بالا آیت میں) توجہ دلائی ہے -

ش م س

اَلشَّمْسُ - آفتاب (۹۱/۱) دھوپ - ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی رنگ برنگ اور متلون ہونے اور کم قرار پکڑنے کے ہیں - اَلشَّمُوْسُ مِنَ الدَّوَابِّ وہ چوپایہ جسے قرار نہ ہو - آفتاب کو بھی اَلشَّمْسُ

*تاج - محیط - راغب -

اسی لئے کہتے ہیں کہ وہ ہمیشہ متحرک رہتا ہے۔ دھوپ کی گرمی۔ لَا یَرَوْنَ فِیْهَا شَمْسًا وَّلَا زَمْهَرِیْرًا (۷۶/۱۳)۔

مَطْلِعَ الشَّمْسِ (۱۸/۹۰) وہ مقام جہاں سے آفتاب طلوع ہوتا معلوم ہو۔ انتہائی شرقی سمت۔ مَغْرِبَ الشَّمْسِ (۱۸/۸۶)۔ وہ مقام جہاں سورج غروب ہوتا نظر آئے۔ انتہائی مغربی سمت۔

صاحبِ غریب القرآن نے لکھا ہے کہ ایرانیوں کا قومی نشان شَمْسٌ تھا جسطرح عرب جاہلیت کا قومی نشان قَمَرٌ تھا **۔ (اس اعتبار سے قَمَرٌ اور شَمْسٌ کے معنی کیلئے ق۔ م۔ ر کا عنوان دیکھئے)۔

ابن کلبی نے کہا ہے کہ اَلشَّمْسُ پرانے زمانے کے ایک بت کا نام ہے ***۔ (شاید اسی کی طرف نسبت کرکے عرب عبد شمس نام رکھتے تھے)۔ بعض کا خیال ہے کہ شَمْسٌ ایک مشہور چشمہ کا نام تھا ***۔

ش م ل

اَلشِّمَالُ۔ بائیں جانب۔ (یَمِیْنٌ کی ضد ہے)۔ (۱۸/۱۷)۔ یَمِیْنٌ (دایاں ہاتھ) یُمْنٌ و سعادت اور خیر و برکت کا مظہر سمجھا جاتا ہے۔ اسلئے اَلشِّمَالُ (بایاں) نحوست کا نشان۔ اسی لئے کہتے ہیں زَجَرْتُ لَهٗ طَیْرَ الشِّمَالِ میں نے اس کے لئے نحوست کے پرندے کو جھڑکا*۔ قرآن کریم میں اَصْحَابُ الشِّمَالِ (۵۶/۴۱) اہل جہنم کے لئے آیا ہے۔ یہی ہیں جن کا اعمال نامہ ان کے بائیں ہاتھ میں دیا جائیگا (۶۹/۲۵)۔ اَلشَّمَالُ۔ شمالی ہوا، جو بالعموم سرد ہوتی ہے۔ مصر میں یہ بادشمال سرد اور خشک ہوتی ہے، اور اگر یہ سات دن تک متواتر چلتی رہے تو مصری کفن تیار کرنے شروع کردیتے ہیں کیونکہ وہ اسے برداشت نہیں کرسکتے *۔

اَلشِّمَالُ۔ اس غلاف کو بھی کہتے ہیں جو بکری کے تھن پر چڑھایا جاتا ہے*۔ اور اَلشَّمْلَةُ۔ وہ کملی ہے جس میں انسان لپٹ جائے*۔ راغب کا کہنا ہے کہ شِمَالٌ اس کپڑے کو کہتے تھے جس سے بائیں جانب ڈھانپ لیجائے۔ نیز الاِشْتِمَالُ بِالثَّوْبِ کسی کپڑے میں اس طرح لپٹنے کے لئے بولا جاتا ہے کہ اس کا بالائی سرا بائیں جانب ڈالا جائے****۔ پھر یہ کپڑے میں لپٹنے کے لئے استعمال ہونے لگا۔ اسی اعتبار سے اِشْتَمَلَ عَلَی الشَّیْءِ کے معنے ہوتے ہیں کسی چیز پر محیط ہو جانا، اور اسے اپنے اندر شامل کرلینا*****۔

* تاج۔ ** (میرزا ابوالفضل)۔ *** ابن فارس۔ ****راغب۔ *****محیط۔

ابن فارس نے کہا ہے کہ یہ اس کے بنیادی معنوں میں سے ہے۔اَلرَّحِمُ تَشْتَمِلُ عَلَى الْوَلَدِ ۔ رحم نے بچہ کو اپنے اندر لے رکھا ہے (۱۴۴/۶) میں ہے أَمَّا اشْتَمَلَتْ عَلَيْهِ أَرْحَامُ الْأُنثَيَيْنِ ۔ یا وہ کچھ جو دو ماداؤں کے رحموں میں ہے ۔

طبیعت اور عادت کو بھی اَلشِّمَالُ کہتے ھیں۔اسکی جمع شَمَائِل ہے*۔

ھم نے اوپر لکھا ہے کہ (i) عربوں کے ھاں یَمِیْنٌ سعادت اور خوش بختی کی نشانی سمجھا جاتا تھا ۔ اور شِمَالٌ، نحوست کی نشانی ۔ اور (ii) قرآن کریم نے أَصْحَابُ الشِّمَالِ ۔ اھل جھنم کو کہا ہے اور أَصْحَابُ الْيَمِيْنِ اھل جنت کو ۔ اس سے یہ نہیں سمجھ لینا چاھئے کہ قرآن کریم بھی سعد و نحس کو اس طرح تسلیم کرتا ہے جس طرح عرب (عہد جاھلیہ میں) عقیدہ رکھتے تھے ۔ قرآن کریم ، عربوں کی زبان میں نازل ھوا ہے اس لئے وہ اس زبان کے الفاظ اور محاورات کو انہی معنوں میں استعمال کرتا ہے جن معنوں میں عرب انہیں استعمال کرتے تھے ۔ اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ قرآن کریم اس وجہ یا سبب کو بھی تسلیم کرتا ہے جس کی بنیاد پر عرب کسی لفظ کا خاص مفہوم لیتے تھے ۔ یہ بنیادی نقطہ ہے جسے ھمیشہ پیش نظر رکھنا چاھئے ۔

ش ن أ

شَنَآءٌ ۔ کسی سے سخت بغض رکھنا** ۔ محیط نے کہا ہے کہ یہ ایسے بغض کو کہتے ھیں جس میں دشمنی کے ساتھ بد خلقی بھی شامل ھو ۔ قرآن کریم میں شَنَآنُ قَوْمٍ (۲/۵) آیا ہے ۔ یعنی کسی قوم کا شدید بغض یا اس کی بد ترین دشمنی ۔ دوسری جگہ ہے إِنَّ شَانِئَكَ هُوَ الْأَبْتَرُ (۳/۱۰۸) ۔ تجھ سے بغض رکھنے والے کی جڑیں کٹ گئیں ۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس مادہ کے معنوں میں بغض رکھنا اور گریز کرنا پایا جاتا ہے ۔

ش ھ ب

اَلشَّهَبُ ۔ سفید رنگ جس میں سیاھی کی آمیزش ھو* ۔ (تقریباً ایسا رنگ جیسے آگ کا شعلہ جب اپنی انتہائی حد کو پہنچ جائے تو اس کا رنگ سفید ھو جاتا ہے اور اس کے مرکز میں کچھ سیاھی مائل سا رنگ نظر آتا

*تاج ۔ ** تاج و محیط و راغب ۔

ہے) ۔ نیز وہ پہاڑ جو برف سے ڈھکا ہوا ہو ۔ سَنَةٌ شَہْبَاءُ ۔ قحط والا سال جس میں کہیں سبزی نظر نہ آئے اور زمین خشکی کی وجہ سے یکسر سفید ہو چکی ہو ۔ شِہَابٌ آگ کا بلند ہونے والا شعلہ ۔ وہ شعلہ جو رات کو آسمان میں دور تک جاتا نظر آتا ہے ۔ (اسے ٹوٹتا تارا کہتے ہیں)** ۔

زمانہ جہالت میں لوگ سمجھتے تھے کہ انسان کی قسمت ستاروں کے ساتھ وابستہ ہے ۔ چنانچہ نجومی ، ستاروں کی گردش سے انسان کی تقدیر کے زائچے بنایا کرتے تھے ۔ (اب بھی اکثر ایسا ہوتا ہے اور علم نجوم کو بڑی اہمیت دی جاتی ہے) ۔ قرآن کریم کہتا ہے کہ ایسی باتیں دور جہالت میں تو چل سکتی تھیں لیکن جب دنیا میں علم کی روشنی آ جائے تو اس قسم کی ظنی اور قیاسی چیزوں کی کوئی حقیقت نہیں رہتی ۔ اگر اس وقت کوئی اس قسم کا دعویٰ کرتا ہے تو علم و یقین کا ایک "شہاب مبین" اس کے پیچھے آجاتا ہے جو اس ظن اور قیاس کی قلعی کھول کر رکھ دیتا ہے ۔ (۱۵/۱۸ و ۳۷/۹ و ۷۲/۹) ۔

ش ھ د

شَہِدَ یَشْہَدُ کے معنے ہیں حاضر ہونا ۔ موجود ہونا ۔ شَہَادَۃٌ ۔ جو کچھ کسی کو معلوم ہو (بصارت یا بصیرت کی بنا پر) اسے ٹھیک ٹھیک طور پر حاضر (بیان) کر دینا** ۔ ایسا کرنے والے کو شَاہِدٌ اور شَہِیْدٌ کہتے ہیں ۔ مُشَاہَدَۃٌ کے معنی (اہل لغت کے نزدیک) آنکھوں سے دیکھنا ہیں * ۔ لیکن اس مفہوم کو وسعت دے دی جائے تو اس کے معنی ہونگے کسی چیز کا حواس کی گرفت میں آ جانا ۔

قرآن کریم میں غَیْبٌ کے مقابل میں شَہَادَۃٌ کا لفظ آیا ہے (۵/۲۲)۔ غَیْبٌ کے معنے ہیں جو آنکھوں سے اوجھل ہو (دیکھئے عنوان غ ۔ ی ۔ ب) اس لئے شَہَادَۃٌ سے مراد محسوس اشیاء ہونگی اور غَیْبٌ سے مراد وہ توانائیاں یا نتائج جو مضمر ہوں ۔ لہذا شَہَادَۃٌ (یا مَشْہُوْدٌ) وہ نتائج ہیں جو مرتب ہو کر محسوس صورت میں بے نقاب ہو جائیں ۔ غَائِبُ الْفَرَسِ گھوڑے کی اس قوت کو کہتے ہیں جسے وہ دوڑنے میں محفوظ رکھ لے اور شَاہِدُ الْفَرَسِ اس قوت کو جسے وہ کام میں لے آئے ۔ نیز شَہِدَ کے معنے گھر پر موجود ہونا اور غَابَ کے معنے سفر میں چلے جانا ہیں*** ۔ چنانچہ روزوں کے احکام کے ضمن میں جو آیا ہے کہ فَمَنْ شَہِدَ مِنْکُمُ الشَّھْرَ فَلْیَصُمْہُ (۲/۱۸۵) ۔ تو اس کا یہ مطلب ہے کہ تم میں سے جو

*تاج ۔ **تاج و راغب ۔ *** لین

حالت سفر میں نہ ھو وہ اس مہینے کے روزے رکھے - (مسافر کے لئے الگ حکم ہے) - اِمْرَاَۃٌ مُشْہِدٌ - اس عورت کو کہتے ھیں جس کا خاوند گھر پر موجود ھو* - مَشْہَدٌ - حاضر ھونے کی جگہ کو کہتے ھیں - یا جس مقام پر تمام پوشیدہ امور اور نتائج محسوس شکل میں سامنے آ جائیں (۱۹/۳۷) - یَوْمٌ مَّشْہُوْدٌ کے معنے ایسے وقت کے ھیں (۱۱/۱۰۳) - سورۃ بنی اسرائیل میں ہے اِنَّ قُرْاٰنَ الْفَجْرِ کَانَ مَشْہُوْدًا (۱۷/۷۸) - یہاں مَشْہُوْدٌ کے معنے یہ ھیں کہ اس کے حقائق محسوس شکل میں سامنے آ جاتے ھیں - (فَجْرٌ کے معنے متعلقہ عنوان میں دیکھئے) - شُہَدَاءَکُمْ (۲/۲۳) - تمہارے مددگار -

خدا کو شَہِیْدٌ اس لئے کہا گیا ہے کہ ھر چیز اس کی نگاھوں کے سامنے ہے (۲۲/۱۷) - اور رسول اس اعتبار سے شَاھِدٌ (۴۸/۸) ھوتا ہے کہ جن حقائق کو وہ اپنی آنکھوں کے سامنے بے نقاب دیکھتا ہے (اسی کو نبوت کہتے ھیں) انہیں وہ دوسروں کے سامنے پوری قطعیت کے ساتھ بیان کر دیتا ہے (اسے رسالت کہتے ھیں) - یا اس لئے کہ وہ اپنی جماعت کے اعمال کا نگران (شَہِیْدٌ) ھوتا ہے - (۲/۱۴۳) -

اَلشَّہْدُ - وَالشُّہْدُ - شہد (عَسَلٌ) کو بھی کہتے ھیں - جبکہ ابھی وہ چھتے سے باھر نہ نکالا گیا ھو** -

شَہِدَ کے معنے گواھی دینے یا تصدیق کرنے کے بھی ھوتے ھیں اور قسم کھانے کے بھی - شَہِدَ عَلَیْہِمْ (۴۱/۲۱) ان کے خلاف شہادت دینگے - شَہِدَ عَلٰی کَذَا کے معنے یہ بھی ھیں کہ کسی کے متعلق پوری اور قطعی خبر بتا دینا*** - صاحب غریب القرآن (ابو الفضل) نے (ابن عباسؓ کے حوالہ سے) لکھا ہے کہ شَہِدَ کے معنے فیصلہ کرنے کے بھی آتے ھیں - (مثلاً ۱۲/۲۶ میں) - اس اعتبار سے اللّٰہُ شَہِیْدٌ بَیْنِیْ وَ بَیْنَکُمْ (۶/۱۹) - کے معنے فیصلہ کرنے والا ھونگے - نیز اس کے معنے نگہبان کے بھی ھیں (۲/۱۴۳) -

آپنے دیکھا ہے کہ اس لفظ کے استعمال کی صورتیں کتنی ھی متنوع کیوں نہ ھوں ان میں سے ھر ایک میں ، موجود ھونا - حاضر رھنا - نظروں کے سامنے رھنا یا رکھنا ، کا مفہوم ضرور پایا جاتا ہے -

خدا کی راہ میں جان دینے والوں کو جو شَہِیْدٌ کہا جاتا ہے تو یہ اصطلاح قرآن کریم نے استعمال نہیں کی - یعنی قرآن کریم نے ایسے شخص کو اس لفظ سے مختص نہیں کیا - ویسے معنوی اعتبار سے دیکھا جائے تو

---

*تاج و راغب - **تاج - ***محیط و اقرب الموارد -

شہید زندہ انسان بھی ہو سکتا ہے اور (جسمانی طور پر) مردہ بھی۔ جو شخص اپنے مَا آمَنَ بِہٖ (جس پر وہ ایمان رکھتا ہے) کی عملی شہادت پیش کر دے وہ شہید ہے۔ خواہ جان سے ہو یا مال سے یا کسی اور مطلوب شے سے۔ اور پھر آخر وقت تک اس روش پر قائم رہے۔ راہ خدا میں جان دینا، اپنے ایمان کی صداقت کی سب سے بڑی شہادت ہے۔

قرآن کریم کی رو سے پوری کی پوری ملت اسلامیہ شُھَدَآءَ عَلَی النَّاسِ (۲/۱۴۳) ہے۔ یعنی تمام نوع انسانی (مختلف اقوام عالم) کے اعمال پر نگاہ رکھنے والی۔ ان سب پر نگران۔ اور ان کا مرکز (رسولؐ) ان کے اعمال کا نگران (۲/۱۴۳)۔ غور کیجئے کہ ملت اسلامیہ کا دنیا میں فریضہ کیا تھا اور اس فریضہ کی ادائیگی کے لئے اس کا مقام کسقدر بلند تھا۔ ایک وہ ملت اسلامیہ تھی اور ایک آج ہم ملت اسلامیہ ہیں کہ دوسروں کے اعمال و کردار کے نگران و محاسب ہونا تو ایک طرف، ہم اپنی ذرا ذرا سی ضرورت کے لئے بھی غیروں کے محتاج ہیں۔ اس کا سبب ظاہر ہے۔ وہ ملت، قرآن کریم کو اپنا ضابطہ حیات سمجھتی تھی اورہم افسانوں میں کھوئے ہوئے ہیں۔

ش ھ ر

اَلشُّھْرَۃُ۔ صاحب تاج العروس نے لکھا ہے کہ اس کے معنے ہیں کسی بری بات کا نمایاں اور مشہور ہو جانا۔ لیکن جوھری نے کہا ہے کہ اس کا استعمال مطلقاً کسی معاملہ کے واضح ہو جانے اور مشہور ہو جانے کیلئے ہوتا ہے۔ (اردومیں عام طور پر شہرت اچھی باتوں کیلئے بولا جاتا ہے اور تَشْھِیْر بری باتوں کے لئے)۔ اَلشَّھِیْرُ۔ مشہورو معروف۔ معزز*۔ اَلشَّھْرُ چاند کو کہتے ہیں کیونکہ اسکے ظہور سے مہینے کی شہرت ہو جاتی ہے۔ نیز مہینہ کو بھی شَھْرٌ کہتے ہیں۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اسکے بنیادی معنی کسی معاملہ کا واضح ہونا اور روشن ہونا ہوتے ہیں۔ اسی سے اَلشَّھْرُ چاند کو کہتے ہیں۔ شَاھَرَہٗ مُشَاھَرَۃً۔ اس سے ماھانہ اجرت پر معاملہ کیا*۔ قرآن کریم میں شَھْرُ رَمَضَانَ (۲/۱۸۵) مہینے کیلئے آیا ہے جسکی جمع اَشْھُرٌ (۲/۱۹۷)۔ اور شُھُوْرٌ ہے (۹/۳۶)

ش ھ ق

شَھَقَ الرَّجُلُ۔ یَشْھَقُ۔ شَھِیْقاً۔ اسکے سینہ میں رونے کی آواز متردد ہوئی، بار بار اٹک اٹک کر نکلی۔ شَھِیْقُ الْحِمَارِ وَ تَشْھَاقُہٗ۔

*تاج۔

گدھے کے رینکنے کی آواز۔ الشَّھُوْقُ ۔ بلند ہونا۔ الشَّھْقَۃُ ۔ چیخ *۔ قرآن کریم میں زَفِیْرٌ وَّشَھِیْقٌ (۱۱/۱۰۶) آیا ہے۔ اس سے مراد چیخنا چلانا ہے۔ زجاج نے کہا ہے کہ یہ الفاظ مصیبت زدہ لوگوں کی آوازوں کے لئے استعمال ہوتے ہیں، اور شَھِیْقٌ کے معنے ہیں کراہنے کی بہت بلند آواز۔ یہ لفظ جَبَلٌ شَاھِقٌ سے ہے جسکے معنے نہایت اونچے اور لمبے پہاڑ کے ہیں جس پر چڑھنا دشوار ہو *۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنے بلند ہونے کے ہیں۔ نیز فُلَانٌ ذُوْشَاھِقٍ سے مراد ہے وہ سخت غصہ ور ہے۔

قرآن کریم میں جہنم کی آواز کے لئے بھی شَھِیْقٌ کا لفظ آیا ہے۔ (۶۷/۷)۔ جہنمی معاشرہ میں ہر طرف چیخ پکار ہوتی ہے۔ وہ یہاں کا جہنم ہو یا آخرت کا۔

ش ھ و

شَھَاہٌ وَّ اشْتَھَاہٌ۔ کسی چیز کی خواہش کرنا۔ اسے چاہنا۔ رغبت کرنا۔ طبیعت کا میلان ہونا۔ راغب نے کہا ہے کہ شَھْوَۃٌ نفس کے ان چیزوں کی طرف کھنچنے کو کہتے ہیں جنہیں وہ چاہتا ہے۔ کبھی اس چیز کو شَھْوَۃٌ کہدیا جاتا ہے جسکی طرف طبیعت کا میلان ہو۔ اور کبھی خود اس جذبہ (میلان) کو شَھْوَۃٌ کہتے ہیں **۔

شَیْئٌ شَھِیٌّ۔ لذیذ چیز۔ طَعَامٌ شَھِیٌّ۔ وہ کھانا جو طبیعت کو مرغوب ہو ***۔

زُیِّنَ لِلنَّاسِ حُبُّ الشَّھَوٰتِ مِنَ النِّسَآءِ (۳/۱۴) میں، خود شَھَوٰتٌ (شَھْوَۃٌ کی جمع) کے معنے (راغب کے الفاظ میں) مرغوب اشیاء ہیں۔ صاحب محیط نے کہا ہے کہ اس میں الشَّھَوَات بطور مبالغہ بمعنی مُشْتَھَیَاتٌ (مرغوب چیزیں) ہے۔ دونوں صورتوں میں معنے ایک ہی ہیں۔ یعنے مرغوب اور پسندیدہ چیزیں۔ یا میلانات۔ (۵۹/۲۷) میں یہ لفظ (باقی الفاظ کے ساتھ مل کر) جنسی میلان کیلئے آیا ہے۔

جنتی زندگی کی خصوصیت یہ بتائی ہے کہ وَلَکُمْ فِیْھَا مَاتَشْتَھِیْٓ اَنْفُسُکُمْ (۴۱/۳۱)۔ اس میں ہر مرغوب خاطر شے میسر ہوگی۔ جو کچھ تمہارا دل چاہے۔

سورۃ مریم مختلف انبیاء کے تذکرہ کے بعد ہے، فَخَلَفَ مِنْ بَعْدِھِمْ خَلْفٌ اَضَاعُوا الصَّلٰوۃَ وَاتَّبَعُوا الشَّھَوَاتِ (۱۹/۵۹) ان کے بعد ایسے لوگ آگئے

*تاج نیز راغب۔ **تاج۔ ***محیط۔

جنہوں نے صلٰوۃ کو ضائع کر دیا اور شہوات کے پیچھے لگ گئے۔ اس کے معنی واضح ہیں۔ یعنی بجائے اس کے کہ وہ قوانین خداوندی کے پیچھے چلیں (دیکھئے عنوان ص۔ ل۔ و) وہ اپنے جذبات اور خواہشات کے پیچھے لگ گئے۔ تصریحات بالا سے یہ حقیقت ہمارے سامنے آجاتی ہے کہ اگر انسانی خواہشات کو وحی کی روشنی میں پورا کیا جائے تو اس کا نتیجہ جنتی زندگی کی خوشگواریاں ہوتا ہے لیکن اگر انہیں وحی کی پابندیوں کو توڑ کر پورا کیا جائے تو اس کا نتیجہ تباہی ہوتا ہے۔ فَسَوْفَ يَلْقَوْنَ غَيًّا (۱۹/۵۹)۔
[نیز دیکھئے عنوان ھ۔ و۔ ی]

ش و ب

اَلشَّوْبُ۔ خلط ملط کرنا نیز آمیزہ (پانی دودھ وغیرہ کا)۔ شَابَ الشَّیْءَ شَوْبًا۔ اس نے اس چیز کو خلط ملط کر دیا۔ ملا دیا۔ اس اعتبار سے اَلشَّوْبَۃُ دھوکے اور فریب کو کہتے ہیں۔ ملاوٹ والی بات۔ اَلشَّوَائِبُ (جمع ہے شَائِبَۃٌ کی) اسکے معنے ہیں کثافتیں اور غلاظتیں نیز نقائص و عیوب اور خطرات۔ شَوْبٌ۔ شہد کو بھی کہتے ہیں کیونکہ اس میں خود بھی موم ملا ہوا ہوتا ہے اور اسے ہر دوا کے ساتھ ملایا جاتا ہے*۔

قرآن کریم میں اہل جہنم کے متعلق ہے اِنَّ لَهُمْ عَلَيْهَا لَشَوْبًا مِنْ حَمِيمٍ (۳۷/۶۷)۔ اس کے اوپر سے انہیں گرم آمیزہ دیدیا جائیگا۔ اس سے مراد بے اطمینانی کا جینا، ناگوار مصائب کو برداشت کرنا، نیز کثافت آمیز زندگی ہے، یا زندگی کی کثافتیں۔ پر فریب زندگی کے اثرات۔

ش و ر

شَارَ الْعَسَلَ۔ شہد کو چھتہ سے نکال لیا اور جمع کر لیا۔ اَلْمَشَارُ۔ وہ چھتہ جس سے شہد نکالا جائے۔ اَلشَّوْرُ۔ چھتہ سے نکالا ہوا شہد۔ اَلْمِشْوَارُ۔ وہ لکڑی جس سے شہد نکالا جاتا ہے۔ اَلْمَشْوَارَۃُ چھتہ کو کہتے ہیں*۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنے ہیں (۱) کسی چیز کو ظاہر کرنا۔ پیش کرنا اور (۲) کسی چیز کو لے لینا۔

شَاوَرَ۔ مُشَاوَرَۃٌ۔ تَشَاوَرَ۔ باہمی مشورہ کرنا۔ اصل کے اعتبار سے (یعنی شَارَ الْعَسَلَ۔ چھتہ کو نچوڑ کر اس سے شہد نکالنے کے اعتبار سے)، مشورہ کے معنے ہوئے دوسرے کے خیالات کا نچوڑ حاصل کر کے کسی نتیجہ پر پہنچنا **۔ اور اگر خود شہد سے مفہوم لیا جائے، تو جس طرح شہد کی

---
* تاج۔ محیط۔ راغب۔ نیز ابن فارس۔ **راغب۔

مکھیاں اپنی اپنی محنت کا ماحصل ایک جگہ جمع کر دیتی ھیں ، مشاورت کے معنے ھونگے مختلف افرادِ معاشرہ کی اپنی اپنی رائے ، فکر ، خیالات ، اور غور و خوض کے نتائج کو ایک جگہ جمع کر دینا تا کہ اس سے کسی فیصلہ تک پہنچا جائے ۔ روئی دھننے والے کی کمان کی تانت کو بھی اَلْمِیْشْوَارُ کہتے ھیں * ۔ لہذا بشورہ کا مفہوم یہ بھی ھو سکتا ھے کہ آراء کو دُھننا اور انہیں کھول کر نتیجہ نکالنا ۔

اَشَارَ اِلَیْہِ ۔ اسکی طرف اشارہ کیا * (۱۹/۲۹) ۔ اَلشُّوْرَۃُ وَالشَّارَۃُ ۔ حسن و جمال ۔ وضع قطع ۔ ھئیت ۔ لباس ۔ پوشاک ۔ فربہی ۔ زینت ۔ آرائش ۔ شَارَ ۔ یَشُوْرُ ۔ گھوڑے کو سدھایا ، یا خریدار کو بتانے کے لئے اس پر سوار ھوا اور اسے دوڑا کر دکھایا * ۔

قرآن کریم نے نوع انسانی کی راھنمائی کے لئے اصولی قوانین دیئے ھیں جو ھمیشہ کے لئے غیر متبدل ھیں ۔ قرآنی نظام یہ ھے کہ ھر زمانے کے لوگ ان غیرمتبدل اصولوں کی روشنی میں اپنے اپنے زمانے کے تقاضوں کے مطابق جزئی احکام خود وضع کریں ۔ یہ چیز باھمی مشورہ سے طے ھوگی ۔ اسی لئے جماعت مومنین کے متعلق کہا گیا ھے کہ وَاَمْرُھُمْ شُوْرٰی بَیْنَھُمْ (۳۸/۴۲) ۔ ان کے معاملات باھمی مشاورت سے طے ھونگے ۔ چونکہ سب سے پہلے قرآنی نظام خود نبی اکرم ؐ نے قائم کیا تھا ، اسلئے حضور ؐ کو بھی حکم دیا گیا کہ شَاوِرْھُمْ فِی الْاَمْرِ (۱۵۸/۳) ۔ معاملات میں ان (مومنین) سے مشورہ کیا کرو۔ اس سے ظاھر ھے کہ چونکہ مشورہ کا حکم تمام مومنین کے لئے ھے اس لئے ان کا نظام شریعت کبھی جامد اور متصلب (Rigid and Static) نہیں ھو سکتا۔ ھر دور کے مومنین اپنے زمانے کے تقاضوں کو سامنے رکھیں گے۔ اگر انکے زمانے کا تقاضا ھو تو وہ باھمی مشورہ سے، کسی سابقہ دور کے فیصلوں میں ردوبدل بھی کرسکتے ھیں، اور نئے فیصلے بھی کر سکتے ھیں۔ اس طرح قرآن کریم کے غیر متبدل اصول تو اپنی جگہ قائم رھینگے لیکن انکی روشنی میں وضع کردہ جزئیات زمانے کے ساتھ ساتھ بدلتی رھیں گی۔ یہ ھے مشاورت کے قرآنی حکم کا عملی مفہوم۔ یہی خود رسول اللہ ؐ نے کیا تھا (جس پر قرآن کا حکم شاھد ھے) اس لئے سنتِ رسول اللہ ؐ بھی یہی ھے کہ ھر دور کے مسلمان ایسا ھی کریں ۔ یہی وہ سَبِیْلُ الْمُؤْمِنِیْنَ ھے (۱۱۵/۴) جس کے اتباع کا حکم ھے ۔ مغربی اندازِ حکومت میں ، کوئی شے غیرمتبدل نہیں ھوتی۔ قوم جس قسم کے فیصلے چاھے کر سکتی ھے ۔ ان فیصلوں کے اوپر کوئی ایسی پابندی یا حدود نہیں جن کا

*تاج ۔ **راغب ۔

علی حالہ رکھنا ضروری ہو ۔ اس طرز حکومت کو سیکولر (Secular) کہتے ہیں ۔ دوسری طرف ، قدامت پرستی کے مسلک کی رو سے ، شریعت میں کوئی چیز قابل تغیر وتبدل نہیں ۔ جوفیصلے پہلے ہو چکے ہیں وہ من وعن نافذ ہوتے رہیں گے۔ ان دونوں کے برعکس قرآنی نظام یہ ہے کہ،قرآن میں بیان کردہ احکام واصول غیر متبدل ہیں ۔ ان کی چار دیواری کے اندر رہتے ہوئے ہر قوم اپنے اپنے زمانے اور حالات کے تقاضوں کے مطابق جزئی قوانین خود مرتب کرے گی ۔ اسطرح ثبات (Permanence) اور تغیر (Change) کے امتزاج سے ، انسانی زندگی اپنے ارتقائی مراحل طے کرتی آگے بڑھتی جائیگی ۔

ش و ظ

اَلشُّوَاظُ ۔ اَلشِّوَاظُ ۔ شعلہ جس میں دھواں نہ ہو * ۔ نیز آگ کی گرمی اور دھواں ۔ آفتاب کی گرمی ۔ ویسے چیخنے چلانے کو بھی کہتے ہیں ، اور پیاس کی شدت کو بھی *۔

قرآن کریم میں ہے یُرْسَلُ عَلَیْکُمَا شُوَاظٌ مِّنْ نَّارٍ (۵۵/۳۵) ۔ تم دونوں گروہوں پر آگ کا شعلہ بھیجا جائیگا ۔

ش و ک

اَلشَّوْکَةُ ۔ درخت کا کانٹا ۔ ہتھیار (۸/۷) ۔ اَرْضٌ شَاکَةٌ ۔ بہت کانٹوں والی زمین * ۔

اَلشَّوْکَةُ مِنَ الْقِتَالِ ۔ جنگ کی شدت ۔ شَوْکَةُ السِّلَاحِ ۔ ہتھیار کی تیزی اور دھار * ۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی ہیں کسی چیز کا کھردرا ہونا یا کسی چیز کے کنارے کا دھار دار' تیز اور نوکیلا ہونا ۔

ش و ی

شَوَی اللَّحْمَ یَشْوِیْهِ شَیًّا ۔ گوشت بھوننا ۔ اَلشِّوَاءُ ۔ بھنا ہوا گوشت ۔ شَوَی الْمَاءَ یَشْوِیْهِ ۔ اسنے پانی کو گرم کیا ۔اَشْوَی الْقَمْحُ ۔ گیہوں اتنے سخت ہوگئے کہ انہیں بالوں سے ، ہاتھ سے مل کر' نکالا جا سکے اور بھونا جا سکے** ۔ سورۃ کہف میں ہے یَشْوِی الْوُجُوْهَ (۱۸/۲۹) جوان کے چہروں کو جھلسا دیگا ۔

* تاج ۔ محیط ۔ راغب ۔ ** تاج و محیط ۔

آلشَّوٰی - کے معنے چاروں ھاتھ پاؤں اور انسان کی کھوپڑی اور سر کی کھال کے ھیں - اس کا واحد شَوَاۃٌ ھے - بعض کا خیال ھے کہ بدن کے وہ تمام اعضاء جن پر ضرب لگنے سے موت واقع نہ ہو شَوٰی ھیں - اسی جہت سے بے قدر اور غیر اہم چیز کو بھی شَوٰی کہدیتے ھیں * -

سورۃ المعارج میں جہنم کی آگ کے متعلق ھے نَزَّاعَۃً لِّلشَّوٰی (۷۰/۱۶) - وہ ھاتھ پاؤں کو زور سے کھینچکر نکال لینے والی ھے - یعنے بالکل بیکار کر دینے والی - یا سر کی کھال کھینچ لینے والی - اس کے معنے ذلت اور مصیبت دونوں کے ہونگے - نیز قوت چھین لینے اور اپاھج بنا دینے کے بھی - ابن فارس نے کہا ھے کہ اس کے بنیادی معنے معمولی اور بے قدر چیز کے ہونے ھیں -

ش ی أ

شَاۤءَ - یَشَاۤءُ - شَیْئًا - وَ مَشِیْئَۃً کے معنے ھیں ارادہ کرنا - اکثر متکلمین نے مشیت اور ارادہ میں کوئی فرق نہیں کیا حالانکہ دونوں میں باعتبار لغت فرق یہ ھے کہ مشیت ، ایجاد (پیدا کرنے) کو کہتے ھیں اور ارادہ کے معنے طلب (چاھنے) کے ھیں* -

آلشَّیْئُ - راغب کے نزدیک یہ لفظ ھر موجود چیز کے لئے بولا جائے گا خواہ وہ محسوس طور پر موجود ہو - مثلاً مختلف اجسام ، یامحض ذھنی طور پر موجود ہو مثلاً اقوال** - نیز شَیْئٌ کا اطلاق ھر اس چیز پر ہوتا ھے جس کا علم حاصل کیا جاسکے یا جس کے متعلق کچھ خبر دی جاسکے*** - متکلمین نے اس پر بہت بحث کی ھے کہ شَیْئٌ کی ماھیت کیا ھے اور اس کا اطلاق کس کس قسم کی چیزوں پر ہوتا ھے - حتیّٰکہ بعض نے یہاں تک کہ دیا ھے کہ معدوم پر بھی اس کا اطلاق ہوتا ھے - لیکن ھمیں ان موشگافیوں میں پڑنے کی ضرورت نہیں - اس لئے کہ قرآن کریم ان متکلمانہ بحثوں میں نہیں الجھتا -

قرآن کریم میں اکثر مقامات پر آیا ھے - اِنَّ اللّٰہَ عَلٰی کُلِّ شَیْئٍ قَدِیْرٌ (۲/۲۰) - یہاں شے کے معنے چیز ، معاملہ یا حقیقت کے ھیں - سورۃ بقرہ میں ھے لَا تَجْزِیْ نَفْسٌ عَنْ نَّفْسٍ شَیْئًا (۲/۴۸) - ''(جس دن) کوئی شخص کسی دوسرے کے کچھ کام نہیں آئے گا'' -

اس حقیقت کے سمجھ لینے کی بڑی ضرورت ھے کہ ''خدا کی مشیت'' سے اصل مفہوم کیا ھے؟ ھمارے ذھنوں میں خدا کے قادرِ مطلق ہونے کا تصور یہ

* تاج و محیط - ** تاج - *** راغب -

ہے کہ اس کے ہاں نہ کوئی قاعدہ ہے نہ قانون ۔ نہ کوئی اصول ہے نہ ضابطہ۔ وہ ایک خودمختار (اور معاذ اللہ) مطلق العنان حاکم کی طرح جو جی میں آئے کرتا چلا جاتا ہے ۔ کبھی خوش ہؤا تو جاگیر بخش دی ۔ ناراض ہو گیا تو گاؤں کا گاؤں ہلاک کر دیا ۔ (خدا کے قادر ہونے کے مفہوم کے لئے تو ق ۔ د ۔ ر کا عنوان دیکھئے لیکن یہاں اتنا سمجھ لیجئے کہ) خدا کے قادر ہونے کا وہ مفہوم قطعاً نہیں جو اوپر لکھا گیا ہے ۔ اس لئے خدا کی مشیت کا بھی یہ مطلب نہیں کہ اس میں کسی قانون اور ضابطہ کا کوئی دخل نہیں ۔

یہ ہمارا مشاہدہ ہے کہ اس دنیا کی ہر شے علت اور معلول (Cause and Effect) کے سلسلہ میں جکڑی ہوئی ہے ۔ لیکن جب ہم اس سلسلہ کو پیچھے کی طرف لے جائیں تو ایک مقام ضرور ایسا آئے گا جہاں یہ سلسلہ ختم ہو جائیگا اور وہاں تسلیم کرنا پڑیگا کہ ایک معلول (Effect) بغیر کسی سابقہ علت (Cause) کے ظہور میں آگیا ہے ۔ یہ وہ مقام ہے جہاں سے تمام کائنات کا سلسلہ ، خدا کی مرضی ، منشا ، ارادہ ، اور پوری خود مختاری سے شروع ہوتا ہے۔اگر کوئی پوچھے کہ خدا نے اس سلسلہ کائنات کو کیوں اور کس طرح بنایا تو اس کا جواب اس کے سوا کچھ نہیں دیا جاسکتا کہ خدا نے اپنی مرضی سے جس طرح چاہا بنا دیا ۔ اس مقام پر مشیت خداوندی (ہمارے تصورات کے مطابق) کسی قاعدے اور قانون کی پابندیوں میں جکڑی ہوئی نہیں ہوتی ۔ یہاں یہی کہاجائیگا کہ اِنَّمَا اَمْرُهٗ اِذَا اَرَادَ شَيْئًا اَنْ يَّقُوْلَ لَهٗ كُنْ فَيَكُوْنُ (۳۶/۸۲) ۔ اس گوشہ میں خدا کا امر اس طرح کام کرتا ہے کہ جب وہ کسی چیز کا ارادہ کرتا ہے تو وہ کہہ دیتا ہے کہ ہو جا اور بس وہ ہو جاتی ہے ۔ (''کہہ دینے،، کے معنی یہ نہیں کہ وہ سچ مچ ''کُنْ،، کا لفظ زبان سے نکالتا ہے ۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ اس کے ارادے کے ساتھ ہی اس شے کی پیدائش کا آغاز ہو جاتا ہے)۔

اس سے آگے بڑھئے تو ہمارے سامنے کائنات کا محسوس سلسلہ آتا ہے جہاں ہم دیکھتے ہیں کہ ہر چیز ایک خاص قانون اور قاعدے کے مطابق عمل کر رہی ہے ۔ اس گوشہ میں خدا نے اپنے امر کو پیمانوں اور اندازوں کے اندر محدود کر دیا ہے ۔ وَ كَانَ اَمْرُ اللّٰهِ قَدَرًا مَّقْدُوْرًا (۳۳/۳۹) ۔ یہاں خدا کا امر مقررہ اندازوں کا پابند ہو گیا ۔ یعنی اب کائنات کی ہر شے ان قوانین کے تابع چلنے لگی جنہیں خدا نے اپنی مرضی اور منشا کے مطابق (اول الذکر گوشے میں) بنایا تھا ۔ اس کے لئے کہا گیا ہے کہ قَدْ جَعَلَ اللّٰهُ لِكُلِّ شَيْءٍ قَدْرًا (۶۵/۳) ۔ اللہ نے ہر شے کے لئے ایک پیمانہ مقرر

کر دیا ۔ یہ تمام پیمانے (قوانین فطرت) خدا ہی کے مقرر کئے ہوئے ہیں لیکن خدا نے یہ فیصلہ کر رکھا ہے کہ ان قوانین میں دخل اندازی کی نہیں جائیگی۔ لَنْ تَجِدَ لِسُنَّةِ اللّٰهِ تَبْدِيلًا (۳۳/۶۲) ۔ ''تو سنت اللہ (خدا کے قاعدوں) میں کبھی تبدیلی نہیں پائیگا''۔ اس گوشے میں مشیت خداوندی کے معنے ہوں گے خدا کے وہ قوانین جن کے مطابق یہ تمام سلسلہ کائنات چل رہا ہے ۔ کائنات کی کسی شے کو اس کا اختیار نہیں کہ وہ ان قوانین کی خلاف ورزی کرسکے۔ چونکہ اس پہلے گوشے کے متعلق (جہاں سے کائنات کی ابتدا ہوتی ہے اور ہر شے کے لئے قانون مقرر کیا گیا ہے) ہم کچھ نہیں جان سکتے۔ وہ ہمارے حیطہ ادراک سے باہر ہے ۔ اس لئے ہم خدا کے متعلق جو کچھ جان سکتے ہیں وہ ان قوانین ہی کی رو سے جان سکتے ہیں جو کائنات میں کار فرما ہیں۔ یعنے مشیت خداوندی کا یہ گوشہ، علم و تجربہ کی بنا پر ہماری سمجھ میں آسکتا ہے ۔

اب ایک اور قدم آگے بڑھئے۔ انہی قوانین کی رو سے جن کا ذکر اوپر کیا گیا ہے خدا نے انسان کو یہ اختیار دے رکھا ہے کہ وہ جونسا راستہ جی چاہے اختیار کر لے ۔ فَمَنْ شَاءَ فَلْيُؤْمِنْ وَّ مَنْ شَاءَ فَلْيَكْفُرْ (۱۸/۲۹) ۔ جس کا جی چاہے ایمان کی راہ اختیار کرلے اور جس کا جی چاہے کفر کی راہ اختیار کرے ۔ یعنی خارجی کائنات کی چیزوں کے برعکس، انسان کو آزادی حاصل ہے کہ وہ چاہے تو ان قوانین کی پابندی کرے جو اس کے لئے وضع کئے گئے ہیں اور چاہے تو ان سے سرکشی برت لے ۔ لیکن اس کے ساتھ ہی اسے یہ بھی بتا دیا گیا ہے کہ فلاں روش کا نتیجہ تباہی اور بربادی ہوگا اور فلاں کا نتیجہ کامرانی و کامیابی ۔ یعنے اس گوشے میں انسان کو اس کا تو اختیار ہے کہ وہ جونسی روش جی چاہے اختیار کر لے لیکن اسے اس کا اختیار نہیں کہ اپنے اعمال کے نتائج بھی اپنی مرضی کے مطابق مرتب کرلے۔ اس کا ہر عمل وہی نتیجہ مرتب کریگا جو اس کے لئے قانون خداوندی (مشیت) نے مقرر کر رکھا ہے ۔ مثلاً اسے اس کا تو اختیار ہے کہ وہ جی چاہے تو سنکھیا کھا لے اور جی چاہے مصری کی ڈلی منہ میں ڈال لے ۔ لیکن اسے اس کا اختیار نہیں کہ سنکھیا کھا کر اسکا نتیجہ مصری کی ڈلی کا سا پیدا کرلے ۔ یہ قوانین، کہ فلاں روش کا نتیجہ کیا ہوگا، انسان کو وحی کے ذریعہ عطا کئے گئے ہیں (جو آج قرآن کریم کے اندر محفوظ ہیں) لہذا جب انسان، خدا کے متعلق کچھ سمجھنا چاہے گا تو اسے قوانین فطرت کو بھی سمجھنا ہوگا جو خارجی دنیا میں کار فرما ہیں اور وحی کے قوانین کو بھی جو اس کی اپنی دنیا سے متعلق ہیں ۔ جب وہ ان دونوں قوانین کو سمجھ لیگا تو یہ حقیقت بھی اس کے سامنے آجائیگی کہ یہ دونوں قوانین در حقیقت ایک ہی اصل کی شاخیں ہیں ۔

قرآن کریم میں جہاں جہاں اللہ کے متعلق مَا یَشَآءُ کا لفظ آیا ہے وہاں یہ دیکھنا ضروری ہوگا کہ وہ ، متذکرہ صدر تینوں گوشوں میں سے کس گوشے سے متعلق ہے ۔ جس گوشے سے مَا یَشَآءُ متعلق ہوگا اس کے مطابق اس کا مفہوم لیا جائیگا ۔ ہر جگہ اس کے ایک ہی معنے لینے سے ذہن میں وہ تمام الجھاؤ پیدا ہو جاتے ہیں جن کی وجہ سے کہا جاتا ہے کہ (معاذ اللہ) قرآن کریم میں عجیب تضاد پایا جاتا ہے ۔ قرآن کریم میں کہیں تضاد نہیں ۔ تضاد ہماری اپنی کوتاہ نگہی کا پیدا کردہ ہوتا ہے ۔ (اس جگہ صرف اشارات پر اکتفا کیا جاتا ہے ۔ تفصیل ان امور کی قرآن کریم کے مختلف مقامات میں ملے گی) ۔ مثلاً قرآن کریم میں ہے یَهْدِیْ مَنْ یَّشَآءُ (۲/۱۴۲) ۔ اس کے واضح معنے ہیں کہ جو شخص خدا سے راہ نمائی لینا چاہے خدا اسے راهنمائی دیتا ہے ۔ یعنے مَنْ یَّشَآءُ کے معنے ہیں جو شخص چاہے ۔ لیکن اگر اس کے معنے یہ کئے جائیں کہ ''اللہ جسے چاہے ہدایت دیتا ہے'' تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ خدا کی طرف سے راهنمائی اس کے قانون مشیت کے مطابق ملتی ہے ۔ (یعنی مَنْ یَّشَآءُ کے معنے قانونِ مشیت کے ہونگے) ۔ اس قانون کی تفصیل قرآن کریم کی متعدد آیات میں موجود ہے ۔ مثلاً سورة مائدہ میں ہے یَهْدِیْ بِهِ اللّٰهُ مَنِ اتَّبَعَ رِضْوَانَهٗ (۵/۱۶) ۔ یعنی اللہ اس (قرآن) کے ذریعے اسی کو راهنمائی دیتا ہے جو اس کے قانون کے ساتھ ہم آهنگی اختیار کرنا چاہے ۔ بات بالکل واضح ہے ۔ یعنی اس کے لئے ابتداء (Initiative) ہمیشہ انسان کی طرف سے ہوگی ۔ اگر یہ قوانین خداوندی کے مطابق چلتا جائیگا تو اسے صراط مستقیم کی طرف راہ نمائی مل جائے گی ۔ اگر یہ اس سے انحراف برتیگا تو اس کا رخ تباہی کی طرف مڑجائیگا ۔ فَلَمَّا زَاغُوْا اَزَاغَ اللّٰهُ قُلُوْبَهُمْ (۶۱/۵) ۔ جب وہ ٹیڑھے چلے تو خدا (کے قانون) نے ان کے دل ٹیڑھے کر دیئے ۔

سورة بقرہ میں اس حقیقت کو ایک اور انداز سے واضح کیا گیا ہے ۔ بنی اسرائیل نے اپنے نبی سے کہا کہ ہم پر ایک کمانڈر مقرر کر دیجئے ۔ اللہ تعالیٰ نے طالوت کو کمانڈر مقرر کر دیا تو بنی اسرائیل نے اس پر اعتراض کیا کہ اس کا انتخاب کس خصوصیت کی بنا پر ہوا ہے، حالانکہ وہ صاحبِ مال و دولت نہیں ہے ۔ اس کے جواب میں نبی نے کہا کہ اسے اس لئے منتخب کیا گیا ہے کہ زَادَهٗ بَسْطَةً فِی الْعِلْمِ وَالْجِسْمِ (۲/۲۴۷) ۔ اللہ نے اسے جسمانی قوت اورعلم فراواں عطا کیا ہے ۔ یعنی انہیں بتا دیا کہ خدا کا انتخاب یونہی اندھا دھند نہیں ہوتا ۔ قاعدے اور قانون کے مطابق ہوتا

ہے ۔ اس کی طرف سے جسے جو کچھ ملتا ہے اس لئے ملتا ہے کہ اس میں اس کی صلاحیت ہوتی ہے ۔ اس کے بعد ہے وَ اللّٰہُ یُؤْتِیْ مُلْکَہٗ مَنْ یَّشَآءُ (۲/۲۴۷) ۔ اللہ کی طرف سے قوت و ملک اس کے قانونِ مشیت کے مطابق ملتا ہے۔ یہاں مَنْ یَّشَآءُ کا مفہوم واضح ہے ۔ یعنی قانون کے مطابق ، یونہی اندھا دھند نہیں ۔ یہاں سے سورۃ آل عمران کی اس آیت کا مفہوم بھی واضح ہو جاتا ہے جہاں کہا گیا ہے کہ تُؤْتِی الْمُلْکَ مَنْ تَشَآءُ وَتَنْزِعُ الْمُلْکَ مِمَّنْ تَشَآءُ ۔ ۔ ۔ ۔ (۳/۲۵)۔ قوت و اختیار اور عزت و حکومت کا ملنا اور چھننا ''مشیت'' پر موقوف ہے ۔ یعنی یہ سب اس کے قانونِ مشیت کے مطابق ہوتا ہے جسکی بنیاد اس پر ہے کہ جس قوم میں صلاحیت ہوتی ہے اسے اقتدار و اختیار ملتا ہے (۲۱/۱۰۵)۔ جس میں صلاحیت نہیں رہتی اس سے یہ چھن جاتا ہے۔

تصریحاتِ بالا سے ظاہر ہے کہ مشیتِ ایزدی (قانونِ خداوندی) کے تین گوشے ہیں :—

(۱) وہ گوشہ جہاں ہر شے کے لئے قوانین متعین ہوتے ہیں ۔ اس گوشے میں خدا کا امر کار فرما ہوتا ہے اور سب کچھ اس کے اپنے پروگرام کے مطابق طے پاتا ہے ۔ ہم اس گوشے کے متعلق کچھ نہیں سمجھ سکتے ۔

(۲) دوسرا گوشہ خارجی کائنات کا ہے جہاں ہر شے ان قوانین کے مطابق چلنے پر مجبور ہے جو اس کے لئے گوشہ اول میں مقرر ہوتے ہیں ۔ ان قوانین میں کوئی تغیر و تبدل نہیں ہوتا ۔ انسان ان قوانین کا علم حاصل کر سکتا ہے ۔

(۳) تیسرا گوشہ انسانی دنیا کا ہے ۔ اس کے ایک حصہ (انسان کی طبعی زندگی) میں تو وہی قوانین کار فرما ہیں جو خارجی کائنات میں جاری وساری ہیں ۔ لیکن اس کی انسانی سطح پر جن قوانین کی ضرورت ہے انہیں وحی کے ذریعے عطا کیا گیا ہے ۔ یہ قوانین (مستقل اقدار) بھی غیر متبدل ہیں ۔ لیکن انسان کو اس کا اختیار دیا گیا ہے کہ وہ چاہے تو ان کے مطابق زندگی بسر کرے اور چاہے ان کے خلاف چلا جائے ۔ وہ جیسی روش اختیار کریگا اس کے مطابق نتائج مرتب ہوں گے ۔ جتنی صلاحیت پیدا کرے گا اتنی ہی خوبیاں اور بڑائیاں اسے حاصل ہو جائیں گی ۔ اسے خدا کا قانونِ مکافات کہتے ہیں جو غیر متبدل ہے ۔

یہ ہے مشیتِ خداوندی سے مفہوم ۔ واضح رہے کہ جس گوشے میں خدا نے انسان کو آزادی دے رکھی ہے ، وہ (خدا) اس میں کبھی مخل نہیں

ہوتا ۔ اس میں انسان کو آزاد چھوڑ دیا گیا ہے ۔ اور اس سے کہہ دیا گیا ہے کہ اِعْمَلُوْا مَا شِئْتُمْ (۴۱/۴۰) ۔ اس گوشے میں تم اپنی مرضی (مشیت) کے مطابق عمل کرو ۔ ”جو تم چاہتے ہو کرو ۔ ہم مخل نہیں ہونگے“ ۔ البتہ تمہارے اعمال کے نتائج قانونِ مشیتِ خداوندی کے مطابق مرتب ہوں گے ۔ اِنَّهٗ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ (۴۱/۴۰) ۔

اس ضمن میں البتہ ایک آیت ایسی ہے جس کا صحیح مفہوم سامنے نہ ہونے سے انسان کے ذہن میں عجیب الجھاؤ پیدا ہوتا ہے ۔ سورۃ دھر میں ہے اِنَّ هٰذِهٖ تَذْكِرَةٌ فَمَنْ شَاءَ اتَّخَذَ اِلٰى رَبِّهٖ سَبِيْلًا (۷۶/۲۹) ”یہ قرآن کریم یقیناً ایک یاد دہانی ہے، سو جس کا جی چاہے اپنے رب کی طرف (کا) راستہ اختیار کر لے“ ۔ یہاں تک بات بالکل صاف ہے ۔ یعنی خدا کیطرف سے وحی مل گئی ہے ۔ اس کے بعد انسان کو اس کا اختیار دیا گیا ہے کہ وہ جی چاہے تو اس وحی کا تجویز کردہ راستہ اختیار کر لے اور جی چاہے تو اس کے خلاف عمل کرے ۔ لیکن اس کے آگے ہے وَمَا تَشَاءُوْنَ اِلَّآ اَنْ يَّشَاءَ اللّٰهُ (۷۶/۳۰) ۔ اسکا عام ترجمہ یہ کیا جاتا ہے ۔ ”اور تم نہیں چاہتے مگر وہ جو اللہ چاہے“ ۔ اس ترجمہ کی رو سے (ظاہر ہے کہ) نہ صرف یہ کہ یہ دونوں آیات ایک دوسرے کی نقیض بن جاتی ہیں بلکہ انسانی اختیار و ارادہ کی ساری عمارت نیچے آگرتی ہے ۔ یعنی ایک طرف تو قرآن کریم کہتا ہے کہ تم چاہو تو ایسا کر لو اور چاہو تو ویسا ۔ لیکن اس کے ساتھ ہی یہ بھی کہدیتا ہے کہ تم اپنی مرضی سے کچھ چاہ نہیں سکتے ۔ تم وہی چاہتے ہو جو اللہ چاہتا ہے ۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ جسے تم اپنا فیصلہ کہتے ہو وہ دراصل تمہارا فیصلہ نہیں ہوتا بلکہ خدا جو فیصلہ چاہتا ہے تم سے کرا لیتا ہے ۔ لہذا انسان مجبور محض ہے ۔

سورۃ دھر کے علاوہ یہ آیت (قریب قریب انہی الفاظ کے ساتھ) سورۃ مدثر (۷۴/۵۴-۵۶) اور سورۃ تکویر (۸۱/۲۸-۲۹) میں بھی آئی ہے ۔

”مَا تَشَاءُوْنَ“ نفی مضارع ہے جس کے عام معنی ہیں ”تم نہیں چاہتے“ ۔ لیکن عربی گرامر کی رو سے اس کے معنی نہی (مت کرو) کے بھی ہوتے ہیں ۔ یعنی ”تم مت چاہو“ ۔ گرامر کی اصطلاح میں اسے کہتے ہیں خبر کا انشاء کے معنوں میں استعمال ہونا ۔ مختصرالمعانی میں ہے ثُمَّ الْخَبَرُ قَدْ يَقَعُ مَوْقِعَ الْاِنْشَاءِ ۔ اِمَّا لِلتَّفَاؤُلِ اَوْ لِاِظْهَارِ الْحِرْصِ فِيْ وُقُوْعِهٖ كَمَا مَرَّ ۔ اَوْ لِلْاِحْتِرَازِ عَنْ صُوْرَةِ الْاَمْرِ

اَوْ لِحَمْلِ الْمُخَاطَبِ عَلَى الْمَطْلُوْبِ بِاَنْ يَكُوْنَ الْمُخَاطَبُ مِمَّنْ لَا يُحِبُّ اَنْ يُكَذِّبَ الطَّالِبَ (صفحہ ۲۳۲) یعنی کبھی کبھی خبر انشاء کی جگہ بھی مستعمل ہو جاتی ہے۔ ایسا بطور تفاول کے ہوتا ہے۔ یا متکلم چاہتا ہے کہ ایسا واقع ہو جائے۔ یا متکلم (صاف صاف) امر (حکم) کی صورت سے بچنا چاہتا ہے۔ یا پھر مخاطب کو اس بات کے لئے بر انگیختہ کرنے کے لئے ہوتا ہے کیونکہ مخاطب ان لوگوں میں سے ہوتا ہے جو متکلم کو جھٹلانا نہیں چاہتے۔

زمخشری نے (اپنی تفسیر کشاف میں) اس نکتہ کی وضاحت کی ہے۔ سورۃ بقرہ میں ہے وَاِذْ اَخَذْنَا مِيْثَاقَ بَنِيْٓ اِسْرَآئِيْلَ لَا تَعْبُدُوْنَ اِلَّا اللّٰهَ وَبِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا وَّذِي الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسَاكِيْنِ۔ وَقُوْلُوْا لِلنَّاسِ حُسْنًا.... ($\frac{۲}{۸۳}$)۔ یہاں لَا تَعْبُدُوْنَ نفی مضارع ہے۔ لیکن اس کے معنی نہی کے ہیں۔ آیت کا ترجمہ یہ ہے کہ "جب ہم نے بنی اسرائیل سے اقرار لیا کہ تم اللہ کے سوا اور کسی کی محکومی (عبدیت) اختیار مت کرنا۔ اور والدین اور رشتہ داروں یتامٰی اور مساکین کے ساتھ احسان کرنا"۔ اس کے بعد قُوْلُوْا امر کا صیغہ ہے۔ یعنی "لوگوں کو اچھی بات کہو"۔ زمخشری نے اس آیت کے تحت لکھا ہے کہ یہاں اخبار فی معنی النہی ہے۔ یعنی خبر، نہی کے معنوں میں ہے۔ جیسے کہتے ہیں "تَذْهَبُ اِلٰى فُلَانٍ، تَقُوْلُ لَهٗ كَذَا۔ اس میں "تَذْهَبُ"۔ "تَقُوْلُ"۔ اگرچہ مضارع کے صیغے ہیں لیکن ان سے مراد امر ہے۔ پھر وہ لکھتا ہے کہ۔ "وَهُوَ اَبْلَغُ مِنْ صَرِيْحِ الْاَمْرِ وَالنَّهْيِ۔ یعنی یہ انداز امر و نہی کے صیغوں کے ذریعہ صاف حکم دینے یا منع کرنے کے مقابلہ میں زیادہ بلیغ ہوتا ہے۔

قرآن کریم میں اس انداز بیان کی اور مثالیں بھی ہیں مثلاً (اسی) سورۃ بقرہ میں ہے وَمَا تُنْفِقُوْنَ اِلَّا ابْتِغَآءَ وَجْهِ اللّٰهِ ($\frac{۲}{۲۷۲}$)۔ اس کے معنی بھی یہی ہیں کہ "تم مت خرچ کرو بجز لوجہ اللہ" یعنی مضارع نفی نے نہی کے معنی دئے ہیں۔

ان تصریحات کی روشنی میں وَمَا تَشَآءُوْنَ اِلَّآ اَنْ يَّشَآءَ اللّٰهُ کے معنی واضح ہو جاتے ہیں۔ یعنی ہم نے تمہیں اس کا اختیار دے رکھا ہے کہ تم جیسا جی چاہے کرو۔ لیکن تمہیں چاہیئے یہ کہ اپنے اختیار و ارادہ کو ہماری مشیت سے ہم آہنگ رکھو۔ تم وہی چاہو جو ہم چاہتے ہیں۔ ہم یہی چاہتے ہیں کہ تم ہمارے قوانین کے مطابق زندگی بسر کرو۔ سورۃ زمر

میں ہے اِنْ تَكْفُرُوْا فَاِنَّ اللّٰهَ غَنِیٌّ عَنْكُمْ ۔ اگر تم (قوانین خداوندی) سے انکار کرو گے تو (اللہ کا کیا بگاڑ لو گے) اللہ تم سے بے نیاز ہے ۔ وَلَا يَرْضٰى لِعِبَادِهِ الْكُفْرَ ۔ وَاِنْ تَشْكُرُوْا يَرْضَهُ لَكُمْ (۳۹/۷) ۔ لیکن وہ اپنے بندوں کے لئے کفر کو پسند نہیں کرتا ۔ وہ تمہارے لئے شکر ہی کو پسند کرتا ہے ۔

لہذا انسان کو چاہئے کہ اپنے اختیار و ارادہ سے ، بطیب خاطر ، مشیت خداوندی (قوانین الہیہ) سے ہم آہنگی کی زندگی اختیار کرے ۔

ش ی ب

اَلشَّيْبُ ۔ بڑھاپا ۔ سفید بال یا بالوں کی سفیدی * ۔ سورۃ مریم میں ہے وَاشْتَعَلَ الرَّاْسُ شَيْبًا (۱۹/۴) اور سر بالوں کی سفیدی کی وجہ سے (شعلے کی طرح) بھڑک رہا ہے ۔ یا سر میں سفید بال بکثرت نمودار ہو گئے ہیں ۔ سورۃ روم میں شَيْبَةً (۳۰/۵۴) بڑھاپے کیلئے آیا ہے ۔ سورۃ مزمل میں ہے يَجْعَلُ الْوِلْدَانَ شِيْبًا (۷۳/۱۷) جس دن کی سختی بچوں کو بوڑھا کر دے گی ۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی ایک چیز کا دوسری چیز کے ساتھ مخلوط ہونا اور مل جانا ہیں ۔ شَيْبٌ کو شَيْبٌ اس لئے کہتے ہیں کہ اس میں بالوں کی سفیدی ، سیاہی کے ساتھ مل جاتی ہے ۔

ش ی خ

اَلشَّيْخُ ۔ بوڑھا آدمی ۔ نیز اونٹ کو بھی کہتے ہیں ۔ استاذ ۔ عالم ۔ سردار قوم ۔ ماہر فن کو بھی بزرگی اور فضیلت کی وجہ سے شَيْخٌ کہدیتے ہیں ۔ اَلشَّيْخَةُ ۔ بوڑھی عورت ۔ شَيْخُوْخَةٌ ۔ بڑھاپا * ۔

قرآن کریم میں شَيْخٌ (۱۱/۷۲) نیز (۱۲/۷۸) ۔ بوڑھے کے لئے آیا ہے ۔ اَلشَّيْخَةُ کا لفظ قرآن کریم میں کہیں نہیں آیا ۔ اور اَلشَّيْخُ وَالشَّيْخَةُ بمعنی بیاہا (مرد) اور بیاہی (عورت) لغت عرب میں کہیں نظر نہیں آیا ۔

ش ی د

شَادَ الْبِنَاءَ ۔ يَشِيْدُهُ ۔ وَشَيَّدَهُ ۔ عمارت پر چونہ وغیرہ کا پلستر کر کے اسے مضبوط اور بلند کر دینا ۔ اَلشِّيْدُ ۔ اس چونہ وغیرہ کو کہتے ہیں جس سے پلستر کیا جائے ۔ اَلْمَشِيْدُ ۔ جو عمارت چونہ وغیرہ سے بنائی

* تاج و محیط ۔

اور بلند کر دی جائے۔ محکم ۔ مضبوط * ۔ چنانچہ قرآن کریم میں ھے قَصْرٍ مَشِیْدٍ (۲۲/۴۵) ۔ اَلْاِشَادَۃُ ۔ آواز بلند کرنا * ۔ بُرُوْجٍ مُشَیَّدَۃٍ (۴/۷۸) کے معنے ھیں اونچے اور محکم قلعے ۔ ابن فارس نے کہا ھے کہ اس مادہ کے بنیادی معنی کسی چیز کو بلند کرنے کے ہوتے ھیں ۔

ش ی ع

شَاعَ الْخَبَرُ فِی النَّاسِ ۔ لوگوں میں خبر پھیل گئی * ۔ قرآن کریم میں ھے اِنَّ الَّذِیْنَ یُحِبُّوْنَ اَنْ تَشِیْعَ الْفَاحِشَۃُ (۲۴/۱۹) ۔ جو لوگ چاہتے ھیں کہ نا پسندیدہ باتیں پھیل جائیں ۔

ھٰذَا شَیْعُ ھٰذَا ۔ یہ اس کی مثل ھے * ۔ سورۃ سبا میں ھے کَمَا فُعِلَ بِاَشْیَاعِھِمْ مِنْ قَبْلُ (۳۴/۵۴) ۔ جیسا انہی جیسے لوگوں کے ساتھ ان سے پہلے کیا گیا ۔ سورۃ قمر میں ھے وَلَقَدْ اَھْلَکْنَا اَشْیَاعَکُمْ (۵۴/۵۱) ۔ ھم تمہارے جیسے لوگوں کو ھلاک کر چکے ھیں ۔

اَلشِّیَاعُ ۔ چرواھے کی بانسری یا اس کی آواز (جس سے وہ منتشر جانوروں کو بلاتا ھے) ۔ بلانے والے ۔ داعی * ۔ نیز اس کے معنے متابعت کرنے ۔ یعنے بلانے والے کے پیچھے پیچھے چلنے کے بھی آتے ھیں ۔ شَیَّعَہٗ عَلٰی رَاْیِہٖ ۔ اس نے اس کی رائے کی پیروی کی ۔ اسے تقویت دی ۔ ھٰذَا شَیْعُ ھٰذَا ۔ یہ اس بچہ کی پیٹھ پر پیدا ھونے والا بچہ ھے ۔ یہ ایسے اوپر تلے کے ، دو بچوں کے لئے بولا جاتا ھے جنکے درمیان کوئی اور بچہ پیدا نہ ھوا ھو ۔ اَلْمُشَایِعُ ۔ کسی کے ساتھ ساتھ (ملحق) رھنے والا ۔ شَیْعُ نِسَاءٍ اسے کہتے ھیں جو ھمیشہ عورتوں میں گھسا رھے ۔ اَلشَّاعَۃُ ۔ بیوی کو کہتے ھیں کیونکہ وہ شوھر کے ساتھ ساتھ یا اس کے پیچھے رھتی ھے * ۔ ابن فارس نے کہا ھے کہ اس کے بنیادی معنوں میں ایک دوسرے کی مدد کرنا بھی ھیں ۔

ان معانی سے شِیْعَۃٌ کے معنے واضح ھو جاتے ھیں ۔ یعنے وہ لوگ جو کسی کے پیچھے چل کر ایک پارٹی بن جائیں ۔ اور اس طرح ایک دوسرے کی تقویت اور مدد کا موجب ھوں ۔ اگر یہ اتباع قانونِ خداوندی کی ھے جس میں تعاون برّ اور تقویٰ میں ھوتا ھے تو اس پارٹی کا نام جماعت مومنین ھے ، جن کے ساتھ شامل ھونا باعث صد فخر و سعادت ھے ۔ چنانچہ قوم نوح کے مومنین کا ذکر کرنے کے بعد فرمایا اِنَّ مِنْ شِیْعَتِہٖ لَاِبْرٰھِیْمَ (۳۷/۸۳) ۔ یقیناً ابراھیم ؑ ان ھی کے گروہ میں سے تھا ۔ لیکن اگر اس قسم کی گروہ بندی انسانوں

* تاج و محیط ۔

کے پیچھے چل کر بنائی جائے تو قرآن کریم اسے شرک قرار دیتا ہے ۔ چنانچہ اس نے امت مسلمہ سے واضح الفاظ میں کہہ دیا کہ وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِيْعًا وَّلَا تَفَرَّقُوْا (۳/۱۰۳) ۔ تم سب کے سب اس کتاب اللہ کے ساتھ وابستہ رہو اور فرقوں میں مت بٹ جاؤ ۔ وَلَا تَكُوْنُوْا مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ ۔ مِنَ الَّذِيْنَ فَرَّقُوْا دِيْنَهُمْ وَكَانُوْا شِيَعًا ۔ كُلُّ حِزْبٍۢ بِمَا لَدَيْهِمْ فَرِحُوْنَ (۳۰/۳۲) ۔ (دیکھنا ۔ تم مومن بن جانے کے بعد کہیں) مشرک نہ بن جانا ۔ یعنے ان لوگوں جیسے نہ ہو جانا جنہوں نے اپنے دین میں فرقے پیدا کر لئے اور گروہوں میں منقسم ہو گئے ۔ (اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ) ہر فرقہ اس پر اکڑتا ہے کہ ہم حق پر ہیں اور باقی سب باطل پر ۔ لہذا قرآن کریم کی رو سے یہ سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کہ کونسا فرقہ حق پر ہے اور کونسا باطل پر ، جبکہ اس کی رو سے خود فرقہ بندی ہی شرک ہے ۔ اسی بنا پر اس نے رسول سے کہدیا کہ اِنَّ الَّذِيْنَ فَرَّقُوْا دِيْنَهُمْ وَكَانُوْا شِيَعًا لَّسْتَ مِنْهُمْ فِيْ شَيْءٍ (۶/۱۶۰)۔ جو لوگ دین میں فرقے پیدا کرلیں اور گروہ گروہ بن جائیں ۔ اے رسول ۔ تیرا ان سے کوئی تعلق اور واسطہ نہیں ۔ کہا جا سکتا ہے کہ آج جب کہ مسلمانوں میں اس قدر فرقے پیدا ہو چکے ہیں تو ان میں وحدت کی صورت کیا ہوسکتی ہے؟ وہی صورت جسے قرآن کریم نے خود واضح کر دیا ہے ۔ یعنے اِعْتِصَام بِحَبْلِ اللّٰه ۔ خدا کی کتاب کو مرکز قرار دیکر نظام قائم کر لینا ۔ اس سے فرقے خود بخود ختم ہو جائینگے ۔ اگر شخصیتوں کو درمیان سے نکال دیا جائے اور ایک نظام کے ذریعہ اطاعت صرف کتاب اللہ کی کی جائے تو فرقوں کا وجود باقی نہیں رہتا ۔ (''نظام کے ذریعے قرآن کریم کی اطاعت'' کی شرط بڑی اہم ہے ۔ انفرادی طور پر ، اپنے اپنے خیال کے مطابق، خدا کی اطاعت سے فرقے پیدا ہوتے ہیں ۔ نظام کی رو سے اطاعت خداوندی سے وحدت امت برقرار رہتی ہے ۔) یہ بھی واضح رہے کہ فرقوں سے مراد صرف مذہبی فرقے ہی نہیں ، سیاسی پارٹیاں بھی ہیں ۔ مومنین تو ایک طرف ، قرآن کریم نے ہر قوم میں فرقہ بندی ، پارٹی بازی اور گروہ سازی کو خدا کا عذاب قرار دیا ہے (۶/۶۵) ۔ اس نے بتایا ہے کہ دنیا میں ''حکمت فرعونی'' ہمیشہ یہی کرتی ہے ۔ یعنے پارٹیاں بناتی اور توڑتی رہتی ہے (۲۸/۴) ۔ (مزید تفصیل ف ۔ ر ۔ ق کے عنوان میں دیکھئے) ۔

قرآن کریم میں شِيَعٌ کا لفظ اقوام یا قبائل کے معنوں میں بھی استعمال ہوا ہے (۱۵/۱۰) ۔

(جلد دوم ختم شد)

اس لغات میں

آپ نے مختلف مقامات پر یہ پڑھا ہوگا کہ '' اس نکتہ کی وضاحت آپ کو پرویز صاحب کی فلاں کتاب میں ملیگی ''۔ چونکہ قرآنی تعلیم سے متعلق یہ مباحث بڑے اہم ہیں اس لئے پرویز صاحب کی ان تصانیف کا مطالعہ بڑا ضروری ہے۔ بالخصوص حسبِ ذیل کتابوں کا مطالعہ۔

انسان نے کیا سوچا؟ گذشتہ اڑھائی ہزار سال میں، دنیا کے مختلف مفکرین، مدبرین، مؤرخین اور سائنسدانوں نے انسان کی انفرادی اور اجتماعی زندگی کے متعلق جو کچھ سوچا اور کہا ہے، اسے نہایت دلنشین پیرایہ میں اسطرح بیان کیا گیا ہے کہ اس کی روشنی میں قرآنی حقائق کی عظمت خود بخود سامنے آجاتی ہے۔ بڑی جلد کے ۴۳۹ صفحات۔

سلیم کے نام خطوط ۔ ہمارے نوجوان، تعلیم یافتہ طبقہ کے دل میں، اسلام کے متعلق جسقدر شکوک اور سوالات پیدا ہوتے ہیں، ان کا نہایت اطمینان بخش جواب۔ انداز بیان دلچسپ، سلیس اور نہایت شگفتہ۔ کتاب تین جلدوں میں شائع ہوئی ہے۔

پرویز صاحب کی دیگر تصانیف کی فہرست ایک کارڈ لکھ کر طلب فرمائیں۔

ملنے کا پتہ

طلوعِ اسلام ٹرسٹ (رجسٹرڈ) ۲۵/بی۔ گلبرگ۲۔ لاہور